UNIVERSAL
LIBRARY

OU_224004

UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. [illegible] Accession No. [illegible]

Author

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.



منظورہ محکمہ تعلیمات حکومت حیدرآباد

مجلسِ مشاورت

حبیب الرحمٰن
فضل الرحمٰن
ڈاکٹر یوسف حسین خاں
ڈاکٹر طاہر علی خاں مسلم
رائے جانکی پرشاد
سید محمد
عالم خوندمیری
ڈاکٹر حفیظ قتیل
دلاور علی خاں
رضیہ بیگم

●

خزانہ
عابد علی خاں

مجلسِ ادارت

● سلیمان اریب
● حسینی شاہد
● مغنی تبسم

ecked 1973

جلد ۳ ——— شمارہ ۱

جنوری ۱۹۵۰ء

قیمت
||
دس آنے

صبا

● زرسالانہ
ہندوپاک سے آٹھ روپے
شش ماہی
پانچ روپے

ٹیلی فون
۵۴۰۲

پرنٹر پبلشر۔ سلیمان اریب ● نیشنل پریس ● ۱۷، مجروگاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد دکن

اس شمارے میں

پہلی بات ۳

مضامین:-

موازنۂ آہنگ — ابوظفر عبدالواحد ۶

مانٹسکیو اور

مکتوباتِ فارسی — رضیہ بیگم ۱۰

جانِ دوستاں — تحسین سروری ۲۴

غزلیات:-

اختر الایمان ۳۲

نشور واحدی ۳۳

شاذ تمکنت ۳۴

اختر سعید ۳۵

شہاب جعفری ۳۶

زبیدہ تحسین ۳۷

سلیمان اریب ۳۸

نظمیں:-

سایۂ رخسار میں — کیفی اعظمی ۳۹

سہاگ رات — خلیل الرحمٰن اعظمی ۴۰

دادگر — عزیز قیسی ۴۱

حیات و موت — وحید اختر ۴۲

آہٹ — متین سروش ۴۳

سوچنے کی بات — شفیق فاطمہ شعریٰ ۴۴

انتظار — زبیر رضوی ۴۶

طنز:-

ادب برائے اکسپورٹ — میگھ دوت ۴۷

افسانہ:-

چاند محل — واجدہ تبسم ۵۱

ڈرامہ:-

پنچایت — انور معظم ۶۴

اشتہارات ۷۷ تا ۸۰

پہلی باتیں

نیا سال مبارک ؛

قومی شعور کی توہین ہوگی اگر ہم آپ کو سال نو کی مبارک باد دیں اور ان سرفروشوں کو بھلا دیں جنھوں نے ۱۸۵۷ء کے سال کو ہندستان کی تاریخ میں امر بنا دیا ہے۔

۱۸۵۷ء کا سال ہندستان کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ اس سال ہندستانی مجاہدوں نے بیرونی اقتدار کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور اپنے خون سے آزادی کی تاریخ کی تمہید لکھی۔ یہ بغاوت غیر منظم تھی، اس لیے ناکام ہوئی اور سامراجی مورخوں نے اس کو غدر کا نام دیا۔ بغاوت کی ناکامی سے انگریز اقتدار کی بنیادیں مستحکم ہوگئیں لیکن وہ چنگاری جو ہندستانیوں کے دل میں روشن ہو چکی تھی کجلائی نہیں بلکہ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کی تاریخ اسی چنگاری کے شعلۂ جوالا بننے کی تاریخ ہے۔

۱۸۵۷ء کا انقلاب صرف سیاسی انقلاب نہیں تھا، اس نے ہماری معاشی، سماجی اور تہذیبی زندگی کے رخ ہی کو بدل دیا۔ جماعتی اور ملکی آزادی کا تصور عام ہوا اور جب سیاسی اور معاشی غلامی ہماری تقدیر بن چکی تھی تو حب الوطنی، قومیت سامراج دشمنی اور ملکی آزادی کے جذبات بھی ابھرنے لگے۔ اردو ادب بھی ان تبدیلیوں سے متاثر ہوا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ادیب پہلی بار شہر لب و رخسار سے رسن و دار کی آزمائش تک اسی زمانے میں پہنچا۔ اس لیے اس سال جب ہم ۱۸۵۷ء کی آزادی کا صد سالہ جشن منا رہے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ اپنے ادب کے پچھلے سو سال کا جائزہ لیں، اور ان تخلیقات کا ایک جامع اور بسوط انتخاب شائع کریں جن سے نئی زندگی کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ یہ کام جتنا اہم اور ضروری ہے اتنا ہی کٹھن اور صبر آزما بھی ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ محققین اور نقادوں کی ایک جماعت اس کا بیڑہ اٹھائے۔

ادارۂ "صبا" نے کافی غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ پورے سو سال کا جائزہ لینے کے بجائے وہ اس ادب کا انتخاب کرے جو ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے سلسلے میں تخلیق کیا گیا ہے۔ اس فرض سے ادارہ اسی وقت عہدہ برآ ہو سکتا ہے کہ تمام ادیب، نقاد اور محقق اس کا ہاتھ بٹائیں۔ ہمیں توقع ہے کہ ہمارے اہل قلم ہمارے ساتھ پورا پورا تعاون کریں گے۔ اور ایسی تمام چیزوں کی نقلیں ہمارے ہاں روانہ کریں گے اور اگر وہ نقلیں روانہ نہیں کر سکتے تو کم از کم ان تمام چیزوں کی نشان دہی کر دیجئے جو اس انتخاب میں شامل ہونی چاہئیں۔

ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس

۲۳ سے ۲۸ دسمبر تک دلی میں ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ۱۷ ایشیائی ملکوں کے نمائندوں کے علاوہ فرانس، اٹلی، انگلستان اور دوسرے یورپی ملکوں کے سمبرین نے بھی بڑی تعداد میں شرکت کی اور ہندستان کی مختلف زبانوں

کے تین سو سے زائد ادیب اور دانشور شریک ہوئے جن میں اردو والوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔

کانفرنس کے آغاز سے ایک دن پہلے یعنی ۲۲ر دسمبر کو ہندستانی ادیبوں کا کنونشن ہوا، جس میں تنظیمی مسائل پر بات چیت ہوئی۔ ۲۲ر دسمبر کے مباحث سے جو بات ظاہر ہوئی وہ بڑی دلچسپ ہے۔ اور وہ یہ کہ مختلف ملکوں کے ادیبوں کو بنیادی مسائل پر یک جا کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا کٹھن ہندستانی ادیبوں میں اتحاد فکر و نظر پیدا کرنا ہے اس لیے تمام ہندستانی ادیبوں کی کسی قومی تنظیم کا سوال ابھی قبل از وقت معلوم ہوتا ہے۔

کانفرنس کا آغاز ۲۳ر دسمبر سے ہوا اور اس کی کارروائی پانچ دن تک جاری رہی۔ ابتداء میں مختلف زبانوں کے ادب کے بارے میں رپورٹیں پیش ہوئیں جن کے مطالعہ سے نہ صرف ان زبانوں کے ادب کے آغاز و ارتقار کا خاکہ ذہن نشین ہوتا ہے بلکہ ان مسائل سے بھی واقفیت ہوتی ہے جو مختلف زبانوں کے ادب کے سامنے ہیں۔ ان میں کئی بنیادیں مشترک نظر آتی ہیں اور یہی مشترک عناصر ایشیائی ادیبوں کو ایک دوسرے سے قریب لاتے ہیں۔

ان رپورٹوں کے بعد ادیب اور آزادی، ادیب اور اس کا پیشہ، تہذیبی تبادلہ وغیرہ جیسے اہم موضوعات پر مقالے پڑھے گئے اور ان پر بحث ہوئی۔ کانفرنس میں تمام مکاتیب خیال کے ادیبوں نے حصہ لیا تھا اس لیے ان بحثوں میں مکاتیب خیال کی آویزش بھی نظر آتی تھی۔ لیکن ہر ایک مکتب خیال کے نمائندے نے دوسرے مکتب خیال کے نمائندے کا احترام کیا اور اس بات سے احتراز کیا کہ بحث میں تلخی آنے پائے اور نہ یہ صورت پیدا ہو کہ خیالات اور نظریات کی آویزش ان مسائل کو پس منظر میں ڈال دے جو ایک مشترک موجو بوجھ کی بنیاد بن سکتے ہیں۔ بلکہ اس بات کی شعوری کوشش کی گئی کہ اپنے نقطۂ نظر کو بے باکی کے ساتھ پیش کرتے ہوئے مشترک مسائل پر اتفاق رائے کے زیادہ سے زیادہ امکانات پیدا کیے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادیب اور آزادی کے کمیشن میں گرما گرم بحثوں اور جوابی تقریروں کے باوجود ایک ایسی جامع رپورٹ تیار کی جا سکی جس پر متضاد خیالات اور متحارب نقاط نظر رکھنے والے بھی پوری طرح متفق تھے اور اسی فضا نے کانفرنس کو کامیاب بنایا۔

کانفرنس کے مختلف اجلاسوں کو وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو، نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن، شری راجگوپال چاری اور شری مدلیار نے بھی مخاطب کیا۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ مادام زلفیہ نے اپنے ساتھیوں کی طرف سے دعوت دی ہے کہ ایشیائی ادیبوں کی اگلی کانفرنس ان کے وطن تاشقند میں بلائی جائے۔

مدراس اور اردو

اے۔ جے اردو سمینار ایک ایسا ادارہ ہے جو مدراس میں اردو کی نشر و اشاعت اور بقا و تحفظ کے کام کو آگے بڑھانے میں پچھلے کئی سال سے غیر معمولی اہم کام انجام دے رہا ہے۔ اس ادارے کا کردار دہرا ہے۔ وہ بہ یک وقت عام اردو بولنے والوں کے لیے بھی کام کر رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی اردو میں لکھنے والوں کا بھی مرکز ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ وہ مستقبل میں بھی اسی طرح اردو کی خدمت کرتا رہے گا اور بہت جلد جنوبی ہند میں اپنے لیے ایک اونچا مقام

پیدا کرلے گا۔

مدراس اور آندھرا کے اردو بولنے والوں کی خوش قسمتی ہے کہ انھیں افضل العلما ڈاکٹر عبدالحق جیسی شخصیت کی معیت حاصل ہے۔ وہ بجائے خود ایک ادارہ ہیں اور ان کی شخصیت آندھرا اور تامل ناڈو کے اردو بولنے والوں کی تہذیبی، تعلیمی اور اجتماعی زندگی پر چھائی ہوئی ہے۔ چنانچہ اے جے اردو سمینار بھی انھیں کی رہنمائی میں کام کرتا ہے۔ جنوری کے پہلے ہفتہ میں سمینار کی طرف سے ایک بڑا مشاعرہ منعقد کیا گیا تھا جس میں ہندستان کے مختلف علاقوں سے شعرا کو مدعو کیا گیا تھا۔ ہم ڈاکٹر صاحب اور سمینار کے کارکنوں کو اس مشاعرے کی کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں۔ اس لیے کہ اس مشاعرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ مدراس میں اردو زبان کے تحفظ کا شعور کس قدر عام ہوگیا ہے اور اس دور افتادہ علاقے کے لوگوں میں زبان اور ادب سے کتنا گہرا لگاؤ ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی رہنمائی میں سمینار اردو والوں کی ہمہ جہتی ترقی کی مہم کو آگے بڑھائے گا، اور جو تعلیمی تحریک آندھرا اور تامل ناڈو میں جاری ہے وہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرتی رہے گی۔

زیر رہنمائی حیدرآباد ہینڈلوم ویورس سنٹرل کوآپریٹیو سوسائٹی لمیٹڈ

ہائیکو فیبرکس

۱۴۹۰۰۰، اتحادی بافندے

پیش کرتے ہیں مختلف رنگوں اور نمونوں میں اور اس فیشن کا ساتھ دیتے ہیں جو قومی ترقی کو ظاہر کرتا ہے

اپنی پسند کا پارچہ ابھی خریدیئے

ویورس ہاؤس ——— نارائن گوڑہ ——— حیدرآباد دکن

دستی پارچہ کی خریدی پر آپ کی ہر ایک پائی لاکھوں بافندوں کیلئے کام دلاتی ہے

کل ہند صنعتی نمائش حیدرآباد میں ہمارے اسٹالس

۱۷، ۲، ۷، ۴، ۲/۱۱، ۴، اور ۲/۱۲، ۷، ۴ میں ضرور تشریف لیجائیے

ابوظفر عبدالواحد

موازنۂ آہنگ

(سلسلہ)

۳

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ترنمی سانچوں کو عربی اصطلاح میں ارکان، یا افاعیل کہتے ہیں اور ان کی مختلف اشکال کی بنا پر ان کے جُداگانہ نام بھی ہیں۔ مثلاً ۵ ۱ ۵ (مُستفعلن) کا ترنمی سانچہ رجز کہلاتا ہے، اور ۱ ۵ (فعولن) کا سانچہ متقارب۔ ہندی میں اسی طرح ترنمی سانچوں یا ارکان کو گن کہتے ہیں جو سنسکرت کے بوجھل لفظ گنؔ سے نکلا ہے۔ اس باب میں چند ایک ہندی ارکان کے اصطلاحی نام اور ان سے پیدا ہونے والے اوزان (چھند) کا ذکر ہوگا۔

گنوں کی دو بڑی اقسام ہیں۔ ایک وہ جو ماترک گن کہلاتے ہیں۔ دوسرے وہ جنھیں برنک گن کہتے ہیں۔

ماترک گن کی پانچ اقسام ہیں جو سب کی سب چھ حرفی کھڑی ماتراؤں (متحرک حروف) سے متعلق ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے اکھڑ بولوں سے لہجے میں ثقالت پیدا ہوتی ہے اور جہاں تک ہماری زبان کا تعلق ہے، ہمارے ہاں ایسے بوجھل اور ثقیل الفاظ کا چلن نہیں ہے۔ اس لیے ماترک گنوں کی تفصیل میں جانا بے سود ہوگا۔ خود ہندی اور سنسکرت والے، ماترک گنوں کو بے فیض اور بے ثمر قرار دیتے ہیں۔

برنک گن البتہ کارآمد ہیں اور ان کی مجموعی تعداد آٹھ ہے، جس طرح عربی کے سات اور پانچ حرفی ارکان کی جملہ تعداد دس ہے۔ ان آٹھ گنوں میں سے چار ایسے ہیں جو کُدھائی (غیر نافع) ہیں اور انھیں اصطلاح میں "اگن" کہتے ہیں۔ اور چار ایسے ہیں جو سُکدھائی (فیض رساں) اگن کہلاتے ہیں۔ یہ آٹھوں گن اگن تین برنوں کے پرستار سے نکلے ہیں جن کے نام یہ ہیں:-

(۱) مگن، جس کے اجزائے ترکیبی میں تین گرُو (۵ ۵ ۵) شامل ہوتے ہیں۔ یہ رکن سُکدھائی ہے اور مفعولن کا ہم وزن۔

(۲) یگن، جس کے اجزائے ترکیبی میں ایک لگھُ اور دو گرُو (۱ ۵ ۵) ہوتے ہیں۔ یہ گن مفعولن کا ہم آہنگ ہے اور مگن کی طرح یہ بھی سُکدھائی ہے۔ ایک شعر مثالاً دیتا ہوں اس لیے کہ یہ گن مفعولن کے برخلاف، عربی کے سمو چے رکن سے متقارب سالم کہلاتا ہے، قریبی مماثلت رکھتا ہے۔ ایک اور نرمے کی بات یہ ہے کہ ذیل کے سب مصرعے اکہرے (ایک کنی) ہیں۔

مہا میں ⁘ سہی میں ⁘ جشی سے ⁘ شششی سے
ا ا ک ا ا ک ا ا ک ا ا ک
فعولن فعولن فعولن فعولن

(ترجمہ)

[دنیا میں مشاہیر چاند کی طرح چمکیلے ہوتے ہیں]

اس میں شک نہیں کہ اوپر کے یہ اکہرے مصرعے اپنی خالص اوزان رکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایسے اکہرے مصرعوں کا چلن نہیں ہے۔ ہمارے ہاں ان چار چھندوں کا ایک مصرعہ ہوگا۔ بہر حال اس وزن کو جو متقارب کا مماثل ہے، ہندی میں شششی کہتے ہیں۔ مسدس حالی اسی چوکنی چھند میں ہے۔

(۳) رگن، اس کے اجزائے ترکیبی ہیں: گرو + لگھ = گرو (ا ک) جو ہم وزن ہے فاعلن کا۔ یہ اگن ہے اور غیر نافع (دکھدائی)۔ خیر نہیں اس رکن کو دکھدائی کیوں قرار دیا جاتا ہے، حالانکہ اس ترنگی سانچے سے جو وزن پیدا ہوتا ہے بڑا ہی دلکش ہوتا ہے۔ ہندی کے چار مصرعے دیئے جاتے ہیں، جو ہمارے ہاں کے ایک مصرع کے برابر ہوں گے ؎

ہے کھڑو ⁘ پتھرو ⁘ توھیا ⁘ ری پریا
ک ا ک ک ا ک ک ا ک

(ترجمہ)

[ری پریا (اے پیاری)، توھیا (تیرا دل) پتھر کی طرح سخت ہے]

(۴) سگن، = لگھ + ایک گرو (ا ا ک) اس کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ فعلن کا ہم وزن۔ رگن کی طرح یہ بھی دکھدائی ہے۔ اس رکن کو بھی غیر نافع قرار دینے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ ہمارے ہاں یہ وزن حد درجہ دلکش سمجھا جاتا ہے۔ ایک شعر دیتا ہوں جو مرکب چھند میں ہے جس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔ البتہ اس کے ابتدائی اجزا میں سگن مصرع میں دو بار آیا ہے ؎

بھج رام کرشن مکند ⁘ برج ناتھ گوکل چند
ا ا ا ا ک ا ا ا ا ک ا
فعلن فعلن فعلات ⁘ فعلن فعلن فعل

(ترجمہ)

[رام کرشن کی رٹ لگاؤ جو گوکل محافظ اور اس کے چاند ہیں]

مندرجہ بالا مصرعوں کے دونوں ابتدائی اجزا (ا ا ا ا) سگن ہیں۔ البتہ آخری اجزا میں جہاں ایک جگہ فعلات اور دوسری جگہ فعل آیا ہے، یہ اختلاف فنی حیثیت سے بہ نظر تنوع روا ہے۔ ان معرعوں کی اور ایک طرح سے بھی تقطیع ہو سکتی ہے جو آئندہ کسی اور بحث میں آئے گی۔

(۵) نگن، ۲ گرو + لگھ (ا ا ا ا) اس کے اجزائے ترکیبی ہیں اور مفعول کا ہم وزن ہے۔ یہ اگن ہے اور غیر نافع (دکھدائی) اسے دکھدائی قرار دینے کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ اس لیے کہ بذات خود یہ سانچا اچھا ترنم پیدا نہیں کرتا۔ دوسرے ارکان کے امتزاج کے ساتھ البتہ پُرترنم ہو سکتا ہے۔ اس کی مثال بعد کے اوراق میں آئے گی جو مرکب اوزان سے متعلق ہے۔

(۶) مگن، ایک لگھ + گرو + لگھ (ا ا ا) اس کے اجزائے ترکیبی ہیں اور فعولن کا ہم وزن ہے۔ نگن کی طرح یہ بھی اگن اور غیر نافع ہے۔ ہمارے ہاں فعولن اپنے بل پر کچھ اچھا ترنم نہیں دیتا۔ دوسرے ارکان کے امتزاج کے ساتھ البتہ۔ اس کی مثال بھی بعد کے اوراق سے متعلق ہوگی۔

(۷) بھگن، گرو + ۲ لگھ اس کے اجزائے ترکیبی ہیں اور فاعل کا ہم وزن ہے۔ ہندی والوں کے ہاں یگن (رکن) اسکھدائی ہے۔ ہمارے ہاں یہ بے فیض قرار دیا جائے گا، اس لیے کہ کسی دوسرے رکن سے ہم آہنگ ہوئے بغیر کوئی اچھا ترنم اس سے پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی مثال بھی بعد میں دی جائے گی۔

(۸) نگن، تینوں اجزا لگھ (ا ا ا)۔ ہندی والوں کے ہاں یہ گن سکھدائی ہے۔ ہماری ہاں یکسر دکھدائی اور بوجھل سمجھا جائے گا، اس لیے کہ تینوں بول اس کے متحرک ہیں۔ مثال کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

گن اگن کی بحث یہاں ختم ہوتی ہے۔ اس نوبت پر یہ جتا ناضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہندی کے یہ ترنجی ارکان، عربی کے افاعیل کی طرح جامع اور خود مکتفی نہیں ہے۔ بعض صورتوں میں ان کے ساتھ چند ایک اور اصولوں سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ اصطلاح میں انھیں "برت" کہتے ہیں۔

برت کے لفظی معنی ہیں کسی چیز کا متعین کرنا۔ اور اس سے ترنجی اجزا (لگھ اور گرو) کا شمار اور ترتیب مراد ہے جو کسی چھند یا چرن (مصرع) میں بطور خاص ملحوظ رکھی جاتی ہے۔ اس کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے چند ایک کا یہاں ذکر ہوگا۔

۱۔ سم برت: سم یعنی برابر۔ اور اصطلاحاً ایسا وزن جس کے تمام مصرعے تقطیع میں برابر اتریں۔ ؎

کنجن میں نند لالا ۔ سنکھ لیے برج بالا

ا ا ا ا ا ا ا ا ا ا ا ا ا ا ا ا

۲+۱+۲+۲+۲+۲ = ۱۲ مات ۲+۱+۲+۲+۲+۲ = ۱۲ مات

اوپر کی بانٹ میں اجزا کی مجموعی تعداد بہ حساب ۱+۲ (لگھ اور گرو) مساوی ہے، اور ہر چرن بارہ ماتروں کا ہے۔ اس قسم کے التزام کو سم برت کہا جائے گا۔

۲۔ ارد سم برّت: جہاں مصرعوں میں بیش و کم کا اصول کارفرما ہو۔ التزام یہ کیا جائے کہ طاق مصرعوں میں ماتراؤں یا برنوں کی تعداد دُجفت مصرعوں کی تعداد سے مختلف ہو۔ خود ارد کے معنی اختلاف یا تضاد کے ہیں۔ ایکشال:۔

(۱) میری سینے برج چندا ۔ (۲) (کہنی) کہواں جوڑ کر آ ندکندا

ISSIIISIS SSSIISSIS

۲+۲+۱+۱+۲+۱+۱+۲+۱+۲ = ۱۶ ماتر ۲+۲+۲+۱+۲+۲+۱+۲+۲+۱ = ۱۶ ماتر

(۳) نج دیجے جو چھل چھندا (۴) مانو سیکھا جستے نندا

IISSIISSSI SSIISSSS

۱+۱+۲+۲+۱+۱+۲+۲+۲ = ۱۶ ماتر ۲+۲+۲+۲+۱+۱+۲+۲+۲ = ۱۶ ماتر

اوپر کے مصرعوں میں پہلے اور تیسرے میں ماتراؤں کی جملہ تعداد چودہ ہے اور دُجفت مصرعوں (۲ اور ۴) کی سولہ۔ مصرعوں کی یہ عدم مساوات ارد سم برّت کہلائے گی۔

۳۔ جات: ایسا چھند جو دو یا دو سے زائد چھندوں سے مرکب ہو۔ دو ہے کے چھندوں میں اور چھند شامل کرنے سے یہ معجون مرکب بنتا ہے۔ دو ہا خود ایک طرح کا دوانجنی (دُہرا) مصرعہ ہوتا ہے جس میں چار چھند اور شامل کرکے چھ چھندی مصرع بنا لیتے ہیں۔ جات چھند کو کنڈلیا بھی کہتے ہیں۔ ایک مثال توضیحاً یہاں دی جاتی ہے۔ ہر فرعی مصرعے کے بعد بشرام (ٹھہراؤ کے نشان //) لگا دیئے گئے ہیں تاکہ دیکھنے اور غایۃً تفہیم میں سہولت ہو۔ لیجئے، چھ انجنی بہار کی بہار ملاحظہ کیجئے۔

(مصرع اوّل)

نیا و چارے جو کرے // سو پاچھے پچتائے // کام بگاڑے آپ تو // جگ میں ہوت ہنسائے // جگ میں ہوت ہنسائے // جیت میں چین نہ آوے

(مصرع دوم)

کھان پان، اسناں راگ رنگ // من نہیں بھاوے // کہیں گھر، کبہ راتے // دُکھ کچھ مٹت نہ ٹارے // کھٹ کھٹے ہے دن رات // کہیو جو بنا و چارے

رضیہ بیگم

مانٹسکیو اور مکتوباتِ فارسی

شخصیت پرستی یقیناً بری چیز ہے لیکن اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ ہر زمانہ اور ہر ملک میں کچھ شخصیتیں ضرور ایسی ہوتی ہیں جو اپنی کسی مخصوص فکر یا عمل کی بناء پر خاص و عام توجہ کا مرکز بن جاتی ہیں۔ خاص طور سے فن اور ادب کے حلقہ میں کہ جب وہاں کوئی ایسی نمایاں شخصیت ابھرتی ہے تو اکثر و بیشتر اس کی شہرت و مقبولیت زماں و مکاں کی حدوں کی بھی پابند نہیں رہتی۔ ایک اچھے فن کار، شاعر یا ادیب کی آواز جو انسانی ذہن کے ساتوں کو چھیڑتی ہے اور جو نہ جانے کتنے ہی دلوں میں ان کی اپنی صدائے بازگشت بن کر گونجتی ہے۔ لامحالہ بے شمار نظروں کو اپنی طرف کھینچتی ہے نہ صرف اپنے زمانہ اور ملک میں بلکہ دوسرے ملکوں اور آنے والے ادوار میں بھی۔ اور اس کی شخصیت اور تخلیقی کارناموں سے شناسائی اور واقفیت، میں سمجھتی ہوں یقیناً ہمارے اندر ایک زیادہ بھرپور اور دیرپا مسرت کا احساس جگاتی ہے۔ شاید اسی لیے آج میں اُردو دان گروہ کو مانٹسکیو . . . . . اور اس کی ادبی تخلیق "مکتوبات فارسی" LETTER PERSONS سے روشناس کرانے اور ان میں بھی اپنی اسی "ادبی مسرت" میں شریک بنانے کی جراءت کر رہی ہوں۔

مانٹسکیو۔ جو پیشہ کے لحاظ سے فرانس کے ایک معمولی مگر سنجیدہ اور ایماندار مجسٹریٹ تھا اور بہ ظاہر "قانون" اور ادب میں کوئی منطقی ربط نظر نہیں آتا مگر غالباً اسی پیشہ کے متضاد تجربوں اور اس سے پیدا ہونے والے گوناگوں تاثرات اور لوئی چہاردہم کے فرانس کی عام بدحالی اور ایک مخصوص اونچی سوسائٹی کی ہنگامہ طرازیوں اور عیش پرستوں سے قریبی تعلق نے ہی مانٹسکیو کی ذہانت اور "ادبی حساسیت" کو متحرک کیا اور اس سے "مکتوبات فارسی" جیسی کتاب لکھوائی۔

اوائل ۱۸ ویں صدی کا فرانسیسی سماج اس وقت جس دور سے گذر رہا تھا وہ کسی بھی حساس دل و دماغ کے لیے کوئی خوشگوار چیز نہ تھی۔ شاہ اور کلیسا کی آپس کی نزاع، دو طاقتوں کی باہمی کشمکش اور لوئی ۔ شاہ فرانس کی احمقانہ عیش پرستیوں نے پورے فرانس میں ایک عام سماجی، مذہبی، اخلاقی، سیاسی اور معاشی بے چینی پھیلا رکھی تھی، ہر طرف عجیب انتشار تھا جو قبول کسے بعض دلوں میں شدید غصہ اور جھنجھلاہٹ، کا باعث تھا تو کچھ اسے ہنس کر ٹال جانے میں ہی اپنے قلب و روح کی نجات محسوس کر رہے تھے۔ ان حالات میں مانٹسکیو جیسے وسیع نظر، حساس اور ایماندار انسان کے لیے خاموش رہنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ جب ۱۷۲۱ء میں یکایک اس کی چھپی ہوئی ادبی صلاحیتیں "مکتوبات فارسی" کی شکل میں منظر عام پر آئیں تو فرانس کے ادبی اور سماجی حلقوں میں جیسے ایک

ہلچل مچ گئی۔ "ادب دوست" خواتین نے اپنے "دیوان خانوں" کے دروازے مانتسکیو کے لیے کھول دئے اور کتنی ہی حسین آنکھیں مانتسکیو کی اس "نئی شخصیت" کے لیے چشم براہ رہنے لگیں اور خوشنما "قصر و بام" سے دور کتنے ہی دلوں نے ایسا محسوس کیا۔ جیسے مانتسکیو کے طنز و مزاح میں ان کی اپنی زندگی کی تلخیاں گھلی ہوں اور اس کی آواز ان کے اپنے دل کی "آواز بازگشت" ہو۔ یوں صرف ایک مجسٹریٹ یکایک خاص و عام کی توجہ کا مرکز بن گیا اور اس کی ادبی تخلیق نے اپنے وقت کی ایک بھرپور دلکش آواز بن کر جو شہرت و مقبولیت حاصل کی وہ صرف اپنے وقت اور زمانہ تک محدود نہیں رہی بلکہ آج بھی نہ صرف فرانسیسی ادب میں بلکہ دوسری زبانوں کے ادب میں بھی بجا طور پر ایک مخصوص قدر و قیمت کی حقدار ہے۔ اور آج بھی اہل ذوق کے لیے "ادبی تسکین" اور سامان دلچسپی فراہم کر سکتی ہے۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ۱۸ ویں صدی عیسوی کے آغاز میں مانتسکیو کی یہ کتاب اپنی نوعیت کی کوئی بالکل نئی یا انوکھی چیز تھی، کیونکہ سیاحوں کے ذریعہ ایک روپ دھارنے کا انداز میں اپنے یا کسی دوسرے ملک کے سماج پر نیم مزاحیہ اور طنزیہ انداز میں تنقید و تبصرہ کا رواج اس سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔ مختلف زبانوں میں ایسی کئی کتابیں لکھی جا چکی تھیں اور خاص طور سے مشرق کے بارے میں جو بہت قدیم سے یورپیوں کے لیے ایک عجیب پراسرار سرزمین رہی ہے اور جہاں کے رہنے بسنے والوں کو ایسا لگتا ہے وہ کبھی ٹھیک سے سمجھ نہ سکے اور اہل مشرق ان کے کچھ الٹی بغض، تعصب اور کم فہمی نے ہمیشہ ان سے غلط تصویریں ہی پیش کروائیں۔ ۱۷ ویں صدی کی مغربی کہانیوں، ناولوں اور ڈراموں میں جو چند ایک مشرقی کردار نظر آتے ہیں۔ وہ سب عموماً مسخرے، بدمعاش، جلاد، چور اور ڈاکو ہیں، ۱۶۶۴ء میں کسی ایک "صہ اما" نامی شخص نے قسطنطنیہ کے وزیر اعظم اور شاہ ایران کے جاسوسوں کے پراسرار تعلقات پر ایک ایسا ہی سفرنامہ لکھا تھا جس کے مشرقی کردار بہت ہی غلط تصور کے نمائندہ ہیں۔ پھر ۱۶۸۵ء میں ولیم فرینی کی کتاب نکلی جس کا ہیرو ایک سیامی ہے جو سیاح کی حیثیت سے پیرس آتا ہے۔ اور اپنی سیر و سیاحت کے تاثرات کو قلمبند کرتا ہے۔ اس کے بعد غالباً ۱۷۱۱ء میں انگریز شاعر اور ظرافت نگار ایڈیسن نے ہندوستان کے راجاؤں کو سیاح بنا کر لندن کی سیر کرائی اور ان کی زبان سے اپنے اس وقت کے سماج پر طنزیہ حملے کئے۔ غرض اسی قسم کی طنزیہ تنقید اس وقت کے ادیبوں کا ایک عام شعار بن چکی تھی کیونکہ وہ جن حالات میں گھرے ہوئے تھے ان میں اقتداری طاقت کی روسے بچنے اور محکمۂ احتساب کی دار و گیر سے محفوظ رہتے ہوئے اپنے مقصد کی تکمیل کا یہی بہتر اور موثر طریقہ تھا۔

مانتسکیو کی نظر سے یقیناً یہ سب کتابیں گذری تھیں اور جب خود اس کے دل میں اپنے گرد و پیش کی مصنوعی دھوم دھام اور ایک کھوکھلے ماحول سے شدید بیزاری اور اکتاہٹ کا جذبہ پیدا ہوا اور اس نے اُسے آواز دینا چاہی تو یہی مناسب سمجھا کہ ایک "دل جلے" مشرقی کو فرانس کا سیاح بنائے اور اس کے ہاتھ میں طنز و مزاح کا حربہ دیکر خطوط کے پیرایہ میں اپنے سماج کی تنقید کرنا اور اپنے ہی سماج کی خرابیوں اور اس کے اونچے پن پر انگلی اٹھانا اور کھری کھری بات کہنا اول تو ممکن نہ تھا۔ دوسرے شاید یہ براہ راست انداز اس وقت اتنا موثر بھی ثابت نہ ہوتا۔ پھر مانتسکیو کے لیے تو یہ اور بھی مشکل تھا۔

اس لیئے کہ وہ خود بھی اونچی اونچی حویلیوں سے قریبی تعلق رکھتا تھا جن کی تہوں کو وہ کھولنا چاہتا تھا اور اس کا خاندان دربار کے قدیم "نمک خواروں" میں شمار ہوتا تھا۔ اس لیے بھی اس نے طنز و مزاح کو ہی اپنایا جو بلاشبہہ ایک طرف لکھنے والے ہر قسم کی گرفت اور "نظر عتاب" سے محفوظ رکھتا ہے تو ساتھ ہی زیادہ موثر انداز میں اپنے مقصد کو بھی حاصل کرتا ہے۔ عام پڑھنے والے اسے زیادہ دلچسپی سے پڑھتے ہیں کیوں کہ پہلی نظر میں وہ ان کے لیے سامان تفریح ہوتا ہے۔ مگر لطیف طنز جو اپنے اندر "تیز نمکیش" کی سی خلش رکھتا ہے یقیناً غیر محسوس طور پر بہت گہرائیوں تک اترتا ہے اور ہنسی ہنسی میں بات وہاں تک بھی جا پہنچی ہے جہاں شاید یوں گذر نہ پا سکتی اور بہت دیرپا اثرات چھوڑ جاتی ہے اور اپنے پیش رووں کے مقابلے میں مانٹسکیو کی یہی سب سے بڑی طاقت ہے کہ اس کے بات کہنے کا ڈھنگ بڑا لطیف اور خوشگوار ہے۔ اس کے اسٹائل میں بڑی دلکش "رمزیت" ہے۔ اس کے طنز و ظرافت میں کہیں بھی ایک پھکڑ باز کے ناگوار قہقہوں کا شور نہیں بلکہ بڑی معنی خیز مسکراہٹ ہے، صرف ایک ہلکا متبسم جو غیر محسوس ہوتے ہوئے بھی ہزاروں دلوں میں ایک "خلش پیہم" پیدا کر سکتا ہے۔

مانٹسکیو نے خود ایران کا سفر نہیں کیا تھا مگر یہ بھی غالباً اس کی ادبی اور ایمانداری کا تقاضا تھا کہ اس نے اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے دو ایرانیوں کا ہی انتخاب کیا جو سیاح بن کر فرانس آئے ہیں۔ کیوں کہ پورے مشرق کی طرح ایران کے بارے میں بھی اس وقت تک مغرب میں عجیب و غریب تصورات پھیلے ہوئے تھے۔ وہ ایرانیوں کو انسان کے سوا اور سب کچھ سمجھتے تھے۔ مانٹسکیو، مغربی مصنفین کے اس غیر انسانی تصور سے متفق نہیں تھا۔ سائنس اور تاریخ کے گہرے مطالعہ نے اس کے نہ ہبی اور سماجی نقطۂ نظر میں جو وسعت پیدا کی تھی اس کی بناء پر ہرگز یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ مشرقی محض "وحشی" ہیں اور تہذیب و تمدن سے یکسر عاری، غالباً اسی لیے اس نے عمداً ایرانی سیاحوں کو ہی اپنا ہیرو اور نمایندہ کردار بنا کر مغربی دنیا کے سامنے پیش کیا تاکہ وہ یہ جانیں کہ مشرق کے باسی بھی ان کی طرح انسان ہیں وہ بھی دل و دماغ رکھتے ہیں، ان کا اپنا بھی کلچر ہے، ادب ہے، تاریخ ہے اور اس میں بہت سی خوبیاں بھی ہیں۔

دوسرے یہ کہ یوں تو ایران اور فرانس کے درمیان قدیم سے تعلقات تھے مگر ۱۷۱۵ء میں لوئی چہاردہم کے آخری زمانہ میں جس ایرانی سفیر محمد رضا بیگ کی پیرس میں آمد نے ہر طرف ایک عجیب تہلکہ مچا دیا تھا اور جس کی — نہ جانے کسی کی ساختہ پرداختہ "مضحک شخصیت" عرصہ تک ہر صحبت اور محفل میں خاص و عام کی گفتگو کا موضوع بنی رہی تھی اس نے جیسے خاص طور پر از سر نو فرانس کو ایران کی طرف متوجہ کیا اور ہو سکتا ہے ایران سے اس وقت کے فرانس کی اس عام دلچسپی نے بھی مانٹسکیو کو ایرانی سیاحوں کے ہی انتخاب پر ابھارا۔ چنانچہ اپنے ایک خط میں ۱۷۱۵ء کے اس "ہنگامہ خیز" واقعہ کا بھی اس نے دلچسپ طنزیہ انداز میں خود ار بیگ کی زبانی ذکر کیا ہے۔

نیز اس سے کچھ ہی پہلے ۱۷۱۱ء میں شاردین کا "سفرنامۂ ایران" بھی شائع ہو چکا تھا جو ان تمام کتابوں میں جو اس وقت تک ایران کے بارے میں لکھی گئی تھیں بہت دلچسپ اور عالمانہ کتاب تھی بقول کسے اس نے ایران کے بارے

میں کوئی ایسی بات نہیں جو نہ کہی ہو۔ "تاورنیسے" وغیرہ دوسرے تاجر سیاحوں کے برعکس شاردین پہلا مصنف تھا جس نے اپنے مشاہدات کو صرف چند شہروں، قصبوں اور دیہاتوں کے ذکر تک محدود نہیں رکھا بلکہ وہاں کے "لوگوں" کی طرف توجہ کی اور ان کی روح کے اندر بھی جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی اہل ایران کے بارے میں مغربیوں کے جو قدیم تعصبات تھے ان کو بھی ایک حد تک توڑا۔

مانٹسکیو نے ایران کی تاریخ، رسم ورواج، عادات و اخلاق، خواصوں اور خواجہ سراؤں کی زندگی سے متعلق اپنا پورا مواد شاردین کے اسی سفرنامہ سے لیا ہے مگر اس کی نمایاں خصوصیت یہی ہے کہ وہ اس سب کو زیادہ روادارانہ انسانی نقطۂ نظر کے ساتھ اپنے طرز میں کچھ اس طرح نکھار کر پیش کرتا ہے کہ اس میں ایک نئی تازگی اور شگفتگی پیدا ہوگئی ہے جو پڑھنے والے کو اپنے میں جذب کر لیتی ہے۔ خاص طور سے "حرم سرا" کے ماحول اس کی فضا اور اس میں جینے والوں کی پیچیدہ نفسیات کو اس نے جس طرح اجاگر کیا ہے اس کی یہ ظاہر ہلکی پھلکی ظرافت کے پیچھے بہت گہری علمیت پوشیدہ ہے۔

دنیا کے مختلف گوشوں سے پرکھ کر لائی ہوئی "حسیناؤں" کے ناز و انداز، ان کے مختلف مشاغل، ان کی دلچسپیوں، کھیل تفریح، ان کے شوق، رشک و رقابت، دھوکا فریب، مزاج طبیعت، سب کو مانٹسکیو ایک مخصوص انفرادی انداز سے بیان کرتا ہے اور ایک عجیب ماحول میں گھری ہوئی مختار مگر مجبور عورتوں کی ذہنی اور نفسیاتی الجھنوں اور متضاد کیفیتوں کو اس نے حس فن کارانہ نظر سے دیکھا ہے۔ اور ان کی جیسی بھرپور تصویریں ابھاری ہیں اس میں ایک مخصوص طبقہ کی عورتوں کے بارے میں مانٹسکیو کے اپنے ذاتی مشاہدہ اور تجربہ کو بھی بہت دخل معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ فرانس کی اس وقت کی ایک اعلیٰ سوسائٹی اور ایران کے شاہی "حرم سرا" میں کوئی زیادہ بنیادی فرق نہیں تھا۔

حرم سرا کی "داخلی دنیا" میں پابند و مجبور کنیزوں سے اس نے جو خط لکھوائے ہیں وہ ان کے ذہنی اور اخلاقی خدوخال کے واقعی نمائندہ ہیں اور ان کے طنز و مزاح میں بڑا گہرا غم چھپا ہوا ہے جو اس غیر فطری، غیر انسانی زندگی کے خلاف یقیناً ایک خاموش احتجاج ہے۔ ان کی تسکاتیں، ان کی جھنجھلاہٹیں، ان کا چڑچڑا پن حتیٰ کہ ان کے ہنسی مذاق، ان کی دلگیاں بھی جیسے بے بسی کی ایک تیز چیخ ایک دل دوز فریاد ہے جو ہر بند حرم کو توڑ دینا چاہتی ہے لیکن "اونچی دیواروں" سے ٹکرا کر جیسے پھر وہیں لوٹ آتی ہے۔

فاطمہ کے سینہ میں کتنا محبت بھرا دل ہے۔ ازبیک کے نام اس کی تحریریں کیا ہیں گویا وفا و محبت کی ایک دنیا ہے۔ مگر حرم سرا کا "سناٹا" بالآخر اس کے ہر انسانی جذبہ کو کچل دیتا ہے اور پھر وہ سوائے اپنے جذبات کی بہیمانہ تسکین کے اور کچھ نہیں چاہتی۔

سمجھدار اور سنجیدہ ذکی بھی حرم کی دم گھٹانے والی فضا سے اکتا کر اپنی فطری تشنگی کو بجھانے کی فکر میں سب کچھ بھول جاتی ہے خود اپنے لیے سامان رسوائی فراہم کرتی ہے۔ اور جب "اخلاق کے پاسبانوں" سے سزا پاتی ہے تو پھر ایک تابع

فرمانبردار "کنیز" بن جاتی ہے۔ جیسے اس کی اپنی شخصیت اپنی "انا" مرچکی ہو۔ انسانی زندگی کا اس سے بڑھ کر المیہ کیا ہو سکتا ہے اور وہ نازک اندام نفیس جو اتنی منکسر مزاج، نرم و نازک، مطیع و فرمانبردار نظر آتی ہے۔ وہی نفیس اپنے محافظ غلام جلیس سے تعلق رکھتی ہے۔ حرم کی سازشی فضا نے اسے بھی اس فن میں ماہر بنا دیا ہے اور وہ بڑی کامیابی سے "دوہرا کھیل" کھیلتی ہے۔ اور رخسانہ! وہ معصوم باحیا رخسانہ! جس کی معصومیت "اور" پاکیزگی" پر ازبیک کو ناز ہے، جس کا ذکر اپنے ایک خط میں اس نے بڑے فخریہ انداز میں کیا ہے۔ وہ حسین و جمیل رخسانہ! جو اپنے آقا کی منظورِ نظر ہے، جو آخر تک انتہائی فرض شناس اور وفا شعار نظر آتی ہے۔ وہی رخسانہ سب سے زیادہ چالاک اور تیز نکلتی ہے۔ کہ ایک عرصہ تک خواجہ سراؤں کو بھی اس کے عاشق کا پتہ نہیں چلتا اور جب بالآخر یہ راز فاش ہوتا ہے۔ اس کا چاہنے والا مار ڈالا جاتا ہے تو وہ بھی زہر کھا لیتی ہے۔ لیکن مرنے سے پہلے اس نے ازبیک کو جو خط لکھا ہے اس کے ایک ایک لفظ میں شدید غصہ اور نفرت کا جوہر چھپا ہوا ہے کیا وہ حرم سرا کے اس پورے نظام کے خلاف ایک شدید احتجاج کا نمائندہ نہیں؟

غرض اس قسم کے خطوط کے ذریعہ مانٹسکیو نے اس غیر فطری زندگی سے اور اس سے پیدا ہونے والی لازمی برائیوں کو اپنے مخصوص ہلکے پھلکے انداز میں بہت خوبصورتی سے ابھارا ہے کہ ان مجبور حسیناؤں کی وفاداریاں، ان کی نام نہاد فرمانبردارانہ اطاعت، جاں نثاری، اور اپنے آقا سے محبت و چاہت کے بلند بانگ دعوے۔ وہ سب کیا ہیں؟ ایک "دست تہہ سنگ آمدہ پیمان وفا" ہی تو ہیں۔ اسی کے ساتھ خواجہ سراؤں کی انتہائی غیر فطری زندگی، ان کی لاحاصل تمناؤں، محزون، بے چینیوں، بے معنی شادیوں، ان کی سختیوں، ظلم اور جبر اور گوناں گوں پوشیدہ کیفیات کو بھی مانٹسکیو نے خطوں کے ذریعہ بڑے لطیف پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ خاص طور سے وہ خط جو اس نے خود خواجہ سراؤں سے لکھوائے ہیں ان کے طنز و مزاح کے پیچھے بھی بہت گہرا غم چھپا ہوا ہے۔ جس سے لکھنے والے کی گہری نظر کا پتہ لگتا ہے۔ اس سے ہٹ کر عام ایرانی اخلاق و عادات، روایتی اور مذہبی اختلافات پر بھی مانٹسکیو اکثر جگہ چوٹ کرتا ہے مگر بحیثیت مجموعی ایران کے بارے میں اس نے جو کچھ بھی لکھا ہے اس میں وہ ہر جگہ بہت متحاط اور سنبھلا ہوا نظر آتا ہے۔ جیسے اسے اندیشہ ہے کہ کہیں اس کے قلم سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جس سے اس کی ایمانداری اور بے تعصبی پر حرف آئے۔ لیکن اس کے برعکس جب وہ اپنے ملک اور سماج کے بارے میں قلم اٹھاتا ہے تو جیسے ہر احتیاط سے اپنا دامن چھڑا لیتا ہے۔ اور ہر بندش سے بے پروا ہو کر اپنے گرد و پیش کی گراوٹوں پر کڑی نظر ڈالتا ہے۔ دربار سے لیکر کلیسا تک کوئی چیز اس کے طنز سے نہیں بچتی۔ اپنی اوچھی محفلوں جھوٹی شان و شوکت، مصنوعی انداز، سختی، حرص، ہوس، غیر ضروری غصہ نفرت، بے مایہ شوق، فضول ادبی حماقتوں، بغیر سوچے سمجھے لکھنے اور بغیر سمجھے تنقید کرنے کی عادت، سستے مذاق، اوچھی گفتگو، غرض اپنے چاروں طرف کی ان تمام چیزوں پر جو اس کی نظر میں کھٹکتی ہیں وہ اپنے ایرانی سیاحوں کی زبان سے خطوں کے روپ میں بے رد و ک

حملے کرتا ہے اور بڑے بے رحمانہ انداز سے ان پر تنقید کرتا ہے لیکن متانت اور شرافت کی حدوں سے کہیں باہر نہیں ہوتا، وہ ہر چیز کا مضحکہ اڑاتا ہے، ہنستا ہے، طنز کرتا ہے مگر اس کی ہنسی طنز اور مزاح میں کسی کو رسوائے زمانہ بنانے یا کسی پر جھوٹا بہتان باندھنے کا پہلو ہرگز نہیں۔ اس کے مشرقی ہیرو پورے فرانس میں بالکل آزادانہ گھومتے ہیں۔ اور بے خوف وخطر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہیں۔ جو حقیقت سے کسی قدر دور ضرور ہے کیوں کہ اس زمانہ میں بیرونی سیاحوں پر فرانس میں جو پابندیاں تھیں اس کی بنا پر ان کا اس طرح بے روک ٹوک ہر جگہ پہنچنا اور جو چاہیں کہنا ممکن نہ تھا لیکن چونکہ مانٹسکیو اپنے سماج کے ہر پہلو پر نظر ڈالنا چاہتا ہے اس غالباً اس نے اتنی ادبی جرأت سے کام لینا ضروری سمجھا کہ اپنے سیاحوں پر کسی قسم کی پابندی نہ لگائے۔ چنانچہ مانٹسکیو کے ایرانی ہیرو پورے فرانس میں یوں گھومتے ہیں جیسے وہ ان کی اپنی ملکہ ہو، محلوں میں، باغوں میں، شاہی ضیافتوں میں، ادبی محفلوں میں "معزز خواتین" کے دیوان خانوں میں شبستانوں میں، گرجاؤں میں، بازاروں میں، گلیوں میں۔ وہ ہر جگہ پہنچتے ہیں اور قدم قدم پر گویا ان کے لیے ایک دنیائے حیرت داستعجاب موجود ہے، لوگوں کا ہجوم، کاروبار کی ہماہمی، تھیٹر، کھیل تفریح، اوپیرا۔ ہر چیز ان کے لیے ایک حیرت کدہ ہے کیوں کہ یہ دنیا ان کی دنیا سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں کے طور طریقے، آداب محفل عقائد خیالات سب ان کے لیے نئے ہیں اور گو بہت کچھ انہیں اپنے نقطہ نظر سے غلط اور غیر اخلاقی معلوم ہوتا ہے پھر بھی وہ متانت اور رواداری سے اس پر تنقید و تبصرہ کرتے ہیں۔ صرف اشیاء اور واقعات کو ہی نہیں دیکھتے بلکہ ان کی روح تک بھی پہنچنا چاہتے ہیں اور انھیں ہر پہلو سے سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح مانٹسکیو نے گویا اپنے سیاحوں کے بلند کردار اور ان کی عالی ظرفی کو بھی ابھارا ہے اور یہ بتایا ہے کہ مشرقی بھی جن کو اہل مغرب وحشی سمجھتے ہیں بلند کردار رکھتے ہیں اور ان میں بھی سوچنے سمجھنے اور اچھے برے کی تمیز موجود ہے۔ وہ صرف سطح بیں نہیں۔

البتہ مذہب کے معاملہ میں مانٹسکیو بہت بے باک نظر آتا ہے۔ وہ کسی مذہب کی بھی طرفداری نہیں کرتا اور ہر مذہب کے ٹھیکہ داروں پر اس نے بہت سخت حملے کئے ہیں خاص طور سے کیتھولک مذہب کے "پرانے خداؤں" کا تو اس نے دل کھول کر مذاق اڑایا ہے اور نام نہاد اخلاق کے علمبرداروں کے خلاف اس کی آواز میں بڑی تیز تلخی ہے، وہ مقدس ہستیاں جنھیں نہ اپنی قسموں کا پاس ہوتا ہے نہ انسانی شرافت و پاکیزگی کا لحاظ اور پھر بھی سمجھتی ہیں کہ ان کی جگہ آسمانوں پر یسوع مسیح کے پہلو میں ہے۔ اسی طرح وہ ادیب جنھیں کچھ کہنا نہیں مگر کتابوں پر کتابیں لکھے جاتے ہیں اور "فلاسفر" جو جانتے بوجھتے کچھ نہیں مگر زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں۔ وہ ان سب پر بھی خوب چوٹ کرتا ہے ان کا مضحکہ اڑاتا ہے۔ مگر کہیں بھی وہ انسانی کمزوری کی تہوں کو کرید کر غلاظت نہیں گھسیرتا نہ خامیوں کو محض اس لیے تلاش کرتا ہے کہ اپنی ظرافت کا اظہار مقصود ہے بلکہ وہ "احمقوں" کو صرف چھیڑتا ہوا گذر جاتا ہے اور اپنی ایک طنزیہ ہنسی ایک لطیف تبسم سے انھیں چونکا کر خود انجان بن جاتا ہے یہی اس کے طنز کا کمال ہے اور مقبولیت اور شہرت کا راز۔ اسی وجہ سے اس کی تنقید "تباہ کن" نہیں بنتی اور غالباً یہی "اولیت"

تھی۔ جن کی بناء پر والیٹر بھی مانٹسکیو پر رشک کرتا ہے۔

مانٹسکیو نے تاریخ اور سائنس کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا یہی وجہ ہے کہ وہ مذہبی تعصبات توہمات اور غیر عقلی تصورات سے بہت گھبراتا ہے اور بعض اخلاقی مسائل پر اس کا نقطۂ نظر فلسفیانہ اور تعمیری تو خیر نہیں کہا جا سکتا مگر ایک مخصوص ردِ عمل کا اظہار ضرور کرتا ہے اور اپنی حد تک واضح اور روشن بھی ہے۔ مثلاً اس وقت کے شہری اور مذہبی قانون کے برخلاف اس کا خیال ہے کہ خودکشی کو قانونی جواز ملنا چاہیے اور اسی کا استدلال یہ ہے کہ:

"سوسائٹی کی بنیاد باہمی فائدے پر ہے لیکن جب وہ میرے لیے ایک بوجھ بن جائے تو مجھے اس سے نجات پانے سے کون روک سکتا ہے اور کیوں روکے؟ اگر میری روح میرے جسم سے جدا ہوتی ہے تو کائنات کی تنظیم و ترتیب میں اس سے کیا خلل واقع ہوتا ہے؟ اس کا کیا نقصان ہوتا ہے؟ میرا جسم ایک گیہوں کی بالی، ایک گلاس ایک کھیت تو نہیں ——"

(خط ۷۶ و ۷۷)

اسی طرح وہ اس وقت کے مروجہ قانون طلاق کو بھی بدلنے اور اس کے آزاد حق کو ماننے پر زور دیتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں دل کو بھی تعینات کی حدوں میں قید کر دیں۔ دل! جو قدرت کی سب سے زیادہ متنوع اور انتہائی غیر مستقل "صنعت" ہے۔ وہ دو مغلوب شخصیتوں کو بغیر باہمی رضامندی اور خوشی کے ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے باندھے رکھنا چاہتے ہیں۔ دو دلوں کو جو کسی چیز میں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتے زبردستی ایک "مصنوعی رشتے" کا پابند بنانا چاہتے ہیں۔ جیسے کوئی ظالم محض اپنی ذاتی خوشی کے لیے زندہ انسانوں کو مردہ جسموں سے باندھ رکھے۔ اف اس قدر بے جان رشتہ ہے! اور آخر کیوں! شادی کا معاہدہ، جو دو دلوں کی اپنی آزاد خوشی کا معاملہ ہے یوں ان کے پیروں کی زنجیر کیوں بنے؟

پھر اسی ضمن میں مانٹسکیو نے "کمی آبادی" کے سوال کو اٹھایا ہے جو اس وقت تمام اخلاقیین اور سوشیالاجسٹ کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ان کی آزمایش کر رہا تھا۔ اور اس پر مانٹسکیو نے بڑے جوش و خروش سے کئی خطوں میں بحث کی ہے۔ اور ایک طرف قدرتی حادثات ہیں۔ سانحے ہیں جو انسانی آبادی کی تباہی کا باعث بنتے ہیں تو دوسری طرف انسانی ہوس کی احمقانہ بے راہ روی ہے جو انسانی نسل کی پیدایش کو روکتی ہے۔ ایک طرف حرم سرا کی چار دیواری میں بند سینکڑوں حسین عورتیں ہیں۔ جو شاذ و نادر ہی ماں بنتی ہیں اور ہزاروں خواجہ سرا جو اپنی جنس کے لحاظ سے مردہ ہیں دوسری طرف یہ مقدس مذہبی رہنما" جنھوں نے طلاق کے حق پر پابندی لگا رکھی ہے اور یہ ان کے "خواجہ سرا" پادری' بشپ اور جانے کون کون اس پر مستزاد مذہبی جنون جو قوم کے بہترین افراد کا بیجھا کر رہا ہے اور لاکھوں انسانی جانوں کی تباہی کے سامان فراہم کر رہا ہے کیا کیا جائے؟ اس کا حل ہو تو کیسے؟"

اور جہاں کہیں اس قسم کے کچھ سنجیدہ سوالات آئے ہیں وہاں ہم دیکھتے ہیں کہ ہنستے کھیلتے گذر جانے والا مانٹسکیو تھوڑی دیر کے لیے ایک بڑا مفکر بن جاتا ہے وہ ان کا مذاق نہیں اڑاتا بلکہ بڑی سنجیدگی سے ان پر سوچتا نظر آتا ہے

اور ایک "قومی مصلح" کی طرح ان کا حل بھی تلاش کرنا چاہتا ہے جو ہو سکتا ہے آج ہمیں بر خود غلط یا ایک حد تک غیر عقلی معلوم ہو لیکن اس میں ہم اس وقت کے حالات کے ایک مخصوص ردعمل کی جھلک ضرور دیکھ سکتے ہیں۔

لوئی چہاردہم نے فرانس کو جہاں پہنچا دیا تھا اور اس کے بعد ہر طرف جو افراتفری لوٹ مار مچی تھی آئے دن کے ٹیکسوں کی بھرمار سے قومی معیشت جس طرح تباہ ہو رہی تھی غلط تاثرات پھیلا کر عوام کو جس طرح لوٹا جا رہا تھا اس پر مانتسکیو کا حساس دل واقعی دکھتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ کہیں کہیں اپنی قوم کی اس بدحالی پر اس میں مذاق کرنے کی بھی نکت نہیں۔ تاہم اس کے مزاج کا یہ "موڈ" بہت گریز پا ہے۔ یہ "موڈ" زیادہ دیر نہیں ٹھیرتا اور بہت جلد خود اس سے اکتا کر پھر ہنستے کھیلتے گذر جانے میں ہی اپنے دل و دماغ کی نجات دیکھتا ہے۔

غرض مانتسکیو نے اپنے ایرانی سیاحوں کے ذریعہ طنز و مزاح کے ملے جلے پیرایہ میں اپنے ملک اور سماج کے تقریباً ہر رخ کو بے نقاب کیا ہے اور ایرانی زندگی کے ایک مخصوص حلقے کی بھی اچھی عکاسی کی ہے مگر مجموعی حیثیت سے میرا خیال ہے کہ اس کی تنقید میں تعمیری پہلو بہت کم نمایاں ہے۔ بلاشبہ وہ اس وقت کے اپنے اور پرائے سماج کی تہہ بہ تہہ برائیوں اور گراوٹوں کو سامنے لاتا ہے مونارکی کو ایک "لازمی برائی" بھی سمجھتا ہے۔ ری پبلک کے تصور کا دل سے حامی ہے مگر پھر بھی جیسے اپنے ماحول سے دامن نہیں چھڑوا سکتا اور اپنی فکر کے آئینہ میں جو عکس دیکھتا ہے اس کے واقعی اسباب کا ٹھیک پتہ نہیں چلا سکتا اس طرح اس کی تنقیدی نظریں اثباتی پہلو واضح طور پر ابھرنے نہیں پاتا اور طنز و مزاح کا ہی رنگ غالب رہتا ہے۔ اور اس وقت شاید یہ ممکن بھی نہ تھا پھر بھی اس کے "مکتوبات فارسی" نے فرنچ سوسائٹی پر جو اثر ڈالا اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ازبیک کا خط اپنے دوست رستم کے نام

ارض روم ۲۰ جمادی الثانی ۱۷۱۱ء

پیارے دوست!

تمہارا خط مجھے ارض روم میں ملا جہاں ہم آج کل مقیم ہیں

مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ میرے اس "اقدام" سے وہاں ایک ہل چل مچ جائے گی۔ لیکن مجھے اس کی پروا نہ تھی۔ تم کیا چاہتے ہو؟ میں اپنے دشمنوں کی "مصلحت اندیشیوں" پر عمل کروں یا اپنی؟

تم تو جانتے ہو جس وقت میں درباریوں میں داخل ہوا، مجھے یہ اعزاز" عطا کیا گیا، میں ابھی بہت کم سن تھا۔ میرے دل پر ابھی کسی برائی کا رنگ نہیں لگا تھا، میرا تصور بھی بے لوث تھا اس پر طرہ یہ کہ میں تازہ گرفتار اپنی معصومیت میں ایک

بلند مقصد کو بھی اپنا بیٹھا۔ یعنی میں نے نیک اور "راست باز" رہنے کی جراءت کی۔ میری حق پسند نظروں نے جہاں کہیں برائی اور ناانصافی کو دیکھا صرف یہی نہیں کہ اپنے کو اس سے دور رکھا بلکہ اسی کو دوسروں پر بھی آشکارا کرنے کی کوشش کی۔ حتیٰ کہ حضور شاہ میں بھی میں نے حق اور سچائی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ میری "سچائی" ایسی زبان میں گفتگو کرتی تھی جو آداب دربار کے منافی تھی، جس سے اب تک وہاں کوئی واقف نہ تھا۔ میں نے خوشامد اور چاپلوسی کے پردے چاک کئے اور قدم قدم پر "مصنوعی خداؤں" کی پرستش کرنے والوں کو اپنی بے باکی اور جراءت سے حیرت میں ڈال دیا۔۔۔

لیکن جب میں نے دیکھا۔ میرے خلوص اور سچائی نے صرف میرے دشمن ہی پیدا کئے، میری حق دوستی نے مجھے الٹا وزیروں کے شکمے حسد کا نشانہ بنا دیا اور میں شاہزادہ کا لطف و کرم بھی حاصل نہ کر سکا۔ جب میں نے محسوس کیا کہ دربار کی سازشوں اور فتنہ طرازیوں کے بیچ میں محض اپنے نیکی کے سہارے نہیں جی سکتا تو میں نے اس سے الگ ہو جانا ہی مناسب سمجھا۔ مگر یہ بھی تو اتنا آسان نہ تھا۔ تاہم میں نے کسی نہ کسی طرح سائنس علوم و ادب سے گہری دلچسپی کے بہانے ان جھمیلوں سے کچھ نجات حاصل ہی کر لی اور دربار کے ہنگاموں سے کنارہ کش ہو کر ایک گوشہ میں جا بیٹھا، مگر وائے نصیب! یہ گوشہ نشینی بھی تو میرے لیے کوئی سامان تسکین نہ فراہم کر سکی۔ مجھے یہاں بھی چین نہ ملا۔ دشمنوں نے یہاں بھی میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ میں اب بھی ہر دم دشمنوں کی بدخواہیوں کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ میں ان کی نظروں میں کھٹک رہا تھا۔ میری سلامتی ہر وقت خطرہ میں تھی۔ میری "نیکیاں" جیسے خود میری زنجیریں بن رہی تھیں۔ بالآخر جب حاسدوں کی کچھ پوشیدہ مشر انگیزیوں کی خبر مجھ تک پہنچی تو مجھے سنجیدگی سے سوچنا ہی پڑا۔ اور مجھے سوائے اس کے اور کوئی راستہ دکھائی نہ دیا کہ اپنے عزیز وطن کو ہی خیرباد کہہ دوں اور اس سے دور کسی دوسری دنیا کی سیر کروں۔۔۔ تم ہی بتاؤ میں اس کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔

چنانچہ بڑی ہوشیاری اور دانشمندی سے کام لیکر میں نے دربار سے اپنا دامن چھڑایا۔۔۔ بادشاہ سلامت کب مجھے چھوڑتے تھے۔ مگر میں خود ان کے حضور میں گیا اور دست بستہ ان سے اپنی دلی خواہش کا اظہار کیا کہ میں مغربی علوم کی تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہوں جس کا تمام فائدہ ظاہر ہے حضور والا کو ہی پہنچے گا۔ اس سے حضور اقدس کا ہی اعزاز بڑھے گا ان کی شان و شوکت میں اضافہ ہوگا، دنیا میں ان کا نام بلند ہوگا۔۔۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر بات بن گئی۔ میری عاجزی اور انکساری نے شاہ کی نظروں میں میرا وقار بڑھا دیا۔۔۔ مجھے اجازت مل گئی اور میں فوراً حسین و جمیل کنیزوں، نوکر چاکر سب کچھ چھوڑ کر چل پڑا۔ اس طرح دشمنوں کے ہاتھ سے گویا ایک بڑا شکار نکل گیا تو وہ کیوں نہ تلملائیں؟

تو یہ ہے رستم! میرے سفر کا اصلی سبب۔۔۔ اصفہان کو جلانے دو، مجھے اس کی پروا نہیں اور میں کسی کے سامنے اپنی صفائی بھی پیش کرنا نہیں چاہتا سوائے ان چند کے جو مجھے واقعی عزیز ہیں۔ میرے مخالفین جو چاہیں سمجھیں، جیسی چاہیں

تاویل کریں۔ افواہیں پھیلائیں، میری بلا سے، میں خوش ہوں کہ وہ اب اس سے زیادہ میرے حق میں کوئی اور برائی نہیں کر سکتے، میں ان کی دسترس سے باہر ہوں اور پھر اس "شور" کی زندگی ہی کتنی ہے؟ — میں خوب جانتا ہوں — آج ہر زبان پر میرا ذکر ہے، میرے لیے جیسے ہر کوئی مضطر و پریشان ہے۔ جیسے سب ہی میری "بے وطنی" کی فکر میں گھلے جا رہے ہیں — لیکن تم دیکھنا بہت جلد وہ مجھے بھی فراموش کر دیں گے۔ کوئی "نیا واقعہ" ان کی نظروں کو اپنی طرف کھینچ لیگا اور وہ یہ سب کچھ بھول جائیں گے۔ مگر میرے مخلص دوست" — ؟ کیا وہ بھی مجھے بھول جائیں گے؟ نہیں رستم میں اس جان کا بھروسہ کو بھی اپنے ذہن میں نہ آنے دوں گا۔ یہ کیسے ممکن ہے! مجھے یقین ہے ان کی نظروں میں، میں ہمیشہ عزیز رہوں گا مجھے ان کی وفا شعاری" پر اتنا ہی اعتماد ہے جتنا تم پر — خدا حافظ — "ازبیک"

صدر خواجہ سرا کا خط ابّی کے نام

اصفہان کے محل سے ماہِ صفر — ۱۱۷۱ھ

تو خوش نصیب ہے کہ تجھے اپنے پرانے آقا کی صحبت نصیب ہے! تو اس کے سفر میں شریک ہے اور اس کی ہمراہی میں مختلف سلطنتوں اور ریاستوں کی سیر کر رہا ہے! — ہر طرح کی فکر اور رنج و آلام سے دور — ہر لمحہ تیری نظر میں نئے نئے حسین مناظر اور دلکش انوکھی چیزوں سے لطف اندوز ہوتی ہیں۔ تجھے وقت کے گذرنے کا احساس بھی نہ ہوتا ہوگا۔ تیری خوش بختی پر کون ناز نہیں کر سکتا!

اور میں بدنصیب! یہاں اس خوفناک حصار میں گھرا ہوا جیسے "محبس" میں بند ہوں جہاں کوئی بات، کوئی چیز نئی نہیں، ہمیشہ ایک ہی منظر، وہی چیزیں، وہی رنج و غم، شکایتیں اور پریشانیاں! نصف صدی کی لاتعداد ہی بے چینیوں، اضطراب الجھنوں اور ناگوار فرائض کے بھاری بوجھ تلے میرا رواں رواں کانپتا رہتا ہے، ہر دم مجھ پر ایک عجیب سا خوف طاری رہتا ہے۔ ایک نامعلوم دہشت ہے۔ اس طویل درباری زندگی میں کبھی ایک دن بھی تو چین کا سانس نہ لے سکا، کبھی ایک لمحہ بھی تو ایسا نصیب نہ ہوا جسے میں پرسکون اور مطمئن کہہ سکوں جس وقت میرے آقا نے مجھ پر یہ "عنایت خاص" فرمائی کہ اپنے حرم کو میری تحویل میں دیا، مجھے "حرم سرا" کے سفید و سیاہ کا مالک بنایا تب ہی سے گویا مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے کو خیمہ کہنا پڑا، میری زندگی جیسے اپنی آخری منزل کو جا پہنچی — اور میں نادان! میں نے سمجھا اُن انتہائی تکلیف دہ اور ناگوار فرائض میں گرفتار — ہیں تمام آرزوؤں، خواہشوں اور ہیجان جذبات سے نجات پا جاؤں گا اور اپنی تمناؤں کی قربانی دیکر ایک طرح کا سکون قلب پالوں گا۔ مگر وائے نصیب! یہ امید بھی بر نہ آئی۔

مجھے کامل یقین تھا کہ جس جذبہ کو مطمئن کرنے کی مجھ میں طاقت نہیں، جو چیز مجھ سے چھینی جا چکی ہے اس سے محرومی میں اب کوئی آرزو یا خواہش مجھ پر غلبہ نہ پا سکے گی۔ مگر افسوس! انھوں نے تسکین آرزو کے ذریعہ کو تو برباد کر دیا لیکن

آرزوؤں اور خواہشوں کو نہ مٹا سکے ۔ اور من سے نجات پانا تو درگذر ۔ میں نے الٹا اپنے آپ کو ایسے حالات اور چیزوں میں گھرا ہوا پایا جو ہر دم میری آتش ہوس کو اور بھڑکاتی ہیں ۔

میرا نصیب! کہ سرداری بھی ملی تو کہاں کی ۔۔۔ وہ "حرم سرا" جس کے دلکش نظارے اور توبہ شکن مناظر نے میرے "احساس محرومی" کو جیسے اور تازہ کر دیا ، لازماً میری بے تابیاں اور بڑھ گئیں، ہزاروں حسین جسم، سینکڑوں دلفریب جادو، عشوہ و انداز اور بے پناہ شوخیاں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے صرف مجھے تڑپانے اور ترسانے کے لیے میری تحویل میں دے گئے ہیں اور اس پر ستزاد میرے "فرائض" اور "ذمہ داریاں" کہ دنیا کی نظروں میں مجھے ہمیشہ اپنے آپ کو انتہائی مطمئن اور "بے نیاز" ہی ظاہر کرنا پڑتا تھا ۔ آہ! دوست! تم نہیں جان سکتے، اس وقت ان الجھنوں میں گرفتار، شوق کی ناسپاسیوں سے مجبور جب مجھے کسی حسینہ کو اپنے آقا کی خوابگاہ تک پہنچانا پڑتا تو میرے دل کی کیا کیفیت ہوتی تھی ۔ میری روح یاس و حرمان کے کیسے ناقابل برداشت اندھیروں میں ڈوب جاتی تھی ..... تو جانتے ہو دوست! یوں ایک مستقل کرب و اضطراب کے عالم میں مجھ بدنصیب نے اپنی جوانی کے دن گذارے ۔ اور میرا کوئی ہمدم و ہمراز بھی نہ تھا، سارے رنج و غم میری اکیلی جان کو ہی سہنا پڑتے تھے میں کسی کے سامنے زبان تک نہ ہلا سکتا تھا کسی کو اپنی داستان غم نہ سنا سکتا تھا ۔ حتیٰ کہ خود ان "حسیناؤں" سے جن کے لیے اس وقت میری نظروں میں بے پناہ نرمی اور تمنا تھی ۔ مجھے مصلحتاً سختی اور درشتی کا ہی برتاؤ کرنا پڑتا تھا ۔ اپنے ہیجان جذبات کو چھپانے کے لیے ۔ کیوں کہ خدانخواستہ اگر انھیں میری کیفیتوں کا ذرا سا بھی پتہ چل جاتا تو سمجھ لو وہ میری موت ہی ہوتی وہ اس سے کتنا کچھ فائدہ نہ اٹھاتیں ۔

مجھے وہ دن آج بھی یاد ہے جب ایک بار ایک حسینہ کے ساتھ تنہائی میں جانے کیسے صرف ایک ثانیہ کے لیے میں اپنے کو بھول بیٹھا ۔ اور غیر ارادی طور پر میرے مجبور ہاتھ نے شاید صرف اس کے جسم کو چھو لیا ۔۔۔ جانتے ہو اس وقت جو پہلا خیال میرے ذہن میں آیا کیا تھا! مجھے یوں لگا جیسے وہ میری زندگی کا آخری دن ہے جیسے اب کوئی طاقت مجھے "اس گناہ عظیم" کے عذاب سے نہیں بچا سکتی ۔

تاہم، خوش نصیبی کہو یا بدنصیبی میں ایک خوفناک موت سے تو بچ گیا لیکن اس کی مجھے کتنی بڑی قیمت دینا پڑی، اف! اس کمبخت حسینہ نے جو میری "انسانی کمزوری" سے واقف ہو چکی تھی اپنی خاموشی اور "اخفائے راز" کے لیے مجھ سے بہت بھاری قیمت وصول کی ۔۔۔ اس پر میرا کوئی اثر باقی نہ رہا وہ بالکل ہی میرے قبضہ سے نکل گئی ۔ اب مجھے اس کے ہر "وہم" ہر بے جا خواہش اور تصور کی بے چوں وچرا تعمیل کرنی پڑتی تھی ۔ میں گویا اس کے ہاتھ کا کھلونا بن گیا تھا، وہ جیسے چاہتی مجھ سے کام لیتی اور میں مجبور تھا، کچھ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کی ذرا سی بھی عدول حکمی میرے لیے سامان موت فراہم کر دیتی ۔

لیکن شکر خدا کا! بالآخر جوانی کا شعلہ بجھ گیا، وہ جوشِ شباب ختم ہو گیا، اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور زندگی کی اس منزل پر میں اب اپنے اندر ایک طرح کا ٹھیراؤ اور "سکوت" محسوس کرتا ہوں۔ میرے جذبات کی آگ سرد پڑ چکی ہے۔ اب میں ان ظالم حسیناؤں کو ان کے قاتل عشوؤں کو بڑی بے رحمی اور لاپرواہی سے دیکھتا ہوں، ان کا بے پناہ حسن اب میرے اندر کوئی جذبہ نہیں ابھارتا، کوئی خواہش اور ہیجان نہیں پیدا کرتا اب میں ان کی خواہشوں اور تمناؤں کو بڑی بے دردی سے کچل سکتا ہوں اور ان تمام اذیتوں کا جو اب تک ان کے ہاتھوں مجھے پہنچی ہیں دل کھول کر بدلہ لے سکتا ہوں اور کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی اس بات کو فراموش نہیں کرتا کہ میں حکم چلانے کے لیے پیدا ہوا ہوں۔ میری مجبور زندگی کا مقصد یہی ہے۔ سچ پوچھو تو اپنی "مردانگی" کے احساس کو باقی رکھنے کا یہی تو ایک ذریعہ میرے پاس ہے اور جب میں ان پر حکم چلاتا ہوں تب ہی تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں "مرد" ہوں ــــ اور اب کہ میرے خون کی گرمی اور حرارت ختم ہو چکی ہے میں انہیں بڑی سرد مہری اور نفرت کی نظروں سے دیکھتا ہوں۔ میرے تجربہ اور ہوشمندی کی نظر ہر وقت ان کی کمزوریوں پر رہتی ہے میں ان کی مجبوریوں کو کبھی خاطر میں نہیں لاتا۔ جانتا ہوں میں کسی اور کی طرف سے ان کا محافظ ہوں، ان کی "نیکیوں" کا پاسباں، ان کا معزز آقا اور مالک کوئی اور ہے۔ جس کا میں بھی ایک خادم ہوں۔ پھر بھی ان سے جا و بیجا اپنی فرمان برداری کروانے میں مجھے ایک عجیب طرح کی مسرت ملتی ہے۔ جب میں انہیں ہر چیز سے محروم رکھتا ہوں، ان کی ہر خواہش کو بے دردی سے ٹھکرا دیتا ہوں تو جیسے میری "حیوانیت" غیر معمولی تسکین پاتی ہے، مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہ سب کچھ میرے لیے ہے اور بالواسطہ طور پر میری روح اس سے ایک طرح کی طمانیت حاصل کرتی ہے۔ کم از کم تھوڑی دیر کے لیے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ محل، حرم سرا، اس کا سارا حسن میری سلطنت، میری قلمرو ہے! میں ہی اکیلا اس کا مالک ہوں، سارے خواجہ سرا بھی میرے تابع ہیں، اور میرے حوصلے، میری تمنائیں اب کچھ نہیں! وہ تنہا جذبہ جو اب میرے اندر باقی رہ گیا ہے اپنی اسی "جھوٹی انا" کی تشفی ہے۔ کتنی خوشی ہوتی ہے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ ہر چیز میرے گرد گھوم رہی ہے! میری موجودگی ہر جگہ ہر وقت ضروری ہے! بغیر میری مرضی کے کوئی تنکا تک نہیں ہلا سکتا، میرا حکم "فرمانِ آخر" ہے اور مجھے اب اس کی بھی پروا نہیں ہوتی کہ میں سب ہی کی نفرت کا نشانہ بن رہا ہوں بلکہ میں تو اپنی خوشی سے گویا جان بوجھ کر ان کی نفرت کو دعوت دیتا ہوں کیونکہ اس طرح میرے "احساسِ اقتدار" کو اور تقویت پہنچتی ہے میری "انا" اور تشفی پاتی ہے میرا رعب و داب بڑھتا ہے مجھے معلوم ہے یہ "حسینائیں" مجھ سے شدید نفرت کرتی ہیں۔ اور کیوں نہ کریں، دوست! میں تم سے کہتا ہوں، یقین جانو ان کی ہر معصوم سے معصوم خواہش کا بھی گلا گھونٹ دیتا ہوں ان کی چھوٹی سی چھوٹی بے ضرر خوشی کو بھی پورا نہیں ہونے دیتا، ہمیشہ ان کے راستہ کا کانٹا بنا رہتا ہوں ان کی ہر خواہش کے درمیان ایک ناقابلِ تسخیر رکاوٹ بن کر کھڑا ہو جاتا ہوں ــــ وہ منصوبے بناتی ہیں، تجویزیں کرتی ہیں اور میں نہایت بے رحمی سے انہیں توڑ

دیتا ہوں ان کا کوئی ارادہ، کوئی منصوبہ کبھی شرمندۂ تکمیل نہیں ہو پاتا، میرا ایک اشارہ، میری ایک نفی ان کی تمناؤں اور آرزوؤں کا خون کر دیتی ہے۔ میری زبان پر ہمیشہ فرض، نیکی، پاکیزگی عصمت اور شرم و حیا کے "مقدس" الفاظ رہتے ہیں میں ہر لمحہ انھیں ان کی جنس کی کمزوریوں اور خامیوں کو یاد دلاتا رہتا ہوں اور آقا کی "شرافت" "نیکی" اور "اقتدار" کا کلمہ پڑھتا رہتا ہوں اور ان کی ہر امید کو خاک میں ملا کر انہیں یاس و حرماں کے خطرناک اندھیروں میں پہنچا دیتا ہوں اور میری ہوشیاری دیکھو۔ اس ساری سختی اور بے رحمی کے لیے میں اپنے کو مجبور ظاہر کرتا ہوں (اور یہ کچھ غلط بھی نہیں) انہیں یہی باور کرانا چاہتا ہوں کہ یہ سب انھی کی بھلائی کے لیے ہے، میں ان کا دوست جو ٹھیرا مجھے ان سے گہری دلچسپی جو ہے، میں انھی کا تو بھلا چاہتا ہوں ـــ مگر دوست! یہ مت سمجھو، اس طرح میرے لیے سب کچھ خوشگوار بن گیا ہے، میری زندگی آسان ہو گئی ہے۔ نہیں۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یہ حسینائیں! تم نہیں جانتے یہ بڑی آفت کی پرکالہ ہیں وہ بھلا کب چوکنے والی ہیں۔ میں انھیں دق کرتا ہوں تو وہ بھی مجھے ہزاروں طرح سے تنگ کرتی ہیں اور ہر روز ہی مجھ سے سود در سود بدلہ لینے کے موقعے نکال لیتی ہیں اور ان کا انتقام! اف! اکثر وہ بڑا خطرناک ہوتا ہے! وہ خوب جانتی ہیں میں ان کا کتنا دوست ہوں! ہمارے درمیان جیسے ہر وقت ہی ایک جوار بھاٹا رہتا ہے۔ وہ عجیب عجیب طرح سے میری تذلیل کرتی ہیں۔ ایسی ایسی چالیں چلتی ہیں کہ خدا کی پناہ۔ انہیں میری ضعیفی اور بڑھاپے پر بھی ترس نہیں آتا۔ چھوٹی چھوٹی چیز کے لیے وہ راتوں میں دس دس بار مجھ ہی کو اٹھاتی ہیں، ان کی فرمائشوں، ان کے احکامات کا تانتا جیسے کبھی ٹوٹتا ہی نہیں اور جیسے محض مجھے دق کرنے کے لیے وہ بلاوجہ بھی حکم پر حکم چلاتی رہتی ہیں ـــ میری ذمہ داریوں اور فرائض کو بڑھانے میں جیسے انھیں خاص لطف آتا ہے۔ کبھی وہ بھاگی بھاگی آتی ہیں کہ دیکھو دیوار کے قریب کوئی نوجوان مکر کھا رہا ہے انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ کبھی کہتی ہیں کچھ عجیب سا شور اور آوازیں سنائی دے رہی ہیں ضرور کوئی بھید ہے کوئی آتی ہے کہ میرا خط فلاں تک پہنچا دو، کسی کو اپنے سامان آرائش کے لیے میری مدد چاہیے تو کسی کو سوائے میرے کسی اور پر بھروسہ نہیں حمام تک بھی مجھی کو ساتھ جانا پڑتا ہے۔ غرض یوں ہی طرح طرح کے حیلوں بہانوں سے وہ میرا ہر وقت ناک میں دم کرتی رہتی ہیں اور اس طرح مجھے پریشان کر کے، میرا مذاق اڑا کر انہیں گویا ایک روحانی مسرت ملتی ہے۔

اور صرف یہی نہیں ـــ مجھے مزید اذیت دینے کے لیے وہ مجھے عجیب عجیب طرح سے بے نیاز الجھنوں اور مخمصوں میں بھی ڈالتی ہیں۔ ایسی حرکتیں کرتی ہیں کہ لامحالہ شک اور شبہہ پیدا ہو، جان بوجھ کر ایسی باتیں کرتی ہیں کہ میرے کان کھڑے ہوں اور میں رات رات بھر دروازوں کے پیچھے چھپ کر ان کی باتیں سننے پر مجبور ہو جاؤں۔ ان کے حیلوں بہانوں کی انتہا نہیں اور جھوٹ موٹ بیمار پڑ جانا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے اور اس وقت مجھے ان کے اشاروں پر ناچنا پڑتا ہے کیوں کہ ایسے نازک موقعوں پر ایک اندھی اطاعت اور بے پناہ فرمانبرداری لازمی ہو جاتی ہے "آقا کی" "امانت"

اور اپنی "بندگی" کا احساس اس وقت تیز ہو جاتا ہے۔ کہ میں بیچارا ایک خواجہ سرا۔ ! میری زبان سے کوئی انکار ظاہر ہے ان کے نازک دل کو صدمہ پہنچائے گا جو میرے آقا کی محبوب ہیں۔ ایسے موقعوں پر میں ان کی نہ مانوں، ان کا خیال نہ رکھوں، ان کی ناز برداری نہ کروں تو انہیں مجھے سزا دینے کا بھی تو حق ہے۔ آقا کی مسرتیں۔ بہر حال ان سے وابستہ ہیں۔

سچ کہتا ہوں پیارے ابی اس ذلت و خواری کی زندگی سے تو موت ہزار درجہ بہتر ہے!

اور مزید کم نصیبی یہ کہ ان ساری مجبوریوں اور مصیبتوں کے ساتھ مجھے اپنے "مالک" کی مہربانی اور خوشنودی کا بھی تو بھروسہ نہیں۔ اس کے دل میں بھی جانے میرے کتنے دشمن گھر کئے ہوئے ہیں جو ظاہر ہے میری تباہی کے سوا اور کیا سوچ سکتے ہیں۔

برافروختہ اور برہم حسیناؤں کو آقا کی خواب گاہ تک پہنچانا، تم سمجھتے ہو میرے لیے کوئی آسان کام ہے؟ ان کے ناز و انداز، آنسو، آہیں، سسکیاں، مصنوعی انکار، حتیٰ کہ ان کی خوشی تک بھی اس وقت میرے لیے ایک عجیب نازک مرحلہ بن جاتی ہے۔ ہزاروں اندیشے اور خوف مجھے گھیر لیتے ہیں اور ان سے مفر کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا ان کی حیثیت اس وقت ایک فاتح کی سی ہوتی ہے ان کی خوب صورتی اور "نسوانی ہٹ" میرے لیے ایک بلائے بے درماں بن جاتی ہے میں غریب دو دلوں کی "سودا بازی" کے بیچ عجیب مشکل میں پھنس جاتا ہوں، ان کی اس وقت کی ایک "ادائے ناز" ایک "ہاں" میری زندگی بھر کی بھلی خدمات اور "وفا شعاریوں" کو حرف غلط کی طرح مٹا دینے کے لیے کافی ہے۔ اور ایک "مدہوش" آقا سے ۔۔۔ تم سمجھتے ہو ایک خواجہ سرا کو کچل سکتا ہے، جس کے پاس اپنی اشک اطاعت گذاریوں کے سوا اور کچھ دینے کے لیے نہیں۔

کتنی ہی بار ایسا ہوا ہے کہ رات اس کے لطف و کرم کے گھنے سایہ میں سویا ہوں اور صبح آنکھ کھلی ہے تو شاہی عتاب اور نظر برہم کو اپنا منتظر پایا ہے۔ یاد ہے۔ اس دن جو اتنی ذلت کے ساتھ مجھے کوڑے لگائے گئے، سب کے سامنے بے حرمتی سے محل کے گرد گھمایا گیا۔ کیوں؟ میں نے کیا کیا تھا؟ میری خطا کیا تھی؟ سوائے اس کے کہ حسینہ کو آقا نے چاہا اس کی خوابگاہ تک پہنچا دیا۔ اب اگر اس "قتالہ" کی عشوہ طرازیوں اور بے جا ناز و انداز نے ہوس کے نشہ میں چور آقا کی بات نہ مانی اور اس کی آتش شوق کو اور بھڑکایا تو بھلا میں کیا کر سکتا تھا۔ میں ایک "بندہ بے دام" میرا اس میں کیا دخل تھا کہ میں غریب ہی ان کے باہمی شوق اور ناز و انداز کا شکار بن گیا۔

تو یہ ہے صورت حال۔ پیارے ابی جس میں میری زندگی گذر رہی ہے۔ ایک مستقل الجھن اور عذاب! اور تم ۔۔۔ تم سچ مچ خوش نصیب ہو کہ تمہیں از بک کی مصاحبت حاصل ہے۔ تیرے لیے اپنے آقا کو خوش رکھنا بھی آسان ہے اور تو زندگی بھر اس کے الطاف و عنایات کو بھی باقی رکھ سکتا ہے۔

(فرنچ سے ترجمہ)

ت حسین سروری

جانِ دوستاں

غالباً ۱۹۳۰ء ہی کی بات ہوگی، اُس وقت میں اپنی خالہ کے ہاں نئے پل کے متصل ممتاز ہوٹل کے عین اوپر والی بلڈنگ میں رہتا تھا۔ اگرچہ مجھے شاعری شروع کئے کافی دن ہوگئے تھے۔ اور میں مشاعروں میں باقاعدہ شریک ہونے لگا تھا، لیکن میرا حلقۂ احباب نہایت محدود تھا۔ نظرؔ حیدرآبادی سے رشتہ دارانہ مراسم ضرور تھے لیکن دوستی و اتحاد کا ارتباط ابھی قائم نہ ہوا تھا۔

ایک دن دوپہر کے وقت میرے مکان کے دروازے پر دستک ہوئی، میں باہر نکل آیا۔ میرے دو احباب غلام دستگیر جمیلؔ اور عبدالجلیل قمرؔ تھے۔ وہ مجھے لیے ہوئے نیچے اترے، اور ہوٹل کے ایک کیبن میں داخل ہوئے جہاں اور تین حضرات بیٹھے ہوئے تھے ـــــ یہ تینوں خوش رُو اور خوش پوشاک نوجوان تھے۔ چہروں سے متانت اور شائستگی ٹپکتی تھی، اور باتوں سے نہایت مہذب، سنجیدہ اور باذوق معلوم ہوئے۔ میں نے ایک ہی نظر میں جان لیا کہ یہ سٹی کالج کے طالب علم ہیں، اس لیے کہ اس وقت وہ سٹی کالج کے امتیازی رنگ کی شیروانیاں پہنے ہوئے تھے۔

جمیلؔ اور قمرؔ نے تعارف کرایا۔

آپ احمد حسینی صاحب ہیں اور شاہدؔ تخلص کرتے ہیں۔

یہ کسی قدر دراز قد نوجوان تھا، چہرہ یا بدن، آنکھوں میں چمک، ہونٹوں پر پان کی لالی۔ سر کے بال اتنے لانبے کہ گردن تک آپڑے تھے۔

آپ مسیح الدین خاں صاحب متینؔ ہیں۔ میٹرک میں پڑھتے ہیں، لیکن نہایت عمدہ نظمیں لکھتے ہیں۔ آپ کی نظمیں "بچوں کے سب رس" میں شائع بھی ہوتی ہیں۔

یہ ایک پستہ قد، گورا، اور نکھرا ستھرا لڑکا تھا۔ بات بات پر ہنستا تھا۔

آپ لطیف شریف صاحب ہیں، اور ساجدؔ تخلص ہے اور شعر خوب کہتے ہیں۔ شاہد صاحب اور یہ ہم جماعت ہیں۔

بوٹا سا قد، نہایت پرکشش چہرہ، سانولی رنگت، متناسب جسم، چھوٹی چھوٹی آنکھیں جن میں ذہانت کی چمک یاں تھی ان تینوں سے مل کر میں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ واقعی ان سے مل کر مجھے بڑی خوشی ہوئی تھی، اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا، جیسے یہ میرے برسوں کے دوست تھے اور بچھڑ کر پھر مل گئے ہیں۔ اس روز نہ وہ کالج گئے اور نہ میں اور پورے دن گھر گیا، ہم چھ دوست، رات گئے تک ادھر اُدھر گھومتے رہے اور جہاں کہیں مناسب جگہ معلوم ہوئی ایک دوسرے کو اپنا کلام سنایا۔

پھر ان تینوں کا یہ معمول ہو گیا کہ کالج سے چھوٹتے ہی میرے گھر آجاتے اور ہم چار یار" مل کر کبھی کتب خانہ آصفیہ جاتے، اور وہاں سے بھی اکتا جاتے تو کسی چمن میں یا کسی کھلے میدان میں بیٹھ کر وقت گزاری کرتے۔ بعض وقت موسیٰ ندی کے کنارے بنی ہوئی فصیل پر بیٹھے اپنا اپنا تازہ کلام سناتے۔ اور یہ سلسلہ کافی عرصہ تک جاری رہا۔

ہم لوگ نہ صرف ایک دوسرے کو اپنا کلام ہی سناتے بلکہ نہایت خلوص کے ساتھ ایک دوسرے کے کلام پر نکتہ چینی بھی کیا کرتے۔ اور کسی کے شعر میں کوئی خامی ہوتی تو اس کو دور کرنے کی طرف توجہ دلائی جاتی تھی۔ اس میں محض یہ جذبہ کارفرما ہوتا تھا کہ ہمارے دوست کے کلام پر کوئی اور اعتراض نہ کرنے پائے ـــــ ہم جو خامیوں کو اس طرح محسوس کرتے تھے، نہ معلوم کس حد تک حق بہ جانب ہوتے، لیکن ہم اعتراض کرنے والے دوست سے ہرگز بحث نہ کرتے کثرت رائے سے ہر اعتراض کو قبول کر لیا جاتا تھا۔ اس معاملہ میں میں نے دیکھا ساجد بڑا فراخدل واقع ہوا تھا۔

ہم لوگوں کی دوستی محبت سے بدل گئی تھی اور محبت میں والہانہ پن آگیا تھا ـــ متین کا گھر اول تو پیلی بھیت میں تھا، اس کے بعد وہ بازار گھانسی میں آرہا۔ شاہد عثمان پورہ میں رہتا تھا اور ساجد کی رہائش شہر سے دور جانب مشرق ... کوئی چھ سات میل کے فاصلہ پر عنبر پیٹھ میں تھی۔ جب کالج بند ہوتا تو عموماً متین کے گھر پر ہم سب جمع ہوتے کھانے کا وقت ہوتا تو وہیں کھانا بھی کھا لیتے۔

اب آہستہ آہستہ شاہد، ساجد اور متین بھی عام مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ شاہد اور متین شاعر کی حیثیت سے زیادہ دن نہ چل سکے۔ ساجد کی خوب آؤ بھگت ہونے لگی۔

ایک روز ہم چاروں میرے گھر لینے تماز ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے کہ نظر (حیدرآبادی) مجھ سے ملنے آئے میں نے اپنے نئے دوستوں کا تعارف کرایا۔ پھر کچھ کلام سننے اور سنانے کا موقع نکل آیا۔ ساجد کا کلام نظر کو اس قدر پسند آیا کہ وہ مارے خوشی کے اُچھل پڑا۔ اور بہت جلد ساجد کا بے تکلف دوست بن گیا۔ اس ملاقات کے دو تین روز بعد کی بات ہے کہ نظر کے چند دوست تفریح کے لیے عثمان ساگر جا رہے تھے۔ اس پارٹی میں بڑے سنجیدہ اور رٹرمنٹ لکھے قسم کے لوگ تھے نظر نے ساجد اور شاہد کو بھی ساتھ لے لیا۔ اور عثمان ساگر میں ان لوگوں نے شعر و سخن کی ایسی محفل جمائی کہ عثمان ساگر کی خاموش فضائیں بھی گیتوں سے معمور ہو گئیں۔ اس دن کے بعد سے صحیح معنوں میں محسوس ہونے لگا کہ حیدرآباد کے

نوجوان شعرا میں ایک اور صحت مند، اور توانا شاعر کا اضافہ ہو گیا ہے جس کی آواز اگرچہ نئی تھی، لیکن برسوں کی جانی پہچانی معلوم ہوتی تھی جس کے نغمے نئے ہوتے ہوئے بھی سننے والوں کے دل کی دھڑکنوں کے رفیق تھے۔

بعض وقت تو ہم مشاعرے میں جانے سے قبل ترنم کی مشق بھی کر لیا کرتے، اور یہ دیکھ لیا کرتے تھے کہ یہ دھن ٹھیک رہے گی یا نہیں۔ مجھ پر کچھ ایسی پابندی تھی کہ میں مشاعرے کے بعد گھر نہ جا سکتا تھا، اور ساجد بھی دوری کے باعث عنبر بیٹھ نہ جاتا، اس لیے اکثر ہم سب جمیل کے گھر جا کر اُسے جگاتے، اگر موڈ درست ہتا تو صبح تک اپنا اپنا کلام سنا کر بور کرتے، اور پھر اس کے "کاروبارِ شوق" میں خلل پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ صبح ہوتے ہی بیچارے جمیل کو ہمارے لیے نہاری کلچوں کا انتظام کرنا پڑتا۔

خدا جانے ہمارے دل میں یہ بات کیوں بیٹھ گئی تھی کہ شاعروں کے لیے پینا بھی ضروری ہے۔ ہم میں سے ہر شخص پینے کا لطف ایک دو بار اٹھا چکا تھا۔ لیکن آزادانہ پینے والا کوئی بھی نہ تھا۔ ایک روز کسی دوست کی تحریک پر پینے کا پروگرام بنایا گیا اور کچھ پیسے اکٹھے کر کے ایک جگہ سے وہسکی کی بوتل خرید لی۔ عابد روڈ پر گرانڈ ہوٹل میں بیٹھ کر پینا طے ہوا۔ ہوٹل کا عقبی حصہ خوبصورت پھولوں کے گملوں اور گھاس کی ایک مختصر سی روش سے آراستہ تھا، ہم لوگ اس جگہ بیٹھ کر کافی دیر تک پیتے رہے۔ پُرخلوص دوستوں کی یہ محفل ایک عجیب دنیائے نشاط بن گئی تھی۔

یہ پینے پلانے کا شوق برابر ترقی کرتا رہا، اور ہر بار اس کے محرک ضیغم اور ساجد ہوا کرتے۔ لطف کی بات یہ تھی کہ شروع میں ساجد شراب پیتا تو رغبت سے تھا، لیکن اس کی تلخی اسے گوارا نہ تھی۔ چنانچہ ایک ہاتھ سے اپنی ناک بند کرتا اور دوسرے ہاتھ سے شراب اپنے حلق میں انڈیل لیتا تھا۔

ہو سکتا ہے کہ نہ پینے والوں کی نگاہ میں ہم "آوارہ" سمجھے گئے ہوں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی "آوارہ مزاج" نہ تھا۔ ہمیں اپنی خاندانی شرافتوں کا بھی پورا لحاظ تھا۔

جیسے جیسے دن گزرتے گئے، ہم چاروں میں خود اعتمادی اور شعور کی پختگی بھی پیدا ہونے لگی۔ انھیں دنوں حسرت ترمذی صاحب سے کسی طرح میری ملاقات ہو گئی تھی۔ اوقات دفتر کے بعد بوڑھے اور نوجوان شاعر ترمذی صاحب کے گھر پر رکاب گنج میں جمع ہو جاتے تھے۔ کسی دن ادب کے مختلف موضوعات پر بحث ہو رہی ہے تو کسی دن صرف شاعری ہی شاعری ہے۔ کسی دن کسی استاد کا تذکرہ ہو رہا ہے تو کسی دن کسی کے کلام پر تنقید ہو رہی ہے۔ غرض حسرت صاحب کا مکان ایک اکیڈیمی بنا ہوا تھا۔ ہم چاروں بھی وہاں جایا کرتے تھے۔ جہاں اور احباب بھی مل جاتے۔ مخدوم محی الدین شاہد صدیقی، عبدالمقتدر خاں ناظم، نظر خیرآتی، طالب رزاقی، حیرت بدایونی، ہادی بدایونی، تسنیم مینائی، مومن گلبرگوی (مرحوم) غرض ہر قسم اور ہر درجے کے شعرا کا یہاں کی محفلوں میں شریک ہونا لازمی تھا۔

مخدوم ویسے کالج میں صرف متنبی کے استاد تھے۔ لیکن ان کی شخصیت اور شاعری کا ساجد اور شاہد پر بھی بڑا

گہرا اثر تھا۔ شاہد کی تو یہ حالت تھی کہ اپنی دو تین نظمیں نہ جانے کہاں رکھ چھوڑی تھیں لیکن مخدوم کا سارا کلام مرتب صورت میں اس کے پاس محفوظ تھا۔ جہاں مخدوم نے کوئی نظم کہی، کسی رسالے میں شائع ہونے سے قبل شاہد کی بیاض میں درج ہو جاتی تھی ـــــ اس کے علاوہ ابو ظفر عبدالواحد صاحب کی علمیت اور ان کی استادانہ شفقت نے بھی میرے ان تین دوستوں کو گرویدہ بنا لیا تھا۔ ادب و شعر کا جب کوئی مسئلہ سمجھ میں نہ آتا تو یہ سیدھے ابو ظفر صاحب سے جا کر رجوع کرتے۔ خاص کر ساجد نے موصوف سے کافی استفادہ کیا تھا۔

اس زمانے میں میں نے محسوس کیا کہ متین اس کمبختی زندگی سے کچھ زیادہ خوش نہ تھا۔ شاہد میں علمی ترقی کا رجحان بے حد تھا۔ اور ساجد محض شاعر بن کر رہنا چاہتا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کہ اُسے ایسی کوئی مجبوری ضرور ہے جس کی وجہ سے وہ تعلیمی مدارج طے کرنا چاہتا ہے۔ اُس کے خانگی حالات ایسے تھے کہ کم سے کم اسے ایک گریجویٹ بننا لازمی تھا۔ اگرچہ وہ محض شاعری کا رسیا تھا لیکن اس کی اس کسمپرسی میں چند ایسی تلخیاں تھیں جن کے دور کرنے کا اس نے بیڑا اٹھایا تھا۔ ساجد کے والد بزرگوار کوئی جاگیردار یا دیسکھ تو نہ تھے، البتہ کثیر العیال تھے۔ ساجد ان کا بڑا بیٹا تھا اور اسے وہ بے حد چاہتے تھے، لیکن اعلیٰ تعلیم دلانے کے وہ موقف میں نہ تھے ـــــ اور ساجد اپنے والد کی طرح ایک کلرک بن کر اپنا، اپنے چھوٹے بھائیوں اور بہنوں کا مستقبل تاریک دیکھنا نہ چاہتا تھا۔ ایک شاعر کی حیثیت سے بھی اسے اپنے فرائض کا پورا احساس تھا۔ وہ لاپرواہی، خانہ بدوشی اور بے راہ روی کو جزو شاعری نہ سمجھتا تھا۔ وہ دنیا میں اُجالا پھیلانے کے لیے خود اپنے گھر میں خوشی و شادمانی کا چراغ جلانا چاہتا تھا۔ وہ چراغ جو مدت سے اس کے خاندان میں نہ جلا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی نظموں میں اسی احساس کی شدت موجود ہے۔ جو بہت کم شاعروں کو نصیب ہوتی ہے۔

اب احمد حسینی شاہد، حسینی شاہد اور مسیح الدین خاں متین چند دنوں تک متین سہروردی اس کے بعد اقبال متین بن گیا۔ ساجد نے تخلص اور نام کے دو جزو سے ایک مرکب بنا لیا یعنی وہ لطیف ساجد ہو گیا۔

پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ میں حیدرآباد سے باہر شنکر گر چلا گیا۔ متین فقط "اسپرزلف درخ" ہو کر رہ گیا تھا، وہ گھر سے کتابیں لے کر چلتا تھا، لیکن بارگاہ حسن میں زانوئے عشق تہ کر کے چلا آتا۔ البتہ شاہد اور ساجد اہنماک سے پڑھتے تھے شاہد تو ٹیوشن وغیرہ سے اپنے تعلیمی اخراجات پورے کر لیا کرتا تھا، ساجد شاید ایسا کوئی کام کرنے کا اہل نہ تھا۔ اس کی مالی الجھنیں بڑھتی گئیں اور وہ ایف اے کی تیاری نہ کر سکا۔ نتیجہ یہ کہ شاہد امتیاز کے ساتھ کامیاب ہو گیا اور اس نے جامعہ عثمانیہ میں بی اے میں داخلہ بھی لے لیا ـــــ ساجد کو دو باتوں کا نہایت ملال تھا۔ ایک تو یہ کہ اس کا ایک ہم جماعت دوست بچھڑ گیا۔ دوسرے اس کے تعلیمی مدارج جس قدر جلد ہو سکے طے کرنا ضروری تھا، لیکن مجبوری نے اس کے ہاتھ پاؤں توڑ کر رکھ دیئے تھے۔

اسی زمانے میں اس نے شنکر گر کے پتہ پر ایک خط مجھے لکھا تھا جس سے اس کے احساسات کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

عنبر پٹھ ۲۹ ستمبر ۵۱ء

مجتبیٰ تحسین!

۲۰ ستمبر کو تمھارا عنایت نامہ ملا۔ ایک حیرت آمیز خوشی محسوس کرتا ہوں کہ تم کو اپنے وعدہ کی پاسداری کا خیال رہا۔ ورنہ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ "اس یہ ہوا وہ ہوا" میں انسان خود کو بھی بھول جاتا ہے۔ چہ جائیکہ ایک غریب وعدہ۔

تم نے لکھا ہے کہ "خط کے جواب کا شدید انتظار رہے گا" تمھارے جانے کے بعد اگر کچھ ہوا ہو تو لکھوں نا؟ ـــ غالب کی طرح یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ع خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو ـــ خیر ـــ اگر تم اس کو کچھ ہونا خیال کرتے ہو تو ادارۂ ادبیات اردو کے مشاعرے میں جو حسرت موہانی کی صدارت میں ہوا تھا نظر سے صرف نظری ملاقات ہوئی تھی۔ اس لیے کہ جہاں صرف ..... نواب تراب یار ..... جنگ کا اکھاڑا میدان مشاعرہ میں اپنے داؤں پیچ دکھا کر لوگوں کی توجہ اپنی طرف منعطف کرائے، وہاں کسی دوست آشنا سے تفصیلی ملاقات کیسی؟ جلیل (قمر) سے وہیں پر سرسری ملاقات ہوئی متین حیدرآباد سے ابھی نہیں آیا۔ شاہد کی امتحان میں کامیابی مجھے کچھ کہتے کا احساس دلا کر ملنے سے روکتی ہے۔ جانتے ہو؟ وہ بی اے کا طالب علم ہے۔ جمیل کسی کے جمال جہاں آرا کی جلوہ زائیوں میں گم ہے۔ اب رہے جناب ساجد ـــ سو وہ بھلے اور ان کا کنج قفس و گوشۂ تنہائی ـــ بھلا اب تم ہی کہو اس ہنگامۂ خاموش میں کیسے اپنی سُدھ بُدھ کی خبر ہو سکتی ہے۔ خیر تمھارے کہنے سے نظر سے مل لوں گا۔ لیکن مل کر کیا کروں جب کہ کالج عنقریب کھل رہا ہے، اور سب سے اہم چیز "طلب معاش" ہے جس کے بغیر کوئی چارہ نہیں اور اس نے بھی بفضل خدا اوروں کی طرح اپنا پنڈا چھڑا رکھا ہے۔ ایسی حالت میں تم ہی کہو کہ نظر سے مل کر کیا کروں؟ اس کے علاوہ ع

کون سنتا ہے یہاں غمگیں دلوں کی دھڑکنیں

تمھارا۔ ساجد

نوٹ:۔ اختر صدیقی سے سلام کہنا۔ اور کہنا کہ میں نے تمھیں کچھ نہیں لکھا۔ کیونکہ

مدتیں گذریں تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

ساجد کی مالی پریشانیوں کے پیشِ نظر میں نے اس کو لکھا تھا کہ نظر سے مل کر اپنے حالات بیان کرے۔ تاکہ وہ کہیں ایسا کام دلا دے کہ اس کی تعلیم جاری رہے اور کوئی ایسا ناگہانی واقعہ پیش نہ آئے جس سے اس کا تعلیمی سلسلہ منقطع ہو جائے۔ لیکن غالباً اس کوشش میں اسے کامیابی نہ ہوئی تھی۔

کچھ دن بعد پھر میں حیدرآباد آگیا۔ . . یہ وہ زمانہ تھا، جب کہ متین نے شاعری کو خیرباد کر کے افسانہ نگاری شروع کر دی تھی۔ حسینی شاہد تو تھا ہی دو تین نظموں کا شاعر اب وہ بھی نہ رہا۔ اور وہ جامعہ عثمانیہ کی ڈبیٹوں اور تنقیدی مونگفلیوں میں کھو گیا تھا۔ سا پوچ رہا تھا کہ اس کا اگلا قدم کس طرف اٹھنا چاہیے۔

حیدرآباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ مخدوم محی الدین کی سرکردگی میں ترقی پسند شاعروں کا ایک گروہ ترتیب پا چکا تھا جس میں نظر، اریب، ساجد، یوسف ناظم، کنول پرشاد کنول اور راقم الحروف پیش پیش تھے یوں تو ہم سب آپس میں ایک دوسرے کے بے تکلف دوست تھے۔ لیکن یارانہ صرف چار آدمیوں میں بہت گہرا اور استوار تھا یعنی، نظر، اریب، سردار سلیم اور میں۔ عجیب بات ہے کہ اس مرتبہ بھی چار آدمیوں کا گروپ بنا تھا۔ جہاں بھی جاتے ہم چار ضرور ہوتے، سردار سلیم موزوں طبع اور ادبی مذاق کا آدمی ضرور تھا، لیکن نہ شعر لکھتا تھا نہ مضامین۔ اس وقت وہ سردار علی خاں تھا۔ کوئی مشاعرہ ہوتا، یا کوئی پینے پلانے کی محفل ہوتی، ہم چاروں کے بغیر سونی ہو جاتی تھی۔ چنانچہ یہ عابد علی خاں اور محبوب حسین جگر نے ہمارا نام چار "معرعے" رکھ دیا تھا۔ ہم میں سے کوئی دکھائی نہ دیتا تو وہ پوچھتے "چوتھا معرعہ کہاں ہے" اس کے باوجود ہمیں ساجد کی اور ساجد کو ہماری تلاش ضرور رہتی تھی اور اکثر ہم لوگ پانچ معرعے بن جاتے تھے۔

کسی نہ کسی طرح ساجد نے انٹر پاس کر لیا اور فوراً ہی بی اے میں داخلہ لے لیا۔ اسی دوران میں اُسے ادارہ ادبیات اردو میں ایک جزوقتی کام بھی مل گیا تھا۔ اور اس وقت تک اس کی شاعری پورے شباب پر آگئی تھی ۔ ساجد ادھر تو ایک نئے گروپ کی جان بنا ہوا تھا، اور ادھر اس نے اپنے پرانے دوستوں کو ہرگز فراموش نہ کیا۔ جس طرح ہم لوگوں سے اس کا ہر روز ملنا لازمی تھا، اسی طرح متین اور شاہد کی قدیم رفاقت کا بھی اس نے پورا لحاظ رکھا۔ یہ بات اس کے کردار کو واضح کرتی ہے۔

یہ داستان بڑی طویل ہے۔ کہاں تک لکھتا جاؤں۔

آخر میٹرک کے بعد متین نے تعلیم ترک کر دی، شاہد ایم اے پاس کرنے کے بعد صحافت کے میدان میں اترا۔ ہفتہ وار "تاج" اور ہفتہ وار "رباب" کے ادارتی فرائض انجام دینے لگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کا سرگرم کارکن بھی تھا ــــ انتہائی نامساعد حالات میں ساجد نے بی اے کر لیا۔ اس کے حالات کے پیشِ نظر یہ بہت بڑی بات تھی۔ اس کے بعد اسے ایک مناسب ملازمت کی ضرورت تھی۔ ایک مرتبہ وہ تحصیلداری کا بھی امیدوار ہوا۔ لیکن کسی وجہ سے انٹرویو میں کامیاب نہ ہو سکا۔ لیکن آخر میں وہ مارکٹنگ افسری کے لیے

انتخاب میں آگیا۔ اور گلبرگہ پر اسے پروبیشنری مل گئی۔ اس وقت میں ماڈرن پریس کے مالک عبدالمنان خاں کے اخبار "دورِ جدید" سے منسلک تھا۔ اس کے لیے میں نے ساجد کو گلبرگہ کے پتہ پر خط لکھا تھا کہ اپنا تازہ کلام بھیجے۔ اس کے جواب میں اس نے یہ خط لکھا تھا۔

دفتر مہتمی مارکٹ۔ شہر گلبرگہ
لطیف ساجد۔ پروبیشنر مہتمم

۱۰ ترتیب ۵۶ ف

تحسین! ــــ میں اس طرح تو غائب نہیں ہوا کہ کسی کو خبر نہ ہوئی ہو۔ جب حیدرآباد سے جانے لگا ہوں تو ہر شخص میرے ساتھ تھا۔ حتیٰ کہ اثر صدیقی بھی!! یہ اور بات ہے کہ یہاں آنے کے بعد ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اس کی رفاقت چھوٹتی نظر آرہی ہے۔ بے چارہ اثر صدیقی ــــ!

"آزاد حیدرآباد" تم سے چھوٹ گیا۔ دیکھیں "دورِ جدید" کا کیا حشر ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے قدم میمنت لزوم اس گلستاں کو بھی بیاباں بنادیں۔ بہرحال میری طرف سے مطمئن رہو۔ کوئی نظم یا غزل لکھ سکوں تو "دورِ جدید" کے لیے وقف رہے گی۔ اگر بہت مجبور کل رہا ہے تو اپنی کوئی ایک پرانی غیر مطبوعہ نظم بھیج دوں گا۔ تاریخ سے مطلع کرو۔

سرفراز، ارتیب اور نظر کو سلام کہنا۔ میں اتحاد المسلمین کے سالانہ اجلاس کی تواریخ میں شاید حیدرآباد آجاؤں۔ امکان کم ہے۔ کوشش کروں گا۔ بھائی میرا ایک کام کردو۔ یوسف ناظم سے مل کر صرف اتنا دریافت کرو کہ میکش سے اگر ملاقات ہوئی ہے تو انھوں نے ہماری اجرت کے سلسلے میں کیا کیا؟ ایک غریب الدیار بے حد پریشان ہے۔

امید کہ تم خیریت سے ہوگے۔

تمہارا۔ لطیف ساجد

پولیس ایکشن کے بعد ۱۴ دسمبر ۱۹۴۸ء کو میں پاکستان چلا آیا۔ اس وقت ساجد کسی ضلع پر تھا۔ پورے چھ سال بعد جولائی ۱۹۵۴ء میں جب میں حیدرآباد گیا تو اس وقت بھی وہ حیدرآباد میں نہ تھا۔ بلکہ ہنگولی میں تھا۔ ارتیب نے یا کسی نے خط کے ذریعہ اسے اطلاع دی تھی کہ تحسین پاکستان سے آیا ہوا ہے۔ ساجد نے یقین نہ کیا اور یہ لکھا کہ اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا کوئی ایک جملہ، کوئی تحریر، یا کم سے کم اس کے دستخط بھیجو تو میں یقین کروں گا کہ وہ واقعی آیا ہوا ہے۔ خیر اس کی تو نوبت نہ آئی کچھ دنوں بعد وہ خود حیدرآباد آیا، اور ہم بچھڑے ہوئے دوست بغل گیر ہوئے ــــ اور چند ایک ملاقاتیں ہوئیں، باتوں میں

ہنسنے ہنسانے میں تو پندرہ برس قبل ہی کا لطیف ساجد تھا، لیکن شکل اور ہیئت کے اعتبار سے وہ بہت کچھ بدل چکا تھا اس قدر لحیم شحیم، اور توانا و تندرست تھا کہ اس کے مرنے کا گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔

ایک دوست اور ایک شاعر کی حیثیت سے ساجد کو بہت قریب سے دیکھنے کا مجھے اتفاق ہوا تھا اور ان دونوں حیثیتوں میں وہ ایک مکمل انسان تھا۔ وہ اپنے دوستوں کی انتہائی ناگوار بات پر بھی برا نہ مانتا تھا۔ وہ دوستوں پر بری طرح مٹا ہوا تھا۔ وہ دوستوں کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتا تھا۔

وہ بڑا ہی حساس شاعر تھا۔ ہر معمولی حادثہ سے اس پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔ وہ غریبوں کی حالت زار اور فقیروں کی دردناک صداؤں پر رو پڑتا تھا۔ مصیبت زدہ انسانوں کا حال سن کر اپنے ہونٹ چبانے لگتا۔ اس کی ساری شاعری میں یہ کیفیت نمایاں ہے۔

لطیف ساجد اپنی نظموں بلکہ غزلوں میں بھی زیادہ موٹے موٹے الفاظ استعمال کرنے کا عادی تھا، لیکن چونکہ اس میں بے انتہا خلوص تھا اس لیے اس کی ہر نظم حسین لفظوں کا ایک مرقع بھی ہوتی تھی۔ بعض وقت اس کے کلام میں فارسی و عربی آمیز ترکیبیں بھی آجاتی تھیں، لیکن وہ اس کی اپنی ہوتی تھیں، بہت ہی خوبصورت اور گوارا ــــ وہ "نئے پن" کے شوق میں اپنی زبان اور اپنے ادب کی روایات کی صورت مسخ کر دینے کا قائل نہ تھا۔

ساجد نے اپنی شاعری کی کم عمری کے باوجود ایک ایسی روش نکالی تھی کہ وہ اپنے ایک مخصوص اور منفرد رنگ کا شاعر تھا اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ حیدرآباد کی انجمن ترقی پسند مصنفین کی ادبی تحریک کو تقویت پہنچانے میں ساجد اور اس کی شاعری نے بھی بہت بڑا کام کیا تھا۔

ہم جب تک زندہ ہیں لطیف ساجد کی یاد کو سینے سے لگائے رکھیں گے۔

وہ اپنے دوستوں کے دلوں میں اپنی غیر فانی یاد، اور آنے والے لوگوں کے لیے زندگی سے بھرپور نغمے چھوڑ کر سدھار گیا ــــ!! دھڑکتے دل اور اُمڈتے آنسوؤں کے ساتھ میں حیدرآباد کے جواں سال شاعر عزیز قیسی کی نظم (نغمے کی موت) کے ان آخری شعروں پر اپنا مضمون ختم کرتا ہوں ــــ!

اے میرے رفیق، میرے ہمدم
فتح انساں کا خواب رنگیں
ہر صبح شفق کے ساتھ آکر
نغمات سحر سنائے جانا

لبکوں پہ یونہی اٹھائے رکھنا
ہر دور میں اپنے خون دل سے
ہر فصل بہار میں ابھر کر
ہر پھول میں مسکرائے جانا

یادوں کے دیئے جلائے رکھنا!
جب تک یہ رات حکمراں ہے
یادوں کی ہر انجمن کے دل میں
احساس وفا جگائے جانا

ہر گام دیئے سجائے رکھنا

اختر الایمان

نیشِ غم خوابِ مسرّت کا رقیب آج بھی ہے
خالِ رخ، زلفِ سیہ، میرا نصیب آج بھی ہے

جس کے نشتر سے مرا حال عجیب آج بھی ہے
پھر وہی دشمنِ جاں میرا طبیب آج بھی ہے

شورہ پشتوں کے لیے ویسے بھی دنیا ہے بہشت
بے اماں ویسے ہی بے چارہ نجیب آج بھی ہے

سگ نوازی وہی شیوہ ہے جہاں سازوں کا
ابنِ مریم تہِ بیدادِ صلیب آج بھی ہے

اے خدائے مہ و پروینِ وفا ایک نظر
میرا دل عشق فروزاں کا نقیب آج بھی ہے

نشور واحدی

نگاہِ مست سے اخذِ غمِ حیات کرے
خبر نہ ہو تو کسی بے خبر سے بات کرے

کہاں فلک کے شرارے کہاں زمیں کے نجوم
وہ کچھ دنوں ابھی مشقِ تجلیات کرے

حریفِ غم گریزاں ہے وہ گدائے شراب
جو بندِ شیشہ میں اک لمحۂ حیات کرے

یہ اک جہانِ نواب تک سنبھل سکا ہی نہیں
کسے پڑی ہے کہ پھر کُن سے کائنات کرے

نہ ہو امید تو یہ تیرگیٔ بزمِ حیات
جہاں سے دن ہے نکلتا وہیں سے رات کرے

نگاہِ حسن ہے محجوبِ التفات مگر
کبھی کبھی تو کسی اجنبی سے بات کرے

کہیں ہے رنگِ چمن اور کہیں ہے دار و رسن
کہاں کہاں کوئی پاسِ تعلقات کرے

مری شراب سے جبیں بر جبیں نہ ہو واعظ
خدا تجھے بھی کبھی وندِ خوش صفات کرے

جب اک ادائے تغافل پہ خوش ہیں اہلِ جنوں
انھیں بھی کیوں کوئی پابندِ التفات کرے

نہیں ہے شاعرِ فطرت پہ کوئی قیدِ نشورؔ
مگر کبھی تو نظر سوئے واقعات کرے

شاذ تمکنت

محرومِ گل و لالہ ہی سہی پر ذوقِ جنوں بے باک بھی ہے
اس طرح قفس میں ہوں کہ ابھی دامن میں چمن کی خاک بھی ہے

یوں تجھ سے بچھڑ کر جیتے ہیں غمخوار کو حیرت ہوتی ہے
کچھ تیری خوشی کا پاس بھی تھا کچھ غم کا ہمیں ادراک بھی ہے

کیوں خاکِ درِ میخانہ بنے کیا کہیے پرا تنا جانتے ہیں
جو سایہ تہِ گیسو نہ ملا وہ سایہ زیرِ تاک بھی ہے

آنکھوں میں خلوصِ اشک لیے اے کاش کوئی پھر ہم سے ملے
مدت ہوئی پلکیں نم نہ ہوئیں گو سینہ پُرخوں چاک بھی ہے

جو ہونٹ پئے پرسش نہ کھلے کہتے ہیں کہ اب ہیں صرفِ دعا
جو آنکھ مری جانب نہ اٹھی وہ آنکھ سنا نمناک بھی ہے

اختر سعید

رہا جو اہلِ درد سے تو اتنا وا سطہ رہا
وہ خود نگر کبھی کبھی ادھر بھی دیکھتا رہا

وہی متاعِ آرزو غرورِ مدعا رہا
نظر سے دور رہ کے جو دلوں سے کھیلتا رہا

سحر ہوئی تو ماحصل یہ تھا شبِ امید کا
جو اعتبار تھا گیا جو انتظار تھا رہا

دبا سکیں مٹا سکیں نہ تلخیاں حیات کی
جو یاد تھی فزوں رہی جو درد تھا سوا رہا

عجیب مرحلے تھے وہ رہِ حیات کے جہاں
نہ دل سا راہزن رہا نہ غم سا رہنما رہا

میں سوچتا ہوں تیرے ساتھ زندگی میں کیا نہ تھا
میں دیکھتا ہوں تجھ سے چھٹ کے زندگی میں کیا رہا

فضائے رنگ و نگ میں جہانِ جہد و جنگ میں
کہاں کہاں غریبِ دل تجھیں پکارتا رہا

شہاب جعفری

حاصلِ عمرِ رواں یاد آیا — تیری رخصت کا سماں یاد آیا
کیوں ترا ضبطِ فغاں یاد آیا — کیوں نہ آشوبِ جہاں یاد آیا
غم کے ہنگاموں سے تھی رونقِ دل — جانِ جاں دشمنِ جاں یاد آیا
غم بھی اظہارِ طلب ہے کتنا — ہائے پھر جی کا زیاں یاد آیا
پھر جراحت کا طلب گار ہے دل — پھر کوئی زخمِ نہاں یاد آیا
کاوشِ چارہ گری یاد آئی — ناخنِ چارہ گراں یاد آیا
دوست دشمن تو ہیں دم کے ساتھی — کیا کہیں، کون کہاں یاد آیا
جب بھی جینے کی ملی ہے فرصت — تو بہت جانِ جہاں یاد آیا
تجھ سے خود رفتہ پہ سو ہوش نثار — میں بھی اپنے کو کہاں یاد آیا

سر اٹھایا ہی تھا ہم نے کہ شہابؔ
عشق کا بارِ گراں یاد آیا

زبیدہ خاتون حسین

حضورِ دیدہ و سروِ سمن کی آزمائش ہے
بہ ہر شاخ و شجر دار و رسن کی آزمائش ہے

لبِ ساحل نہ ڈوبی کشتیٔ عمرِ رواں اپنی
بھنور میں ہمت طوفاں شکن کی آزمائش ہے

اڑانا چاہتا ہے دستِ گلچیں بھی زرِ گل کو
خزاں کا دورِ چاکِ پیرہن کی آزمائش ہے

سُراغِ جوئے شیر اب ہے نہ دستِ تیشہ و باقی
مگر اب تک محبت کوہ کن کی آزمائش ہے

لُٹا کر خود کو اس محفل سے تحسیںؔ ہم تو لوٹ آئے
ہمارے بعد اہلِ انجمن کی آزمائش ہے

بن کے حسرت جم گئی آنکھوں میں پھر تنویرِ شوق
بے کہے افسانے خود ہی مختصر ہوتے گئے

آہ جیسے دل کے زخموں کو ہوا دیتی رہی
اور روشن یہ چراغِ رہ گذر ہوتے گئے

سلیمان اریبؔ

پوچھ مت دیکھ کہ کیا حالِ اریبؔ آج بھی ہے
اپنے ہی شہر میں بے چارہ غریب آج بھی ہے

تھی تو مرہم کی ضرورت پہ تری یاد کے ساتھ!
ایک نشتر سا مرے دل کے قریب آج بھی ہے

دوست پھر دوست ہے اب اس سے شکایت کیا ہو
خود مرا بخت سیہ میرا رقیب آج بھی ہے

ابن آدم سے یہ دنیا ابھی مایوس نہیں
ابن مریم کے لیے گرچہ صلیب آج بھی ہے

لاکھ یورش ہو خزاں کی مجھے اس کا ہے پتہ
ہر گل تازہ بہاروں کا نقیب آج بھی ہے

شکل واعظ کی بنا کر ہی نہ کیوں آئے مگر
رندِ بدنام سلیمانِ اریبؔ آج بھی ہے

کیفی اعظمی

سایۂ رخسار میں

اک ستارہ میرے سر پر ضو فشاں ہے اِن دنوں
میں جہاں ہوں وہ زمیں بھی آسماں ہے اِن دنوں

صبح آنکھیں کھولتی ہے دیدۂ سرشار میں
اور سورج ڈوبتا ہے سایۂ رخسار میں
وقت پر اس کی جوانی حکمراں ہے اِن دنوں

سانولی شامیں گھنی زلفوں کی مہکائی ہوئی
چاندنی راتیں ہم آغوشی کی پگھلائی ہوئی
زندگی کتنی حسیں کتنی جواں ہے اِن دنوں

خلیل الرحمٰن اعظمی

سہاگ رات

ناز کرنا نز کرلے جان کہ تیرے آگے
آج اک شاعرِ خود کام کا سر جھکتا ہے
پیرو مسلکِ خیام کا سر جھکتا ہے

میری آشفتہ سری، خود نگہی، خود نگری
جس پہ کتنے ہی خداؤں نے نظر ڈالی ہے
جس کے آگے غم و حرماں نے پٹخ ڈالی ہے

میرا "میں"۔ میری انا۔ میری خودی کی قندیل
عمر بھر جس کو پلایا ہے تمنا کا لہو
جس کی خاطر کیے پامال کئی جام و سبو

تشنگی زہر کے پیالوں سے بجھائی میں نے
آج امرت کی مرے رخ پہ نہ آنے پائے
میری پاکیزگیٔ فن نہ کہیں بک جائے

اسی دھرتی، اسی سینے کے نہاں خانے سے
ایک کونپل کی طرح میری کنواری نظمیں
پھوٹتی تھیں (کہ مرے نام کو زندہ رکھیں)

عمر بھر کا یہ اثاثہ، یہ گراں قدر متاع
آج قدموں پہ ترے میں نے نچھاور کر دی
جو کوئی پا نہ سکا تجھ کو وہی شئے دے دی

لے مرے پاس تو اب کچھ بھی نہیں "میں" بھی نہیں
تو اگر چاہے تو اب چین سے میں سو جاؤں
تو اگر چاہے تو میں آج امر ہو جاؤں

عزیز قیسی

دادگر

مجھے خبر ہے کہ آسودفا کا لمحہ ہے
اِسے تری نگہِ جاوداں سے ربط نہیں

مجھے خبر ہے کہ تو بھی شکارِ دوراں ہے
متاعِ جاں کے سوا اس قمار خانے میں
ہر ایک نقدِ نفس ہار کر پشیماں ہے

مگر یہ ربط ہے کیسا یہ کیا تعلق ہے
کہ جب بھی ہار کے اٹھا جہاں کی محفل سے
اُمنگ ہنس کے کلیجے پہ چوٹ کھانے کی
ہجومِ دشنہ و خنجر میں مسکرانے کی
اُمنگ داؤں پہ جانِ حزیں لگانے کی
کبھی جو ہار کے اُٹھا جہاں کی محفل سے
نہ جانے کیوں مرے دل میں خیال آیا ہے
کہ تجھ سے جا کے شکایت کروں زمانے کی

وحید اختر

حیات و موت

اک عمر گنوا کے سوچتا ہوں — کیوں زہرِ حیات پی رہا ہوں
حاصل نہیں کچھ بجز تباہی — ہر عیش کو آزما چکا ہوں
بڑھتی ہے کچھ اور نا مرادی — خوشیوں کا مآل جانتا ہوں
آلام کو غرقِ مے بھی کر کے — خود کو نہ فریب دے سکا ہوں

جب موت کی جستجو میں نکلا — قدموں کو زمین نے نہ چھوڑا
دامن سے لپٹ گئیں ہوائیں — پایاب ہوئیں بلند موجیں
مہتاب نے مسکرا کے روکا — چاندی کی رِدا اڑھا کے دیکھا
حُسنِ شبِ مہ میں کھو گیا میں — لوری سے فضا کی سو گیا میں

ٹوٹا جو سکوتِ شب کا افسوں — پہلی ہی کرن سے جی اٹھا ہوں
نجمِ سحری کی آنکھ جھپکی — چڑھتے ہوئے دن کی دھوپ چمکی
سورج نے دعائیں دے کے پوچھا — کرنوں نے بلائیں لے کے پوچھا
"کیوں تنگ ہے زندگی کا جادہ؟!
کیا تیری زمیں نہیں کشادہ؟!
کیا موت تغیر آفریں ہے؟!
کیا موت حیات سے حسیں ہے؟!

متین سرشؔ

آہٹ

اک نوائے دل نشیں آتی ہے کانوں میں مرے
نغمۂ ہستی سناتا ہے فضاؤں میں کوئی
شب کے سناٹے میں رہ رہ کر بلاتا ہے مجھے
گنگناتا ہے مری سادہ دعاؤں میں کوئی

اب نہ چھکے گا بہاروں میں جوانی کا لہو
کوئی کہتا ہے مزاجِ غم کو بدلا جائے گا
زخمِ دل پر آگ چھڑکیں گے نہ تاروں کے کنول
اس جہاں کی فکر بیش و کم کو بدلا جائے گا

زمزموں سے اب نہ آئے گی کراہوں کی صدا
تار جتنے ساز کے ٹوٹے ہیں جوڑے جائیں گے
اب نہ پہرہ ہوگا کوئی نطق کے اعجاز پر
جس قدر خاموش ہیں لفظے وہ گائے جائیں گے

اک نئی بنیادِ مے خانے کی ڈالی جائے گی
امتیازِ جام و مینا کو مٹایا جائے گا
زہر صہبا کو بنائے گا نہ دورِ آسماں
اب زمیں پر چاند تاروں کو بچھایا جائے گا

جگمگا اٹھتی ہے رہ رہ کر مری بزمِ خیال
ذہن میں رقصاں ہوں جیسے ماہ و انجم کے چراغ
بیک بیک کانوں میں آتا ہے رسیلا قہقہہ
بھر رہی ہو جیسے کوئی حور جنت میں ایاغ

سازِ گل پر جیسے گاتی ہو عروسِ نو بہار
جھوم اٹھے جیسے پائل کی چھما چھم پر شباب
شوق کی صورت گری یا خوابِ راحت ہو ندیم
زلف بکھرائے ہوئے آیا ہے کوئی بے حجاب

عنبر افشاں ہو گئی رنگین آنچل کی ہوا
میری سانسوں میں کسی کی سانس ہے مہکی ہوئی
بھر گیا تنہائیوں میں کہکشانوں کا نکھار
دل کے غم خانے میں پھیلی چاندنی ہی چاندنی

یہ مری جانِ تمنا ہے نگارِ انقلاب
جوشِ غم میں آئی ہے مجھ کو ہنسانے کے لیے
فرطِ تنہائی میں آغوشِ حسیں کھولے ہوئے
میرے اشکوں کو دامن میں چھپانے کے لیے

مطربِ عہدِ مسرت، ساقیٔ کیفِ حیات
دیتی ہے آہٹ سے اپنی عزم و ہمت کو ثبات!

شفیق فاطمہ شعریٰ

سوچنے کی بات

وقفہ وقفہ سے یہ سناٹے میں اک جھنکار کیا ہے
یہ شکست شیشۂ دل کی حسیں جھنکار کیا ہے
یہ نہ سوچو چاندنی کا سحر کیا ہے یہ نہ سوچو
درد میں ڈوبے ہوئے نظاروں کی چمکار کیا ہے
جو جلا کرتا ہے ماہ و کہکشاں کی وادیوں میں
آرزو کے اس دیے کا نور شب بیدار کیا ہے
خامشی کی وسعتوں میں تیرتی ہیں کتنی آہیں
ہر طرف دکھتے ہوئے زخموں کی یہ مہکار کیا ہے
انکشاف غم میں ہے گم انکشاف حسن عالم
اپنی منزل کھونے والا بھولا بھٹکا پیار کیا ہے
آہ شب پیما کی صورت پھیکا پھیکا، پھیلا پھیلا
گنبد مینا ہے یا اک تلزم اسرار سا کیا ہے
یہ نہ سوچو رات رانی ہے کہ اک فوارۂ گل
موتیوں کا ڈھیر یا تاروں کا اک انبار سا کیا ہے؟
بانسری سے جھیل کی موجوں میں مے گھلتی ہے کیونکر
یہ نہ سوچو یہ نہ سوچو شعلۂ آواز کیا ہے
کونسا منتر ہے جس سے موم ہو جاتا ہے پتھر
جو بتوں کے دل کو دھڑکاتا ہے وہ اعجاز کیا ہے
زندگی کا چشمۂ رنگیں قلم سے کیسے پھوٹا
خون دل الفاظ سے جھلکا تو اس کا راز کیا ہے

رقص کو کیسے ملیں اٹھکیلیاں بادِ سحر کی
بالوں کا مہرباں زخمہ ، دلوں کا ساز کیا ہے
آتش تخلیق سے پگھلی ہوئی فطرت کا نقشہ
نقش جس پر نقش گر کو ہو ابد تک ناز ، کیا ہے
فکر نو ہے نام جس کا ، ارتقا ، پیغام جس کا
رنگ اس نازک فرشتے کا دم پرواز کیا ہے
سر اٹھانے کی ذرا سی بھی ملے مہلت تو سوچیں
داستانِ زیست کا انجام کیا آغاز کیا ہے؟

سوچنے کی بات یہ ہے سر جھکا کر تم یہ سوچو
مفلسی کے ناگ کی یہ آتشیں پھنکار کیا ہے
سوچنے کی بات یہ ہے سر جھکا کر تم یہ سوچو
قرض خواہوں سے نجات دائمی کا راز کیا ہے
دال روٹی کے جہاں میں گمشدہ فنکار کیا ہے
اس کی عظمت کیا ہے اس کا کھوکھلا پندار کیا ہے
اس کے آنسو کیا ہیں اس کی ڈوبتی آواز کیا ہے
اک نگاہ تیز کا مارا ہوا انداز کیا ہے
دام کھوٹے بھی نہیں لگتے کنیز ان ادب پر
مصر اردو کیا ہے یہ اجڑا ہوا بازار کیا ہے
ہر طرف اک بے یقینی ہر طرف غربت گزینی
بجتے بجتے ٹوٹ جاتا ہے یہ فن کا ساز کیا ہے
سوچنے کی بات یہ ہے سر اٹھا کر ہم یہ سوچیں
یہ جہانِ آب و گل یہ عرصۂ پیکار کیا ہے؟

زبیر رضوی

انتظار

ہاں، اسی کُنج میں اک شام کوئی زہرہ جبیں
پرسشِ درد کو چپ چاپ چلی آئی تھی
اپنے دامن میں بہاروں کو چھپا لائی تھی

ہاں، اسی کُنج میں اک شام کوئی آیا تھا
دل بے تاب کی تسکین کا سامان لیے
عشق کے جذبۂ معصوم کا ارمان لیے

ہاتھ میں ڈالے ہوئے ہاتھ اسی کُنج میں ہم
دیر تک اپنی وفاؤں سے گلے ملتے رہے
دل کو نزدیکیٔ جاناں کے مزے ملتے رہے

ہاں، اسی کُنج میں اک شام کہا تھا اس نے
میں یہاں روز ٹہلنے کے لیے آتی ہوں
تم بھی آیا کرو بے تابیٔ دل کی خاطر
اور ہر شام نیا گیت سنایا کرنا
اک نئی دُھن نئے انداز سے گایا کرنا

پھر یہیں اور اسی کُنج میں ملنے کے لیے
ہم نے جب اپنی محبت کی قسم کھائی تھی
جانے کیوں چاند ستاروں کو ہنسی آئی تھی

اس ملاقات کو اب تین برس بیت گئے
میں اسی کُنج میں ہر شام چلا آتا ہوں
روز اک گیت نیا، دُھن میں نئی گاتا ہوں
آتی جاتی ہوئی شکلوں کو تکا کرتا ہوں
ایک اک کر کے ستاروں کو گنا کرتا ہوں

رات اس کُنج میں اس شوق میں کٹ جاتی ہے
جانے کب مجھ پہ عنایت کی نظر ہو جائے
جانے اس راہ سے کب اُس کا گذر ہو جائے

میکھ دوت

ادب برائے اکسپورٹ[1]

(ایک کانفرنس کی صدارتی تقریر کی رپورٹ)

ادب کے انقلابیو!

مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی کہ ہمارے ادب کے انقلابیوں نے وقت کے تقاضے کو محسوس کر کے اپنے بنیادی مقاصد کو دوبارہ پرکھنے کی کوشش شروع کر دی ہے اور یہ کانفرنس اس پرکھ کے سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ مجھے اس کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے بہت فخر محسوس ہوتا ہے اس لیے کہ مجھے آپ حضرات سے دل کھول کر باتیں کرنے کا موقع ملا ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے ہی عرض کیا اس کانفرنس کا مقصد ہے ایک نئے مقصد کی تلاش، مقصد کوئی مقررہ چیز نہیں، کوئی بندھی ٹکی چیز نہیں، بلکہ ایک بدلتی ہوئی نئے نئے جلوے دکھاتی نامیاتی اور غیر مابعد الطبیعاتی چیز ہے (ایک آواز: ذرا اس بات کو واضح کر دیجیے)۔

بات اتنی واضح ہے کہ مزید وضاحت کی ضرورت نہیں، سچائی، صداقت کیا ہے؟ (ایک آواز: آپ ہی بتلیے) جی ہاں بتاتا ہوں۔ سچائی دراصل ایک نقطۂ نگاہ ہے، ایک زاویۂ نظر ہے، چیزوں کو دیکھنے کا انداز و طریقہ ہے۔ سچائی بذات خود کوئی چیز نہیں، ہم جسے صداقت کہیں وہی صداقت ہے، ہم جسے غلط کہہ دیں وہی غلط ہے۔ یعنی بہ الفاظ دیگر صداقت میں جانبداری لازمی ہے اور صداقت تک پہنچنے کے لیے جانبدارانہ رویے کی ضرورت ہے ورنہ صداقت تک پہنچنا معدوم۔

تو حضرات آج کل کی سب سے بڑی صداقت کیا ہے؟ (ایک آواز: آپ) جی ہاں آپ نے بجا ارشاد فرمایا۔ اور یہ بات میں مذاق سے نہیں کہہ رہا ہوں اس لیے کہ جو بات آپ آج کہہ رہے ہیں وہ میں مدت دراز سے کہتا آیا ہوں اور آج آپ بھی اس کی صداقت ماننے پر مجبور ہیں۔

تو حضرات آج ہمارا سب سے بڑا مقصد کیا ہے؟ پہلے ہمارا مقصد تھا ایسا ادب تخلیق کرنا جو زندگی کے لیے ہو۔ آپ تو خود پڑھے لکھے ہیں (ایک آواز: جی نہیں ہم میں سے بہتیرے ادیب ان پڑھ بھی ہیں) بہرحال آپ پڑھے لکھے ہوں یا ان پڑھ ادیب تو ہیں، اس لیے اس بات سے بخوبی واقف ہوں گے کہ ہمارے ادب میں ایک عرصے سے ایک بحث چل

[1] برآمد

رہی تھی کہ ادب صرف ادب کے لیے ہو یا ادب زندگی کے لیے۔ یعنی ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بحث۔ آپ حضرات نے بالغ نظری کا ثبوت دیتے ہوئے ادب برائے زندگی کو اپنایا۔ . . . . . اور اپنے ملک کی زندگی کا ایسا نقشہ کھینچا کہ (ایک آواز: کہ خود زندگی کو شرم آنے لگی)۔ جی نہیں، ایسا نقشہ کھینچا کہ مزدوروں اور کسانوں کو یقین کامل ہو گیا کہ اگر ہمارے ملک میں ان کا کوئی دوست، ساتھی، رہنما اور راہبر ہے تو صرف آپ۔ جہاں ہڑتال ہوئی آپ نے ایک نظم، ایک افسانہ، ایک گیت ضرور لکھا اور جہاں گولی چلی وہاں (تو نظموں اور افسانوں کا ایک لامتناہی سلسلہ پیدا ہو گیا۔ حضرات میں آپ کو مبارکباد دینا چاہتا ہوں کہ آپ کے افسانوں اور نظموں کے بعد حالات میں ایسی بنیادی تبدیلی پیدا ہوئی کہ لوگ ہڑتالوں اور گولی کا انتظار کرنے لگے اور قحط کے لیے چشم براہ ہو گئے کیونکہ انھیں یقین ہو گیا کہ جب تک کوئی ایسا سانحہ نہ پیش آئے کوئی عظیم افسانہ نہیں لکھا جا سکتا۔ کوئی عظیم نظم تخلیق نہیں ہو سکتی۔ آپ نے جب امن کے موضوع پر قلم اٹھایا تو فضا میں فاختائیں اڑنے لگیں جن کی چونچ میں زیتون کی ڈالی اور زبان پر امن کے گیت تھے (ایک آواز: چونچ سے زیتون کی ڈالی گر نہیں گئی) دنیا کے کسی خطے میں آگ بھڑکی اور آپ کی امن پسند طبیعت میں جوش پیدا ہوا اور آپ نے نظموں کے ڈھیر لگا کر جنگ کے تاجروں کو روک دیا۔ سوچنے کا مقام ہے کہ جب معمولی جھڑپوں اور لڑائیوں کی وجہ سے آپ اتنی عظیم نظمیں اور افسانے تخلیق کر سکتے ہیں تو اگر دنیا میں نہیں ہی جنگ عظیم ہو گئی تو ہمارے عظیم شاعروں اور عظیم افسانہ نگاروں کی تخلیقی قوتیں کس زور و شور سے ابھریں گی۔ حضرات ہم ایٹمی توانائی کے دور میں ہیں اور مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر دنیا میں ایٹم بم گرنے لگے تو آپ کی عظیم نظموں اور عظیم افسانوں سے ایسے عظیم دھماکے بلند ہوں گے ایٹم بموں کا شور ان کے آگے پانی بھرے گا۔

لیکن آج حقیقت یہ ہے کہ جنگ کا خطرہ ٹل گیا ہے اور ہڑتالوں اور گولی کا زور بہت مدھم پڑ گیا ہے۔ اس لیے ہمارے ادب کے انقلابی کیا کریں؟ کیا ہم خاموش بیٹھیں؟ کیا ہم اپنے قلموں میں زنگ لگ جانے دیں؟ آج یہی سب سے بڑا سوال ہے جو ہمارے ادیبوں کو پریشان کر رہا ہے۔

یہی وہ سوال ہے جو بہت بڑا سوالیہ نشان بن کر سارے فن کاروں کے سامنے کھڑا ہے اور وہ خود کھڑے سوچ رہے ہیں کہ آخر لکھیں کس بات پر؟ کس موضوع پر؟ اور واقعی یہ ہے بھی بڑا مسئلہ۔ لیکن یہ الجھن اور پریشانی اس لیے ہے کہ ہم مقصد اور صداقت کے غیر نامیاتی اور مابعد الطبیعاتی نظریہ کے شکار ہیں۔ جب تک ہم دنیا کی بدلتی ہوئی حقیقتوں کو نہ دیکھیں گے ہمارے ادب میں جمود رہے گا۔

اور آج کی سب سے بڑی حقیقت کیا ہے؟ آج کی سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ جنگ کا خطرہ ٹل گیا ہے اور ہڑتالیں رک گئی ہیں اور فساد بند ہو گئے ہیں اور قحط پڑنا رک گئے ہیں۔ ایٹمی دور میں دنیا بہت چھوٹی ہو گئی ہے سارے ملکوں کو ہمسایوں کی طرح رہنا ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ بات ہے کہ سارے ملکوں کو ایک دوسرے کی تہذیب و تمدن ادب و فن سے روشناس ہونا ہے۔ اب انسان ہندستانی، پاکستانی، روسی، امریکی نہیں صرف انسان ہے اور یہ

بات بہت اہم ہے۔

یعنی آپ کو بین الاقوامی نقطۂ نظر اختیار کرنا ہے۔ آپ صرف ہندستان کے ادیب نہیں دنیا بھر کے ادیب ہیں اور اس لیے آپ کے قاری دنیا بھر میں بکھرے پڑے ہیں۔ آپ ان کے مطالبات پورے کیجیے۔ آپ ان کے لیے لکھیے۔ آج بہت سے ادیب شکایت کرتے ہیں کہ ہماری کتابیں شائع نہیں ہوتیں اور اگر ہوتی ہیں تو ایک ہزار کا ایڈیشن سمی گودام میں پڑا سڑا کرتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں اس میں غلطی کس کی ہے؟ خود ان ادیبوں کی۔ آپ کیوں سمجھتے ہیں کہ آپ ہندستان والوں کے لیے لکھتے ہیں۔ بس یہی کافی ہے کہ آپ ہندستان کے رہنے والے ہیں۔ ذرا آنکھیں کھول کر دیکھیے ایسے ملک موجود ہیں جو ہمارے ملک کی ہر چیز کو سر آنکھوں پر رکھنے کے لیے بیتاب ہیں۔ وہ تیار ہیں کہ آپ کی کتابوں کو لاکھوں جلدوں میں شائع کریں اور شہرت کی دیوی کو آپ کے قدموں پر لا کر ڈال دیں۔ ہم قلم کے مزدور ہیں اور اگر کوئی دوسرا ملک ہمارے قلم کی اجرت اتنی دینے پر تیار ہو کہ ہم سے پہلے کے ادیبوں نے نہ دیکھی نہ سنی تو پھر آپ کو اس میں اعتراض کیا؟ ایسی حالت میں تو غیر ادیب بھی ادیب بن سکتے ہیں نہ کہ ہم ایسے ادیب جنھوں نے ادب کے میدان میں جھنڈے گاڑ رکھے ہیں۔

اس لیے حضرات اب وہ وقت نہیں رہا کہ ہم ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی کی غیر حقیقی بحث میں الجھیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم سارے ادیبوں اور خاص طور پر ادب کے انقلابیوں کے سامنے ایک نیا مقصد، ایک نیا نعرہ، ایک نیا مسلک پیش کریں ـــــ ادب برائے اکسپورٹ۔ (ہال تالیوں سے گونج اٹھا ـــ لوگوں نے نعرے لگائے۔ "ادب برائے اکسپورٹ زندہ باد")

لیکن یہاں پہنچ کر میں چند چیزیں اور پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ہر نعرہ اس وقت تک صرف نعرہ ہی رہتا ہے جب تک اسے عملی شکل دینے کے طریقوں پر بھی پوری طرح عبور حاصل نہ کر لیا جائے۔ ادب برائے زندگی کو جب تک مزدوروں اور کسانوں کی ہڑتالوں اور سنچریوں پر منطبق نہیں کیا گیا اس وقت تک اس نعرے نے عملی شکل اختیار نہیں کی۔ اس طرح ہمیں ادب برائے اکسپورٹ کے عملی مسائل پر بھی غور کرنا چاہیے۔

ظاہر ہے کہ ہر قسم کی چیز دوسرے ملکوں میں شائع نہیں ہو سکتی صرف وہی چیز چلتی ہے جس کی مانگ ہو۔ آپ اس مانگ کا غور سے مطالعہ کیجیے اور اس کے مطالبات کے پیش نظر ادب تخلیق کیجیے۔ اگر آپ ادبی نفاستوں اور باریکیوں کے چکر میں پھنسے تو اول تو یہ بات ہیئت پرستی کے مترادف ہوگی جس کی ہم سب مذمت کرتے آئے ہیں اور دوسرے اس کا ترجمہ کسی بیرونی زبان میں ناممکن ہو جائے گا۔ یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ ہمارا مقصد ہیئت کے گورکھ دھندے میں پھنسنا نہیں بلکہ اپنا مقصد واضح کرنا ہے۔ ہم مقصدی ادب کے موئد ہیں اور ہمارا کیش ہے ترک رسوم۔ ہم معنی پر جان دیتے ہیں صورت پر نہیں۔

ہم اہمیت اس بات کو دیتے ہیں کہ کیا بات کہی جا رہی ہے نہ کہ کس طرح کہی جا رہی ہے۔ اس لیے ہمارے ضمیر کو مطمئن ہو جانا چاہیے کہ اگر ہم دوسری زبانوں اور ملکوں کے عوام کو اعلیٰ ادب سے روشناس کرانا چاہتے ہیں تو ہیئت و صورت

ہمارے لیے بے معنی چیز ہیں۔

مثال کے طور پر شاعری کو لیجئے۔ میں ہمیشہ سے کہتا آیا ہوں کہ غزل اظہار جذبات کا ناکارہ ذریعہ ہے اور یہ بات آج پورے آب و تاب کے ساتھ سب پر روشن ہوگئی ہے۔ ہم نے شاعری کو غزل سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ غزل نے کبھی کوئی عظیم شاعر پیدا نہیں کیا (ایک آواز: میر تقی میر کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے) آپ نے اچھا کیا کہ میر صاحب کا ذکر کر دیا۔ ان کے متعلق اتنا ہی کہہ دینا کافی ہوگا کہ وہ عطار کے لونڈے سے دوا مانگتے تھے۔ اور جو شخص لونڈے سے دوا مانگے وہ کبھی عظیم شعر تخلیق نہیں کر سکتا۔

تو حضرات میں عرض کر رہا تھا کہ غزل آج کل تو ہمارے مطالبات پر بالکل ہی پوری نہیں اترتی۔ میں پرانی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا اور غزل کی وہ تمام کمزوریاں اور مجبوریاں بیان کرنا نہیں چاہتا۔ جنھیں کئی بار اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ اس وقت تو میں صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ غزل کا کسی دوسری زبان میں اور خاص طور پر ہندستان سے باہر کی زبان میں ترجمہ تقریباً ناممکن ہے۔ آپ اگر صرف یہ چاہتے ہیں کہ اردو کے چند گنے چنے لوگوں ہی تک اپنا پیغام پہنچائیں تو الگ بات ہے ورنہ اگر مقصد یہ ہے کہ دنیا کے کروڑوں انسانوں کو جو آپ کی طرف پر امید نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں اپنے عظیم پیغام سے روشناس کرائیں تو اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ نظمیں لکھیے اور وہ بھی ایسے موضوع پر اور ایسے انداز میں کہ اس کا ترجمہ آسانی سے ہو سکے اور دوسرے ملکوں کے لوگ ہمارے عظیم کلچر اور ہمارے ملک کے عظیم پیغام سے واقف ہو سکیں

یہی بات افسانے اور ناول پر بھی صادق آتی ہے۔ پریم چند کی حقیقت پسندی اور سرت چندر کی مرقع نگاری کا زمانہ بیت گیا۔ سرشار اور رسوا کی زبان کا عہد بھی ختم ہوا۔ آپ خود سوچیے کہ اگر آپ آج سرشار اور رسوا کی زبان میں افسانے اور ناول لکھنے لگے تو اس کا ترجمہ دوسری زبانوں میں کیسے ہو سکے گا۔ اگر آپ نے پریم چند اور سرت چندر کی حقیقت پسندی اور مرقع نگاری پر زور دیا تو بین الاقوامی موضوعات پر کون قلم اٹھائے گا اور کس کو پڑی ہے کہ آپ کے ملک کی حقیقتوں کو اپنے ملک میں روشناس کرائے۔

آج اگر ٹیکنکو میں بغاوت ہوتی ہے تو وہاں کے باغی کسان اور مزدور کو آپ کے ناول اور کہانی کا ہیرو بننا پڑے گا آج آپ کے قلم کی زد سے کوئی باہر نہیں ہے۔ صرف ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ اپنے مقصد کو پہچانیں اور ادب کی لایعنی نفاستوں اور باریکیوں کے جھمیلے میں پھنس کر بین الاقوامی کھپت کے لیے ادب تخلیق کریں کہ یہی وقت کا تقاضا ہے اور یہی عہد کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

ادب برائے ایکسپورٹ زندہ باد

ادب کے انقلابی پائندہ باد

(ہال میں تالیاں بجتی ہیں، پھر پرشور تالیاں اور پھر سب لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں اور نعرے لگاتے ہیں

ادب برائے ایکسپورٹ زندہ باد و جناب صدر پائندہ باد!!

واجدہ تبسم

چاند محل

سراج بھائی کے خواب ہمیشہ سچ ہوتے تھے ـــــ فجر کی نماز سے قبل جو خواب دیکھتے وہ تو گویا ایک طرح کی بشارت ہی ہوتے ـــــ پہلی نیند کے جھونکے میں جو بھی نظر آتا وہ تو قابل فکر نہ ہوتا مگر جہاں صبح اٹھ کر سراج بھائی بولتے ـــــ

"رات، فجر کی اذان سے قبل میں نے دیکھا کہ بڑے ماموں میاں اپنے رومال سے آنسو پونچھ رہے ہیں" ـــ یا پھر ـــ "بڑے ہی تڑکے مجھے خواب دکھائی دیا کہ سارے گھر میں اندھیرا پھیلا ہوا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے اتنا بڑا چاند نکل آیا ـــ" تو سمجھ لو وہ بات بالکل سچ ہو کر رہتی ـــــ

بڑے ماموں میاں رومال سے آنسو پونچھتے دکھائی دیئے۔ اس کے چار دن بعد ہی گاؤں سے خط آیا۔ بڑی مامی اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں ـــــ چاند نکل آنے کی بات تو یوں سچ ہو گئی کہ بلقیس بیگم کی شادی کو ایک نہ دو پورے بارہ برس ہو گئے تھے ـــ سراج بھائی کو یہ خواب دکھائی دیا اور اس کے بعد ہی سننے میں آیا کہ بلقیس بیگم کو حمل رہ گیا ـــــ

چھوٹے میاں اچھے بھلے تھے ـــ جمعرات کی رات کو سراج بھائی یٰسین شریف پڑھ کر سوئے ـــــ بڑی بے کلی سے رات کٹی ـــ صبح ہوتے ہوتے ذرا کی ذرا جھپکی آ گئی ـــ مؤذن کی آواز پر اٹھ بیٹھے مگر ایسے پریشان پریشان کہ پوچھو مت ـــ ناشتے پر کسی نے پوچھا بھی کہ "سراج میاں ایسے چپ کیوں ہوتے ـــ اگر چپ چاپ ہی ہوتے تو کوئی بات نہ تھی مگر ان کے چہرے سے تو پریشانی ظاہر ہو رہی تھی ـــ اماں بولیں ـــ

"سراج میاں بولو پریشان کیوں ہے رہے ـــ" اس پر سراج بھائی اور بھی گم سم ہو گئے ـــ پھوپھی بی نے زور دے کر پوچھا ـــــ

"رات کو نیند تو اچھی لگی ـــ؟ انھیں معلوم تھا سراج میاں کو کوئی خواب دکھیں تو ایسے ہی سونٹھ بن جاتے ہیں ـــ بڑا دل کڑا کر کے بولے ـــ

"پھوپھی بی" ـــ اس پر چپ ہو گئے ـــ پھوپھی بی کے دل میں بڑا ہول آیا ـــ رسول پاک کی قسم دی

تب سراج بھائی منہ سے پھوٹے ــــ

"پھوپھی بی ــــ چھوچھا میاں کے سب درجے پورے ہو گئے"!

دوپہر کو چھوچھا میاں کھلیان سے لوٹے ــ کھانا کھایا بات چیت کی ــ لوٹ پوٹ کی ــ سہ پہر کو اٹھے تو بولے "دل کے پاس درد سا محسوس ہو رہا ہے" ــــ دیکھتے ہی دیکھتے "یا اللہ" کا نعرہ لگایا اور چل بسے ــــ بعد میں سراج بھائی نے بتایا کہ رات میں مجھے ایسا خواب دکھائی دیا کہ چھوچھا میاں اپنے خاندانی ہڑواڑ میں دادا میاں کی قبر کے پائنتی کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں ــــ

"مجھے یہی جگہ پسند ہے" ــ اس پر دادا میاں بولے بھی کہ نہیں میاں پائنتی کاہے کو ٹپرو ــ ادھر سرہانے آکر سو جاؤ" ــ تو کہنے لگے نہیں میں تو آپ کے قدموں میں ہی اچھا ہوں" ــــ

سراج بھائی بھی بس اللہ والے تھے ــ پانچوں وقت کی نماز، روزے، خیرات ــ سب ہی میں ہاتھ اونچا ہی اونچا تھا ــ اماں تو بولیں کہ میرے گھر میں میرے میاں کے دم سے ہی ساری برکت ہے ــ سراج بھائی کو وہ پیار سے میاں ہی کہا کرتیں ــــ سراج بھائی کی شادی کا اماں کو بڑا ارمان تھا ــ مگر سراج بھائی کو دیکھو کہ اماں کی ایک نہ سنتے ــ یوں احکام خداوندی کی پوری پیروی کرتے مگر یہیں آکر بدل جاتے ــ اب پوچھو بھلا کیا ماں کی بات سننا اور ماننا، خدائی حکم نہیں ہے ــــ ؟؟ ایک دن کسی کے کہنے سننے پر اناضر در بولے تھے کہ "مجھے تو لگتا ہے کہ خواب سے ہی مجھے بشارت ملے گی کہ کب ہے میرا شادی" ــ بس تب ہی کر لوں گا"

اماں سراج بھائی کا بڑا مان رکھتیں ــ ان کی کوئی بات نہ ٹالتیں ــ بولیں "میرا میاں تو اللہ والا ہے اس کا رخ دیکھ کے بات کرتی ہوں" ــ اور تھا بھی ایسا ہی ــــ کبھی تو اماں ان کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرنے کو نہ کہتیں ــــ سراج بھائی یوں مولوی کب تھے مگر ان کے خوابوں نے انھیں گھر بھر میں . . . باقاعدہ پیر کا درجہ دے دیا ــ ایم اے پاس تھے ــ یہ بھی نہیں کہ جاہل لٹھ ــ انگریزی، اردو، عربی، فارسی سب ہی آتی تھی ــ ہاں انتاضر در تھا کہ عربی بہت پڑھی تھی ــ لوگ باگ پوچھتے "اللہ میاں نے اور کسی اولاد میں یہ گن نہ دیے کہ سراج میاں کو ہی کیوں نواز دیا" ــ اب یہ تو اوپر والا ہی سمجھے تو سمجھے ــ ویسے اصل بات یہ تھی کہ سراج بھائی کبھی بھولے سے بھی ادھر ادھر نہ جاتے ــــ اماں قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتی تھیں کہ میرا میاں معصوم بچہ ہے. جیسے ابھی ماں پیٹ سے نکلا ہو ــــ اور یہ اسی پاکی اور معصومیت کا نتیجہ تھا کہ اس کے خواب سچے ہوئے.

یہ تو رہی خواب کی بات ــــ سراج بھائی تعبیر بھی ایسی دیتے کہ ادھر سے ادھر بال برابر بھی فرق نہ آتا.

زاہدہ بیگم کو خواب دکھائی دیا کہ ان کے میاں لنگڑے ہو گئے ہیں ــ مگر پھر چلنے لگے ــــ زاہدہ بیگم نے سراج بھائی کو اپنا خواب بتایا ــ چھوٹتے ہی بولے "نوکری چھوٹ جائے گی ــ مگر دیکھ لینا پھر لگ جائے گی ــ لنگڑے

ہوکر اچھا ہو جانا تو یہی بتاتا ہے۔"

تھوڑے دنوں کے لیے زاہدہ بیگم کے میاں کو نوکری سے نوٹس ملا مگر مہینے بھر کے بعد ہی کام سے لگ گئے۔ جُھنّا اماں پڑوس میں رہتی تھیں ـــــ ظہیر میاں کے پاس بھی آنا جانا تھا ـــــ ایک دن صبح ہی صبح بڑی گھبرائی گھبرائی سی آپی اور سراج بھائی سے پوچھنے لگیں ـــــ سراج بھائی منہ دھوتے بیٹھے تھے ـــــ بولے "خیر تو ہے جُھنّا اماں ـــــ ایسے گھبرائی ہوئی کیوں ہو ـــــ"؟

بولیں "کیا بولوں بیٹا ـــــ صبح ہی صبح اذان سے پہلے دکھائی پڑا کہ پوری بستی میں آگ لگ گئی ہے ـــــ لوگ باگ گھروں سے نکل نکل کر بھاگ رہے ہیں ـــــ اتنے میں ایک نورانی صورت بزرگ دکھائی پڑے اور بولتے ہیں "ارے بھاگنے سے کیا ہوگا ـــــ اپنی جوان لڑکیوں کو لیکر ادھر جاؤ ـــــ اور ایسا کہہ کر انھوں نے ہاتھ سے ایک راستہ دکھایا ـــــ سب ادھر کو چل پڑے ـــــ مگر میاں اتنے کے اتنے میں مجھے کیا دکھائی پڑتا ہے کہ جیسے میرا گھر بھی جل رہا ہے ـــــ اور میری ٹٹی سکینہ ادھر سے ادھر بکھنڈی سی پھر رہی ہے ـــــ جانے اسے کیا ہوا کہ اکدم اپنے دوپٹے کو جان بوجھ کر آگ لگا لی ـــــ میں پوچھتی ہوں ـــــ اری باؤلی یہ آگ کیوں لگا لی تو جواب دیتی ہے ـــــ اماں جی لیٹرے آرہے ہیں لیٹرے ـــــ عزت کے ـــــ عصمت کے لوٹنے والے ـــــ اس سے اچھا تو ہے کہ خود ہی جل مروں ـــــ" بس اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی ـــــ! سراج بھائی گم سم ہوگئے ـــــ

"میری سمجھ میں آیا نہیں اچھی طرح ـــــ میں بڑی مسجد کے پیش امام جی سے پوچھ کر بتاؤں گا جُھنّا اماں!"۔

اُس رات سراج بھائی نے گھر بھر کے مردوں سے کہہ دیا ـــــ "بڑی زوردار جنگ ہونے والی ہے ـــــ بڑے خون خرابے ہوں گے میں کہے دیتا ہوں جُھنّا اماں کا خواب تباہی کی نشانی ہے ـــــ"

سلام میاں نے ہنسی میں اڑانا چاہا ـــــ "ارے میاں جانے دو نا ـــــ اب سب ہی کے خوابوں کی تعبیر دینے لگے ـــــ وہ جُھنّا اماں ایک خرانٹ بڑھی ہے ـــــ"

"کیا بات کرتے ہیں سلام بھائی آپ بھی ـــــ جُھنّا اماں کو میں نے خود جاڑے پالے میں ٹھنڈے یخ کر دینے والے پانی سے وضو بناتے دیکھا ہے ـــــ اور یہ خواب تو انھوں نے جمعرات کی رات کو دیکھا ہے، وہ بھی صبح صادق سے قبل ـــــ"

"تم ہو بھولے سالے ـــــ لوگوں کی باتوں میں آجاتے ہو ـــــ اب بٹھے بٹھائے کا ہے کی بیہا آنے والی ہے ـــــ ہشت ـــــ"!

"دھنّا میراثن نے ڈھول اپنی طرف کھینچا ـــــ اُس کی بکی تنگ کی ـــــ اور تھاپ دی ـــــ

دولہن میری بیچ رفی سنہری گوٹے سے!

"چل ہٹ ادھر سے" اماں نے ڈھول اپنی طرف کھینچا ۔۔۔ "تجھے اتنی بھی سمجھ نہیں ۔۔ مہندی چڑھ رہی ہے اور سنہری گوٹوں کا گیت لے بیٹھی ۔۔۔"

اماں کی بڑے دنوں کی آرزو پوری ہونے کو جا رہی تھی ۔۔۔ اپنی نند کی بڑی بیٹی کو پیام دیا اور بات بھی پکی ہوگئی ۔۔۔ شادی کا ابھی کچھ طے نہ تھا مگر اماں نے سوچا منگنی ہی کر ڈالیں گے ۔۔۔ اماں کا کیا ہے ۔۔؟ جب کرنے پر اتر آتی ہیں تو چھوٹے موٹے کاموں بھی ہزاروں کا خرچہ لگا دیں ۔۔۔ اب یہ منگنی کا رسم دیکھو اور جھوڑ جھنکا ۔۔۔

پلنگ چاندی کا = ایک عدد
چوکی چاندی کی = ایک عدد
گنگال تانبے کا (چاندی کا پانی کا چڑھا ہوا) = ایک عدد
مسہری کے ڈانڈے چاندی کے = چار عدد
سونے کی انگوٹھیاں (دسوں انگلیوں کی) = دس عدد
گلوبند جڑاؤ = ایک عدد
پازیب سونے کی = ایک عدد
کھڑے دوپٹے تاش کے = پانچ عدد
کرتیاں تاش کی = پانچ عدد
چولیاں سرخ باناتی = پانچ عدد
آڑے پاجامے ۔ مشجر اور سرخ = پانچ عدد

اتنی لمبی چوڑی فہرست بنا کے دی سراج بھائی کو ۔۔۔ کہنے لگیں "میاں تیری شادی پر تو اصل ارمان نکلیں گے ۔۔۔ یہ تو دل بہلاوا ہے"

سراج بھائی ہنس کر بولے "اماں جو آپ کے جی میں آئے کر لینا ۔۔۔ مگر اس کو دل بہلاوا کہنا تو زیادتی ہے نا ۔۔۔"

"لے میں کہتی ہوں تیری عقل ماری گئی ہے ۔۔۔ اور یہ ہے ہی کیا ۔۔۔؟ ارے بیٹا تم نے ہمارا زمانہ ہی کہاں دیکھا ہے ۔۔۔!

اماں کو اس بات کا بڑا خلق رہتا کہ ان کا زمانہ کسی نے نہیں دیکھا ۔۔۔ اپنے وقتوں کی کیا کیا باتیں اماں کرتیں

کہ سن لو تو یقین نہ آئے ـــ مگر اماں جھوٹ بولنے والی تھوڑی ہی ہیں ـــ اماں کے سکے میں پیسہ اس غضب کا تھا کہ اٹھائے نہ اٹھتا ـــ رکھے نہ رکھا جاتا ـــ

"اے میری زبان ہے جو جھوٹ بولوں ـــ ہماری اماں کے گھر میں ایک کوٹھری تھی ـــ اچھی خاصی چوڑی چکلی ـــ وہاں روپوں کے بدرے پڑے رہتے ـــ لگان آتا ـــ کپاس بکتی ـــ گیہوں بکتا، جو بھی روپیہ آتا وہاں جمع ہوتا ـــ میں جھوٹ کیوں بولوں گی ـــ ایک برسات ایسی آئی کہ کوٹھری ٹپکنا شروع ہوگئی ـــ بدرے پڑے سڑتے رہتے اور سارے روپے ایک دوسرے سے جڑ گئے ـــ بیلوں کی جوڑی جلوائی گئی تب کہیں جاکر روپے کھلے۔"

سراج بھائی گھر بھر کے بچوں کے ساتھ مل کر پتنگیں اڑاتے غلیل چلاتے تو اماں کہتیں ـــ

ارے تم لوگوں نے دیکھا ہی کیا ہے ـــ یہ بھی موئے کوئی کھیل ہیں ـــ تمھارے ماموں تھے ـــ کبوتر پالتے مرغ ـــ اصیل مرغ پالتے ـــ بھینسے پالتے ـــ ہزاروں کا تو میوہ ہی کھلا دیتے اور پھر انھیں لڑاتے ـــ پورے گاؤں میں ان کے مرغوں، کبوتروں کی دھاک تھی ـــ وہ وہ لڑائیاں ہوتیں کہ بس ـــ جس دن مقابلہ ہوتا وہ وہ تیاریاں ہوتیں ـــ باہر والے صحن میں چھڑکاؤ کرکے تخت بچھا دیے جاتے ـــ اس پر چاندنیاں اجلی اجلی ـــ اور پھر سارے تماش بینوں کے لیے چائے پانی ـــ پورے گاؤں میں دھوم مچ جاتی کہ آج حسین میاں کے کبوتر لڑنے والے ہیں۔"

اب بھی اللہ رکھے اماں کا وہی زور تھا ـــ پیسے کی کیا کمی تھی ـــ گاؤں جیسے گاؤں ـــ ان کی ڈھیروں آمدنی ـــ گاؤں کی رعیت اپنی غلام ـــ یہی اماں کی زندگی تھی ـــ مگر بڑے ماموں تو یہ کہتے تھے کہ اب پچھلا زمانہ نہیں رہا وہ بات ہی ختم ہوگئی ـــ کہاں وہ باوا جان کا طنطنہ اور کہاں ہماری یہ ردی حالت ـــ اللہ جانے کیا قارون کا خزانہ دیکھ بیٹھے تھے کہ کوئی چیز لگا ہوں میں نہ رچی ـــ

اماں کو اپنی شادی کے قصے سنانے میں بڑا مزہ آتا ـــ "اے چاندی کی تھالیوں میں لڈو بٹے تھے ـــ پوری بارات کو ـــ اور بارات بھی آئی آئی تھی ـــ پورا گاؤں اٹا پڑا تھا ـــ اور پھر ہمارے باوا جان کا ہاتھ ـــ کہ ٹہری نام کو نہ تھی ـــ سننے والوں نے تو منہ میں انگلی دے لی تھی ـــ اے میں کہوں دنیا بھی کون ہے چاندی کی تھالیاں ـــ اور ایسی تھالیاں ہنس کر ماتھے میں گدھا مار دیا جیسے ـــ پتلی پوٹ پڑا ـــ ارے دس دس تولے کی ایک ایک تھالی تھی۔"

اماں نے بڑے چاؤ چونچلوں سے سراج بھائی کی بات پکی کی ـــ منگنی میں بڑا دھوم دھڑکا مچایا ـــ چار دن پہلے سے تو دھنا میراثن اپنے پورے گھرانے کو لیے بیٹھی تھی ـــ اماں کا کہنا تھا "چلتے چالے شادی بھی رچا ہی ڈالو میٹا۔ پھر میرا اتھا کا وقت آرہا ہے یا جارہا ہے ـــ دیکھ لو بیٹھتی ہوں تو کھڑا ہونا مشکل ـــ کھڑی ہو جاؤں تو بیٹھنا مشکل۔"

سراج بھائی نے نا نہیں کی ـــ بولے "اماں مذاق سے کہتا تھا میں تو ـــ بھلا خوابوں کے سہارے بھی جیا کرتے ہیں ـــ آپ مقرر کر لیجئے تاریخ ـــ آپ کی خوشی میرا دین ہے ـــ"

اماں نے چٹ چٹ بلائیں توڑیں ـــ ایسے سعادت مند بچے ہوتے ہی کہاں ہیں ـــ چار حرف پڑھ کر ماں باپ کو بے ارے کرتے پھرتے ہیں ـــ سراج میاں جیسا بیٹا ایک تو ہولے ـــ اماں کو اور کیا چاہیئے تھا؟ ابھی تو منگنی کے پونچھے ہو رہے تھے ـــ ادھر اماں نے شادی کی بھی دھوم مچادی۔

سب سے پہلے تو اماں کو گھر سجانے کی سوجھی ـــ

اماں کا یہ گھر بھی ایسا ویسا نہ تھا ـــ ہزاروں سے روپیہ اس کی اینٹ اینٹ میں بھر آگیا تھا ـــ یہ لٹکتے ہوئے بڑے بڑے فانوس اماں نے ابا سے لڑ لڑ کر شہر سے منگوائے تھے۔ دیوار گیریوں کے چم چماتے جھالر دار رنگ برنگے پردے، جن پر موتیوں کی بیلیں مڑھی ہوئی تھیں ـــ ایک ایک پردہ اتنے روپیوں میں آیا تھا کہ پورے سال بھر کی لگان بھی پوری نہ پڑ سکی ـــ اماں کو اچھی اچھی چیزیں جمع کرنے کا کیا شوق تھا ـــ ؟ ؟ تھیں تو پرانے زمانے کی۔ مگر اپنے گھر کو ایسا سجا کر رکھا کہ بڑے بڑے انگریزی داں بھی آئیں تو حیران بھونچک تک دیکھتے جائیں ـــ ابا جان کے کسی دوست کی بیگم انھیں شہر لے گئی تھیں ـــ وہاں ان کے ڈرائنگ روم میں میز پر بیچوں بیچ ایک مجسمہ بھی رکھا ہوا تھا ـــ پیٹھ پر ترکش میں تیر ـــ اور ہاتھ میں کمان ـــ بس اماں گھر آکر ابا کے سر ہی تو ہو گئیں کہ "ہمارے گھر میں بھی ویسا ہی مجسمہ لاؤ"۔

ابا ہاں ہاں کر کے ٹالتے ہی رہے پھر بھی لاتے ہی بنی ـــ وہ تو اماں تھیں ـــ جو سوچتیں وہ کر نہ گزرتیں ـــ ؟ ؟ ـــ

ایسا خوبصورت گھر تھا کہ گھر کہنا بھی اس کی شان کو گھٹانا تھا ـــ سامنے ہی باغ تھا ـــ ہرا بھرا ـــ پھول بیلوں سے لدا پھندا ـــ باغ کے بیچ میں حوض ـــ رنگا رنگ مچھلیاں ـــ ابا کبھی مذاق کی جون میں آتے تو بولتے ـــ

"ایک جنت تو شداد نے زمین پر بنائی تھی ـــ یا پھر اب ہماری بیگم نے بنائی ہے"۔

شداد تو آرزو لے کر ہی چلتا بنا ـــ یہاں تو اماں بھرپور راج رنج رہی تھیں ـــ ایک کھڑکی ایسی تھی چھت پر ـــ کہ ادھر چاند نکلا ادھر چھکا چک اجالا گھسا پڑے کمرے میں ـــ کھڑکی میں سے پورا چاند بیٹھے بٹھائے نظر آتا ـــ مامون جان نے ایک بار دیکھا تھا تو مسکرا کر بولے تھے ـــ

"سچ مچ اگر تو پورا چاند محل ہے ـــ فرق ہی کیا ہے؟ وہ بھی روشن ـــ یہ بھی روشن" ـــ بس تب سے اماں والے گھر کا نام ہی چاند محل پڑ گیا ـــ اور ابا تو حیرت بولتے ہی تھے ـــ

سراج بھائی کو سدا چاند محل دیکھ کر تھرتھلاتی ـــ تھے تو اللہ والے ـــ کچھ نہ کچھ خیال آتا ہی ہوگا۔

بیٹھے بٹھائے بولنا شروع کرتے ــــ

"کسی چیز کا، گھر کا، بچے کا، جانور کا نام بھی ذرا سمجھ بوجھ کے رکھنا چاہیئے ــــ یہ کیا ہے جو دل میں آیا اٹھا یار کو دیا ــــ اب بھلا چاند محل بھی کوئی نام ہے ــ نام رکھتے وقت کچھ خیال ہی کیا ہوتا ــــ چاند میں سیاہ سیاہ سا دھبہ ہے ــ اور میں کہتا ہوں جو چاند محل کو بھی سیاہی گھر گئی تو ــــ؟؟ ابا مرحوم جنت کہہ کہہ کر مر گئے ــــ اس جنت میں کسی کو رہنا بسنا نصیب نہ ہوا ــ میں کہتا ہوں پہلے کے یہ بزرگ ــــ؟

چاند محل میں رات بے رات چاند نی جھلکتی رہتی ــــ یہ منّواں ہے ــ لمبے لمبے بالوں والی ــ ایسے لمبے بال تھے کہ ایک رات خالہ بی اپنے بستر پر اٹھ بیٹھیں ــ چلا چلا کر پورے گھر کو جمع کر لیا۔

اے ڈریو ــــ سانپ ــ ناگ ہے پورا ــــ ارے بچاؤ بچاؤ ڈریو کی ہا ہا کار سن کر سب ہی تو جاگ پڑے ــ تبی اونچی کی اور دیکھا تو منّواں کی چوٹی ان کے پلنگ سے نیچے لوٹ رہی تھی ــ

"اے بی تم اپنے بال سمیٹ، کر رکھا کرو ــ جی ہول گیا موا ــــ بھلے کو دم نہ نکل گیا میرا ــــ" وہ ہنسی کی دھوم مچی پورے گھر میں کہ توبہ ــــ اب منّواں بیچاری ہے کہ شرمائے جا رہی ہے، تھوڑی تھوڑی ہوئی جا رہی ہے ــــ نہا کر بال کھلے چھوڑ دیتی تو لگتا سیاہ چادر ہے جو پورے جسم پر لپیٹ لی ہے ــ شمّو بیگم تھیں ــ وہ بھولا بھالا چمکتے چاند ایسا پیارا چہرہ ــ پیاسا دیکھے تو پیاس بھول جائے ــ ہنستی تو پھول جھڑتے ــ دھان پان ایسی کہ چلتی تو دھڑکا لگا رہتا کہ ہوا سے اڑ نہ جائے ــ پتلے دبلے ہاتھ پاؤں ــ اُجلی اُجلی نازک انگلیاں ــ چھڑیا تھی ــ ہونٹ سے ہونٹ تو ملتے ہی نہ تھے کبھی ــ جب دیکھو تب ہنس رہی ہے ــ مسکرا رہی ہے ــ چلتے میں کسی کو ٹھولا مار دیا کسی کو دھکا دے دیا اور بس وہی ہلڑ مچانے میں اوّل نمبر ــــ اور چھریرے بی بی ــ صابرہ بیگم ــ شمّو بی ــ سبھی تو تھیں ــ چاند محل میں رات دن ہزاروں چاند چمکا کرتے ــ کہ دیکھنے والی آنکھیں چکا چوند ہو کر رہ جاتیں۔

کس بات کی کمی تھی ــــ پھر بھی اماں تل گئیں گھر سجانے کو ــــ اور سچ جو پوچھو تو سجانے کو تھا بھی کیا ــــ؟ ہر چیز تو اپنی جگہ درست تھی ــــ نندوں، بھاوجوں نے چھیڑ اتواں بولیں۔

اُئے غصّہ نہ دلاؤ بہن ــــ ماں کا دل لے کر دیکھو تب پتہ چلے گا ــــ اور اب تو اللہ رکھے میرے گھر خوشیوں کا زمانہ آ رہا ہے۔ بٹیا تو ایک تھی سو پیا کا دیس بسانے چلی گئی اب میرا میاں ہے۔ خوشیوں کا مینہ برسے گا مینہ ــــ اور کیا ــــ؟ دیکھو پورے گھر میں وہ رونق دوڑ جائے گی کہ لوگ منہ تکیں گے" پھر وہ بڑی بھاوج سے رائے لینے پر جٹ گئیں ــــ

"میں کہوں سونے کی پائلیں ہوں اور ان میں گھونگرو تو گھر میں ذرا بھی تو پتہ چلے گا کہ بہو آئی ہے"

"سونے کے چند ہار میں چمکیوں کی بجائے چتّوں کی نتھ ڈلواؤں گی ــــ وہ تو پرانی وضع ہے سو ئی ــــ

سلیمہ آپا کی بیٹی کے پاس تو وہی پرانا سا ہے ۔"!

"اجی بڑی آپا ۔۔۔ زمانہ بدل رہا ہے ۔۔۔ اکلیاں اور کھڑے دوپٹے تو ہوں گے ہی ہوں گے ۔۔۔ میں کہوں تھوڑی بہت ساڑیاں کیوں نہ خرید لیں ۔۔۔ شہر سے وہ سراج میاں کے دوست کی بہن آئی تھیں نا ۔۔۔ کیسی جگ مگ جھکا جھول ساڑی تھی ۔۔۔ پلو پر کامدانی بھی تھی اور کرن کا حاشیہ بھی ۔۔۔"!

ڈھیروں کپڑا تھا اور گوٹا پٹھہ کناری کی وہ ریل پیل کہ لگتا! آپا نے نیازی کی دکان کھول لی ہے ۔۔۔ شادی کے دن قریب آ رہے تھے اور اماں کا جلووں خون بڑھتا جاتا ۔۔۔ بڑھاپا تو تھا مگر گال دیکھو تو خون جھلکی مارا جاتا تھا۔ چال میں وہ تیزی اور طنطنہ آ گیا تھا کہ پلنگ سے اٹھیں تو پلنگ کی نواڑ ساری چرچر کر رہ گئی ۔۔۔ گرد کی ایسی دھول اڑی کہ چھوٹی نند کو بھی مذاق کا موقع ہاتھ لگ گیا ۔۔۔

"بھاوج ماں ۔۔۔ اب یہ حال ہے تو نہ جانے کیا غضب ڈھاتی ہوں گی پہلے آپ ۔۔۔" اور وہ معنی خیز ہنسی ہنسنے لگیں ۔ اماں بھی ہنسیں ۔۔۔ "اری بوڑھی سے مذاق کیا کرتی ہے ۔۔۔ گذر گیا وہ زمانہ بھی ۔۔۔ یہ تو اولاد کے دیکھنے کے دن ہیں ۔۔۔"

چاند محل میں وہ گڑبڑ ہوئی کہ توبہ ۔۔۔ لوگ راتوں کو سونا بھی بھول گئے ۔۔۔ چاند دھیرے دھیرے چڑھتا ہوا بڑے کمرے میں گھس جاتا ۔۔۔ گلاب کی ٹہنیاں نیچے جھک آتیں ۔۔۔ موتیا کے پھولوں کی خوشبو سارے محل میں رچ بس جاتی ۔۔۔ اندھیرے اجالے آنکھ مچولی کھیلنا شروع کر دیتے اور ادھر چھوکریاں بالیاں ہیں کہ نیند آنکھوں سے اڑ کر بھاگ گئی ہے ۔۔۔ غرارے سل رہے ہیں ۔۔۔ کرتے قطع ہو رہے ہیں ۔۔۔ چمکیوں اور کرن کے پٹڑے کے پٹڑے کھل رہے ہیں ۔۔۔ رات ہے مگر فانوسوں کی وہ جگ مگاہٹ ہے کہ پتہ نہیں چلتا دن کدھر سے گھس آیا ہے ۔۔۔ جو چم چم کرتا اجالا ہے ۔۔۔ زری اور بادلے کے ڈھیر کرنیں سی پھینک رہے ہیں ۔۔۔ اور دھڑا دھڑ سلائی ہو رہی ہے ۔

"اماں رات کو آبا خواب میں دکھائی دیئے ۔۔۔ ناشتے پر ایک دن سراج بھائی بولے ۔۔۔
اماں کے ہاتھ کا نوالہ چھوٹ کر رکابی میں جا گرا! ۔۔۔ "سچ ۔۔۔"؟ پھٹی ہوئی آنکھیں بول اٹھیں ۔۔۔
"ہاں ہاں جھوٹ تھوڑے ہی کہہ رہا ہوں ۔۔۔" سراج بھائی کنمنی سی آواز میں بولے ۔۔۔
"کیا کہا ۔۔۔" اماں سہمی ہوئی سی آواز سے بولیں ۔۔۔
سراج بھائی ہنس پڑے ۔۔۔ "بولے دو بولے کچھ بھی نہیں ۔۔۔ بس میں کھڑا تھا تو مسکرا کر دیکھتے رہے اور پھر جیسے ہوا میں اڑ گئے ۔۔۔ بعد میں دیکھتا ہوں تو آبا تو اڑے چلے جا رہے ہیں اور دونوں ہاتھوں میں کوئی چیز پکڑے

ہوتے ہیں ۔۔۔ غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ گیہوں کی دو موٹی موٹی روٹیاں ہیں ۔۔۔ اماں ۔۔۔ خواب میں مردے کا کھانا دکھائی دینا بہت بُرا ہے ۔۔۔ میں آج ہی آپا کو دو پارے پڑھ کر بخشوں گا ۔"

جیسے اماں کو کچھ یاد آیا ۔۔۔ بولیں "ہاں میاں اگر خواب میں دانت گرے ہوئے دکھائی دیں تو ؟؟"

سراج میاں ہڑبڑا کر بولے "کیوں ۔۔۔ کس کو دکھائی پڑے ۔"

اماں بھی ہول کھا گئیں بولیں "مجھے ہی دیکھے میاں ۔۔۔ بس میں اسی چوکی پر آنگن کی طرف منہ کر کے بیٹھی تھی ایسا لگا جیسے میرے دانتوں میں پُل سی ہو رہی ہے ۔۔۔ بس میں نے ذرا کی ذرا ہتھوکا ۔۔۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک ایک کر کے سارے دانت گر گئے پھر اس کے بعد میری چوکی کو آپ ہی آپ دھکا سا لگا ۔۔۔ اس کے بعد جانے اور کیا دکھتا کہ اکدم کسی نے میرے پلنگ کو دھکا دیا اور میری آنکھ کھل گئی ۔۔۔"

سراج میاں نے کھاتے برتن پرسے ہاتھ سمیٹ لیا ۔۔۔ دلی پریشانی چھپا کر بولے "خیر ۔۔۔ ایسے خواب تو دیکھتے ہی رہتے ہیں ۔۔۔ آیتیں دم کر کے سونا چاہیے ۔۔۔ پھر انھوں نے سب کو سنایا ۔" میں ایک آیت بتاتا ہوں ۔۔۔ اسے پڑھ کر سینے پر دم کر لینا چاہیے ۔۔۔ اللّٰھُمَّ بِسْمِكَ اَمُوْتُ وَاَحْیَا اور پھر سیدھی کروٹ سو جانا چاہیے ۔۔۔ بائیں کروٹ کوئی نہ سوئے ۔۔۔ دل دبتا ہے تو برے برے خواب نظر آتے ہیں ۔"

اس رات سراج میاں کا دل آپ ہی آپ ہول ہو رہا تھا ۔۔۔ جمعرات کی رات تھی ۔۔۔ وضو کر کے انھوں نے یٰسین شریف پڑھا ۔۔۔ سوتے وقت آیۃ الکرسی پڑھ کر دم کی اور سیدھی کروٹ سو رہے ۔۔۔ نیند جیسے شرط لگا کر بیٹھی تھی کہ آؤں گی نہیں ۔۔۔ سراج میاں کا دل تھا کہ ڈوبا جا رہا تھا ۔۔۔ جاگتے جاگتے ہی تین کے گھنٹے ہو گئے ۔۔۔ چاند اتر کر گھٹ رہا تھا ۔۔۔ سراج میاں نے تہجد کی نماز پڑھی ۔۔۔ دیر تک بیٹھے وظیفہ کرتے رہے ۔۔۔ پھر آ کر لیٹ گئے ۔۔۔ چاند سیدھا منہ پر تپک رہا تھا ۔۔۔ جھاڑ کی اوٹ میں ہوا تو ان کے منہ پر اندھیرا پڑ گیا ۔۔۔ اور ان کو ذرا کی ذرا جھپکی سی آ گئی ۔۔۔ آنکھ جو پٹ سے کھلی تو ٹوٹی مسجد کے موذن کی آواز کان میں پڑی ۔۔۔ اکدم اٹھ بیٹھے ۔۔۔ جسم پسینہ پسینہ ہو رہا تھا ۔۔۔ سانس دھونکنی ایسے چل رہی تھی ۔۔۔ ہاتھ پیر کانپ رہے تھے ۔ آنکھوں پر ہاتھ پھیرے تو گیلی گیلی سی تھیں ۔۔۔ پھر اکدم سے وہی خواب آنکھوں میں پھر گیا ۔۔۔ دیکھتے کیا ہیں کہ بڑا پرا سرار اندھیرا سارے کو میں پھیلا ہوا ہے اور کچھ بھی نظر نہیں آتا ۔۔۔ دیکھتے ہی دیکھتے لال لال روشنی سی پھیلی ۔۔۔ اور اجالا ہو گیا ۔۔۔ اب جو غور سے دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ لال روشنی جو پھوٹ رہی ہے وہ سچ ہے کہ نہیں ۔۔۔ خون کا دریا جیسا ہے اور چمکے جا رہا ہے ۔۔۔ پھر کیا ایک چاند محل ڈولنے لگا ۔۔۔ ہوا نہیں ۔۔۔ ہوا کا ہلکا سا جھونکا تک بھی نہیں مگر عالم یہ ہے کہ چاند محل کٹی پتنگ کی طرح ڈولے جا رہا ہے ۔۔۔ اتنے میں دکھائی دیا کہ اماں ادھر سے شعل لیے آتی ہیں ۔۔۔ دھاڑوں

سے رو رہی ہیں مگر منہ سے کچھ بولتی نہیں ـــــ سراج میاں پوچھتے ہیں کہ اماں ہوا کیا ـــ بولو تو سہی ـــ سلام نہ کلام ـــ بس چپ چاپ روئے جاتی ہیں ـــــ اکدم چاند محل زور زور سے ڈولنے لگا ـــ اب تو اماں آواز سے رونے لگیں اور چیخ کر بولیں ـــ میرا ایک چراغ تھا وہ بھی گل ہوگیا ـــــ ایسا بولتے ہی مشعل آپ ہی آپ بجھ گئی۔ اماں نے جھٹ محل کا صدر دروازہ کھولا اور وہ چاند محل میں گھس گئیں ـــ اب تو ہر طرف بھک بھک اُجالا ہوگیا ـــ بس آگ کے شعلے تھے کہ گھر سے چلے آرہے تھے ـــ دیکھتے ہی دیکھتے چاند محل تھرّایا اور خون کے دریا میں جا پڑا ـــــ بس ایک ذری دیر کو اماں دکھائی دیں کہ ادھر چٹ سے سراج میاں کی آنکھ کھل گئی ـــ

بدن میں جُرجھری سی دوڑ گئی ـــ اپنا خواب خود ان کے سمجھ میں بھی نہ آیا ـــ عالم یہ تھا کہ مسلسل کانپے جا رہے تھے ـــ اٹھ کر ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے وضو کیا اور جب مسجد کی طرف چلے ہیں تو یہ حالت تھی کہ بچّوں کی طرح ٹھک ٹھک رو رہے ہیں اور آسمان کی طرف دیکھے جاتے ہیں ـــــ!!!

پاکستان بن گیا ـــــ
مسلمانوں کو گوہر مراد مل گیا ـــــ

اب کیا ہوگا ـــــ ؟؟

مرد لوگ بیٹھک میں بیٹھے تو اخبار ہاتھوں میں تھے اور جتنے منہ اتنی باتیں ـــ پھر سب کو ایسے سانپ سونگھ گیا کہ گم سم بیٹھے ہیں مگر زبان نہیں کھلتی ـــ

"اب کیا ہوگا میاں ـــ"؟ ماموں میاں نے جمیل میاں سے پوچھا ـــ حال ہی میں علی گڈھ سے پڑھ کر آئے تھے ـــ شہروں کی ستّر ہزار باتیں سناتے تھے اور ہر مشکل مسئلے کا حل بتا سکنے کا دعویٰ کرتے تھے۔

"اب تو ہر طرف آگ لگ جائے گی آگ ـــ پتہ نہیں کیا ہوگا اور کیا ہونے والا ہے ـــ" انھوں نے پریشانی سے کہا ـــــ "اور سنا ہے کچھ ـــــ ؟" ..... ماموں میاں نے آواز نیچی کرلی ـــ گھر تو عورتوں سے بھرا پڑا تھا ـــ بات کا بتنگڑ بن جاتا ـــ

اکدم سراج میاں بولے ـــ "آپ لوگ تو اُس دن ہنستے تھے ـــ جُھنّا اماں کے خواب کی تعبیر یہی ہے ـــ اب دیکھئے ہر طرف سچ مچ آگ لگے گی ـــ پھر کہیئے گا کہ جُھنّا اماں خرانٹ بڑھی ہے ـــ"

خاموشی اور بھی پراسرار ہوگئی ـــ

"جہاں تک بنے خدا کی عبادت کرو ـــ" سراج میاں نے دل ہی دل میں کانپ کر کہا ـــ کلام اللہ میں بڑی برکت ہے ہر بلا ٹل جاتی ہے ـــ"!

جمیل میاں نے بگڑ کر کہا ۔" یہ خون خرابے ہوں گے تو کیا آیۃ الکرسی پڑھنے سے رک جائیں گے"! ۔؟؟
جمیل میاں بے بات گرم ہو رہے تھے سراج میاں ٹال گئے ۔
رات کو سراج میاں سونے کے لیے لیٹے تو چاند ان کے منہ پر چمک رہا تھا ۔ انھیں ایسا لگا کہ چاند کے سیاہ دھبے سرخ ہو گئے ہیں اور ان سے لہو ٹپک رہا ہے ۔ وہ ساری رات جاگتے رہے ۔

" اب بھلائی اسی میں ہے کہ اپنی جوان بیٹیوں کی عزت محفوظ رکھنے بھاگا جائے ۔" ماموں میاں نے اخبار سب کے سامنے کر دیا ۔
منو ماں تھی ۔ جس کے لمبے لمبے بال تھے اور نہا کر کھلے چھوڑ دیتی تو لگتا کہ سیاہ چادر اوڑھ رکھی ہے ۔ پھر شمو تھی ۔ چاند ایسی چمکتی صورت ۔ ہنستی گاتی بھولی بھالی مینا ۔ اور شرباتھی کہ بس مسکرائے جاتی اس کے ہونٹ تو صدا ادھ کھلی کلی کی پتیوں کی طرح کانپ جاتے ۔ ان سب کا کیا ہوگا؟
زینو بی بی ۔ صابرہ ۔ اور شنو ماں ۔ یہ کھلتی ہوئی کلیاں تھیں جن سے ابھی باغ مہکنے والا تھا ۔ ان سب کا کیا ہوگا ۔
پھوپھو جان آپ تو اپنی بیٹیوں کو لے کر حیدر آباد چلی جائیے ۔" جمیل میاں نے رائے دی ۔
میں اکیلی عورت ذات کیسے جاؤں ۔ کوئی ساتھ والا بھی تو نہیں" ؟ اور پھوپھا میاں کی یاد میں ٹپ ٹپ آنسو بہانے لگیں ۔ کیسا بے وقت ساتھ چھوٹا کہ تنکے کا بھی سہارا نہ رہا ۔
" میں بھی تو جاؤں گا ۔" ماموں میاں بول اٹھے ۔ یہ اتنی جوان جوان لڑکیاں ۔ خدا وہ دن نہ دکھائے ۔ اگر کچھ ہو ہوا گیا تو بن موت مر جائیں گے ۔ اس سے اچھا وقت تو یہ ہوگا کہ خود ہی اپنے ہاتھوں زہر پلا دیں ۔ عزت جیسی چیز تو بچ جائے گی ۔
" آپ چلے جائیں تو پھر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سراج میاں کی زبان گنگ ہو گئی ۔
" ارے سبھی چلیں گے میاں ۔ اب یہاں رکھا ہی کیا ہے ۔ میں تو دیکھوں گا اور بن پڑا تو پاکستان چل دوں گا ۔"

" سونے کی پازیب میں گھونگھرو تو ہونے ہی چاہئیں ۔ کچھ تو پتہ چلے گا کہ گھر میں بہو آئی ہے ۔"!
" اماں ۔ اماں ۔" سراج میاں جھنجھوڑتے گئے اماں پر اس بری طرح نہریاں چھایا تھا کہ بڑے جاتیں ۔
چاندنی کی چوکی تو دولہن کے نہانے کے لیے ہے ۔ توبہ ہے سلیم میاں مہری کے ڈانڈے پتیلے پڑ گئے ۔"

ادھر چاندنی پھوپھی بی کے رخساروں کی طرح رنگ کھو چکی تھی ۔ پیلی پیلی بے نور ۔

ماموں میاں کا خط آیا ۔

"بڑی بری خبریں سننے میں آرہی ہیں ۔ ہم تو سرتے پڑتے یہاں تک جیسے تیسے پہونچ گئے ۔ جانے کی راہ ہوتے ہوئے آئے ۔ پونے دو دن کا راستہ ہے ۔ مگر پورے تیرہ دنوں میں پہونچے ہیں ۔ راستوں میں کٹے ہوئے سر ہیں ۔ دھڑ ہیں اور سڑے ہوئے ہاتھ پاؤں ۔ سن رہے ہیں ادھر حالات بہت کڑے ہوگئے ہیں ۔ تم بھی آجاؤ ۔ سرچھپانے کو جھونپڑا مل ہی جائے گا ۔ یہاں ظہیر یار جنگ کی کوٹھی مل گئی ہے ۔ بس اس میں رہ رہے ہیں ۔ اپنا چاند محل بہت یاد آتا ہے ۔ مگر اب کہاں وہ زمانہ ۔ اتنا رو چکے ہیں کہ آنسو بھی سوکھ گئے ہیں ۔ کچھ بھی کرکے چلے آؤ ۔ پھر پاکستان جانے کے بارے میں سوچا جائے گا" !

"اماں چلوگی پاکستان ؟" ؟

"اونہوں ؟" !

"اچھا تو اماں حیدرآباد چلو ۔ وہاں چارمینار ہے اور اماں وہاں بہوت اچھی اچھی چیزیں ملتی ہیں ۔ چاند محل کو خوب سجالینا ۔ پھر چاند جیسی دولہن لانا ۔ آں اماں ؟" ؟

میاں ۔ سراج میاں میں صدقے گئی ۔ میری بچی کو بچالو ۔ کیسی تباہی آئی ہے مولا" ۔ جنّا اماں گرتی پڑتی آئی ۔ اور سراج میاں کے پیروں میں لوٹ گئی ۔

"سراج میاں نے گڑبڑا کر دیکھا ۔ سکینہ جنّا اماں کے کندھے سے لگی کانپ رہی تھی ۔

"بولو میاں کیا کروں اس جوان بچی کا حشر ۔ اس سے تو اچھا ہے کہ آپ ہی آگ لگادوں ؟" ؟

"نہیں جنّا اماں ۔ ایسا مت کرو ۔ میں جو موجود ہوں ۔ دیکھو تم فکر نہ کرو ۔ میں اسے اور تمھیں دونوں کو ماموں میاں کے پاس چھوڑ آتا ہوں ۔ ادھر اللہ نگہبان ہے اماں کا" ! وہ تو چاند محل چھوڑنے والی نہیں" ۔ رک کر بولے ۔

کیوں کانپ رہی ہو بہن ۔ میں موجود ہوں تمھارے لیے"

سراج میاں نے منہ ہی منہ میں آیتیں بد بدانی شروع کردیں ۔

"بھیا" سہمی ہوئی آواز میں سکینہ چیخی ۔

"کوئی بات نہیں اوپر اللہ ہے"

"سراج میاں ۔ سراج میاں ۔ سراج میاں" ۔ جنّا اماں کی آواز ابھری ۔ ابھری اور پھر ڈوب گئی ۔

"بھیّا ـــ بھئی ـــ یا ـــ" سکینہ کی آواز چاند میں سے آرہی تھی ـــ یا اس سے بھی کہیں دور سے ـــ بس آگ کے شعلے تھے کہ گھبرے چلے آرہے تھے ـــ دیکھتے ہی دیکھتے چاند محل تھرّایا اور خون کے دریا میں جا پڑا ـــ بس ایک ذری دیر کو اماں دکھائی دیں ـــ ہاتھ میں مشعل لیے ـــ پھر مشعل بجھ گئی ـــ

"میاں ـــ او میاں ـــ یہ چوکی بالکل چھوٹی ہے ـــ"

"سونے کی پازیب میں گھونگھرو بھی نہیں لگوائے تم نے ـــ چھنا کا کہاں پیدا ہو رہا ہے ـــ؟ کیا کہیں گے کہنے والے ـــ کیسی پائل بنوائی کہ جھنکار بھی نہیں ـــ"

"فانوس بجھ رہے ہیں ـــ ارے یہ چاند پر سیاہی کیسی تیر رہی ہے ـــ"

میری آنکھوں میں دھند سی چھا رہی ہے ـــ بٹیا ـــ او بٹیا ـــ میاں ـــ سراج میاں ـــ کوئی نہیں بولتا ـــ کوئی جواب نہیں دیتا ـــ

"نہیں نہیں ـــ یہ جنت ہے میری ـــ میں اسے مرے دم تک نہیں چھوڑوں گی ـــ اس کے ذرے ذرے سے مجھے پیار ہے ـــ"

"میاں پھر ایسا لگا کہ آپی آپ میرے سارے رانت جھڑ گئے ہیں اس کے بعد ـــ اس کے بعد میری آنکھ...

"ایک جنت تو شدّاد نے زمین پر بنوائی تھی! پھر اب ہماری بیگم نے بنائی ہے ـــ"!

شدّاد تو آرزو لے کر ہی چلتا بنا ـــ یہاں تو اماں بھرپور راج رچ رہی تھیں ـــ ایک کھڑکی ایسی تھی چھت پر کہ ادھر چاند نکلا اور چھکا چھک اجالا گھسا بڑے کمرے میں ـــ کھڑکی میں سے پورا چاند بیٹھے بیٹھے نظر آتا ـــ ماموں جان نے ایک بار دیکھا تھا تو مسکرا کر بولے تھے ـــ "تمہارا گھر تو پورا چاند محل ہے ـــ"

بس تب سے اماں والے گھر کا نام ہی چاند محل پڑ گیا ـــ اور ابا مرحوم تو اسے جنت بولتے ہی تھے ـــ

حیدرآباد میں شہر کا قدیم ترین ہوٹل عزیزیہ ہوٹل ہے
جہاں صبح و شام ہندوستانی طریقے سے ماہر فن باورچیوں کے ہاتھوں تیار کئے ہوئے کھانے مل سکتے ہیں
صفائی اور پاکیزگی اس ہوٹل کا امتیازی نشان ہے کم کرایہ پر صاف ستھرے اور ہوادار کمرے مل سکتے ہیں، پتہ یاد کیجئے
عزیزیہ ہوٹل
ناپسلی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن فون ۴۳۱۶

انور معظم

پنچایت

(ایک ایکٹ کا ڈرامہ)

(انور معظم نے منشی پریم چند کی کہانی "پنچایت" کو ڈرامائی روپ دیا ہے۔ ڈرامہ نگار نے اصل کہانی کے واقعات اور مکالموں کو جہاں تک ممکن تھا جیسے برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اسٹیج کی ضرورتوں کے اعتبار سے کہیں کہیں تھوڑی بہت تبدیلیاں کی گئی ہیں جو ناگزیر تھیں۔ یہ ڈرامہ حیدرآباد ہندی پرچار سنگھ کے سالانہ جلسے کے موقعہ پر کامیابی کے ساتھ اسٹیج کیا جا چکا ہے)

کردار

جمن	رامو
الگو چودھری	رام دھن
فتح خاں	جگو سنگھ
نارائن	سمجھو سیٹھ

گوڑ رشتہ

فہیمن	موسی

گاؤں کا منظر ——— اسٹیج کی بائیں جانب شیخ جمن کے گھر کے سامنے کا حصہ دکھائی پڑتا ہے۔ ورانڈا چبوترہ سا ہے جس پر گھاس کا سائبان ہے۔ گھر کے سامنے وسیع جگہ ہے جو گاؤں کی چوپال کا بھی کام دیتی ہے مکان کی دوسری سمت ایک بکری بچوں کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔

پردہ اٹھتے وقت اسٹیج پر سویرا ہو رہا ہے۔ روشنی مدھم ہے آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہے۔ گھر کا دروازہ بند ہے۔ دروازے کے برابر والی کھڑکی سے چراغ کی روشنی دکھائی دیتی ہے۔ گھر کے اندر سے چکی کی آواز آرہی ہے۔ جس کے ساتھ عورت کی گنگناہٹ بھی شامل ہے۔ شیخ جمن گھر کے ورانڈے میں کھاٹ پر کمبل اوڑھے سو رہے ہیں۔ دور سے بنسری پر بھیرویں کی دھن سنائی دیتی ہے۔ بنسری ختم ہونے پر رامو بنسری ہاتھ میں لیے دائیں جانب سے اسٹیج پر آتا ہے اور اسٹیج کی بائیں جانب بکری کی طرف جاتا ہے۔

رامو۔ (پکارتے ہوئے) چاچی ۔ چاچی موہنی کو لے جا رہا ہوں (بکری کھولتا ہے گھر میں چکی کی آواز بند ہو جاتی ہے)

فہمین۔ (کھڑکی میں سے جھانکتے ہوئے) رامو ۔ تو آ گیا؟

رامو۔ ہاں چاچی۔ آج دیر ہو گئی ۔ دیکھو نا میری موہنی بھی مجھ سے کچھ روٹھی جان پڑتی ہے ۔ کیوں ری موہنی (بکری کو پیار سے تھپ تھپاتا ہے)

فہمین۔ دیکھ رامو شام میں جلد لائیو اسے نہیں تو دونوں بچے چلا چلا کر میرا ناک میں دم کر دیں گے۔

رامو۔ اچھا چاچی ۔ دن ڈھلنے سے پہلے ہی لے آؤں گا۔ چل موہنی۔

(بکری کو لے کر چلا جاتا ہے۔ بنسری کی آواز پھر ابھرتی ہے اور آہستہ آہستہ ڈوب جاتی ہے۔ فہمین کھڑکی سے ہٹ جاتی ہے۔ کھڑکی کی روشنی بجھ جاتی ہے فہمین باہر آ کر لٹکی ہوئی قندیل بجھا دیتی ہے۔ قندیل اندر رکھ کر جمن کی طرف بڑھتی ہے)

فہمین۔ ارے میں کہتی ہوں یوں کب تک خراٹے لیتے رہو گے۔ سویرا ہو چلا ہے۔ اٹھو گے نہیں۔

جمن۔ (ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے۔ جمائی لیتے ہوئے) ہاں۔ اوہ ۔ ہوں۔

فہمین۔ آج منڈی جانا ہے ۔ یاد بھی ہے کہ نہیں؟

جمن۔ ہاں ہاں یاد ہے۔

فہمین۔ ادھر دیکھو کہیں اپنی خالہ سے نہ کہہ بیٹھنا کہ منڈی جا رہے ہو۔ نہیں تو ان کی بھی کچھ انگیں لگ جائیں گی۔ سمجھے کہ نہیں؟

جمن۔ ہاں ہاں سمجھ گیا ۔ میں ان سے کچھ نہ کہوں گا۔ تم چنتا نہ کرو۔

فہمین۔ چنتا نہ کرو ۔ چنتا نہ کرو ۔ سدا یہی کہتے ہو اور نہ جانے کیوں اس بڑھیا سے دبے دبے رہتے ہو۔ میں کہتی ہوں کہ اس بڑھیا نے دو گز جمین تمہارے نام کر دی ہے تو کیا تم زندگی بھر اسے کھلانے پلانے کا ٹھیکہ لیے رہو گے؟

جمن۔ اری میں نے یہ کب کہا ہے۔ بیکار رچ رچ لگا رکھی ہے۔ سویرے سویرے لوگ سورج کی پہلی کرن دیکھ کر اللہ کا نام لیتے ہیں اور تم ہو کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

الگو چودھری۔ (باہر سے) جمن بھیا۔

جمن۔ لو چودھری آ گئے۔

(فہمین دروازے سے اندر چلی جاتی ہے۔ دروازے کا ایک پٹ کھلا ہے جہاں سے وہ کھڑی ہوئی دکھائی دیتی ہے)

چودھری۔ (داخل ہوتے ہوئے) نمستے جمن بھیا۔

جمن۔ سلام چودھری۔ آؤ بیٹھو۔

(کھاٹ دو ڈنڈے سے نیچے اتار کر دونوں بیٹھ جاتے ہیں)

چودھری۔ یہ سویرے سویرے شیخ جی اور بی شیخانی میں کیا کھٹ پٹ ہو رہی تھی؟

جمن۔ وہی پرانا بکھیڑا ہے چودھری۔

چودھری۔ وہی موسی والی بات۔

جمن۔ اور کیا ۔ میں کہتا ہوں بڑھیا ہے ایک کونے میں پڑی رہنے دو۔ مگر یہ فہمین تو بس ۔

فہمین ۔ (اندر ہی سے) ہاں جی بس میں ہی تو ہوں جھگڑے کی جڑ۔ تم تو بڑے بھولے ہو بیچارے ۔۔

چودھری۔ (اونچی آواز میں) نہتے بھابی۔

فہمین ۔ (اندر سے) نہتے بھیا۔ ذرا تم ہی انھیں سمجھاؤ۔ مجھے ماں جی سے کیا لینا ہے۔ میں تو صاف سیدھی بات کہتی ہوں ۔ تم تو جانتے ہو گھر کی حالت۔ گھر کیسے چلتا ہے یہ تو گھر والی ہی جانتی ہے۔ باہر والوں کو اس کا کیا پتہ۔ میں کہتی ہوں چار لوگوں میں جو بھرم ہے وہ بنا رہے تو کیا برا ہے۔

چودھری۔ مگر ہوا کیا بھابی ۔ کچھ بتاؤ بھی تو۔

فہمین ۔ بھیا ۔ بیچاری خالہ جیسی بھی ہیں اور ہم ان سے جیسا پریم کرتے ہیں وہ تو سارا گاؤں جانتا ہے مگر انھیں تو جیسے ہم سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ ہمیں اپنا بیری سمجھتی ہیں۔ گاؤں کے بچے بچے سے کہتی پھرتی ہیں کہ ہم ان کا جینا دوبھر کئے ہوئے ہیں۔ بھلا یہ بات بھی کوئی وشواس کرنے کی ہے؟

چودھری۔ موسی آپ سے ناراض ہیں کیا؟

فہمین ۔ پوچھ لو نا ۔۔ سامنے ہی تو بیٹھے ہیں۔ کہتے کیوں نہیں کیا منہ میں گھنگنیاں بھری ہیں؟

جمن ۔ (گھبرا کر) ہاں ۔ ہاں چودھری ۔ خالہ کچھ خفا تو ہیں ہم سے۔

چودھری۔ مگر وہ تو بہت خوش تھیں تم سے اور اسی کارن تو انھوں نے اپنی جمین سارے پنچوں کے سامنے تمھارے نام کر دی تھی ۔ ارے یہ دو مہینے پہلے ہی کی تو بات ہے۔

فہمین ۔ ہاں ۔ بھیا ۔ بس یہی تو بات ہے، جہاں یہ دب جاتے ہیں۔ بڑھیا نے وہ اجاڑ جمین ان کے نام کیا کر دی جیسے ان کی سو پشت پر احسان کر دیا ہے۔ بات کیا کرتی ہے مانو حکم چلاتی ہے کھانا اچھا چاہیئے۔ پہننے کو اچھا چاہیئے اور جو ہم کہیں "ماں جی جو اگھر کے کھرچے کا بھی دھیان کرو"، تو بس تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ جو من میں آئے بکنے لگتی ہے۔

چودھری۔ یہ اگر سچ ہے تو کچھ اچھی بات نہیں ہے (کھڑا ہو کر) اچھا جمن اب میں چلا۔

جمن ۔ کہاں جا رہے ہو؟

چودھری۔ ذرا منڈی تک ہو آؤں۔

جمن ۔ منڈی تو میں بھی جا رہا ہوں۔

چودھری۔ تو پھر دیر کاہے کی چلو نا۔

جمن ۔ (اٹھ کر) فہمین ذرا رومال تو دے دینا۔

(فہمین، رومال، ٹوپی اور ایک تھیلی بڑھا دیتی ہے۔ جمن ٹوپی سر پر رکھ لیتے ہیں۔ رومال کندھے پر ڈال لیتے ہیں اور تھیلی ہاتھ میں لٹکا لیتے ہیں)

چودھری۔ اچھا بھابی نہتے۔

فہمین ۔ آداب۔

(دونوں جاتے ہیں اور فہمین باہر نکل کر کھاٹ کو دوبارہ چبوترے پر رکھ دیتی ہے اور پھر اندر سے چند برتن دھونے کے لیے باہر لاتی ہے۔ موسی دائیں طرف سے لاٹھی ٹیکتی ہوئی داخل ہوتی ہے)

فہمین ۔ (پلٹ کر دیکھتی ہے جھٹکے سے برتن پٹکتی ہے)

موسی ۔ (چبوترے پر بیٹھ کر سانس ٹھیک کرتی ہے) نارائن کی بٹیا کا بیاہ ہے مجھے وہاں جانا ہے۔ روٹی دے دو تو جلدی سے کھا کر چلوں۔

فہمن ۔ بس صبح ہوئی اور تمھیں کھانے کی پڑ گئی ۔ ایک دن تم ہمیں بھی کھا جاؤ گی، دو تین بیگھے اوسر کیا دے دیا ہے گویا مول لے لیا ہے ۔ جتنا روپیہ تمھارے پیٹ میں جھونک چکے اس سے تو اب تک کئی گاؤں مول لیتے۔

موسی ۔ (چونک کر کچھ سکنڈ تک اسے اچنبھے سے دیکھتی ہے) کیا ہو گیا ہے تجھے بہو ـــــ تو مجھ سے کیسی باتیں کر رہی ہے؟

فہمن ۔ ہاں ۔ بس بہت ہو چکا ۔ کب تک چپ رہوں ۔ تمھاری بہت سیوا کر لی اب اور نہیں ہوتی، سمجھیں۔

موسی ۔ سیوا ـــ تو نے کونسی میری سیوا کی ہے۔ ذرا میں بھی تو سنوں۔

فہمن ۔ ہاں اب کیوں یاد آئے گا۔ کھانے کی مقالیاں پروس پروس کر سامنے رکھیں ہنگلوار کو بازار سے تمھارے لیے کپڑے لاتے رہے دن رات تمھارے ہاتھ پیر دابتے گذری مگر تمھارے یہ طعنے نہ گھٹنے تھے نہ گھٹے بس اب بہت ہو چکا ۔ ہم سے اب کچھ نہ ہوگا۔ سن لیا نا

موسی ۔ ہاں ۔ سن لیا ۔ مانتی ہوں ۔ یہ سب تم نے کیا کھلایا بھی اور پہنایا بھی، ہاتھ پیر بھی دابے مگر کب تک ۔ جب تک میں نے اپنی جمین جمن کے نام نہیں کی تھی اس سمے تک ۔ پر خدا جانتا ہے ۔ جیسے ہی نیچوں کے سامنے میں نے اپنی جمین جمن کے نام کر دی جیسے جمین آسمان ہی بدل گئے ۔ ادھر تو نے اپنا رنگ بدلا ۔ ادھر جمن نے آنکھیں پھیر لیں ۔ ایسا اندھیر کسی نے کاہے کو دیکھا ہوگا۔

فہمن ۔ اے خدا نہ کرے ہم کیا تمھارے دھن کے بھوکے ہیں ۔ کیسا الجام لگا رہی ہو۔

موسی ۔ یاد رکھو بہو ۔ ایک دن تمھیں بھی اوپر والے کو منہ دکھانا ہے ۔ میرا کیا ہے آج مری کل دوسرا دن ۔ مگر دنیا یہی کہے گی کہ دو گز جمین کے لیے تو نے ایک بڑھیا کو دکھ دے دے کر مار ڈالا۔

فہمن ۔ کیوں کوسنے دے رہی ہو۔

موسی ۔ اے میں کاہے کو سوں ۔ میں تو تجھے اور جمن کو اپنا سمجھ کر پاس آئی تھی اب میرا بھی جی بھر گیا تجھ سے اور میرا بھی تجھ سے ۔ میں ابھی جمن سے صاف صاف کہے دیتی ہوں۔

فہمن ۔ ہاں ۔ ہاں کہہ دینا ۔ انتظار کس بات کا ہے آئے دن کی دا غا کل کل سے چھٹی تو ملے گی۔

(جھنجھلا کے اندر سارے برتن اٹھا کر چلی جاتی ہے موسی غصے اور دکھ سے کانپ رہی ہے)

موسی ۔ بس ۔ بہت ہو چکا اب سہن نہیں ہوتا ۔ میں بڑھیا ایسی باتیں سن سن کر کل کی مرتی آج ہی مر جاؤں گی ۔ مگر اس طرح رو رو کے کیوں مروں جمن کہاں ہے ۔ میں اس سے صاف کہوں گی

ہاں سب صاف صاف کہہ دوں گی۔
(جمن تر مار یوں کی تھیلی لیے داخل ہوتا ہے)

جمن ۔ سلام خالہ۔

موسی ۔ (پلٹ کر) جمن! سن۔ میں تجھ سے صاف صاف کہے دیتی ہوں کہ تیری بہو سے اب نباہ نہیں ہوتا۔ اور میں بھی تنگ آ گئی ہوں ۔ سنا (فہمین تیز تیز آکر تھیلی لے کر اندر چلی جاتی ہے)

جمن ۔ ہاں سن لیا۔ میں بھی تم سے یہی کہنے والا تھا۔

موسی ۔ تو بھی یہی کہنے والا تھا۔ چلو اچھا ہوا۔ قصہ ہی صاف ہو گیا۔ تو بس بیٹا تمھارے ساتھ میرا نباہ نہ ہوگا۔ تم مجھے روپے دے دیا کرو میں اپنا الگ پکا لوں گی۔

جمن ۔ روپے ۔ روپیہ کیا یہاں پھلتا ہے؟

موسی ۔ (بگڑ کر) تو مجھے نان نک چاہیے یا نہیں؟

جمن ۔ چاہیے کیوں نہیں۔ میرا خون چوس لو۔ کوئی تھوڑے ہی سمجھا تھا کہ تم خواجہ خضر کی حیات لے کر آئی ہو۔

موسی ۔ (بھڑک کر) تجھ پر اللہ کی مار۔ میرے مرنے کی دعائیں مانگ رہا ہے۔ اچھا تو میں پنچایت ہی سے اپنے جھگڑے کا فیصلہ کرواؤں گی ۔ سنا پنچایت میں اس کا فیصلہ ہوگا۔

جمن ۔ (ہنس کر) ہاں ضرور بلاؤ پنچایت۔ فیصلہ ہو جائیگا مجھے بھی دن رات کا یہ جھنجھٹ پسند نہیں۔

فہمین ۔ (باہر آکر) چلو اندر کچھ کھا لو (دونوں اندر چلے جاتے ہیں۔ چودھری داخل ہوتے ہیں)

چودھری ۔ سلام موسی۔ جمن کہاں ہے۔

موسی ۔ جمن گیا بھاڑ میں۔ سنو چودھری۔ تم مجھے جانتے ہو۔ اور میں بھی تمھیں جانتی ہوں۔ میں نے تمھیں گلیوں میں کھیلتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور کھیتوں میں ہل چلاتے ہوئے بھی۔ تم نے اپنی سچائی اور پریم سے سارے گاؤں والوں کے من میں گھر کر لیا ہے۔ چودھری تم سچے آدمی ہو سچ کا ساتھ کبھی نہ چھوڑنا۔

چودھری۔ یہ بات کیا ہے موسی۔ تم تو کانپ رہی ہو غصے سے۔

موسی ۔ بڑھاپے کے پاس غصہ کہاں بیٹیا۔ یہ تو دکھ بول رہا ہے بیٹیا۔ جمن کا اور میرا جھگڑا کیا ہے یہ تو تم جانتے ہی ہو۔ اس کے فیصلے کے لیے میں پنچایت بلا رہی ہوں۔ تم بھی چھن بھر کے لیے چلے آنا۔

چودھری۔ مجھے بلا کر کیا کرو گی۔ کئی گاؤں کے آدمی تو آئیں گے ہی۔

موسی ۔ اپنی سچر یا دتو سب کے کان میں ڈال دوں گی۔ آنے نہ آنے کا حال اللہ جانے۔

چودھری۔ یوں آنے کو میں آ جاؤں گا۔ مگر پنچایت میں منہ نہ کھولوں گا۔

موسی ۔ کیوں بیٹیا؟

چودھری۔ اب اس کا کیا جواب؟ اپنی اپنی طبیعت جمن میرے پرانے دوست ہیں۔ ان سے بگاڑ نہیں کر سکتا۔

موسی ۔ بیٹیا کیا بگاڑ کے ڈر سے ایمان کی بات نہ کہو گے؟

اس بات کو سن کر چودھری کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے۔ وہ اٹھ کر ٹہلنے لگتا ہے (اپنے آپ سے) دھرم اور دوستی! دوستی اور دھرم! نہیں ایسا نہیں ہوگا ۔ موسی سے مخاطب ہوکر۔ اچھا موسی میں آؤں گا دشو اس رکھو ضرور آؤں گا۔

موسی ۔ (خوش ہوکر) خدا تجھے سکھی رکھے بیٹا۔ اچھا تو میں چلتی ہوں۔ گاؤں والوں کو بھی ذرا کہہ دے دوں ۔ (لاٹھی ٹیکتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ چودھری اسے جاتے ہوئے دیکھتا ہے اور کچھ سوچتا ہے ۔) پردہ گرتا ہے

دوسرا سین

(پنچایت ۔ جمن کے گھر کے سامنے پنچایت بیٹھی ہوئی ہے۔ سامنے کھاٹ رکھی ہے۔ رام دھن فتح خاں ، جسونت سنگھ اور جگو سنگھ ان میں شامل ہیں)

رام دھن۔ دیکھنا فتح خاں آج مزہ آئے گا۔ شیخ جمن کا سارا بھرم کھل کر رہے گا۔ سرپنچا نہ ہو جائے ساری برادری میں تو رام دھن میرا نام نہیں۔

فتح خاں۔ ہاں جی۔ شیخ جمن کی ساری شیخی نہ نکل جائے تب بات ہے۔ اور تو اور جگو سنگھ بھی چوٹ کھاتے ہوتے ہیں۔

جگو سنگھ۔ وہ بیچارہ ہم پر کیا چوٹ کرے گا۔ پر تو مجھے بس یہی بات کھلتی ہے کہ اس بڈھیا کو مرتے سمے دکھ دے رہا ہے۔

رام دھن۔ اجی بھگوان سب دیکھنے والا ہے۔ اس کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ ذرا سوچو تو یہ کوئی بھلے آدمی کی بات ہوئی۔ کہ جب تک جمن موسی کے نام تھی خوب سیوا کرتا رہا۔ ایسی سیوا کرتا کہ ہم بھی اچنبھے میں پڑ جاتے۔ مگر بعد میں پتہ چلا کہ یہ سیوا موسی کی نہیں نقد نارائن کی تھی (سب ہنستے ہیں) ـــــ موسی سیدھی سادھی ناری ۔ سمجھیں کہ جمن ان کی سیوا کر رہا ہے۔ بس آؤ دیکھا نہ تاؤ، جمن جمن کے نام کر دی۔ بس یہ ہوا اور اس کے بعد ساری سیوا دھری کی دھری رہ گئی۔ اور آج پنچایت بلانے کی نوبت آ گئی ـــ یہ لو موسی بھی آ گئیں۔ (موسی داخل ہوتی ہیں ۔ سب سلام کرتے ہیں۔)

موسی۔ جیتے رہو۔ جیتے رہو۔ سب آ گئے ـــ ؟ بڑی کرپا کی ـــ الگو چودھری دکھائی نہیں پڑتے (چودھری اور جمن گھر میں سے نکلتے ہیں) آؤ نا یہاں۔

نارائن۔ موسی اب تو سب آ گئے۔ پنچایت شروع ہو جائے تو اچھا ہے۔

موسی۔ اچھا نارائن بیٹا ـــ (اٹھ کھڑی ہوتی ہے) پنچو آج ایک برس ہوتا ہے میں نے اپنی ساری جمین اپنے بھانجے کے نام لکھ دی تھی۔ آپ لوگ جانتے ہوں گے۔ جمن نے مجھے زندگی بھر روٹی کپڑا دینے کا وعدہ کیا تھا۔ دو تین مہینے

تو میں نے اس کے ساتھ کسی طرح رو دھو کر کاٹے۔ مگر اب مجھ سے رات دن کا رونا نہیں سہا جاتا۔ مجھے پیٹ کی روٹیاں تک نہیں ملتیں بیکس بیوہ ہوں۔ تمھارا کچہری کر نہیں سکتی۔ سوائے تم لوگوں کے اور کس سے اپنا دکھ روؤں۔ تم لوگ جو راہ کمال رو، اس راہ پر چلوں۔ اگر میری برائی دیکھو تو میرے منہ پر تھپڑ مارو۔ جمن کی برائی دیکھو تو اسے سمجھاؤ۔ کیوں ایک بیکس کی آہ لیتا ہے۔"

رام دھن۔ جمن میاں۔ پنچ کے بولتے ہو۔ ابھی سے طے کرلو۔

جمن۔ (سب پر سہمی ہوئی ڈال کر۔ مایوسی اور غصے کے ملے جلے لہجے میں) موسی جسے چاہیں پنچ بنالیں مجھے کوئی عذر نہیں۔

موسی۔ (چڑ کر) ارے اللہ کے بندے! تو پنچوں کے نام کیوں نہیں بتا دیتا۔

جمن۔ (بھڑک کر) اب اس وقت میری جان نہ کھلواؤ جسے چاہو پنچ بنالو۔

موسی۔ بیٹا خدا سے ڈر میرے لیے کوئی اپنا ایمان نہ بیچے گا۔ اتنے سارے آدمیوں میں سب کیا تیرے دشمن ہی ہیں۔ اچھا اور سب کو جانے دے الگو چودھری کو تو مانے گا؟

جمن۔ (الگو کی طرف دیکھکر مسکراتے ہوئے) الگو چودھری ہی سہی۔ میرے لیے جیسے رام دھن مسر ویسے ہی الگو چودھری۔ کوئی میرا دشمن نہیں ہے۔

نارائن۔ کیوں چودھری۔ کیا سوچ رہے ہو؟

چودھری۔ (رک کر) موسی تم جانتی ہو کہ میری اور جمن کی گاڑھی دوستی ہے۔

موسی۔ بیٹا دوستی کے لیے کوئی اپنا ایمان نہیں کھوتا۔ پنچ کا حکم اللہ کا حکم ہے۔ پنچ کے منہ سے جو بات نکلتی ہے وہ اللہ کے طرف سے نکلتی ہے۔

رام دھن۔ (ملا کر۔ فتح خاں اور جگو سنگھ کی طرف دیکھتے ہیں۔ جگو سنگھ۔ ٹھیک ہے چودھری ہی پنچ نہیں۔

نارائن۔ الگو چودھری اب دیر کس بات کی ہے۔

(چودھری اٹھ کر کھاٹ پر جا بیٹھتے ہیں)

رام دھن۔ باقی پنچوں کے نام بھی بتا دو موسی۔

موسی۔ موہن سنگھ، رام لال، فتح خاں، داتا دین سبھی میرے لیے ایک سے ہیں کسی کو بھی بلا لیں۔

(یہ لوگ اٹھ کر کھاٹ کے قریب جا بیٹھتے ہیں)

چودھری۔ شیخ جمن ہم اور تم پرانے دوست ہیں۔ جب بھی مجھے ضرورت پڑی تم نے میری مدد کی اور ہم سے بھی جو کچھ بن پڑا ہے، تمھاری خدمت کرتے آئے ہیں۔ مگر اس وقت تم ہمارے دوست نا ہو نہ ہم تمھارے دوست۔ یہ انصاف اور ایمان کا معاملہ ہے۔ موسی نے پنچوں سے اپنا حال کہہ سنایا تم کو بھی جو کچھ کہنا ہو کہو۔

جمن۔ (کھڑے ہو کر) پنچو۔ میں خالہ کو اپنی ماں کی بجائے سمجھتا ہوں۔ اور ان کی خدمت میں کوئی کسر نہیں رکھتا۔ ہاں عورتوں میں ذرا اَن بن رہتی ہے۔ اس میں میں مجبور ہوں۔ عورتوں کی یہ عادت ہی ہے۔ مگر ماہوار روپیہ دینا میرے قابو سے باہر ہے کھیتو کی جو حالت ہے وہ کسی سے چھپی نہیں۔ آگے پنچوں کی

حکم سر آنکھوں پر ہے۔

(چودھری اشارے سے جمن کو بیٹھ جانے کے لیے کہتے ہیں)

چودھری۔ جمن میرے سوالوں کا ٹھیک ٹھیک جواب دو۔ موسی نے جو زمین تمھارے نام کی ہے اسے چھوڑ کر تمھاری اپنی زمین کتنی ہے؟

جمن ۔ بس ایک کھیت ہے۔

چودھری۔ ہوں۔ تم نے یہ گھر کب بنایا۔ موسی کی زمین ملنے کے بعد نا؟

جمن ۔ ہاں۔

چودھری۔ مکان بنانے کے لیے روپیہ اسی زمین سے ملا؟

جمن ۔ ہاں۔

چودھری۔ موسی نے زمین تمھارے نام کرتے وقت پنچوں کے سامنے تم سے وعدہ لیا تھا کہ تم زندگی بھر انھیں روٹی کپڑا دو گے۔

جمن ۔ ہاں۔ وعدہ تو کیا تھا۔

چودھری۔ اس کو کتنے دن ہوئے؟

جمن ۔ کوئی ایک سال ہوتا ہے۔

چودھری۔ اس ایک سال میں تم نے کتنے روپے موسی کو دیئے؟

(جمن خاموش رہتا ہے۔ لوگ آپس میں بات چیت کرتے ہیں)

چودھری۔ جمن میرے سوال کا جواب دو۔

جمن ۔ چودھری پنچ کیا کہہ رہے ہیں۔

چودھری۔ جمن میں اس وقت سرپنچ ہوں ۔ میں اپنے سوال کا جواب مانگ رہا ہوں۔ تم نے ایک سال میں موسی کو خرچ کے لیے کتنے روپے دیئے؟

جمن ۔ کچھ بھی نہیں۔

چودھری۔ ہوں۔ تم نے موسی سے طے ہوئے کتنے کھیت بیچ دیئے؟

جمن ۔ چودھری ۔ ؟

چودھری۔ جمن!

جمن ۔ میں نے تین کھیت بیچے ہیں۔

چودھری۔ کتنے روپے ہیں؟

جمن ۔ آٹھ ہزار میں۔

چودھری۔ ان میں سے موسی کو کتنے دیئے؟

جمن ۔ کچھ نہیں دیئے۔

(جمن سر جھکا لیتا ہے)

چودھری۔ (حقہ ہاتھ سے رکھ کر پنچوں سے کچھ بات کرتے ہیں پھر سب سے مخاطب ہو کر) میں اس پنچایت کے سرپنچ کی حیثیت سے اپنا فیصلہ سناتا ہوں۔ پنچ شیخ جمن ۔ پنچوں نے اس معاملہ پر اچھی طرح غور کیا، زیادتی سراسر تمھاری ہے۔ کھیتوں سے اچھا نفع ہوتا ہے۔ تمھیں چاہیئے کہ موسی کے ماہوار گذارے کا بندوبست کر دو۔ اس کے سوائے اور کوئی صورت نہیں۔ تمھیں یہ منظور نہیں تو ہبہ نامہ منسوخ ہو جائے گا (کھاٹ سے اتر آتے ہیں۔ جمن اٹھ کر اپنے گھر کے چبوترے پر بیٹھ جاتے ہیں۔)

موسی۔ (چودھری کی بلائیں لے کر) خدا تیرا بھلا کرے

چودھری۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دکھایا۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا۔ پنچ کے منہ سے جو بات نکلتی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔

چودھری۔ اچھا موسی تو میں چلوں ۔ (تیزی سے باہر چلا جاتا ہے۔ لوگ باہر جاتے ہیں۔ موسی لمحہ بھر کے لیے جمن کو دیکھتی ہے۔ پھر وہ بھی خاموشی سے باہر چلی جاتی ہے۔ اسٹیج پر رام دھن، جگو سنگھ فتح خاں، نارائن اور جمن رہ جاتے ہیں)

نارائن۔ جمن بھیا۔ الگو چودھری تو تمھارے پرانے متر تھے پھر انھوں نے یہ فیصلہ تمھارے خلاف کیسے کر دیا؟

جمن ۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) یہ دنیا ہے جسے اپنا سمجھو وہی ڈنک مارتا ہے۔ اگر لوگ ایسے دغاباز، مکار اور دھوکے باز نہ ہوتے تو ہمارے دیش پر اتنی کٹھنائیاں کیوں آتیں ۔ ؟ لوگ کیوں پریشان رہتے؟ ـــــ یہ ہیضہ اور پلیگ کے روگ انھیں مکاریوں کی سزا ہے نارائن۔

فتح خاں۔ واہ شیخ جی ۔ یہ خوب کہا۔ دوسروں کی آنکھ کا تنکا نظر آجاتا ہے اپنی آنکھ کا شہتیر دکھائی نہیں دیتا۔

جگو سنگھ۔ اور کیا۔ اب تک موسی کو تنگ کرتے رہے اس بڑھیا کی آہ لیتے رہے۔ اس سے دیش اور جنتا یاد نہیں آئے ۔ ہونہہ

رام دھن۔ چھوڑ دو بھی جگو سنگھ۔ اونچی دکان پھیکا پکوان۔ ایسے لوگوں کا بس اوپری دکھاوا ہے۔ اندر سے دیکھو تو ڈھول ہی ڈھول۔ چودھری نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ واہ واہ۔ اس کا نام پنچایت ہے۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی۔ دوستی دوستی کی جگہ ہے دھرم کے آگے دوستی کیا چیز ہے ۔ چلو فتح خاں۔

(سب جاتے ہیں۔ فہمین اندر آتی ہے)

فہمین۔ لو بس ہو گیا۔ اسی لیے کہتی تھی کہ یہ پنچایت کے کام ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کچہری کے کاغذ پر لکھا لو۔ مگر تم کہاں سنتے ہو۔ وہی ہٹ نہ کرو، ہٹنا نہ کرو کی رٹ لگائے رکھی۔ آخر رہ گئے نا خالی ہاتھ۔

جمن ۔ (چڑ کر) چپ رہو۔ تم ہمیشہ میرا بھیجا کھاتی ہو۔ آخر مجھے بھی تو کچھ سوچنے دو۔ میرے پاس بھی تھوڑی بہت عقل ہے۔

فہمین۔ ہوتی تو یہ دن کیوں دیکھنا پڑتا۔ خوب فیصلہ سنایا چودھری نے ـــ ماہوار روپیہ دو اس بڈھی کو!

جمن۔ جنتا کیوں کرتی ہو۔ دیکھ لوں گا اس چودھری کو مجھ سے گھل مل کر باتیں کرتا رہا مگر سرپنچ بنتے ہی آنکھیں پھیر لیں۔ واہ رے چودھری خوب بدلہ دیا۔ خیر کبھی اپنا وقت بھی آئے گا۔ تب دیکھ لوں گا تم ہٹنا نہ کرو۔

(پردہ)

تیسرا سین

(وہی منظر ـــ جمن کے گھر پر تالا پڑا ہے ـــ سامنے میدان۔ الگو چودھری، رام دھن، جگو سنگھ، فتح خاں، اور نارائن کے ساتھ گفتگو میں مصروف ہیں۔ الگو حقہ پی رہے ہیں ـــ .....)

نارائن۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ بھیا کو کل کیا ہونے والا ہے
یہ سانس جو اس وقت سینے میں چل رہی ہے
دو گھڑی بعد بھی چلتی رہے گی یا بند ہو جائے گی
کون جانتا ہے ۔ ؟ کیوں جگو ؟

جگو سنگھ۔ کیا بے تکی ہانک رہے ہو جی تم ۔ کل کیا کرنا
ہے پہلے آج تو اپنی فکر کر لو۔

رام دھن۔ ارے اپنی فکر کرنے والوں کو نسا پھل پا لیا ۔ دیکھ لیا نا
شیخ جمن کو ۔ انھوں نے اپنے لیے مالا کو دکھ
دینا چاہا ۔ مگر کیا کر لیا ۔ ؟ دیکھ لو ۔ آج
گھر کو نا لا لگ گیا ہے

الگو۔ (حقہ الگ کر کے) ارے ہاں ۔ جمن کہاں چلے
گئے رام دھن ؟

فتح خاں۔ فیروز پور گیا ہے۔ اپنے بڑے بھائی کے یہاں۔
اس کی بھتیجی کی شادی ہے نا ۔ آج کل میں
لوٹنے والا ہے۔

رام دھن۔ چودھری۔ تمھاری وہ پنچایت زندگی بھر یاد
رہے گی۔ کیا مثال رکھ دی تم نے سارے گاؤں
کے سامنے ۔ واہ ۔ متر تا ایک طرف ۔ اور
انصاف ایک طرف۔

الگو۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) ٹھاؤ، رام دھن اس بات
کو ۔ پنچایت اچھی تو رہی مگر میں نے ایک اچھے
دوست کو کھو دیا۔ . . . .

نارائن۔ (سر ہلا کر) اس سنسار میں سب کچھ مل سکتا ہے
مگر ایک سچا دوست ۔ سر ہلا کر کسی مول پر
نہیں ملتا۔ ہر طرف دھوکہ ہے ۔ پر یم کہیں نہیں

کیوں جگو ؟

جگو ۔ ہاں اور کیا ۔ اب سمجھو سیٹھ ہی کی بات لو ۔
چودھری جیسے بھلے آدمی کو دھوکہ دے گیا ۔!

فتح خاں۔ دھوکہ ؟

رام دھن۔ ارے تمھیں نہیں پتہ ؟

فتح خاں نہیں ۔ کیا ہوا۔

رام دھن۔ ارے بھئی الگو چودھری نے بیسٹر کے میلے سے
بیلوں کی ایک شاندار جوڑی خریدی تھی
تین سو روپے میں۔

الگو ۔ پونے تین سو میں۔ . . .

رام دھن۔ ہاں پونے تین سو ۔ کیا جوڑی تھی ۔ نظر لگتی
تھی دونوں کو ۔ بھگوان کا کرنا یہ کہ ان
میں سے ایک مر گیا۔ . . . . .

نارائن۔ ہٹی ہے . . . . . مر گیا ؟

جگو ۔ تو چپ رہ۔

رام دھن۔ . . . . . دوسرا یونہی رہ گیا۔ چودھری
بھیا نے سمجھو سیٹھ کو وہ بیل بیچ دیا۔ سمجھو سیٹھ
نے لے تو لیا مگر کہا پیسے ایک مہینے بعد دوں گا
چودھری بے چارے بھولے بھالے ۔ راجی
ہو گئے، اور ایک ہی مہینے میں ایسا رگڑ کر کام
لیا کہ بے چارے کا کچومر نکل گیا اور وہ بھی
سورگ سدھارا۔

نارائن۔ چچ چا ۔ بے چارا وہ بھی مر گیا!

جگو ۔ (گھور کر) پھر وہی۔

فتح خاں۔ ہاں تو پھر کیا ہوا۔

الگو۔ ارے بھیا ہوتا کیا۔ اب جو ہم پیسے مانگتے ہیں ان سے تو وہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(سمبھو سیٹھ داخل ہوتے ہیں۔ جھجک کر واپس جانے لگتے ہیں)

رام دھن۔ لو یہ آ گئے۔

جگو۔ سمبھو سیٹھ ۔۔۔ ادھر آؤ۔

فتح خاں۔ سیٹھ جی پلٹ کیوں گئے ۔۔۔؟

(سمبھو سیٹھ جھجکتے ہوئے لوٹتے ہیں)

سمبھو سیٹھ۔ نمستے سب کو۔

الگو۔ آیئے ۔ بیٹھیے۔

نارائن۔ بیٹھیے سیٹھ جی۔

رام دھن۔ چودھری آپ سے ملنے آنے ہی والے تھے۔

سمبھو سیٹھ۔ کرپا چودھری کی۔

فتح خاں۔ اجی آپ ہی ان پر کرپا کیجیے۔ ان کے بیل کے دام کب دے رہے ہیں آپ۔

سمبھو سیٹھ۔ دام ۔۔۔؟؟

چودھری۔ آپ تو ایسے پوچھ رہے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

جگو سنگھ۔ اجی سیٹھ جی! جو بیل آپ نے چودھری سے خریدا تھا۔

سمبھو سیٹھ۔ ہاں جی ۔۔۔ اسی بیل کی بات کر رہے ہو وہ تو بیمار تھا جی۔ روگی تھا، سمجھا روگی بیل کے کیا دام ۔۔۔۔؟

چودھری۔ روگی؟ ۔۔۔ کیوں جھوٹ بول کر دھرم کھو رہے ہو سیٹھ۔ ایک مہینے کے وعدے پر دیا تھا اب چار مہینے ہونے کو آئے ہیں۔

سمبھو سیٹھ۔ ہاں جی تمھارے اس بیل کے کارن تو مجھے پورے چار سو روپے کھونے پڑے۔ سسرا بیچ راستے میں مر گیا اور میں اکیلا رہ گیا۔ جرا آنکھ لگی تھی کہ کسی نے کمر سے روپے نکال لیے اور سارا مال بھی اڑا لے گئے۔ نہ چودھری بیمار بیل گلے باندھتے نہ میں دن دھاڑے لٹتا۔ اب دام بھی مانگنے لگے ۔ واہ اچھا انصاف ہے۔

چودھری۔ یہ سب نہیں چلے گا ۔۔۔ مجھے پورے روپے چاہئیں ۔۔۔ سمجھے سمبھو سیٹھ ۔۔۔؟

سمبھو سیٹھ۔ واہ یہ اچھی رہی ۔۔۔ کیا مجھے نرا پونگا ہی سمجھ لیا ہے۔ کسی گڑھے میں منہ دھو آؤ تب دام ملیں گے۔ کل نہ پڑتی ہو تو ہمارا بیل کھول لے جاؤ۔ جینے کے بدلے دو مہینے جوت لینا اور کیا لو گے؟ ہنھ (جانے لگتا ہے)

چودھری۔ (بھڑک کر) اچھا یہی سہی۔ میری پنچایت میں تم سے روپے وصول نہ کر لیے تو بات نہیں۔

سمبھو سیٹھ۔ ہاں ہاں۔ جاؤ بلا لو پنچایت میں بھی دیکھ لوں گا۔

چودھری۔ اچھا۔ یوں تو یوں ہی سہی۔ چلو رام دھن (غصہ سے اٹھ کر جاتا ہے) پیچھے پیچھے رام دھن بھی۔

رام دھن۔ چلو ۔۔۔

سمبھو سیٹھ۔ ہنہ۔ آنکھ میں دھول جھونک دی اور اب دام مانگنے چلے ہیں ۔۔۔ پنچایت کی دھونس جماتے ہیں۔ میں بھی دیکھ لوں گا۔

(پردہ گرتا ہے)

چوتھا سین

(پنچایت کا دہی منظر۔ لوگوں میں چودھری جمن سمبھو سیٹھ، موسی موجود ہیں)

رام دھن۔ اب دیر کیوں کی جائے۔ بولو چودھری کن کن آدمیوں کو پنچ بدلتے ہو؟

چودھری۔ میں کیا کہوں سمبھو سیٹھ ہی چن لیں۔

سیٹھ۔ (فوراً کھڑے ہوکر) میری طرف سے شیخ جمن کا نام لکھ لو۔

رام دھن۔ چودھری تم کو کوئی عذر تو نہیں ہے۔

چودھری۔ (مایوسانہ انداز سے) نہیں مجھے کوئی عذر نہیں

فتح خاں۔ اور نام بھی چن لو۔

رام دھن۔ میرے خیال میں۔ اموگھ، فتح خاں، رام لال اور ۔۔۔ سبھی ٹھیک ہیں۔

گوڈر شاہ۔ سمبھو بھائی سرپنچ کسے بناتے ہو۔

سیٹھ۔ شیخ جمن کو!

رام دھن۔ الگو تمھیں کچھ عذر ہو تو کہو۔

چودھری۔ نہیں مجھے کچھ عذر نہیں ہے۔

(جمن کھاٹ پر جا بیٹھتے ہیں اور پنچ کھاٹ کے قریب ہو جاتے ہیں)

جمن۔ سیٹھ جی آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟

سیٹھ۔ جی بس مجھے یہی کہنا ہے کہ میں نے الگو چودھری سے ایک بیل لیا تھا اور ایک مہینے کے بعد دام دینے کو کہا تھا۔ پر مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ بیمار بیل میرے گلے باندھ دیں گے۔ سو وہ بیل دس روز کے اندر ہی مر گیا اب میں اس کے دام کیا دوں؟

جمن۔ تم نے بیل کب خریدا تھا؟

سیٹھ۔ تین مہینے ہوئے۔

جمن۔ جب تم بیل خرید رہے تھے اس وقت کوئی اور بھی تمھارے ساتھ تھا؟

سیٹھ۔ ہاں۔ نارائن اور فتح خاں تھے۔

جمن۔ نارائن کیا تم نے بیل کو دیکھا تھا؟

نارائن۔ ہاں جی۔

جمن۔ کیا وہ بیمار تھا؟

نارائن۔ نہیں تو۔ وہ تو اچھا بھلا تھا۔ اور مجھے یاد ہے اسی روز رام لال نے بھی چودھری سے بیل کھریدنے کی بات چیت کی تھی ان سے بھی پوچھ لیجے۔

جمن۔ رام لال کیا یہ سچ ہے؟

رام لال۔ ہاں میں نے بیل خریدنے کی بات کی تھی۔

جمن۔ کیا وہ بیل بیمار تھا؟

رام لال۔ نہیں وہ بالکل چنگا تھا۔

(جمن چاروں ساتھیوں سے آہستہ آہستہ بات چیت کرتے ہیں۔ اس کے بعد)

جمن۔ الگو چودھری اور سمبھو سیٹھ! پنچوں تمھارے معاملے پر غور کیا۔ سمبھو تم الگو چودھری کو بیل کی پوری رقم ادا کر دو۔ جس وقت بیل ان کے گھر گیا تھا اسے کوئی بیماری نہ تھی۔ اگر قیمت اسی وقت دیدی گئی ہوتی تو آج سمبھو اسے واپس لینے کا ہرگز تقاضا نہ کرتے۔

رام دھن۔ قسمت کے علاوہ ان سے کچھ تاوان بھی لیا جائے
سمجھو نے بیل کو دوڑا دوڑا کر مار ڈالا۔

جمن۔ اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔

گوڈر شاہ۔ سمجھو کے ساتھ کچھ رعایت ہونی چاہیئے۔ ان کا
بہت نقصان ہوا ہے اور اپنے کیے کی
سزا مل چکی ہے۔

جمن۔ اس کا بھی اصل معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ
الگو چودھری کی بھل منسی پر منحصر ہے۔

(سب اٹھ کر جانے لگتے ہیں) اب پنچایت
برخواست کی جاتی ہے۔

جمن۔ (چودھری کی طرف مڑتے ہوئے) چودھری
مجھے معاف کرو میں نے تمہیں اپنا دشمن سمجھ کر
غلطی کی تھی۔ تم نے اس پنچایت میں میرے خلاف
فیصلہ دیا تھا۔ میں نے سمجھا تم نے دشمنی کی۔ مگر
آج مجھے معلوم ہوا کہ پنچ کے استھان پر بیٹھ کر
نہ کوئی کسی کا دوست ہوتا ہے نہ دشمن۔
اُسے انصاف کے سوا کچھ نہیں سوجھتا۔ (دونوں
گلے ملتے ہیں)

(موسی داخل ہوتی ہے۔ جمن اس کے پیر
چھوتا ہے) مجھے معاف کر دیجیے خالہ۔ مجھ سے
بڑی بھول ہوئی تھی۔

خالہ۔ لے چپ بھی رہ۔ میں تو کب کی تجھے معاف
کر چکی تھی۔ دیکھ رہی تھی تو کب تک مجھ سے
ناراض رہتا ہے (فہمین اندر سے آتی ہے)

جمن۔ فہمین سنا تو نے خالہ نے کیا کہا؟

فہمین۔ مجھے معاف کر دیجیے ہاں جی۔

موسی۔ اچھا اچھا کر دیا معاف جو ہوا بھول جا۔ ارے
اب تو یہاں کیا کر رہی ہے۔ کہاں ہیں وہ بیا کے
مہمان۔ جمن تو کہہ رہا تھا کہ یہاں ناچ اور سنگیت
کی سبھا ہونے کو ہے۔ سب کو یہیں بلا لو۔

دماغ اور گردوں کی کمزوری

صحت کی خطرناک دشمن ہے جو توانائی اور تندرستی کو رفتہ رفتہ تباہ کر کے زندگی کو تلخ بنا دیتی ہے

قوی تن ایسے تمام امراض کا کامیاب علاج ہے جو مادۂ تولید کے تمام نقائص کو دفع کر کے دماغ میں تر و تازگی، قوت حافظہ کو تیز اور مردانہ قوت میں اضافہ کرتا ہے۔

قیمت ۲۰ خوراک کی شیشی چھ روپے، ۱۰ خوراک کی شیشی تین روپے ۴ آنہ

وقت مشورہ:- ۵ تا ۹ ساعت شام

تیار کردہ:- کامیاب دواخانہ نظام شاہی روڈ

زیر نگرانی:- حضرت حکیم میر ابراہیم علی صاحب چشتی القادری طبیب دواخانہ یونانی ناپسلی

سالار جنگ میوزیم و میر عالم گسٹ ہاوز

سالار جنگ میوزیم عجائبات عالم کا وہ مجموعہ ہے جس کی ایشیا میں نظیر نہیں۔ مشرقی اور مغربی ممالک کے اعلیٰ ترین فنکاری کے نمونے دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ وسیع نوادرات کا ذخیرہ ۱۰۰ کمروں میں آراستہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ حال ہی میں ایک جدید شعبۂ اطفال کی تشکیل کی گئی ہے۔ جو بچوں کی تفریح اور تعلیم کے لیے آپ اپنی نظیر ہے۔ دنیا کے گوشے گوشے سے شوقین میوزیم دیکھنے کے لیے آتے اور محو حیرت ہو کر واپس جاتے ہیں۔ آپ بھی اس کی سیر کیجیے اور نوادرات عالم کو اپنی نظروں سے ملاحظہ فرمایئے۔ پہلے کے مقابلہ میں جدید عجائبات کا بھی میوزیم میں اضافہ کیا گیا ہے جلو شعبہ جات صرف ایک روپیہ دس آنے میں آپ دیکھ سکتے ہیں۔ طالب علموں سے اور ہندوستانی فوجی سپاہی اور افسروں سے جو وردی میں ہوں نصف داخلہ لیا جاتا ہے۔

ہر ماہ کا پہلا جمعہ صرف خواتین کیلئے مختص رہے گا

★ ★ ★

میوزیم کے علاوہ سالار جنگ اسٹیٹ کمیٹی نے میر عالم تالاب کے قریب ایک گسٹ ہاوز بصرفۂ کثیر تعمیر و ترمیم کرکے اور جدید طرز پر آراستہ کر کے عوام کی تفریح کے لیے کھول دیا ہے جو شہر سے بہت ہی نزدیک واقع ہے اس کا منظر جاذب نظر اور آب و ہوا صحت بخش ہے۔ اس میں ضروریات کا جملہ اعلیٰ ترین سامان مہیا کیا گیا ہے۔

صبح ۹ بجے سے دوسرے دن صبح ۹ بجے تک قیام کے لیے صرف دس روپے کرایہ مقرر ہے۔ برقی روشنی کے اخراجات علیحدہ ہوں گے۔ یہ پرفضا مقام رہنے اور لطف اندوز ہونے کے لایق ہے۔

گسٹ ہاوز ہر ماہ ۱۶ ر تاریخ سے ختم ماہ تک میڈیکل ڈیپارٹمنٹ کیلئے مختص رہتا ہے

ادارۂ ادبیات اردو کی مطبوعات

عام معلومات اور تعلیم بالغاں

تعلیم کا مسئلہ — از ڈاکٹر ضی الدین صاحب صدیقی، صفحات ۹۶ قیمت ایک روپیہ

رفیق اردو داں — از مرزا عصمت اللہ بیگ مرحوم، قیمت دو روپے چار آنے

اردو دانی کی دوسری کتاب — تعلیم بالغان کے لیے، قیمت چھ آنے

خطابیات — شیخ رحیم الدین صاحب، ایک روپیہ بارہ آنے

عروض — مولوی کلیم اللہ حسینی صاحب، قیمت بارہ آنے

مرقع مشاہیر — قیمت پانچ روپے

معلم بالغاں — از شیخ زاہد حسین صاحب، صفحات ۵۶ قیمت ایک روپیہ

اردو دانی کی پہلی کتاب — جدید ترین اصول تعلیم کے مطابق، قیمت صفحے پانچ آنے

فن تقریر — فن تقریر پر معلوماتی کتاب، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

دفتری معلومات — از ظہیر الدین احمد صاحب، قیمت صفحے چھ آنے

بلاغت — مولوی کلیم اللہ حسینی صاحب، قیمت بارہ آنے

فہرست مطبوعات ادارہ — مرتبہ اکبر الدین صدیقی و غلام یزدانی صاحب، قیمت تین روپے

ملنے کا پتہ

ادارۂ ادبیات اردو

خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن

قطرہ میں طوفان!



● جی ہاں۔ سنکارا کے ایک ایک قطرہ میں طاقت کا ایک طوفان پوشیدہ ہے۔ یہ بے نظیر ٹانک آپ کے حلق سے اُترتے ہی آپ کے جسم میں چستی اور توانائی کی ایک لہر سی پیدا کر دیگا۔

سنکارا ناکافی غذائیت کی خرابی کو دور کرتا ہے اور جسم میں نیا خون اور نئی زندگی پیدا کرتا ہے۔

سنکارا

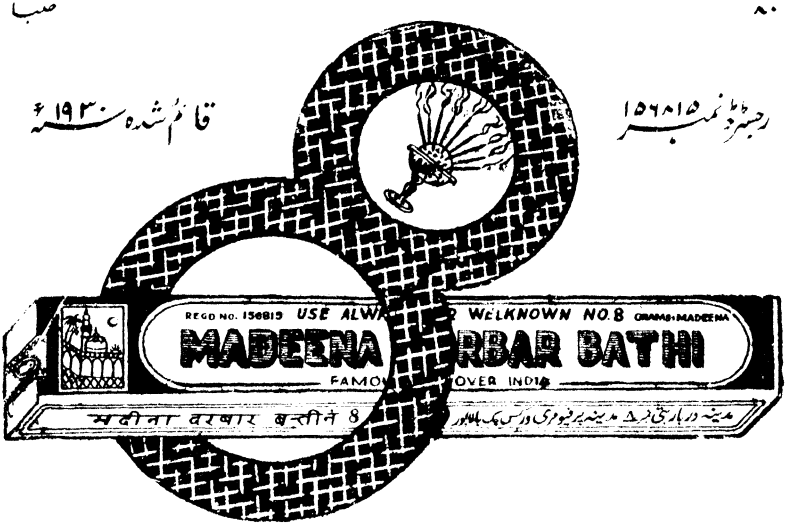
تمام خاندان کیلئے ایک ٹانک

ہر عمر و ہر موسم میں استعمال ہو سکتا ہے۔

●

قیمت فی بوتل -/-/۷ اَدھا -/۱۲/۳

ہمدرد ۔ دَواخانہ (وقف) دِہلی۔



MADEENA DURBAR BATHI
No 8 (REGD.)

مدینہ دربار اگربتی

جس کی بھینی بھینی اور بے مثال خوشبو آپ کو دیگر اگربتیوں سے
بے نیاز کر دے گی

(مدینہ پبلٹی)

کام کی بات

اپنے کردار کے لیے لوگوں کو پھولوں سے سبق لینا چاہیئے، گلاب کے مقبول ہونے کا راز یہ ہے کہ وہ کبھی یاسمین کی خوشبو پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتا

پیش کردہ

مدینہ دربار اگربتی

(مدینہ پبلشنگ)

ادارۂ ادبیات اردو کی مطبوعات

تاریخ وسیاست

مقدمہ تاریخ دکن	از پروفیسر عبدالمجید صدیقی قیمت :- عہ ۱۲
مال والوں کی تاریخ	از مولوی سید مراد علی صاحب قیمت :- عہ ۴
حیدرآباد	ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ قیمت :- ۱۰ر
سلسلہ سوانح سلاطین آصفی	از مولوی سید مراد علی صاحب ہر کتاب کی قیمت ۶ر
اعظم الامراء ارسطو جاہ	از پروفیسر عبدالمجید صدیقی
مختار الملک سالار جنگ اعظم	از فیض محمد صدیقی صاحب قیمت مجلد ۸ر
عماد الملک	از فیض محمد صدیقی صاحب قیمت :- ۸ر
ہندوستانی تمدنی	از ڈاکٹر الیشور ناتھ ٹوپا قیمت :- عہ ۲
ہندوستانی قومیت کا مسئلہ	از ڈاکٹر الیشور ناتھ ٹوپا قیمت :- عہ
اشوک اعظم	از سیدہ مہدہ جعفری صاحبہ قیمت :- ۸ر
یورپ جنگ سے پہلے	از ڈاکٹر بارون خاں شروانی قیمت :- عہ ۲
تاریخ سیاسیات	از پروفیسر عبدالمجید صدیقی قیمت :- عہ ۸
اسلامی عدل گستری	از محمد عبدالحفیظ صاحب صدیقی قیمت :- عہ
مسلمان شاہی خاندان	از محمد عبدالرحمن خاں صاحب قیمت :- پانچ روپے
ریاض مختاریہ	از دلاور علی صاحب دانش قیمت :- پانچ روپے
دادا بھائی نوروزجی	الہ آبادی ظہیر الدین احمد صاحب قیمت :- ۴ر
بلقان	از حفیظ صدیقی صاحب قیمت :- ۴ر
بہمنی سلطنت	از پروفیسر عبدالمجید صدیقی قیمت :- دو روپے آٹھ آنے

ملنے کا پتہ

ادارۂ ادبیات اردو۔ خیریت آباد، حیدرآباد دکن

مجلس مشاورت

حبیب الرحمٰن
فضل الرحمٰن
ڈاکٹر یوسف حسین خاں
ڈاکٹر طاہر علی خاں مسلم
رائے جانکی پرشاد
سیّد محمد
عالم خوندمیری
ڈاکٹر حفیظ قتیل
دلاور علی خاں
رضیہ بیگم
● خازن
عابد علی خاں
● زرِ سالانہ
ہند و پاک سے آٹھ روپے
● ششماہی
پانچ روپے

منظورہ محکمہ تعلیمات حکومت حیدرآباد

مجلس ادارت
● سلیمان اریب
● حسینی شاہد
● مغنی تبسم

جلد ۳ شمارہ ۳،۲

۱۹۵۷ء

قیمت
بارہ آنے

ٹیلی فون
۵۴۰۲

پرنٹر پبلشر۔ سلیمان اریب ● نیشنل پریس ● ۱۱، مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ۔ حیدرآباد دکن

اس شمارے میں

پہلی بات ۵

• مضامین

موازنہ آہنگ — ابوظفر عبدالواحد — ۶
رومیو اور جولیٹ — ڈاکٹر وحیدالدین — ۱۶
تحلیل نفسی کی بنیادیں — وحید اختر — ۲۳

• نظمیں

گمنام شہید — فضل الرحمٰن — ۳۵
دوسری محبت — شاذ تمکنت — ۳۷
رات کو رو رو صبح کیا — عزیز قیسی — ۳۹
ایک ارمان اک امید دید — س۔ ا۔ عشرت — ۴۰
دشت نیم شب — رضی اختر شوق — ۴۱
ٹوٹا طلسم نیم شبی — راحل — ۴۳
رقص ناتمام — سکندر محسن — ۴۴

• کہانیاں

دو مرد — رام لال — ۴۷
ایک مرد ایک عورت — نینا کاش — ۵۵
ہم سفر — آمنہ ابوالحسن — ۶۴
پیسے کا کھیل — ہرمندر سنگھ دوست — ۷۵

• غزلیں

نشور واحدی، حسن نعیم — ۸۱ تا
ابن احمد تاب، مظہر امام
خیرات ندیم، غفور انیس — ۸۶

• تنقیدی تبصرے

زبان اور علم زبان — مجنوں گورکھپوری — ۸۷ تا
روایت اور بغاوت
اردو غزل کی نشوونما
پرچھائیاں — ۹۳

• بازگشت

آمنہ ابوالحسن — ۹۴
عوض سعید
غلش جعفری
شانتی رنجن بھٹاچاریہ
قطب شاہین
رفیق جعفری

پہلی بات

یہ شمارہ فروری اور مارچ کا مشترکہ شمارہ ہے۔ چونکہ پچھلے کئی مہینوں سے "صبا" اپنے وقت پر نہیں نکل رہا تھا۔ اس لیے یہی مناسب معلوم ہوا کہ اس دفعہ دو شماروں کو ملا دیا جائے تاکہ آئندہ پرچہ بروقت نکل سکے۔

آج ہندستان میں اعلیٰ ادبی معیار کے دو چار ہی اردو جریدے باقی رہ گئے ہیں اور "صبا" بھی ان میں سے ایک ہے۔ جہاں ہم کو یہ شکایت ہے کہ ادب دوست حضرات "صبا" کی توسیع اشاعت میں بالکل حصہ نہیں لے رہے ہیں وہیں ہمیں اپنے بلند پایہ ارباب قلم سے بھی گلا ہے کہ وہ ہم سے تعاون نہیں کر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر ہم اپنا معیار برقرار نہ رکھ سکیں تو اس کی ذمہ داری ہمارے لکھنے والوں پر بھی ہوگی۔

اس شمارے میں وحید اختر کا ایک مضمون پیش کیا جا رہا ہے۔ وحید اس وقت عثمانیہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کے لیے فلسفے میں ریسرچ کر رہے ہیں۔ ان کی شاعرانہ حیثیت سے تو آپ واقف ہی ہیں۔ اب آپ انھیں ایک نثر نگار روپ میں بھی دیکھیے۔

اس شمارے میں ہم بطور خاص تین نئے شاعروں اور ایک پرانے شاعر کو متعارف کرانا چاہتے ہیں۔ رضی اختر شوق عثمانیہ یونیورسٹی کے گریجویٹ ہیں۔ آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔ ہم پہلی دفعہ ان کی ایک خوبصورت نظم شائع کر رہے ہیں۔ راحل ایک جواں سال شاعر ہے اور اس میں غضب کی شاعرانہ صلاحیتیں ہیں۔ اگر وہ اپنی شاعری پر محنت کرے اور اپنے آپ کو مشکل پسندی سے بچائے تو اس کا مستقبل بہت تابناک ہے۔ سکندر محسن کی پہلی ہی نظم کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک اچھے شاعر بن سکتے ہیں۔ ابن احمد آب غزل خوب لکھتے ہیں لیکن اب تک ان کی بہت کم چیزیں طبع ہوئی ہیں۔ اس دفعہ ہم ان کی ایک بہت کامیاب غزل پیش کر رہے ہیں۔

ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ اردو کا ایک قدیم رسالہ ہمایوں بند ہو گیا۔ ہمایوں ۳۵ برس سے اردو زبان و ادب کی خدمت کر رہا تھا اور رسالوں کی تاریخ میں اس کا نام کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا اس طرح بند ہو جانا اردو کے لیے فال نیک نہیں اور خاص طور پر پاکستان میں۔ اگر ہمارے لکھنے پڑھنے والے اپنی زبان و ادب سے اسی طرح لاپرواہی برتتے رہیں تو ہمایوں کیا تمام پرچوں کی جان پر بن سکتی ہے۔ کاش ہمایوں پھر جاری ہو سکے۔ پاکستان کے ادب دوستوں کو اس طرف توجہ کرنی چاہیے۔

ابو ظفر عبدالواحد

موازنہ و آہنگ

(سلسلہ)

(۴)

یہ تو پہلے ہی واضح کیا جا چکا ہے کہ ہندی میں اوزان کی تقطیع کا مدار دو اصولوں پر ہے، ایک ماترک اور دوسرا برنک۔ چنانچہ چھندوں (اوزان) کی تقسیم اور مختلف اوزان کے نام بھی انھیں بنیادی اصولوں پر قائم ہیں۔

برنک اور ماترک تقسیم کے لحاظ سے ہندی اوزان کی تعداد یوں تو ڈیڑھ سو یا اس سے کچھ اوپر پہنچتی ہے ان سب کا جائزہ لینا عام دلچسپی کا باعث ہوگا، اور نہ قرین مصلحت، اس لیے یہاں صرف ایسے اوزان پیش کیے جائیں گے جن کا عام طور پر چلن ہے۔

قدیم فن دانوں کے عام چلن کے خلاف ہم ماترک اور برنک چھندوں کو ایک جگہ سمونے اور ان کو خلیلی سانچوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ ایک عامی بھی ترنم کی اصولی یکسانیت اور تقطیعی کیف کو بہ آسانی محسوس کر سکے۔

اس حصے میں اُن اوزان کا ذکر ہوگا جو کسی ترنمی سانچے کو ایک بار مصرعے میں دُہرانے سے پیدا ہوتے ہیں۔ انھیں یک رکنی مصرعے یا اکہرے اوزان کہنا مناسب ہوگا۔ بعض یک رکنی اوزان کا پچھلی مشق میں ہم ذکر بھی کر چکے ہیں۔ یہاں ان کا تفصیلی جائزہ لیا جائے گا۔

(۱) یک رُکنی اوزان

(۴ مت، ۲ برن)

۱۔ کامل : ایسا اکہرا مصرع جس کی ترکیب میں چار ماترائیں یا دو گرو (ـ ـ) شامل ہوں۔ فعلن (متدارک مزاحف) اس کی جوابی شکل ہوگی۔ ایک مثال ؎

سوا ہے ٭ ناری ٭ پنکی ٭ پیاری
۴ ۳ ۴
ے ے = ۲ برن ے ے = ۲ برن ے ے = ۲ برن
فعلن فعلن فعلن

۲ + ۲ = ۴ مت ۲ + ۲ = ۴ مت ۲ + ۲ = ۴ مت

اوپر کے چار مصرعے ہمارے ہاں کے ایک مصرعے کے برابر ہوں گے۔ کما کو استری چھند بھی کہتے ہیں۔ مولانا حالی کی "مناجات بیوہ" اسی چورکنی استری چھند میں ہے، جسے متدارک مثمن مقطوع کہیں گے۔ مثمن یعنے آٹھ رکنی اس لیے کہ پورے شعر میں بحساب ۴ + ۴ آٹھ بار فعلن آیا ہے۔

(۴ مت ۲ برن)

۲۔ رمن، ایسا وزن جس میں فی مصرعہ ایک سگن (ا ا ے) آے جس کی جملہ ماترائیں ۴، اور اجزا (برن) ۳ ہوں گے۔ یہ سانچہ فعلن کا ہم وزن ہوگا، جسے اصطلاح عروض میں متدارک مخبون کہتے ہیں ؎

گرجا ٭ گرجا ٭ بھیجے ٭ بھیجے
ا ا ے ۳ ب ا ا ے ۳ ب ا ا ے ۳ ب
فعلن فعلن فعلن

۱ + ۱ + ۲ = ۴ مت ۱ + ۱ + ۲ = ۴ مت ۱ + ۱ + ۲ = ۴ مت ۱ + ۱ + ۲ = ۴ مت

(۵ مت، ۳ برن)

۳۔ ششی، فی مصرع ایک یگن (ا ے ے)، فعولن کا ہم وزن جسے متقارب سالم کہیں گے۔ پچھلے باب میں گنوں (ارکان) کے بیان میں ایک مثال دیدی گئی ہے۔ ایک نئی مثال یہاں اور دی جاتی ہے

(کھرر اکشش)
۴ ۳ ۴
کھراری ٭ بہاری ٭ کرپالا ٭ ویالا
ا ے ے ۳ ب ا ے ے ۳ ب ا ے ے ۳ ب
فعولن فعولن فعولن

۱ + ۲ + ۲ = ۵ مت ۱ + ۲ + ۲ = ۵ مت ۱ + ۲ + ۲ = ۵ مت

ہمارے ہاں اوپر کے چار مصرعوں کا ایک مصرع ہوگا۔ مسدس حالی اور اقبال کا ساقی نامہ (بال جبریل میں) اسی چورکنی ششی میں ہے۔ چورکنی ششی کو ہندی والے بھجنگ پریات کہتے ہیں۔

۴۔ پریا : فی مصرع ایک رگن (ے ا ے) فاعلن کا ہم وزن۔ گن اگن کے بیان میں ایک

مثال اس سے پہلے دی جا چکی ہے۔ ایک اور مثال یہاں پیش کی جاتی ہے ؎

باغ میں[1] ۔: ناچتے[2] ۔: مور بھی[3] ۔: ہیں مگن[4]

ISI = ۳ب ISI = ۳ب ISI = ۳ب ISI = ۳ب

فاعلنُ فاعلنُ فاعلنُ فاعلنُ

۲+۱+۲=۵مت ۲+۱+۲=۵مت ۲+۱+۲=۵مت ۲+۱+۲=۵مت

(۶ مت، ۵ برن)

۵ - رام : فی مصرع ۱ لگھو + ۲ گرو (IISI) = فعلاتن جو رمل مخبون کا سانچہ ہے ؎

جگ[1] ماہیں ۔: سکھ ناہیں[2] ۔: بھج رامے[3] ۔: سچ کامے[4]

IISI = ۴ب IISI = ۴ب IISI = ۴ب IISI = ۴ب

فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلاتن

۱+۱+۲+۲=۶مت ۱+۱+۲+۲=۶مت ۱+۱+۲+۲=۶مت ۱+۱+۲+۲=۶مت

۶ - رس، کلا : ایک ہی چھند کے دو نام ہیں۔ فی مصرع ایک بھگن + ایک گرو (SIIS) = مفتعلن ۔ جسے رجز مطوی کہیں گے۔ مثال :-

رام[1] بھجو ۔: کام[2] تجو ۔: مان کہی ۔: سار یہی

مفتعلن مفتعلن مفتعلن مفتعلن

SIIS = ۴ب SIIS = ۴ب SIIS = ۴ب SIIS = ۴ب

۲+۱+۱+۲=۶مت ۲+۱+۱+۲=۶مت ۲+۱+۱+۲=۶مت ۲+۱+۱+۲=۶مت

(۷ مت، ۴ برن)

۷ - مُدرا : فی مصرع ایک بھگن + ایک گرو (ISSS) = مفاعیلن۔ ہزج کا سانچہ ہے ؎

(کام دیو کے عدد)

اینگاری[1] ۔: ششی دھاری[2] ۔: کر پاکیجے[3] ۔: سکھ دیجے[4]

ISSS = ۴ب ISSS = ۴ب ISSS = ۴ب ISSS = ۴ب

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

۱+۲+۲+۲=۷مت ۱+۲+۲+۲=۷مت ۱+۲+۲+۲=۷مت ۱+۲+۲+۲=۷مت

۸ - دھارا : فی مصرع ایک بھگن + ایک گرو (SISIS) فاعلاتن۔ رمل کا ہم وزن ہے ؎

رام نا ما ۔ ۲ آٹھا (پہر) ۔ اشٹ جاما ۳ (میری) ۔ مور پیاری ۴ ۔ چت لا ری

ا ۱ ۵ ۵ = ۲ ب ا ۱ ۵ ۵ = ۲ ب ا ۱ ۵ ۵ = ۲ ب ا ۱ ۵ ۵ = ۲ ب

فا علاتن فا علاتن فا علاتن فا علاتن

۲+۱+۲+۲ = ۷ مت ۲+۱+۲+۲ = ۷ مت ۲+۱+۲+۲ = ۷ مت ۲+۱+۲+۲ = ۷ مت

۹ ۔ ھیر : فی مصرع ایک لگن + ایک گرو (ا ۱ ۵ ، ۵) = مستفعلن ۔ رجز کا مثل ہے ۔ ؎

را ما بھجو ۔ ۲ کرو (غصہ) دھ بجو ۳ ۔ چنتا ھرو ۴ ۔ پاپے دُرو

۵ ۵ ا ۱ = ۲ ب ۵ ۵ ا ۱ = ۲ ب ۵ ۵ ا ۱ = ۲ ب ۵ ۵ ا ۱ = ۲ ب

۲+۲+۱+۲ = ۷ مت ۲+۲+۱+۲ = ۷ مت ۲+۲+۱+۲ = ۷ مت ۲+۲+۱+۲ = ۷ مت

(۷ مت، ۵ برن)

۱۰ ۔ مایا : فی مصرع ایک لگن + ایک لگو + ایک گرو (ا ۱ ۵ ، ا ، ۵) = مُتفاعلن ۔ بحر کامل کا سانچہ ہے ؎

تج کرودھ (غصہ) کو ۔ ۲ دھر بدھ کو ۳ ۔ بھل ہے سما ۴ ۔ جپ ری اُما (دوسری کشن)

ا ۱ ۵ ا = ۵ پ ا ۱ ۵ ا = ۵ ب ا ۱ ۵ ا = ۵ ب ا ۱ ۵ ا = ۵ ب

مُتفاعلن مُتفاعلن مُتفاعلن مُتفاعلن

ا+۱+۲+ا = ۷ مت ا+۱+۲+ا = ۷ مت ا+۱+۲+ا = ۷ مت ا+۱+۲+ا = ۷ مت

اوپر کے چاروں اکہرے مصرعوں کا ہمارے ہاں صرف ایک مصرعہ ہوگا ۔ چورکنی، بحر کامل کو ہندی والے اگیتا، یا اگیت چھند کہتے ہیں جس کا ذکر بعد میں آئے گا ۔

(ب) دو رکنی (مربع) اوزان

(۸ مت، ۵ برن)

۱۱ ۔ ھنس : فی مصرع ایک بھگن + ۲ گرو (ا ۱ ۱ ، ۵ ۵) = فاع فعولن جو متقارب اشتم کا سانچہ ہے ؎

چھوڑ ہمارے ۔ ۲ آہ کہارے ۳ ۔ توڑ ھگ رہوں ۴ ۔ بھاج بہیوں

ا ۱ ۱ ۵ ۵ = ۵ ب ا ۱ ۱ ۵ ۵ = ۵ ب ا ۱ ۱ ۵ ۵ = ۵ ب ا ۱ ۱ ۵ ۵ = ۵ ب

فاعَ فعولن فاعَ فعولن فاعَ فعولن فاعَ فعولن

۲+۱+۱+۲+۲ = ۸ مت ۲+۱+۱+۲+۲ = ۸ مت ۲+۱+۱+۲+۲ = ۸ مت ۲+۱+۱+۲+۲ = ۸ مت

(ترجمہ)

۱۔ ہے ہے چھوڑ دے، (۲) آ دے کیا بات، (۳) تیرے ہی ڈھگ (پاس) رہوں گی (۴) بھاگ نہ جاؤں گی۔

۱۲۔ کبیر : فی مصرع ایک نگن + ایک لگھ + ایک گرو (ا ا ا ا ، ا ا ا ا) = فعولن فعولن

جو متقارب محذوف کا مماثل ہے۔ ؎

چھوڑ رام کو ٭ بھجو کام کو ٭ دھرو دھیر کو ٭ ہر و پیر کو

ا ا ا ا = ۵ ب ا ا ا ا = ۵ ب ا ا ا ا = ۵ ب ا ا ا ا = ۵ ب

فعولن فعولن فعولن فعولن

۱+۲+۲+۱=۸ مت ۱+۲+۲+۱+۲=۸ مت ۱+۲+۲+۱+۲=۸ مت ۱+۲+۲+۱+۲=۸ مت

۱۳۔ اسی ذیل میں ہم ایک اور چھند کو شامل کیے دیتے ہیں جس کو تلک چھند کہتے ہیں، اس لیے کہ گو اس کے اجزا (برن) چھ ہوتے ہیں لیکن اس کی ماتراؤں کا مجموعہ وہی آٹھ ہے، جیسا کہ کبیر اور جنس کا۔ فعلن کو دو بار دہرانے سے مصرع کا وزن پیدا ہوتا ہے اور اس کی ترکیب میں دو سگن (ا ا ا ، ا ا ا) آتے ہیں ؎

ہر کو جو بھجیں ٭ کٹھن سنگ تجیں ٭ بھو سندھ تریں ٭ سب کاج سریں

ا ا ا ا = ۶ ب ا ا ا ا = ۶ ب ا ا ا ا = ۶ ب ا ا ا ا = ۶ ب

فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن

۱+۱+۲، ۱+۱+۲=۸ مت ۱+۱+۲، ۱+۱+۲=۸ مت ۱+۱+۲، ۱+۱+۲=۸ مت ۱+۱+۲، ۱+۱+۲=۸ مت

(۹ مت ۶ برن)

۱۴۔ باری : فی مصرع ۲ گرو + ایک نگن (ا ا ، ا ا ا) = فعلن فعولن جو

متقارب اثلم سالم کا وزن ہے ؎

تو لے کنھائی ٭ میں یاہ لائی

ا ا ا ا = ۵ مت ا ا ا ا = ۵ مت

فعلن فعولن فعلن فعولن

۲+۲، ۱+۲+۲=۹ مت ۲+۲، ۱+۲+۲=۹ مت

(۱۰ مت ۶ برن)

۱۵۔ بھوہا : فی مصرع ۲ رگن (ا ا ا ، ا ا ا) = فاعلن مصرع میں دوبارہ، جو متدارک مربع سالم کا وزن ہے۔ بھوہا کو "بجوہا" بھی کہتے ہیں ؎

پیارے جی میں[1] دھرے ؛ لاگ مورے[2] گرے (لگے)
ا ا ا ا ا ا ا ا ا ا ا ا ا ا ا ا = ۱۶ ب
فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن

۲+۱+۲+۲+۱+۲+۲+۱+۲+۲+۱+۲+۲+۱+۲+۲ = ۱۶ امت

۱۶ ۔ سنکیاناری: فی مصرع ۲ رگن (ا ا ا ا ا ا ا ا) = فاعلن مصرع میں دو بار، جو متقارب مربع سالم کا وزن ہے ۔

کتے رین[1] جاگے؟ ؛ نہار[2] کو نہ سوئیں (اس طرح) ؛ جیسے نینن دیکھو[3] ؛ انیند بے اجو ہیں (بے خواب) (ابھی)
ا ا ا ا ا ا ا ا ب ا ا ا ا ا ا ا ا ب ا ا ا ا ا ا ا ا ب
فعولن فعولن فعولن فعولن فعولن فعولن فعولن فعولن

۱+۲+۲+۱+۲+۲+۱+۲+۲+۱+۲+۲+۱+۲+۲+۱+۲+۲+۱+۲+۲+۱+۲+۲+۱+۲+۲ = ۱۶ امت

(۱۱ امت، ۷ برن)

۱۷ ۔ سمان : مصرع میں ایک رگن + ایک جگن + ایک گرو (ا ا ا ا ا ا ا) = فاعلن مفاعلن یا فاعلاتُ فاعلن (ہزج مربع اشتر مقبوض، یا رمل مربع مکفوف محذوف) کا ہم وزن ہوگا۔ ذیل کے چار مصرعوں میں دو زنگی تقطیع (الف ہزج اور ب رمل) کی جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

رام نام گاؤ[1] رے ؛ اشٹ[2] جام[3] دھیاؤ رے ؛ بول بول[4] ساپ رے ؛ ساپ کو نہ آپ رے
ا ا ا ا ا ا ا ا ب ا ا ا ا ا ا ا ا ب ا ا ا ا ا ا ا ا ب ا ا ا ا ا ا ا ا ب
فاعلن مفاعلن فاعلن مفاعلن فاعلاتُ فاعلن فاعلات فاعلن

۲+۱+۲+۱+۲+۱+۲ = ۱۱ امت ۲+۱+۲+۱+۲+۱+۲+۱+۲ = ۱۱ امت ۲+۱+۲+۱+۲+۱+۲+۱+۲ = ۱۱ امت ۲+۱+۲+۱+۲+۱+۲+۱+۲ = ۱۱ امت

(۱۲ امت، ۸ برن)

۱۸ ۔ پربھاتکا : فی مصرع ایک جگن + ۲ رگن + ایک لگو + ایک گرو (ا ا ا ا ا ا ا ا) = مفاعلن مفاعلن جو ہزج مربع مقبوض کا مماثل ہے ۔

چھوٹے[1] انمول[2] (انوکھے) ہار[3] (ڈال) ہیں ؛ مُکتے الوپ[4] ہار رہیں
ا ا ا ا ا ا ا ا ب ا ا ا ا ا ا ا ا ب
مفاعلن مفاعلن مفاعلن مفاعلن

۱+۲+۱+۲+۱+۲+۱+۲ = ۱۲ امت ۱+۲+۱+۲+۱+۲+۱+۲ = ۱۲ امت

۱۹ - ہلکا : مصرع میں ایک رگن + جگن + گرو + لگو (ISI، ISI، IS) = فاعلن مفاعلاں

جو ہزج مربع اشتر مقبوض ندال کا وزن ہے ۔ ؎

یوں لگے اپار جوت (درجسم) ۔:۔ ہلکا (تیجلی) ملین (لشکنده) ہوت

ISIISI ISIISI = ۸ب

فاعلن مفاعلاں فاعلن مفاعلاں

۲+۱+۲+۱+۲+۱+۲+۱ = ۱۲ مت ۲+۱+۲+۱+۲+۱+۲+۱ = ۱۲ مت

(۱۲ مت، ۹ برن)

۲۰ - تومر : مصرع میں ایک سگن + ۲ جگن (IIS، ISI، ISI) = مُتفاعلن فعلاتُ کے مماثل ہوگا، جو بحر کامل مربع اخذ مسبغ کا وزن ہے ؎

بھج رام کرشن مکند ۔:۔ برج نانھ گوکل چند

IIS ISI IIS ISI = ۹ب IIS ISI IIS ISI = ۹ب

مُتفاعلن فعلاتُ مُتفاعلن فعلاتُ

۱+۲+۱+۲+۱+۲+۱+۲ = ۱۲ مت ۱+۲+۱+۲+۱+۲+۱+۲ = ۱۲ مت

۲۱ - انوچھلا : فی مصرع آٹھ اکہری اور دُہری ماتراییں + ایک جگن (جس میں جگن سے پہلے کی ماترائیں دونوں مصرعوں میں کسی قدر بے میل سی آتی ہیں اور جن کا عروضی بدل بھی تلاش کرنا ناممکن ہے) ملاحظہ ہو ذیل کے مصرعوں سے اس چھند کے تیور ۔

اہُو جسومت نندن ۔:۔ کھل دل دیخ نکندن

ISI ISI IIS = ۹ب IIS ISI IIS = ۹ب

۱+۲+۱+۲+۱+۲+۱+۲ = ۱۲ مت ۱+۲+۲+۲+۱+۲+۱+۱ = ۱۲ مت

(۱۳ مت، ۸ برن)

۲۲ - نراچکا : مصرع میں دو گرو + جگن + رگن (SS، ISI، ISI) = مُستفعلن مفاعلن

جو رجز مربع سالم مخبون کا وزن ہے ؎

(ابرو) بھوں نہیں، کڑی کمان ہیں ۔:۔ نیناں (تیر) پر چنڈ باں ہیں

SSISISI = ۸ب SSISISI = ۸ب

مستفعلن فاعلن مستفعلن فاعلن

۲+۲+۱+۲+۱+۲+۱+۲ = ۱۳ مت ۲+۲+۱+۲+۱+۲+۱+۲ = ۱۳ مت

(۱۴ مت، ۸ برن)

۲۳ - سُوم : مصرع میں ایک رگن + نگن + ۲ گرو (ISS . ISI . SS) = فاعلاتن فاعلاتن، جو رمل مربع سالم کا وزن ہے ؎

رادھکا دھیتا (شوہر) ، مکت (نجات دہندہ) ، گا سے لے رے ، نند نندا

ISISISI S S ، ب ISISISI SS = ب

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن

۲+۱+۲+۲ ، ۲+۱+۲+۲ = ۱۴ مت ۲+۱+۲+۲ ، ۲+۱+۲+۲ = ۱۴ مت

(۱۴ مت، ۱۰ برن)

۲۴ - سَنیتا : مصرع میں ایک سگن + ۲ جگن + گرو (IIS . ISI . ISI . IS) مُتفاعلن مُتفاعلن

جو بحر کامل مربع سالم کا وزن ہے ؎

کبھو (کبھی) نہ رُوسن (روٹھنا) سٹھا (روٹھنا) ہوں ، کہو (جو کہو گے) سو میں اب (مانوں گی) ماہوں

IIS ISI ISI IS = ب IIS ISI ISI IS = ب

مُتفاعلن مُتفاعلن مُتفاعلن مُتفاعلن

۱+۱+۲+۱+۲ ، ۱+۱+۲+۱+۲ = ۱۴ مت ۱+۱+۲+۱+۲ ، ۱+۱+۲+۱+۲ = ۱۴ مت

* * *

ج - سہ رُکنی (مسدس) اوزان

(۱۲ مت، ۶ برن)

۲۵ - بَدل لیکھا : مصرع میں دو گن (S S S ، S S S) = فعلن فعلن فعلن، جو متقارب مُسدّس اثلم کا وزن ہے ؎

تیرے پاچھے کو (اون) ہے ، واکی شوبھا جو ہے

SS ، SS ، SS = ب SS ، SS ، SS = ب

فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن

۲+۲ ، ۲+۲ ، ۲+۲ = ۱۲ مت ۲+۲ ، ۲+۲ ، ۲+۲ = ۱۲ مت

(۱۲ مت، ۹ برن)

۲۶ - مدلیکھا : مصرع میں ایک گن + سگن + گرو (SSS ، IIS ، S) = فعلن فاع فعولن،

جو متقارب اثلم محبوق (اثرم) سالم کا وزن ہے ؎

(تجھی کو) (بھلائی) (سے)
تیرو ہوں چاہتا ہوں ؛ تو سوں پریت بنا ہوں

ب ۔ ۱۵ ۔ ۱۵ ۔ ۱۵ ۔ ۱۵ ب ۔ ۱۵ ۔ ۱۵ ۔ ۱۵ ۔ ۱۵ ب

فعلن فاع فعولن فعلن فاع فعولن

۲+۲+۱ ، ۱+۲+۲ ، ۲+۲+۱ ، ۱+۲+۲ = ۱۲ مت ۲+۲+۱ ، ۱+۲+۲ ، ۲+۲+۱ ، ۱+۲+۲ = ۱۲ مت

(۱۵ مت ۴½ برن)

۲۷ - چوپئی : ٹبرا ہی سبک سانچہ ہے جو بحر سریع کے ایک خوش آہنگ وزن (مفتعلن مفتعلن فاع) سے ملتا جلتا ہے۔ ہر مصرع میں پندرہ ماتراؤں بالالتزام آتی ہیں، البتہ چوکے (چار مصرعوں کا فطعہ) کے آخری اجزا میں تنوع کی خاطر گنوں (ارکان) کی ہیر پھیر سہتی ہے۔ تکنیک (صناعت) کے لحاظ سے چوپائیاں ثنوی کے دوتالے جانچ میں رباعی کے چوتالے سے مختلف بدل ہیں۔ مثلاً ملاحظہ ہو اس چوکے کی بہار۔ دُہری بانٹ طوالت کا موجب ہوگی عروض کے متبادل ارکان آپ خود ٹھاکر آنک سکتے ہیں:-

(۱) (پدمنی) (گلے کے اطراف) (موتی) (مالا) (پان کی لالی) (مونگا)
پدمن کے اُرنگ من مال ؛ پیک بھاس پدرم سی لال
ب ۔ ۱۱۵ ۔ ۱۱۵ ، ۱۵ ۔ ۱۱۵ ب ۱۱۵ ۔ ۱۱۵ ، ۱۵ ۔ ۱۱۵ ب
۲+۱+۲+۱ ، ۲+۱+۲+۱ = ۱۵ مت ۲+۱+۲+۱ ، ۲+۱+۲+۱ = ۱۵ مت

(چوٹی کا عکس) (اس پر) (موتی) (رات ہو)
بین بجے جب تا پر پڑے ؛ نیلم بن کی شوبھا ہرے
ب ۱۵۱ ، ۱۵۵ ۔ ۱۵ ۔ ۱۵۱ ب ۱۵۱ ، ۱۵۵ ۔ ۱۵ ۔ ۱۵۱ ب
۲+۱+۲+۱ ، ۲+۲+۲+۱ = ۱۵ مت ۲+۱+۲+۱ ، ۲+۲+۲+۱ = ۱۵ مت

اوپر کے چوکے میں مصرع سوم و چہارم کے ہندی آنکڑوں (لگھو اور گرو) کا جزئی فرق اور برنوں کی مجموعی تعداد کا اختلاف غیر اہم ہے۔ اس لیے کہ ماتراؤں کی مجموعی تعداد مساوی ہے۔

(۱۶ مت، ۹ برن)

۲۸ - ہادا گا لک : اسی طرح خوش آہنگ اور چوپئی کا کسی قدر بدلا ہوا روپ ہے جس میں صوتی اجزا (برنوں) کی تعداد نو، اور ماتراؤں سولہ ہوتی ہیں۔ مفعولن مفعول فعولن اس کا

متبادل وزن ہوگا۔ اس کا ترنم کیف چوپئی سے کچھ تیز اور جست ہوتا ہے۔ چوپئی کے اس نعم البدل کے بھی تیور دیکھئے:

(۱) میری نانو سیکھ سہیلی ری — مس اوسر پہیو نہ الی ری
ssss،ıs،ıss = بحر — ssss،ıs،ıss = بحر
۲+۲+۲+۲ ، ۲+۱ ، ۱+۲+۲ = ۱۶ مت — ۲+۲+۲+۲ ، ۲+۱ ، ۱+۲+۲ = ۱۶ مت

(۲) روس (روٹھنا) مان، اب بھول نہ کیجئے — درشن کرمن (دل) آنند لیجئے
ıs،ıs،ıss = بحر — ıs،ıs،ıss = بحر
۲+۱+۲+۲ ، ۲+۱+۲ ، ۱+۲+۲ = ۱۶ مت — ۲+۱+۲+۲ ، ۲+۱+۲ ، ۱+۲+۲ = ۱۶ مت

اس سے پہلے کے چوکے کی طرح یہاں بھی آنکڑے کا اختلاف، اور مصرع سوم و چہارم میں ایک ماترا کی بیشی و کمی نعمی اعتبار سے جائز اور ناقابل اعتنا ہے۔

(۱۸ مت، ۱۲ برن)

۲۹۔ چاتک: مصرع میں جگن + رگن دوبار (ıs،ıs،ıs،ıs) مفاعلن مفاعلن مفاعلن مفاعلن جو ہزج مسدس میں مقبوض کا مماثل ہے۔

(وہی وقت، درگا شنکر جی)
بجی بجے جو بانسری برجیش کی ۔ بھئی کبدھ بدھی ہی گنیش کی
ıs،ıs،ıs،ıs = بحر — ıs،ıs،ıs،ıs = بحر
مفاعلن مفاعلن مفاعلن — مفاعلن مفاعلن مفاعلن
۱+۲+۱+۲ ، ۱+۲+۱ ، ۱+۲+۱+۲ = ۱۸ مت — ۱+۲+۱+۲ ، ۱+۲+۱ ، ۱+۲+۱+۲ = ۱۸ مت

(۲۱ مت، ۱۵ برن)

۳۰۔ من ہنس: مصرع میں ایک سگن + ۲ جگن + بھگن + رگن (ıs،ıs،ıs،ıs،ıs،ıs،ıs) = مفاعلن مفاعلن مفاعلن، جو بحر کامل مسدس کا وزن ہے۔

(آنچل) (جوبن) (فریب) (ٹوٹنے)
انچرا اگھار دکھائے کے جل سوں ہیو ۔ ترچھے چتے مسکائے کے کچھ تیں کیو
ıs،ıs،ıs = بحر — ıs،ıs،ıs = بحر
مفاعلن، مفاعلن، مفاعلن — مفاعلن، مفاعلن، مفاعلن
۱+۲+۱+۲ ، ۱+۲+۱+۲ ، ۱+۲+۱+۲ = ۲۱ مت — ۱+۲+۱+۲ ، ۱+۲+۱+۲ ، ۱+۲+۱+۲ = ۲۱ مت

(باقی آئندہ)

ڈاکٹر سید وحید الدین

رومیو اور جولیٹ

شکسپیر کا ڈرامہ رومیو اور جولیٹ شباب اور الفت کا حزنیہ ہے۔ شباب اور الفت ایک دوسرے سے لزومی طور پر وابستہ نہیں ہوتے۔ محبت زندگی کے کسی موسم میں بھی نمودار ہو سکتی ہے۔ کبھی تو وہ اتنے سویرے آتی ہے کہ ہم کو خود پتہ نہیں چلتا کہ ہے کیا اور کبھی اتنے دیر گئے کھٹکھٹاتی ہے کہ دنیا اس کو سمجھ نہیں سکتی۔ انٹونی اور کلوپٹرا میں محبت جوانی کا نکھار رکھتی ہے گو جوانی اب باقی نہیں۔ محبت خواہ کبھی بھی کیوں نہ نمودار ہو عہد شباب کی بے تابی رکھتی ہے اور افلاطونی تصور کی طرح زندگی کے ہر زمانے کو منور کر سکتی ہے۔ جوانی بھی ہر وقت اس مقام پر نہیں ملتی جہاں اس کی توقع ہوتی ہے۔ محبت خود جوانی کو اپنے ساتھ لے آتی ہے، اور یہ تبلاتی ہے کہ جس کو ہم شباب کہتے ہیں وہ عصری زندگی کا سیدھا سادا مظہر نہیں ہے۔ اس کی روح ہمارے ساتھ اٹھلاتی رہتی ہے گو ہم اس کے دائمی حضور سے آگاہ نہیں ہوتے۔ شباب ضرور حیاتیاتی شرائط و مطالبات کا شکار ہو جاتا ہے لیکن اس کے باوجود زندگی کے آخری سانس تک ہمارے جسم کے ساتھ وابستہ بھی ہو جا سکتا ہے۔ گوئٹے نے شباب کو آخری عمر تک نبھایا اور اسی لیے آخری ایام تک وہ محبت کر سکتا تھا۔ لیکن یہ بھی ہوتا ہے کہ شباب محبت کا مطالبہ ہو اور اس کو وقت پر پا نہ سکے جس کو عام طور پر جوانی کی محبت کہا جاتا ہے۔ وہ صرف اشتہاء ہے جو تشفی کی طالب ہوتی ہے اور بڑھاپے میں محبت بھی کبھی گذرے ہوئے جذبے کے وقتی ہیجان کو ظاہر کرتی ہے لیکن شباب اور الفت اپنی تصوری حقیقت میں زندگی کے ہر موسم میں ایک دوسرے سے وابستہ ہو کر نمودار ہو سکتے ہیں جب ہم سفید بالوں کے ساتھ محبت کرتے ہیں اور لڑکپن کی نا انصافیوں کے ساتھ دل کھو بیٹھتے ہیں تو پھر ہم بچپن اور بڑھاپے کے ترجمان نہیں ہوتے بلکہ اس شباب کے جو ہر عمر میں باقی رہتا ہے۔ یہ محبت بانجھ نہیں ہوتی۔ جنسی تخلیق اس کا منشا نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف سنائندگی کرتی ہے اس شباب کی جو سدا بہار ہے۔

الفت اور شباب کا ربط دائمی قیمت رکھتا ہے اور شکسپیر کے ڈرامے "رومیو اور جولیٹ" میں اس نے اپنا لافانی اظہار پایا ہے اس ڈرامے میں ہم محبت کو اس کی مہمہ جہتی حیثیت میں پاتے ہیں۔ رومیو کی پہلی محبت صرف بلوغ کا نشان ہے، اس کی دوسری محبت شباب کا محبت کو پیغام ہے۔ مرد اور عورت جو محبت کو صرف ایک "معاملہ"

سمجھتے ہیں وہ اس بھید کو جان نہیں سکتے وہ محبت کو صرف سماجی تہذیب کے معیار سے جانچنے اور پرانی رقابتوں اور خاندانی نزاعوں کے پس منظر میں دیکھتے ہیں۔ رومیو اور جولیٹ بھی اس صورت حال کا شکار ہوتے ہیں ان کے ماں باپ صرف ان کو اپنا سمجھتے ہیں لیکن محبت خود کو کسی دوسرے کا ہونے نہیں دیتی رومیو اور جولیٹ بھی ساری امیدیں کھو کر مذہب اور خدا میں اپنا سہارا ڈھونڈتے ہیں لیکن مذہب بحیثیت کلیسا اور روایت کے محبت کو ہمیشہ شبہ کی نگاہ سے دیکھتا رہا ہے۔ مذہب شادی کو مقدس رشتہ تصور کرلیتا ہے۔ ان بچوں کا جو اس رشتے سے دنیا میں نمودار ہوتے ہیں سواگت کرتا ہے۔ لیکن محبت آسمان سے نمودار ہوتی ہے۔ وہ گھریلو نہیں ہوتی اور گھر میں وہ پخت نہیں رہ سکتی۔

رومیو اور جولیٹ میں کلیسا بھی محبت کا ساتھ دیتا ہے کیونکہ یہاں محبت مذہب سے رشتہ جوڑنے میں کامیاب ہو جاتی ہے کلیسائی مذہب محبت کا صرف اس لیے مخالف بنا رہتا ہے کہ وہ ایک نظام کا پابند ہے اور محبت کا کسی نظام عمل و فکر سے واسطہ نہیں، سماج کی ساری کوشش یہ ہوتی ہے کہ مذہب اور محبت کو باہم ملنے نہ دے پھر بھی مذہب اور محبت جب کسی طرح ایک دوسرے سے وابستہ ہو لیتے ہیں اور اصل میں تو وہ ہیں ایک ہی تو دنیا کی کوئی قوت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی لیکن جب محبت کلیسائی مذہب کے حدود سے باہر کھڑی ہوتی ہے تو پھر وہ گناہ متصور ہوتی ہے۔ مذہب اور محبت کا تعلق بہر صورت بڑا الجھا ہے۔ جب محبت آدمی کو گناہگار بناتی ہے تو گناہ کے بل بوتے پر وہ مقام حاصل ہوتا ہے جہاں فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں۔ آدمی اب گناہ کے قابل ہوا ہے اس قابلیت کے اساس پر وہ ذمہ داری کا بوجھ اپنے سر لیتا ہے۔

رومیو اور جولیٹ کے حزنیے میں حزن اپنی تلخی کچھ اس لیے کھو دیتا ہے کہ مذہب کی محبت سے کوئی نزاع نہیں ہے۔ خاندانی سماجی اور انفرادی رقابتیں بربادی کا باعث بنتی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ شیکسپیر محبت کی اصل اور نقل دونوں سے خوب آگاہ ہے۔ جب محبت خالص ہوتی ہے تو وہ مطلوب کو ناقابل انتقال سمجھتی ہے لیکن جب وہ سچی نہیں ہوتی تو فریب بن کر ہم کو دھوکہ دیتی ہے رومیو کی پہلی محبت بلوغ کی حیاتیاتی منزل پر شباب کا ردعمل ہے وہ اس لیے جلد بطولی سپری ہو جاتی ہے اس محبت میں یقین اور تخصیص تو ہوتی نہیں اور اگر ہوتی بھی تو وقتی اور زمانے کے دست برد سے وہ آسانی سے مار کھا جاتی ہے زمانے کے اتفاقات اس کے رنگ کو پھیکا کر دیتے ہیں۔ لیکن جب اصل محبت بیدار ہوتی ہے تو زندگی کے تمام لمحات اس کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔

لالی میرے لال کی جت دیکھوں تت لال
لالی دیکھن میں گئی، میں بھی ہوگئی لال

وہ نام رکھتے ہوئے بھی نام کی نہیں ہوتی ہے شادی بیاہ کے تعلقات اور قانونی واجبات میں نام کی

بڑی اہمیت ہوتی ہے لیکن محبت کے لیے گُل، گُل ہی ہے خواہ تم اس کو کسی نام سے کیوں نہ پکارو جب آدمی اس محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے تو پچھلی آزادی پر افسوس کرتا ہے۔

نالۂ از بہر رہائی نہ کند مرغ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود

وہ غیر مرئی علائق میں جکڑا جاتا ہے اپنے مرکز سے کبھی تھوڑا سا گریز بھی کرپاتا ہے تو پھر واپس بلا لیا جاتا ہے اس لیے شیکسپیر محبت میں فرق کرتا ہے ایک محبت وہ ہے جو نظروں میں کھیلتی ہے اور ایک وہ محبت ہے جو دل میں بستی ہے۔ نظروں کی محبت بلوغ کی نشانی ہے اور بلوغ کے ساتھ ساتھ وہ بہت جلد خواب و خیال ہو جاتی ہے۔ اسی لیے جب رومیو کے دوست نیک بخت راہب کو یہ پتہ چلتا ہے کہ رومیو نے اپنی محبت کا مقصود ایک دم بدل دیا ہے تو اس کو بڑا اچنبھا ہوتا ہے رومیو معذرت کرتا ہے پہلی محبت کا اس کو کوئی جواب نہیں ملا لیکن اب اس کی جولیٹ کے ساتھ محبت جوابی ہے پیار کے مقابل پیار ہے اور پریم کا بدل پریم ہے۔ لیکن کیا محبت کے لیے جواب ضروری ہے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ محبت تو پہلے ایک کیفیت کی شکل میں نمودار ہو جاتی ہے اور مقصود بعد میں سامنے آتا ہے۔ ایسی صورت میں وہ ایک پیش بینی اور الہام کی حالت رکھتی ہے۔ ہاں یہ بھی ہوتا ہے کہ نسبت کبھی علیحدگی جھیل جاتی ہے اور جب وہ اپنی غلطی سے آگاہ ہوتی ہے تو اس کا خمیازہ پشیمانی ہوتا ہے رومیو کی محبت بھی ٹھوکر کھاتے ہوئے اپنی مقصود کی طرف رجوع ہوتی ہے وہ پرانے نظام کو درہم برہم کر دیتی ہے لیکن اس کی جگہ کوئی نیا نظام قائم نہیں کر سکتی۔

کارل ہاس پیس کے نزدیک عیسائیت کے لیے نہ کوئی حزنیہ ہے اور نہ حزن کا علم۔ فضل الٰہی نجات کا باعث بنتا ہے اور ابتدا حزنیہ سے ہوتی ہی ہے تو اختتام اس کا حزنیہ پر نہیں ہو سکتا اس لیے ایک عیسائی کے لیے بحیثیت عیسائی کے شیکسپیر کا سمجھنا مشکل ہے۔ شیکسپیر کے ہاں نجات نہیں ہے حزنیہ حیات عبور ہوتے نہیں پاتا۔ حزن کا علم ہے جو رومیو اور جولیٹ میں بھی کارفرما ہے جب مقدس کلیسا کی بدولت دو ایک بن جاتے ہیں تو بھی دونوں کے پاس سادہ مائی تھیکنے نہیں پاتی۔ ان کی شادی کا نتیجہ مسرت نہیں بلکہ موت ہے اس ڈرامہ میں محبت نام ہے موت کے شعور کا۔ خوشی اور غم ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں۔ چھوٹی سی مسرت بھی بڑی قیمت رکھتی ہے اٹھتی ہوئی نگاہیں بھی رومیو وہ خوشی پاتا ہے جس کی قیمت ساری دنیا کے غم کے مقابل بھی اونچی ہے غالب کی طرح وہ یہ نہیں کہتا۔ ع

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا

لیکن موت اس محبت کا تعاقب کرتی ہے اس کا احساس پیش بینی بن کر محبت کو ستاتا ہے ایسا معلوم ہوتا

ہے کہ محبت اب ساتھ بن کر ہی رہے گی۔ رومیو کی محبت مشرقی دیوانگی ہے اور اس کے تصورات اور تمثالات بھی بالکل مشرقی نژاد معلوم ہوتے ہیں جولیٹ خیال کرتی ہے کہ اگر اس کے درست کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں تو ہر ایک ٹکڑا چھوٹا ستارہ بن جائے گا۔ اور زمین اتنی دلکش ہو جائے گی کہ ہر ایک کو رات محبوب ہو جائے گی اور ہر نیم روز کا قدرداں کوئی باقی نہ رہے گا۔ اور شائد ع

بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے

ساتھ ہی رومیو کو یقین ہے کہ شہر کی مکھیوں میں اب وہ عظمت ہے جو سارے روم میں نہیں کیونکہ وہ اس کے محبوب سے لافانی برکتیں چراتی ہیں جیسا کہ باس پر نے لکھا ہے کہ صرف محبت قابل قدر نہیں ہوتی بلکہ آس پاس کی ہر چیز کو وہ نئی قدر و قیمت سے منور اور بامعنی کر دیتی ہے وہ انقلابی ہوتی ہے اور عورت مرد کے قلب ماہیت بنتی ہے رومیو میں لسانی رقت قلب نمودار ہوتی ہے وہ مرد ہوتے ہوئے بھی پھوٹ پھوٹ کر روتا ہے اور جولیٹ جو کبھی خوف و ہراس کا شکار تھی اب زندگی کے بڑے سے بڑے خطرے کے مقابل مردانہ وار نبرد آزما ہو جاتی ہے عاشقی صبر طلب ہے لیکن رومیو کی تمنا بے تاب ہے۔ حکمت کی نصیحتیں اب کارگر نہیں ہوتیں اور فلسفہ بھی جو آلام کے لیے "شیر شیریں" ہے لاحاصل نظر آتا ہے کیونکہ وہ دل کی مرادوں کے مطابق دنیا کو ڈھال نہیں سکتا۔ کبھی رومیو اور جولیٹ کے لیے جدائی بھی ایک لذت رکھتی تھی اور وہ فراق کی لذتوں سے بھی خوب آشنا تھے لیکن اب جدائی میٹھا درد نہیں معلوم ہوتی بلکہ آنے والے اندیشوں اور وسوسوں کی حامل ہوتی ہے، محبت میں زمانی شعور کی بھی کایا پلٹ ہو جاتی ہے یہ سچ ہے کہ شعور زمان کی تبدیلی صرف محبت کے ساتھ مخصوص نہیں لیکن محبت کی بے تابی نرالی صورت حال پیدا کرتی ہے اور ہر لحظہ دونوں کا حامل معلوم ہوتا ہے اور محبوب کے ملنے کا وقفہ صدیوں کو اپنے اندر سمو لیتا ہے، ساتھ ہی محبت بہت آسانی سے یاس و حرمان کا شکار ہو جاتی ہے مقدر اس کے خلاف سازش میں لگا معلوم ہوتا ہے، جولیٹ امید، مداوا اور دستگیری سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔ جب امید ہی نہ رہے تو پھر رہا کیا یہ ڈرامہ شباب کا حزنیہ ہے صرف موت کا مرہون نہیں ہوتا۔ موت تو خود فطری چیز ہے۔ موت کا ناگزیر ہونا کوئی سانحہ نہیں، کبھی تو وہ ڈوبتے ہوئے دلوں کا آخری سہارا ہے اور جب ایک دوسری زندگی کا عقیدہ بھی ساتھ ہو تو پھر موت پیام حیات ہے اور ناکام محبت کا سہانا خواب ہے۔ یہ دائمی رخصت نہیں بلکہ "پھر ملیں گے" کا سلام ہے۔ یہ حزنیہ نہیں ہے کہ ہم مرتے ہیں بلکہ خاک اس زندگی پر کہ ہم ملنے نہیں پاتے ؎

شمع و گل و پروانہ و بلبل ہمہ جمع اند
اے دوست بیا رحم بہ تنہائی ما کن

انگریز شاعر سارے وجود میں باہمی وصال کی ہمہ گیر تمنا کو متحرک پاتا ہے۔ اس لیے انسانی محبت بھی صرف

اس وقت حزنیہ کا باعث ہوسکتی ہے جب وہ عاشق و معشوق کو ایک دوسرے سے جدا کر دے اور جونہی وہ ایک دوسرے کے پیچھے اس دنیا کو خیرباد کہتے ہیں تو پھر حزن باقی نہیں رہ سکتا۔ حزن صرف وقفہ میں ہے خاتمہ میں نہیں۔ حزنیہ پس اس کے لیے ہے جو محبت کی دنیا سے باہر کھڑا اس کا تماشا دیکھ رہا ہو۔ وہ غمزدہ دیکھتا ہے کہ محبت پھلنے پھولنے نہ پائی اور نخل آرزو کی جڑ وقت سے پہلے کٹ گئی۔ ہاں حزنیہ اس وقت ہے جب رومیو جولیٹ کی موت کی خبر سنتا ہے اور خود کو پوری صحت اور توانائی کے عالم میں پاتا ہے اور حزنیہ اس وقت ہے جب جولیٹ ہوش میں آتی ہے اور رومیو کو مردہ پاتی ہے لیکن جب دونوں مر جاتے ہیں تو حزن بھی ختم ہو جاتا ہے ان محبوبوں کا مرنا تو مستقبل کے لیے خوش آئند ثابت ہوتا ہے۔ ان کی موت سے برسوں کی غلط فہمیاں دور ہوتی ہیں اور خاندانی نزاع ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی ہے۔ ان کی موت شہیدوں کی موت ہے جن کا خون رنگ لاتا اور جن کی خاک پر سدا بہار پھول کھلتے ہیں ان کی موت اپنے بزرگوں کے گناہوں کا کفارہ ہے۔

ماں باپ کا اپنے بچوں کی محبت کے مقابل طرز عمل ان کے انجام کے بعد ان کی بے بسی عام سماجی صورت حال کی پابند ہے۔ ماں باپ روایات کے حامل ہوتے ہیں اور ان کا وظیفہ حیات کے تسلسل کا تحفظ ہے۔ اب محبت یکایک نمودار ہوتی ہے اور روایات کا پاس کرتی ہے وہ اولاد کی فکر سے آزاد ہے اس لیے محبت سماج اور زندگی کے لیے ایک تضاد معلوم ہوتی ہے اس کی منطق نرالی ہے اس لیے بقول پاسکال دل کی عقل کو عقل سمجھ نہیں سکتی۔ ماں باپ محبت کے اس لیے مخالف ہوتے ہیں کہ وہ ان قوتوں کو نظر انداز کرتی ہے جن کی اساس پر وہ ماں باپ بنے ہیں لیکن جب ماں باپ کو کامیابی ہوتی ہے اور محبت پامال ہوتی ہے تو ان کو اپنی غلطی کا پتہ چلتا ہے اور زود پشیمانی لاحاصل ثابت ہوتی ہے جب جولیٹ کی ماں اپنی اکلوتی بیٹی کو دنیا سے رخصت ہوتا ہوا پاتی ہے تو اس کی زندگی لایعنی نظر آتی ہے اور جولیٹ کا باپ اپنے حسین پھول کو بے وقت مرجھاتا ہوا دیکھ کر آنسو بہاتا ہے اس پر اب یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ زندگی فانی ہے۔ ماں باپ اور دایہ سب زمانہ کے دست برد کا رونا روتے ہیں اور ان کو وہ حال جس میں وہ اب ہیں اور وہ دن جوان پر روشن ہوا ہے سب تاریک اور اداس نظر آتے ہیں ان کی زندگی پر ہمیشہ اندھیرا چھا جاتا ہے یہاں بھی صرف موت ان کے لیے حزنیہ کا باعث نہیں بنتی بلکہ اس کی قبل از وقت آمد۔

کون جی سے نہ جائے گا اے میر
حیف یہ ہے کہ تو جوان گیا

موت چپکے سے آتی ہے اور ان کی اکلوتی بچی کو اچک لے جاتی ہے۔ جانے بغیر انھوں نے موت سے ساز باز کر لیا ہے، یہ حزن اس لیے بھی بڑھ جاتا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محبت کو اس کا مقصود ملنے ہی

کو تھا کہ ہاتھ سے نکل گیا لیکن محبت اصل میں ناممکن کو اپنا مقصود بناتی ہے۔ جرمن فلسفی نکولائے ہارٹ مان نے اچھی طرح اس کو واضح کیا ہے، دنیا میں صرف ایک متعلقہ عنصر کے نہ ہونے سے مقصود کا حصول اتنا ہی ناممکن ہو جاتا ہے جتنا کہ دوسرے تمام عناصر کے غیاب سے محبت ناممکن کو مقصود بنا لیتی ہے اور طرفہ تماشہ یہ کہ وہ آخر تک ناممکن کو ممکن ہی سمجھنے پر مصر رہتی ہے جب حزنیہ ابدی نجات کی طرف نشان دہی کرے تو پھر وہ سماوی طرب و نشاط کا ضامن ہو جاتا ہے۔ موت حیات کا پیام لے کر آتی ہے اور آدمی ایک تنگنائے سے گذر کر ساحل مراد تک پہنچتا ہے۔ اب تو درازی عمر درازی کلفت بن کر ستاتی ہے اور طمانیت کو پامال کرتی ہے۔ رومیو کے بزرگ دوست اور ہمدرد عیسائی راہب کے لیے موت ترقی ہے اور دائمی حیات میں ہر خسارہ کی تلافی اور ہر قیمت کا تحفظ پایا جاتا ہے اگر فلسفیانہ فکر محرومی دل کے لیے پیام نو نہیں تو بلاشبہ مذہب تو آدمی کی آخری آس بن کر زندگی کی تلخ کامیوں کو بھی معنی بخشتا ہے اور موت خود فانی محسوس ہوتی ہے۔ رومیو کا مذہبی دوست موت کو خاتمہ نہیں جانتا بلکہ وہ ایک درخشاں مستقبل کا وعدہ لے کر مسکراتی آتی ہے لیکن آدمی تو آدمی ہے اس کا دل سنگ و خشت نہیں درد سے بھر آتا ہے اور حال کی تلخی کے مقابل ٹوٹ جاتا ہے موت اور محبت کی کشمکش میں شکسپیر اور ائی احساسات سے نامانوس نظر نہیں آتا۔ رومیو کو اپنی موت سے کچھ پہلے بڑی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ اس کو معلوم نہیں کہ اس کی قسمت کا کیا لکھا ہے۔ اپنی موت سے ایک روز پہلے شاداں و فرحان حالت میں خود کو پاتا ہے اور عجیب عجیب خواب اس کو پڑتے ہیں۔ اس کو پہلی بار یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس محبت کی دولت کا کیا ٹھکانا جس کی صرف پرچھائیں مسرت سے یوں مالا مال ہے موت جب ناگہانی ہوتی ہے تو اپنی آمد کو دو متضاد طریقوں سے ظاہر کرتی ہے کبھی تو آدمی کو طرح طرح کے بھیانک خیالات آتے ہیں اور ایک ناقابل فہم فکر ستاتی ہے یا پھر یہ ہوتا ہے کہ آدمی واقعہ سے پہلے ایک غیر معمولی خوشی سے پھولے نہیں سماتا، اس کو خود معلوم نہیں ہوتا کہ آخر وہ خوش کیوں ہے۔ شاید کہ اب زندگی کے آلام ختم ہو رہے ہیں۔ اصل میں موت کوئی طبعی لزوم کو ظاہر نہیں کرتی بلکہ اس مابعد الطبیعاتی صورت حال کو بتاتی ہے جس میں آدمی گرفتار ہے اور جس سے کوئی مفر نہیں۔ آدمی آنے والی نسلوں کے سلسلے میں بقا چاہتا ہے اور اس کے ذریعے سے موت کو دغا دینا چاہتا ہے لیکن زماں کا سیلاب اس کے شعور کو ہمیشہ ہمیشہ موت کی طرف رجوع کراتا ہے موت کے مقابل آدمی کو کسی طرح سے کھڑا رہنا پڑتا ہے لیکن ان میں دو صورتیں خاص طور پر قابل لحاظ ہیں۔ اگر موت خود اپنی ہو تو اس کے لیے قیامت ہے اس کی حد تک دنیا کا خاتمہ ہو چکا۔ ہستی کا اب نیستی کے مقابل کوئی سوال باقی نہ رہا۔ موت اگر اپنے محبوب کی ہے تو دنیا تو رہی بے رنگ اور بے کیف سارے اقدار کے شعور کا خاتمہ ہو گیا زندگی معنی اور قیمت سے مرا ہو گئی، جب رومیو کو جولیٹ کے مرنے کی خبر ملتی ہے تو زندگی میں اس کو کوئی ٹھکاؤ نظر نہیں آتا اس کے پیچھے وہ خود سدھارنا چاہتا ہے جب جولیٹ کے چہرے کو دیکھتا ہے تو وہ اس کو مردہ محسوس نہیں کرتا۔ وہی تازگی ہے اور وہی نہ ختم ہونے والی مسکراہٹ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا حسن موت پر غالب آگیا ہے اس کی سیدھی سادی وجہ تو یہ تھی کہ

جولیٹ ابھی مری نہ تھی۔ لیکن اصل میں اس کی وجہ رومیو کی محبت تھی اور محبت کے لیے موت کسی صورت میں خاتمہ نہیں بن سکتی رومیو اور جولیٹ کے حزنیہ میں اب ایک نیا عنصر داخل ہوتا ہے جس کی وجہ سے حزنِ حیات کی تلخی بدرجہا تیز ہو جاتی ہے رومیو کا رقیب پیارس نامی ایک نیک اور شریف النفس انسان ہے وہ رات کے اندھیرے میں چپکے چپکے قبرستان جاتا ہے تاکہ جولیٹ کی قبر پر گلفشانی کرے اور اپنے آنسوؤں اور آہوں کا تحفہ پیش کرے۔ وہ رومیو کے ہاتھوں مارا جاتا ہے اور اس خواہش کے ساتھ دم توڑتا ہے کہ اس کا آخری ٹھکانہ اپنے محبوب کے ساتھ ہو لیکن پیارس کو خبر نہیں کہ اس کے محبوب کا محبوب اس کا قاتل ہے اس کی محبت کی دنیا کے پاس کوئی قدر نہیں اور نہ اس کی موت پر کوئی رونے والا ہے۔ رومیو کی قسمت سے ہم اتنا متاثر رہتے ہیں کہ پیارس کے لیے ہمارے پاس کوئی آنسو نہیں رہتا۔ رومیو جو ناحق ایک بے گناہ کے خونِ ناحق سے اپنے ہاتھ رنگ لیتا ہے لیکن نہ رومیو کے پاس اور نہ ہمارے پاس پشیمانی کے لیے کوئی فرصت ہے۔ رومیو اور جولیٹ کا حزنیہ حالات کے ایسے اجتماع کو پیش کرتا ہے جن سے کائنات کی ہم آہنگی کے عقیدہ کا بطلان نظر آتا ہے اور رجائیت اپنا جواز کھو دیتی ہے لیکن اگر دنیا میں ہم آہنگی سرے سے مفقود ہو جائے تو دنیا ایسا ظلمت کدہ بن جائے جس میں شمع بھی "دلیلِ سحر" نہ ہو

اور جب رات اتنی تاریک ہو جائے تو حزنیہ کے لیے بھی کوئی مقام باقی نہیں رہتا۔ . . . . . .

. . . . . مگر حزنیہ ایک آرٹ کے شاہکار کی حیثیت سے کبھی بھی امید کی کرن سے خالی نہیں ہو سکتا۔ اس ڈرامے میں بھی پھول مرجھاتے ہیں لیکن ان کی خوشبو باقی رہتی ہے۔ خاندانی نزاع جو اس حزنیہ کا باعث ہے ختم ہو جاتی ہے۔ دلوں کا میل باقی نہیں رہتا اور دل کدورت سے پاک ہو جاتے ہیں۔ پیار اس دنیا سے ختم ہو کر نئے پیار کا بیج بوتا ہے اس حزنیہ کے دردناک افراد کی زرد پیشانی بھی رنگ لاتی ہے اور ان کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ اب ہم پھر سورج کی روشنی میں داخل ہوتے ہیں لیکن قدرے تکلف کے ساتھ۔ اس پرس کے نزدیک عیسائی روح سے شیکسپیر کے ڈرامے ناآشنا ہیں لیکن بالکل بے گانہ تو وہ نہیں ہیں۔ اس ڈرامہ میں خاص طور پر یہ احساس بھی ہے کہ ہم سے بڑی کوئی قدرت ہمارے ارادوں اور عزائم کو فسخ کرتی ہے خاندانی نزاع منشیت کے فضیلوں کے لیے میدان تیار کرتی ہے اور معصوم تمناؤں کا خون ہوتا ہے لیکن ماورائی قوتِ انسانی ارادوں کے مقابل صرف منفی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ اس قدرت کے بل پر موت بھی آدمی کے لیے حیات نو کی تمہید بن جاتی ہے اور اس کے سہارے شباب اور محبت کا تعلق غیر منقطع ہو کر جریدہ عالم پر محبت کا دوام ثبت کر جاتا ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

فضل الرحمٰن

گمنام شہید

(۱۸۵۷ء کی یاد میں)

سلام ان سب شہیدوں کو جن کے خون سے یہ چمن بنا ہے
ہزاروں گمنام مرنے والے نشان تک جن کا مٹ چکا ہے
سلام ان سب مجاہدوں کو وطن پہ قربان ہو گئے جو
نثار پروانہ وار اک شمع پر بہ صد جان ہو گئے جو
سلام اسیروں پہ مسکراتے ہوئے جو قید محن سے گذرے
وہ سرفروش اپنے سر اٹھائے ہوئے جو دار و رسن سے گذرے
بلاکشانِ وفا جو ہر سمت اس حسیں خاک سے اٹھے تھے
جو ہند کی سرزمیں کے ہر ایک گوشۂ پاک سے اٹھے تھے
دیارِ بنگال کے جیالے نواحِ پنجاب کے دلاور
جنوبی خطّے کے مرد میداں، شمالی دوآبہ کے بہادر
کسان و مزدور و اہلِ حرفہ، ادیب و دانشور و سپہ گر
ہنود و مسلم، امیر و محتاج، صاحبِ علم و مالک زر

بلاد و دیہات سے نکل کر جو کوہ و دشت و دمن میں پھیلے
شمیم ہنگام صبح جیسے فضائے صحن چمن میں پھیلے
سوادِ منزل نظر سے اوجھل پہ رگذر پر وہ گامزن تھے
جوان و پیر ایسے منچلے وہ کہ وہ سر پھرے ایسے مردِ زن تھے
دبے تھے بیڑی کے نیچے سینے مگر اسیری نے کا حوصلہ تھا
سروں میں سودائے زندگانی دلوں میں مرنے کا حوصلہ تھا
وہ قافلے غیند سے جو یکدم جرس کی آواز سن کے اٹھے
وہ نو گرفتار بیک بیک جو رہائی کا ساز سن کے اٹھے
بغیر تنظیم کے وہ لشکر۔ بغیر ہتیار کے سپاہی
ہجوم بے میر کارواں وہ ۔ روانہ بے رہنما وہ راہی
چمن کے دلدادہ زور و دحشت سے دشت میں جو بھٹک گئے تھے
شراب آزادی پی کے حد سے سوا جو میکش بہک گئے تھے
رہا نہ دو چار دن سے بڑھ کر زمین پر اقتدار جن کا
بدل گیا جبر میں دو بارہ وہ عارضی اختیار جن کا
حیات و حرکت کا چشمۂ تازہ جن کے حق میں سراب نکلا
سمجھ رہے تھے جسے حقیقت وہی حقیقت میں خواب نکلا
وہ خواب اہل جنوں کا جس کی سب آج تعبیر دیکھتے ہیں
عمل میں جن کی شکست کے ہم شکست زنجیر دیکھتے ہیں

شاذ تمکنت

دوسری محبّت

یہ اکثر تم سے مل کر سوچتا ہوں کیا ہوا مجھ کو
دماغِ عشق باقی ہے نہ اب ذوقِ وفا مجھ کو
وہی میں ہوں وہی گھر ہے وہی سنسان آنگن ہے
دریچوں پر وہی پھولوں کا آسودہ نشیمن ہے
وہی بیلوں کی جدول کے تلے ٹھنڈک کی بستی ہے
درختوں پر وہی معصوم خاموشی برستی ہے
وہی کمرے کی دیواروں کی لب بستہ رفاقت ہے
کتابوں اور تصویروں کا سامانِ جراحت ہے
دھری جاتی ہیں طاقوں پر ابھی تک وہ جلی شمعیں
مگر دم اب بھی سنتا ہوں پگھلتی موم کی چیخیں
ابھی پچھلے پہر آتی ہیں آوازیں سرابوں کی
ہتھیلی سے کوئی ملتا ہے آنکھیں میرے خوابوں کی

تم آئے سر بہ زانو ہو چلی ہے میری تنہائی
سر آنکھوں پر تمھارا التفاتِ چارہ فرمائی
نگاہوں میں تمھاری گو کل و پرسوں کی باتیں ہیں
کھلی مہکی ہوئی زلفوں میں بندر آبن کی راتیں ہیں
دہکتے عارضوں پر پو پھٹے کا عکس لرزاں ہے
شگرفی بازوؤں میں جیسے آتش زاریوناں ہے
زسر تا پا نکلتی ہیں سحل بانکی شعاعیں سی
کہ جیسے ہشت پہلو پارۂ نیلم کی ضوتابی
ہر اک خطِ بدن میں بجلیاں سی ڈوب جاتی ہیں
خم محراب لب میں پیاسی آنکھیں سنسناتی ہیں
وہی لہجے کا دکھنا جیسے خوں تھم تھم کے رستا ہو
وہی آنکھیں کہ جن پر التجا کا صاف دھوکہ ہو

کف دست بلوریں پر حنا کی رنگ سامانی
جواہر کی دُکاں میں جس طرح ہیروں کی ہمانی
مبارک ہو گھنی زلفوں کو گلبانگِ اماں ہونا
زمانے کی کڑی دھوپوں میں مثلِ سائباں ہونا

مگر میں سوچ میں گم ہوں یہ ایں الطافِ برنائی
مرے احساس پر اوّدی گھٹا سی کیوں نہیں چھائی
نگاہوں کو رہا ہے مدتوں ذوقِ چمن بینی
رچی تھی دل میں ہلکے رنگ کی کلیوں کی شیرینی
سہانی چاندنی پگڈنڈیوں پر اب بھی کھلتی ہے
عذارِ کنجِ پُرسنبل کی لٹ مستانہ ہلتی ہے
نہیں ہوتا مگر اب آگ پینے کا گماں خود پر
وہ عالم ہے کہ ڈرتا ہوں نہ ہو جائے عیاں خود پر

کہاں وہ دن مزاجِ غم کو زہر درد راس آئے
سر دامن لرز کر آنسوؤں کی التماس آئے
وہ بیگانہ وشی وہ بے نیازی بزمِ دُنیا سے
کہ جیسے تھی مجھے اک نسبتِ دیرینہ صحرا سے
سحر کے ساتھ اب دل میں کھٹک سی کیوں نہیں ہوتی
سرِ بالش نہ تر ہوتا مگر تم آستیں ہوتی
نہیں پہلی کرن کی سینۂ پُرخوں پہ وہ چبھن میں
کہ جیسے نوکِ سوزن ٹوٹ کر رہ جائے ناخن میں
غضب ہے خاک در پر گر نہ ہو اکسیر کا دھوکہ
پسِ عجز دعا تم پر نہیں تاثیر کا دھوکہ
زمانہ ہو گیا ہے خال و خط کو اپنی یاد آئے
نہیں ممکن کہ اب آئینہ میرا عکس لوٹائے
سراپا جرم ہوں آسودۂ لطف و کرم ہو کر
میں شائد رہ گیا پہلی محبت کی قسم ہو کر

عزیز قیسی

رات کو رو رو صبح کیا

یہ شب گزری تو کیا وہ نزع کا عالم تو باقی ہے
نفس اک شمع بے بس ہے کہ بجھتی ہے نہ جلتی ہے
یہ دُنیا بھی ہماری طرح، وہ مجبور ہے شاید
کہ بس چلنے کی پابندی ہے اور مر مر کے چلتی ہے

شمیم گل شکستِ غنچہ کی جھنکار ہے شاید
یہ نغمہ پھوٹتا ہے ساز دل کے ٹوٹ جانے پر

جنوں مجبوری دست وفا کا آفریدہ ہے
گریباں چاک ہو جاتے ہیں دامن چھوٹ جانے پر

مقدر چشم و دل کا اتنی آسانی سے کیوں بدلے
اندھیرا جب اجالے میں لہو رو کر بدلتا ہے
وہ عالم صبح کے تارے کے گل ہونے کا ہے شاید
لہو کا آخری قطرہ جو چشم تر سے ڈھلتا ہے
خیال آتے ہیں کیا کیا دل میں جب سورج نکلتا ہے

بہت روتے رہے سوتے میں بیداری میں لیکن اب
سکوتِ مرگ تنہائی سے جی اٹھنے کا وقت آیا
گلی کوچوں میں نکلو، جشن کا عالم بپا ہوگا
اٹھو اذنِ مسیحائی سے جی اٹھنے کا وقت آیا
چلو شاید کہ ان مانوس و ویراں رہگزاروں میں
کہیں تم منتظر ہو جس کے وہ آوازِ پا آئے
قبا کے عطر سے ممکن ہے ہر لمحہ مہک جائے
خبر کیا ہے کہیں سے اس کے دامن کی ہوا آئے
کسی سنسان رستے میں کسی آباد بستی میں
دبے پاؤں وہ آئے اور تمہاری سرد آنکھوں پر
کسے معلوم چپکے سے دہکتی انگلیاں رکھ دے
اٹھو شاید یہ دن ہے سفر کا آخری دن ہے
اٹھو جلدی کرو، دو مرحلے بس اور چلنا ہے
چلو اب تک تو دن کا قافلہ آہستہ چلتا ہے
خیال آتے ہیں کیا کیا دل میں جب سورج نکلتا ہے

س۔ ا۔ عشرت

ایک ارمان، اک امید دید!

آج پھر درد غم کی تنہائی
دور تک تم کو ڈھونڈھ آئی ہے
دل بصد یاس مضمحل، ویراں
کب سے محروم لب کشائی ہے
کتنی راتوں کو تم سے شکوہ ہے
کتنی صبحوں پہ نیند چھائی ہے

تم کہیں مجھ سے دور ہو لیکن
آج فصل بہار آئی ہے
پھول کھلنے لگے ہیں شاخوں پر
زیست مستانہ وار آئی ہے
پچھلی شب چپکے چپکے بادِ سحر
روئے شبنم نکھار آئی ہے
اور ایسے میں پھر تمہاری یاد
کتنی بے اختیار آئی ہے
لیکن اے دوست میری تنہائی
آج رہ رہ کے مجھ کو ڈستی ہے

سوچتا ہوں جو تم یہاں آؤ
یہ مرے روز و شب بدل جائیں
میرے بے کیف زیست کے لمحات
قالبِ سرخوشی میں ڈھل جائیں

ایک ارمان، اک امید دید
جس کو اتنے طویل عرصے میں
وقت کے سرد سرد ہاتھوں سے
میں نے اب تک بچا کے رکھا ہے
یوں تو دل کو یقین ہے اس کا
تم کبھی اس طرف نہ آؤ گی
پھر بھی اس بے بسی کے عالم میں
ایک موہوم سی امید لیے
جبر یہ اختیار کر لوں گا
اور کچھ انتظار کر لوں گا

رضی اختر شوق

وحشتِ نیم شب

آج مہتاب کس دھند میں کھو گیا
رات کی مانگ بے کہکشاں ہو گئی
وسعتِ بام پر تلملاتی کرن
سایۂ گیسوئے دلبراں ہو گئی
ہر شبستاں میں سائے ابھرنے لگے
دل میں بے نام تیشے اُترنے لگے
وقت کا کارواں گوش بر ساز ہے
صرف دل کے دھڑکنے کی آواز ہے
دل سے کہتی ہے یہ عقل کی روشنی
کتنی قاتل ہے یہ ہجر کی رات بھی
میرے اور میرے خورشید کے درمیاں
جس نے پیدا کیے وقت کے فاصلے

جس کے صحراؤں میں زرد رو نیم جاں
بھٹکتے رہتے ہیں عشاق کے قافلے
اشک دیتے ہیں زندہ دلی کی سزا
زخم دیتے ہیں حسن و وفا کے صلے
کون جانے کہ ہو کونسی شام کو
اس کے جلووں سے گلنار میری نظر
کونسی صبح سونا بکھیرے گی جب
اس کی خوشبو کا ہو گا یہاں سے گذر
اس کے قدموں کی لو سے بکھر جائے گی
ایک چاندی کی رو رہگذر رہگذر
دل کی ٹھٹھک نظر کے سکوں کے لیے
اور کرنا ہے اشکوں کو کتنا سفر

کون جانے کہ اس شامِ غم میں ابھی
اور کتنے ہیں شبِ خون کے مرحلے
کوئی تدبیر اے دلِ کہ پہلو سے اب
کوچ کرتے نہیں درد کے قافلے
اے شکن در شکن رات مژدہ کوئی
صبح کے آبشاروں سے جو جا ملے
اے صبا ایک ایسا بھی جھونکا ہو جو
اس کے رخسار کا لمس پا کر چلے
دل سے کہتی ہے یہ عقل کی روشنی
کتنا سفاک ہے وقت کا کاروان
زندگانی ہے اک مشعلِ سوختہ
جس کے سینے سے اٹھتا ہے پیہم دھواں
لوگ کہتے ہیں دل کے لہو کو شفق
غم کی روداد کا نام ہے داستاں

آسمانوں سے ٹوٹیں تو تارے کہیں
میری پلکوں سے ٹوٹیں تو سب رائیگاں
جس کی صورت سے روشن ہے قندیلِ دل
اس کی چاہت کا انعام ہیں سولیاں
جس کے لب پر صداقت کے شہ تاب ہوں
اس پہ اب بھی سیہ رات کا قہر ہے
اب بھی مقتل میں بسمل ہے روحِ مسیح
اب بھی ہر بادہ و جام میں زہر ہے
اب بھی قاتل حقائق کے پتھراؤ سے
ٹوٹ جاتا ہے بلور کا ہر صنم
دل پہ آتی ہے یلغار کرتی ہوئی
آنسوؤں کی رفاقت میں ہر شامِ غم
نیند کے پیرہن ہیں دریدہ ابھی
کتنے خورشید ہیں شب گزیدہ ابھی

داخل

ٹوٹا طلسم نیم شبی

کیوں کر حقیقتوں سے نگاہیں چرائیں ہم
اس بزم آب و گل سے کہاں بھاگ جائیں ہم
ہر شے کو آہ عرضی باد گرد کی
ہم شائقین درد کو حسرت ہی رہ گئی
کس آرزو سے جی کو مسلسل جلائیں ہم

وہ اک ضمیر (جس پہ صداقت کو ناز ہے)
کہتا ہے قصر زیست کے محرم رہے ہیں ہم
یعنی شریک گریہ و ماتم رہے ہیں ہم
ہنستے ہیں پھول چار دنوں کی بہار پر
جاوید بن سکی نہ نگاہوں کی زندگی
بے روغن و زبال رہی شمع زیست کی
لوٹے ہیں نامراد پھر اپنے مزار پر!!
(رفتار روز شب ہے کہ بیمار کا خرام)
شاید یہیں کہیں پہ دل زندہ دفن ہو
کچھ ذکر خیر کوچۂ خوباں کا بھی کرو
پروردگار قلب و نظر ہے سنبھالا سانام!!!
سنتے ہیں ڈھل چکی لب و رخسار کی شفق
پہلی سی اب نہیں شب گیسو کی تیرگی
ابر سیاہ کھل بھی گئے چاندنی ہوئی
کیا اہل دل کو اب نہیں دیوانگی کا حق؟

کب مٹ سکا ہے آتش و روغن کا اختلاط
طوفان ہو کہ سرکشیٔ خاک و باد ہو
ہر چند ان کو عہد محبت نہ یاد ہو
ہم نے ہوس کے ذکر سے برتی ہے احتیاط!
ہر گام پر تو عقل نے کی دل سے قیل و قال
پھر بھی رواں تھی ان کے تعقب میں زندگی
دشت فلک میں ایک ستارے کی رہبری
گہوارۂ نگاہ میں نازک سا اک خیال!
تسکین سنگ و خشت کو سہہ ہے وہی مگر
شائستہ ہو رہا ہے وہ وحشت نواز غم
کس آرزو سے جی کو مسلسل جلائیں ہم
چشم فسوں طراز کے انداز بے اثر

آہنگ شب گداختہ اخوند ہوش ہے
ٹوٹا طلسم نیم شبی رو پ ڈھل گیا!
لگتا ہے آج منظر دل کچھ بجھا بجھا
اٹھو! کہ کار و بار جنوں بے خروش ہے!!
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے"

سکندر محسن

رقص ناتمام

نیم شب کی طلسم ساز فضا
رات خاموش ہے، زمیں خاموش
پورے مہتاب کا حسیں پیکر
کسی دوشیزہ کے بدن کی طرح
نرم شفاف، صاف روشن ہے
چاندنی کی تھکی تھکی پلکیں
نگراں ہیں زمین کی جانب
جیسے کوئی حیا صفت محبوب
مست آنکھوں کی شوخ چلمن سے
اپنے مشتاق کی طرف دیکھے

چاندنی رات کا سہانا پن
سلسلہ ہائے کوہ سے ہو کر
ایک وادی میں نور افشاں ہے
سبز و شاداب ہے زمیں ساری

چاندنی کر رہی ہے زرکاری
ایک الھڑ حسین دوشیزہ
خانہ بر دوش، میکدہ آغوش
لے کے پلکوں پہ پیار کے دیپک
دشت کی انجمن میں آئی ہے
لالہ و نسترن میں آئی ہے
جسم فانوس کی دھڑکتی لو
سینۂ شب کا تیر، صبح کی ضو
مسکراتی بہار کا نغمہ
لے کے ہونٹوں پہ پیار کا نغمہ
رقص میں آگیا حسیں پر تو
گنگنائیں ہوائیں رندانہ
جھوم اٹھی فضا بھی مستانہ

چند لمحے بصد نشاط حیات
ناچتے آئے، ناچتے گذرے
رقص جاری تھی وجد میں تھی فضا

ناگہاں دور کی پہاڑی سے
ایک آواز تند و تیز و مہیب
آئی یوں چیر کر ہواؤں کو

جیسے پرہول خامشی کا دیو
اپنی تاریک راہداری میں
نغمہ و رقص کی بغاوت پر

بادلوں کی طرح گرجنے لگے
بجلیوں کی طرح کڑکنے لگے
وادیٔ کوہ کی وہ شہزادی

نغمۂ عشق روحِ آزادی
یوں سہم کر ٹھٹک گئی اک پل
جس طرح کوئی سنسناتا تیر

ناچتے مور کو کرے گھائل

رامش و رنگ کی کماں ٹوٹی
ساز ٹوٹا کہ رک گیا سرگم
برگِ تازہ سے اڑ گئی شبنم

پا بہ زنجیر ہو گئی جیسے
ایک تصویر ہو گئی جیسے
آہوئے زخم خوردہ کی مانند
سہمی سہمی نظر اٹھائی جب
آسماں پر نظر پڑا مہتاب
ٹھنڈی ٹھنڈی شعاعیں برساتا
شب کی محفل میں ناز فرماتا
چاند کی مسکراتی وادی میں
اپنا محبوب اسے نظر آیا
بندھ گیا چاندنی سے تارِ نظر
اور اس جگمگاتی سیڑھی سے
چھوڑ کر چاند کا حسین نگر
کوئی آغوش میں اتر آیا
پردۂ ذہن پر ابھر آیا
گذرے ایام لوٹ کر آئے
لوٹ آیا قرار کا موسم
اور ہر بھولا، بسرا، پچھلا پل
عہدِ ماضی کے کچھ حقیقی خواب
اپنے دامن میں لے کے لوٹ آیا

یہیں اس نغمہ زارِ الفت میں
اسی وادی کا ایک شہزادہ

مادرِ کوہسار کا پالا
چاندنی کی سلگتی راتوں میں

لالہ و یاسمن کی گھاتوں میں
نیم کی ٹیڑھی ترچھی شاخوں پر

راہ کے ایستادہ آموں پر
ہر گھڑی انتظار کرتا تھا

اس کی باہوں میں گیت گانے کو
دیدہ و دل میں ڈوب جانے کو

حسن اور عشق کے یہ رازِ دنیاز
دو دلوں کی بہم دگر آواز

کتنے ہی مہربان برسوں تک
خالی لمحوں کی گود بھرتی تھی

آئینہ خانۂ محبت میں
جانے کس کس طرح سنورتی تھی

یہیں اس نغمہ زارِ الفت میں
ایک ایسا بھی لمحہ گذرا ہے

جس کا دامن رہا خوشی سے تہی
جس کی آغوش میں تھے انگارے

وہ گراں بار لمحۂ خونیں
آج تک ٹل نہیں سکا ہے کہیں

جس نے اک سادہ لوح عاشق کو
اس کی محبوب سے جدا کر کے

جنگ کی بھٹیوں میں جھونک دیا
آج پھر اس سلگتے لمحے نے

شب مہتاب کو جلا ڈالا
چاند تو ہے مگر وہ حسن نہیں

رات تو ہے مگر نہیں وہ فسوں
رقص کی اپسرا ہے کھوئی سی

ناتمامی کا اک شدید احساس
جیسے ساری فضا پہ طاری ہے

کون جانے یہ رقصِ آزادی
دیکھ پائے گی کب حسیں وادی

رام لعل

دو مرد

بوندا باندی ہو رہی تھی۔ چائے خانے کی ٹین کی چھت پر گرنے والی بوندوں سے ایک مسلسل دھیما دھیما نغمہ سا پیدا ہو رہا تھا یہ چائے خانہ بس اسٹاپ کے سامنے بنا ہوا تھا۔ آخری بس جا چکی تھی، گیارہ بجنے والے تھے۔ سیلون ریڈیو کا پروگرام ختم ہو جانے کے بعد بہت سے لوگ باہر چلے گئے تھے۔ اس وقت کوئی سواری نہ ملنے کی وجہ سے رکشا اور تانگے والے بھی چلے گئے تھے، ہوا اور بارش کی وجہ سے سردی بڑھ گئی تھی، عالم باغ کی پوری بستی پر ایک گہری تاریکی کا پردہ پڑ گیا تھا، شہر سے پانچ میل دور ریلوے کے دفاتر، ورکشاپوں میں کام کرنے والوں، اور بہت سے شرنارتھیوں، اور دوسرے لوگوں کی اس چھوٹی سی بستی میں صرف ایک ہی چائے خانہ کھلا ہوا تھا۔ اس کا مالک ایک شرنارتھی سندھی تھا۔ جسے سب لوگ "سائیں" کہکر پکارتے تھے سائیں چائے خانہ کو ایک بجے تک کھلا ہوا رکھتا تھا۔ کان پور جانے والی سڑک پر رات دن ٹرک، اور موٹریں چلتی تھیں، یہاں عموماً ڈرائیور اپنی گاڑیاں روک کر چائے پیا کرتے تھے۔ سائیں کے دو ملازم، جو صبح چھ بجے سے کام شروع کرتے تھے اس وقت دو میزوں، اور کرسیوں کو ایک طرف ہٹا کر زمین پر سوئے ہوئے تھے۔ سائیں کا تیسرا ملازم انگیٹھی میں کوئلے ڈال رہا تھا۔

وہاں اچانک ایک ٹرک رکا، اس میں سے چھ آدمی اترے، چار مزدور، ایک منشی، ایک سکھ ڈرائیور۔ سب آدمی سخت تھکے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ان کے چہروں، بدن کے کپڑوں اور سر کے بالوں پر سرخ رنگ کی گرد جمی ہوئی تھی جب سب بیٹھ گئے تو سائیں نے بغیر کچھ پوچھے، مزدوروں کے سامنے چار گلاس چائے، اور ایک ایک ڈبل روٹی، منشی کے سامنے صرف چائے، اور ڈرائیور کے سامنے ایک خالی گلاس، اور ایک بوتل سوڈا رکھ دی، یہ ان کا روزمرہ کا معمول تھا ڈرائیور نے اپنے بھاری بھرکم اوورکوٹ کی جیب میں سے دیسی شراب کا ادھا نکالا، اور سائیں سے کہا:۔

"سائیں، چھ انڈوں کا آملیٹ وی لے آنا، چھپی چھپی!" پھر منشی کی طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے بولا "یار قسم سے بڑی بھوک لگی ہے ——"

یہ لوگ روزآنہ کام کر کے اسی وقت یہاں آتے تھے۔ چائے پینے کے ساتھ ساتھ ..... منشی ایک کاپی میں کچھ حساب کتاب بھی لکھتا جا رہا تھا۔ اس نے لکھتے لکھتے پنسل روک کر مزدوروں سے پوچھا "آج تم لوگن کے دس پھیرے ہے نا: کیوں رام کھلاون ٹھیک ہے نا: ——"

"ہاں آں ـــ دس ہیں بھئے ـــ" رام کھلاون نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"دس ہی تو ہوئے منشی ! " سردار مونچھوں پر لگی شراب کو آستین سے پونچھتے ہوئے بولا ـــ سالا ٹائر کیچڑ میں دھنس گیا ہوتا، تو آج میں دو پھیرے، اور لگا لیتا۔"

منشی نے رقم جوڑ کر کہا ـــ" تو پندرہ روپے ہوئے۔ ایک ایک کے حصے میں تین روپے بارہ آنے پڑے۔ یہ لو، سنبھال لو۔"

اس نے چاروں مزدوروں کو رقم بانٹ کر دیدی، مزدوروں نے اپنے اپنے روپے بہت احتیاط سے رکھے، اور پھر انہیں لے کر باہر چلے گئے، ڈرائیور نے انہیں پکار کر کہا ـــ" ابے رام کھلاون ! ادے سن ذرا یہاں آ ـــ"

رام کھلاون بیڑی سلگاتے سلگاتے لوٹ آیا۔

"سالے، دو آدمی اور ساتھ میں کر لے، کام جلدی ہوگا پھیرے زیادہ لگیں گے، مزدوری زیادہ ملے گی۔ کیا کہا میں نے ؟ "

"آپ کہن کہ دو آدمی اور کر لئی۔ ہاں ٹھیک تو ہے بی، پر سِدّا رجی، تب ہم اَین بڑا نقصان بیٹھے"

سردار نے اُسے جوتا دکھا کر کہا ـــ" پھر وہی بات ! ماروں ایک سوگن کر ؟ تجھے سمجھایا نا کہ زیادہ آدمیوں سے زیادہ کام نکلے گا۔ زیادہ مزدوری ملے گی۔ اب تم ایک ہزار اینٹوں کو اتارنے اور چڑھانے میں دو گھنٹے لگاتے ہو، دو آدمی بڑھا کر ایک گھنٹہ لگا دُگے، صبح چھ بجے سے رات کے دس بجے تک چار، اور پھیروں کا وقت بچا سکتے ہو۔ کیا کہا میں نے ؟ "

"آپ کہن کہ ـــ اچھا کل صبح دیکھیے جائی۔ جے رام جی کی ـــ"

"ہاں، اس میں تم لوگوں کا، اور میرا سب کا فائدہ ہے میں نے یہاں اس ٹھیکے میں بیس بیس پھیرے ایک دن میں لگائے ہیں ! ـــ"

رام کھلاون کے جانے کے بعد منشی نے کہا ـــ

"پھول سنگھ ! تمہارے پانچ روپے آج کاٹ لوں ؟ ـــ"

"نا بھائی، پانچ کیوں کاٹتا ہے ؟ دو کاٹ۔ آج تو صبح بھی ایک اٹھنّا پیا تھا۔ پانچ کل کاٹ لینا"

"ارے پھول سنگھ، بیٹھ جو بگڑے گا۔ اسے بھی تو حساب دینا ہے۔"

"حساب دینے میں کونسی بڑی آفت آجائے گی، کہہ دینا، پھول سنگھ کو ضرورت پڑ گئی بیس روپے اڈوانس لے گیا ـــ کیا کہا میں نے ؟ "

"سوتو تم نے ٹھیک ہی کہا لیکن یہ ایڈوانس تو پچھلے مہینے سے چل رہا ہے۔ آج پانچ کاٹ لوں، تو سات باقی رہ جائیں گے ۔"

"اب جانے بھی دو منشی، پانچ تو لے لے گا تو باقی کیا بچے گا! پانچ ہی تو! دو روپے تو یہ سائیں لے لے گا، کل کے دن میں کیا کھاؤں گا؟ کھانا پینا ہی تو میرا دھرم ہے، زندگی میں میرے لئے، اور ہے ہی کون؟ نہ ماں باپ، اور نہ ہی جورو! چار دن جو جینا ہے، وہ مجھے خوب کھا پی کر، جی لینے دے، اچھا سن اس طرح کر سوڈے اور انڈوں کے پیسے تو دے دے۔ ان مزدوروں کو بھی چائے ڈبل روٹی کھلاتا ہے۔ میری خوراک کا بھی تو نہ لے لے صرف سوڈے، اور انڈوں کا ذمہ! کیا کہا میں نے؟"

منشی نے سر سے میلی کچیلی ٹوپی اتار کر آگے میز پر رکھ لی، اور بولا

"سیٹھ نہیں مانتا۔ ورنہ میں یہ کرا دیتا۔ اچھا کل پھر بات کروں گا، تم میرے دوست ہو ضرور کوشش کروں گا۔ آج پانچ کاٹ لینے دو۔"

"چھوڑ یار منشی، تو بھی مرغے کی ایک ٹانگ ہی ہے اچھا پانچ نہ کاٹ۔ چار کاٹ لے۔ کل ایک نیا تہمد، اور قمیص کے لئے کپڑا خریدنا ہے۔"

منشی نے چھ روپے اس کی طرف بڑھا دیئے۔ اور پھر بچی ہوئی چائے کو ایک گھونٹ میں پی کر بولا

"اب جلدی سے مجھے گھر پہنچا دو۔ بارہ بج رہے ہیں!"

پھول سنگھ نے آملیٹ کا ایک بڑا سا لقمہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"یار منشی، تو مجھے جب دوست کہہ کر پکارتا ہے، تو میرا جی پھڑک اٹھتا ہے، تیری حالت دیکھ کر شراب کی قسم مجھے بھوت پر بڑا ترس آتا ہے لیکن ایک بات یہ بھی بتا دوں، مجھ پر بڑا غصہ بھی آتا ہے۔ جانتا ہے کیوں؟"

"جانتا ہوں لیکن کیا کروں؟" منشی نے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا

"کیا کروں؟ پھر وہی گھامڑ پنے والی بات! ارے مرد ہو کر کہتا ہے کیا کروں! دیکھ ادھر دیکھ تیری جگہ میں ہوتا نا! یعنی اگر میری بیوی ایسی ہوتی، تو میں اس کی گردن یوں مروڑ کر الگ کر دیتا۔" یہ کہتے کہتے اس نے پلیٹ میں رکھے ہوئے آملیٹ کے مروڑ کر دو حصے کر دیئے، اور پھر ایک ٹکڑے کو منہ میں رکھ کر آہستہ آہستہ کھاتے ہوئے بولا۔ "عورت ہے ہی کیا چیز؟ مرد کے سامنے اس کی حیثیت ہی کیا ہے!"

منشی کی میلی آنکھوں میں جانے کہاں سے اتنی ساری اداسی سمٹ آئی، اس کے چہرے پر بجھی ہوئی راکھ کا تاثر آیا، اس نے چاء خانے کے اندر دیواروں پر لگے ہوئے کیلنڈروں کی طرف دیکھا۔ فلمی، مذہبی، سیاسی

سبھی طرح کے کیلنڈر لگے ہوئے تھے، دیوار کا جہاں کوئی حصہ ان کیلنڈروں سے بچ گیا تھا، وہاں تازہ فلموں کے پوسٹر، اور اشتہار چسپاں تھے، بارش کا اداس نغمہ، ابھی تک جاری تھا۔ سائیں اور اس کا ملازم آگ کے سامنے دم بخود سے کھڑے ان کی باتیں سن رہے تھے، سڑک پر ایک موٹر سن سے گذر گئی، اور سنتی نے اوپر ٹین کی چھت کو تکتے ہوئے کہا ــــ "میں نے چاہا تھا وہ سیر سب سے بڑی خوشی بنے میں جب بھٹے سے تھکا ماندہ رات کو گھر لوٹوں، تو وہ مجھے اپنی نرم اور راحت بخش گود میں لٹا کر میرے بدن کی ساری تکان کو دور کرے ــ رات کے چار گھنٹے، جو اس کے پاس، گذارے دوں ان کے دوران میں مجھے دن بھر کی کوئی بات یاد نہ آئے، بس میں اس سے صرف اسی بات کی آشا کرتا تھا اور وہ اس کے بدلے میں مجھ سے میرا سب کچھ لے لے ــ جو کچھ بھی میرے پاس ہے، لیکن ہائے ری بھلوا! تو نے میرا کوئی بھی ارمان پورا نہیں کیا ــ میرے سات سو روپے مٹی میں مل گئے، پھول سنگھ تمہیں یاد ہے نا، الموڑہ کے کتنے دشوار گذار راستوں پر پیدل سفر کر کے آسے لینے کے لئے پہونچا تھا ــــ"

پھول سنگھ نے سر سے پگڑی اتار کر گود میں رکھ لی، اور بالوں کا جوڑا کس کر باندھتے ہوئے بولا "بہت زیادہ غم نہ کر یا کریا منشی! عورت شئے ہی ایسی ہے ــ عشق پر کر یا مندھے تو پوری دنیا کو ہلا دیتی ہے ــ تو نے ساڑے پنجاب دی جٹی ہیر کا نام سنیا ہوا ہے نا! ، وہ بھی ایک عورت تھی جسدے عشق دا چرچا، آج تک سارا جہان کر رہا ہے ــ لے سن تجھے ہیر کا ایک بند سناؤں ــــ" یہ کہکر اس نے ایک کان پر ہاتھ رکھ کر اونچے سر میں گانا شروع کیا ــ

بس بس زبان توں ٹھوک ایتھے میرے عشق نوں نند نہ قاضیا وے
خالی ڈھول تیں سیر اکھاں والے تینے عشق دی جند نہ قاضیا وے
رانجھے یار دے دیکھنے باہجھ میرا لنگھے جھٹ تے بند نہ قاضیا وے
لیا لکھ تھیں رانجھا لکھ وارث اوہدی کوئی مانند نہ قاضیا وے

گاتے گاتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ــ وہ چند لمحوں تک خلا میں گھورتا رہا، پھر آنسو پونچھ کر شراب کا ایک گھونٹ پیا ــ اور منشی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا ــــ

"اور وہ بھی ایک عورت ہوتی ہے؟ جو مرد کی تمام تر محبت، اور قربانیوں کو بھول جاتی ہے بالکل آنکھیں پھیر لیتی ہے ــ اس کی بے وفائی کا بھی کوئی یار نہیں ہے ــ میں نے خود آزما کے دیکھ لیا ہے، تو میرے اندر زرا جھانک کے دیکھ، تو تجھے اتنا بڑا چاک، اتنا بڑا زخم دکھائی دے گا، کیا تو جانتا ہے، وہ عورت کون ہے؟ نہیں جانتا ــ تو کیا تیرے فرشتے بھی اس عورت کو نہیں جان سکتے ــ وہ یہیں رہتی ہے اسی شہر میں ــ کئی مرتبہ نظر آتی ہے کبھی ہوٹلوں میں مٹکتی، موٹی کبھی بڑی بڑی دکانوں پر شاپنگ کرتی ہوئی ــ یوں پاوڈر، اور سرخی لگی ہوئی،

ہوتی ہے اس کے ہونٹوں پر آنکھیں چندھیا جاتی ہیں لیکن میری طرف دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیتی ہے۔ کیونکہ میں ایک معمولی سا ٹرک ڈرائیور ہوں اور ایک بہت بڑے ٹھیکیدار کی بیوی ہے۔ میرے ساتھ آنکھیں ملاتے ہوئے بھی اس کی بے عزتی ہوتی ہے۔ کبھی وہ بھی دن تھے منشی، وہ میرے پاس چھپ چھپ کر آتی تھی۔ گھنٹوں میرے سینے پر سر رکھ کر میرے ساتھ باتیں کرتی تھی، سچ کہتا ہوں منشی گھنٹوں! اب جب اسے اپنی طرف سے اس طرح نفرت کے ساتھ منہ پھیرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہ کسی دن بیچ سڑک پر مل جائے تو اسے ٹرک کے نیچے کچلتا ہوا نکل جاؤں۔ ایک دن ضرور ایسا کروں گا۔ مجھے یقین ہو چلا ہے مجھے اس کے قتل کے جرم میں پھانسی ضرور ہوگی۔"

منشی دونوں گھنٹوں کو سینے کے ساتھ لگائے کرسی میں پھنسا ہوا سابارش کا اداس نغمہ سننے میں مصروف تھا بوندوں کا جل ترنگ کبھی تیز ہو جاتا کبھی مدھم۔ پھول سنگھ نے گلاس میں بچی ہوئی شراب منشی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ۔"ارے میں نے تجھے کہا ہے نا کہ بہت زیادہ غم نہ کھایا کر۔ لے یہ شراب پی لے۔ اس کو پینے سے تیرے سارے غم اور دکھ دور ہو جائیں گے۔ تو ہر روز میرے ساتھ بیٹھ کر پیا کر۔"

"نہیں دوست! میں شراب نہیں پی سکتا۔ میرے لیے کچھ کر سکتے ہو تو صرف یہی کرو۔ مجھے وہ طریقہ بتاؤ جس سے میں اس عورت سے چھٹکارا پا سکوں۔ سچ کہتا ہوں اس وقت گھر جانے کے لیے جی نہیں چاہتا۔ گھر میں میرے لیے کوئی کشش نہیں رہ گئی ہے۔"

"اچھا یہ بات ہے تو سن۔ میں تجھے ایک ترکیب بتاتا ہوں۔ تو مجھے دوست کہتا ہے نا! آج میری بات مان لے۔ میں ابھی تیرے ساتھ چلتا ہوں۔ ٹرک کو میں سڑک پر روک لوں گا۔ تو اپنے کوارٹر میں جا۔ وہاں اگر کوئی کوئی گڑبڑ دیکھے تو عورت کو چوٹی سے پکڑ کر میرے ٹرک کے سامنے ڈال دے میں اسے کچلتا ہوا نکل جاؤں گا۔ بس! ایک بار اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا ہے؟ کیوں سائیں! کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

سائیں نے کوئی جواب۔ چپ چاپ دونوں کو گھورتا رہا۔ منشی نے بھی کوئی جواب نہ دیا۔ سردار اس کی خاموشی کو برداشت نہ کر کے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پگڑی کو بغل میں دبا کر بولا۔" اگر تو کچھ نہیں کر سکتا تو پھر مجھے دوست نہ کہکر مجھے ایک نامرد کا دوست بننا پسند نہیں ہے۔ چل اٹھ تجھے گھر تک چھوڑ آؤں۔ کتنے پیسے ہوئے سائیں؟"

دوسرے دن رات کو گیارہ بجے چائے خانے کے سامنے پھول سنگھ کا ٹرک رکا تو اس میں سے پانچ آدمی باہر آئے۔ پھول سنگھ اور چار مزدور۔ منشی نہیں تھا۔

سائیں نے پوچھا تو پھول سنگھ جیب میں سے بوتل نکالتے ہوئے بولا۔" سالا بیوی کو لے کر کہیں بھاگ گیا

ہے۔ سمجھتا ہے کسی نئی جگہ پر جاکر بیوی سدھر جائے گی۔ گدھے کی اولاد، اتنا بھی نہیں جانتا کہ وہاں جاکر نئے یار بنا لے گی۔ جس عورت کو ایک بار یہ چسکہ پڑ جائے اس کے لیے کہیں بھی کوئی کمی نہیں اور ایک غیرت مند شوہر کو چاہیے کہ اس کا بس ایک ہی علاج کرے ۔۔ یوں!" یہ کہہ کر اس نے گردن مروڑنے کا طریقہ پھر دہرایا۔

چائے خانے کے ملازم نے چاروں مزدوروں کے سامنے ایک ایک ڈبل روٹی اور ایک ایک چائے رکھی اور پھول سنگھ کے سامنے سوڈا اور چھ انڈوں کا آملیٹ۔

اب منشی کا کام پھول سنگھ کرنے لگا۔ کئی روز گزر گئے۔ ایک رات جب وہ مزدوروں کو ان کی مزدوری کے روپے بانٹ رہا تھا تو وہاں اچانک منشی آ گیا۔ بہت ہی صاف ستھرے کپڑے پہنے اور جھومتا ہوا سا۔ وہ نشے میں تھا۔ اسے اس کیفیت میں دیکھ کر پھول سنگھ بہت حیران ہوا۔ پوچھا "او ے او ے! تم کہاں؟ یہ کیا ٹھاٹھ ہیں!!"

منشی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کی شراب کی بوتل ہاتھ میں لے کر بولا "ایک گلاس اور دینا سائیں! آج ہم بھی پھول سنگھ کے ساتھ بیٹھ کر پئیں گے!"

"تو اتنے روز تک کہاں تھا بھئی! آج کل کیا کر رہا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔ صرف عیش کر رہا ہوں عیش! میں تم سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔ سوچا آج اپنے دوست سے مزدر طوں لگا"

"پر منہ سے بھی تو کچھ بول۔ نوکری کیوں چھوڑ دی؟ بیوی کو کہاں رکھا ہوا ہے۔۔؟"

"اُسے؟ اسے تو" پھول سنگھ کے کان کے پاس منہ لے کر بولا "اسے تو ختم کر دیا۔ ایک ایسے گہرے تاریک کنوئیں میں پھینکا ہے کہ وہاں سے کبھی نکل نہیں سکتی۔ تم یہی چاہتے تھے نا!"

"کیا سچ؟" پھول سنگھ کے چہرے پر حیرت اور خوف کے ملے جلے آثار نمایاں ہو گئے۔ "کسی کو معلوم تو نہیں ہوا؟ اچھا ٹھہر جا ذرا۔ باتیں کریں گے۔"

اس نے جلدی جلدی مزدوروں کو رخصت کیا۔ اور سائیں کا بل ادا کر کے ٹرک میں جا بیٹھے ۔۔ پوچھا ۔۔ "ہاں اب مجھے پوری بات بتا ۔۔ تو نے اُسے کیسے ختم کیا؟"

منشی نے سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر کہا "اب مجھے وہ واقعہ یاد نہ دلاؤ۔ بس سمجھ لو کہ وہ ختم ہو گئی۔ ایک کنوئیں کے اندر ڈوب گئی۔ اب میں آزاد ہوں بہت خوش ہوں۔ ٹرک اسٹارٹ کرو اب میں شہر جاؤں گا ایک جگہ پہنچنا ہے۔"

"عجیب آدمی ہے تو! نشے میں بالکل دھت ہے کیا؟ قتل کے الزام میں کہیں پکڑا گیا تو ۔۔!"

"اماں کچھ نہیں ہو گا۔ کوئی میرا بال تک بیکا نہیں کر سکتا۔ پوری بات پھر کبھی سناؤں گا چلو مجھے اے پی سین روڈ کے چوراہے پر اتار دو۔"

"تو اب نوکری بھی نہیں کرے گا؟ تجھے سیٹھ پوچھ رہا تھا" پھول سنگھ نے ٹرک اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔
"سیٹھ کی ایسی تیسی۔ ابھی تو میں نوکری کا نام بھی نہیں لوں گا۔ گھر کا سب سامان بیچ ڈالا ہے۔ اتنا روپیہ ہو گیا ہے کہ چھ مہینے آرام سے بیٹھ کر کھا سکتا ہوں۔"
معلوم ہوتا ہے بیوی کو مار کر تو اپنے ہوش و حواس بھی گنوا بیٹھا ہے۔ ان روپوں سے ایک عورت کیوں خرید نہیں لیتا! ہاں خوب یاد آئی۔ وہ جو روپی ہے روپی! اوے اپنے بھٹے پر جو کام کرتی ہے! مجھ سے کئی مرتبہ کہہ چکی ہے کہ کوئی مرد کرا دو۔ مجھے کوئی مرد اس کے لیے جچتا نہیں ہے۔ لیکن نہیں یار تو تو اپنا یار ہے۔ جب تجھے ایک بار اپنا یار کہہ دیا ہے تو تیرے حوالے ایسی عورت کیسے کروں جو میرے پاس بھی کبھی کبھی آ کر رہتی ہے۔ تو کوئی اور عورت ڈھونڈ لے۔ عورتوں کی کمی نہیں ہے دنیا میں!"
"نہیں اب کوئی عورت نہیں رکھوں گا۔ تنہائی میں بڑا مزا ہے۔ شکر ہے کہ منجال سے جان چھوٹی۔"
پھول سنگھ نے اسے خوش دیکھ کر بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔ ادرا سے اے پی سین کے چوراہے پر اتار کر اپنے ڈیرے پر واپس چلا گیا۔

کوئی سال بھر بعد ایک دن رات کو گیارہ بجے کے قریب منشی اسی چائے خانے میں پھر آیا۔ وہ پھول سنگھ سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ وہاں پھول سنگھ کو نہ پا کر سائیں سے پوچھا "کیا آجکل پھول سنگھ نہیں آتا ہے۔ کیا اینٹوں کا ٹھیکہ ختم ہو گیا ہے!"
"وہ تو برابر آتا ہے سائیں! ابھی آتا ہوگا۔ آپ اتنے دن کدھر رہا ہے منشی جی!"
"ارے میرے متعلق کیا پوچھتے ہو سائیں! زندگی گذر رہی ہے کسی طرح"
اچھا سائیں! اور تو سب ٹھیک ہے نا!"
منشی نے آج شراب نہیں پی تھی۔ اس کے کپڑے میلے تھے۔ بال بکھرے ہوئے اور شیو بڑھی ہوئی تھی۔ وہ کوئی جواب دیئے بغیر چلا گیا۔
آدھ گھنٹہ بعد وہ پھر لوٹ آیا۔ اب وہ رکشہ میں تھا۔ اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ رکشا کو ایک طرف ایک بند دکان کے سامنے روک دیا۔ عورت کو اسی میں بیٹھے رہنے دیا۔ اور خود سیدھا چائے خانے کے اندر چلا گیا۔ پھول سنگھ شراب کی بوتل کو لے ہوئے بیٹھا مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ منشی کو دیکھتے ہی کہا اٹھا "آیا منشی! تو کہاں چلا گیا تھا۔ آ ادھر بیٹھ میرے پاس۔ آج تجھے ولایتی پلاؤں؟ کل میں نے بیس پھیرے لگائے تھے۔ آج اٹھارہ لگائے ہیں۔ دو دن میں پچاس اپنی جیب میں پہنچ گئے ہیں۔ لیکن تو اتنے دن تک کہاں چھپا رہا منشی! کیا تو لکھنؤ سے باہر کہیں چلا گیا تھا؟"
"میں کانپور چلا گیا تھا، چھ سات مہینے وہاں بڑے ٹھاٹ سے گذرے۔ پھر وہاں سے الہ آباد، بنارس اور پھر پٹنہ سے ہوتا ہوا یہاں آ گیا ہوں۔"
کوئی دھندہ شروع کیا نہیں؟ پر تیں نے یہ شکل کیا بنا رکھی ہے؟ یہ کیسے کپڑے پہن رکھے ہیں؟ چھڈیا منشی تو وہی منشی ہی رہا!"

"بھئی پھول سنگھ کچھ پوچھو۔ روپیہ پیسہ ختم ہو گیا ہے۔ لیکن ہاں ایک پرائیوٹ بات سنو۔ کان ادھر کرو۔ ایک شکار ہے اپنے ساتھ اچانک مل گیا ہے۔ لیکن جیب میں پیسے ویسے نہیں ہیں اسے دینے کے لیے۔ کیا تم خرچ کر سکتے ہو دس پندرہ روپے کی بات ہے۔"

"ہوں ۔۔۔ ں!" پھول سنگھ نے ایک ہوں کھینچی۔ اور پھر جلدی سے شراب کا گلاس خالی کر کے بولا "کہیں دور تو نہیں جانا پڑیگا؟"

"باہر رکشا میں ہے ۔۔۔ آؤ تمہیں ملا دوں۔"

دونوں اُٹھ کر باہر چلے گئے۔ رکشا کے پاس جا کر منشی نے عورت سے کہا "یہی میرا دوست پھول سنگھ ہے۔ میں نے اس سے سب کچھ کہہ دیا ہے تم کوئی فکر نہ کرو۔"

اندھیرا ہونے کی وجہ سے پھول سنگھ کو ٹھیک طرح سے عورت دکھائی نہیں دی۔ ہاتھ سے ٹٹولا تو اس کی اور عورت دونوں کی ہنسی نکل گئی۔ پھول سنگھ خوش ہو کر بولا ۔۔۔ تو بڑے کام کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ کئی دنوں سے جی مچل رہا تھا۔ اچھا اب اسے جلدی سے میرے ٹرک میں بٹھا دے۔"

منشی نے عورت کو رکشا سے اتار کر ٹرک میں بٹھا دیا۔ جب پھول سنگھ نے ٹرک اسٹارٹ کیا تو منشی نے کہا ۔۔۔ "میرے پاس رکشا والے کو دینے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ کچھ کھاؤں گا بھی بڑی بھوک لگی ہے۔"

"اچھا لے ۔۔۔ یہ پانچ کا نوٹ۔ یہیں چائے خانے میں میرا انتظار کرنا۔"

ٹرک چلا گیا۔ منشی رکشا والے کو رخصت کر کے چائے خانے میں آ بیٹھا۔ چھ انڈے منگوائے۔ ایک ڈبل روٹی۔ پھول سنگھ کی آدھی بچی ہوئی ولایتی بھی اس کے پاس تھی۔ لیکن اسے وہاں بیٹھے ہوئے ابھی آدھا گھنٹہ بھی نہیں گذرا تھا کہ پھول سنگھ لوٹ آیا وہ ٹرک میں سے نکل کر بڑی تیزی سے اندر آیا۔ اور آتے ہی منشی کو گریبان سے پکڑ کر اس کے زور زور سے کئی طمانچے جڑ دیئے۔

"سالے، سور، کتے، میرے ساتھ دھوکا! میں تیری ہڈی پسلی توڑ ڈالوں گا۔ تیرا خون پی جاؤں گا۔ مجھے دوست کہہ کر میرے ساتھ ہی دغا کرتا ہے!"

وہ اسے مارتا رہا۔ سائیں نے بیچ بچاؤ کرنے کی کوشش کی تو اس سے بولا ۔۔۔ "بیچ میں نہ آ سائیں! نہیں تو تیرے کو بھی ایک دو ہاتھ پڑ جائیں گے۔ میں آج اس کا خون کر کے رہوں گا۔ یہ تو سچ مچ نامرد نکلا۔ نامرد بھی اور کمینہ بھی۔"

"آخر بات کیا ہے؟ اسے جان سے ہی مار ڈالے تو باہر سڑک پر لے جا کر مارو نا! مجھے کیوں خواہ مخواہ پھنساتے ہو بیچ میں سائیں!"

سائیں نے منشی کو پھول سنگھ کے ہاتھوں سے چھڑا کر الگ کر لیا۔

پھول سنگھ بولا ۔۔۔ "سالا کہتا تھا میں نے بیوی کو مار کر کنوئیں میں پھینک دیا ہے اور اب وہ وہاں سے کبھی باہر نہیں آئے گی۔ الو کی دم! مجھے تیری بیوی کی ضرورت ہوتی تو اسے میں نے کبھی کا ہتھیا لیا ہوتا۔ لیکن میں جسے دوست سمجھتا ہوں اس کے ساتھ مرتے دم تک دوستی نبھاتا ہوں۔ لیکن آج تو نے مجھ سے بھی پیسے بٹورنے چاہے جو روکے دلال! سائیں اسے چھوڑ دے۔ آج میں اس کا خون کر کے رہوں گا۔"

نینا کاش

ایک مرد — ایک عورت

ماضی کی رنگین اور مسرت افزا یادیں، کچھ دیر کے لیے حال کی تلخیوں پر پر غالب آکر انسان کو ایک نئی دنیا کا باشی بنا دیتی ہیں، اور ایک نامراد و تشنہ کام بھی حسین حسین خوابوں کے بگڑے گوندھنے لگتا ہے۔

وہی پسپا جس کے پاس چند آہوں، سسکیوں اور آنسوؤں کے علاوہ کچھ نہ بچا تھا، جس کی مسرتوں کے فنچے کو قبل از شگفتگی ہی مسل دیا گیا تھا۔ اور جو قریباً دس سال سے ایک بیوہ کی سی خشک اور رنگینیوں سے عاری زندگی بسر کر رہی تھی، آج اپنے محبوب منوہر کا خط ہاتھ میں لیے ہدمست شرابی کے مانند جھوم رہی تھی۔ اس کے دل کی خاموش جھیل میں ایک بار پھر لہریں ناچ اٹھی تھیں، ذہن میں خیالات کا ایک طوفان سا موجزن تھا۔ تصورات کی ایک گھوڑ دوڑ سی جاری تھی ـــــ اور وہ مدہوش سی ہو کر رہ گئی تھی۔ منوہر! اس کا منوہر آج اس سے ملنے آرہا تھا اور اس کے خشک اور سوکھے ہوئے ہونٹ گلاب کی کنواری کلی کی طرح رنگین اور تر و تازہ ہو کر، بے اختیار کھلے جا رہے تھے۔ اور مسرت کی فراوانی کے زیر اثر اس کا انگ انگ پھڑک رہا تھا۔

شام کے چار بجے تھے۔ پانچ بجے اُسے اپنی عزیز سہیلی شوبھا کے ساتھ ویمنز کلب کی میٹنگ میں جانا تھا وہ اس کلب کی بانی، صدر اور روح رواں تھی، آج کلب کی ایک خاص میٹنگ ہو رہی تھی جس میں عورتوں سے متعلقہ ایک نہایت اہم مسئلہ پر غور کیا جانا تھا۔ لیکن وہ اس طرف سے بالکل بے نیاز اپنی ہی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی ـــــ وہ دنیا، جو اس کے منوہر، اس کے ارمانوں کے چاند، مسرتوں کے کنول اور خوابوں کے شہزادے منوہر کی عطیہ تھی۔ اور وہ دس سال پہلے کی زندگی میں پہنچی، اس نشیلی اور روح افزا زندگی کے سحر آفرین تخیلات کی بھول بھلیاں میں بھٹک رہی تھی۔

یہی وہ دن تھے جب وہ جاگتے میں بھی خوابوں میں ڈوبی رہتی تھی، جب وہ بڑی سڈول اور ملیح تھی جب اس کی آنکھیں بے اختیار بادہ ریزی کرتی تھیں اور رخساروں کی گولائیاں نوخیز گلاب کی مانند ہنستی تھیں جب وہ بات بات میں مسکرایا اور گلاب ہو جایا کرتی تھی، اور جب وہ اور منوہر ایک دوسرے سے ملے تھے اور ایک دوسرے کو اپنا بنا کر ایک دوسرے کے بن گئے تھے۔ اس کی امیدیں حسرتیں بنیں ـــــ اور حسرتیں سٹاگیں

وہ محبت کی بازی ہار گئی۔ اس کا منوہر اسے چھوڑ کر کسی اور کا ہو گیا اور وہ لٹی پٹی سی بھری جوانی میں ہی بوڑھیوں کی سی سنجیدہ اور بے کیف زندگی گذارنے لگی۔

ماں کی محبت اور شفقت سے وہ بچپن ہی سے محروم تھی۔ لیکن جوانی آتے ہی اس کا باپ اسے چھوڑ کر بھگوان کے یہاں چلا گیا تھا۔ ان دنوں وہ تھرڈ ایئر کی طالبہ تھی۔ باپ کی وفات کے بعد اگرچہ وہ بالکل بے سہارا اور یتیم بن کر رہ گئی تھی۔ تاہم اس نے ہمت نہ ہاری۔ ایک پرائیویٹ اسکول میں چالیس روپے ماہانہ کی نوکری کر کے اور ٹیوشنیں پڑھا پڑھا کر اس نے اپنی پڑھائی جاری رکھی، ان ہی دنوں منوہر بھی اس کی زندگی میں آیا، اور اس بے سہارا نے منوہر کو اپنا سہارا بنا کر شاہراہ زیست پر بڑھنے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن ایک دو سال تک اس کے جذبات و احساسات زندگی و جوانی سے کھیلنے کے بعد نرموہی منوہر نے بھی اپنی الگ دنیا بسا لی۔ اس پر بھی وہ ہمت و استقلال کا دامن اپنے ہاتھوں میں تھامے رہی اور متواتر بڑھتی رہی۔ ایم اے اور بی ٹی کی ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد وہ ایک مقامی ہائی اسکول میں بطور ہیڈ مسٹریس کام کرنے لگی، اور تب سے آج تک وہیں کام کر رہی تھی۔ اپنی پچھلی زندگی کو وہ بالکل فراموش کر چکی تھی ـــــ لیکن آج یکایک اس کی وہ زندگی اور جوانی کے وہ مدھر اور رنگیلے دن، پھر اس کی آنکھوں کے سامنے ناچ کر اس کے دل اور دماغ میں ہلچل مچانے لگے۔ صبح کی ڈاک سے اسے منوہر کا خط ملا اور خط کو پڑھتے ہی وہ دیوانی سی ہو کر رہ گئی تھی اور اس نے اسکول جانا ملتوی کر دیا تھا، اور اپنی صندوقچی لینے کے لیے گھر آئے ہوئے چپراسی کے ہاتھ سکنڈ مسٹریس کے نام پیغام بھجوا کر، وہ گھر کی صفائی میں مصروف ہو گئی تھی۔

منوہر، اس کا منوہر آج شام کو اس سے ملنے آ رہا تھا اور اس کی خزاں رسیدہ آرزوئیں پھر سے بہاروں کے ہنڈولے میں جھولا جھولنے لگی تھیں۔ جیون کے اندھکار میں یکایک آشاؤں کے دیپ جگمگا اٹھے تھے۔ اندھیری رات میں چاند، پونم کا چاند نکل آیا تھا۔ اسے اپنا سارا گھر خوشیوں سے بھرا نظر آنے لگا تھا، اور وہ سارے گھر کو قرینے سے سجا رہی تھی۔ مسرت پھوٹ پھوٹ کر بہی جا رہی تھی۔ پانچ بجے منوہر اس کے گھر آ رہا تھا۔ منوہر..... اس کا منوہر! ..... اور وہ خوابوں کی وادیوں میں اڑی اڑی جا رہی تھی۔

دن بھر وہ گھر کی صفائی اور آراستگی میں منہمک رہی تھی۔ اپنے کمرے کو اس نے خاص طور پر سجایا تھا۔ کمرے کی دیواروں اور ان پر آویزاں تصویروں کو گرد سے پاک کر دیا گیا تھا، اور ان میں ایک زندگی اور جوانی سی مسکرا اٹھی تھی۔ فرنیچر کو بھی کپڑے سے اچھی طرح سے جھاڑ پونچھ کر فنکارانہ انداز سے لگایا گیا تھا۔ فرش کا قالین بھی چمک اٹھا تھا۔ ٹیبل پیس کے سامان کی طرف بھی توجہ فرمائی گئی تھی۔ اور سارا کمرہ حجرۂ عروسی کی مانند ہنس رہا تھا اور وہ صوفے کی پشت پر اپنا چہرہ ٹکائے بیٹھی ہوئی کسی فردوسی سرور میں غرق تھی۔ منوہر کے کندھے پر بھی وہ کبھی اسی طرح سر رکھ کر راحت محسوس کیا کرتی تھی ـــ لیکن اب تو اسے راحت کا منہ دیکھے ایک زمانہ گزر چکا تھا!

ساڑھے چار بجے شوبھا اس کے پاس آئی اور وہ ادھر ادھر کے بہانے بنا کر اسے ٹالنے کی کوشش کرنے لگی۔ شوبھا حیران تھی کہ آج یکایک اس کی عزیز سہیلی کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ اسے کیوں ٹال رہی ہے؟ کلب میں جانے سے کیوں آنا کانی کر رہی ہے؟ ـــــ اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی ہوئی، اس کی اس اچانک تبدیلی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

وہ آج پہلی مرتبہ کلب سے غیر حاضر ہو رہی تھی، پہلی ہی مرتبہ شوبھا کو ٹال رہی تھی۔ اور شوبھا سوچ رہی تھی کہ وہ سب کیا ہے؟ کیا وجہ ہے اس کی؟ کیوں وہ آج بہت مسرور نظر آتی ہے، کمرہ بھی ہر روز کی طرح نہیں ہے۔ فرنیچر بکھرا ہوا ہونے کی بجائے قرینے سے رکھا ہوا ہے۔ دیواریں گرد آلود ہونے کی بجائے صاف ستھری ہیں، آج اس کی ساڑی بھی نئی اور بڑھیا ہے۔ چہرے پر بھی میک اپ ہنس رہا ہے۔ آخر یہ سب اہتمام کس لیے؟ ہمیشہ اپنی طرف سے یکسر بے نیاز اور لاپرواہ رہنے والی وہ، آج اس قدر سنگھار اور سعادت مند کیسے بن گئی؟ اس میں یہ اچانک انقلاب ..... ؟

شوبھا پوری قوت سے سوچ رہی تھی، لیکن اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔

دوسری طرف وہ نہایت بے چینی سے شوبھا کے جانے کی منتظر تھی۔ اس نے بہت کوشش کی تھی کہ وہ آج بھی شوبھا کے سامنے ہمیشہ کی طرح ہی سنجیدہ اور محجوب رہے۔ لیکن کمرے کی صفائی اور آراستگی اس کی نئی ساڑی اور میک اپ کیا ہوا چہرہ، اور ہونٹوں پر چپکے چپکے کھیل جانے والی مسکراہٹ، سبھی اس کی چغلی کھا رہے تھے، اور شوبھا اتنا ضرور سمجھ گئی تھی کہ کوئی نہ کوئی بات ہے ضرور۔ لیکن کیا بات ہو سکتی ہے؟ یہ وہ نہ سمجھ سکی تھی۔

بارے کچھ لمحوں تک سوچتے رہنے کے بعد شوبھا صوفے پر اس کے پہلو میں آ بیٹھی، اور اسے گدگداتے ہوئے بولی "کیوں جی، کیا چھپایا جا رہا ہے؟"

وہ چپ رہی اور خود کو شوبھا سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

"بولو نا" شوبھا اسے اور بھی شدت سے گدگدانے لگی۔

"بھئی شوبھا!" اس نے قدرے تمکنت سے کہا۔

"تو پھر جواب دو۔"

"میں آج موڈ میں نہیں ہوں" اس نے غیر معمولی سنجیدگی سے کہا۔ "اور دیکھو آج تم اکیلی ہی میٹنگ کا سارا انتظام کر لینا۔ میں ..... میں ... ہاں، مجھے ایک کام ہے۔ بہت ضروری کام ہے ..... ایک مہمان آ رہا ہے پانچ بجے۔"

"مہمان؟" شوبھا چونک سی پڑی اور یکایک اسے اس کی اور منوہر کی محبت کا خیال آیا۔ مسکرا کر بولی۔

"یہ مہمان صاحب کون ہیں؟ . . . . کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟" اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"بولو!" شوبھا نے پھر اسے گدگدایا، اور اس کی آنکھوں میں جھانکتی ہوئی اسی طرح مسکرا کر بولی "کہیں منوہر صاحب تو . . . . . !" نہ جانے اس کے منہ سے یہ الفاظ کیسے نکل گئے۔ حالانکہ کئی برسوں سے پشپا کی زبان پر یہ نام کبھی نہ آیا تھا۔ اور وہ خوب جانتی تھی کہ منوہر کے ساتھ اس سہیلی کی کتنی بربادیاں وابستہ ہیں اور ہمیشہ اس ذکر سے بچنے کی کوشش کرتی رہتی، مگر آج نہ جانے کیسے اس کے منہ سے یہ نام نکل گیا۔

"ہاں شوبھا!" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی اس کی غزالی آنکھیں اشک آلود ہوگئیں۔ چہرہ بے طرح تمتما اٹھا۔ گال انگارے کی طرح سلگ اٹھے۔ اس نے شوبھا کے گلے میں بانہیں حائل کر دیں اور بولی: "ہاں، وہ آ رہا ہے۔ اس نے مجھے خط لکھا ہے کہ وہ آ رہا ہے . . . . . پانچ بجے!"

شوبھا چپ رہی اور اس کی نمناک آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ عورت کی آنکھ زبان سے زیادہ دل کا اظہار کر سکتی ہے۔ اور ان دونوں کی آنکھوں نے بھی ایک دوسرے کو بہت سی باتیں سمجھا دیں۔ خاموشی کی زبان میں دل کی تمناؤں کا اظہار کر دیا گیا۔ حیا کے پردے میں حسرتیں اور امنگیں ابھر رہی تھیں۔ پھر یکایک دونوں نے خود کو سنبھال لیا۔ شوبھا نے اپنی رسٹ واچ کی طرف دیکھا۔ پونے پانچ بج چکے تھے۔

"اوہ، پونے پانچ ہوگئے!" یہ کہہ کر شوبھا اٹھی اور اس سے رخصت لے کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

شوبھا کے جانے کے بعد وہ بھی صوفے سے اٹھی۔ منوہر کے آنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ ان پندرہ منٹوں میں اُسے اپنے سنگار اور چائے کی میز کا آخری جائزہ لینا تھا۔ لیکن اسی لمحہ کسی کے قدموں کی آہٹ ہوئی اور اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا کہ منوہر کمرے میں داخل ہو رہا ہے ـــــ وہی خوبصورت اور من موہنا کھڑا، سحر کار آنکھیں، پیشانی پر بکھرتا ہوا بالوں کا ایک چھلا، وہی مسکراتے ہوئے ہونٹ، سب کچھ وہی! ـــ اور اس پر ایک غنودگی سی چھانے لگی۔ مگر اس نے اسی آن خود کو سنبھال لیا، اور منوہر کے استقبال کے لیے دروازے کی طرف بڑھی۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں پشپا!" منوہر نے دس سال پہلے کی طرح آج بھی اسی بے تکلفی سے کہا، اور مسکراتا اور سرسری نظر سے سارے کمرے کا جائزہ لیتا ہوا اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔

"بیٹھیے!" اس نے صوفے کی طرف اشارہ کر کے نہایت لجاجت سے کہا۔

"خوب!" منوہر نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہ ہو اور اس کی بک شیلف پر نگاہیں جما کر بولا۔

"تو یہ آپ کی لائبریری ہے؟"

"جی ہاں، اور ڈرائنگ روم بھی!" اس کی لجاجت دور ہو چکی تھی۔ "تشریف رکھیے۔"

منوہر بے تکلفی سے صوفے پر بیٹھ گیا۔

دونوں ٹکر ٹکر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے اور چند ساعتوں تک کمرے کی فضا خاموشی میں ڈوبی رہی۔

"پشپا!" یکایک منوہر نے سلسلۂ خاموشی کو منقطع کیا۔ "آج دس سال بعد ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں، یوں ہی گذر گئے یہ دس سال! گویا دس سال کا یہ عرصہ اس کے لیے دس دن تھا۔

"دس سال!..... ہاں، یونہی گذر گئے!" اس نے سوچا۔ "اس کے دس سال یوں ہی گذر گئے۔ لیکن میرے دس سال، وہ کیسے جان سکتا ہے؟"

"ہاں یونہی گذر گئے۔" وہ بولی۔

"وہ کتنے اچھے دن تھے، جب میں اور تم.....!" منوہر نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "لیکن اب تو ان دنوں کی یاد بھی دل میں نشتر سے لگانے لگتی ہے!"

وہ لفظ "تم" پر چونکی۔ دس سال بعد پھر کوئی اسے تم کہہ کر پکار رہا تھا۔ کوئی کون؟..... منوہر! وہی جس نے اسے ایک ابدی درد دیا تھا، اس بربادی کے گڑھے میں دھکیلا تھا۔ جس نے اس کے ہونٹوں کی کنواری مسکراہٹوں کو لوٹا تھا۔ اس کی آنکھوں کی بادہ ریزیوں، چہرہ کی شگفتگی، رخساروں کی تمتماہٹ اور اعضاء کی سڈول تی و ملاحت کو لوٹا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ تیس سال ہو جانے کے باوجود بھی، ابھی تک کنواری تھی۔ تاجر باپ کا بیٹا ہونے کی وجہ سے اس نے محبت میں بھی مالی فائدہ ہی کو دیکھا تھا، اور اس کے ساتھ شادی کرنے کو ایک خسارے کا سودا جانا تھا۔ جس نے اس کی زندگی اور جوانی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنا فائدہ ہی مقدم سمجھا تھا۔ آج وہی منوہر.....! لیکن وہ سب کچھ بھول گئی تھی۔ عورت جو ٹھہری! اس نے اپنے دل کو بے وفائی اور سنگدلی کی ٹھوکروں سے روندڈالنے والے کو بھی معاف کر دیا تھا۔ اس کے لیے منوہر آج بھی وہی منوہر تھا۔ اس کا منوہر!..... اس کے خوابوں کا شہزادہ، حسرت و ارماں کا دولہا!.....

چائے کی میز پر بیٹھے، دونوں کسی اور ہی دنیا میں پہنچ چکے تھے۔ وہ ایک بار پھر بے تکلفی سے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ اُسے کہانیاں لکھنے کا بھی شوق تھا۔ چار مہینے پہلے اس کی کہانیوں کا ایک مجموعہ شائع ہوا تھا۔ منوہر یکایک اسی کو گفتگو کا موضوع بنا کر بولا۔

"پشپا!..... وہ تمھاری کہانیوں کا مجموعہ خوب ہے!"

"آپ نے پڑھا تھا اسے؟"

"ہاں، کئی مرتبہ۔ تم تو اب بہت اچھا لکھنے لگی ہو۔"

"بہت اچھا لکھنے لگی ہوں!" اس نے دل ہی دل میں کہا۔ جس پر بولی "آپ کا دیا ہوا درد ہی تو کہانیوں کی شکل اختیار کر گیا ہے! لیکن..... آپ کو کیا معلوم؟"

منوہر چپ رہا۔

"لیکن مجھے اس سے ذرا بھی مالی فائدہ نہیں ہوا" وہ کہتی رہی۔ "پبلشر نے اطلاع دی ہے کہ میرا یہ مجموعہ زیادہ بک نہیں رہا ہے۔ ہاں، اس پر تبصرہ اچھے اچھے پرچوں نے شائع کیا ہے، جو پبلشر کے کہنے کے مطابق اس کے بھی اثر ورسوخ کا نتیجہ ہے۔"

"تم خود شائع کرلیتیں، اور پھر ....." منوہر نہ جانے کیا سوچ کر رک گیا۔

"آپ کی وساطت سے بکواتی!" اس نے طنز آمیز سنجیدگی سے اس طرح کہا گویا اس نے منوہر کے نامکمل جملے کو مکمل کر دیا ہو۔

"ہاں!" منوہر کھل کھلا کر ہنس پڑا وہ اس کے طنز کو سمجھ گیا تھا، لیکن اس کے خیال میں وہ اس کی طبیعت کا خاص جوہر اور پیار کا ایک انوکھا انداز تھا۔

پھر چند ساعتوں تک دونوں خاموش رہے۔

منوہر کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن چپ تھا۔ وہ کچھ سننا چاہتی تھی اور بے قرار تھی، آخر میں منوہر ہی بولا: "پشپا، تم بالکل ویسی ہی ہو۔ جیسی آج سے دس سال پہلے تھیں!" یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔ کیک کا ٹکڑا اس کے منہ میں تھا، اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے، وہ اسے دیکھ رہا تھا۔

"ہاں، میں بالکل ویسی ہی ہوں۔" وہ دل ہی دل میں سوچنے لگی ــــ اور آج سے دس سال پہلے کے زمانے میں جا پہنچی۔ منوہر کے ساتھ گزارے ہوئے دنوں کا ایک ایک لمحہ اسے یاد آرہا تھا اور وہ اپنے وجود تک سے غافل ہو چکی تھی۔

یکایک منوہر اٹھا اور اس کے ریشمی بالوں کی لٹوں کو اس کی گردن کے چاروں طرف لپیٹ کر گانٹھ لگا دی۔ گوری گوری گردن میں نیلی نیلی رگیں ابھر آئیں۔ لیکن اسے ذرا بھی تکلیف نہ ہوئی۔ وہ مدہوش اور خود فراموش ہو چکی تھی اس نے سر اٹھا کر منوہر کی طرف دیکھا۔ وہ اس پر جھکا ہوا تھا۔

"پشپا!" منوہر نے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر کہا: "ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھیے"

"تمھیں اب بھی مجھ سے محبت ہے؟"

"ہاں" اور اس کی پلکیں حیا آلود ہو کر جھک گئیں۔

"تو سنو، اسی محبت کے صدقے میں میں آج تم سے کچھ لینے آیا ہوں!"

"کیا ــ؟" اس نے یکایک چونک کر پوچھا۔

"تمھاری مدد!" منوہر کی آواز التجا آمیز تھی۔

"مدد!..... اور مجھ سے؟" اس نے حیرت آمیز نظروں سے منوہر کی طرف دیکھا۔

"ہاں، تم سے! آواز کے ساتھ ساتھ اب منوہر کی آنکھوں میں بھی التجا آگئی تھی۔ اس نے ایک آہ بھری اور بولا" دو مہینے ہوئے میری بیوی مرگئی ہے۔ ہاں، تو میں دوسری شادی....."

"دوسری شادی!" اس نے سوچا۔ کیا حرج ہے دوسری شادی میں؟ اگر آج دس سال بعد بھی وہ اپنے منوہر کو پانے میں کامیاب ہوجائے تو، کتنا اچھا ہو! اس نے اپنی شادی نہیں کی، اچھا ہی ہوا۔ اس کا منوہر آخر اسی کا تھا۔ سماج والدین کی دولت اور کاروبار، ان سب کے دباؤ کی وجہ سے وہ اسے اپنا نہ سکا تھا لیکن اب وہ آزاد ہے۔ والدین کی دولت اور کاروبار کا واحد مالک ہے۔ اب وہ اس کا ہے، صرف اس کا!

کمرے کی اداس فضا میں مسرت سی تھرکنے لگی تھی۔ دیواروں پر لگی ہوئی تصویریں مسکرا رہی تھیں۔

"آپ!..... دوسری شادی.....؟" سوچتے سوچتے یکایک اس کے ہونٹ پھڑپھڑائے۔

"ہاں، پشپا!" منوہر نے سنجیدگی سے کہا" بات یہ ہے کہ مرنے والی اپنے پیچھے دو بچے چھوڑ گئی ہے۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا!"

"بچے!" وہ دوبارہ خیالوں میں ڈوب گئی۔ وہ ان بچوں میں جائے گی۔ وہ اسے ماں کہہ کر پکاریں گے۔ وہ انھیں پیار کرے گی۔ اگر اس کی اپنی شادی ہوگئی ہوتی تو..... آج اس کے بھی بچے ہوتے اور وہ ماں ہوتی، ماں!

"مجھ سے ان کی دیکھ بھال نہیں ہوسکتی!" منوہر کہتا رہا" کام کو سنبھالوں یا انھیں لیے بیٹھا رہوں! مجھے تمھاری مدد کی ضرورت ہے پشپا!! اس کے بغیر شاید میں کامیاب نہ ہوسکوں گا!"

"کامیاب نہ ہوسکوں گا!" اس نے منوہر کے ان الفاظ کو بار بار دل میں دہرایا اور سوچنے لگی کہ کیا منوہر کو ابھی تک اس پر یقین نہیں ہے؟ بھلا کیا وہ کبھی "نہ" کہہ سکتی تھی؟ اس نے منوہر ہی کے لیے تو اپنی زندگی برباد کردی تھی اسی کے لیے تو وہ ابھی تک کنواری بیٹھی تھی۔ اور منوہر!..... وہ بھی کونسا دودھ پیتا بچہ تھا۔ لیکن شاید اپنے رویے کی وجہ سے وہ اس سے اپنا مدعا کہتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ لیکن..... اب وہ پچھلی باتوں کو بھول چکی تھی، کیونکہ ان تمام باتوں کا انجام بہت ہی اچھا تھا۔ منوہر آخر اسی کا تھا، اور اور اسی کا ہوگیا۔

منوہر کو کوئی جواب دینے کی بجائے اس نے صرف "ہوں" کردی۔ وہ متواتر منوہر کے منہ سے کچھ سننا چاہتی تھی۔ اس کے رخسار تمتما اٹھے، آنکھوں سے خمار ٹپکنے لگا۔ جوانی کا خون رگوں میں دوڑنے لگا۔ دبے ہوئے جذبات اور احساسات ابھر آئے۔ جسم تو کا سوکھا ہوا گلشن پھر سے سرسبز و شاداب ہوگیا۔ اور وہ مجسم سرور و انبساط بن کر ہر مدھر آشاؤں اور کلپناؤں کے سنسار میں حسین تتلی کی طرح اڑنے لگی۔ کبھی ایک پھول پر کبھی دوسرے پر۔

"پچھلے مہینے ایک پارٹی میں میری ملاقات مسٹر بی ایس میری سنیئر سب جج اور ان کی صاحبزادی مس ریکھا ایم اے سے ہوئی۔" منوہر اس کے چہرے پر نگاہیں جما کر بولا۔

"پہلی ہی نظر میں ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے تھے، اور مختصر یہ کہ اب ہمیں ایک دوسرے سے محبت ہے اور ہم دونوں شادی کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جج صاحب اور ان کی مسز بچوں کا سہارا لے کر رکاوٹ ڈال رہے ہیں۔"

منوہر کے منہ سے یہ سب سن کر وہ گویا آسمان سے زمین پر آ گری۔ اس نے نہ جانے کتنی امنگوں سے حسرتوں کی ایک دنیا سجائی تھی، لیکن آندھی اور زلزلے کے ایک ہی جھٹکے نے اس دنیا کا نام و نشان تک مٹا دیا۔ اس کی حالت ٹھیک جنگل میں بھٹکتے ہوئے اس پیاسے کی سی تھی، جس کا پیاس کے مارے دم نکلا جا رہا ہو۔ اچانک اسے دور سے پانی دکھائی دے۔ وہ پاگلوں کی طرح اس طرف دوڑے، اور اس خیال و احساس کے زیر اثر اس کی پیاس بھی تیز ہو جائے کہ اسے پانی مل گیا ہے۔ وہ گرتا پڑتا پانی تک پہنچے اور جسے اس نے پانی سمجھا تھا، وہ چمکتی ہوئی ریت نکلے۔ گرم اور خشک ریت! زندگی کی آخری امید بھی ٹوٹ گئی! وہ کیا سمجھ رہی تھی اور ہوا کیا؟ گلاب سے رخسار مرجھا گئے۔ وہ پتھر سی ہو کر رہ گئی اور دھم سے کرسی پر لڑھک گئی۔

منوہر کچھ نہ سمجھا۔ اس نے اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیئے۔ وہ گھبرا گیا۔ ابھی ابھی وہ اتنے اچھے موڈ میں تھی۔ لیکن یہ یکایک اسے کیا ہو گیا، وہ کچھ بھی سوچ اور سمجھ نہ سکا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور مردہ لاش کی طرح منوہر کو گھورنے لگی۔

"یہ تمہیں کیا ہو گیا تھا پشپا؟" منوہر نے سہمے سہمے اور پیار آمیز لہجے میں پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ بڑبڑائی۔ "مجھے اکثر ایسا ہو جاتا ہے نہ جانے کیوں؟"

"ہاں، تو پھر تم نے میری بات کے بارے میں کیا سوچا؟" منوہر نے اس کی پیشانی سہلاتے ہوئے کہا۔ "تم اکیلی ہو اگر میرے بچوں کو سنبھال لو تو تمہارا بھی دل بہلتا رہے گا اور میں اور ریکھا بھی ایک دوسرے کے ہو جائیں گے تمہاری اس مہربانی کے لیے میں عمر بھر تمہارا احسان مند رہوں گا۔"

اس کے دماغ میں خیالات کی ریل سی چلنے لگی، وہ تذبذب میں ڈوبی سوچ رہی تھی کہ منوہر کی بات مانے یا نہ مانے؟ لیکن اس طرح وہ کب تک زندگی گذار سکے گی؟..... شادی نہ کرنے کا عزم تو وہ پہلے ہی کر چکی تھی لیکن منوہر کو بھول جانے سے اب وہ خود کو بالکل مجبور پا رہی تھی۔ وہی منوہر جس نے اس کی زندگی اور جوانی کو ایک ابدی پیاس دی تھی۔ جو آج تک اس کے لیے ایک حسین سراب بنا رہا تھا اور سدا بنا رہے گا۔ اگر وہ اس کے بچوں کو اپنے پاس رکھ لے گی، تو ان کے سہارے زندگی تو گذار لے گی۔ پانی نہ ملے لیکن پانی کا تصور تو قائم

رہے گا۔ پیاس نہ بجھے، تو کیا ہوا، سوکھے حلق میں اگر ایک دو قطرے ہی پانی پڑ جائے تو کم از کم کچھ وقت کے لیے جینے کا سہارا تو ہو جائے گا۔ منوہر نہ سہی، اس کی نشانی تو اس کے پاس رہے گی۔ بچوں میں زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت تو وہ منوہر کو پا سکے گی۔ زندگی بھر اس بے وفا کی یاد میں گھل گھل کر مرنے سے تو بچ جائے گی! — اور یکایک اس کے لب پھڑپھڑا اٹھے — "اگر آپ کی یہی خواہش ہے تو میں تیار ہوں۔"

"مجھے تم سے یہی امید تھی لپشیا!" منوہر مسرت سے پاگل سا ہو کر بولا۔

"لیکن مجھے نہیں تھی۔"

"کیا؟" منوہر یکایک گھبرا کر بولا۔

"یہی کہ آپ اپنے بچوں کو مجھے دے دیں گے!" اس نے مسکرا کر جواب دیا، اور کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گئی۔

منوہر بھی اپنی کرسی پر جا بیٹھا، اور دونوں باتیں کرتے ہوئے چائے پینے لگے۔



سبب کیوں صافی بہترین مصفّیِ خون ہے!

۱۔ معدہ کے فعل کو درست کرتی ہے اور فاسد مادّہ کو خارج کرتی ہے۔

۲۔ خون کو صاف کرتی ہے اور خون میں بیماریوں سے مقابلہ کی طاقت بڑھاتی ہے۔

۳۔ کیل، مہاسوں، داغ دھبوں کو دور کرتی ہے اور جلد کو خوشنما بنا لیتی ہے۔

۴۔ خارش کو جڑ سے دور کرتی ہے اور مکمل شفا دیتی ہے۔

۵۔ دورانِ خون میں توازن پیدا کرتی ہے اور خرابیٔ خون سے پیدا ہونے والی بیماریوں سے محفوظ رکھتی ہے۔ قیمت فی شیشی صرف ایک روپیہ

نوٹ:۔ بیرونی استعمال کے لئے ہمدرد مرہم بے حد مفید ہے۔

ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی
Hamdard
DAWAKHANA (Regd.) DELHI

امتہ ابوالحسن

ہم سفر

دور ٹرین نے وسل دی انجن دھواں اڑاتا ہوا پلیٹ فارم میں داخل ہوا میں نے بھاگ پھاند کر ایک جست لگائی سائیس نے گھوڑے کو سنبھال لیا۔ کوشش کے باوجود میں تین منٹ لیٹ ہو چکی تھی اور حد یہ کہ اس گمنام اسٹیشن پر گاڑی بھی صرف تین منٹ ٹھہرتی تھی ۔ ٹکٹ لے کر سوار ہونے تک گاڑی بڑھنا شروع ہو چکی تھی انٹر کلاس کے دروازے میں ایک نوجوان کھڑا ہوا تھا جس نے ہٹ کر جلدی سے مجھے جگہ دی اور گاڑی میں چڑھ کر میں نے پہلا اطمینان کا سانس لیا۔

اپچ۔ پی کا بیج لگائے ہوئے ایک پولیس انسپکٹر نے تیز نظروں سے مجھے دیکھا اور ان دو سیٹوں میں کانا پھوسی شروع ہو گئی جو کان میں سونے کی بالیاں پہنے سیٹ پر بڑے اطمینان سے براجمان تھے دو ایک آدمی اور بھی تھے جن میں سے ایک "اسکرین" دیکھ رہا تھا اور ایک تقریباً اونگھ رہا تھا۔ ڈبے کا ماحول مجھے بڑا خشک اور روکھا لگا ایک اداس سی اجنبیت ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ کچھ دیر تو میں کھڑی باہر کے مناظر دیکھتی رہی پھر تھک کر ایک طرف بیٹھ گئی ۔۔۔۔ ہوا کہساروں کے دامن میں اٹھکیلیاں کر رہی تھی اور ہرے بھرے درخت عجب شانِ استغنا سے سر اٹھائے کھڑے ہوئے تھے۔ مجھے یکایک وہ ساری باتیں یاد آنے لگیں جو بیری تعطیلات کی یادگار تھیں اور جن کا لطف شہر سے دور گاؤں کی سادہ فضا میں رہ کر میں نے حاصل کیا تھا۔ خوابوں کے ایک طویل سلسلے کی طرح جن میں رنگ بھی تھا اور بے کیفی بھی جن میں حسن بھی تھا اور بیزاری بھی۔ میں سوچتی رہی سوچتی رہی سوچتی رہی حتیٰ کہ وہ نوجوان دروازے سے ہٹ کر سیٹ پر آ بیٹھا۔

"کہاں جا رہی ہیں آپ ۔۔۔" اس نے یکایک مجھ سے پوچھا۔

"حیدرآباد ۔۔۔" میں نے اسے بتایا۔

"تب پھر خوشی کی بات ہے راستہ بھر تو آپ کا ساتھ رہے گا ہی" اس نے خود بھی بتایا کہ وہ حیدرآباد جا رہا ہے۔

"یہاں کس لیے آئی تھیں" اس نے زیادہ بے تکلف بننے کی کوشش کی۔

"تعطیلات گذارنے" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"اور مستقل قیام ۔ ؟"
"حیدرآباد ہی میں ہے"
"تو پھر وہاں ملاقات کا موقع ملا کرے گا ۔ ؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔
"جی ۔" میں ہکلا کر رہ گئی۔
"اچھا یہ بتایئے مضمون کیا ہے ۔ ؟"
"کالج کے سوا کوئی اور خاص مضمون نہیں۔"
"کس ایئر میں پڑھتی ہیں آپ ۔ ؟"
"تھرڈ ایئر میں"
"مضامین ۔ ؟"
"ہسٹری ۔ انگلش لٹریچر اور فلسفہ ۔"
"اوہ تب آپ سے بحث خالی از دلچسپی نہ ہوگی" وہ مسکرایا۔
مگر اس وقت مجھے بحث کا موڈ نہ تھا ۔ گاڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی معلوم ہوتا تھا اگر اسی رفتار سے چلتی رہی تو ہم وقت سے بہت پہلے پہنچ جائیں گے مگر میرے اس خیال کے ساتھ ہی اس کی رفتار میں کمی ہوئی اور پھر کچھ آگے بڑھ کر وہ ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر ٹھہر گئی۔ میرے اجنبی ساتھی نے سگریٹ سلگایا اور پھر دروازے میں جا کھڑا ہوا میں نے اپنی کتاب کھول لی اور تھوڑی دیر کے لیے ماحول کی تمام بے رنگی ختم ہوگئی ۔ پتہ نہیں کتنے اسٹیشن آئے اور گذر گئے بڑی دیر بعد میں نے کتاب بند کی تو مجھے اندازہ ہوا کہ ہم حیدرآباد کے قریب آچکے ہیں۔ پولیس انسپکٹر اب بھی متشکی آنکھوں سے مجھے دیکھے جا رہا تھا اور دونوں تو ندیل سیٹھ باتوں سے تھک کر بڑے اطمینان سے سو چکے تھے وہ دونوں آدمی نیند سے جاگ کر اور سگریٹ بند کر کے کسی گرم مباحثے میں مصروف تھے اور میرا اجنبی دوست منہ میں سگریٹ دبائے آنکھیں نیم وا کیے اپنی سیٹ پر بیٹھا نہ جانے کیا سوچ رہا تھا ۔ اس وقت پہلی بار میں نے اسے غور سے دیکھا چہرے کے نقوش خاصے تھے اور بلند قدوقامت کی وجہ سے وہ مکمل طور پر اچھا اثر چھوڑتے تھے اس کے بال بے ترتیب پیچھے سے مختصر مگر سامنے پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے اور بازو سے دیکھنے پر وہ بالکل لاابالی شاعر لگتا تھا جو تفکرات کی دنیا میں کھو کر بھی ہر فکر سے ایک حسن تخلیق کرتا ہو ۔ ایک نظر سب ساتھیوں پر ڈال کر میں اپنی جگہ خاموش بیٹھ گئی ۔ سگریٹ کا ایک لمبا کش لے کر اجنبی اپنی جگہ سے اٹھا اور پھر میرے قریب آکر بیٹھتے ہوئے اس نے پوچھا ۔ "آپ کیا وائلن بھی بجا لیتی ہیں ۔ ؟"
"جی ۔ مگر آپ نے کس طرح جانا ۔" مجھے حیرت ہوئی۔

اس نے میری انگلیوں کی طرف اشارہ کیا کثرت مشق کی وجہ سے خفیف سے نشانات میری انگلیوں پر بہت واضح دکھائی دے رہے تھے۔

"معاف کیجئے میں آپ سے خواہ مخواہ سوالات کیے جا رہا ہوں اگر آپ بیزار ہو جائیں تو بتا دیں۔" اس نے اپنے سوالات کی رفتار کو محسوس کرتے ہوئے خود ہی کہا۔

"ابھی تو میں بیزار نہیں جب ہو جاؤں گی تب آپ کو بتا بھی دوں گی ویسے یہاں اتنی یکسانیت ہے کہ دل خود بخود کسی نئی چیز کے لیے چاہتا ہے۔"

"نوازش" وہ خوشی سے مسکرایا اور پھر اپنا سگریٹ کیس کھولتے ہوئے بولا "دیکھئے میں سگریٹ بہت پیتا ہوں تنہائی کا اس سے اچھا رفیق اور کوئی نہیں غالباً آپ اس پر کوئی اعتراض نہ کریں گی؟"

"نہیں آپ شوق سے پئیں۔"

"مگر یہ تو بتلایئے میں آپ کو کس نام سے جان سکتا ہوں ــــ؟"

"ناہید ــــ"

اس نے جیب سے ایک چٹ نکالی اور قلم سے کچھ لکھ کر میری طرف بڑھا دی: "یہ میرا پتہ ہے اگر آپ کبھی ضرورت محسوس کریں تو مجھے یاد کر سکتی ہیں۔"

میں نے چٹ کو دیکھا سنہرے حروف میں اس پر لکھا ہوا تھا ــــ ممتاز سلیم

۷۹۹۔ بشیر باغ حیدرآباد دکن

میں نے وہ چٹ کتاب میں رکھ لی اور پھر اس سے پوچھا: "آپ کرتے کیا ہیں؟"

"میں انجینئرنگ پڑھ رہا ہوں شام میں کلاس اٹینڈ کرتا ہوں دن میں ورکشاپ جاتا ہوں سوائے اتوار کے فرصت بالکل نہیں ہوتی۔ کالج تو ایک آدھ بار چھوڑ سکتا ہوں لیکن ورکشاپ نہ جاؤں تو فوراً رپورٹ کی جاتی ہے کمبخت کہتے ہیں ایکسپیریئنس میں کمی ہو جاتی ہے ــــ بہت بور ہوتی ہے صاحب طبیعت کبھی تو ــــ"

اس نے پھر ایک بار طویل کش لگایا اور منہ کھول کر سارا دھواں باہر اگل دیا۔ میں نے دل میں سوچا کہاں انجینئرنگ اور کہاں شاعری ــــ مگر اس تضاد کے باوجود اس کے نقش تیکھے اور پُراثر تھے چہرہ دیکھ کر تو کوئی کہہ بھی نہ سکتا تھا کہ وہ اس خشک پیشے میں الجھا ہوا ہوگا۔

"میں نے تو سمجھا آپ شاعر ہیں ــــ" میں نے اسے بتایا۔

"اوہ۔ آپ نے غلط سمجھا شاعر تو نہیں مگر شعر پڑھتا ضرور ہوں ــــ کبیر کے دوہے اور عمر خیام کی رباعیاں مجھے بہت پسند ہیں۔"

یقین کیجئے میں اپنی جگہ سے اچھل کر رہ گئی۔ کبیر کے دوہوں اور عمر خیام کی رباعیوں سے عشق کر کے یہ آدمی ورکشاپ میں کیسے کام کرتا ہوگا ..... میں نے سوچا پھر اس سے بولی ۔" تو پھر آپ اس انجینئرنگ کے پیر میں کیسے پڑ گئے مزے سے لٹریچر پڑھتے اور ادبیات کے اسکالر ہو جاتے ..... ؟"

" ہاں ہو سکتا تھا لیکن آپ جانتی ہیں اس دنیا میں بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں ہم چاہ کر بھی نہیں کر سکتے والد کی تمنا ہے میں انجینئر بنوں بس۔ اب فرصت کے اوقات میں اپنا شوق پورا کر لیا کرتا ہوں " اس نے بڑی سادگی سے مجھے بتایا مگر اس کے چہرے پر غم کی لکیر دور تک کھنچ کر رہ گئی شاید اسے خود افسوس رہا ہو ـــــ

گاڑی سکندرآباد پر رک گئی۔ پولیس انسپکٹر ایک آخری نگاہ مجھ پر ڈال کر اتر گیا دونوں سیٹھ نیند سے چونک کر اپنی جگہ سنبھل گئے، ان دونوں آدمیوں نے اب اپنا مباحثہ ختم کر دیا تھا اور ان میں سے ایک پھر " اسکرین " دیکھنے میں محو تھا۔ میں نے کینٹن بوائے سے دو کپ چائے منگوائی اور پلیٹ کر ممتاز سلیم سے بولی ـــــ " چائے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟"

" میرا خیال ..... ؟ میں تو کبھی کبھار پی لیتا ہوں مگر جب لوگ بہت پیتے ہیں تو انہیں منع بھی نہیں کرتا۔ بات دراصل یہ ہے کہ مجھے چائے کے ذائقے سے زیادہ اس کی نقصان رسانی کا خیال ہوتا ہے ـــ" اس نے مجھے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

میں یکایک خاموش ہو گئی۔

" مگر آپ نے جو چائے منگوائی ہے وہ میں بہت شوق سے پیوں گا " اس نے میری خاموشی کے جواب میں کہا، میں پھر بھی چپ رہی۔ بوائے نے ٹرے میرے آگے رکھ دی میں نے چائے بنا کر اس کی جانب بڑھا دی مجھے رفتہ رفتہ اکتاہٹ کا احساس ہونے لگا میں بے دلی سے گھونٹ لیتی رہی اور بے کیفی سے انھیں اتارتی رہی رات ڈوبے میں آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی۔

" حیدرآباد پہنچ کر بھول تو نہ جائیے گا ـــ ؟" اس نے چائے ختم کر کے مجھ سے پوچھا۔

" اپنی یادداشت سے میں بھی بہت نالاں ہوں آپ کو کوئی گلہ نہ ہونا چاہیئے " میں نے اسے بتایا اس نے پھر سگریٹ سلگایا اور میرے اس غیر متوقع جواب پر اس طرح مجھے دیکھنے لگا جیسے جاننا چاہتا ہو کہ میری بات میں کتنی سچائی ہے۔

" تو آپ بھولتی بہت اور یاد بہت کم رکھتی ہیں ـــ ؟" اس کا لہجہ بڑا طنزیہ تھا۔ " مگر سنیئے اس سے کوئی فرق نہیں پڑ جاتا انسان کی ہر خواہش اپنے عروج پر نہیں پہنچتی مگر زندہ ضرور رہتی ہے " وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس چلا گیا اور بے مقصد نظروں سے باہر دیکھتا ہوا مسلسل دھواں اگلنے لگا۔

مجھے ایک منٹ کو اپنے اندازے میں غلطی ہوئی اور پھر میرا پہلا احساس عود کر آیا گاڑی منزل پر پہنچ کر رک گئی چلنے سے پہلے اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولا "پھر آپ کب ملیں گی کم از کم یہی بتا دیجئے ۔۔؟"

"جب آپ چاہیں میں ضرور آؤں گی ۔۔" مجھے اس کی اداس بے مقصد نگاہیں اچھی نہ لگیں مسرور انسان اداس ہو کر کتنا برا لگتا ہے۔

"تو پھر کل شام آیئے "پیراڈائز" چلیں گے۔" اس نے خواہش کی۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"مگر آپ بھول تو نہ جائیں گی ۔۔؟" اس نے رک کر پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے اطمینان دلایا۔

"اس بات کا فیصلہ کل کیجئے گا۔" اس نے حسب عادت سگریٹ کا لمبا کش کھینچا اور پھر دھواں اڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

رات سفر کی تھکان کی وجہ سے میں بہت غافل سوئی صبح اٹھ کر میں نے خیریت کا اطلاعی خط لکھا اور دن کی معروفیات میں منہمک ہو گئی اتفاق کی بات کہ میں واقعی بھول گئی ساڑھے چھ بجے مجھے ایک دم خیال آیا تیار ہو کر جب میں "پیراڈائز" پہنچی تو سات بج چکے تھے اور وہ انتظار کر کے رخصت ہو چکا تھا۔ مجھے بے حد کوفت ہوئی اچھی خاصی چہل پہل کے باوجود ایسا لگا جیسے میری اس غلطی پر فضا کے ہونٹوں پر بڑا تلخ تبسم تیر رہا ہے ۔۔۔ مجھے اس کے گھر کا پتہ معلوم تھا مگر میں وہاں نہ گئی اور پھر کئی دن گذر گئے اس کی یاد آئی اور رفتہ رفتہ ختم ہو گئی اور پھر ایک حد ایسی بھی آئی جب میرا دماغ اس کے خیال سے یکسر خالی ہو گیا ۔۔۔ کچھ دن بعد میں بمبئی چلی گئی اور ایک ہفتہ بعد جب واپس آئی تو ایک بالکل نئی تحریر میری منتظر تھی، مجھے ایک دم گرے پتلون اور شرٹ کا خیال آیا اور پھر ایک ایسی مسکراہٹ میرے ذہن میں ابھری جس میں ملنی بھی تھی اور نرمی بھی اور ان دونوں کے امتزاج نے اسے ایک عجیب رنگ دے رکھا تھا۔ کپڑے تبدیل کیے بغیر میں نے لفافہ چاک کیا بہت مختصر تحریر اس سے برآمد ہوئی۔

"کل ایک بار نہیں بہت بار آیا میں نے بہت مایوسی اٹھائی مگر پھر ایک بار کل" آپ کا منتظر ہوں اگر تکلیف نہ ہو تو وہیں آجایئے گا۔" سلیم

تاریخ بالکل تازہ تھی میں نے احتیاط سے ذہن نشین کر لیا کہ کل وہاں جانا ہے اور یہ بات کسی حال بھولوں گی نہیں۔" پیراڈائز کے گیٹ پر وہ مجھے دور ہی سے نظر آ گیا۔ نیلی پتلون اور سفید قمیص میں وہ بہت اسمارٹ لگ رہا تھا مجھے دیکھ کر اس نے پوچھا۔ "آپ یہیں آئی ہیں یا کہیں جاتے جاتے میں راہ میں آپ کو نظر آ گیا ؟"

مجھے اس کے شکایتی انداز پر بڑی ہنسی آئی میں نے مسکراہٹ روک کر پوچھا۔ "آپ بہت ناراض ہیں کیا ۔۔؟ حالانکہ یقین مانیے میں نے عمداً ایسا نہیں کیا واقعی بھول گئی۔"

"شکر ہے کہ آج آپ نہیں بھولیں" وہ شکریہ کے طور پر قدرے خم ہوا، ہم اوپر ہال میں جا بیٹھے اس نے چائے کے ساتھ بہت کچھ منگوایا میں نے منع کیا تو کہنے لگا۔ "آپ نہیں کھائیں گی یہ تو مجھے معلوم ہی ہے مگر آتو جانے دیجئے کیا معلوم آپ کو موڈ آجائے ——" اس کا لہجہ اتنا عجیب تھا کہ میں کچھ بول نہ سکی۔

"تو سنائیے کیسی رہی آپ کی اور آپ کا سفر — دلچسپ ہی ہوگی ورنہ آپ اتنے مختصر عرصے کے لیے باہر کیوں جاتیں" اس نے لفظ مختصر کو کافی کھینچ کر کہا۔

تو کیا ایک ہفتہ اتنا طویل ہوتا ہے —— میں نے دل میں سوچا مگر اس سے کچھ بولی نہیں، سفر کی تفصیلات البتہ میں نے اسے بتائیں وہ ٹبرے انہماک سے سنتا رہا مطلوبہ چیزیں آئیں تو اس نے ایک بار بھی مجھ سے کھلنے کی فرمائش نہ کی۔ میں ہی اس کے خیال سے ہر چیز کھاتی رہی البتہ چائے کی کشتی میرے آگے دھکیل کر اس نے خاص طور پر فرمائش کی — "چائے بنائیے"

"چائے" میں نے حیرت سے کہا "آپ کے لیے —؟"

اس نے بڑی گہری آنکھوں سے مجھے دیکھا اور جب میں نے چائے بنائی تو بڑے شوق سے پیتے ہوئے بولا "نہ جانے کیوں مجھے اب چائے کی عادت ہوتی جا رہی ہے، گذشتہ چند دنوں سے جب بھی یہاں آتا ہوں چائے ہی پیتا ہوں" میں نے بغور اسے دیکھا وہ دوسری طرف دیکھتا ہوا ٹبر سے اطمینان سے گھونٹ لے جا رہا تھا میں نے سوچا کہیں یہ شخص سائیکالوجی کا ماہر تو نہیں۔ کس غضب سے ظالم میری سائیکو انالیسس کر رہا تھا اور خود محظوظ ہو رہا تھا — مجھے اپنی حماقت پر کوفت ہونے لگی۔

"آپ سچ مچ جانتی ہیں کتنی بار آپ کی وجہ سے میرا پروگرام خراب ہوا" وہ دفعتاً بولا۔

"میری وجہ سے" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں آپ ہی کی —"

"طبیعت بھلا —؟"

"اس کا جواب تو میرے پاس بھی نہیں اگر ہوتا تو شاید ایک بار بھی میرا پروگرام تبدیل نہ ہوتا —"

"مگر آخر وہ پروگرام تھا کس نوعیت کا —؟"

"گھر سے خط آیا تھا کہ والد کی طبیعت خراب ہے اور وہ میری واپسی کے خواہش مند ہیں —"

"پھر —" میں نے پوچھا۔

"پھر یہ کہ میں نہیں گیا — ورک شاپ کے بہانے بناتا رہا"

اوہ — میرا دل بے تحاشہ دھڑکنے لگا۔

"وہ ہارٹ کے پرانے مریض ہیں میں نے یہاں سے انھیں دوائیاں بھیجیں ایک اسپیشلسٹ ڈاکٹر کو جو میرا بہت دوست ہے روانہ کیا مگر خود آپ سے ملے بغیر نہیں جانا چاہتا تھا۔"

"آپ نے بہت برا کیا ہے" میں نے بے حد افسوس سے کہا۔

"یہ میں جانتا ہوں ـــــ مگر ـــــ"

"مگر کیا ـــــ ؟"

"مگر یہ کہ بعض دفعہ اچھائیوں اور برائیوں پر سوچنے کی مہلت ہی نہیں ملتی سچ پوچھئے تو دل ہی نہیں چاہتا۔"

"اب آپ کے والد اچھے ہیں نا ـــ ؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"جی ہاں آپ کی دعا سے ـــ" وہ مسکرایا۔

ایک نامعلوم اندیشے نے اس کی مسکراہٹ سے سر اٹھایا اور میرا رواں رواں پسینہ میں تر بتر ہو گیا مجھے یہ پوچھنے کی ہمت بھی نہ ہوئی کہ وہ آئندہ کیا کرنے والا ہے ـــ

وہ تھوڑی دیر تک سگریٹ پیتا رہا پھر خود ہی بولا ـــ "اب میں بہت جلد چلا جاؤں گا ـــ" اس بار اس کا لہجہ صاف اور آنکھیں بڑی نرم چمک سے مزین تھیں۔

میں چپ رہی ـ کہتی بھی کیا ـــ

آپ سے ملنے کا قصد کیا تھا وہ پورا ہو گیا کسی دن چھٹی لے کر انھیں دیکھ آؤں گا۔"

خاموشی بڑی ناگوار تھی مگر پھر بھی طاری تھی .....

"آپ خط تو خیر کیا لکھیں گی یاد ہی نہیں رہنا پھر بھی اگر وہاں ٹھہر جاؤں تو یہ پتہ اپنے پاس رکھئے ـ کبھی صاف بادل بھی بڑی گھن گرج کے ساتھ برستے ہیں ـــ" اس نے اپنا پتہ میرے آگے ڈال دیا۔

میری انگلیاں کسی نامعلوم طاقت کے زیر اثر کانپنے لگیں ـــ واپس لوٹ کر میں بہت دیر تک اس شخص کے بارے میں سوچتی رہی کتنا انوکھا اس کا انداز اور کتنی عجیب اس کی وابستگی کی رفتار تھی میرے اپنے دل میں ایک شبہ سر اٹھا رہا تھا .....

مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کب حیدرآباد سے باہر گیا مگر پندرہ دن بعد اس کا ایک خط ملا جو بدستور بہت مختصر مگر بڑا معنی خیز تھا۔

"میں دل سے دور پہنچ گیا اس کی دھڑکن کا کوئی اندازہ مجھے قطعاً نہیں والد صاحب اب روبہ صحت ہیں میں تہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوں اگر پہنچ گیا تو آکر تم سے ملوں گا۔" سلیم

میں گھنٹوں اس کی تحریر میں کھوئی رہی نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا طبیعت خود بخود اداس تھی اور کوئی وجہ اس اداسی

کی میری سمجھ میں نہ آتی تھی۔ مختلف خطوط آئے رکھے تھے میرے اپنے کئی پروگرام نامکمل پڑے تھے مگر نہ کوئی توجہ میری ان کی جانب تھی نہ کسی اور طرف۔ دل جیسے خالی ہوگیا تھا صرف ایک ہی وسوسہ تھا جو رہ رہ کر سر اٹھاتا تھا اور جسے میں جان بوجھ کر کچل رہی تھی.....

کچھ دن بعد وہ اچانک مجھے آملا ہم "ٹینک بنڈ" پر ٹہلنے گئے۔ چاندنی ہر طرف کھیت کر رہی تھی پانی کی لہریں چمکیلے تاروں کی طرح بہہ رہی تھیں۔ وہ بہت مضمحل تھا۔

"کب آئے آپ ــــ؟" میں نے پوچھا۔

"کل رات کو"

"کیسے ہیں آپ کے والد ــــ؟"

"وہ چل بسے ــــ"

حیرت نے مجھے لڑکھڑا دیا "مگر آپ نے تو لکھا تھا وہ صحت میں ہیں ــــ؟"

"ہاں مگر ہارٹ کے مریضوں کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا ہر وقت ان کے لیے نازک ہوتا ہے وہ کہیے میں ان تک پہنچ گیا ورنہ عمر بھر بے آرام رہتا ــــ"

کسی نامعلوم غم سے میری ہتھیلیاں جلنے لگیں مجھے ایسا لگا جیسے اس موت میں کچھ حصہ میری لاپرواہی کا بھی ہے حالانکہ ایسا قطعاً نہ تھا۔

اس نے یکایک میری پریشانی کو محسوس کیا اور پھر بڑے تسلی آمیز لہجے میں کہنے لگا "پریشان نہ ہو۔ موت ہر قوت سے آزاد ہے وہ کسی طاقت کے زیر اثر نہیں اگر تم یہ سوچتی ہو کہ یہ صرف میرے نہیں جانے سے ہوا تو یہ ایک دم غلط ہے انھیں کوئی شوک نہ تھا جب وہ مرے میں ان کے پہلو میں تھا اور ان کا دل مجھ سے زیادہ مطمئن ــــ"

اس نے مجھے غور سے دیکھا میری جسمانی حرارت کو محسوس کیا اور پھر اٹھتے ہوئے بولا "چلو چائے پئیں گے، تمھیں شاید سردی ہو رہی ہے اور میں خود بہت تھکا ہوا ہوں ــــ"

پھر آئندہ ملاقات میں اس نے بتایا ــــ میرا ارادہ مستقل طور پر حیدرآباد چھوڑ دینے کا ہے ــــ"

"کیوں ــــ" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اب اس اجڑے دیار میں دل نہیں لگتا ــــ"

"مگر تمھیں تو ڈگری حاصل کرنے صرف ایک سال ہی رہ گیا ہے۔"

"مجھے ڈگری کی فکر نہیں ــــ"

میں بے تاب خلاؤں میں گھورنے لگی زندگی کی چہل پہل مستقبل کی امیدیں اس وقت کتنی ناگوار تھیں ــــ

میرے ساتھ تھوڑی دیر تک وہ بھی چپ رہا پھر بولا ــــ "سنا تمھاری شادی ہو رہی ہے ــــ ؟"
اوہ مجھے دفعتاً یاد آگیا یہ ایک پرانا سلسلہ تھا جو اب نئے سرے سے ابھر رہا تھا۔ "تمھیں کس نے کہا" میں نے پوچھا۔
"اس سے کوئی بحث نہیں بات غلط ہے یا صحیح یہ بتاؤ ــــ ؟"
"کچھ غلط کچھ صحیح ــــ"
"مطلب ــــ" وہ ہکلایا
"مطلب یہ کہ والد چاہتے ہیں مگر میں نہیں چاہتی ــــ"
"اوہ ــــ" وہ ہنسا "تب پھر یقین ہے ــــ" اس نے یقینی لہجے میں کہا"
"کس بات کا ــــ"
"کہ تمھاری شادی ہو جائے گی ــــ"
مجھے اس کی بے اعتباری پہ غصہ آنے لگا بات لاکھ صحیح تھی مگر اس سے زیادہ صحیح استدلال کے ہوتے ہوئے میں خاموش ہو گئی۔
"مگر سنو یہ کوئی بات نہیں ایسا تو ہوتا ہی ہے بہت سی باتیں یکایک ہو جاتی ہیں ان کے نتائج بھی ایسے ہی غیر متوقع ہوتے ہیں مجھے اس کی امید تو کبھی تھی ہی نہیں کہ تم مجھے ملو گی پھر بھی اس کا گمان نہ کر کہ اتنا جلد کھو جاؤ گی اب جب یہ صورت سامنے ہے میں تم سے کہتا ہوں مجھے صرف یاد رکھنا اگر بھول جاؤ گی تو اس سے بڑا کوئی المیہ نہ ہوگا۔ میں تمھیں ہر غرض سے بالا ہو کر چاہنے لگا ہوں اور تم سے بھی یہی توقع رکھتا ہوں کہ مجھے ہر دم اپنا دوست سمجھو گی صرف ایک مخلص دوست شاید کبھی ــــ زندگی کے کسی زرین لمحے میں تمھارے کام آسکوں" اس نے سگریٹ دور پھینک دیا کوشش کے باوجود اس کی آنکھوں میں ستارے کانپنے لگے۔
مجھے اپنے سینے میں کوئی چیز چبھتی ہوئی محسوس ہوئی جس ضبط سے میں نے خاموشی کو قائم رکھا تھا وہ ایک تیز جھکولے سے آپ ہی آپ ٹوٹ گئی۔ میرے آنسو دیکھ کر وہ مسکرایا ــــ "بہت نرم دل ہو اس میں رونے کی کیا بات ہے ضبط کرو ضبط میں اتنا اچھا آدمی نہیں کہ تم میرے لیے آنسو بہاؤ میں بہت خشک ہوں تمھیں اس خشکی سے کئی بار واسطہ پڑا ہے پھر بھی تم سمجھ نہیں پاتیں نادان لڑکی۔ ہر چمکنے والی چیز ہوا نہیں ہوتی جو ستارے آسمان سے ٹوٹ چکے ہیں ان کا ماتم نہیں کیا جاتا دیکھنے کے لیے اور بھی تو لاکھوں ستارے ہیں ــــ"
میرا سارا ضبط جاتا رہا دل سینے میں بیٹھتا محسوس ہوا اس کی باتوں میں کتنی خلش تھی اور کتنی پُرجوش کشش۔ آس پاس کا خیال کیے بغیر میں نے اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "بس کرو اب بس بھی کرو میں اتنی حوصلہ مند نہیں۔"
"اچھا اسی بات پر ہنس دو مجھے خود اس تلخی کا احساس ہے مگر بچھڑنے سے پہلے تمھیں یہ سب کچھ کہنا بہت ضروری

معلوم ہوا ۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آگیا ۔ "چلو کچھ دیر ٹہل آئیں " اس نے اپنی تھرتھراتی انگلیاں میرے بازو پر رکھ دیں۔

بہت دیر تک ہم ساتھ ساتھ ٹہلتے رہے کھلی ہوئی تازہ ہوا اور شگفتہ فضا نے زخم پر مرہم کا کام کیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ جوش بھی کم ہوا اور غم بھی۔ وہ پھر مسرور نظر آنے لگا۔ لوٹنے سے پہلے میں نے کہا "وعدہ کرو"

"کس بات کا؟"

"کہ ایسے خیالات کو دل میں جگہ نہ دوگے ۔"

"آخر ہو نا لڑکی" وہ ہنسا اس کی ہنسی بھی اس کی طرح بعید از فہم تھی۔

"چاہے جو کچھ ہوں مگر ۔"

"مگر وگر کچھ نہیں اب اس سلسلے کو تازہ نہ کرو میں نے کوئی بات چھوڑی نہیں اور جتنا کچھ کہا وہ غلط نہیں کہا۔"

مجھے ایک دم پھر اداسی نے آگھیرا۔ وہ چپ چاپ مٹیالا پانی میں کنکریاں پھینکتا رہا پھر مجھے مغموم دیکھ کر بولا "اچھا بتاؤ وہ کیا بات ہے، تمہاری خاطر وعدہ کرلوں گا۔"

"نہیں جبر سے کیا فائدہ ۔؟"

"پاگل نہ بنو تمہیں چھوڑ بھی تو جبر سے رہا ہوں پھر اگر پانے کے لیے اپنے آپ پر جبر کرنا پڑے تو مشکل کیا ہے ۔"

میں چپ رہی ۔

دیکھو اب جھٹ پٹ بول دو تم سمجھتی ہو میں بہت ضابط ہوں مگر جو پیڑ اوپر سے بہت تناور نظر آتے ہیں وہ اندر کبھی کبھی کھوکھلے ہوتے ہیں اب بہت دیر آدھا ہو گی تو چوٹ پڑوں گا۔"

"تو پھر وعدہ کرو کہ اپنی ٹریننگ ضرور پوری کروگے۔ اور ڈگری حاصل کیے بغیر کہیں نہ جاؤ گے ۔"

"اگر نہ حاصل کروں تو کیا فرق پڑے گا ۔؟"

"بہت ۔" میں نے اسے یقین دلانا چاہا۔

"کچھ بھی نہیں وہ بے تعلقی سے بولا۔ "جو چیز آج مر رہی ہے اسے ایک سال تک خواہ مخواہ جلا جلا کر زندہ رکھنا تو فضول ہے مگر جب کوئی چیز مر ہی نہیں رہی ہے تو اس کے متعلق غلط سوچنا بھی فضول ہے ۔"

"تو پھر کیا یہ ساری بکواس تھی ۔؟" وہ بچوں کی طرح کشمکش میں پڑ گیا۔ "دیکھو بھئی بات سیدھی کرو، میں نے کہا نا اس وقت نارمل حالت میں بالکل نہیں اس لیے کوئی بات بھی صبر کے ساتھ نہیں سن سکتا۔"

"تو پہلے نارمل حالت میں آجاؤ ۔"

"پھر ۔" سگریٹ اس کے ہونٹوں میں کانپنے لگا۔

"پھر تمھیں یقین آجائے گا ۔"

"کس بات کا ۔ ؟"

"جس بات سے تم غیر مطمئن ہو ۔"

"نہیں یہ شاید تم جذبات میں کہہ رہی ہو۔ مجھ پر رحم کھا کر مگر میں ایسے غلط رحم کا قائل نہیں ۔"

"اچھا ہی ہوا کہ تم نے فلسفہ نہیں پڑھا ۔"

"کیوں ۔ ؟"

"پھر دوسروں کا جینا مشکل تھا ۔" میں نے اسے بتایا کہ اتنی بے اعتباری اچھی نہیں ہوتی کم از کم اب اس موڑ پر اسے میری ہر بات مان لینا چاہیئے ۔

"مگر تم دریا کی طرح فانوں سے سنبھل نہ سکو گے، بہت نازک ہو مجھے یقین ہے یہ تم نہیں تمھاری نرم دلی بول رہی ہے وہ بھی صرف وقت کی خاطر ۔" وہ اب بھی مایوس تھا ۔

"تم اس کا غم نہ کرو میں بہت مضبوط ہوں اور وقت کے تقاضوں سے خوب واقف ۔"

"دیکھو پھر مجھ ہی کو الزام دو گی ۔ ؟!"

"نہیں کبھی نہیں ۔"

"مجھے آزما رہی ہو کیا ۔ ؟" وہ پھر کشمکش میں پڑ گیا ۔

"کبھی تو بحث چھوڑ دو ۔" میں نے زچ ہو کر کہا ۔

"تو پھر یہی بات ۔ ؟" وہ ہاتھ بڑھا کر بولا ۔

"پکی ۔" میں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا ۔

"تو پھر آزمالوں تمہاری مضبوطی ۔ ؟" اس نے پوچھا ۔

"ضرور ۔"

بڑی گہری نظروں سے اس نے مجھے دیکھا زندگی کا سارا رس اس کی آنکھوں میں اتر آیا بڑی آہستگی سے وہ میری طرف بڑھا اس کے تکیے تقش اور دلکش بن گئے پھر اس کی مستی کے نامعلوم اثر نے مجھے غافل کرنا شروع کیا یہاں تک کہ میں اپنے آپ کو بھولنے لگی ۔ اپنے اطراف کو بھولنے لگی صرف ایک ہی بات یاد رہ گئی ۔ اس کے ہونٹوں کا لطیف لمس جو مجھے آہستہ آہستہ تحلیل کر رہا تھا ۔

ہربنس سنگھ دوست

پیسے کا کھیل

جب ٹرام دوبارہ اپنی رفتار میں آگئی تو اچانک اسے جیسے ہوش آگیا۔ وہ تو اپنے اسکول سے کافی آگے نکل آئی تھی۔ خوب عورت تھی وہ بھی، اپنے خیالات میں کچھ ایسی مگن رہی کہ یہ بھی یاد نہ رہا کہ اس کا اسکول پیچھے رہ گیا۔ اسکول شروع ہونے میں ابھی دیر تھی اور آج وہ معمول سے ذرا پہلے بھی نکل آئی تھی اس لیے بجائے گھبرانے یا پریشان ہونے کے وہ اپنے آپ مسکرا پڑی۔ وہ اپنے بچے کا مستقبل سنوارنے کے لیے کتنی فکرمند ہے۔ خدا جانے وہ کل اسے جانے گا بھی کہ نہیں۔ لیکن جانے گا کیوں نہیں۔ اس کا بیٹا تو ایک بہت بڑا انسان ہوگا..... وہ اس قسم کی باتیں سوچتی رہی کہ اگلا اسٹاپ آگیا۔

ٹرام سے اترنے کے بعد وہ واپس اسکول کی طرف چلنے لگی۔ آج اس کی تنخواہ کا دن تھا..... تنخواہ تو خیر اسے اس سے پہلے بھی ملتی تھی لیکن اس ماہ کی تنخواہ کے تصور سے اُسے جو ایک مسرت سی ہو رہی تھی اس کی وجہ کچھ اور ہی تھی۔ وہ اپنے چاند سے بیٹے کو دنیا کی تمام بڑی جگہوں اور گندی فضاؤں سے دور رکھنا چاہتی تھی کیوں کہ وہ چاہتی تھی اس کا بیٹا ایک بہت بڑا انسان بنے اس لیے اس کی خواہش تھی کہ وہ بچے کو انگریزی اسکول میں داخل کروائے۔

پچھلے تین برسوں سے وہ ایک قریبی اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ لیکن جانے کیوں اسے ان اسکولوں سے چڑ سی ہوگئی تھی حالانکہ وہ خود بھی ایسے ہی ایک اسکول میں استانی تھی۔ جب سے اس نے اپنے بچے کو ایک عام اسکول میں داخل کروایا تھا تب سے وہ سوچ رہی تھی کہ موقع ملتے ہی وہ اسے ہٹوا کر انگریزی اسکول میں داخل کروا دے گی۔ کتنے اچھے بچے ہوتے ہیں وہاں کے۔ ایک لباس، ایک ڈھنگ، چلتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان تمیز مستقبل جا رہا ہے۔

اس کا خاوند زندہ نہیں تھا۔ بچہ اس وقت دو سال کا ہی تھا جب وہ ایک حادثے کا شکار ہوگیا تھا۔ اس کے بعد ہی تو اسے اسکول میں نوکری کرنی پڑی تھی۔ کیوں کر کسی نہ کسی طرح آخر گذارہ تو کرنا تھا نا۔ یہ بچہ اس کی تیس سال کی آرزوؤں اور تمناؤں کا مرہون منت تھا۔ اور وہ چاہتی تھی کہ وہ اس کے مستقبل کے سنوارنے میں اپنی

طرف سے کوئی کسر نہ اٹھا رکھے۔ وہ تو شروع میں ہی اسے انگریزی اسکول میں داخل کروانا چاہتی لیکن ان دنوں کوشش کے باوجود بھی وہ وہاں کی داخلہ فیس کا انتظام نہ کر سکی کیوں کہ عام اسکولوں کے مقابلے میں وہ کہیں زیادہ تھی۔ اور تقریباً ہر سال داخلوں کے وقت کچھ ایسے ہی حالات آ جاتے کہ وہ لاکھ کوشش کرتی لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو پاتی۔ . . . . . اسی طرح تین سال گزر گئے۔ ہر ماہ کوئی نہ کوئی ضرورت کھڑی رہتی۔ مرحوم شوہر کے قرض ادا کرنے پڑتے۔ اپنی اور بچے کی ضرورتیں پوری کرنی پڑتیں اور اسی طرح اس کے وہ ستر پچھتر روپے ختم ہو جاتے جو اسے اسکول کی طرف سے ملتے تھے۔

انگریزی اسکولوں میں داخلے شروع ہوئے کئی دن ہو گئے تھے۔ اور اس نے اس بات کا تہیہ کر لیا تھا کہ چاہے کچھ ہو اس بار داخلے کے بند ہونے سے پہلے پہلے وہ بچے کا نام لکھوا دے گی۔ داخلوں کی آخری تاریخ چھٹی تھی اور آج پہلی تھی۔ آج تنخواہ لینے کے بعد پہلا کام وہ یہ کرے گی کہ کسی سکے ہاتھ سے اس انگریزی اسکول کا داخلہ فارم منگوا لے گی، تاکہ کل اسے کسی قسم کی دقت نہ ہو۔

احتیاطاً کچھ دن پہلے وہ اس اسکول کی ایک اُستانی مس بھارد واج سے ملی تھی، جو بہت دنوں سے اس کی شناسا تھی۔ اُس نے مس شیلا سے بات چیت کر کے اچھی طرح معلوم کر لیا تھا کہ اس کا بیٹا اگر محنت کرے تو وہ اسی سال دو جماعتیں پاس کر سکتا ہے۔ وہ گھر میں بھی بچے کو بچپن سے انگریزی پڑھاتی رہی تھی، اس لیے اسے یقین تھا کہ اس کا بچہ ایک سال میں دو جماعتیں ضرور پاس کر لیگا، اور اس طرح جو تین سال اُس نے ایک قریبی اسکول میں ضائع کیے اُس کی بھی پوری ہو جائے گی۔

وہ اسکول پہنچ گئی۔ دوسری استانیاں بھی آ گئی تھیں اور آج پہلے کے مقابلے میں زیادہ خوش و خرم نظر آتی تھیں۔ اور کوئی نئی آنی جانی ہوا نہیں آتی سوائے کم از کم وہ نو انظر آ رہی تھی۔ پہلی گھنٹی لگی اور وہ اپنی کلاس میں چلی گئی۔ اس اسکول کا قاعدہ تھا کہ تنخواہ کے روز سات کلاسوں کے بجائے صرف پانچ کلاسیں ہوتی تھیں تاکہ بعد میں تنخواہیں وغیرہ اطمینان سے بانٹی جا سکیں ظاہر ہے اس طرح عام دنوں سے اسکول کا وقت تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کم ہو جاتا تھا لیکن اسے یوں معلوم پڑ رہا تھا جیسے عام دنوں کے مقابلے میں وقت کہیں زیادہ لگ رہا تھا۔ جتنی دیر میں اسکول کا پورا وقت گذر جاتا تھا، اتنی دیر میں آج جیسے ایک پیریڈ گذرتا تھا۔ کئی بار اس نے کلاس میں اپنے دل کو لگانے کی کوشش کی۔ کئی بار اسٹاف روم میں بیٹھ کر اخبارات و رسائل میں کھونے کی کوشش کی، لیکن اس کا من . . . . . اس طرف نہ لگتا تھا نہ لگا۔ اس کا دل تو یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح یہ پانچوں پریڈ ختم ہوں، اور وہ تنخواہ لے کر یہاں سے نکلے۔ ایک لڑکے کے ذریعہ اس نے انگریزی اسکول کا داخلہ فارم بھی منگوا لیا تھا، جس نے اس کی پریشانی کو بجائے کم کرنے کے بڑھا دیا تھا۔ اس نے اس میں بچے کا نام وغیرہ بھی پُر کر دیا تھا لیکن وہ چاہتی تھی کہ کیوں نہ آج ہی مس شیلا سے سیدھا ایک بار مل لے، اور کچھ مزید

معلومات حاصل کرلے اور اگر ممکن ہو تو آج ہی اپنے بچے کا داخلہ بھی کروالے۔

خدا خدا کر کے پانچوں پریڈ ختم ہوگئے، اور تنخواہیں بھی مل گئیں۔ سب تنخواہیں لینے جا رہے تھے تو اس کا دل چاہتا تھا یہ اڑ کر سب سے پہلے ہیڈ مسٹرس کے کمرے میں چلی جائے۔ شاید وہ پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ رفتار سے چل رہی تھی تو سنہرا کمر جی نے کہا تھا۔ "کیا بات ہے آج تو بالکل ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو" اور وہ جواب میں کچھ کہنے کے بجائے جھینپ سی گئی تھی۔

اسکول سے نکلتے ہی اس نے بس پکڑی اور انگریزی اسکول پہنچی۔ مس شیلا سے ملاقات بھی ہوگئی اور بہت دیر تک باتیں بھی ہوئیں۔ لیکن پتہ چلا کہ داخلے کے لیے بچے کو ساتھ لانا ہوگا۔ مس شیلا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ٹھیک تو ہے۔ اس طرح آپ کل آئیں گی تو نا۔ اور ہمیں آپ کے درشن کرنے کا ایک موقع اور ملے گا"

کچھ بھی ہو۔ انگریزی اسکول سے نکلنے کے بعد اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا ایک اچھا خاصا بوجھ کم ہوگیا۔ وہ تو سوچ رہی تھی اس بار تنخواہ میں سے بچے کے داخلے کے بعد شاید ہی کچھ بچے۔ لیکن اسے یہ جان کر مسرت ہوئی کہ اس بار تنخواہ میں سے تقریباً اس کے تیس روپے بچ جائیں گے۔ یہ اس کے لیے اچھی خاصی مسرت تھی کیوں کہ ایک تو پہلے سے اس نے ساری بیاری کی تھی، دوسرا اس بار سارے ماہ کا فریج چلانے کا ڈھنگ جو اس نے سوچا تھا، اس کے مطابق اسے تنخواہ میں صرف دس روپوں کی ضرورت تھی۔ اب جب اسے پتہ چلا کہ اس کے پاس تقریباً تیس روپے بچتے ہیں تو ان تیس روپوں کے لیے اس کے ذہن میں کئی خیال آنے لگے۔ کبھی سوچتی اپنی ایک ساڑی خرید لے۔ اس کے پاس کوئی اچھی ساڑی نہیں ہے۔ کبھی سوچتی کیوں نہ بچے کے لیے ایک سویٹر خرید لے ان دنوں جو سویٹر وہ پہن رہا ہے اس میں کوئی خاص جان نہیں۔ غرض کہ اس کے چیسٹر میں پڑے روپے جن میں تیس روپے اس کی مرضی کے غلام تھے اس طرح معلوم پڑتے تھے جیسے ایک خزانہ ہیں۔ بازار سے وہ گذر رہی تھی اور ہر چیز اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔

شام ہو رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ سردی میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ اس نے چیسٹر سے اپنے جسم کو اچھی طرح چھپالیا۔ سامنے کسی انگریزی فلم کا پوسٹر لگا ہوا تھا جس میں ایک عورت دو خوبصورت بچوں کی انگلی تھامے چلی آرہی تھی وہ اپنے بچے کو اسی طرح دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ بہت دیر تک ٹکٹ ہاتھ کھڑی اس تصویر کو اور خصوصاً اس میں کے داہنے بچے کو دیکھتی رہی۔ جانے وہ کب تک دیکھتی رہی کہ اچانک دو بھکاری بچے اس کے سامنے آگئے اور بار بار کر بھیک مانگنے لگے۔ پوسٹر کے خوبصورت بچوں کے بعد ان بھکاری بچوں کو دیکھ کر اسے عجیب سا خیال آیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اچانک آسمان سے زمین پر آگری ہو۔ پھر جانے کیوں وہ کچھ دیر تک انھیں بغور دیکھتی رہی، اس کے بعد جیسے لاشعوری طور پر اس کا ہاتھ اپنی جیب میں چلا گیا، اور اس نے ایک پیسہ نکال کر بچے کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ دونوں

بچے چلے گئے لیکن پھر بھی وہ کھڑی سوچتی رہی کہ بھگوان نے پیسہ بھی کیا چیز بنائی ہے۔ ساری دنیا پیسے ہی کا ایک کھیل ہے اگر پیسہ ہے تو دنیا کی ہر چیز ہمارے قدموں میں ہوتی ہے، اور پیسہ نہ ہو تو ہم خود بھی اپنے پاس نہیں ہوتے۔

وہ بچپن سے ہی بہت رحم دل اور جذباتی واقع ہوئی تھی۔ کسی کا دکھ وہ دیکھ نہیں سکتی تھی۔ کسی کی پریشانی اگر اس کے دل میں گھر جاتی تھی تو اسے کئی کئی دنوں تک پریشان رکھ سکتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ان بھکاری بچوں کو دیکھ کر وہ کیا کیا سوچنے لگی تھی۔ اس کی عادت تھی کہ دوسرے کی حالت کا وہ ہمیشہ اپنے ساتھ موازنہ کرتی جس سے ہوتا یہ کہ وہ قدرے جذباتی ہو جاتی۔

وہ اسی طرح سوچتے سوچتے سامنے کی ایک دکان میں داخل ہو گئی۔ دکان میں چہل پہل تھی، لیکن بھیڑ نہیں وہ اطمینان سے یکے بعد دیگرے مختلف چیزوں کو دیکھنے لگی۔ دکان کافی بڑی تھی اور اس میں تقریباً وہ تمام چیزیں مل سکتی تھیں جن پر آج اس کا دل آ سکتا تھا۔ ایک کے بعد دوسری چیز پر اس کا خیال جاتا، دوسری کے بعد تیسری پر۔ اسی طرح وہ مختلف چیزوں کو دیکھتی رہی ..... پیسہ ایک ایسی چیز ہے کہ جب تک اس کو استعمال کرنے نہ نکلیے اس کی قدر معلوم نہیں ہوتی۔ اگر تخیل کی آنکھ سے پیسے کو دیکھا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ہم اس سے ساری دنیا خرید لیں گے لیکن جب ہم خریدنے لگتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ تو پسند کی ایک چیز خریدنے کے لیے بھی ناکافی ہے ..... یہی آج اس کے ساتھ ہوا۔ جو چیز وہ خریدنا چاہتی اس کے سامنے یہ پیسے کم معلوم ہوتے۔ بہت دیر تک وہ ایک سے دوسری اور دوسری سے تیسری چیز کی طرف جاتی رہی۔ آخر کار اس نے بچے کے لیے پچیس روپے کا ایک سوٹ خرید لیا، اور باہر نکل آئی۔ کچھ بھی ہو۔ سوٹ اس کی پسند کا تھا، اور اس نے آج کی مسرت میں کہیں زیادہ اضافہ کر دیا تھا۔

وہ دکان سے نکل رہی تھی تو سوچ رہی تھی کہ ایک بچے کو اس موسم میں جیسے کپڑے ملنے چاہئیں، ویسے اب اس کے بچے کے پاس ہو گئے ہیں۔ اب ان سردیوں کا کوئی اثر اس پر نہ ہو گا۔ اب جب وہ انگریزی اسکول میں جائے گا تو یوں بھی اسے اچھے کپڑے پہننے چاہئیں۔ وہاں اچھے لوگوں کے بچے آتے ہیں۔ یہ کپڑے جب وہ پہنے گا تو یقینی بڑا خوبصورت اور دلکش لگے گا۔ اور کسی طرح بھی دوسرے بچوں سے کم نہ ہو گا۔

وہ ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اس نے دور سے ایک لڑکے کو دوڑ کر آتے دیکھا۔ پھر اس نے دیکھا: ایک موٹا سا آدمی ایک ڈنڈا لیے اس کے پیچھے دوڑ رہا ہے، اور ننگ دھڑنگ لڑکا جس کی عمر بمشکل نو برس ہو گی یعنی اس کے بچے کے لگ بھگ اور جو ایسے موسم میں صرف ایک نیکر اور ایک بوسیدہ سی بنائن پہنے ہوئے ہے اس شخص سے بچنے کے لیے وہ اپنی پوری طاقت سے دوڑ رہا ہے۔ آدمی عجیب عجیب گالیاں بکتا اس کا پیچھا کر رہا ہے، اور بچے کے چہرے سے جیسے کسی نے جان نکال لی ہو، ایک رنگ آتا ہے اور دوسرا جاتا ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے بچہ اس کے پاس آ گیا۔ آدمی بھی فوراً وہاں پہونچ گیا۔ بچہ اس کے پاس آتے ہی اس

شخص سے بچنے کے لیے اس سے لپٹ گیا، اور روتا ہوا بولا "ماں جی، مجھے بچایئے۔ یہ مجھے مار ڈالے گا۔"

بچے کا سانس بڑی بری طرح پھولا ہوا تھا۔ خوف سے معلوم پڑتا تھا وہ بے طرح کانپ رہا ہے۔ اس نے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا، اور اس آدمی سے جو لٹھ لیے کھڑا ہانپ رہا تھا، پوچھا۔

"کیوں بھائی، تم کیوں مار رہے ہو اسے؟"

"آپ نہیں جانتیں بی بی جی۔ یہ بہت شیطان ہو گیا ہے۔" اس نے میری محنت کی کمائی کے بیس روپے گنوا دیئے۔"

"جو گر ہی ہو گئے ان کا کیا ہو سکتا ہے۔ تم کیا اب اس کی ہڈیوں سے لگا لو گے؟" اس نے بڑی نرمی سے پوچھا۔

"ہاں ہڈیوں سے لگا لوں گا۔" اس نے بچے کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹنا چاہا۔ بچہ زور زور سے چیخنے لگا، اور کسی طرح اپنا بازو چھڑا کر اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔ وہ برابر سسک رہا تھا۔ آدمی پر جیسے خون سوار تھا۔ وہ اس طرف لپکا لیکن لڑکا اچھل کر پھر آگے آ گیا۔ اس نے آدمی کو بہت روکا۔ اور لوگوں نے بھی اسے سمجھایا، لیکن وہ باز نہ آیا۔ بچہ کچھ دیر تک اس طرح بچنے کی کوشش کرتا رہا لیکن جب اس نے دیکھا کہ یہاں بچاؤ مشکل ہے تو وہ پھر بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ شخص بھی فوراً لٹھ لیے گالیاں دیتا ہوا اس کے پیچھے ہو لیا۔

وہ سوچنے لگی: پیسے کے لیے یہ آدمی اپنے بچے پر بھی ترس نہیں کھاتا۔ ایک میں ہوں کہ اپنے بچے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار رہوں۔ اور ایک یہ آدمی ہے کہ بیس روپوں کے لیے اپنے بچے کا خون پینے پر تلا ہوا ہے۔ وہ بہت دیر تک اس بچے کے بارے میں سوچتی رہی اور آہستہ آہستہ جلتی رہی۔

وہ پہلا موڑ مڑی ہو گی کہ اس نے دیکھا۔ بچہ پھر آگے آگے دوڑا آ رہا ہے اور وہ آدمی اسی طرح اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ جانے کیوں اس کا دل بری طرح بیٹھنے لگا۔ بچے کی یہ حالت اس سے نہ دیکھی گئی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس آدمی کو بلائے گی، اور اسے بیس روپے ادا کر دے گی تاکہ یہ معصوم بچہ اس مصیبت سے چھٹکارا پا سکے۔ اس کا بیٹا انگریزی اسکول میں نہیں پڑھ سکتا تو نہ سہی۔ وہ ایک معصوم بچے کو اس حالت میں نہیں دیکھ سکتی۔

لیکن شاید اس کے بیٹے کی قسمت میں انگریزی اسکول لکھا تھا۔ وہ آدمی اور بچہ دوسری گلی میں مڑ گئے اور اس کار نیک کی خواہش اس کے دل میں گھٹ کر رہ گئی۔

وہ اس بچے کے بارے میں سوچ رہی تھی اور آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اس بچے کے خیال نے اسے پریشان کر دیا تھا، اور بازار کی ہر چیز جو تھوڑی دیر پہلے اسے قدرے حسین اور دل فریب معلوم ہٹ رہی تھی، اب اس طرح معلوم پڑ رہی تھی جیسے ہر ایک پر ایک ملمع سا چڑھا ہوا ہے، اور نیچے سے اس کا بھدا پن جھلک رہا ہے۔ بازار کی تمام چیزیں اسے صرف گوٹیاں معلوم پڑ رہی تھیں، جو اپنے وجود سے پیسے کے کھیل کو جاری رکھتی ہیں۔ یہ ساری دنیا اس

کھیل ہی پر قائم ہے۔ کوئی اپنا سب کچھ لٹا کر پیسہ حاصل کرتا ہے اور کوئی اپنی ساری دولت۔ سارے پیسے کے عوض اپنی ادنیٰ سی خواہش کو پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور وہ کبھی پوری ہوتی ہے کبھی نہیں۔

رہ رہ کر اس کی آنکھوں کے سامنے اس غریب بچے کا چہرہ آجاتا۔ جو اس کے سینے پر ایک گھونسے کی طرح لگتا۔ ..... جانے اس غریب بچے کا خیال اسے کب تک پریشان کرتا کہ وہ اپنے گھر پہنچ گئی۔ اس کا بچہ کمرے میں بیٹھا سبق یاد کر رہا تھا۔ دھیمی دھیمی روشنی میں اس کا ذہین چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ اس سے لپٹ گیا۔ بچے کے لپٹنے پر اسے اس طرح محسوس ہوا جیسے ایک کھوئی ہوئی دولت اسے مل گئی ہے اس نے اسے سینے سے لگا لیا۔ ایک تو اس کا ذہن پہلے ہی پریشان کن خیالات سے بوجھل تھا۔ دوسرا بچہ اس سے اس طرح لپٹا کہ اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ اس نے بار بار اسے سینے سے لگایا۔ اس کے ماتھے پر بوسوں کی ایک بوچھار سی کر دی۔

جب اس کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا تو اس نے بچے کو وہ خوبصورت سوٹ دکھایا جو وہ بڑے شوق سے اس کے لیے لائی تھی۔ اور پھر بڑی مسرت سے وہ داخلہ فارم جو اس وقت اس کی سب سے محبوب چیز تھی اور جس کو بھرنے کے لیے وہ لگاتار تین برسوں سے کوشاں تھی، نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ لیکن جیب میں نہ داخلہ فارم تھا، نہ وہ روپے جس پر اس کی ساری مسرتوں کا دارومدار تھا۔ غریب بچے اور بے رحم باپ کی اداکاری اپنا کام کر گئی تھی۔ ..... اُسے یوں لگا جیسے دفعتاً دنیا نے بڑی تیزی سے گھومنا شروع کر دیا ہے، اور ہر چیز ایک دوسرے سے گڈمڈ ہوتی جا رہی ہے۔

حیدرآباد میں شہر کا قدیم ترین ہوٹل

عزیزیہ ہوٹل ہے

جہاں صبح و شام ہندوستانی طریقے سے ماہر خانساموں کے ہاتھوں تیار کیے ہوئے کھانے مل سکتے ہیں۔ صفائی اور پاکیزگی اس ہوٹل کا امتیازی نشان ہے کم کرایہ پر صاف ستھرے اور بلوادار کمرے مل سکتے ہیں۔

پتہ یاد رکھیئے:۔

عزیزیہ ہوٹل

نامپلی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن فون (۴۳۱۶)

نشورواحدی

ہر ذرۂ خاکی کو کرن ہم نے بنایا — مٹی کو لہو دے کے چمن ہم نے بنایا
تھا حسن مگر اک نگہِ نیم رضا سے — گیسو بہ کمر لالہ شکن ہم نے بنایا
صد شکر کہ ہے ان کا تبسم بھی ہمیں پر — کلیوں میں جھجکتی غنچہ دہن ہم نے بنایا
حصّہ ہے یہاں شاخ پہ آہو کی ابھی تک — اور صحنِ غزالانِ چمن ہم نے بنایا
اقوام کو گل پیرہنی ہم نے عطا کی — اپنے لیے پھولوں کا کفن ہم نے بنایا
ہر جذبۂ آزادیٔ فطرت کو ہوا دی — ہر بادۂ پیمانہ شکن ہم نے بنایا
تاریخ جنوں یہ ہے کہ ہر دور خرد میں — اک سلسلۂ دار و رسن ہم نے بنایا
ڈرتے ہیں خموشی سے ہماری مہ و انجم — چپ رہ کے وہ اعزازِ سخن ہم نے بنایا
ٹکرائے کبھی موج سے ساحل پہ کبھی ہیں — بہتے ہوئے دریا میں وطن ہم نے بنایا
اشکوں سے ہمارے ہے منور نئی دنیا — شبنم کو ضیا دی تو کرن ہم نے بنایا
مستقبلِ تہذیب کا نغمہ وہی ٹھہرا — جو زمزمۂ گنگ و جمن ہم نے بنایا

آفاق کا ہر جلوہ نشور اس میں عیاں ہے
مل جل کے وہ آئینۂ فن ہم نے بنایا

حسن نعیم

ان سے ملے تو جان کے ذکر کرم کیا — شکووں کو گویا ختم شکایت کو کم کیا
تم نے کیا جو غیر پہ لیکن خدا گواہ — ہم خوش ہوئے کہ تم نے کسی پر کرم کیا
ہم پر کرو ستم کہ ہمیں باوفا ہیں ایک — ہم ہی نے دل کو تنگ نہ آنکھوں کو نم کیا
لائے ہیں سوزِ دل کو ہمیں بامِ فکر تک — ہم ہی نے ہجر و وصل کی قیمت کو کم کیا
بھٹکے دیارِ حسن میں ہم اہلِ دل مگر — دو اک قدم تو عشق کی منزل کو کم کیا
تم نے وہاں پہ آ کے اٹھایا ہے کس کا غم — ہم نے جہاں پہنچ کے زمانے کا غم کیا

تم نے کہا نہ ایک انھیں سے مگر نعیم
سارے جہاں کے سامنے افشائے غم کیا

ابنِ احمد تاب

دل کا مقدر ہے غم شکر ہے اتنے تو ہم — مونسِ غم بن گئے
ہجر کا اب ذکر کیا قرب کے لمحات بھی — کیفِ الم بن گئے
پینے پہ جب آ گیا جاگ اٹھا میکدہ — جھوم کے آئی بہار
اور لبوں تک مرے جتنے بھی جام آ گئے — ساغرِ جم بن گئے
حرف نہ آئے کہیں نامِ وفا پر کبھی — بس یہی اک بات تھی
اس لیے اے دوست ہم اتنے ہوئے پائمال — نقشِ قدم بن گئے
بندۂ صاحب جلال کرتے رہے عمر بھر — دیکھ بھر کے دل کا طواف
جو نہ کبھی بن سکے ٹوٹے دلوں کا سکوں — شیخِ حرم بن گئے
دامنِ محبوب بھی پی نہ سکا اشکِ غم — عظمتِ غم کی قسم
وہ بھی جدا ہو گیا جس کے لیے آج ہم — دیدۂ نم بن گئے
چاک ہوا بارہا پھر بھی نہ پھیلا کبھی — دامنِ اہلِ جنوں
اور گریباں کے تار جب بھی ہوئے منتشر — وجہِ کرم بن گئے
انجمنِ ناز میں حکم یہ ہے مسکراؤ — خواہ تصنع سہی
کس سے کہیں دل کی بات کتنے تبسم یہاں — حاصلِ غم بن گئے
تابؔ اڑانے لگی زندگی ہنس کر مذاق — جی کے بھلا کیا کریں
غیر کا اب ذکر کیا آج ہم اپنے لیے — خود ہی ستم بن گئے

مظہر امام

دل ہے مجموعِ داغِ محبت سے لالہ زار — لو گلشنِ حیات میں آ ہی گئی بہار

مانا نگاہِ عشق میں معصومیت نہ تھی — جلوے مگر حضور کے خود بھی تھے بے قرار

روزِ ازل سے ترشیٔ حالات ہے نصیب — پھر بھی مئے حیات کا اُترا نہیں خمار

دامن اُلجھ گیا تھا کبھی جن سے حُسن کا — اب تک کھٹک رہے ہیں مری روح میں وہ خار

تکمیلِ آرزو کا بہانہ بھی تھا عجیب — کچھ عشق سوگوار تھا کچھ حُسن شرمسار

ہونے کو یوں تو عشق سے انکار ہے مگر — دل نے بھی اعتراف کیا اس کا چند بار

دامانِ چشمِ روسیہ کے سائے تلے بھی آج — کیا جانے دل کو کیوں کسی پہلو نہیں قرار

اپنی وفاؤں پر بھی ندامت ہوئی مجھے — وہ اس قدر تھے اپنی جفاؤں پہ شرمسار

خود موت کو نہ جائے اماں مل سکی امامؔ!

تھا دامنِ حیات کچھ اس طرح تار تار

خیراتِ ندیم

مری زندگی کہاں تک نئے سورجوں کو ترسے
کوئی اس قدر تو پوچھے کبھی اس نئی سحر سے

اسی تنگیٔ قفس نے مجھے وسعتیں بھی دی ہیں
یہ حیاتِ نو ملی ہے تو شکست بال و پر سے

ترے حُسن و دلبری سے گل و گلستاں کی رونق
مئے و میکدہ سلامت تری مستیٔ نظر سے

یہ کلی کلی سے پوچھو یہ روش روش کہے گی
وہیں پھول کھِل گئے ہیں وہ گذر گئے جدھر سے

غمِ زندگی کی گھڑیاں کچھ عجیب کٹ رہی ہیں
کبھی وہ ہیں اجنبی سے کبھی ہم ہیں بے خبر سے

میں بھٹک رہا ہوں لیکن مجھے یہ یقیں ہے پھر بھی
رہِ زندگی ملے گی کہیں تیری رہ گذر سے

ترے غم بھی دل میں آئے تو تھکے تھکے سے آئے
کوئی جیسے لوٹتا ہو کسی دور کے سفر سے

جو گلگذارِ شب ہیں یہ ندیمؔ ان سے کہدو
وہ نقاب اُٹھ رہی ہے رخِ روشنِ سحر سے

غفور انیس

کسی بہانے طبیعت بہل ہی جاتی ہے
نہ یاد آ کر مجھے اپنی یاد آتی ہے

یہ تیرا غم، یہ غم دوستاں، غم فردا
جو بات ہو غم دوراں پہ لوٹ آتی ہے

وہ آرزو ترے رخسار کو جو چھو نہ سکی
وہ آرزو ورقِ گل میں مسکراتی ہے

اٹھائے ہاتھ سلاسل پہ اہلِ زنداں نے
صدا خفیف سہی پر ضرور آتی ہے

ہزار حشر رہ خنجر و سناں میں اٹھے
حیات آج بھی زخموں میں مسکراتی ہے

انیسؔ حوصلے اہلِ جنوں کے کیا ہوں گے
کہ ہر نگاہ افق سے بھی دور جاتی ہے

مجنوں گورکھپوری

(تبصرے کے لیے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

تنقیدی تبصرے[1]

زبان اور علم زبان

مصنفہ پروفیسر عبدالقادر سروری
تقطیع ۲۶×۲۰۔ حجم ۳۲۲ صفحات۔ کاغذ اچھا۔ لکھائی چھپائی اور جلد ستھری۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو حیدرآباد (دکن)
قیمت ستّر روپے۔ ملنے کا پتہ۔ اردو ہال حمایت نگر حیدرآباد (دکن)
ہندوستان کے دوسرے مشہور کتب فروشوں سے بھی یہ کتاب مل سکتی ہے۔

پروفیسر عبدالقادر سروری کو علم و ادب کی دنیا میں روشناس ہوئے۔ اتنی مدت ہو چکی ہے کہ وہ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کا ایک مرتبہ قائم ہو چکا ہے جو بلند اور رفیع ہے۔ کسی کتاب پر اُن کا نام ہونا اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ کتاب اپنے موضوع پر نوعیت کے لحاظ سے ایک خاص قدر کی مالک ہوگی۔ پروفیسر سروری اردو کے ان گنتی کے لکھنے والوں میں ہیں جو خود عالم فاضل ہیں اور دوسروں کے اندر بھی علمی فضیلت حاصل کرنے کی قابلیت پیدا کرنے ..... میں مشغول ہیں۔ وہ جو لکھتے ہیں عالمانہ تبحّر اور فاضلانہ اعتماد کے ساتھ لکھتے ہیں اور کافی سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں۔ "دنیائے افسانہ"، "کردار اور افسانہ"، "جدید اردو شاعری"، "اردو مثنوی کا ارتقا"، "سراج اورنگ آبادی اور ان کی شاعری" وغیرہ ان کی ایسی تحقیقی کوششیں ہیں جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ اردو زبان میں ایک بیش بہا اضافہ کا حکم رکھتی ہے۔

زیر نظر کتاب "زبان اور علم زبان" پروفیسر سروری کی تازہ ترین تصنیف ہے اور ان تمام امتیازی خصوصیات کی حامل ہے جن کو ہم موصوف سے منسوب کرتے آئے ہیں۔ دیباچہ کے علاوہ کتاب اٹھارہ ابواب میں تقسیم ہے اور ہر پہلو سے جامع اور مکمل تصنیف کہے جانے کی مستحق ہے۔ موضوع کا کوئی رخ نظر انداز نہیں کیا گیا ہے زبان کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ وہ کیوں اور کس طرح وجود میں آئی اور پھر کیسے دور بدور تمدن انسانی کی رفتار کے ساتھ ارتقا کی منزلیں طے کرتی رہی؟ کون کون سے خارجی اسباب و موثرات زبان کی تشکیل اور تہذیب میں ناگزیر طور پر حصّہ

---

[1] ان میں سے پہلے تین تبصرے ۸ ستمبر ۱۹۵۶ء کو آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے نشر ہو چکے ہیں۔

لیتے رہے؟ زبانوں کی مختلف شاخوں میں نسلی تقسیم کی بنیاد کیا ہے؟ تکلمی یا تحریری زبان رفتہ رفتہ تحریری زبان کیسے ہوئی اور رسم الخط کی ابتدا کب ہوئی اور پھر دنیا میں قدیم ترین زمانے سے لے کر اب تک اتنے بے شمار رسم الخط جو رائج ہوگئے ان کی تواریخ کیا ہے؟ لغات کی تعداد کثرت اور الفاظ کی معنوی وسعت اور بلاغت انسان کی معاشرتی اور سماجی ترقی کے ساتھ کس طرح بڑھتی گئی؟ یہ ہیں بعض اہم اور ادق سوالات جن پر اس کتاب میں تشفی بخش بحث کی گئی ہے اور کوئی بحث ایسی نہیں ہے جو مصنف کے عالمانہ درک اور کارآگاہانہ وثوق کا پتہ نہ دیتی ہو۔ لسانیات ایک علم کی حیثیت سے بالکل دور جدید کا اکتساب ہے۔ اور اردو زبان میں اس موضوع پر مواد کا بڑا قحط ہے۔ متقدمین جو لکھ گئے ہیں وہ قیاسی ادعائی اور سطحی ہے۔ حال میں کچھ اہل قلم نے اس طرف توجہ کی ہے اور دو چار کتابیں اب لسانیات پر مل جاتی ہیں لیکن وہ بھی کچھ سرسری انداز کی ہیں۔ جن سے ہماری ضرورت خاطر خواہ پوری نہیں ہو پاتی پروفیسر سروری کی یہ کتاب اردو میں ایک زبردست کمی کو پورا کرتی ہے۔ ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ لسانیات پر اب تک اس سے زیادہ بلیغ اور کامیاب کتاب نہیں لکھی گئی۔ اس موضوع پر آئندہ لکھنے والے "زبان اور علم زبان" کو ایک ایسا کارآمد ماخذ پائیں گے جس سے بے نیازی نہیں برتی جا سکتی۔ ہم پروفیسر سروری کو ان کی اس تصنیف پر مبارکباد دیتے ہیں۔

کتاب کے آخر میں اصطلاحات کی ایک فرہنگ ہے جو اس کی قدر کو بڑھا دیتی ہے۔ لسانیات جدید سے متعلق دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں جو علمی اصطلاحیں رائج ہیں ان کے مرادفات ہماری زبان میں نہیں ملتے اور لکھنے والے کو ایجاد و اجتہاد سے کام لینا پڑتا ہے۔ پروفیسر سروری نے بڑی خوبی کے ساتھ اس دقت پر قابو پایا ہے اس باب میں ان کو بڑی جسارتوں سے کام لینا پڑا ہے جو کہیں کہیں حد سے تجاوز کر گئی ہیں۔ اور ہمارے لیے ان سے موافقت پیدا کرنا آسان نہیں ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس میدان میں کیسی دماغی کاوش اور عرقریزی سے کام لینا پڑتا ہے اس لیے ہم کو مصنف سے جواب طلب کرنے کا کوئی حق نہیں۔ پھر بھی بعض اصطلاحوں کے لیے جن کے مرادفات پہلے سے موجود ہیں نئے الفاظ گڑھنا کچھ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے مثلاً (ETYMOLOGY) کے لیے علم صرف یا صرف کی اصطلاح موجود تھی اس کی جگہ علم اشتقاق ایجاد کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اسی طرح (CONSONANTS) اور (VOWELS) کے لیے علی الترتیب حروف صحیح اور حروف علت موجود تھے۔ ان کی جگہ مصمتات اور مصوتات یقیناً نامانوس ہیں اگرچہ کہا جا سکتا ہے کہ پرانی اصطلاحات کو قائم رکھا جاتا تو ان سے تعریفی مشتقات بنانے میں بڑی دقت ہوتی۔

بہرحال "زبان اور علم زبان" اردو میں ایک ایسی تصنیف ہے جس کی جگہ کوئی دوسری کتاب عرصہ تک نہ لے سکے گی ہم کو اور ہمارے تعلیمی اداروں کو پروفیسر سروری کی اس کوشش کی داد دینا ہے۔

روایت اور بغاوت

مصنفہ پروفیسر احتشام حسین لکھنؤ یونیورسٹی
تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۳۱۲ صفحات۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط۔ گرد پوش سادہ مگر جدید طرز لیے ہوئے۔ قیمت ۴ ہے
ناشر ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ

پروفیسر احتشام حسین نئی نسل کے ان ممتاز لکھنے والوں میں ہیں جنھوں نے اردو زبان کو جدید تنقید سے آشنا اور مانوس بنانے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ ان کی بعض تصنیفیں مثلاً "تنقیدی جائزے" "ادب اور سماج" تنقید اور عملی تنقید" اپنے اپنے عنوان کی بالکل نئی کوششیں ہیں جو اہل ذوق اور متعلموں کی جماعتوں میں کافی مقبول ہو چکی ہیں۔ وہ جدید ذہن کی سچی اور پوری نمائندگی کرتے ہیں، یعنی وہ ادب کو زندگی کے مادی اسباب و حالات کی روشنی میں دیکھتے ہیں، اور ادیب یا شاعر کو تواریخی قوتوں کی پیدا کی ہوئی مخلوق سمجھتے ہیں۔ انھوں نے عمرانیات اور معاشیات جدید کا کافی مطالعہ کیا ہے جس سے ان کے اندر ایک تواریخی بصیرت پیدا ہو گئی ہے۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں کافی سوچ سمجھ کر اور بڑی احتیاط اور ایمانداری کے ساتھ لکھتے ہیں۔ اگرچہ بعض اوقات ان کے مضامین سرسری ہو جاتے ہیں اور زیادہ گہرائیوں کا پتہ نہیں دیتے لیکن ان کا کوئی مضمون ایسا نہیں جو اردو ادب کے نئے پہلوؤں کو سامنے نہ لاتا ہو اور اردو انشا پردازوں اور شاعروں کو نئے زاویوں سے نئی روشنی میں پیش کرتا ہو۔ ان کے مضامین پڑھنے والوں کے لیے بلیغ اور فکر انگیز اشاروں کے حامل ہوتے ہیں۔

اس وقت جو کتاب پیش نظر ہے اس کا نام بیساختہ اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ یہ نام غالباً مشہور انگریزی نقاد (LOWES) کی تصنیف (CONVENTION AND REVOLT) سے اخذ کیا گیا ہے جس کا اب سے پندرہ بیس سال پہلے بڑا چرچا تھا مگر اب پرانی ہو گئی ہے اور کم پڑھی جاتی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب کے نام سے دھوکہ ہوتا ہے کہ یہ "روایت اور بغاوت" کے موضوع پر کوئی مستقل تصنیف ہو گی اور اس میں پرانی اور نئی قدروں پر شرح و تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہو گی۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ یہ ایک مجموعہ ہے پروفیسر احتشام کے چند مضامین کا جو اس سے پہلے ایک مرتبہ شائع ہو چکا ہے اور جو اب نظر ثانی کے بعد دوسری اشاعت کی شکل میں پیش کیا گیا ہے مجموعہ میں جتنے مضامین ہیں ان میں سے کسی کو بھی غیر اہم نہیں کہا جا سکتا۔ سب کے سب نئے فکری میلانات اور جدید ادبی مطالبات بہت واضح شعور لیے ہوئے ہیں اور زندگی اور ادب میں نئے نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کا ایک خاص وصف فکری خلوص و صداقت اور زبان اور اسلوب کی متانت اور پروقار سادگی ہے۔ چند عنوانات ملاحظہ ہوں: "ادبی تنقید کے مسائل"۔ "افسانہ اور حقیقت"۔ "اقبال بہ حیثیت شاعر اور فلسفی"۔ "جدید اردو شاعری اور سماجی کشمکش"۔ "نیا ادب اور ترقی پسند ادب"۔ موخر الذکر مضمون ایک تحریری مباحثہ ہے جو پروفیسر

رشید احمد صدیقی، مصنف اور مولوی سید اختر علی تلہری کے درمیان ہوا۔ پروفیسر احتشام حسین نے بڑے سلیقہ اور ذہنی توازن کے ساتھ "ترقی پسند ادب" اور "نیا ادب" کا فرق سمجھا کر "ترقی پسند ادب" کی نیابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ہم کو ایسا احساس ہوتا ہے کہ مضمون کچھ اور وسعت اور وضاحت چاہتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ جیسی منطقی تعریف پر جناب اختر تلہری کو خواہ مخواہ اصرار تھا ویسی تعریف ترقی پسند ادب کی نہیں ہو سکتی تھی اور نہ اس کی ضرورت تھی۔ لیکن ترقی پسند ادب کے مفہوم کی تفصیل اور تمثیل سے اور زیادہ واضح اور قطعی تو کیا ہی جا سکتا تھا جس کی بڑی ضرورت تھی۔ مضمون کچھ زیر لب اعتذار ہو کر رہ گیا ہے۔ "روایت اور بغاوت" کے بعض دو سرے مضامین کو بھی پڑھ کر محسوس ہوتا تھا کہ لکھنے والا موضوع پر پورا عبور رکھتا ہے اور اس پر مبسوط اور مدلل مضمون لکھ سکتا تھا لیکن جو کچھ لکھا ہے کم فرصتی یا عجلت میں لکھا ہے۔ اس لیے بحث تشنہ رہ گئی ہے۔ یہ مصنف پر کوئی اعتراض نہیں ہے اور نہ اس سے "روایت اور بغاوت" کے مضامین کی قدر کم ہوتی ہے۔ مضامین اپنے دائرے کے اندر موضوعات پر نئے زاویوں سے روشنی ڈالتے ہیں۔ اور ایسے ہیں جن سے اردو ادب کا کوئی متعلم قطع نظر نہیں کر سکتا۔ ضرورت ہے کہ ابھی اور ایسے بے لاگ اور دیانتدارانہ مضامین کثرت کے ساتھ لکھے جائیں۔

اردو غزل کی نشو و نما

مصنف ڈاکٹر رفیق حسین ایم اے ڈی فل لکچرار شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی۔ تقطیع $\frac{۲۰×۳۰}{۱۶}$ حجم ۶۰ صفحات۔ کاغذ اور لکھائی چھپائی اوسط۔ گرد پوش خوشنما۔ قیمت لے (چھ روپے) ملنے کا پتہ:۔ لالہ رام نارائن لال بک سیلر و پبلشر۔ الہ آباد

یہ دراصل مبسوط مقالہ ہے جس کو تیار کرنے پر مصنف کو الہ آباد یونیورسٹی سے "ڈاکٹر آف فلاسفی" کی سند ملی ہے۔ اب اس کو کتاب کی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ اردو میں ابھی صنفی تنقید کی بڑی کمی ہے اور اردو غزل پر تو یہ بالکل پہلی تصنیف ہے جس میں شاعری اور غزل کی ابتدائی بحث سے لے کر اردو غزل کی تاریخی رفتار اور مختلف ادوار میں اس کے مختلف رجحانات اور اسلوبی تنوعات پر اس محنت اور اہتمام کے ساتھ تبصرہ کیا گیا ہے۔ مصنف نے جن دشوار گذار مرحلوں کو طے کر کے اس کتاب کو مکمل کیا ہے اور جس دھن اور مشقت کے ساتھ ایسے وسیع مبحث سے عہدہ برا ہونے کی کوشش کی ہے اس کا اعتراف کرنا حقدار کو اس کا حق دینے سے زیادہ نہ ہوگا۔ اس کتاب کی افادیت مسلم ہے۔ تعلیم گاہوں سے باہر بھی اردو شاعری بالخصوص غزل سے دلچسپی رکھنے والے اس کو کئی اعتبار سے مفید پائیں گے۔ مصنف نے ہمارے لیے جو مواد اکٹھا کر دیا ہے وہ آئندہ لکھنے والوں کے لیے یقیناً مددگار ثابت ہوگا۔ ساتویں باب سے تیرھویں باب تک اردو غزل کے مختلف دور اور اس کے بعض مشاہیر کے کلام پر نظر ڈالی گئی ہے۔ اور اس حد تک بڑے نظم اور انضباط سے کام لیا

گیا ہے۔ لیکن کتاب میں بعض کمیاں بری طرح محسوس ہوتی ہیں۔ پہلی بات جو ہم کو ناآسودہ چھوڑتی ہے یہ ہے کہ کتاب ذوق، مومن اور غالب کے دور پر ختم ہوگئی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر کی سند کے لیے مصنف نے اپنا دائرۂ بحث یہیں تک محدود رکھا تھا۔ لیکن کم و بیش تیرہ سال بعد اس کو کتاب کی شکل میں پیش کیا گیا تو اس کو عصر جدید تک مکمل کر دینا چاہیے تھا۔ دوسری کمی جو محسوس ہوئے بغیر نہیں رہتی یہ ہے کہ ہر دور میں صرف چوٹی کے چند شعرا کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ مثلاً میر اور مرزا کے دور میں قائم چاندپوری اور میر ضیا کا کوئی ذکر نہیں ہے انعام اللہ خاں یقین۔ میر عبدالحئی تاباں اور خواجہ میر اثر کے صرف نام لیے گئے ہیں حالانکہ ان لوگوں کے کلام اردو غزل سرائی میں ایک قابل قدر سرمایہ ہیں۔ مرزا مظہر جانجاناں کو شاہ حاتم اور سراج الدین علی خاں آرزو وغیرہ کے دور میں ہونا چاہیے۔ ان کو میر اور سودا کے زمانے میں شمار کرنا تاریخی غلطی ہے۔ اس طرح مومن اور غالب کے دور میں بعض شعرا کے تذکروں کی کمی ایک خلا کا احساس پیدا کرتی ہے۔ ہر باب کے آخر میں دور مذکورہ کی کچھ خصوصیات گنائی گئی ہیں۔ یہ حصہ بہت سرسری ہے۔ اگرچہ پڑھنے والے کے لیے بصیرت افروز ہے۔ دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ کا موازنہ مختصر ہوتے ہوئے بھی کافی حد تک اطمینان بخش ہے۔ آخر میں "اردو غزل پر سرسری تنقیدی نظر" ہے جو واقعی بہت سرسری ہے۔ ان چند کمیوں کے باوجود "اردو غزل کی نشو و نما" اردو میں اپنے عنوان کی پہلی کوشش ہے جس کی قدر ہمیشہ کی جائے گی۔

پرچھائیاں

لمبی تقطیع پر چالیس صفحے۔ کاغذ نفیس، کتابت اور طباعت عمدہ۔ گرد پوش نئے طرز کا اور دلکش۔ قیمت عہ۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قیمت زیادہ ہے۔ ملنے کا پتہ رائٹرز پبلشنگ ہاؤس۔ ملاڈ۔ بمبئی

"پرچھائیاں" اردو کے معروف و مقبول نوجوان شاعر ساحر لدھیانوی کی ایک طویل نظم ہے جس کا پیغام آفاقی امن ہے اور جو ہمارے دور کے ایک نہایت سنگین اور اہم مسئلہ کی بینے تحریک امن عالم کی پرخلوص نمائندگی کرتی ہے۔ ساحر اکثر اپنے ہم جولیوں کی طرح زندگی کی ٹھوس مادی حقیقتوں کا بہت سچا اور تیز احساس رکھتے ہیں اور یہ ہمارے لیے بہت مبارک علامت ہے۔

"پرچھائیاں" سے پہلے ان کے کلام کا ایک مجموعہ "تلخیاں" ہم پڑھ چکے ہیں۔ اگر ساحر بقول خود یہ طویل نظم نہ لکھتے تو بھی جدید اردو شاعری میں ان کا مقام محفوظ ہو چکا تھا۔ ساحر شاعری کی نظری صلاحیت اور بے دریغ قوت لے کر آئے ہیں۔ وہ چاہے غزل کہیں چاہے نظم۔ چاہے غزل سنائیں نظم لکھیں یا نظم سنائیں غزل وہ بہرصورت شاعری کا پورا حق ادا کرنے کی قابلیت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اور یہ بڑی بات ہے۔ وہ خارجی عوارض

اور داخلی تاثرات کو سلیقہ کے ساتھ سمو کر ایک آہنگ بنانے کا فن خوب جانتے ہیں۔ ان کے ہر مصرعہ میں مادی محرکات و موثرات کے احساس کے ساتھ وہ کیفیت بڑے سلیقہ کے ساتھ گھلی ملی ہوتی ہے جو صرف بے ساختہ داخلی اظہار سے پیدا ہو سکتی ہے۔ ہم کو اصرار ہے کہ ساحر نظم کہیں یا غزل ان کے کلام کی سب سے زیادہ ناگزیر اور ناقابل انکار خصوصیت غزلیت یا تغزل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظم میں جس کو وہ اپنی طویل نظم بتاتے ہیں اور جو کچھ زیادہ طویل نہیں ہے۔ منفرد اشعار اپنی اپنی جگہ مکمل نظم سے زیادہ جوہری یا عنصری تاثیر اپنے اندر رکھتے ہیں۔ مندرجہ اشعار میں ایک ناقابل فراموش کیفیت محسوس ہوتی ہے جس کی تاثیر کا راز ہر طرح سے تجزیہ کرنے کے بعد بھی راز ہی رہ جاتا ہے۔

تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں ـــــ کبھی گمان کی صورت کبھی یقیں کی طرح

مجھے یقین کہ ہم اب کبھی نہ بچھڑیں گے ـــــ تمہیں گمان کہ ہم مل کے بھی پرائے ہیں

نہ دوستی نہ تکلف نہ دلبری نہ خلوص ـــــ کسی کا کوئی نہیں آج سب اکیلے ہیں

سورج کے لہو میں لتھڑی ہوئی وہ شام ہے اب تک یاد مجھے
چاہت کے سنہرے خوابوں کا انجام ہے اب تک یاد مجھے

مجبور ہوں میں مجبور ہو تم مجبور یہ دنیا ساری ہے
اس دور میں جینے کی قیمت یا دار و رسن یا خواری ہے

ہمارا راز ہمارا نہیں سبھی کا ہے
چلو کہ سارے زمانے کو رازداں کر لیں

پرچھائیاں اپنے زمانے کی نہایت تلخ اور مہلک صورت حال کو ایک کہانی کے روپ میں سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن اس میں کوئی مربوط اور مفصل بیان نہیں ہے۔ بلکہ "اشاریت" کے فن سے کام لیا گیا ہے۔ یعنی مختلف تصورات اور تاثرات کو اشاروں میں ادا کر دیا گیا ہے۔ نظم کا عنوان فکر انگیز

ہے۔ دورِ جدید کی ایک بہت نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ہم کو حال اور مستقبل کے مواقع اور امکانات موجودہ ابتریاں اور آنے والے خطرے اور ان کے تدارک کی تدبیریں کیا ہے اور کیا ہونا چاہیئے۔ یہ تمام نقوش و تصورات پرچھائیوں کی طرح ابھرتے ہیں اور تذبذب اور عدم تیقن کے دھندلکے میں چھوڑ جاتے ہیں۔ ہم دیرینہ کسی ایک تصور یا ایک سوچے ہوئے لائحہ عمل کے سہارے اپنے کو سنبھالے نہیں رہ سکتے۔ یہ موجودہ نظام زندگی اور جدید ذہن کی ایک مستقل علامت ہے۔" پرچھائیاں" زندگی کی اس صورت حال اور نئی نسل کے غیر واضح ذہنی ردعمل کا بڑی خوبصورتی کے ساتھ مظاہرہ کرتی ہے۔

"پرچھائیاں" ایک کامیاب نظم ہے جو اپنے مقصد سے بڑے فنی شعور کے ساتھ عہدہ برا ہوئی ہے۔ سماجی شعور اور انفرادی تاثر کا ایسا خوش آہنگ امتزاج کوئی سہل کام نہیں ہے۔

کتاب کے سرورق اور دوسرے مقامات پر نئے طرز کے خاکے ہیں اور شروع میں علی سردار جعفری کا لکھا ہوا مختصر سا مقدمہ ہے جس میں انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں بیک وقت دوستی کا حق ادا کرنے اور ترقی پسندی کے ناموس کو قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مطبوعات موصولہ :- زندان نامہ، زبردا غ دل، رات کے گھونٹ، شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سوویت یونین میں مسلمان، جمال کربلا، شعور (کراچی) سالنامہ ادب لطیف (لاہور) نیا دور (کراچی)



بازگشت

یہ سلسلہ ہم پھر شروع کر رہے ہیں لیکن ہم اپنے لکھنے والوں اور قارئین سے اس بات کے خواہشمند ہیں کہ وہ "صبا" میں شائع ہونے والے مضامین نظم و نثر پر محض رسمی اور توصیفی انداز میں اظہار خیال کرنے کی بجائے تھوڑا سا تنقیدی انداز اختیار کریں، ورنہ محض رائے دینے کے لیے رائے دینے میں کوئی افادیت نہیں ہے اور اسی وجہ سے ہم نے یہ سلسلہ ختم کر دیا تھا (ادارہ)

۱۴ر فروری ۵۸ء ——— حیدرآباد دکن

"صبا" ملا۔ ٹائیٹل بہت نفیس ہے۔ سادہ اور حسین ——— تحسین سروری کی تحریر (لطیف ساجد پر) پسند آئی۔ خصوصیت سے اس لیے کہ ایسی چیزیں پڑھ کر دوری کا احساس بڑی حد تک ختم ہو جاتا ہے اور ہم اپنے ساتھیوں کے متعلق گھر بیٹھے بہت کچھ جان سکتے ہیں۔ اگر اسی دوستانہ پیرائے میں مختلف دوستوں کی شخصیتیں ابھاری جائیں تو بڑا دلچسپ رہے ——— کیا کسی فرد پر قلم اٹھانے کے لیے موت ضروری ہے؟ اس روایت کو توڑ دو۔

شاذ سے کہوان کا مزاج غزل سے نہیں ملتا۔ وہ درد جوان کا خاصہ ہے اور ان کی غزل میں بالکل مفقود ہے غزل وہ دوسروں کے لیے چھوڑ دیں، انھیں اپنی نظمیں ہی سجتی ہیں۔

آمنہ

۱۴ر فروری ۵۸ء ——— جامعہ نگر دہلی

"صبا" ملا۔ پڑھ کر بڑی مایوسی ہوئی۔ وہ تو کہیے کہ حیدرآباد کے شاعروں نے پرچے کی لاج رکھ لی ورنہ قاری کے لیے کیا تھا؟ آپ کی اور شاذ کی غزلوں کو یہاں سراہا گیا۔

عوض سعید

۱۵ر فروری ۵۸ء ——— سیوری بمبئی

جنوری کا "صبا" ملا۔ اس دفعہ پرچہ کچھ کمزور ہے مواد کے لحاظ سے انتخاب میں تھوڑی سی سختی برتیے۔

خلش جعفری

۲۰ر فروری ۵۸ء _____ سونارپور، ۲۴ پرگنہ

جنوری کا پرچہ ملا۔ پرچہ اس بار بھی بہت LATE ہوگیا۔ پرچہ اچھا ہے اور کلکتہ میں خوب چل سکے گا لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ بروقت نکلا کرے۔ زیادہ کیا لکھوں۔ تمہاری غزل کافی اچھی ہے۔

شانتی رنجن بھٹا چاریہ

۲۲ر فروری ۵۸ء _____ کلکتہ

جنوری کا شمارہ پڑھا۔ آپ کا یہ شعر مجھے بہت پسند آیا ؎

ابن آدم سے یہ دنیا ابھی مایوس نہیں ۔ ابن مریم کے لیے گرچہ صلیب آج بھی ہے

اور نشور واحدی کی غزل بھی بہت اچھی ہے۔

مطلب شاہین

۲۷ر فروری ۵۸ء _____ کلیان۔ بمبئی

پرچے کا سرورق گو سادہ ہے پھر بھی دیدہ زیب ہے۔ چھپائی اور گٹ اپ برا نہیں البتہ کاغذ اس پُرآشوب دور کی کھلی زبان سے شکایت کر رہا ہے۔

"موازنہ آہنگ" قابل قدر مضمون ہے۔ "ادب برائے اسپورٹ" میں بعض جگہ صاف نظر آتے ہیں۔ منظومات میں شاذ تمکنت کی غزل پسند آئی۔ آپ کا مقطع خوب ہے۔ خلیل الرحمن اعظمی اور ربیر رضوی کے تاثرات بھی دلکش ہیں۔

رفیق جعفری



جب کھانا ہضم نہ ہوتا ہو!

..... اور کھانا کھاتے ہی پیٹ میں ہلکا ہلکا درد اور بھاری پن محسوس ہوتا ہو تو فوراً پچنول کی ایک ٹکیہ استعمال کیجیے

پچنول

آپ کو معدے کی تمام خرابیوں مثلاً بدہضمی، قبض، تیزابیت اور متلی وغیرہ سے محفوظ رکھے گی بھوک کو بڑھائے گی۔ ہاضمہ کو درست کرے گی اور خوراک سے پورا لطف لینے میں مدد دے گی۔

قیمت فی شیشی ایک روپیہ چار آنے



ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی۔

Hamdard DAWAKHANA (TRUST) DELHI

حیدرآباد کا ممتاز دوماہی رسالہ

گجر

جسے ہند و پاکستان کے تمام لکھنے والوں کا تعاون حاصل ہے، شائع ہو چکا ہے

صفحات (۲۵۶) علاوہ رنگا رنگ تصاویر۔ قیمت فی پرچہ عہ/۱۲

ترتیب دینے والے:۔ نجم ثاقب شفق، حسینی شاہد

نعمت انور، سرینواس لاہوٹی

ملنے کا پتہ:۔ بی ۔ ۴۴۴۔ نامپلی مارکٹ

پوسٹ بکس ۱۱۲ حیدرآباد دکن

جمشید پور میں

صبا

اردو کے ترقی پسند ادبی رسائل اور کتابیں ہمارے یہاں سے خریدیئے

ہمارا پتہ

آزاد کتاب گھر

ساکچی بازار، جمشید پور

ہم امن چاہتے ہیں

وقت کی اہم ترین کتاب

(امن کے موضوع پر دنیا کی تقریباً تمام زبانوں کے افسانوی و شعری شہ پارے) • اس کتاب کو ہم عالمی امن تحریک کے سامنے فخر کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں.... اردو زبان کو فخر رہے گا کہ ایسا مجموعہ دنیا میں سب سے پہلے اردو میں شائع ہوا میں چاہتا ہوں کہ یہ کتاب نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کی ہر زبان میں ترجمہ ہو کر شائع ہو۔ (خواجہ احمد عباس)

• آپ کے محبوب لکھنے والوں کی تقریباً پانچ درجن رنگا رنگ تصاویر و بیانات • صفحات تقریباً چار سو اور قیمت صرف پانچ روپے تیرہ آنے

مرتبہ:۔ ہربنس سنگھ دوست

فلم ویکلی کلکتہ

کا سالنامہ مارچ کے آخری ہفتے میں مشہور ادیبوں اور شاعروں کی تازہ تخلیقات حسین فلمی تصویروں، کارٹونوں اور تازہ ترین فلمی خبروں کے ساتھ منظر عام پر آ رہا ہے

شرح چندہ:۔ سالانہ ۹ روپے ششماہی ۵ روپے سالنامہ ۸/

سالانہ یا ششماہی چندہ بھیج کر آج ہی سالنامہ مفت حاصل کیجئے

ایڈیٹر:۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ

فلم ویکلی ۲/۸ جھاؤ تلا روڈ کلکتہ (۱۷)

صبا

مدینہ دربار اگربتی

ایک نام ——

—— جو

عبارت ہے ——

—— خوشبو

—— فرحت

اور ——

—— تازگی سے

مدینہ پرفیومری ورکس ۔ پوسٹ بکس نمبر ۳ چک بالاپور
میسور اسٹیٹ
فون نمبر ۲۸

(مدینہ اڈورٹائزرس)

ادارۂ ادبیات اردو کی جدید مطبوعات

گاندھی جی ادارے کی طرف سے بچوں اور بالغوں کے لیے مشاہیر ہند کے حالات زندگی سادہ اور آسان زبان میں مرتب کرا کے شائع کی جاتی ہیں۔ چنانچہ حیدرآباد کے ایک پختہ مشق شاعر فورشید احمد صاحب جامی سے گاندھی جی کی حیات نظم میں مرتب کرائی اور یہ کتاب گاندھی جی کی ایک عمدہ تصویر کے ساتھ بچوں اور ان پڑھ بالغوں کی خاطر جلی حروف میں خاص اہتمام سے چھپوائی گئی ہے۔ صفحات ۳۲ قیمت بارہ آنے۔

سروجنی دیوی مولوی وزیر حسن صاحب نے اپنے مخصوص انداز بیان میں مرتب کی ہے جو اردو دنیا میں ایک خاصہ کی چیز ہے۔ یوں بھی اردو میں سروجنی نائیڈو پر اب تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔ وزیر حسن صاحب چونکہ ان کے چھوٹے فرزند کے دوست ہیں اس لیے انھوں نے سروجنی نائیڈو کی نجی زندگی بڑی خوبی سے قلمبند کی ہے۔ اور ان کی نظموں سے بھی بہت پر لطف اور اہم مواد حاصل کیا ہے۔ اس کتاب میں سروجنی نائیڈو کے بعض نظموں کے ترجمے بھی شامل ہیں۔ صفحات ۵۰ قیمت دو روپے۔

حیدرآباد کے بڑے لوگ ان میں نہایت اہم اور مفید تاریخی و سیاسی و سماجی معلومات نہایت بے باکی سے قلمبند کی گئی ہیں اور جدید حیدرآباد کی زندگی کے معماروں کا تذکرہ درج ہو گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے حیدرآباد کی گذشتہ نصف صدی کی زندگی سامنے آجاتی ہے۔ اور ان اصحاب کی خدمات اجاگر ہو جاتی ہیں جنھوں نے اس مرحوم ریاست کی بیداری اور ہمہ جہتی ترقی کے لیے بے لوث خدمات انجام دیں۔ دکن کی تاریخ میں یہ کتاب ایک خاص اہمیت اور خصوصیت کی حامل رہے گی۔ صفحات ۱۵۲ قیمت دو روپے۔

میاں دادخاں سیاح اور ان کا کلام مرتبہ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی ایم اے، پی ایچ ڈی پروفیسر اردو جوگیشوری کالج بمبئی۔ میاں دادخاں سیاح اردو کے ایک عجیب و غریب شاعر، ادیب اور سیاح تھے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب نے ان کے نام بہت دلچسپ خطوط لکھے ہیں اور سیاح نے غالب کے مخالفوں کے دندان شکن تحریری جواب دیے ہیں۔ اتفاق سے سیاح کا دیوان دستیاب ہو گیا ہے جس کو مدنی صاحب نے بڑی محنت سے مرتب کر لیا اور سیاح کے حالات زندگی بھی معتبر ذرائع سے فراہم کر کے اور ایک تحقیقی کتاب کی صورت میں لکھ کر ادارہ کو اشاعت کے لیے روانہ کیے۔ یہ کتاب ادارے نے خاص اہتمام کے ساتھ با تصویر شائع کی جو تاریخ ادب اردو اور غالبیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک نادر تحفہ ہے۔ بڑی سائز صفحات ۹۶ قیمت دو روپے۔

ملنے کا پتہ :- **ادارۂ ادبیات اردو** خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن

مجلسِ مشاورت

حبیب الرحمٰن
فضل الرحمٰن
ڈاکٹر یوسف حسین خاں
ڈاکٹر طاہر علی خاں مسلم
رائے جانکی پرشاد
سیّد محمّد
عالم خوندمیری
ڈاکٹر حفیظ قتیل
دلاور علی خاں
رضیہ بیگم
● خازن
عابد علی خاں
● کاتب۔ محمّد مظہر
● فرد سالانہ
ہندو پاک سے آٹھ روپے
ششماہی
پانچ روپے

منظورہ محکمہ تعلیمات حکومتِ حیدرآباد

مجلسِ ادارت

● سلیمان اریب
● حسینی شاہد
● مغنی تبسّم

جلد ۳ ..... شمارہ ۲

سنہ ۱۹۵۷ء

قیمت

بارہ آنے

ٹیلی فون
۵۴۰۲

پرنٹر پبلشر۔ سلیمان اریب ● نیشنل فائن پرنٹنگ پریس ● ۱۷ مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ

حیدرآباد دکن

اس شمارے میں

پہلی بات ۵
سخن گسترانہ بات عالم خوندمیری ۶

• مضامین

جعفر زٹلی ڈاکٹر محی الدین قادری زور ۹
غالب وقار احمد رضوی ۱۴
منٹو اور ترقی پسند ادب مغنی تبسم ۱۹

• نظمیں

اک قدم اور بڑھایا میں نے شمیم کرہانی ۲۵
اجنبی کیفی اعظمی ۲۷
شب تاب وحید اختر ۲۸
جب بھی سحر آئی شفیق فاطمہ شعریٰ ۲۹
وہ دیوانہ گیا غفور انیس ۳۲
دل زار راحل ۳۳
تجدید ارشد صدیقی ۳۵

• افسانے

کشمیر کی بیٹی رامانند ساگر ۳۶
زخم آمنہ ابوالحسن ۴۷
اندھیرا اجالا رتن سنگھ ۵۸

• غزلیں

فراق گورکھپوری ۶۲
قمر ساحری اثر مجیدی
غیاث صدیقی سیدہ اختر
انور معظم محمود ایاز ۶۹

• تبصرے

زرد داغ دل شاذ تمکنت ۷۱
خرام شاذ تمکنت
رات کے گھونگھٹ جیلانی بانو
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے جیلانی بانو
نیا دور وحید اختر
ساقی وحید اختر
ادب لطیف وحید اختر ۷۸

• بازگشت ۷۹

واجدہ تبسم، انور خواجہ، منظر شہاب
محمود ایاز، مقتدیٰ علی، حفیظ قیصر
احمد اسحاق نعمانی محمد صادق

پہلی بات

اپریل کا شمارہ حاضر ہے۔ مواد کے لحاظ سے یہ کیسا ہے؟ اس کے بارے میں ہم اپنے قارئین کا ردعمل ضرور معلوم کرنا چاہیں گے۔ ابھی ہمارے قارئین رسمی انداز ہی میں رائیں بھیج رہے ہیں لیکن ہم چاہتے ہیں کہ وہ کھل کر لکھیں اور تنقید کرتے ہوئے ذرا بے باکی اور صاف گوئی سے کام لیا کریں۔ "مصلحت کوشی" سے نہ لکھنے والوں کی خدمت ہو سکتی ہے اور نہ "صبا" کی۔

ویسے ہمیں اپنی کوتاہیوں کا علم ہے اور ہم "صبا" کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اس شمارے میں ہم "سخن گسترانہ بات" کے عنوان سے ایک مستقل فیچر شروع کر رہے ہیں۔ اس عنوان کے تحت ہر ماہ عالم خوندمیری کسی بھی ادبی موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔ عالم صاحب کے خیالات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں اور اگر ان کے خیالات سے اختلاف کرتے ہوئے کوئی صاحب کچھ لکھنا چاہیں تو ہم بخوشی اسے بھی شائع کریں گے۔

عالم ادبی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ نظام کالج حیدرآباد میں فلسفہ کے استاد ہیں اور اردو اور انگریزی ادب پر بہت گہری نظر رکھتے ہیں لیکن ان سے شکایت یہ ہے کہ وہ بڑے کوتاہ قلم واقع ہوئے ہیں ـــــ شائد اس طرح ہم ان سے کچھ لکھوا سکیں۔

کہانیوں میں اس دفعہ رامانند ساگر کی کہانی "کشمیر کی بیٹی" شائع کی جا رہی ہے۔ ہمارے بہت سے دوسرے افسانہ نگاروں اور شاعروں کی طرح فلم نے ساگر کو بھی ہم سے توڑ لیا ہے لیکن ان کے اندر کا افسانہ نگار اب بھی کبھی کبھی فلمی دنیا سے ادبی دنیا میں آجاتا ہے اور یہ کہانی اسی بات کا ثبوت ہے۔ ساگر کی یہ کہانی ہندی، تامل اور غالباً انگریزی میں بھی ترجمہ ہو کر شائع ہو چکی ہے لیکن اب پہلی بار اردو میں شائع ہو رہی ہے ـــ ہم نہیں جانتے کہ اس کہانی کو شائع کرنے میں کیا خطرہ تھا، اور ہم نہیں سمجھتے کہ اس کو شائع کرنے میں کیا برائی ہے؟

○

پچھلے شمارے میں خیرات ندیم کی غزل کے ایک مصرعہ میں "بھی" کی بجائے "کچھ" چھپ گیا ہے اس کی تصحیح کر لی جائے۔

اصل مصرعہ یوں ہے "غم زندگی کی گھڑیاں بھی عجیب کٹ رہی ہیں"

عالم خوندمیری

(مستقل فیچر)

سخن گسترانہ بات

کم و بیش پچھلے بیس سال سے ہمارے ملک میں دانشوروں اور ادیبوں کی عوام سے وابستگی اور ان کی سیاسی و تصوراتی جانبداری پر بجا طور پر زور دیا جا رہا ہے، لیکن تصویر کے اس رخ کو اس حد تک اہمیت دی گئی کہ دوسرا رخ اوجھل ہو گیا، یہ صحیح ہے کہ جاندار ادب کی تخلیق اور صحت مند فکر کی نشوونما کے لیے حقیقت سے قریب ترین ربط ضروری ہے لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ حقیقت سے ربط اس وقت تک نتیجہ خیز نہیں ہوتا جب تک کہ ادیب اور اہل فکر صحیح معنیٰ میں آزاد شخصیت کے حامل نہ ہوں۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس سے بہت کم لوگ اختلاف کریں گے لیکن مشکل یہ ہے کہ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو آزادی اور خصوصاً ذہنی اور فکری آزادی کے بارے میں ایک واضح نقطۂ نظر رکھتے ہوں۔ نظریات اور تصورات میں جہاں یہ طاقت ہوتی ہے کہ وہ فکر کو غلامی اور حکومت سے آزاد کرتے ہیں وہیں ایک منزل پر پہنچ کر یہی نظریات اور تصورات انسانی فکر کی غلامی کا ذریعہ بن جاتے ہیں اگر نظریات حقیقت تک پہنچنے کے ذرائع کے بجائے عقائد اور ایقانات کا روپ اختیار کر لیں۔ ممکن ہے اس ادّعا سے بعض لوگ اختلاف کریں لیکن کیا کریں یہ ایک واقعہ ہے کہ علم اور ذہن کی دنیا ہی میں آزادی اپنا اصلی اور حقیقی مفہوم حاصل کرتی ہے۔ عمل کی دنیا بے شمار رکاوٹوں کی دنیا ہے اور ان رکاوٹوں پر غالب آنے کے لیے انسانی ذہن کو آزادی کی قیمت بھی ادا کرنی پڑتی ہے آزادی کی یہ قربانی ابتدائی تصور کی ترمیم کی صورت میں دی جاتی ہے۔ آزاد عمل آزاد فکر اور آزاد ذہن کی پیداوار ہوتا ہے اور ذہنی آزادی کا مفہوم مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ عقیدے سے زیادہ صحت مند شک انسانی فکر کا رہنما ہو۔ عقیدہ کی اہمیت سے انکار نہیں اور خصوصاً عمل کی دنیا میں عقیدہ ایک اہم مقام کا حامل ہے لیکن عقیدہ جب فکر انسانی پر مسلط ہو جاتا ہے تو وہ آزادی فکر کے تمام راستوں کو بند کر دیتا ہے شک کی صلاحیت ہی آزادی کے لیے امکانات کی تخلیق کرتی ہے اور حقیقت سے ہمارے ربط کو زیادہ وسیع اور گہرے معنیٰ عطا کرتی ہے ایک عقیدہ پرست ذہن جو ایک بنے بنائے فکری نظام کا پابند ہو جو چند مسلّمہ عقائد کو حرف آخر تصور کرتا ہو، جو صداقت تک پہنچنے کے لیے صرف ایک ہی راستے کا قائل ہو اور جو نام نہاد مسلّمات سے انحراف کو گناہ اور گمراہی کا ذریعہ تصوّر کرتا ہو۔ کبھی بھی حقیقت کا بھرپور ادراک نہیں کر سکتا حقیقت کے ادراک کا

کوئی واحد مسلّمہ طریقہ نہیں ہو سکتا، اگر حقیقت متحرک ہے اور تبدیلی پذیر، تو پھر کوئی عقیدہ اور نظریہ حقیقت کے تمام پہلوؤں کا انکشاف نہیں کر سکتا کوئی لمحہ ایسا مثالی نہیں ہو سکتا کہ جس میں ہم حقیقت کے کسی پہلو کا مکمل ادراک کر سکیں اور ادراک کا کوئی ایسا زاویہ ممکن نہیں جو تمام پہلوؤں کو یا کسی ایک پہلو کے تمام گوشوں کو بیک وقت منکشف کر سکے، حقیقت لامحدود ہے اور ادراک کے بھی امکانات لامحدود ہیں۔ صرف ایک ایسا متجسس ذہن جو خود اپنے مفروضات اور مسلّمات پر بار بار تنقید کر سکتا ہو اور ان کا امتحانی نقطۂ نظر سے مطالعہ کر سکتا ہو حقیقت تک ممکنہ رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ تجربہ خانہ میں کام کرنے والے ایک سائنٹسٹ کے لیے ان باتوں .... میں کوئی ندرت نہیں لیکن ادیب اور اہلِ فکر جو فکر کی دنیا میں رہتے ہیں، فکری نظاموں کو حقیقت کا بدل تصور کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ انسانی فکر اور ذہنی تخلیقات کبھی کبھی تکرار کا شکار ہو جاتی ہیں اردو ادب کے اکثر نقاد اور مبصر یہ شکایت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ ہمارے موضوعات میں نیا پن اور جدت کم ہوتی جا رہی ہے۔ یہ شکایت ایک حد تک صحیح ہے لیکن مرض کے صحیح علاج کے لیے اس کے سماجی اور عمرانی اسباب کی تحقیق ضروری ہے۔ شاید اسی تکرار کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہمارے تمدن نے سند اور روایت کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے اور جہاں سند اور روایت سے انحراف کیا گیا ہے وہاں عقل خداداد کو رہنمائی کے لیے کافی سمجھا گیا ہے لیکن عقل کے دونوں ماخذ ہیں اور جن میں تجربہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے تقریباً نظر انداز کر دیے گئے ہیں اس کی عمرانی وجہ یہ ہے کہ ہمارے تمدن میں ایک عرصہ سے ٹھہراؤ ہے اور فلسفہ کو سائنس پر برتری اور تفوق حاصل رہا ہے ایک جامد تمدن میں فلسفہ بہت زیادہ اہمیت حاصل کر لیتا ہے۔ یوں کہنے کو تو نئے ادیبوں اور تنقید نگاروں نے تجربہ کی اہمیت پر نظری طور پر کافی زور دیا ہے لیکن ان کے ذہن بھی تجربہ کے بارے میں بہت کم صاف رہے ہیں، تجربہ کو فکری اور تصوراتی نظام کا اس حد تک پابند تصور کیا گیا ہے کہ صداقت کا ایک پہلو دوسرے تمام پہلوؤں پر غالب آ جاتا ہے اور حقیقت کے مختلف پہلوؤں کے باہمی ربط کی جدلیاتی منطق پر علت و معلول کی میکانی منطق غالب آ جاتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تجربہ کی آزادی چند مخصوص سماجی، سیاسی اور تمدنی شرائط کی پابند ہو گئی، بدقسمتی یہ کہ یہ سماجی، سیاسی اور تمدنی شرائط عام طور پر قیاسی یا استخراجی (APRIORI) طریقہ سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ سیدھے سادے الفاظ میں ادیب کی آزادی کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے احساسات اور جذبات کے اظہار میں کسی پہلے سے بنی بنائی شرط کا پابند ہو اور نہ کسی نظریہ کے تقدس سے خائف ہو۔ نظریات کے تقدس کا احساس انسان کی ذہنی اور فکری آزادی کا سب سے بڑا دشمن ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ تقدس کا یہ احساس مذہب سے ہٹ کر کسی ایک فلسفہ یا فلسفیانہ نظام کے ساتھ وابستہ ہو جائے۔ ایک غیر مابعد الطبیعاتی فلسفہ بھی جس کا مقصد مابعد الطبیعاتی اندازِ فکر کی تنقید ہو، دنیاتی اور مابعد الطبیعاتی رنگ اختیار کر لیتا ہے خاص کر اسی وقت

جب اس فلسفہ کو ایک ایسا گروہ یا ایسا معاشرہ اختیار کر لیتا ہے جس کے تمدنی سانچوں میں دینیات، یا منظم مذہب کو بنیادی اہمیت حاصل ہو۔ اسی دینیاتی انداز فکر نے ہمارے ادب میں معقولیت پسند تحریکوں کو بھی ایک تقدس عطا کر دیا اور خصوصاً ترقی پسند ادب کی تحریک کا جو برا حشر ہوا وہ ہماری تہذیبی تاریخ کا ایک المناک سانحہ ہے۔ بحث یہ نہیں رہی کہ ادیب نے اپنے ذاتی تجربات اور احساسات کا ایماندارانہ اظہار کیا ہے یا نہیں۔ اس کے احساسات خالص ہیں یا مصنوعی، بلکہ تنقید کا سانچہ یہ بنا کہ آیا یہ ادب ایک خاص نقطۂ نظر کے ساتھ ہم آہنگ ہے یا نہیں اور چند خاص مفروضہ سماجی ضرورتوں کی تکمیل کرتا ہے یا نہیں۔ اس بنا پر اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ہماری تنقید اور ہمارے بعض نقاد ادب کی آزادی میں ایک بڑی رکاوٹ ثابت ہوئے ہیں۔ مثلاً ایک عرصہ تک ہمارے ادب میں "داخلیت" کی مخالفت کی جاتی رہی، مفروضہ یہ تھا کہ "داخلیت" عینیت کا ایک مظہر ہے اور عینیت فلسفیانہ طور پر غلط ہے اسی لیے داخلیت بھی غلط ہے۔ اس خالص منطقی استدلال کی بنیاد غلطی یہ تھی کہ انسانی تجربہ کو داخلی اور خارجی میں تقسیم کرنا مشکل ہے اور ضروری نہیں کہ داخلیت صرف عینیت کا مظہر ہو اور یہ بھی ضروری نہیں کہ عینیت ہمیشہ رجعت پسندی کی جانب رہنمائی کرتی ہو۔ یہ تو صرف ایک معمولی مثال ہے ورنہ ہماری جدید تنقید ایسی بہت سی مثالوں کو فراہم کرتی ہے جو فکری الجھاؤ کا افسوسناک اظہار ہیں۔ اسی قسم کی ایک بحث رومانی اور کلاسکی ادب کی بحث ہے۔ بہرحال ادب کے لیے فلسفیانہ نظریات کی اہمیت مسلم لیکن ادب کی ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کی ایک حد متعین کی جائے اس حد کا تعین نقاد کو نہیں بلکہ خود ادیب کو اپنے ذہن، فکر اور وجدان کی مدد سے کرنا چاہیے۔ اس کے سوا ادب کو صرف ایک فلسفیانہ نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ ادیب کے ذاتی اور انفرادی تجربہ کی مدد سے جانچنا چاہیے۔ ورنہ اس کا اندیشہ رہتا ہے کہ تنقید جمالیاتی کم اور فلسفیانہ زیادہ ہو جائے۔

گدھے کی سرگذشت لکھنے والے کرشن چندر کا ایک اور حسین اور چونکا دینے والا ناول

آسمان روشن ہے

شائع ہو گیا ہے

مکتبۂ افکار کی ایک اور فخریہ اور لازوال پیشکش

★ سفید چکنا کاغذ ——— ★ بہترین کتابت و طباعت

★ سہ رنگا سرورق ——— ★ قیمت: چار روپے

ایجنٹ حضرات اپنا آرڈر جلد ارسال فرمائیں

مکتبۂ افکار ——— رابسن روڈ کراچی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

جعفر زٹلی

میں نے ۱۹۲۷ء میں یعنی آج سے ٹھیک تیس سال قبل لندن میں جعفر زٹلی پر ایک مضمون لکھا اور پڑھا تھا اور شاید اردو پانگار میں اشاعت کے لیے روانہ بھی کیا تھا۔ اس کے بعد خود اس کو بھول گیا گذشتہ سال اریب نے مجھ سے ذکر کیا کہ ڈاکٹر طاہر علی خاں مسلم کی خواہش ہے کہ وہ مضمون مجھ سے حاصل کر کے صبا میں چھاپا جائے۔ میں نے اپنے کاغذات میں اس مضمون کو بہت تلاش کیا مگر نہ اس کا مسودہ ملا اور نہ یہ یاد ہے کہ کب اور کس پرچے میں چھپا تھا۔ میں نے معذرت کر دی۔ مگر اریب اور ڈاکٹر صاحب اس کے لیے یاد دہانی فرماتے رہے۔

حسن اتفاق سے اس سال ماہ جنوری میں ادارہ ادبیات اردو کے قلمی نسخوں میں جعفر زٹلی کا ایک دیوان بھی نکل آیا۔ میں نے اس کے بارے میں اپنے زیر ترتیب تذکرہ مخطوطات جلد سوم کے سلسلے میں اس کی تفصیلات لکھ لیں۔ اور اریب سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے خواہش کی کہ اسی کو صبا کے لیے دے دوں۔ چونکہ یہ تحریر بہت مختصر تھی اس لیے میں نے کچھ اپنی یادداشت اور اپنی کتاب اردو شہ پارے سے جعفر زٹلی کی نسبت تفصیلات لکھ لی ہیں لیکن محسوس کرتا ہوں کہ ان پر ایک بسیط مضمون کوئی صاحب لکھ دیں تو بہتر ہے۔

میر جعفر علی ایک ایسے عبوری دور کے شاعر تھے جب شمالی ہند میں اردو پوری طرح شعر و سخن کی زبان نہیں بنی تھی۔ اور ایک ایسے علاقے (ہریانہ) کے رہنے والے تھے جہاں کی زبان نے اردو کی تعمیر میں ان کی پیدائش سے صدیوں پیشتر بہت بڑا حصہ لیا تھا۔

وہ فارسی کے مشہور شاعر مرزا بیدل کے ہم عصروں میں بہت بڑے ہزل گو تھے۔ اور اپنی بے باکی اور جدت طرازی کی وجہ سے اپنی زندگی ہی میں ہندستان گیر شہرت حاصل کر لی تھی۔ اگرچہ زٹلی کے ہم عصر اور بعد کے تذکرہ نویس ان کو شاعر نہیں مانتے لیکن ان کی نظموں میں سے چند کو چھوڑ کر غور کیا جائے تو شاعر کی حیثیت سے ان کو اچھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

اورنگ زیب کی تخت نشینی کے سال یعنی ۱۰۶۸ھ میں وہ پیدا ہوئے۔ اپنے باپ کے تیسرے لڑکے تھے۔ ان کے باپ کا نام سید عباس تھا اور وہ نارنول میں دکانداری کرتے تھے۔ ابھی وہ بچّہ ہی تھے کہ ان کے باپ کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد اپنے چچا میر سرور کے زیر نگرانی انھوں نے پرورش پائی اور مکتب میں تھوڑی بہت تعلیم پاکر فوجی کے لیے نکلے۔ خوش قسمتی سے شہزادہ کام بخش کی فوج میں ان کو جگہ مل گئی (یہ شہزادہ اپنے باپ اورنگ زیب کے ہمراہ دکھن آیا تھا) اور حیدرآباد میں رہتا تھا۔ حیدرآباد کے فتح دروازہ ہی کے پاس اپنے بھائی سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ پس اس طرح سے میر جعفر کو کچھ عرصہ تک حیدرآباد میں رہنے اور یہاں کے شعرا سے ملنے یا کم از کم ان کے کلام کو پڑھنے کا موقع ملا۔

اس میں شبہ نہیں کہ اسی اثر کی وجہ سے میر جعفر کو اردو نظم لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ لیکن جب وہ دہلی گئے تو کسی نے بھی ان کے کلام کی طرف توجہ نہیں کی۔ اس پر ان کو ایک ایسی فضا پیدا کرنے کا خیال پیدا ہوا جس میں کم از کم ان کے کلام کو سننے والے پیدا ہو جائیں۔ اس خیال نے ان کی شاعری کے مستقبل کو اسیدافزا بنانے میں بڑی مدد دی۔ پہلے پہل انھوں نے اردو اشعار میں فارسی الفاظ اور محاورات استعمال کیے لیکن پھر بھی وہ مشہور نہ ہو سکے۔ اس کے بعد انھوں نے ہجو لکھنی شروع کی جس کی وجہ سے نوابوں اور سوداگروں سے ان کو خوب روپیہ ملنے لگا اور سب ان کی اردو آمیز فارسی ہجو سے ڈرنے لگے۔ قدیم تذکروں میں ہمیں ان کی فارسی اور اردو کی مخلوط نظموں کے کئی نمونے ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ زٹلی نے ہجو نگاری کو بڑی خوبی سے ذریعہ معاش بنایا تھا۔ برٹش میوزیم میں ان کی اکثر مخلوط نظموں کو اردو مخطوطات کی فہرست میں داخل کیا گیا ہے۔ بیدل اور حزیں جیسی ادبی شخصیتیں بھی زٹلی سے گھبراتی تھیں۔ باوجود ان تمام کامیابیوں کے اس ہجو نگاری سے ان کو نقصان بھی پہنچا۔ چنانچہ کئی بار ان کو ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا اور بالآخر ۱۱۲۵ھ میں بادشاہ فرخ سیر کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔

جعفر زٹلی کی شاعری کا مجموعہ فصیح اور غیر فصیح دونوں کا آمیزہ ہے۔ غیر فصیح شاعری کو علیحدہ کر کے اگر باقی ماندہ کلام کا اندازہ لگائیں تو زٹلی کو اردو کا ایک اچھا شاعر کہا جا سکتا ہے۔ انڈیا آفس کے کتب خانے میں ان کی نظموں کا جو مخطوطہ ہے اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا "اخبارات سیاسیہ" ہے جس میں مختلف واقعات پر چار فارسی کہانیاں ہیں جو اورنگ زیب کے سامنے بیان کی گئی تھیں۔ اردو میں اس کا جواب بھی ہے۔ اگرچہ صرف جواب چار سطروں میں ہے لیکن وہ اس حیثیت سے بہت اہم ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شہنشاہ بھی اپنی خانگی گفتگو میں اردو زبان استعمال کرتا تھا۔ دوسرا حصہ "اخبارات دربار معلے" ہے۔ جس میں پانچ قصے ہیں جن میں سے چار خود شاعر سے متعلق ہیں اس میں دکھایا ہے کہ وہ درباریوں سے کس

طرح روپیہ کھینچتے تھے اور ان کو سن کر بادشاہ نے کیا جواب دیا۔ تیسرا حصہ طویل ہے اس میں اردو اور فارسی کے مختلف موضوعوں پر لکھی ہوئی پنتالیس نظمیں ہیں۔ اردو کے بہترین نمونوں کے طور پر ذیل کی نظموں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ سلوک ۲۔ جوبن نامہ ۳۔ اختلاف زباں ۴۔ مرثیہ عالمگیر۔

اگرچہ یہ بھی ہزل اور فحش آلود ہیں مگر ان میں اس عہد کی بعض ایسی سماجی اور تاریخی باتیں محفوظ ہو گئی ہیں جو تاریخوں اور عام شعر و سخن کے مجموعوں میں نہیں ملتیں۔ انھوں نے اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کی بھی ہجو آمیز مدحیں لکھی ہیں۔ نمونہ کے طور پر مرزا خدایار کی ہجو کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

کروں اب خبر شہر بازار کوں	لگی آہ میری خدایار کوں
خدایار پر صبر میرا پڑا	کہ تالاب پر یہ بکھیڑا پڑا
بدست حریفاں گرفتار شد	سرش قابل مشت و پیزار شد
چو مرزا چہ گفتار و رفتار او	چہ پاجامۂ چوڑیاں دار او
تڑا تڑ تڑا تڑ لگی لاگنے	مٹک چال مرزا لگے بھاگنے
چو ایں ماجرا جان باشنید	دوا دو روا دو پیا پے رسید
رسید ایں جواں مرد با اختصاص	کیا شیر کے منہ سے گیدڑ خلاص
اگر مرد ثابت نہ ہو سانچ پر	اسے جس نہیں تیغ کی آنچ پر
مصاحب نہ کیجے کفن چور کوں	کہ کھودے سدا پیر کی گور کوں
مجھ اوپر جو کوئی شفقت رکھے	مگت بیچ اس کی خدا ست رکھے

اس کلیات کی نقلیں اور جگہ بھی ملتی ہیں اور یہ بہت مقبول رہا ہے۔ چنانچہ خود زٹلی نے اس کے خاتمہ پر اس کی نسبت لکھا ہے ؎

خوش آمد طبع شاہ و گدا	کشائندۂ قفل دلہا سدا
اگرچہ سبھی کوڑہ و کرکٹ است	بہ ہندی در ندی زبان لٹ پٹ است
ولیکن کسی نے پہیلی کہی	جسے پیو چاہے سہاگن وہی
بیا جعفرا ایں جا سخن کن تمام	کہ ماقل و دل است خیر الانام

ادارہ ادبیات اردو کے نسخے میں کلیات زٹلی کے خاتمہ پر ایک غزل سٹلی پسر میر جعفر زٹلی کی لکھی ہوئی ہے یہ کلیات بمبئی میں ۱۷۱۲ء میں چھپا تھا۔ اور اتنا مقبول ہوا کہ حیدر آباد میں چار سال بعد اس کے نسخے کیا ب ہو گئے۔

تو ایک خوش خط کاتب احمد علی نے اس کو نہ صرف نقل کیا بلکہ اس کے سلسلہ میں خود بھی متعدد تاریخیں اور اشعار اسی ڈھب کے جمع کر دیئے ہیں۔ چنانچہ اس کی اہمیت محض ان ہی الحاقی اشعار و مضامین کی وجہ سے بہت زیادہ ہے ترقیمہ سے پہلے بمبئی کی طباعت کا قطعۂ تاریخ جو لکھا ہے وہ یہ ہے ؎

عجائب یہ نسخہ ہے محبوب جگ — ہر اک لفظ اس کا ہے مطلوب جگ
لیا ہم غیب نے اس کا سال — کہ جعفر زٹلی ہے مرغوب جگ

اس کے بعد حسب ذیل ترقیمہ لکھا ہے

"بمبئی کرمہ نسخۂ موسوم بہ کلیات من جعفر زٹلی رحمۃ اللہ علیہ بتاریخ غرۂ مبارک ماہ صفر المظفر ۱۲۷۵ھ نبوی در کچہری عدالت بادشاہی بلدۂ فرخندہ بنیاد حیدرآباد در عہد ریاست نواب افضل الدولہ بہادر خاص بروز شنبہ بعد دوپہر روز برآمدہ تحریر یافت"

اس ترقیمہ کے بعد اس کے سلسلہ میں بغیر کسی فصل کے حسب ذیل واقعات کے قطعات تاریخ یا اشعار لکھے ہیں۔

۱۔ تاریخ مسند نشینی نواب افضل الدولہ
۲۔ سکۂ شاہ عالی گوہر
۳۔ سکۂ شاہ کام بخش
۴۔ سکۂ ٹیپو سلطان
۵۔ سکۂ شہزادہ بہادر شاہ
۶۔ تاریخ رحلت ناصر الدولہ
۷۔ تاریخ انتقال سراج الملک دیوان دکن
۸۔ تاریخ بنگٹ باشی راجہ چندولال
۹۔ تاریخ رحلت میر جعفر زٹلی
۱۰۔ سکۂ غازی الدین حیدر رئیس لکھنو
۱۱۔ سکۂ عادل شاہ بیجاپور
۱۲۔ سکۂ نور جہاں
۱۳۔ تاریخ انتقال اکبر جاہ
۱۴۔ تاریخ انتقال میاں پیسہ
۱۵۔ تاریخ انتقال نظام علی خاں
۱۶۔ تاریخ انتقال سکندر جاہ
۱۷۔ تاریخ رحلت ناصر جنگ شہید
۱۸۔ تاریخ انتقال محمد شاہ بادشاہ و قمر الدین خاں
۱۹۔ تاریخ کشتہ شدن شہزادہ محمد اعظم شاہ و زیر و نواب نظام الملک آصفجاہ
۲۰۔ تاریخ انتقال سید بہاڑی
۲۱۔ شعر در شان امیر کبیر

امیر کبیر فخر الدین خاں شمس الامرا حیدرآباد کے ایک بڑے علم دوست امیر تھے۔ جنھوں نے اپنی ڈیوڑھی میں ایک پریس قائم کیا تھا اور سائنس کی متعدد کتابیں انگریزی اور فرانسیسی سے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کی تھیں (تفصیل کے لیے دیکھو داستان ادب حیدرآباد صفحات ۱۱۶ - ۱۴۳) وہ حیدرآباد میں بہت مقبول تھے۔ مگر اس

مغنی تبسم

منٹو اور ترقی پسند ادب

آپ متوقع ہوں گے کہ میں سعادت حسن منٹو کی زندگی یا ان کی افسانہ نگاری کے تعلق سے کوئی مبسوط یا مربوط مقالہ آپ کی خدمت میں پیش کروں گا اس لیے پہلے مجھے معذرت چاہنے دیجیے۔ افسوس کہ میں آپ کی اس توقع کو پورا نہیں کر سکوں گا۔ آج کی محفل میں ہم اور آپ منٹو کی یاد منانے، ان کی نجی اور ادبی زندگی اور ان کی ادبی تخلیقات کے بارے میں کچھ سننے سنانے کے لیے جمع ہوئے ہیں لیکن مجھے اجازت دیجیے کہ میں کچھ باتیں منٹو کے بعض نقادوں کے رویہ کے بارے میں بیان کروں۔

ہمارے ایک شاعر نقاد "علی سردار جعفری" جو خیر سے کافی پڑھے لکھے آدمی بھی ہیں منٹو کے بارے میں اپنی مشہور کتاب "ترقی پسند ادب" میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"ہمارے بہت سے ادیب تو ابھی تک مزدور کا مطلب بھی نہیں سمجھتے۔ سعادت حسن منٹو غلطی سے کسی چابی بیچنے والے کو مزدوروں کا نمائندہ سمجھ لیتے ہیں اور اس زبان سے سیٹھ کو گالی دلوا کر یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے انقلابی ادب کی تخلیق کی لیکن مزدور یہ کہانی پڑھ کر منٹو کی سادگی پر ہنس پڑتا ہے منٹو کا یہ مزدور بنیادی طور سے کسان ہے جس نے شہر میں آکر اپنی معصومیت کھو دی ہے لیکن منٹو کے ہاتھ میں پڑ کر وہ ہتک کی ہیروئین منٹو کی اس محبوب رنڈی سے زیادہ قریب ہو گیا ہے جو اپنے ایک گاہک کی زبان سے اپنی بدصورتی اور بڑھاپے کے بارے میں ایک فقرہ سن کر انتقاماً اپنے خارش زدہ کتے کے ساتھ سو جاتی ہے۔ "نیا قانون" کا تانگے والا بھی حالانکہ اس کی تصویر حقیقت سے زیادہ قریب ہے اسی ذہنیت کا اظہار کرتا ہے جب وہ نئے قانون کی خوشی میں ایک ٹامی کی مرمت کر کے جیل خانے پہنچ جاتا ہے۔ تینوں کہانیاں جن سے دوسری کہانی سو فیصد رجعت پرست اور انحطاطی ہے اور ایسی ہی اور کہانیاں مزدوروں سے ادیب کی ذہنی اور جسمانی دوری کی چغلی کھاتی ہیں اور یہ راز فاش کر دیتی ہیں کہ درمیانی طبقے کا ایک حساس نوجوان زندگی اور سماج سے مایوس ہو کر تلخی اور رکلیت کا شکار ہو گیا ہے اور وہ اپنے فن سے حقیقت کو تبدیل کرنے کے بجائے مسخ کر رہا ہے۔ وہ مزدوروں کی ذہنی سطح کی

پستی کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور اپنے فن کی بلندی کو ثابت کرنے کی طرح طرح سے کوشش کرتا ہے لیکن حقیقتاً وہ خود اس ذہنی سطح پر پہنچ گیا۔ جس کی پستی گندے نالوں اور چہ بچوں تک کو شرما دیتی ہے۔"
(ترقی پسند ادب ص)

اب اسے کیا کہا جائے کہ "نعرہ" کہانی کا موضوع خوش قسمتی یا بدقسمتی سے نہ تو سرمایہ دار اور مزدور کشمکش ہے نہ ہی اس کہانی کے ہیرو کو افسانہ نگار نے مزدوروں کا نمائندہ بنا کر پیش کیا ہے۔ یہ تنقیص یا تنقید جن افسانوں پر کی گئی ہے ان کا شمار منٹو کے اچھے افسانوں میں ہوتا ہے۔ نیا قانون اور نعرہ کہانیوں کے کردار کوچوان منگو اور کیشو لال حقیقی زندہ اور جیتے جاگتے کردار ہیں۔ نیا قانون کا قصہ صرف اس قدر ہے "استاد منگو کو انگریزوں سے سخت نفرت تھی۔ کیونکہ آئے دن چھاؤنی کے گورے سپاہی اس کے ساتھ اہانت آمیز سلوک کیا کرتے تھے۔ اس نے سنا کہ پہلی اپریل کو ایک نیا قانون نافذ ہونے والا ہے اس کی ساری توقعات اس قانون سے وابستہ ہوگئیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ قانون نہ صرف اسے گوروں کے ظلم سے نجات دلائے گا بلکہ اس کا اثر ان سیٹھوں پر بھی پڑے گا جو غریبوں کا خون چوستے رہتے ہیں۔ نیا قانون نافذ ہوا تو کوچوان منگو اپنی سادہ لوحی سے یہ سمجھ بیٹھا کہ اب راج اپنا ہو گیا ہے اس کی جھڑپ ایک گورے سے ہو گئی۔ منگو اب اس سے کیوں ڈرنے چلا تھا۔ اس نے ٹامی کی خوب مرمت کر دی ظاہر ہے نئے قانون کی وجہ سے حالات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی اور کوچوان منگو کو محض خوش فہمی تھی۔ پولیس نے اسے گرفتار کر لیا۔ وہ "نیا قانون" "نیا قانون" چلاتا رہا لیکن کسی نے اس کی نہیں سنی اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔" منگو اس مزدور طبقے کا فرد نہیں جو کارخانوں میں کام کرتا ہے۔ جو اپنی مانگوں کے لیے ہڑتال کرتا ہے وہ ایک ان پڑھ اور جاہل کوچوان ہے کسی ٹریڈ یونین کا ممبر نہیں ہے۔ اس کی معلومات سنی سنائی باتوں تک محدود ہیں۔ وہ افواہوں پر ایمان لے آتا ہے۔ منٹو نے اس کردار کی پیش کش میں نہایت ہی حقیقت نگاری سے کام لیا ہے۔ اگر وہ کوچوان منگو کے روپ میں کسی باشعور مزدور کو پیش کرتا تو حقیقت اور واقعیت سے انحراف کا مرتکب ہوتا ہے۔ "ہتک" جس کے بارے میں جعفری صاحب کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ سو فیصد رجعت پرست اور انحطاطی ہے، منٹو کی چند بہترین کہانیوں میں سے ایک ہے۔ طوائف یوں تو پہلے بھی بعض ادیبوں کی تخلیقات کا موضوع بنی ہے لیکن منٹو نے اس طبقے کی عورتوں، ان کے رہن سہن ان کے مسائل اور ان کی نفسیات کا جتنی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے اور پھر جس فنکارانہ خلوص کے ساتھ ایسے کرداروں کو اپنی کہانیوں میں جگہ دی ہے وہ کسی اور کے بس کی بات نہ تھی ـــــ سوگندھی ایک طوائف ہی نہیں عورت بھی ہے وہ جس ماحول میں رہتی ہے اس میں محبت کرنا جرم سمجھا جاتا ہے وہ جنسی بے راہ روی کے باوجود محبت کی پیاسی ہے۔ تب ہی وہ جھوٹ موٹ بھی محبت کے دو بول سن کر پگھل جاتی ہے۔ وہ طوائف بن کر اپنے انسانی حقوق سے دستبردار ہونا نہیں چاہتی

بادھو سے اس کے تعلقات گاہک اور طوائف کے سے تعلقات نہیں ہیں۔ اگر حالات اجازت دیتے تو ممکن ہے وہ کسی ایک مرد کی ہو رہتی لیکن سے مجبوراً طوائف کی زندگی بسر کرنی پڑی۔ وہ نہیں چاہتی کہ کوئی اسے لکاؤ شے سمجھ کر اس کے حسن و قبح کو پرکھے اور اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرے۔

سردار جعفری کی تنقید سے صرف دو ہی باتیں اخذ ہوتی ہیں۔ منٹو اس لیے قابل ملامت ہے کہ اس نے طوائف کو اپنی کہانی کا موضوع بنایا، دوسرے اس لیے کہ اس نے نچلے طبقے کے کرداروں کو جیسا دیکھا ویسا ہی پیش کر دیا اس طرح پورے مزدور طبقے کی توہین کی۔ اگر وہ طوائف کو مذہب اور اخلاق کے نام پر تائب ہوتا یا عشق اور شاعری سے شوق کرتے دکھاتا یا کسی خاص فارمولے کے تحت مزدور اور سرمایہ دار کی کشمکش کو پیش کر کے مارکسزم کے بنیادی اصولوں کا اطلاق کرتے ہوئے مسائل کا کوئی حل یا WAYOUT پیش کرتا اور اپنے کرداروں کو کٹھ پتلیوں کی طرح نچاتا تو ممکن تھا کہ ہمارے میکانکی انداز میں سوچنے والے بہت سے ترقی پسند نقادوں سے داد و تحسین حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔

سردار جعفری نے دو چار جگہ منٹو کا ذکر اس موقع پر کیا ہے جہاں انھیں کرشن چندر کی افسانہ نگاری کو سراہنا مقصود رہا ہے اور دو ایک جگہ اس کے نام پر فاتحہ حسن عسکری کے نام کے ساتھ پڑھا گیا ہے کرشن چندر کی افسانہ نگاری کے بارے میں اس موقع پر مجھے کچھ کہنا نہیں ہے۔ سردار جعفری نے دونوں میں جو خط امتیاز قائم کیا ہے وہ "سماجی شعور" ہے۔ میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ ادب میں جب ہم سماجی شعور کی بات کرتے ہیں تو اس سے وہ شعور مراد ہوتا ہے جسے شاعر یا ادیب اور ایک حد تک نقاد بھی اپنے اردگرد کے سماجی مظاہر کے تجزیے اور اپنے مشاہدے اور تجربے سے حاصل کرتا ہے۔ ایسے خام شعور سے جسے کوئی ادیب مارکس کی "سرمایہ" کو ہضم کیے بغیر حاصل کرتا ہے اچھے ادب کی تخلیق ممکن نہیں۔ سماجی شعور وارنش یا پینٹ نہیں جس کے ذریعہ بڑھائی فرنیچر کو جلا دیتے ہیں۔ درونِ خانہ نظر ڈالنے پر یہ بھید کھلتا ہے کہ قصور سعادت حسن منٹو کا تھا کہ وہ کرشن چندر کا ہم عصر کیوں تھا، اور کچھ خطا ان لوگوں کی بھی ہے جو منٹو کو کرشن سے اچھا افسانہ نگار اور بڑا فن کار مانتے ہیں۔ آگے چلیے تو اور گرہیں کھلتی ہیں۔ سعادت حسن منٹو حسن عسکری جیسے رجعت پرست ادیب کا دوست تھا۔ دشمن کا دوست، دوست بھی ہو سکتا ہے لیکن سردار جعفری تو مارکسسٹ ٹھہرے۔ انھیں غصہ اس بات پر ہے کہ منٹو نے "سیاہ حاشیوں" پر حسن عسکری سے دیباچہ کیوں لکھوایا۔ یہی شکایت انھیں فیض سے بھی تھی کہ انھوں نے "نقش فریادی" کا دیباچہ ن۔م۔ راشد سے لکھوایا اور خواجہ احمد عباس سے وہ اس لیے بدظن ہو گئے تھے کہ انھوں نے رامانند ساگر کے ناول کا پیش لفظ لکھا تھا۔ حسن عسکری نے ستم ظریفی یہ کی کہ منٹو اور کرشن کی افسانہ نگاری کا تقابل کر کے منٹو کا پلہ بھاری کر دیا عسکری نے اس دیباچہ میں جو کچھ تحریر کیا

ہے اس سے مجھے بھی اتفاق نہیں ہے میں تو یہ کہوں گا کہ منٹو کو انھوں نے اپنا آلہ کار بنانے کی کوشش کی اور اپنے نظریات و خیالات کو منٹو کے سر تھوپ کر اسے رسوا بھی کیا۔ لیکن جہاں تک "سیاہ حاشیے" کے افسانچوں کا تعلق ہے سردار جعفری کا کہنا کسی طرح درست نہیں کہ اس نے "فسادات کے ہولناک واقعات سے بھی لذت کا سامان فراہم کیا ہے"۔ جنسی جذبات کا ذکر یقیناً ان میں موجود ہے۔ لیکن منٹو نے مخصوص حالات میں انسانی نفسیات کے مطالعے کو پیش کیا ہے جو اپنی جگہ غلط نہیں ہے۔

یہ سردار جعفری کی پرانی کمزوری رہی ہے کہ وہ کسی بھی ادیب یا شاعر کے بارے میں بعض ذہنی تحفظات کے ساتھ کوئی غیر ذمہ دارانہ بات کہہ دیتے ہیں اور اس آسانی کے ساتھ اس بیچارے کی بھلی بری تخلیقات پر پانی پھیر دیتے ہیں کہ بایدو شاید۔ فراق، فیض، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، ن۔م۔ راشد، اختر الایمان را مانند ساگر، مخمار صدیقی، اور نہ جانے کتنے ادیب و شاعر آج تک ان کے ہدف ملامت بن چکے ہیں۔ لیکن اکثر صورتوں میں نتیجہ خود ان کے اور ترقی پسندی کے خلاف نکلا اور یہ دونوں کے لیے ٹھیک نہیں ہوا۔

"ترقی پسند ادب" میں ایک جگہ کرشن اور منٹو کی افسانہ نگاری کا موازنہ کرتے ہوئے وہ یوں رقم طراز ہوتے ہیں۔

> "غرض پروپگنڈہ دونوں کرتے ہیں۔ صرف فرق یہ ہے کہ ایک میں اتنی اخلاقی جرات ہے کہ وہ اپنی جانبداری اور تبلیغ کا اعتراف کرتا ہے اور دوسرے میں اتنی اخلاقی جرات نہیں ہے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ اس کا پروپگنڈہ مکروہ ہے۔ اس لیے وہ بار بار یہ اعلان کرتا ہے کہ میں پروپگنڈہ نہیں کرتا۔ میں ظالم اور مظلوم میں فرق نہیں کرتا۔ میں تو صرف آرٹ اور ادب پیدا کرتا ہوں۔ میں صرف رنڈیوں اور چکلوں اور بھڑوں کے بارے میں لکھتا ہوں اور مسلسل غلاظت کو گوارا بنانے کے لیے وہ حسن عسکری سے سند لیتا ہے کہ یہ اسلامی ادب ہے"۔ (ترقی پسند ادب صفحہ)

یہ منٹو پر سراسر بہتان ہے۔ خود سردار جعفری صاحب کے قول کے مطابق کوئی ادیب غیر جانبدار نہیں ہوتا اور منٹو کے افسانوں کا ہر قاری اس بات کی گواہی دے گا کہ اس نے کسی کہانی میں سامراجی ظلم و استبداد، سرمایہ دارانہ نظام کی لوٹ کھسوٹ، جنگ بازوں کی بہیمیت، فرقہ وارانہ فسادات کی انسانیت سوزی کی طرفداری نہیں کی۔ فحاشی اور عریانیت کا پرچار نہیں کیا اور نہ کبھی اس نے اپنی تخلیقات پر "اسلامی ادب" کا لیبل لگایا۔ دوسرے الفاظ میں وہ سامراج دشمن مزدور دوست، امن پسند اور انسانیت کا پجاری تھا۔ پروپگنڈے کا لفظ اردو میں خاص معنی رکھتا ہے اور خاص موقعوں ہی پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ادیب یا شاعر کسی چیز کی تائید کر سکتا ہے وہ ادب اور شعر کے ذریعہ قاری تک اپنا پیغام بھی پہنچا سکتا ہے لیکن لیڈروں اور صحافیوں کی طرح کسی بات کا محض پروپگنڈہ نہیں کرتا ظاہر ہے منٹو نے اگر یہ کہا بھی ہے کہ "میں پروپگنڈہ

نہیں کرتا" تو حق بجانب ہے۔

جعفری صاحب نے اپنے بیانات کی تائید میں بعض جگہ عزیز احمد کے حوالے دیئے ہیں اور یہ جتانے کی کوشش کی ہے کہ منٹو "علامت نگار" تھا۔ عزیز احمد لکھتے ہیں:۔

"منٹو کے یہاں جنس کا طلسم جس میں ان کا شعور اور لاشعور چاروں طرف سے گھرا ہوا ہے مدرجہ مریضانہ ہے ـــــ جنس نے سعادت حسن منٹو کے یہاں مذہب کی جگہ لے لی ہے ـــــ جس مصنف کے ذہن پر جنس چھائی ہو جنون بھی اس سے زیادہ دور نہیں رہتا ـــــ منٹو کا انقلابی ہیرو بھی بجائے اس کے کہ سلجھے ہوئے عمل سے، محنت اور کوشش سے، تبلیغ سے ملک کو کوئی فائدہ پہنچائے بالعموم اپنے جوش جنوں میں پاگل خانے یا مرگھٹ پہنچتا ہے ـــــ سب سے بڑا اعتراض منٹو پر یہ عائد ہوتا ہے کہ اس میں انسانیت کا راسخ عقیدہ کہیں نظر نہیں آتا۔"

میں سمجھتا ہوں کہ اس بیان میں ایک بات بھی منٹو کے تعلق سے صحیح نہیں لکھی گئی ہے۔ منٹو نے جنس کو اپنے افسانوں کا موضوع بتایا ضرور لیکن اس کے کسی بھی ایسے افسانے کو لے لیجئے جو جعفری صاحب اور اسلامی حکومت کے عدالت کے جج، دونوں کی نظروں میں فحش ہو اور اس کی کسی ایسی عبارت کو لے لیجئے جو فحش ترین ہو تب بھی کوئی باشعور قاری یہ نہیں کہہ سکے گا کہ اس کے پڑھنے سے لذت محسوس ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف عزیز احمد کے افسانوں اور ناولوں میں جہاں کہیں ایسے بیانات آئے ہیں وہ اکثر و بیشتر لذتیت سے آلودہ ہیں۔

حقیقت نگاری اور انقلابی حقیقت نگاری کے بارے میں اپنے خود ساختہ نظریات کو پیش کرنے کے بعد جعفری صاحب یہ ظاہر کرتے ہیں کہ منٹو کی کہانیوں کا حقیقت نگاری سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہاں ایک بار اور وہ کرشن اور منٹو کے افسانوں کا موازنہ کرنے لگتے ہیں۔

"منٹو اور کرشن کی کہانیوں کا بنیادی فرق یہی ہے کہ منٹو کے ہیرو مسخ شدہ انسان ہیں اس لیے وہ نمائندہ حقیقت نہیں رکھتے کیونکہ وہ زندگی کے ارتقا کی نمائندگی نہیں کر سکتے۔ کرشن کے ہیرو سماج کے ہوش مند اور باشعور معمار ہیں۔ وہ ارتقا کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس لیے نمائندہ حیثیت رکھتے ہیں ـــــ"

(ترقی پسند ادب ص ۲۵۵)

حقیقت نگاری کی بحث طوالت کی متقاضی ہے جس کی اس مضمون میں گنجائش نہیں ہے۔ پھر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہر ادیب اور شاعر کا انقلابی حقیقت نگار ہونا ضروری ہے۔ میں تھوڑی دیر کے لیے اس بات کو تسلیم کیے لیتا ہوں کہ منٹو حقیقت نگار نہیں تھا لیکن شاید اس بات سے خود جعفری صاحب بھی انکار کی جرأت نہیں کر سکیں گے کہ وہ بہت بڑا واقعیت نگار تھا۔ واقعیت نگاری حقیقت نگاری کی اساس ہوتی ہے۔

میں نے منٹو کے سب نہ سہی بہت سے افسانوں کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ اور اس ناقص رائے پر پہنچا ہوں (ناقص کا لفظ انکسار کے لیے لایا گیا ہے) کہ منٹو کے افسانے واقعیت نگاری کی بڑی اچھی مثالیں ہیں۔ کبھی یہ واقعیت نگاری صرف واقعہ کی عکاسی تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے کہیں وہ حقیقت نگاری کی سرحدوں کو چھوتی نظر آتی ہے اور کہیں تو اس کی سرحدوں سے پار بھی ہو گئی ہے۔ محض منٹو کی پشت پناہی مجھے منظور نہیں ہے اس نے اچھے اور برے دونوں طرح کے افسانے لکھے ہیں۔ بعض افسانوں میں اس کی واقعہ نگاری اور استعجاب انگیزی کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں رہی ہے بلکہ خود مقصد بن گئی ہے ایسے افسانے یقیناً کم تر درجے کے ہو گئے ہیں اور شاید آئندہ لوگ انھیں پڑھیں بھی نہیں اور پڑھیں بھی تو محض اسی مقصد کی خاطر۔ بھنگن، آنگن حسن کی تخلیق، دھواں، مس ٹین والا، کتاب کا خلاصہ، ٹھنڈا گوشت اور پھندنے وغیرہ اسی قسم کے افسانے ہیں (فہرست مکمل نہیں ہے۔ اس میں اور ناموں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے)۔ اس کے برخلاف ہتک، کالی شلوار، خوشیا، ممی، موذیل، باپو گوپی ناتھ، ٹوبہ ٹیک سنگھ، نیا قانون اور نعرہ وغیرہ کہانیوں کا شمار منٹو کے کامیاب اور بہترین افسانوں میں ہو سکتا ہے۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے افسانے اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے کہ منٹو نے اردو کو جتنے اچھے افسانے دیے ہیں (راجندر سنگھ بیدی کے استثنا کے ساتھ) کسی اور افسانہ نگار کے اچھے افسانوں کی تعداد اس کے عشر عشیر بھی نہیں ہے اور منٹو نے جتنے برے افسانے لکھے ہیں اس سے تعداد میں کہیں زیادہ برے افسانے دوسرے سب ہی افسانہ نگاروں کے پاس مل جائیں گے۔ یہ اور بات ہے کہ کسی نے ایک ہی افسانہ لکھا ہو اور وہ بھی شاہکار! یہی حال منٹو کے تخلیق کردہ کرداروں کا ہے۔ منٹو نے ہماری زبان میں بہت سے لافانی کرداروں کا اضافہ کیا ہے جن میں سے چند باپو گوپی ناتھ، ٹوبہ ٹیک سنگھ، سوگندھی، موذیل، ممی، خوشیا اور منگو کوچوان وغیرہ ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ترقی پسند ادب کے دوسرے ایڈیشن میں سردار جعفری منٹو کے تعلق سے اپنی تنقید پر ضرور نظر ثانی کریں گے۔ (یوم منٹو میں پڑھا گیا)

حیدرآباد میں "صبا" کی ایجنسیاں

- اسٹار کمپنی — بک سیلرس نیوز ایجنٹ۔ معظم جاہی مارکٹ۔ حیدرآباد دکن
- ڈگمبر لال — نیوز پیپر سپلائر — عابد روڈ۔ بس اسٹانڈ
- ایم، احمد علی خاں نیوز پیپر ایجنٹ۔ عابد روڈ
- کارنر پیپر ایجنٹ۔ علیم برادرس قریب اسٹیشن نام پلی

شمیم کرہانی

اک قدم اور بڑھایا میں نے

اک قدم اور بڑھایا میں نے
چاند کا شیشۂ رنگیں نہ ستاروں کے چراغ
کب سے چھایا ہے دھواں وقت کے میخانے پر
یہ المناک فضا، یہ مری تاریک حیات
جیسے دیوانے کا سایہ کسی دیوانے پر
تیز طوفاں کے ڈبوئے ہوئے بیڑے کی طرح
دل اندھیرے کے سمندر میں بہا جاتا ہے
ماتم درد کہیں شورش فریاد کہیں
امن بھی ہے اسی دنیا میں کہا جاتا ہے
جلتے بجھے ہوئے ارمانوں کے گھائل جگنو
جیسے کہرے میں لرزتے ہوئے بستی کے چراغ
کوئی ٹوٹا ہوا تارا ہے کہ منزل میری
ابھی آکاش کا دیپک تھی ابھی خاک کا داغ

میری ہمت کہ قدم پھر بھی بڑھاتا ہوں ندیم
کہ مری زیست ہے آلام سے لڑنے کے لیے
اور کس دن کے لیے خود کو بچا کر رکھوں
غم نے پالا ہے مجھے غم سے جھگڑنے کے لیے

پھینکتا ہے غم دوراں وہ حوادث کے خدنگ
سر بسر خون تمنا میں نہا جاتا ہوں
دل سے کہتا ہوں کہ چل خوں میں نہاتا ہوا چل
بڑھ گئے قافلے والے میں رہا جاتا ہوں

اور پھر پاؤں بڑھاتا ہوں جو چلنے کے لیے
خار ہی خار نظر آتے ہیں گلشن کیسا —
وادیاں خوں سے چھلک اٹھتی ہیں منزل کیسی
مٹھیاں خاک سے بھر جاتی ہیں خرمن کیسا

ہار جاتا ہوں، مگر ہار کے منجدھار میں
پلٹ آتا نہیں ساحل کی طرف اے ساتھی
کہ مجھے معرکۂ زیست میں ہوتی ہے شکست
تو سمجھتا ہوں کہ منزل کی طرف اے ساتھی
اک قدم اور بڑھایا ہیں۔

کیفی اعظمی

اجنبی

اے ہمہ نور، ہمہ رنگ، ہمہ سوز و گداز
بزمِ مہتاب سے آنے کی ضرورت کیا تھی؟
تو جہاں تھی اسی جنت میں نکھرتا ترا روپ
اس جہنم کو بسانے کی ضرورت کیا تھی؟

یہ خدوخال یہ خوابوں سے تراشا ہوا جسم
اور دل جس پہ خدوخال کی نرمی بھی نثار
خار ہی خار شرارے ہی شرارے ہیں یہاں
اور تھم تھم کے اٹھا پاؤں بہاروں کی بہار

تشنگی زہر بھی پی جاتی ہے امرت کی طرح
جانے کس جام پہ رک جائے نگاہِ معصوم!
ڈوبتے دیکھا ہے جن آنکھوں میں میخانہ بھی
پیاس ان آنکھوں کی بجھے یا نہ بجھے کیا معلوم

ہیں سبھی حسن پرستِ اہلِ نظر، صاحبِ دل
کوئی خلوت کوئی جلوت میں سجائے گا تجھے
تو فقط جسم نہیں شعر بھی ہے گیت بھی ہے
کون اشکوں کی گھنی چھاؤں میں گائے گا تجھے

تجھ سے اک درد کا رشتہ ہے کوئی پیار نہیں
اپنے آنچل پہ مجھے اشک بہا لینے دے
تو جہاں جاتی ہے جادو کنے والا میں کون؟
رستے رستے میں مگر شمع جلا لینے دے

وحید اختر

شب تاب

مدّتیں بیت گئیں ساعتِ دیدار کو آئے
اک زمانہ ہوا اس پیکرِ خوبی کو بھلائے
گردِ غم ہائے دگر، صرصرِ نومیدی سے
سال ہا سال ہوئے یاد کے شعلوں کو بجھائے

پھر بھی اس راکھ تلے ہے کوئی چنگاری سی
گاہے گاہے جو اندھیرے میں چمک اٹھتی ہے
عشقِ ناکام کی محراب میں رکھّی ہوئی شمع
شبِ تنہائی کے زنداں میں بھڑک اٹھتی ہے
اور اس ڈوبتے سورج کی پگھلتی ہوئی آگ
اشک بن کر سرِ مژگاں کبھی دہک اٹھتی ہے
دامنِ دل میں اتر آتے ہیں ٹوٹے تارے
سینۂ ضبط میں اک پھانس کھٹک اٹھتی ہے

کل کی شب بھی اسی عالم میں یہ سوچا پہروں
کون اٹھائے گا یہ پلکوں سے پروئے ہوئے ہار
کیا گلا اس سے فراموش کیا ہے جس نے
میرے غم خانے کی شمعیں بھی نہیں شب بیدار

نیم خوابیدگیٔ یاس میں وہ پیکرِ اُمید
سامنے آ گئی اس شانِ دل آرائی سے
سرِ مژگاں ابھی روشن تھیں وفا کی شمعیں
کچھ نہ کہہ کر بھی کہا آنکھ کی گویائی سے
کوئی اشکوں کا خریدار نہیں دنیا میں
میں نے ہی ان کو چُنا ہے تیری تنہائی سے

تیرے آنسو مری پلکوں نے اٹھا رکھے ہیں
ہار ٹوٹے بھی تو آنکھوں سے لگا رکھے ہیں

شفیق فاطمہ شعریٰ

جب بھی سحر آئی

جب بھی سحر آئی یہاں
بادۂ گلگوں کا نشہ
ابر کے پیکر میں رچا
چشمۂ سیمیں میں بہا
موج کے ساغر میں رچا
آتش گلزار بنا، غنچہ احمر میں رچا

جب بھی سحر آئی یہاں
چاند ستاروں کے شرر
شرق کی لالی میں گھلے
اوس کے تابندہ گہر
نور کے دھاروں میں بہے
دشت میں تاحد نظر جال شعاعوں کے تنے

جب بھی سحر آئی یہاں
ناچ اٹھی بادِ صبا
جاگ اٹھے نغمہ سرا
رنگ اڑے عطر بہا
اشک تھمے درد مٹا
رات کے خاموش سمندر سے اٹھا سیل ضیا

جب بھی سحر آئی یہاں
اس کا یہی روپ رہا
اس کا یہی رنگ رہا
رقصِ تجلی کے لیے
آئینے کو تاہ پڑے
صحنِ جہاں تنگ رہا پیرہنِ بیاں تنگ رہا

کل کی ضیا، آج کی ضو
یہ بھی کوئی بات ہوئی
جب بھی تھمی وقت کی رو
جب بھی کبھی رات ہوئی
شعلۂ تغیر کی لو
برق صفت تیز ہوئی نور کی برسات ہوئی

جب بھی اٹھا شورِ درا
راہ اجلتی ہی رہی
قافلہ چلتا ہی رہا
چشمۂ رفتار سدا
موڑ بدلتا ہی رہا
سینۂ امواج میں اک سیل مچلتا ہی رہا

جب بھی بہار آئی یہاں
فطرتِ رنگین چمن
پھول اگلتی ہی رہی
محفل نو ہو کہ کہن
شہر ہو یا دشت و دمن
شمع مرے راگ کی جل جل کے پگھلتی ہی رہی

تا کہ نمایاں ہو کبھی
قسمتِ آدم کی سحر
جس کے لیے شام نہیں
جس کے نظارے کو ابھی
تابِ نظر عام نہیں
جس کے نقیبوں کو کسی دور میں آرام نہیں

قسمتِ آدم کی سحر
مثلِ صنم پردہ نشیں
وقت کے کہسار میں ہے
تیشۂ فن کار میں ہے
مشرقِ افکار میں ہے
نعرۂ جمہور میں ہے نغمۂ بیداری میں ہے

غفور انیس

وہ دیوانہ گیا

(مجاز کی موت پر)

ایک اک کر کے چلے راہروانِ ہستی
موت بے درد کہ ہنستی ہی چلی جاتی ہے
روح لرزاں ہے دہلتا ہے دلِ خوں گشتہ
لمحہ لمحہ یہی خدشہ کہ کوئی ہمراہی
چھٹ گیا ہو نہ کہیں ہم سے سرِ منزلِ زیست
اور پھر موت کے ہنسنے کی صدا آتی ہے
جیسے ہم درد کے ماروں کا خدا کوئی نہیں

آج خونبار ہے پھر دیدۂ محبوبۂ فن
سو گئے ساز کے تاروں میں سسک کر نغمے
ایک فنکار اک آوارۂ گیسوئے حیات
کس خموشی سے گیا موت کے ویرانوں میں
ہم ادا کر نہ سکے اپنی عقیدت کا خراج
"شہر کی رات" بھی ہے کس قدر افسردہ کہ آج
جگمگاتی ہوئی سڑکوں پہ "وہ آوارہ" نہیں

اے چراغِ رہِ ہستی ترا پروانہ گیا
آہ وہ رندِ بلانوش وہ دیوانہ گیا

راحل

دلِ زار

آ دلِ زار ادھر آ کہ تجھے پیار کریں
اپنے ایّامِ خزاں دیدہ کو گلزار کریں

تو ہی مونس تو ہی دلبر ہے یہاں تیرے سوا
کوئی ہمدرد نہیں، یہ بھی نہیں، وہ بھی نہیں

عہدِ رفتہ کے مصائب کو کہاں تک روئیں
یوں ہی آسائشِ فردا بھی گنوا دیں کہیں

آ دلِ آزار ادھر آ کہ تجھے پیار کریں
کچھ تو سوئے ہوئے ادراک کو بیدار کریں

ایک دن کی تھی تمنّا کہ انھیں اپنا لیں
سوئے طوفاں بڑھے ہم جیسے کنارا ہی تو تھا

زندگی اپنا گلا گھونٹ چکی تھی لیکن
جس سے تسکین ملی، تیرا سہارا ہی تو تھا

آ دلِ زار ادھر آ کہ تجھے پیار کریں
مل کے ہم ماتمِ جور و ستم یار کریں

مدعا اپنا یہاں کون کہے کون سنے
آشناؤں کو بھی اب عذر فراموشی ہے

دیکھ رو رو کے پپیہا بھی کہیں اونگھ گیا
ہم سفر اب تو یہی رات کی خاموشی ہے

آ دلِ زار ادھر آ کے تجھے پیار کریں
نطقِ تخئیل کو اپنے لب گفتار کریں

کون قدموں سے لگا ساتھ چلا آتا ہے
آہ! سایہ ہے کہ دم بھر میں جو کھو جائیگا
یہ بھی کمبخت فقط چاند کا شیدائی ہے
چاند کے ساتھ کسی غار میں سو جائیگا
آ دلِ زار ادھر آ کے تجھے پیار کریں
مختصر اور ابھی رشتۂ اغیار کریں
آخری شمع بھی لرزاں ہے سرِ راہ گذار
آج اک پھونک سے گل کر دیں کہ وہ بھی نہ رہے

سرحدِ چرخ پہ تاروں کی ضیا ہے تو سہی
مہرباں یونہی رہے گی یہ کوئی کیسے کہے
آ دلِ زار ادھر آ کہ تجھے پیار کریں
چشمِ صد شوق سے ہم بارشِ انوار کریں
زہر آلود ہے ہر موجِ ہوائے گیتی
سانس لینا ہو تو لذت کشِ آزار سہی
ذرّے ذرّے میں جہاں زخم کی بو آتی ہے
اب تو مرہم ہے یہی گل نہ ملے خار سہی
آ دلِ زار ادھر آ کے تجھے پیار کریں
اپنے ایّامِ خزاں دیدہ کو گلزار کریں

ارشاد صدیقی

تجدید

جب نئے ارادوں سے زندگی سنورتی ہے
آرزو کے آئینے جھلملا ہی جاتے ہیں
جب نگارِ مستقبل اپنا روپ بھرتی ہے
کچھ فسانے ماضی کے یاد آ ہی جاتے ہیں

اور ان فسانوں میں چلتی پھرتی تصویریں
ذہن کے دریچوں سے یوں ابھرنے لگتی ہیں
جیسے شب کے دامن پر چاندنی کی تحریریں
صبح کی خبر پا کر رقص کرنے لگتی ہیں

کاش اس تخیّل میں کوئی زندگی ہوتی
کاش ان دریچوں سے کوئی مسکرا دیتا
کاش ان شعاعوں میں اتنی روشنی ہوتی
کاش کوئی لو دے کر راہ جگمگا دیتا

ہاں مگر یہ اک تصویر اس طرح نکھرتی ہے
میل کے نشاں جیسے دور مسکراتے ہیں
جب نئے ارادوں سے زندگی سنورتی ہے
کچھ فسانے ماضی کے یاد آ ہی جاتے ہیں

رامانند ساگر

کشمیر کی بیٹی

اوڑی کے پاس جہاں ایک چھوٹا سا نالہ پونچھ کی پہاڑیوں سے نکل کر جہلم میں آ ملتا ہے۔ اس نالے کے اس طرف آج کل ہندوستانی سینا کا ڈیرا ہے۔ اور دوسری طرف پاکستانی فوجوں کا پڑاؤ ہے۔ جنھوں نے ۱۹۴۷ء میں کشمیر پر حملہ کر کے اس کے ایک بہت بڑے علاقے پر قبضہ کر لیا تھا۔ کشمیر کے جس ٹکڑے پر پاکستانی فوجوں کا قبضہ ہے اسے وہ لوگ "آزاد کشمیر" کہتے ہیں۔ اور اوڑی کے پاس یہی چھوٹا سا نالہ کشمیر کے ان دونوں ٹکڑوں کی سرحد بن گیا ہے۔

ایک اندھیری رات میں اس نالے کے کنارے پہرہ دینے والا پاکستانی سپاہی جانے کس کی یاد میں ایک پنجابی لوک گیت گنگنا رہا تھا۔

"چناوے تیری چاننی سیرے یارنوں ڈرا دے"

اپنے گاؤں سے سینکڑوں میل دور انجانے پہاڑوں کی سردی میں ٹھٹھرتا وہ کچھ اس طرح گا رہا تھا جیسے ان لوگوں کی شکایت کر رہا ہو جن کی سیاسی چالوں نے اسے اپنے سہانے وطن پنجاب سے دور کر دیا تھا۔

نالے کی دوسری طرف ہندوستانی فوج کا ایک سپاہی اپنی چوکی پر پہرہ دیتا ہوا اس پنجابی دھن کو سن رہا تھا۔ اور اس کے دل میں برسوں پرانی یادیں بیدار ہو رہی تھیں۔ جب اس کا گاؤں ملک کے بٹوارے کی نذر ہو کر پاکستان کے حصہ نہیں بن گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کسی نے ایک ہی وطن کے دو ساتھیوں کے درمیان ایک اندھیری کھڈ پیدا کر دی تھی۔ اور ان کے ہونٹوں سے ان کے مشترکہ رومانی گیت چھین کر کسی نے ان کے ہاتھوں میں ولایتی کارخانوں کی بنی ہوئی بندوقیں دے دی تھیں۔

پاکستانی سپاہی گاتا رہا اور کہرے سے بھری ہوئی کھڈ کے دوسرے کنارے ہندوستانی سپاہی اپنے وطن کے سپنے دیکھتا رہا۔ اور ان دونوں کو پتہ نہ چل سکا کہ ٹھیک اس وقت اس کہرے کی آڑ لے کر کالی لوئی میں لپٹا ہوا ایک آدمی اس چھوٹے سے نالے کو پار کر کے ہندوستانی علاقہ میں آ گیا ــــ اس کا نام حسن علی تھا!

حسن علی بارہ مولا کا رہنے والا تھا۔ اور جب حملہ آوروں نے بارہ مولا کو لوٹا تھا۔ تو وہ اس وقت

وہیں تھا۔ لیکن جب ہندوستانی فوجوں کے سامنے وہ لوگ پسپا ہوکر پیچھے ہٹ گئے تو حسن علی بھی بارہ مولا سے گم ہوگیا۔ بارہ مولا کے لوگ یہ سمجھے کہ وہ اس قتل عام میں کہیں مارا گیا تھا، یا جب ان لٹیروں نے شہر کے بڑے حصّے کو جلا کر راکھ کر دیا تو شاید اس میں وہ بھی جل گیا ہوگا، کیونکہ جس علاقے میں آگ کا بہت زور تھا اسی علاقے میں اس کی سنگین نوراں رہتی تھی۔ اور بہت سوں کا یہی خیال تھا کہ وہ نوراں کو بچانے کے لیے ضرور وہاں گیا ہوگا حتیٰ کہ نوراں کو بھی اس بات کا ناقابل برداشت دکھ تھا کہ اسے بچانے کے لیے حسن علی جل کر خاک ہوگیا اور وہ تڑپنے کے لیے زندہ رہ گئی۔ یہاں رک کر ایک بار وہ شہر کے بیچوں بیچ بہتی ہوئی جہلم ندی میں چھلانگ لگا کر دوسری دنیا میں حسن علی کے پاس پہنچنا چاہتی تھی۔ مگر اس وقت پنڈت نیل کنٹھ نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا تھا۔

پنڈت نیل کنٹھ نے ہی اسے جلتے ہوئے مکان میں سے بچایا تھا۔ پنڈت نیل کنٹھ کا مکان اس کے محلے میں تھا اور نوراں کا باپ پنڈت نیل کنٹھ کے یہاں کام کرتا تھا۔ جب پٹھان اس محلے میں پہنچے اور پنڈت نیل کنٹھ کا بڑا مکان دیکھ کر اسے لوٹنے لگے تو نوراں کے باپ نے اس وقت تک ان کو ڈیوڑھی پر روکے رکھا جب تک نیل کنٹھ اور ان کے بال بچے پچھلی کھڑکی سے کود کر ایک مسلمان ہمسائے کے مکان میں چھپ گئے۔ اس دھوکے بازی پر غصہ کھا کر پٹھانوں نے نوراں کے بوڑھے باپ کو وہیں گولی مار دی! اس افراتفری میں کسی طرح نیل کنٹھ اپنے بیوی بچّوں سمیت گھاٹ تک پہنچ گئے۔ اور ایک کشتی میں بیٹھ کر دریا کے راستے شہر سے دور نکل گئے۔ لیکن کشتی کھولنے سے پہلے وہ اپنی بیوی سے یہ کہہ کر واپس چلے گئے تھے کہ "اگر میرے لوٹنے سے پہلے پٹھان یہاں آجائیں تو کشتی دلستا یا کی لہروں میں چھوڑ دینا وہ چاہے حفاظت سے کسی کنارے لگا دے، چاہے اپنی لہروں کی گود میں تمہیں چھپا لے۔ مگر تمھاری لاج وہ ضرور بچا لے گی"۔ اور خود وہ نوراں کے مکان تک پہنچے۔ اور اس کی جلتی ہوئی ڈیوڑھی میں سے گذر کر دھوئیں کے مارے بے ہوش نوراں کو اپنی پیٹھ پر اٹھا کر واپس گھاٹ تک پہنچے۔ خوش قسمتی سے ابھی پٹھان اس گھاٹ تک نہیں پہنچے تھے، اور اس طرح پنڈت نیل کنٹھ کے ساتھ نوراں کی زندگی اور آبرو دونوں بچ گئیں۔

جب ان کی کشتی بانڈی پورہ پہنچی تب انھیں ہندوستانی فوج کے آنے اور بارہ مولا کے آزاد ہونے کی خبر ملی۔ بارہ مولا میں لوٹنے کے بعد پنڈت نیل کنٹھ نے حسن علی کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تاکہ نوراں کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیدیں۔ لیکن حسن علی کہاں تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب نوراں خود کشی کرنے پر آمادہ ہوگئی۔ پنڈت نیل کنٹھ نے موقع پر پہنچ کر اسے سمجھایا کہ "خدا نے زندگی مرنے کے لیے نہیں دی بلکہ اس لیے دی ہے کہ اس کی مدد سے خدا کی کائنات کو زیادہ سے زیادہ حسین بنایا جائے! اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی"۔

نوراں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ۔" مگر میرے لیے اب زندگی کا حسن کس کام کا ؟"

بوڑھے نیل کنٹھ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ۔" تو کیا ہوا بیٹی ۔ تمھارے کسی کام کی نہیں تو یہ زندگی دوسروں کے لیے وقف کر دو ۔ تم چاہے تو یہ زندگی کتنے ہی دکھی انسانوں کے دل میں امید کی روشنی بھر سکتی ہے ۔ جس زندگی کو تم موت کے اندھیرے میں کھو دینا چاہتی ہو وہی زندگی تم وطن کے حوالے کر سکتی ہو ۔ تم نوراں ہو تو چاروں طرف نور پھیلاؤ ۔ موت کا اندھیرا کیوں بڑھاتی ہو !

بوڑھے کی بات نوراں کے دل میں گھر کر گئی ۔ اور اب تو اس کی زندگی کا نقشہ ہی بدل گیا ! وہ کشمیر کی نیشنل ملیشیا میں داخل ہو گئی ۔ جہاں اس نے اپنے وطن کی حفاظت کے لیے رائفل تک چلانا سیکھ لیا ۔ اس نے اول رات کے اسکولوں میں جا کر خود لکھنا پڑھنا سیکھا اور پھر اپنی جیسی ہزاروں بچھڑی ہوئی کشمیری عورتوں کی خاطر ان کے محلوں اور گھروں میں جا کر علم کی روشنی پھیلانی شروع کی اور تب اس نے دیکھا کہ اس کام میں وہ اکیلی نہیں ہے بلکہ کشمیر کی وادی میں جہاں صدیوں سے جہالت کے اندھیرے نے ایک بزدلانہ سی سستی طاری کر رکھی تھی وہاں چند ہی سالوں میں چاروں طرف ایسی ہی ہزاروں روشنیاں ٹمٹمانے لگی ہیں ۔ جاہل کہلانے والے کشمیری کسی لمبی نیند سے بیدار ہو رہے ہیں ۔ اب وہ نہ صرف پردیسیوں سے نہیں ڈرتے بلکہ خود اپنے دیس کے رہنما بھی اب ان کے اندھے اعتقاد کا ناجائز فائدہ اٹھا کر انھیں بدھو نہیں بنا سکتے ۔

اس تاریخی بیداری میں نوراں جیسے جتنا کے عام انسانوں کا بھی اتنا ہی ہاتھ تھا جتنا جتنا کے نیتاؤں کا حصہ تھا ۔ چنانچہ نوراں بھی اپنے آپ کو کشمیر کی نئی تاریخ کا ایک حصہ سمجھنے لگی تھی ۔

یہ سب کچھ تھا ۔ مگر حسن علی کی یاد اس کے دل میں اسی طرح تازہ تھی بلکہ حسن علی کی جدائی کے غم نے ہی اسے دوسروں کے دکھ کا ساتھی بنا دیا تھا ۔ ان سات برسوں میں اسے کسی اور مرد کا خیال بھی نہیں آیا تھا ۔ وہ سمجھتی تھی کہ حسن علی سے اب مرنے کے بعد ہی ملاقات ہو گی ۔ اور اس ملاقات کے لیے وہ اپنے آپ کو ہر وقت تیار رکھتی لیکن جب اسی دنیا میں ایک دن نور کے تڑکے حسن علی اچانک اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تو نوراں کا یہ حال تھا جیسے کسی پر اچانک بجلی گر جائے ! تھوڑی دیر تو اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آیا ۔ مگر جب حسن علی نے اسی پرانے انداز میں اسے پکارا ۔" نوراں !" تو وہ کسی ٹوٹے ہوئے پھول کی طرح حسن علی کے سینے پر گر گئی ۔ اور پھر یوں معلوم ہوا جیسے جہلم ندی کا سارا پانی اس کی آنکھوں میں امڈ آیا ۔

وہ نیشنل ملیشیا کی پریڈ میں جانے کے لیے بہت سویرے اٹھی تھی ۔ مگر حسن علی کے آ جانے سے وہ اپنی ساری تیاری بھول گئی ۔ حسن علی نے اسے بتایا کہ وہ رات بھر اوڑی سے بارہ مولا تک پیدل چلتا رہا ہے ۔ سردی کے مارے حسن علی کا سارا بدن ٹھٹھرا ہوا تھا ۔ اس نے جو اپنی لوئی لپیٹ رکھی تھی وہ برف کی ایک چادر معلوم ہوتی

تھی۔ چنانچہ نوراں نے فوراً سماوار میں کوئلے بھرے اور چائے میں ڈالنے کے لیے بادام کوٹنے لگی۔
وہ کام کرتی جا رہی تھی اور ساتھ ساتھ باتیں بھی ہو رہی تھیں۔
حسن علی نے اسے بتایا کہ پٹھان حملہ آور اسے اپنے ساتھ لے گئے تھے اور یہ کہ اتنے برس وہ پاکستانی علاقے میں رہا۔
نوراں نے پوچھا! "تو جیل سے کس طرح بھاگے!"
حسن علی نے مسکرا کر کہا "میں جیل میں تو نہیں تھا!"
"جیل میں نہیں تھے۔ تو پھر تمھیں زبردستی مزدوری پر لگایا گیا ہوگا!"
"نہیں!"
"تو پھر وہاں کیا کرتے تھے؟"
"بس آزادی سے گھومتا تھا"
نوراں سماوار میں ڈالنے کے لیے سبز چائے کی پتیاں ہتھیلی میں مسل رہی تھی حسن علی کا جواب سن کر اس کے ہاتھ وہیں رک گئے۔ وہ غور سے حسن علی کو دیکھنے لگی۔ جس کے ہونٹوں پر اب تک مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ حسن علی کی مسکراہٹ کو تولتی رہی اور خود بھی مسکرانے لگی۔ سماوار کے ابلتے پانی میں چائے کی پتیاں ڈال کر حسن علی کے قریب آ کر اسے پیار سے دیکھتی ہوئی بولی۔
"تم سے مجھے اسی بہادری کی امید تھی کہ تم اپنی مصیبتوں کا ذکر مجھ سے کبھی نہیں کرو گے اور میرے سوالوں کو ہنس کر ٹال جاؤ گے۔ لیکن اب میں ویسی بدھو نہیں ہوں جیسی تم مجھے چھوڑ گئے تھے۔ اب کشمیر نیا کشمیر بن رہا ہے اور ہم لوگوں کو دنیا بھر کی سیاسی چالوں کی خبر ہے کیونکہ دنیا کے بہت سے ملک ہمارے کشمیر کے بارے میں طرح طرح کی چالیں چل رہے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ جو کشمیر کا سیوک حملہ آوروں کا ساتھی بننا منظور نہ کرے اسے وہ جیل کے سوا کہیں نہیں رکھتے۔ تم مزدوران کی جیل سے بھاگے ہو اور مجھے تمھاری بہادری پر ناز ہے۔"
حسن علی نے کچھ جواب دینا چاہا۔ مگر نوراں نے پیار سے اس کا منہ بند کر دیا اور کہنے لگی کہ "اب اور جھوٹ میں تمھارے منہ سے نہیں سننا چاہتی۔ چائے تیار ہوگی۔ میں تمھارے لیے قتلمہ لے کر آتی ہوں۔"
اور وہ مسکراتی ہوئی گھر سے باہر نکل گئی۔ گلی کے موڑ پر حسنو نان بائی کی دوکان اب تک کھل گئی تھی نوراں نے دو قتلمے خریدے۔ تو حسنو نے پوچھا
"کون مہمان آیا ہے نوراں۔ جس کے لیے قتلمے خرید رہی ہو؟"
نوراں نے جب کہا کہ "حسن علی جیل سے بھاگ کر آ گیا ہے۔" تو اس کا منہ نہ جانے کیوں لاج کے

مارے سرخ ہوگیا۔

حسو نان بائی اور اس کی دکان پر بیٹھے ہوئے دو گاہک اس خبر سے چونک پڑے اور انھوں نے بہت سے سوال پوچھے۔ جن کے من گھڑت جواب دے کر نوراں وہاں سے اپنے مکان کی طرف بھاگی۔ اس نے من ہی من میں حسن علی کی بہادری کا جو نقشہ بنالیا تھا اس میں جیسے ایک نشہ سا تھا اور سنجھی کی طرح جسے ایک مدت تک پنجرے میں بند رکھنے کے بعد اچانک ہوا میں چھوڑ دیا جائے۔ نوراں کا من کنجی اپنے پنکھ کھول کر ایک اڑان بھرتا۔ لیکن اڑنے سے پہلے ہی جیسے کسی جھجک کے مارے وہ پنکھ خود بخود بند ہو جاتے۔ اس کا من جیسے کوئی فیصلہ نہ کر پا رہا تھا۔ مگر پھر بھی ایک ان کہی خوشی کا سرور اس کے انگ انگ میں ایک ہلکاپن پیدا کر رہا تھا۔

اس نے حسن علی کو مینی کے پیالے میں الجتی ہوئی چائے پلائی۔ قتلمہ کھلایا اور پھر خود کہیں جانے کے لیے جلدی جلدی تیار ہونے لگی۔

حسن علی نے پوچھا۔ "کہاں جا رہی ہو؟"

نوراں نے جلدی جلدی گنگھی کرتے ہوئے کہا۔ "آج ہماری نیشنل ملیشیا کی پریڈ ہے۔"

"لیکن تمھیں اس پریڈ سے کیا لینا ہے۔ اب تو میں آگیا ہوں۔"

ایک تم ان کی جیل سے آزاد ہو کر بھاگ آئے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اس علاقے میں رہنے والے ہمارے سارے کشمیری آزاد ہو گئے ہیں جب تک ہم اپنا پھنسا ہوا علاقہ ان حملہ آوروں سے واپس نہ لے لیں ہم مادر کشمیر کے فرض کو نہیں بھول سکتے!"

"لیکن آج کے دن نہ جاؤ۔ تو؟"

"آج تو بہت ضروری ہے۔ کل صبح ہمارے نیتا ایک فوجی کمانڈر کے ساتھ اوڑی کا مورچہ دیکھنے جا رہے ہیں اور ہمیں راستے میں ان کا استقبال کرنا ہے اس لیے آج کی پریڈ بہت ضروری ہے۔"

حسن علی نے چونک کر پوچھا۔ "کل سویرے تمھارے نیتا اور فوجی کمانڈر ایک ساتھ آ رہے ہیں!"

"ہاں!"

حسن علی کی آنکھوں میں اس خبر سے ایک عجیب چمک پیدا ہو گئی۔ نوراں جلدی جلدی کپڑے بدلتی ہوئی کشمیر کا ایک رومانی گیت گنگنانے لگی۔ باغ نشاط کے گلونا ز کران کران دلو"

اور جب اس نے تیار ہو کر آئینے میں اپنی صورت دیکھی تو نوراں کو اچانک یہ احساس ہوا کہ اس نے انجانے میں مدت کے بعد آنکھوں میں کاجل لگا لیا ہے۔ آج اس کے بالوں میں شرابیوں کی سی لچک خدا جانے کہاں سے پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے میں آپ ہی آپ ایک ایسا بناؤ آگیا تھا جو کسی کو اپنی طرف دیکھنے کی دعوت

دے رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اسے اپنے آپ میں ایک لاج سی محسوس ہونے لگی اور اس کا جی چاہا کہ وہ اپنے کپڑوں کے اندر کہیں چھپ جائے۔ آج کی پریڈ پر نہ جائے۔ لیکن پھر اسے اپنے فرض کا خیال آیا، کشمیر کی اس نئی تاریخ کا خیال آیا جسے بنانے میں اس کا بھی حصہ تھا اور حسن علی سے کہہ کر کہ وہ دو گھنٹے کے اندر اندر آجائے گی وہ نیشنل ملیشیا کی پریڈ کے لیے چلی گئی۔

جب نوراں لوٹ کر آئی تو اس کے گھر میں حسّو نان بائی اور محلے کے دو چار آدمی حسن علی کے گرد بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ ان میں شیخ علی محمد بھی تھا جو سات سال پہلے گلمرگ میں پردیسی وزیٹروں کا بوجھ اٹھانے کی مزدوری کیا کرتا تھا۔ ان دنوں لوگ اسے علیا کے نام سے پکارتے تھے۔ ایک سال کسی انگریز کی کوٹھی میں نوکری کرنے سے وہ چند ٹوٹے پھوٹے انگریزی فقرے بھی بولنے لگا تھا۔ لیکن آزادی کے بعد اس نے بھی اتنی تعلیم حاصل کر لی تھی کہ اب وہ شیخ علی محمد جرنلسٹ بن گیا تھا اور اپنے شہر میں ہی ایک چھوٹا سا ہفتہ وار اخبار نکالنے لگا تھا۔ وہ ایک صحیح اخبار نویس کی طرح ہمسایہ ملک کے اندرونی حالات جاننے کے لیے حسن علی سے بات چیت کرنے آیا تھا مگر حسن علی کی باتوں کا انداز ہی جدا تھا۔ حسن علی کہہ رہا تھا "میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی کہ جب کشمیر میں اسّی فیصد کے قریب مسلمان رہتے ہیں تو پھر ہندوؤں کے پاس ابھی تک بڑے بڑے عہدے کیوں ہیں؟ ہندوؤں کو یہاں بیوپار کیوں کرنے دیا جاتا ہے۔ دوسرے علاقے میں اور کچھ نہیں تو کم از کم مسلمانوں کا راج تو ہے۔"

اس کا جواب حسّو نان بائی نے دیا۔ "ہم یہ سب گنتی نہیں جانتے بلکہ یہ جانتے ہیں کہ اب نہ صرف کشمیر میں بلکہ جموں پر بھی ہمارے بخشی صاحب کی حکومت ہے۔"

حسن علی نے بات کاٹ کر کہا۔ "وہ بھی تو ہندوؤں کا آدمی ہے۔"

اس پر علی محمد چپ نہ رہ سکا اس نے کہا۔ "ہندوؤں کا نہیں بلکہ غریب جنتا کا آدمی ہے۔ تم یہ بھول گئے کہ آج سے پہلے کبھی غریبوں کو چاول اور نمک اتنے سستے نہیں ملتے تھے؟ اور آج نہ صرف پیٹ کی بھوک بلکہ دماغ کی بھوک بھی اسی طرح مٹائی جاتی ہے۔ جب کہ کشمیر کے کالجوں میں بھی پڑھائی کی کوئی فیس نہیں لی جاتی مذہب کا نام لے کر تم ہو سال پرانے خیالات پیش کر رہے ہو۔ آج مذہب کا نہیں بلکہ بھوک کا مسئلہ سب سے بڑا ہے۔ مذہبی حکومتوں کی کیا درگت ہوتی ہے یہ تم ساری دنیا میں نہیں دیکھتے۔

اس کے بعد حسن علی کے لیے اپنی دلیلوں کی حمایت کرنا مشکل ہو گیا اس نے بات کا رخ پلٹنے کے لیے کہا "ہم تو شخصیتوں کی بحث میں الجھ گئے۔ حالانکہ ہم بات کر رہے تھے ملک اور اس میں رہنے والے لوگوں

کے مذہب کی۔ اور حکومت کی مذہب پرستی کی۔"

علی محمد "مذہب پرستی" کا لفظ سن کر گویا آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے جھلا کر کہا۔

"جس مذہب پرستی کا تم ڈھونڈرہ پیٹتے ہو اس کا صحیح نقشہ ہم نے آنکھوں سے اسی بارہ مولا میں دیکھا ہے جب لٹیرے یہاں آئے تھے۔ تو اسی شہر میں انھوں نے نہ صرف ہندوؤں کو لوٹا تھا بلکہ مسلمانوں کے گھر بھی اجاڑے تھے۔ انھوں نے مسلمان عورتوں سے بھی اسی بے دردی سے سلوک کیا تھا جس طرح انھوں نے ہندو عورتوں کی عصمت دری کی تھی۔ بتاؤ کیا مذہب کا پیار اشروانی ہندو تھا۔ جسے ان درندوں نے حضرت عیسیٰ کی طرح ہاتھوں میں کیلیں گاڑ کر ہلاک کر دیا۔ سات سال دوسرے علاقے میں رہ کر تم اپنے وطن کی عظمت بھول گئے تم بھول گئے کہ آج تم اسی بارہ مولا میں ہو جس شہر نے ایک ڈھال کی طرح اپنے سینے پر لٹیروں کے سب ستم سہے۔ مگر کشمیر کی حفاظت کی۔"

نوراں اب تک بظاہر خاموش بیٹھی یہ سیاسی بحث سن رہی تھی۔ پر اب اس سے چپ نہ رہا گیا جس علی کچھ جواب دینا ہی چاہتا تھا لیکن نوراں نے جذبات کے مارے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہ وہی بارہ مولا ہے جہاں میرا باپ ایک ہندو پنڈت نیل کنٹھ کو بچانے کے لیے تمھارے ان لٹیروں کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ اور جہاں پنڈت نیل کنٹھ اپنی اور اپنے بچوں کی جان خطرے میں ڈال کر مجھے بچانے کے لیے جلتی آگ میں کود گیا۔ اور جانتے ہو کہ ہماری جمہوری حکومت نے اسی نیل کنٹھ کی زمینداری ضبط کر کے مسلمان کاشتکاروں کو بانٹ دی ہے اور اس بوڑھے نے اف تک نہیں کی: کیا ان لوگوں کا کشمیر کی ترقی میں اتنا ہی حصہ نہیں جتنا کسی اور کا ہے۔ لٹیروں نے بارہ مولا کو آگ لگا کر سوچا تھا کہ یہ خاک ہو جائے گا۔ مگر انھیں پتہ نہیں تھا کہ اس آگ کے شعلوں میں روشنی بھی تھی۔ بارہ مولا کی آگ بجھ گئی لیکن ان شعلوں کی روشنی سے اب تک ساری وادیٔ کشمیر منور رہے۔"

نوراں جوش میں اتنا کہہ گئی لیکن باپ کی موت کا ذکر کرتے ہوئے اس کے آنسو نکل آئے تھے۔ اور آخری بات کرتے کرتے اس کا گلا رندھ گیا تھا۔ وہ اپنے آپ پر قابو نہ پا کر رونے لگ گئی۔ بات چیت بند ہو گئی سب لوگ اسے چپ کرانے لگے۔ حسن علی نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "بس یہی عورتوں میں عیب ہوتا ہے۔ ارے بھئی۔ ہم تو صرف بحث کر رہے تھے اور بحث میں غلط باتیں بھی ہو جاتی ہیں۔ اس لیے تو کہتے ہیں کہ عورتوں کو سیاہی بنا دو۔ ہاتھ میں بندوق دے دو۔ لیکن وہ اپنے اصلی ہتیار آنسوؤں کو کبھی نہیں چھوڑیں گی۔"

اس مذاق پر سب قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔ نوراں شرمندہ ہو کر اندر چلی گئی باقی لوگ ان دونوں کو چھوڑ کر چلے گئے۔ اور پھر کسی طرح حسن علی نے نوراں کو منا لیا۔ نوراں کو اس سے اتنا پیار تھا کہ اسے بہت جلد حسن علی

کی اس بات پر یقین آگیا، چونکہ وہ سات سال اپنے وطن سے باہر رہا۔ اسے کیا خبر کہ درحقیقت کشمیر میں کتنی ترقی ہوگئی ہے۔ وہ تو صرف وہی باتیں جانتا تھا جو اس نے دوسرے ملک میں رہ کر سنی ہیں۔ حتیٰ کہ رات ہوتے ہوتے وہ صبح کی باتیں بھول گئی تھی۔

اس رات بہت دیر تک حسن علی نوراں کے ساتھ شادی کی باتیں کرتا رہا، اور نوراں سہاگ رات کو بچھائے جانے والے پھولوں کی لڑیوں کے تانے بانے میں اس طرح الجھ گئی کہ سوتے ہوئے بھی اسی حسین جال میں پھنسی رہی۔

صبح وہ دونوں جلدی اٹھے۔ نوراں کو اپنے نیتا کے استقبال کے لیے جانا تھا۔ حسن علی بھی تماشہ دیکھنے کے لیے ساتھ ہولیا۔ نیشنل ملیشیا کی ڈیوٹی یہ تھی کہ ان کے والینٹر دو دو فرلانگ کے فاصلے پر نیشنل کانفرنس کی جھنڈیاں لے کر سڑک کے کنارے کھڑے رہیں۔

حسن علی کی بات مان کر نوراں نے ایک چھوٹے سے نالے پر بنے ہوئے پل پر اپنی ڈیوٹی لگائی۔ وہ مقام بڑا رومانی تھا۔ ایک چھوٹا سا نالہ اس پل کے نیچے سے دودھیا جھاگ پیدا کرتا ہوا چند گز کی دوری پر جہلم ندی کی گود میں کھو جاتا تھا اور اس جگہ ایک ایسا موڑ تھا کہ ادھر ادھر کھڑے ہوئے والینٹروں کی نگاہ وہاں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ نوراں سمجھ گئی کہ پیار کا متوالا حسن علی اس اکیلی جگہ اس کے قریب بیٹھ کر پیر شادی کی تفصیلی باتیں کرنا چاہتا ہے اور وہ بھی تو یہی چاہتی تھی۔

نوراں نے سرخ کپڑے پر بنے ہوئے ہل کے نشان والی نیشنل کانفرنس کی جھنڈی پل کے جنگلے کے ساتھ کھڑی کردی۔ یہ دونوں باتیں کرتے رہے اور وہ جھنڈی ان دونوں کی پیار بھری باتیں سن کر ہوا کے ہر گذرنے والے جھونکے کو ان کا راز بتانے کی کوشش کرنے لگی۔

اچانک دور سے والینٹروں کی آوازیں آنے لگیں۔ "ہوشیار ــــ ہوشیار"

اپنی باری آنے پر نوراں نے بھی زور سے آواز لگائی۔ "ہوشیار" اور ہوشیاری کی لہر پہاڑوں میں گونجتی ہوئی آگے بڑھتی گئی۔

"ان کے آنے میں کتنا وقت رہ گیا ہے" حسن علی نے پوچھا!

نوراں نے کہا۔ "دس منٹ"

حسن علی نے تھوڑی دیر نوراں کی طرف دیکھا اور پھر اپنے لمبے فرن کی جیب سے ایک کالا سا لوہے کا گولہ نکالا اور جلدی سے جاکر اسے پل کے نیچے لٹکا دیا۔ گولے کے ساتھ ایک لمبا تار لگا ہوا تھا اس تار کا ایک سرا اپنے ہاتھ میں لے کر دوسرے ہاتھ سے نوراں کا ہاتھ پکڑا اور کہا۔ "چلو یہاں سے ذرا دور ہٹ جاؤ"

نوراں نے حیران ہو کر کہا۔ "یہ کیا کر رہے ہو۔ مجھے پل پر پہرہ دینا ہے۔"

حسن علی کا انداز حاکمانہ ہو گیا۔ "بے وقوف مت بنو۔ میرے ساتھ آؤ اور تماشہ دیکھو۔"

پھر حسن علی اسے اپنی پوری طاقت سے گھسیٹتا ہوا نالے کی کھڈ میں اتار کر لے گیا اور جہلم کے کنارے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ حسن علی نے پھرتی سے دوسری جیب سے ایک ریوالور نکال لیا۔

اب ساری بات سمجھنے میں نوراں کو دیر نہ لگی۔ نیشنل ملیشیا میں وہ فوجی ہتھیاروں کی تعلیم پا چکی تھی۔ وہ رک گئی۔ اور حسن علی سے بولی۔ "تم ہم سے پل کو اڑا دینا چاہتے ہو!"

"چپ رہو۔" حسن علی نے سختی سے کہا۔

"لیکن میرے جیتے جی یہ غداری نہیں ہو سکتی۔"

حسن علی نے پستول تان دیا۔ "بے وقوف! شاندار شادی کی باتیں سوچتی ہو۔ لیکن یہ نہیں سوچتیں کہ شادی کے لیے روپیہ کہاں سے آئے گا۔ یہ کام ہو جائے تو ہم مالا مال ہو جائیں گے۔ پھر زندگی بھر کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔"

نوراں تڑپ کر بولی۔ "تو تم دشمن کے ایجنٹ ہو۔ کاش مجھے کل رات یہ پتہ ہوتا تو آج کشمیر والے یہ نہ کہہ سکتے کہ نوراں نے ایک غدار کو پیار کیا تھا۔"

حسن علی نے نوراں کے سامنے پستول کرتے ہوئے کہا۔ "خاموشی سے میرے ساتھ آؤ گی!....."

اپنی بے بسی پر نوراں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے اتنا کہا۔ "مگر اس کے بعد میں یہاں کسی کو اپنا منہ نہیں دکھا سکوں گی۔"

حسن علی نے فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "منہ دکھانے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ ہمارے یہاں سے نکل جانے کا سب انتظام ہو چکا ہے۔"

جوں جوں وہ گھائی میں اترتے گئے انہیں موڑ کے دونوں طرف دور دور تک سڑک نہ دکھائی دینے لگی تھی۔ اپنی اپنی جگہ کھڑے والنٹیروں کی سرخ جھنڈیاں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر نوراں کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس کی اپنی جھنڈی اسی پل کے اوپر بڑی تمکنت سے لہرا رہی تھی جس کے نیچے حسن علی کا رکھا ہوا بم ایک وحشیانہ قہقہہ لگانے کے انتظار میں تھا اور حسن علی اس کے آگے آگے پستول تھامے پتھر سے نیچے اتر رہا تھا۔

اچانک نوراں نے ایک جست لی اور حسن علی کے اوپر دھڑام سے گر گئی۔ حسن علی لڑکھڑا کر گرا۔ لیکن فوراً ہی تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر اتنی دیر میں اس کے ہاتھ سے گرا ہوا پستول نوراں کے ہاتھ میں آ چکا تھا۔ نوراں زمین سے اٹھ ہی رہی تھی کہ حسن علی نے پھرتی سے ایک پتھر اٹھا کر اس کے ہاتھ پر دے مارا۔ مگر نوراں

کی انگلیاں اس سے بھی تیز تھیں۔ ادھر نوراں کے پتھر لگا اور ادھر پستول کی گولی حسن علی کے سینے کے پار ہو گئی۔ اور وہ پتھروں سے لڑھکتا ہوا پانی کے کنارے جا گرا۔

نوراں کا سر پتھر کی چوٹ سے جیسے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا۔ خون نے اس کی آنکھوں کے آگے ایک سرخ پردہ ڈال دیا تھا اور ایک اندھیرا چاروں طرف پھیلتا جا رہا تھا۔ لیکن اس نے اپنی تمام تر قوتوں کو جمع کر کے سنبھالا۔ پستول کی آواز پہاڑوں سے ٹکرا کر واپس آ رہی تھی۔ حسن علی کے ہاتھ میں پکڑا ہوا لوہے کا تار اس کے گرنے سے اس طرح کھنچ گیا تھا کہ پل کے نیچے رکھا ہوا بم شور مچاتے ہوئے نالے میں گر کر اس طرح پھٹا کہ ایک اور دھماکہ چاروں طرف گونج گیا۔ لیکن پل صحیح سلامت تھا۔ اور نالے کی دودھیا لہریں اس بم کی مایوسی پر قہقہہ لگا کر ہنس رہی تھیں۔

نوراں نے دیکھا یہ دھماکہ سن کر دونوں طرف سے والنٹیر اپنی سرخ جھنڈیاں لیے اسی پل کی طرف بھاگ رہے تھے اور اس نے یہ بھی دیکھا کہ اس کا اپنا جسم آہستہ آہستہ موت کی گود میں پھسلتا جا رہا تھا حتیٰ کہ وہ بھی لڑھکتی ہوئی حسن علی کے قریب ہی نالے کے پانی میں گر گئی اور چند گز دوں کی دوری سے جہلم کی لہریں جیسے ہاتھ اٹھا اٹھا کر اسے بلا رہی تھیں۔ اب بھی اتنا احساس اسے باقی نہ تھا کہ اگر والنٹیر اسے اور حسن علی کو یہاں دیکھیں گے تو یہ بات چاروں طرف پھیل جائے گی کہ نوراں کا محبوب ایک غدار تھا۔

چنانچہ مرنے سے پہلے اس نے صرف اتنا کیا کہ حسن حسن علی کی گود میں لیٹ کر کل رات وہ شادی کے سہانے سپنے دیکھتی رہی تھی اسی حسن علی کی لاش کو گود میں لے کر پانی میں کسی طرح ڈھکیلتی ہوئی وہ جہلم ندی کی لپکتی ہوئی لہروں تک پہنچ گئی۔

جب والنٹیر پہنچے تو انھوں نے کسی کو بھی وہاں نہیں دیکھا۔ اسی وقت سرکاری موٹریں وہاں پہنچ گئیں جب والنٹیروں نے جھنڈیاں اٹھا کر "کشمیر زندہ باد" کے نعرے لگائے۔ اس وقت کسی نے یہ نہیں دیکھا کہ نوراں کی جھنڈی بار بار جہلم کی طرف جھک کر اپنی خاموش زبان میں کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔

شاید وہ جھنڈی کہہ رہی تھی کہ "خدارا ایک نظر ادھر بھی۔ جہاں کوئی خاموشی سے اپنے ملک پر قربان ہو گئی ہے۔ جس نئی تاریخ کو بنانے میں اس کا برابر کا حصہ تھا اسی تاریخ کے صفحوں میں شاید اس کا نام کبھی نہیں لکھا جائے گا۔ جس جھنڈے کو سربلند رکھنے کے لیے اس نے اپنا اور اپنی محبت کا خون ان پتھروں پر بہا دیا ہے وہ جھنڈا اس کے اعزاز میں کبھی سرنگوں نہیں ہوگا۔ بڑے بڑے نیتا اور ان کی جے کے نعرے لگانے والی جنتا کو شاید اس خاموش قربانی کی خبر نہیں ہوگی۔ چنانچہ اس سے پہلے کہ اس کا نازک جسم جہلم کے نیلے پانیوں میں جذب ہو جائے وہ ایک عزت بھری نگاہ کی مستحق ہے۔ وہ پھر لوٹ کے نہیں آئے گی اس لیے آخری

بار اسے دیکھ تو لو۔ اور کم از کم ایک "زندہ باد" کا نعرہ تو اس کے لیے بھی لگا دو۔" لیکن جھنڈی کی بات کسی نے نہیں سنی۔

اس دن جب کشمیر کے نیتا اور فوجی کمانڈر اوڑی کی سرحد پر کھڑے دور سے ہی دشمن کے پڑاؤ کو دیکھ کر اپنی مجبوری کا احساس کر رہے تھے، اس وقت جہلم کی لہروں پر سوار نوراں کا جسم ان سرحدوں کو پار کر کے ایک فاتحانہ انداز سے اس علاقے میں آگے بڑھ رہا تھا جس پر دشمن نے قبضہ کر لیا تھا۔ خون نے اس کے چاروں طرف پانی کی لہروں کو اس طرح رنگ دیا تھا گویا نیا کشمیر کا سرخ جھنڈا کشمیر کی ایک بہادر بیٹی کے اعزاز میں لہرا رہا ہو۔

(آل انڈیا ریڈیو سے نشر شدہ)

بقیہ

غالب

بہ حیثیت صاحب طرز انشا پرداز

ادبیات نثر اردوئے معلیٰ تو بن سکی لیکن کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی اردوئے معلیٰ نہ لکھی جا سکی اور غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب مقلدین کی بہ نسبت اپنے مزاج میں شگفتگی، ہمہ گیری کے ساتھ ساتھ قوت مشاہدہ اور مراسلہ نگاری کے متعلق ایک خاص نکتۂ انتخاب رکھتے تھے۔ وہ اگرچہ ایک انحطاط پذیر ماحول میں زندہ رہے تاہم ان کی فکر میں توانائی اور تازگی ہے اور ان کا تخیل بلند اور بے باک ہے۔ ان کا ذہن کئی تلخ حقائق سے دوچار ہوا ان کا ماحول یاس پسند تھا لیکن ان کی فطرت رجائی تھی خیال کی اور رنگ نشینی، فکر کی خلاقی اور شوخیٔ طبع نے ان کے شعور کی تشکیل کی اور ان کی خلاقی فکر، نقش گری، تندئی نظر، اسلوب و سلاست، منفرد شخصیت، ظرافت و بذلہ سنجی، نفسیاتی گہرائی، شوخیٔ بیان اور ان کے ایگو (EGO) ہی کے بنا پر اردو ادبیات عالیہ میں ان کا مقام ایک صاحب طرز انشا پرداز کی حیثیت سے بہت ممتاز ہے۔

آمنہ ابوالحسن

زخم

"تم ہی نے مجھ کو پریم سکھایا" وہ لہک لہک کر کسی پرانے فلمی گانے کی بڑی پیاری نقل اتار رہا تھا۔
میں نے ستانے کے لیے کہا۔ "بس بھی کرو سلیم سہ نید رقیب تو ریٹائرڈ ہو گیا اور پتہ نہ جانے کس حال میں ہے۔"
اس نے ٹائی کی گرہ باندھتے ہوئے پلٹ کر مجھے دیکھا پھر بولا۔ "بڑی بدذوق ہو"
"تمہارے ساتھ جو رہتی ہوں۔" میں نے کہا۔
"ہوں ــــ تب ہی" اس نے ہوں کو لمبا کھینچا پھر بولا "کبھی آئینہ دیکھا ہے؟"
"نہیں تو ــــ" میں بن کر بولی۔
"جبھی" ــــ وہ پھر تیاری میں منہمک ہو گیا۔
میں اٹھ کر جانے لگی تو اس نے مجھے پکارا۔ پاس گئی تو بولا "سامنے کچھ دکھائی دیتا ہے۔
"ہاں ــــ"
کیا ــــ؟
"آئینہ ــــ"
"تو ذرا صورت دیکھو اپنی۔"
"تم سے تو لاکھ درجے اچھی ہے۔" میں نے احساس برتری سے گردن اکڑائی۔
"بڑی خود پرست ہو۔ کیا خود پرستی بھی مجھ سے سیکھی ہے؟"
"بالکل۔ تم ہی تو کہتے ہو اچھی چیز کو ہمیشہ اچھا اور بری کو برا کہنا چاہیے۔"
اس نے زور کا قہقہہ لگایا اور میرے چہرے کے قریب اپنا چہرہ لا کر بولا۔ "کیا تم واقعی اچھی ہو ــ؟"
ہش ــــ میں نے اسے دھکیل دیا۔ اس کی قربت میرے لیے بڑی عجیب تھی
"سنو۔ جب تک میں آؤں میرے نام کا ورد کرتی رہنا۔" وہ جاتے جاتے رک کر بولا۔
"چھوڑو بھی تم یاد رکھنے کے قابل ہی کب ہو۔" میں نے بے نیازی برتی

"دیکھو پیر میں پاکستان چلا جاؤں گا" اس نے دھمکی دی۔
"ضرور جاؤ" میں نے پروانہ کی۔
"اچھا یہ بات ہے ——؟" وہ باہر نکل گیا
میں نے ورانڈے سے اسے جاتے دیکھا پھر اپنے کام میں منہمک ہو گئی۔
امی باہر سے آئیں تو بڑی متفکر لگ رہی تھیں نہ جانے کیا بات تھی کہ پچھلے چند دنوں سے وہ بڑی خاموش خاموش تھیں میں نے کئی بار پوچھا بھی مگر وہ ٹال گئیں۔ آج بھی جب ان کا چہرہ اترا ہوا لگا تو میں نے پوچھا —— "کیا بات ہے امی۔ تھکی تھکی لگ رہی ہیں آپ؟"
"کچھ بھی تو نہیں۔ تم بتاؤ کیسی رہیں۔ دن بھر اکیلے گذرا کہیں ڈر تو نہیں لگا ——؟"
"نہیں امی" میں نے ان کی گود میں سر رکھ دیا۔ انھیں میرا کتنا خیال تھا۔
"سلیم چلا گیا ——؟" انھوں نے پوچھا
ہاں ——
کب ——؟
ابھی کچھ دیر ہوئی ——
وہ پھر چپ ہو گئیں اور میں اس الجھن میں پڑ گئی کہ ان کی خاموشی کے متعلق کو کس طرح حل کروں، رات میں سلیم دیر سے گئے آیا تو میں اپنے کمرے میں بیٹھی پڑھ رہی تھی —— اس نے گذرتے ہوئے پردہ اٹھا کر جھانکا اور سیٹی بجا کر بولا —— "آج تو بڑی دیر تک پڑھ رہی ہو"
میں اسے دیکھ کر چپ رہی ——
وہ دو منٹ کھڑا رہا پھر بولا —— "ذرا کپڑے بدل کر تمہاری نبض دیکھتا ہوں"
"شکریہ۔ میں بیمار نہیں ——" میں نے جل کر کہا۔
"بیمار تو نہیں پھر بھی بیماروں جیسی لگ رہی ہو یہ کیا بات ہے ——؟ کیا یہ بھی کوئی نئی بیماری ہے جو خود کو نہیں دوسروں کو محسوس ہوتی ہے ——؟ بات یہ ہے کہ آج کل نئی نئی بیماریاں نکل رہی ہیں جن کا نام ہی کسی کو معلوم نہیں ہوتا بس اسی لیے گھبراتا ہوں ——"
"تو اچھا ہے۔ تم مجھے بلاتی نہ گئی" میں بولی۔
"شو شو۔ ایسی باتیں نہیں کرتے" اس نے بڑھ کر میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور جھک کر بولا —— "بس کپڑے بدل کر ابھی آتا ہوں ——"

دس منٹ بعد وہ آیا تو "تھری کاسل" جلاکر میری میز پر بیٹھ گیا "اب بولو" وہ بولا۔
میں چپ رہی ــ
"اچھا لاؤ ہاتھ بتاؤ۔ ذرا تمھاری نبض دیکھوں ــ!" اس نے ہاتھ بڑھایا
میں پھر بھی چپ رہی ــ
"میرے جانے کے بعد کچھ کھایا تھا؟" اس نے یکایک پوچھا۔
"تو کیا تم سمجھتے ہو تمھارے جاتے ہی میں کھانا پینا چھوڑ کر بیٹھ رہتی ہوں"
"تو پھر کیا بات ہے۔ خاموشی کے لڈو کھائے تھے جو اس قدر خاموش ہو؟"
"امی بڑی فکرمند ہیں سلیم۔ تم جانتے ہو اس کی وجہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔
"بس اتنی سی بات" وہ میز سے اٹھ کر میری کرسی کے ہتھے پر آبیٹھا۔
ہاں کئی روز سے میں یہی سوچ رہی ہوں۔
"تو بس اب سوچنا ختم کرو۔ اگر جانتا یہ بیماری ہے تو علاج منٹوں میں کر دیتا مگر اب بھی وقت گیا نہیں سنو ــ جس گھر میں لڑائی ہوتی ہے نا ــ وہاں ماں متفکر ہی ہوتی ہے ــ سنا تم نے ــ" اس نے سگریٹ میرے ہونٹوں سے لگایا اور بولا "کھینچو جلدی سے ایک کش"
"نہیں سلیم۔ مذاق نہیں وہ سچ مچ پریشان ہیں"
"ارے تم کش کھینچو پھر میں تمھیں بتاؤں ــ"
"پہلے بتاؤ پھر ــ"
"نہیں میں بغیر سگریٹ پیئے بات نہیں کر سکتا اور سچ بات یہ ہے کہ جب تک تم میرے سگریٹ کا ایک کش نہیں لے لیتیں مجھے لائٹ سے لائٹ سگریٹ بھی تلخ لگتا ہے ــ چلو جلدی کرو"
میں نے کش کھینچا تو وہ بولا "کل سلیم آیا تھا جانتی ہو وہ امی سے کیا کہہ رہا تھا ــ؟"
کیا ــ؟ میں نے پوچھا
"کہہ رہا تھا اگر تسنیم سے میرا بیاہ نہ ہوا تو میں مر جاؤں گا"
"ہٹ ــ میں نے اسے ڈھکیل دیا ــ بڑے بے ہودہ ہو جاؤ یہاں سے۔
"ارے جھوٹ نہیں سچ کہتا ہوں تمھیں اعتبار نہ ہو تو امی سے پوچھ لو۔ بس امی اسی لیے فکرمند ہیں کہ بیٹی کا بیاہ کر دوں تو پھر دل کس طرح بہلے"
"دیکھو سلیم مذاق نہ کرو۔ میں اس موڈ میں قطعاً نہیں"

"تو بھئی مذاق کون کر رہا ہے جو بات سلیم نے کہی میں نے تمہیں بتا دی اگر اب بھی یقین نہیں آتا تو میں سلیم ہی کو بلاتا ہوں۔"

"بس بس۔" میں نے اسے روک دیا۔

"کرلو نا بیاہ۔ اتنا برا بھی نہیں۔ بس ایک ناک چپٹی ہے اور ہونٹ موٹے بال ذرا زیادہ گھنگریالے ہیں اور آنکھیں چھوٹی۔ اس کے علاوہ عیب بھی کیا ہے۔ تمہیں اتنا چاہتا ہے۔ اتنی محبت کرتا ہے ۔ کیا تم اسے واقعی مار دو گی ۔۔۔؟"

"خدا کے لیے سلیم تم نکلو میرے کمرے سے۔" میں بگھر گئی۔

"تو پھر تم چلو میرے کمرے میں ۔۔۔" وہ اٹھ کر بولا۔

"نہیں چلتی میں ۔۔۔"

"تو پھر مجھے بیٹھنے دو ۔۔۔" وہ آرام کرسی پر بیٹھ کر گنگنانے لگا۔

میں نے کتاب اٹھائی مگر ایک لفظ نہ پڑھ سکی یہی سوچتی رہی کہ سلیم کتنا سچ کہہ رہا ہے۔ امی کیا اسی لیے متفکر ہیں ۔۔۔؟"

اس نے دو منٹ انتظار کیا پھر ہاتھ بڑھا کر لیمپ کا شیڈ جھکا دیا۔

میں اسے سیدھا کرنے کے لیے اٹھی تو وہ رک کر بولا۔ "ارے بیٹھی رہو بیٹھی رہو۔ ذرا دیکھو تو کتنا اچھا پروفیل ہے شیڈ اینڈ لائٹ میں تم کس قدر اچھی لگ رہی ہو۔"

"بس اب زیادہ نہ بہکو۔" میں نے شیڈ سیدھا کر دیا۔

"ہونا بدذوق ۔۔۔" وہ چڑ کر بولا۔

"بس تم جاؤ یہاں سے۔" میں نے اسے بھگا دیا۔

صبح ناشتے پر وہ بولا ۔۔۔ "امی رات بھر روتی رہی ۔۔۔"

"کیوں بھلا ۔۔۔" امی گھبرا گئیں

"ارے کہتی ہے شادی کرو تنہائی سے ڈر لگتا ہے۔" اس نے جلدی سے کہا۔

امی کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

غصہ سے میرا حال برا ہو گیا۔ کمبخت کتنا سفید جھوٹ بول رہا تھا۔

امی نے مجھے بغور دیکھا پھر مطمئن ہو کر ہنسنے لگیں۔

"چلو چائے بناؤ۔" وہ کشتی میرے آگے ڈھکیل کر پورے اطمینان سے بولا۔

چڑ کر میں نے کشتی ہٹا دی ۔ "نہیں بناتی میں۔ بنالو خود۔"
عجیب مصیبت ہے بھئی۔ مجھ سے کہتی ہو، سفارش کرتا ہوں تو غصہ بھی ہوتی ہو۔ امی میں نے کان کھینچے آئندہ کبھی نہیں کہوں گا اب ذرا چائے بنوا دیجئے۔
"نہیں بناتی میں ۔" میں بدستور لڑی رہی۔
امی نے چائے بنا دی۔ وہ پیتے پیتے بولا ۔ "کیوں امی کلیم اتنا برا بھی تو نہیں ۔ جب منی کو یہی اصرار ہے تو پھر ہیں انکار کیوں ہو۔"
"سلیم خدا کی قسم میں تمھیں مار دوں گی ۔" میں نے چمچہ اٹھایا۔
"اررر ۔ مرجاؤں گا تو ماں باپ عمر بھر روئیں گے۔ اکلوتا جو ہوں ۔" وہ میز سے اٹھ کر فرار ہو گیا ۔ امی ہنسنے لگیں ۔
میں نے کہا ۔ "آپ منع نہیں کرتیں جب ہی یہ ایسی حرکتیں کرتا ہے۔"
"وہ شروع سے شریر ہے۔ اسے مذاق کئے بغیر چین نہیں آتا۔ تم ناراض کیوں ہوتی ہو۔" وہ الٹا اسی کی پیچ کرنے لگیں۔
میں نے کلیم کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگیں۔ "صاف جھوٹ ہے وہ آیا ہی نہیں ۔"
شام میں وہ آیا تو بڑی مسکین صورت بنائے ۔ میں نے پوچھا ۔ "خیریت ؟"
کہنے لگا ۔ "بیمار ہوں ۔"
"تو جا کر لیٹ رہو۔" مجھے اب تک غصہ تھا۔
"غصہ ابھی تک اترا نہیں کیا ۔؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
"تمھیں کیا اترے نہ اترے ۔"
"آپ رہے۔ امی سے شکایت کر کے بھی نہیں اترا تو پھر کلیم کو بلانا پڑے گا ۔"
میں سچ مچ اسے مارنے دوڑی وہ لپک کر کمرے میں ہو لیا میں جو پہنچی تو میرا ہاتھ پکڑ کر بولا ۔ "دل میں تو تمھارے لڈو پھوٹ رہے ہیں اور بنتی اس طرح ہو جیسے واقعی غصہ میں ہو۔"
"تمھیں کیا ۔ میں جھک ماروں ۔ بس اتنا سن لو آئندہ تم نے کلیم کا نام لیا تو یاد رکھنا ۔"
تو پھر کیا دوسرا نام لوں ؟ کوئی ہو تو جلدی سے بتا دو پھر تمھارے ساتھ میں بھی اس کے پیچھے جھک ماروں گا۔"
میں تنگ ہو کر جانے لگی۔ کس قدر جھگی تھا ایک بات کے پیچھے پڑ گیا تو پھر چھوڑتا ہی نہ تھا۔
رات میں حسب دستور پھر آیا سگریٹ سلگا کر منہ میں لگایا اور بولا ۔ "لو کش ۔"
"نہیں لیتی ۔" میں نے سگریٹ دور پھینک دیا۔

اررر ۔ وہ چلایا پھر سگریٹ اٹھا کر بولا ۔ "گر گیا سارا تمباکو اب کیا پیوں خاک ۔ ؟"

"تو پھر آئے کیوں تھے ۔"

"تو کیا اب آنے پر بھی پابندی ہے ۔ ؟"

"بالکل ۔" میں نے خشکی سے کہا۔

"دیکھو منی گا نے پر تم کہتی ہو تو رک جاتا ہوں مگر یہ آنے جانے پر پابندی نہیں ہو سکتی۔ جانتی ہو کھانا پینا چھوڑ سکتا ہوں مگر آنا جانا نہیں۔ چلو جلاؤ یہی سگریٹ ۔" اس نے لائٹر سلگایا۔ اس کے بڑے بڑے ہاتھ کانپ رہے تھے میں نے چپکے سے دیکھا پلکیں نم تھیں اور ہونٹ سکڑے ہوئے۔ میں نے جھک کر سگریٹ جلایا اور بولی ۔ "سلیم اگر آج میں مر جاؤں تو ۔ ؟"

"شوشو۔ تم اس طرح کا مذاق کیوں کرتی ہو ۔" اس نے میرا منہ بند کر دیا۔

"سچ کہتی ہوں اگر مر جاؤں تو تمہاری سگریٹیں کون جلائے گا؟ کیا سگریٹ پینا چھوڑ دو گے ؟"

"دیکھو منی۔ میں سب کچھ سہہ سکتا ہوں مگر یہ دہشت کی باتیں نہیں سہہ سکتا پھر آئندہ کبھی نہ کہو ۔"

ارے دہشت کیسی۔ موت تو بہر حال آتی ہے ۔"

"مگر وقت سے پہلے نہیں اور جب تم پہلے ہی اس کا تذکرہ کرتی ہو تو مجھے الجھن ہونے لگتی ہے ۔" وہ کمرے میں چپ چاپ ٹہلنے لگا۔

میں کن انکھیوں سے دیکھتی رہی وہ مذاق پر تلا ہوا تھا مگر اندرونی طور پر جذبات کا شکار جیسے آنسو پی رہا ہو اور قہقہے اگل رہا ہو ۔

"امی اب کیسی ہیں ۔ ؟" اس نے ٹھہر کر مجھ سے پوچھا

"ٹھیک ہیں ۔" میں نے کہا۔

"دیکھا تم نے ۔ اگر صبح مذاق نہ کرتا تو وہ تمہیں اب بھی متفکر نظر آتیں۔ اسی لیے کہتا ہوں ذرا مذاق کیا کرو ہنسو بولو مگر تم مانتی نہیں اور جو میں مذاق کرتا ہوں تو اتنا برا اس کا جواب دیتی ہو کہ دل دہل جاتا ہے ۔" وہ میرے قریب آ کھڑا ہوا ۔ "سنو منی ۔ جب موت آئے گی تو میں مسکراؤں گا مگر شرط یہ ہے کہ تم پاس رہو پھر جب تم خود مرنے کے لیے کہتی ہو تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تم میری ساری مسکراہٹیں سمیٹ لے رہی ہو کیا تم واقعی ایسا چاہتی ہو ۔ ؟"

"تم بغیر میرے بھی مسکرا سکتے ہو ۔ کیا تمہیں اس کا یقین نہیں ؟" میں نے پوچھا۔

اس نے بڑی سنجیدگی سے میرا چہرہ اوپر اٹھایا۔ دیر تک دیکھتا رہا پھر چھوڑ دیا اور صوفے پر چپ چاپ

کھڑا رہا پھر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

دس منٹ بعد جب میں گئی تو وہ رضائی تانے پڑا ہوا تھا۔ میں نے آہستہ سے لحاف اٹھایا وہ چپکے چپکے رو رہا تھا۔

"بزدل" ــــ میں نے اسے ہلکی چپت لگائی اور لحاف کھینچ کر دور پھینک دیا۔

وہ ساکت پڑا رہا اس کی بڑی بڑی آنکھیں تیزی کے ساتھ بھیگتی رہیں۔

"جتنا مذاق کر سکتے ہو اتنا صبر نہیں کر سکتے کیا ــــ ؟" میں نے پوچھا

اس نے اپنے آنسو خشک کیے مگر میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ میں تھوڑی دیر اس کے سرہانے بیٹھی رہی پھر اٹھ کر چلی آئی۔ نیند کوسوں دور تھی مگر لائٹ بند کر کے لیٹ رہی وہ کچھ دیر بعد آیا تو لائٹ جلا کر بیٹھ گیا۔

میں نے پوچھا ــــ "سوئے نہیں کیا ؟"

بولا ــــ "نیند نہیں آ رہی ــــ"

میں نے کہا ــــ "کوشش کرو ــــ"

کہنے لگا ــــ "میں کوشش نہیں کرتا خود آ جائے تو اس کی مہربانی ــــ"

غالباً وہ منہ دھو کر آیا تھا اب چہرہ صاف اور آنکھیں روشن تھیں۔

میں نے کہا ــــ "امی ناراض ہوں گی اتنی دیر نہ جاگو ــــ"

بولا ــــ "امی سے کہہ دوں گا بہت جلد سونے والا ہوں"

میں نے دیکھا وہ کچھ عجیب سا ہو رہا تھا اگر میں کچھ اور بھی کہتی تو شاید وہ پھر رو دیتا ــــ میں نے چپکے سے "تھری کاسل" جلایا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔

اس نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل کر لائٹ بند کی اور جھک کر میری پیشانی پر اپنا چہرہ رکھ دیا۔

نہیں معلوم میں کب سو گئی ــــ صبح اٹھی تو وہ بدستور سرور تھا۔

کلیم آیا تو مجھے خواہ مخواہ اس سے چڑ ہونے لگی وہ غریب باتیں کر رہا تھا اور میں جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھی۔ امی نے تک ناراض ہو کر کہہ دیا کہ تم خبطی ہو مگر سلیم دور بیٹھا سب کچھ سنتا رہا اور ہر بات پر کلیم کی طرفداری کرتا رہا

کلیم بولا ــــ "پاکستان جا رہا ہوں"

سلیم بولا ــــ "ہرگز مت جانا۔ پہلے شادی کرو پھر چلے جاؤ"

وہ بولا ــــ "اتنی جلدی شادی کس طرح ہو گی ؟"

اس نے کہا ــــ "امی سے کہو انتظام کر دیں گی"

"مگر لڑکی ــــ" سلیم ہکلایا۔

"ارے اس کاغذ میرا ــــ کیوں امی آپ سے پرسوں بات ہوئی تھی نا ــــ" اس نے کن انکھیوں سے مجھے دیکھا۔

نفرت سے میرا خون کھول گیا نہ جانے مجھے ستا کر اسے کیا لطف ملنے لگا تھا۔ میں اٹھ کر چلی گئی۔ امی روکتی رہیں مگر اس بار میں برداشت نہ کر سکی۔

سلیم گیا تو وہ سیدھا میرے پاس آیا۔ "تم اٹھ کر کیوں آگئیں" اس نے پوچھا

"تمہاری بلا سے۔ چلے جاؤ میں تمہاری صورت دیکھنا نہیں چاہتی" میں نے اسے جھڑک دیا۔

"مت دیکھو بابا۔ مگر بات تو کرو ــــ" وہ منت سے بولا

"نہیں کرتی جاؤ ــ یہاں سے" میں نے اسے باہر ڈھکیل کر دروازہ بند کر دیا۔

جب وہ باہر چلا گیا تو میں مختصر سا مان کے ساتھ باجی کے پاس چلی گئی۔

امی نے پوچھا تو میں نے کہہ دیا ــــ چند دن رہ کر آؤں گی ــــ انھوں نے روکا بھی مگر میں ضد کر کے چلی آئی ــــ

دوسرے دن ناشتے سے پہلے سلیم آیا ــــ بال بکھرے ہوئے چہرہ فق۔

میں اسے دیکھ کر اندر چلی گئی۔ باجی نے باتوں میں بٹھا لیا۔ میں کھڑکی سے دیکھتی رہی۔ وہ بے قرار تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے خوشی ہونے لگی۔

باجی نے ناشتے کے لیے کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ انھوں نے میرے پاس بھیجا کہ میں اصرار کروں مگر میں انجان ہو گئی۔

مجھے انجان دیکھ کر وہ بولا "بھوک لگ رہی ہے"

"تو پھر کھاؤ ــــ" میں نے روکھائی سے کہا۔

"تم گھر چلو ــــ"

"نہیں چلتی میں ــــ"

"تو پھر بھوکا رہوں گا ــــ"

"رہو ــــ"

وہ مجھے اس طرح دیکھنے لگا جیسے میں اسے بالکل نئی لگ رہی ہوں اور وہ مجھے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

خود میری سمجھ میں نہ آیا وہ تسکین کس طرح چاہتا ہے مجھے رُلا کر۔ ہنسا کر یا صرف زخم خوردہ دیکھ کر ــــ

"تو نہیں آؤ گی ــــ؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں ۔"

"میں جاؤں ۔ ؟"

"شوق سے ۔"

وہ اٹھ کر تیزی سے باہر نکل گیا ۔۔۔۔

باجی نے پوچھا "سلیم اتنا اداس کیوں ہے۔ بیمار ہے کیا ۔۔ ؟"

"ارے نہیں اچھا خاصا ہے کبھی کبھی اسے دورے پڑتے ہیں تب وہ ایسا ہی دکھائی دیتا ہے" میں نے کہا۔

"تعجب نہیں تسنیم ۔ ماں باپ کی یاد آتی ہی ہوگی سب پاکستان میں وہ غریب اکیلا یہاں رہ گیا میں تو کہتی ہوں اسے ایک بار مل آنا چاہیئے ورنہ وہ دن بدن اور سنک ہوتا جائے گا۔ آدمی جب اپنے دل کی بات نہیں کر سکتا تو اسی طرح کی الٹی سیدھی حرکتیں کرتا ہے اب وہ چاہے لاکھ ضبط کرے مگر اسے محسوس ہوتا ہوگا کہ ساتھ نہ جا کر اس نے کتنی بڑی غلطی کی ہے۔ دنیا اپنی سی کر لے ماں باپ کی کرنی کوئی نہیں کرتا۔" وہ افسوس کرنے لگیں۔

مجھے یکایک ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے دھوکا کھایا ۔۔۔۔

باجی کہہ رہی تھیں ۔۔۔۔ ایک ہی صورت ہے شادی کر کے ممکن ہے وہ اطمینان سے رہ سکے مگر اکیلا نہیں رہ سکتا ۔۔"

کوئی قوت مجھے آگے ڈھکیلنے لگی۔ دل کہتا تھا چلے چلو مگر اس طرح آنا جانا مذاق لگا اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا چند دن رہ کر ہی جاؤں گی ۔۔۔۔ چار روز گذر گئے وہ ایک دم غائب رہا پانچویں شام اس طرح آیا جیسے کہیں باہر جا رہا ہو۔

باجی نے چائے دی تو سامنے رکھے خاموش بیٹھا رہا وہ اٹھ کر اندر گئیں تو جلدی سے میری پیالی اٹھا کر پی گیا۔

میں نے پوچھا "کیسے ہو ۔ ؟"

وہ چپ چاپ بیٹھا رہا ۔۔۔

امی کے متعلق پوچھا تو بولا "ٹھیک ہیں۔ تمھیں دو ایک روز میں آنے کو کہا ہے۔"

دیر تک بیٹھا رہا مگر کھویا کھویا۔ باجی نہ جانے کیا کیا پوچھتی رہیں وہ سب کے الٹے سیدھے جوابات دیتا گیا۔ چلنے کو کھڑا ہوا تو دل چاہا پکڑ لوں۔ کتنا دبلا لگ رہا تھا اور کیسا عجیب عجیب جیسے جلد کی رنگت اور چہرے کا نکھار گھر میں رکھ آیا ہو۔

میں نے چاہا پوچھوں "پھر تو نہ ستاؤ گے ؟" مگر چپ ہو گئی۔

وہ چلتے ہوئے بولا "کبھی یاد آؤں تو تھوڑا ہنس لینا۔ آنسو نہ بہانا ۔"

وہ چلا گیا ۔۔۔۔ رات عجب بے چینی میں بسر ہوئی۔ صبح دل اتنا اچاٹ ہوا کہ میں نے فوراً گھر کی راہ لی۔

امی چولھے کے پاس تھیں میں گئی تو انھوں نے سب کو پوچھا۔ خیریت کی اطلاع دے کر میں اوپر چلی۔ اس کا کمرہ بند تھا۔ میں نے سمجھا وہ کہیں باہر گیا ہوگا نیچے آئی تو امی نے پوچھا "سلیم آیا تھا؟"

ہاں ــــ

"بہت اداس تھا نا ــــ؟"

"وہ ہے ہی عجیب امی۔ ہنستا ہے تو بے طرح اور روتا ہے تو قسم کھا کر ــــ"

"نہ جانے اب کب آئے غریب۔ بڑا اداس گیا میں نے روکا تو کسی حال نہ رکا چپکے چپکے روتا رہا مگر روڑ دھوپ کر کے کسی نہ کسی طرح انتظام کر ہی لیا ــــ میں نے سوچا ماں باپ کے پاس جا رہا ہے دل بھر آیا ہوگا۔ تمھیں بلانا چاہا تو روک دیا کہنے لگا میں خود جا کر مل آؤں گا ویسے کہہ بھی دوں گا۔

"مگر اس نے تو کچھ نہیں کہا" مجھے تعجب ہو رہا تھا۔

"یہ بھی نہیں کہ وہ پاکستان جا رہا ہے ــــ؟" امی حیرت سے بولیں۔

"پاکستان ــــ؟؟؟" میں لرز کر رہ گئی۔ امی کی باتیں میری فہم سے باہر ہو رہی تھیں ــــ

"تو پھر اور کیا کہہ رہی ہوں۔ وہ کلیم کے ساتھ پاکستان چلا گیا تعجب ہے کہ اس نے تم سے نہیں کہا"

میں اندھا دھند اوپر دوڑی۔ مجھے یقین نہ آتا تھا۔

ذرا سے دھکے پر کمرہ کھل گیا مگر وحشت سے میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ کس قدر خالی اور کتنا ویران لگ رہا تھا۔ میں بمشکل اپنے کمرے میں جا سکی "تھری کاسل" کا ٹن کھلا پڑا تھا۔ پورے سگریٹ اس میں جوں کے توں تھے اس کی لائی ہوئی سرخ چوڑیاں چور چور تھیں۔ کینٹ پر اس کی تصویر بدستور تھی۔ مگر میرا فریم خالی تھا میں نے پلٹ کر دیکھا اس کے ہاتھوں کی مٹی مٹی تحریر تھی ــــ

میں نے ہنسنے کی کوشش کی مگر نہ ہنس سکا۔ تم ہنس رہی ہو اس لیے تمھیں ساتھ لے جا رہا ہوں۔ ہمیشہ ہنستی رہنا"

فریم ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میز کے پاس گتے کے ڈبے کے نیچے ایک چٹ نظر آئی میں نے کانپتے ہاتھوں سے نکالا۔ بغیر کسی القاب کے لکھا تھا ــــ

"تمھیں بتانے کی حسرت دل میں لیے جا رہا ہوں۔ دل اگرچہ بھرا ہوا ہے مگر خالی محسوس ہوتا ہے۔ تمھارا غصہ میرے زخم پر مرہم رکھتا تھا اب اس سے بھی محروم ہوں۔ یہ سگریٹ چھوڑے جا رہا ہوں ہر روز ایک کش لگا کر پھینک دینا میں دیکھ نہیں سکتا مگر یقین کرنا چاہتا ہوں کہ جو سگریٹ میرے منہ میں جل رہا ہے وہ تمھارا ہی جلایا ہوا ہے"

تمھارا ہی۔ سلیم

اس کی تحریر نے پھیل کر سارے کمرے پر قبضہ کر لیا۔ مجھے اب بھی یقین نہ آتا تھا کہ وہ اس طرح چلا گیا ہوگا۔

مجھے تو برابر ایسا دکھائی دے رہا تھا جیسے وہ اس کمرے میں موجود ہے میرے سامنے کرسی پر، میز پر، پلنگ پر ہمیشہ کی طرح لیٹا ہوا، بیٹھا ہوا، میرے پاس..... کھڑا ہوا۔ چور آنکھوں سے دیکھتا سگریٹ کو ہونٹوں میں دبائے لمبے لمبے کش لیتا ہوا۔

میں نے اسے ٹٹولنا چاہا۔ میں نے اسے پکڑنا چاہا — آنکھوں میں تو وہ تھا ہی — مجھے آج اس کے جسم کی ضرورت تھی اس وجود کی جو میری گرفت میں آسکے —

میں نے اسے ہر جگہ ڈھونڈا ہر جگہ ٹٹولا مگر میری سرد انگلیاں ہر بار ایک نئے زخم سے چھوتی رہیں — زندگی کی گرمی سرد ہو رہی تھی آگ دہک دہک کر راکھ بن رہی تھی۔ عمر کا الاؤ بجھ رہا تھا — دل رونا چاہتا تھا مگر آنکھیں خشک تھیں —

مجھے اس وقت محسوس ہوا جس وجود سے ہم محبت کرتے ہیں وہ جب سامنے سے ہٹ جاتا ہے تو ہم کس طرح پگھلتے ہیں۔

میں نے چاہا — لیٹ جاؤں — بیٹھ جاؤں — چلوں — پھروں مگر کچھ نہ کر سکی آنکھیں کھلی رہیں مگر گہری دھند نے مجھے گھیر لیا جیسے ہزاروں مہیب بادل مجھ پر چھائے جا رہے ہوں۔

بڑی دیر بعد جب میں کچھ سمجھ سکی تو پتہ چلا اس کی تصویر میرے ہاتھوں میں ہے اور بے پناہ سسکیاں میرے ہونٹوں پر —

نہ جانے میں خود کہاں تھی..... ؟؟؟

حیدرآباد میں شہر کا قدیم ترین ہوٹل

عزیزیہ ہوٹل ہے

جہاں صبح و شام ہندوستانی طریقے سے ماہر فن باورچیوں کے ہاتھوں تیار کیے ہوئے کھانے مل سکتے ہیں صفائی اور پاکیزگی اس ہوٹل کا امتیازی نشان ہے کم کرایہ پر صاف ستھرے اور ہوادار کمرے مل سکتے ہیں

پتہ یاد رکھیئے

عزیزیہ ہوٹل

ناپسلی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن فون ۳۱۶۴

رتن سنگھ

اندھیرا اُجالا

ستر سالہ بوڑھا جاٹ لچھوان پڑھ تھا۔ ظاہر ہے کتابیں اس کے کام کی چیز نہ تھیں۔ لیکن جس دن ذیلدار کا لڑکا ہرنام سنگھ جو اسر تسر خالصہ کالج میں پڑھتا تھا، اصرار کر کے اس کی سب کتابیں مانگ لے گیا تو اسے بہت دکھ ہوا۔

اس نے یوں محسوس کیا جیسے گھر سے کوئی قیمتی چیز غائب ہو گئی ہے۔ اتنا دکھ تو اسے اس لال گھوڑی کا نہ ہوا تھا جس کو اس نے روزانہ مالش کر کے پال پوس کر جوان کیا تھا، اور جب اس پر چڑھنے کے دن آئے تھے تو اس کا چھوٹا بھائی یہ کہہ کر گھوڑی کھول لے گیا تھا "توں تے مَن بڈھا ہو گیا ایں، جوان گھوڑی جواناں نوں ای جنگی لگدی اے۔ (تم اب بوڑھے ہو گئے ہو۔ جوان گھوڑی جوانوں کو ہی زیب دیتی ہے)

یہ کتابیں لچھو کو اس مکان میں بکھری پڑی ملی تھیں جو اسے تقسیم کے بعد بھارت آنے پر الاٹ ہوا تھا۔ شروع شروع میں اس کے پاس بیلوں کی ایک جوڑی بھی نہیں تھی جو کاشت کا کام شروع کر سکتا۔ زمین بھی ابھی الاٹ نہیں ہوئی تھی اس لیے ہر وقت گھر پر بیٹھا رہتا۔ دونوں میاں بیوی تھے کوئی اولاد نہیں تھی۔ دونوں مکان کے صحن میں بیٹھے اس نئے ماحول کی باتیں کیا کرتے۔ فلاں کیا کر رہا، فلاں کہاں بسا ہے۔ کرم دیئی کے لیے تو یہ ٹھیک تھا کہ لچھو گھر پر بیٹھا رہتا ہے۔ اس سے اس کا دل لگا رہتا تھا۔ پاس پڑوسی بھی کوئی نہیں تھا۔ وہ اور کسی سے بات چیت کر کے دل بہلاتی۔ لیکن لچھو جس کی ساری زندگی کھیتوں میں محنت کرتے گذری تھی، گھر پر ایک منٹ بیکار بیٹھنا ایک بوجھ سا محسوس کر رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے اس نے سب سے پہلے مکان کی مرمت کرنے کی بات سوچی۔ اس کے محنتی ہاتھوں اور کرم دیئی کے ہاتھ بٹانے سے ہفتہ بھر میں ہی مکان کا نقشہ بدل گیا۔ مکان کچا تھا۔ صحن کی دیواریں جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھیں۔ لچھو نے مٹی گوندھ گوندھ کر ان دیواروں پر لگائی۔ کرم دیئی نے سب دیواروں کو گوبر اور سخت مٹی سے پتائی کر دی۔ کتابوں کو اٹھا کر کرم دیئی نے دالان کے ایک کونے میں ڈھیر کر دیا تھا۔ لیکن لچھو کو یہ اچھا نہ لگا۔ اس نے مٹی کی ہی دو پتلی سی چھوٹی دیواریں کھڑی کر کے ان میں لکڑی کے دو تختے لگا دیئے۔ اس طرح وہ اچھا خاصہ ریک بن گیا جس پر کتابیں

رکھ دی گئیں۔ چھت کا بارش میں ٹپکنے کا اندیشہ تھا۔ لچھو نے اس پر بھی نئی مٹی ڈال دی۔ نیچے سے جالا وغیرہ صاف کر دیا۔

گلی میں دو تین کنبے آ بسے تھے۔ باہر نکل کر کچھ اس قسم کی بات چیت بھی ہو جاتی۔ تم کہاں سے آئے ہو؟۔ کوئی جانی نقصان تو نہیں ہوا؟ کچھ بچا کے لائے یا نہیں؟ اب کیا کریں گے؟ زمین کب تک الاٹ ہو گی؟ اس کے بعد درد بھری کہانیاں شروع ہو جاتیں، جو ختم ہونے ہی میں نہ آتیں۔ لیکن لچھو اب بھی بیکار تھا، اور اسی وجہ سے اداس رہتا تھا۔ باتیں کرنے سے ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے سننے سے دل بہل سکتا ہے۔ لیکن باتیں کام تو نہ تھیں۔

لچھو گھر پر پڑا رہتا۔ ایک دن یوں ہی اس نے ریک میں رکھی ہوئی کتابوں میں سے ایک اٹھائی اور اس کے ورق الٹنے لگا۔ ورق الٹتے الٹتے اسے اپنے ان پڑھ ہونے کا شدت سے احساس ہوا۔ وہ سوچنے لگا، اگر پیٹ میں چار لفظ پڑے ہوتے تو کم از کم ان کتابوں کو پڑھ کر ہی وہ اپنا دل بہلا سکتا تھا۔ ایک ایک کر کے اس نے سب کتابیں اٹھائیں۔ کچھ کتابوں میں خوبصورت تصویریں بھی تھیں۔ وہ سب تصویروں کو انہماک سے دیکھنے لگا۔ آہستہ آہستہ کتابوں کے ورق الٹ کر ان میں چھپی تصویروں سے دل بہلانا اس کا معمول ہو گیا۔ وہ تصویریں خود دیکھتا اور کرم دئی کو بھی دکھاتا۔ اس طرح اس کی کچھ اداسی دور ہو جاتی۔ کبھی کبھی وہ کتاب میں چھپے ہوئے حروف کو بھی غور سے دیکھتا جیسے وہ بھی رنگین تصویریں ہی ہوں۔ وہ اس تصویروں کی دنیا میں کھو جاتا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے جب اسے اپنے ان پڑھ ہونے کا خیال آتا تو اس کے دل سے ایک ٹیس سی اٹھتی اور وہ پریشان ہو جاتا۔ کتابوں کو روز دیکھتے رہنے سے لچھو کو یہ تک یاد ہو گیا کہ کونسی تصویر کس کتاب میں ہے۔ جو تصویر وہ دیکھنا چاہتا وہی کتاب نکال لیتا۔

یہ دلچسپی زیادہ دیر پا ثابت نہ ہوئی۔ دو مہینے بعد اسے عارضی طور پر کچھ کھیت مل گئے۔ ایک جوڑی بیل مل گئے۔ ہل اور دوسری چیزوں کا اس نے پہلے سے انتظام کر رکھا تھا۔ اب اس نے کھیتوں میں کام کرنا شروع کر دیا لچھو خوش تھا۔ ملک کے بٹوارے کی وجہ سے وہ بھٹک گیا تھا۔ لیکن اب پھر اسے راستہ مل گیا۔ وہ اس راستے پر ہمیشہ کی طرح ڈھولا اور مائیا گاتا ہوا چلنے لگا۔ یہ تعجب کی بات ہے کہ وہ ٹبر ہاے میں بھی ڈھولا اور مائیا گاتا تھا۔ ڈھولا اور مائیا پنجاب کے وہ گیت، جن میں پنجاب تھرکتا اور ناچتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے اپنے گاؤں کے جوان لڑکے اسے اکثر کہا کرتے تھے۔ لچھو اب تم بوڑھے ہو گئے ہو۔ ڈھولا اور مائیا گانا اب تمھیں زیب نہیں دیتا۔ لیکن اس حقیقت سے وہ لڑکے بھی بے خبر نہ تھے کہ لچھو کے بغیر بھنگڑے میں جان نہیں آتی۔ جب لچھو ایک ہاتھ میں پیتل کے سموں والی لاٹھی تھامے دوسرا ہاتھ اپنے کان پر رکھے، منہ اوپر کی طرف کیے، اونچی آواز میں سلا بولتا تو ڈھولچی زور زور سے ڈھولک بجانا شروع کر دیتا۔ جوانوں کے پاؤں ناچ اٹھتے، ایک سماں بندھ جاتا۔

لچھو پھر پرانی زندگی کو قریب لانا چاہتا تھا۔ دن بھر وہ کھیتوں میں کام کرتا۔ کرم دئی دونوں وقت اس کا کھانا

لے کر جاتی. کھیت کچھ دیر خالی پڑے رہے تھے اس لیے ان میں پولی (کانٹے دار جھاڑیاں) اُگ آئی تھی. لچھو کو زیادہ محنت کرنی پڑتی تھی. سب سے پہلے اس نے اپنی زمین کو کانٹوں اور جھاڑیوں سے صاف کیا. ایک مرتبہ سب کھیتوں میں پانی دیا تاکہ زمین نرم ہو جائے. زمین نرم ہونے پر اس نے ہل چلایا. مہاگے سے کھیتوں کو ہموار کیا اور فصل بو دی. یہ سب کام اس نے پندرہ بیس روز میں کر لیا اور بھی بہت سے کام باقی تھے. چراگاہ کی طرف جو کھیت تھے اُن پر کانٹے دار شاخوں کی باڑھ لگانا ضروری تھا، ورنہ اندیشہ تھا کہ مویشی اس کی اُگنے والی فصل کو برباد نہ کر دیں. سردی کا موسم آ رہا تھا، اور رات کو بیلوں کو باندھنے کے لیے کوئی حویلی نہ تھی. اس نے قریبی جوہڑ کی مٹی گوندھ کر آہستہ آہستہ چار کچی دیواریں کھڑی کر لیں، ان پر معمولی سی چھت بھی ڈال دی. اس طرح بیلوں کے باندھنے کا بھی انتظام ہو گیا. اتنا کام کرتے ہوئے بھی جب وہ تھک کر آرام کرنے بیٹھتا تو دل بہلانے کے لیے کتابوں کے ورق الٹنے شروع کر دیتا. رنگ برنگی تصویریں دیکھ کر محظوظ ہوتا. گویا وہ کتابیں بھی اس کی زندگی کا اہم حصہ بن گئی تھیں، جیسے کھیتی باڑی کی دوسری چیزیں.

پورا گاؤں آباد ہو گیا. کچھ لوگ ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے تھے کچھ بالکل انجانے تھے. سب کو نئے کھیت الاٹ ہو گئے تھے. انھوں نے اپنے کھیتوں میں کام شروع کر دیا تھا. لیکن ابھی تک بہت سے ایسے تھے جو اس انجانے ماحول میں خود کو جذب نہ کر پاتے تھے. ان کے چہروں سے عجیب قسم کی اجنبیت اور اداسی ٹپکتی تھی. زیادہ سے زیادہ وہ ایک دوسرے کو لوہا، یا ترکھان کی دکان پر جب ہل وغیرہ ٹھیک کروانے جاتے تو ملتے. کچھ رسمی باتیں ہو جاتیں، اور بس کام کی زیادتی کی وجہ سے ان کے پاس اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ اپنے دل کی کہیں یا دوسرے سے کچھ سنیں. اس روکھے ماحول کو لچھو نے شدت سے محسوس کیا اور اس جمود کو توڑنے کے لیے اس نے ایک دن گاؤں کے سب لوگوں کو اپنے کھیتوں پر بھنگڑے کی دعوت دی. بھنگڑے کا نام سنتے ہی جوانوں کے دل مچلنے لگے.

پورنماشی کی رات بھنگڑے کے لیے طے ہوئی. اس رات لچھو کے کنوئیں پر خوب رونق ہوئی. ایک عرصے کے بعد اُن کے مغموم دلوں میں خوشی کی ترنگیں اٹھیں. ان ترنگوں کی تال پر زندگی جھومنے اور ناچنے لگی. پورے گاؤں والوں پر اجنبیت اور اداسی کے بجائے اپنے پن اور مستی کی سی کیفیت چھا گئی. وہ ایک دوسرے کے قریب ہو گئے پھر بھنگڑا اکثر ہونے لگا. لوگ ایک دوسرے کے اور قریب ہوتے گئے. مل کر گاؤں کی ایک پنچایت بنائی. پنچایت نے گاؤں کی بہبودی کے لیے کافی کام کیا. گلیاں صاف کرنے کا باقاعدہ انتظام ہو گیا. گلیوں میں روشنی لگ گئی. ایک چھوٹا سا شفاخانہ بھی کھل گیا. اس کے علاوہ پنچایت نے گاؤں کے بچوں کے لیے تعلیم کا انتظام کرنے کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا. ان سب کاموں کا سہرا بوڑھے لچھو کے سر تھا.

لچھو اس نئی زندگی سے مطمئن تھا. وہ یہ بھی قریب قریب بھول چکا تھا کہ وہ شرنارتھی ہے. اس نے کھیتوں

میں محنت کی تھی پہلی فصل اچھی ہوئی تھی اس لیے اُسے کسی قسم کی تکلیف نہیں تھی۔ گاؤں والے اس کی عزت کرتے تھے۔ ہاں کبھی کبھی اسے ان کتابوں کی یاد آتی تھی جن کے ورق الٹ کر وہ شروع شروع میں دل بہلایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی تو ان تصویروں کو دیکھنے کے لیے اس کا دل بچوں کی طرح مچلنے لگتا۔ لیکن پھر وہ خود ہی سوچتا۔ کتابیں میرے کس کام کی تھیں۔ ہیں تو انھیں پڑھ ہی نہیں سکتا تھا جس طرح ہل زمین کھودنے کے لیے ہے، دراتی فصل کاٹنے کے لیے ہے اسی طرح کتابیں بھی پڑھنے کے لیے ہوتی ہیں۔ میرے پاس کتابیں پڑی خراب ہو رہی تھیں۔ کرم دیئی انھیں لاپرواہی سے ادھر ادھر پھینک دیتی۔ اب اچھا ہے ذیلداروں کا لڑکا ہرنام سنگھ انھیں پڑھتا ہوگا۔ وہ ان سے کچھ فائدہ اٹھائے گا۔ یہ سوچتا سوچتا وہ اپنے کسی کام میں لگ جاتا۔ اس کے بوڑھے لیکن پھرتیلے ہاتھ گوڈھائی کرنے لگ جاتے یا بیلوں کے لیے چارہ کاٹنے لگ جاتے۔

ایک دن شام کے وقت لچھو گاؤں کے چھوٹے سے بازار سے گزر رہا تھا یونہی اسے خیال آیا کہ کرم دیئی نے صبح کہا تھا کہ ہلدی نہیں ہے۔ اس نے پگڑی کے پلو کو جس میں کچھ نوٹ بندھے ہوئے تھے ٹٹولا اور منشی رام پنساری کی دکان پر رک گیا۔

"چار آنے کی ہلدی دینا سیٹھ"۔ یہ کہتے ہوئے اس نے پگڑی کے پلو سے پیسے کھولنے شروع کیے۔

"آؤ باجی" کہہ کر پنساری ہلدی تولنے لگا۔ ہلدی تول کر جب وہ کاغذ میں باندھنے لگا تو لچھو کی نظر ردی کی ڈھیر پر گئی اور وہیں جمی رہی۔ وہ کچھ دیر خاموش کھڑا رہا پھر بولا۔

"یہ کتابیں تمھارے پاس کیسے آئیں سیٹھ"۔ اس کے لہجے میں ترشی تھی۔

"کیا مطلب! یہ تو ذیلدار کا لڑکا ہرنام سنگھ بیچ گیا ہے۔ پانچ روپے میں"۔

"ہوں اب سمجھا" بوڑھا لچھو تلخ لہجے میں بولا۔ اس کے بعد وہ کچھ نہ کہہ پایا۔ مارے غصے کے اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہیں پا رہا تھا۔ اس نے اسی حالت میں پگڑی سے پانچ کا نوٹ کھولا۔ نوٹ جو اس نے اتفاق سے پیسے ختم ہونے کی وجہ سے ایک پڑوسی سے ادھار لیا تھا۔

"یہ لے لو۔ کتابیں مجھے دے دو"۔

کتابیں لے کر وہ چپ چاپ گھر لوٹ آیا۔ دروازے پر بیٹھی کرم دیئی کو ہلدی دے دی۔ دالان کے اندر جا کر ریک کو صاف کیا، جس پر کرم دیئی نے گنی کے بھٹے رکھ چھوڑے تھے اور کتابوں کو جھاڑ کر ریک پر سجا دیا۔

اگلے دن وہ نائٹ اڈلٹ اسکول میں بیٹھا الف۔ ب پڑھ رہا تھا۔

فراق گورکھپوری

لبِ نگیں کی وہ باتیں کہ ہر لفظ ایک عالم ہو
ملاقاتوں کی وہ راتیں ابد اک آن سے کم ہو

یہی ہر گردشِ چشمِ فسوں گر کا تقاضا ہے
کہ نظمِ زندگی رہ رہ کے برہم ہو، منظم ہو

کہاں ملتی ہے اتنی فرصتِ غم دورِ گردوں میں
دلِ گم گشتہ کا اے ہم نشیں نو آج ماتم ہو

وہی ہے زخمِ پنہاں خشک ہو کر جو لہو دے دے
وہی ہے دردِ دل جو اور بڑھ جائے اگر کم ہو

ہمیں اے زندگی! کچھ غیب کو پیغام دینا ہے
فرازِ عرش سے اترے خدا بھی آج آدم ہو

ہم آہنگ اس قدر ہے شاعرِ فطرت سے یہ خلقت
کہ سیارے پگھل جائیں اگر میری پلک نم ہو

وصیت کر رہا ہوں آج آنے والی نسلوں کو
کچھ ان سے کہہ سکوں اے دردِ بے پایاں ذرا کم ہو

تری قربت کی حاصل ہو سعادت یہ کہاں ممکن
قریب اپنے سے ہو جاؤں اب اتنا تو ذرا غم ہو

بھری دُنیا کے سونے پن سے تنگ آ کر یہ کہتا ہوں
یہاں کیا کچھ نہیں ہے تو مگر کیسے فراہم ہو

شعورِ کائنات اس طرح کوئی دے نہیں سکتا
مری نظروں سے عالم کو جو دیکھیں اور عالم ہو

مری تحریر کا ہر نقطہ خالِ روئے زیبا کر
ہر اک شوشہ و مرکز میں لبِ جاں بخش کا خم ہو

کلام با اثر ہو سر بسر پیغام رحمت کا
گداز قلب سے آنکھوں کی چنگاری بھی شبنم ہو

قلم کا زور تنقیدوں میں ناحق صرف کرتے ہیں
غزل اک ایسی کہہ لائیں حریفوں میں اگر دم ہو

فراقؔ اب تو نئے سر سے زمانے کو سنورنا ہے
نظامِ زندگانی اور بہ ہم اور برہم ہو

فتنہ ساحر

تجھ سے تو کچھ گلہ ہی نہیں اے نگاہِ ناز
جو بھی خوشی ملی غمِ دوراں نے چھین لی
وہ اک خلش کہ جس سے تھی تسکینِ دل ہمیں
تیری نگاہِ زود پشیماں نے چھین لی
مے سے غرض نشاط یقیناً تھی ہمنشیں
وہ بھی نوازشِ غمِ دوراں نے چھین لی
فصلِ بہار ہم تو تہی دست ہی رہے
وحشت ملی تھی جیب و گریباں نے چھین لی

O

کہیں کہیں ہی سہی اے سکوں گزیدہ حیات
کبھی تو مرحلۂ اضطراب بھی آئے
یہاں نہیں تو سرِ دار ہی سہی لیکن
ہمارے سامنے وہ انقلاب بھی آئے
یہ سب بجا مگر اے ذاکرانِ ماہ و نجوم
کبھی تو تذکرۂ آفتاب بھی آئے

اثر مجیدی

خزاں نے کچھ ایسے گل کھلائے، بہار آ کر پلٹ گئی ہے
گلوں کے بدلے چمن کی ساری بساط کانٹوں سے پٹ گئی ہے

سمٹ کے موجیں بکھر گئی ہیں، سنبھل کے طوفاں بپھر گئے ہیں
نہ جانے کس غمزدہ کی کشتی قریب ساحل الٹ گئی ہے

وہی گلستاں کی آرزو ہے، وہی ہے پرواز کی تمنّا
اگرچہ زنداں کھلا ہوا ہے، اگرچہ زنجیر کٹ گئی ہے

بقدرِ ظرفِ بشر نہیں ہے، نظر کا پھیلاؤ دل کی وسعت
تمہارے ماحول کی بدولت حیاتِ انساں سمٹ گئی ہے

نہ جانے آئی ہے یاد کس کی، نہ جانے دل کیوں دھڑک رہا ہے
مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ عمرِ رفتہ پلٹ گئی ہے

جسے زمانے نے دی صدائیں جسے پکارا ہے زندگی نے
وہی تو عمرِ عزیز اپنی، تمہاری محفل میں کٹ گئی ہے

عجیب شے ہے یہ واقعی مے ذرا سی میں نے اثرؔ جو پی لی
کہ کیفِ ذہن و دھل گئی ہے کدورتِ قلب چھٹ گئی ہے

انورِ معظم

اشک ہے سرمژگاں، باریاب ہونے دو
شام کے ستارے کو ماہتاب ہونے دو

اک کلی ہے یادوں کی دشتِ دل کا سرمایہ
اس بہارِ تنہا کو باب گلاب ہونے دو

احترامِ غم بھی اک رسمِ مئے پرستی ہے!
آنسوؤں کو پی جاؤ یا شراب ہونے دو

مختصر نہ ہو جائیں تذکرے وفاؤں کے
حسن کی نگاہوں کو کامیاب ہونے دو

اہلِ درد کی راتیں چاند کو نہ ترسیں گی
میرے داغِ الفت کو آفتاب ہونے دو

پھر چلے ہیں فرزانے میر کے خرابے میں
ہاں! مزاجِ داروں کو کچھ خراب ہونے دو!

محمود ایاز

اہلِ محفل ابھی شائستۂ ایّام نہیں — آگہی عام ہے اندازِ جنوں عام نہیں

بزمِ ہستی سے ہے یک گام پہ منزل گہِ ہوش — تیرے مستوں کو مگر فرصتِ یک گام نہیں

ایک مدّت ہوئی ہر رشتۂ دل ٹوٹ گیا — آج وہ سلسلۂ نامہ و پیغام نہیں

میری نظروں میں ہیں صد جلوۂ کونین کے راز — عشق کا ذوقِ نظر صرفِ در و بام نہیں

میں بھی ہوں شاہدِ ایّام کے عشووں کا قتیل
میرے ہونٹوں پہ مگر شکوۂ ایّام نہیں

○

جو ایک بار وہ جلوے بکھر گئے ہوتے
غمِ حیات کے گیسو سنور گئے ہوتے

جو تیرے در پہ بھی تسکینِ جاں نہیں ملتی
مزاجِ دہر کے مارے کدھر گئے ہوتے

کبھی تو دیدۂ و دل کا حجاب اٹھ جاتا
کبھی تو اہلِ طلب بے خبر گئے ہوتے

۵ راپریل سے شاندار افتتاح

عورتوں کی تعلیم کے مسئلے پر بنائی ہوئی اصلاحی فلم

ابھیمان



ہدایت :- مہیش کول ـــــ موسیقی :- انل بسواس ـــ کہانی :- مکھرام شرما

اداکار :- چاند عثمانی ۔ شیکھر ۔ امیتا ۔ محمود ۔ نذیر حسین اور یعقوب

پربھات ٹاکیز (حیدرآباد) ـــــ **منوہر ٹاکیز** (سکندرآباد)

(عذرا)

ایڈوانس بکنگ روزآنہ ۱۱ تا ایک بجے اور اوقات سینما میں

(تبصرے کے لیے دو جلدیں بھیجی جائیں)

تبصرے

زرِ داغِ دل

از :- عبدالعزیز خالد
ناشر :- مکتبۂ شعور کراچی
قیمت :- دس روپے

عبدالعزیز خالد شاعروں کی نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ زرِ داغِ دل ان کی طویل تمثیلی نظموں کا مجموعہ ہے۔ بلحاظ کمیّت و کیفیت قابلِ توجہ ہے۔

جدید شاعری کا سرمایہ مختصر نظم اور غزل تک محدود ہے۔ ہمارے ہاں طویل نظموں کا وجود برائے نام ہے اور ڈرامائی یا تمثیلی نظموں کا تو خیر کوئی ذکر ہی نہیں۔ اس قحط الصناف میں عبدالعزیز خالد کی یہ کوشش اپنے اندر بڑے امکانات رکھتی ہے۔

خالد کی شاعری کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے شعر خاصی کاوش نظر کے ساتھ کہے ہیں۔ ان کے جذبے میں کوہکنی کے سے انداز پائے جاتے ہیں اور جوئے شیر لانے کی تڑپ بے قرار نظر آتی ہے۔ ان تمثیلی نظموں کا بنیادی خیال انگریزی کی بعض مشہور نظموں سے لیا گیا ہے لیکن اس سے ان نظموں کی افادیت اور انفرادیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ کیونکہ خالد نے ان نظموں کو جو پیرہن عطا کیا ہے وہ ہمارے لیے نامانوس نہیں۔

خالد کالم نویسی کے آرٹ سے بھی خوب واقف ہیں۔ ان تمثیلی نظموں کے مطالعہ کے دوران میں جا بجا ایسے مقامات بھی آتے ہیں جہاں شاعر کی اہلیتوں کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ لیکن دبی زبان سے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ خالد ثقالت و غرابت کے جا بجا شکار نظر آتے ہیں۔ ان کی نظم تو خیر اس عیب سے پاک نہیں مگر ان کی نثر بھی بھاری بھرکم الفاظ سے بوجھل نظر آتی ہے۔ میں یہاں خالد کے خود نوشتہ افتتاحیہ سے چند جملے نقل کرتا ہوں ملاحظہ ہوں

"وہ (شاعر) انسان کا اور اس کے مختلف شؤن و مظاہر عوامل و عناصر، شمائل و سجایا، خصائل و مزایا مقادیر و کوائف اور عصور و دھور میں مطالعہ کرتا ہے۔ دل کی شعلیات اور دماغ کی تنقیحات کا جائزہ لیتا ہے ذوقیات وضعیات، واقعیت و رومانیت، سرمدیت و عینیت سے بحث کرتا ہے۔ امانی و آمال، اقوال و افعال اور اعمار و آجال کے طریقہ و حزبہ پر غور کرتا ہے اور قوارئ تسخیر کے حقائق و بحر کے ادراک کی ممکن کوشش کرتا ہے۔"

نفیس ٹائپ میں چھپی ہوئی یہ کتاب خوبصورتی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ جس کے لیے ناشر قابلِ مبارک باد ہے۔

(شاذ تمکنت)

خرام

از:۔ مہیش چندر نقش
ناشر:۔ مکتبہ قیصر اردو
قیمت:۔ دو روپے آٹھ آنے

ادبی رسائل کے قارئین کے لیے مہیش چندر نقش کا نام نیا نہیں۔ "خرام" ان کی فکری کاوشوں کا نتیجہ ہے جس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ نقش ایک خاموش اور سنجیدہ فن کار ہیں تخلیقی لگن بدرجۂ اتم موجود ہے۔

خرام غزلوں کا مجموعہ ہے جس میں کہیں کہیں جگر اور فراق کی لے بھی سنائی دیتی ہے مگر اس کے باوجود نقش کی اپنی آواز جو ابھی مدھم سہی، جلوہ گر ہے۔ اکثر غزلوں کی زمینیں پرانی ہیں مگر نقش نے ان میں تازگی اور شگفتگی پیدا کی ہے جس سے ان کی فکر کی صحت مندی کا پتہ چلتا ہے۔

کتاب کا دیباچہ فراق گورکھپوری نے لکھا ہے جو بہت متوازن اور دلکش ہے۔ احسان دانش نے شاعر کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جس کے بغیر بھی یہ مجموعہ وقیع تھا۔

محمد اسماعیل آرٹسٹ نے اس مجموعہ کے بعض اشعار کو کاغذی پیرہن عطا کیا ہے جس سے "خرام" کی دیدہ زیبی میں اضافہ ہوگیا ہے۔ (شاد نعمانی)

رات کے گھونگھٹ

مصنف:۔ ٹھاکر پونچھی
ناشر:۔ رسالہ "بیسویں صدی" دہلی
قیمت:۔ دو روپے

آج کل ہر زبان کے ناول نگار کے سامنے ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ وہ کن مسائل کی ترجمانی کرے آج کل بے شک ناول کا دور ہے لیکن اس کے باوجود اچھے ناولوں کی تعداد اتنی کم ہے کہ ان کے نام زبانی یاد رکھے جا سکتے ہیں۔ آج زندگی اور تہذیب کا معیار تیزی سے بدلتا جا رہا ہے۔ زندگی نے خود ہی اپنا نصب العین اس میں مقرر نہیں کیا ہے۔ نئے اذہان اپنے ماحول سے مطمئن نہیں ہیں اور اپنے عمل پر خود ہی اعتبار نہیں کرتے اس لیے ادیب کو ایک ایسے ماحول کی عکاسی کرنا پڑ رہی ہے جو اس کے سامنے واضح نہیں ہے۔

ناول نگاری میں کردار نگاری اور تسلسل لازمی چیزیں ہیں۔ فلم کی طرح ناول میں بھی الجھاوے اور SUSPENSE کا ہونا ضروری ہے۔

ان باتوں کو دھیان میں رکھ کر نئے ناول پڑھیے گا تو دو باتوں کا احساس ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ناول کو نئے موضوع مل رہے ہیں، لیکن ساتھ ہی ناول ٹکنیک سے ہٹتا جا رہا ہے۔ ٹھاکر پونچھی کا نیا ناول "رات

کے گھونگھٹ" بھی ان ہی ناولوں میں شمار ہوسکتا ہے۔

شام کے وقت افسانہ نگار ایک ہوٹل میں اپنے دوست کا انتظار کر رہا ہے۔ انتظار کے دوران میں وہ مختلف طبقوں اور ذہنیتوں کے افراد کو اپنے پاس دیکھتا ہے۔ ان کی زندگی کے متعلق لوگوں سے کچھ باتیں سنتا ہے اور رات گئے ہوٹل سے جاتے وقت ناول بھی ختم کرتا جاتا ہے۔ ناول میں سب کردار صرف ایک جھلک دکھانے کو آتے ہیں اور اپنا تعارف کروانے کے بعد اندھیرے میں ڈوب جاتے ہیں۔

لیکن ناول کی ٹکنیک نہ برتنے کے باوجود ٹھاکر صاحب نے اعلیٰ طبقہ کی کھوکھلی زندگی پر بڑے سلیقے سے طنز کیا ہے۔ اس طبقے کے متعلق ان کا مشاہدہ گہرا ہے اور وہ متضاد ذہنیتوں کا تقابل بڑی خوبصورتی سے کرتے ہیں۔ طبقاتی الجھنوں پر غور کرتے وقت مصنف نے اپنی چوکسی کا ثبوت دیا ہے۔

اس طرح "رات کے گھونگھٹ" ایک بڑی خوبصورت کہانی ہے۔ جو ادبی حلقوں میں اپنی ٹکنیک کی وجہ سے ضرور پسند کی جائے گی۔

کتاب بڑی نفاست سے شائع کی گئی ہے اس کے باوجود قیمت بہت کم ہے۔ (جیلانی بانو)

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے

مصنف :- ٹھاکر پونچھی
پبلشر :- رسالہ بیسویں صدی - دہلی
قیمت :- دو روپے

"شمع ہر رنگ میں جلتی ہے"۔ ٹھاکر پونچھی کا ایک اور ناول ہے۔ اس ناول کا موضوع بہت اہم ہے۔ سرمایہ دارانہ سماج میں سچا فن کار کس طرح زندہ رہے! یہ سوال صرف اس ناول کے ہیرو کے آگے ہی نہیں ہے بلکہ سوال ان سب فن کاروں کے سامنے ہے جو اپنے فن کی عفت کو تجارت سے ملوث کرنا نہیں چاہتے اس ناول کا ہیرو دریندر بابو بھی پیٹ کی بھوک اور روح کی بھوک کا شکار ہے۔ وہ اپنے آرٹ میں کھویا ہوا ہے تو اس کا پیٹ احتجاج کرتا ہے اور پیٹ بھرنے کی سوچے تو قلم بیچنا پڑتا ہے ——

ٹھاکر پونچھی اپنے ہیرو کو اس کشاکش سے نکال کر گاؤں کی پرسکون وادیوں میں کھو جانے کے لیے بھیج دیتے ہیں۔ اس طرح ناول ایک استعجاب کی علامت لیے ہوئے ختم ہو جاتا ہے۔

اردو میں یہ ناول نگاری کا اہم موڑ ہے جہاں فنکار رومان کی دل آویز وادیوں سے نکل کر سنجیدہ حقیقتوں کی بھی چھان پھٹک کر رہے ہیں۔ لیکن سرمایہ داری اور آرٹ کے اس تضاد کو کم کرنا آج کا اہم موضوع ہے۔ کیونکہ آج ایسے فنکار بھی ہیں جو اس ماحول سے لڑ رہے ہیں اور اپنے فن کو بلندیوں کی طرف لے جا رہے ہیں۔ نئے لکھنے والوں کو انھیں قریب سے دیکھنا ہوگا۔

بہر حال ناول نگاری کا یہ نیا رجحان قابل ستائش ہے۔ اس سلسلے میں "رات کے گھونگھٹ" اور "شمع ہر رنگ میں جلتی ہے" وغیرہ ناولوں کو گرم جوشی کے ساتھ خوش آمدید کہنا ہوگا۔ تاکہ آئندہ یہ من کاران چھوٹے چھوٹے تجربوں کے بعد اور زیادہ شاندار ناولوں کا ادب میں اضافہ کریں۔

یہ ناول بھی طباعت اور گٹ اپ کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہے۔ (جیلانی بانو)

رسالے

نیا دور (کراچی) شمارہ

ایڈیٹر:- ثناء اللہ
ناشر:- پاکستان کلچرل سوسائٹی۔ کراچی ۵

نیا دور پاکستان کے ان رسالوں میں سے ہے جنھوں نے طباعت اور صوری حسن کا ایک نیا اور بلند معیار قائم کیا ہے۔ اس شمارے میں مضامین اور افسانوں کے حصے بہت جاندار ہیں۔ ڈاکٹر محمد اشرف کا مضمون "تاریخ ممتاز" بہت معلومات آفرین ہے۔ جمیل جالبی نے خواجہ میر درد کی شاعری کو نئے زاویے سے پرکھا ہے اور حق تو یہ ہے کہ درد کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے۔ آل احمد سرور کا مضمون "فیض" زنداں نامے کے ہندوستانی ایڈیشن کا دیباچہ ہے۔ ہماری تنقید میں شاعروں اور ادیبوں کے گرد عظمت کا ہالا بنا کر شخصیت پرستی کا رواج خطرناک حد تک سرایت کر چکا ہے اور اس بات کی ضرورت ہے کہ تنقید کو اس راستے سے ہٹایا جائے۔ فیض کی انفرادیت ان کی خوبیاں اور بڑائی مسلم، یہ بھی تسلیم کہ وہ عہد آفریں شاعر ہیں۔ لیکن تنقید کا تقاضا یہ ہے کہ روشن اور تاریک دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے ادھر کچھ عرصے سے ہمارے بلند پایہ نقاد فیض پر قلم اٹھاتے ہوئے قصیدہ خواں نظر آتے ہیں۔ فن اور زبان کی غلطیوں کو تو جانے دیجئے ان کی کمزور نظموں کی طرف بھی کوئی اشارہ نہیں کرتا، اس مضمون میں ایک نظم کے کچھ مصرعے بہت ہی تعریف کے ساتھ نقل کئے گئے ہیں، تین مصرعے ملاحظہ فرمائیے ؎

اسی کی شبنم سے خامشی کے
یہ چند قطرے تری جبیں پر
برس کے ہیرے پروگئے ہیں

"چند قطروں کا برس کر جبیں پر ہیرے پرونا" خود محل نظر ہے۔ آل احمد سرور ایسے بلند پایہ نقادوں سے ہمارا یہ مطالبہ حق بجانب ہوگا کہ وہ علی تنقید کو زیادہ اونچا اٹھائیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کا مضمون جذبی پر اور باقر مہدی کا مضمون اختر الایمان پر کافی متوازی اور مدلل تنقیدی انداز رکھتے ہیں۔ اسی شمارے میں اختر الایمان پر تین مضمون ہیں اور خود ان کی چار نظمیں۔ اختر الایمان ان شاعروں میں سے ہیں جن کے ساتھ اب تک ہمارے

نقادوں نے انصاف نہیں کیا اور شخصیت پرستی، گروہ بندی اور لغزہ بازی کے نقار خانے میں وہ طوطی کی آواز بن کر رہ گئے۔ باقر مہدی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ اب تک ہمارے نقاد غزل اور تغزل کے ناقد ہیں" اگر وہ نظم کے ناقد ہوتے تو اخترالایمان کی اب تک ناقدری نہ ہوتی۔ ڈاکٹر محمد احسن کا مضمون "شعور کی نوعیت" بہت الجھا الجھا سا ہے، انھوں نے جس مفروضے پر اپنے مضمون کی بنیاد رکھی ہے وہ یہ ہے کہ شعور کا ہر نیا انکشاف دراصل شعور اور لاشعور کے وصال سے وجود میں آتا ہے۔ اس طرح مضمون کی پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھی ہے جس کی وجہ سے پوری عمارت بھول بھلیاں بن کر رہ گئی ہے۔ ایک اصطلاح عین کو جن مختلف معنوں میں استعمال کیا گیا ہے اس کی وجہ سے اور بھی الجھن پیدا ہوتی ہے اور پورا مضمون پڑھ کر بھی سوائے الجھنوں کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ انتظار حسین اور ناصر کاظمی کا مکالمہ دلچسپ ہے اور انھوں نے آزاد ادب میں مغربی اثرات کو انکشن کے ذریعہ داخل کرنے کا اچھا خاکہ اٹھایا ہے مگر کہیں کہیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حضرات بہت دور کی کوڑی لائے ہیں اور "گفتگو کی تکنیک" کو برتنے کے لیے خوب ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔

شاہد احمد دہلوی کا انداز شخصیت نگاری اتنا دلچسپ اور منفرد ہے کہ "میر ناصر علی" کو محض ایک کامیاب اسکیچ کہنا ہی کافی نہیں افسانوں میں آغا بابر کا افسانہ "حویلی" اور غلام جیلانی کا "نیم کا پیڑ" سماج کے آئے دم توڑتے ہوئے طبقے کی زندگی کے بہت اچھے آئینے ہیں۔ خدیجہ مستور کا افسانہ "ڈولی" اور واجدہ تبسم کا افسانہ "آگ میں پھول" جنسی موضوع پر ہیں اور کامیاب افسانے ہیں۔ رتن سنگھ کا سفارت خانہ اچھا طنز ہے، ہاجرہ مسرور نے افسانوں کے علاوہ اب ڈرامے لکھنے بھی شروع کیے ہیں اور اس صنف میں بھی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے۔ شوکت صدیقی نے ادھر چند بہت کامیاب افسانے لکھے ہیں۔ لیکن سنسنی پیدا کرکے افسانوں کی فضا کو پُراسرار بنانے کا بڑھتا ہوا رجحان خود ان کے حق میں مفید نہیں۔

نیا دور میں "نئی تحریریں" کی طرح شاعروں کی بیک وقت کئی کئی چیزیں دینے کا جو سلسلہ شروع کیا گیا ہے وہ شاعر کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ اور ایک مستحسن اقدام ہے۔ امین اشرف نئے شاعر ہیں اور ان میں غزل کا مزاج بھی ہے لہجہ بھی، انھیں ایک نئے غزل گو کی حیثیت سے خوش آمدید کہنا چاہیے۔ ضیا جالندھری کی غزلیں بھی گوارا ہیں۔ ابن انشاء کے قلندرانہ انداز میں جہاں ان کی انفرادیت ہے وہیں کچھ بنانے کی کوشش ان کی کمزوری بھی ہے۔ اپنے آپ کو "انشا جانی" کہنا کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ حمایت علی شاعر کی نظمیں اچھی ہیں اور غزلیں گوارا۔

رسالے میں سب سے زیادہ کمزور حصہ نظموں اور غزلوں کا ہے۔ بڑے نام ہونے کے باوجود جذبی کے سوا اور کسی کی غزل اپنی طرف نہیں کھینچتی، نظموں میں شاذ تمکنت کی نظم ہی ذرا دل کو لگتی ہے۔ جمیلہ خاتون اور

مائر سیالکوٹی کی نظمیں انتہائی بے جان اور کمزور ہیں، نہ تو خیال نیا ہے اور نہ انداز بیان میں کوئی ندرت ہے۔ نظم کی صنف اب اتنی ترقی کر چکی ہے کہ ایسی نظموں کی اشاعت پر حیرت ہوتی ہے۔ مدیر کو انتخاب میں احتیاط برتنی چاہیئے۔

مجموعی حیثیت سے نیا دور ایک اچھا اور معیاری ادبی جریدہ ہے جو افسانوں اور مضامین کے اعتبار سے قابل قدر ہے۔ ساڑھے چار سو صفحات کے رسالے کی ترتیب سے مدیر کی کاوش اور دقتِ نظر کا پتہ چلتا ہے اس قدر حسین اور معیاری رسالے کی قیمت چار روپے کچھ زائد نہیں۔ (وحید اختر)

ساقی افسانہ نمبر

مرتب :- شاہد احمد دہلوی
صفحات :- ۴۰۰ قیمت :- چار روپے

ساقی کے اس افسانہ نمبر میں دنیا کی تمام زبانوں کے بہترین افسانوں کے تراجم شامل کئے گئے ہیں۔ ساقی ان رسالوں میں سے ہے جنھوں نے ادب کی جدید تحریک کے آغاز سے ہی اپنا ایک اونچا معیار دیا ہے۔ اور خاص طور پر مختصر افسانوں کی صنف کو بالا ل کرنے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ساقی اور مدیر ساقی نے بہت سے ایسے نئے افسانہ نگاروں کو پہلی بار اپنے صفحات میں روشناس کرایا جو آج اردو میں صف اول کے افسانہ نگار مانے جاتے ہیں۔

اس خاص نمبر کو شاہد احمد دہلوی اور حسن عسکری نے مرتب کیا ہے۔ افسانوں کی حد تک دونوں کا ذوق انتخاب اور وسعت نظر مسلّمہ ہے۔ "جھلکیاں" میں کچھ سخن گسترانہ باتیں آپڑی ہیں مگر اس سرسری تبصرے میں اتنی گنجائش نہیں کہ ان بحثوں میں الجھا جائے۔

اردو ادب میں تراجم کی اہمیت اس لحاظ سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ ہمارے ادب کو ابھی باہر سے بہت کچھ سیکھنا ہے، مرتبین کی یہ کوشش قابل قدر ہے کہ انھوں نے تراجم کا اتنا ضخیم مجموعہ ہمارے ہاتھوں تک پہنچایا ہے۔ اس کی ترتیب و تدوین میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا اسے وہ لوگ بخوبی جان سکتے ہیں جو کسی ادبی جریدے کی ادارتی دشواریوں سے واقف ہیں، اس وقت پاکستان میں پرانے ادبی رسائل کی قدردانی کا یہ عالم ہے کہ ہمایوں دم توڑ چکا ہے، ادبی دنیا دم توڑ رہا ہے۔ ایسے میں ساقی کا یہ نمبر اس کی زندگی کا ناقابل تردید ثبوت ہے۔

ہم کو مرتبین کی پوری دقتوں کا احساس ہے۔ لیکن پھر بھی یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ یہ دقیع نمبر اور زیادہ دقیع ہو سکتا تھا اگر افسانوں کے انتخاب میں کچھ اور محنت کر لی جاتی۔ بعض افسانہ نگاروں کی بہترین تخلیقات مل سکتی

تھیں، بعض زبانوں کے اور زیادہ اچھے لکھنے والوں کی چیزیں اس انتخاب میں شامل کی جاسکتی تھیں۔ ہندوستان کی پوری زبانوں کی بھی نمائندگی نہیں ہوسکی ہے، باہر کے لکھنے والوں میں بہت سے ناموں کی کمی کھٹکتی ہے۔ مثال کے طور پر ترگنیف، چیخوف، بالزاک، لوہسوُن، جیمز جوائس، ٹامس مان، آلڈوس ہکسلے، ہیمنگوے، سمرسٹ ماہم پراٹ لیو، جبران، پرل بک اور کئی نام نظر نہیں آتے۔ لیکن اس کمی کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے کیوں کہ اس کا سبب وہ مجبوریاں ہیں جو غریب اردو کے غریب پرچوں کی راہ میں ہر وقت حائل رہتی ہیں۔ ادبی پرچوں کی اس کساد بازاری اور ناقدری کے زمانے میں ساقی کا افسانہ نمبر اپنی موجودہ صورت میں بھی ایک اہم کارنامہ ہے۔ (فرحید اختر)

ادبِ لطیف سالنامہ ۱۹۵۵ء

مرتب :- مرزا ادیب
ناشر :- مکتبۂ اردو، سرکلر روڈ، لاہور
قیمت :- دو روپے آٹھ آنے۔ صفحات :- ۲۴۴

ادب لطیف کے تعلق سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس وقت یہ ہندو پاکستان کے اعلیٰ ترین ادبی معیار کے دو تین ماہناموں میں سے ایک ہے۔ اس کے عام شماروں میں بھی افسانے اور ڈرامے کا حصہ بطور خاص مدیر کی دقتِ نظر اور حسنِ انتخاب پر دال ہوا کرتا ہے۔ یہی خصوصیت ہمیں سالنامے میں بھی نظر آتی ہے۔ مجموعی حیثیت سے پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ آج کے دور میں اچھا اور معیاری ادب زیادہ نئے لکھنے والوں کی اشتھاک صلاحیتوں کا رہینِ منت ہے۔ اور یہ بات خود ایک اچھا شگون ہے۔ یہ مقام ان لوگوں کے لیے بھی لمحۂ فکریہ ہے جو ادب میں جمود کا رونا روتے ہیں اور ان نقادوں کے لیے بھی جو نئے لکھنے والوں کی صلاحیتوں کو تسلیم کرنا کفر سمجھتے ہیں۔ یہاں ان لوگوں کا تو ذکر ہی بے کار ہے جو ادب کو سمجھے بغیر صرف بڑے ناموں پر جان دیتے ہیں۔

ڈرامہ پچھلے چند برسوں سے ادب لطیف کی ایک خصوصیت بن گیا ہے۔ ادھر مرزا ادیب نے اردو کی اس کم مایہ صنف کو نہ صرف خود مسلسل اچھے اور کامیاب ڈرامے لکھ کر مالا مال کیا ہے بلکہ پابندی کے ساتھ ہر شمارے میں کم از کم ایک اچھا ڈرامہ دے کر اس صنف کو آگے بڑھانے کی قابلِ قدر کوشش کی ہے۔ سالنامے میں بھی تین ڈرامے ہیں۔ اور تینوں اپنے اپنے دائرے میں کامیاب ہیں۔ بطور خاص غلام جیلانی کا ڈرامہ اس صنف پر ان کی قدرت اور تمثیل نگاری کی صلاحیت کا اچھا نمونہ ہے۔

افسانوں میں احمد ندیم قاسمی، جیلانی بانو، شام ملک اور صادق حسین کے افسانے اچھے ہیں۔ بانو قدسیہ کا افسانہ خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے کیونکہ اس سے قبل ان کے صرف دو افسانے ادب لطیف ہی میں چھپے ہیں اور یہ تیسرا افسانہ ہے، جس نے بھی ان کے تینوں افسانے پڑھے ہیں وہ ان کے تابناک مستقبل سے کافی پرامید ہے۔ مقالوں کے حصے میں تینوں ہی مضامین اچھے اور اپنے موضوع پر کافی جامع بھی ہیں لیکن ڈاکٹر وزیر آغا کا

مضمون پڑھتے ہوئے کہیں کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خیالات میں تھوڑا سا الجھاؤ ہے۔ اگر یہ دور ہو جاتا تو اچھا تھا ویسے بھی مضامین کی کمی کھٹکتی ہے کیونکہ اس ضخیم سالنامے میں صرف تین مقالے کافی نہیں تھے۔

نظموں میں سردار جعفری کی دو نظمیں "میرے خواب" اور "ایک دوست سے" ان کی شاعری کے بدلتے ہوئے رجحان کی آئینہ دار ہیں اور کامیاب بھی ہیں۔ اختر الایمان، ضمیر جعفری، قاضی سلیم، خلیل الرحمٰن اعظمی، مصطفےٰ زیدی اور شاذ تمکنت کی نظمیں اچھی ہیں۔ فراق گورکھپوری، باقی صدیقی، انجم رومانی، اور مشفق خواجہ کی غزلیں ٹھیک ہیں، گیت سب پھس پھسے ہیں۔

یہاں میں دو چیزوں کا اہمیت کے ساتھ ذکر کرنا چاہتا ہوں ایک وقار لطیف کا طویل مختصر افسانہ ہے اور دوسرا جعفر طاہر کا کینٹو۔ وقار لطیف افسانوی دنیا میں نو وارد ہے لیکن اس کی اٹھان ابتدا ہی سے بہت شاندار ہے۔ یہی حال کم و بیش شاعری میں جعفر طاہر کا ہے۔ لیکن ان دونوں کی یہ چیزیں پڑھنے کے بعد یہ سوچنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ کیا ہمارے ماحول، ہمارے دیس اور ہمارے اردگرد پھیلے ہوئے بے شمار موضوعات میں سے کسی میں اتنی کشش نہیں کہ وہ افسانے یا شاعری کا موضوع بن سکیں؟ ہر زبان کی اپنے کلچر کے مطابق کچھ روایات ہوتی ہیں، اگر ایسی روایات کو شعر و ادب میں منتقل کیا جائے جو عام پڑھنے والوں کے مزاجوں سے میل نہیں کھاتیں یا کم سے کم اجنبی ہیں تو شعر و ادب کی تاثیر کا کم ہونا لازمی ہے۔ مغربی افکار و نظریات کے ساتھ ساتھ مغربی روایات کو اپنا موضوع بنانا وہی انجکشن سے مغربی اثرات داخل کرنے والی بات ہے۔ افسانے میں بھی یہ رجحان مقامی رنگ اور مزاج کی ترجمانی کے مفائر معلوم ہوتا ہے لیکن شعر تو وہ نازک آبگینہ ہے جو ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ جاتا ہے۔ اردو ہر ہر لفظ پر اپنی تشریح کے لیے سات سمندر پار کی روایتوں کے سہارے کا متحمل نہیں ہو سکتا ایک بات اور جعفر طاہر کے ڈکشن سے تعلق رکھتی ہے کہ اگر وہ اپنے کو غیر ضروری لفظی اور ثقالت سے بچا سکیں تو زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔

ادب لطیف کا سالنامہ اپنی پچھلی روایات کے مطابق صوری حسن کا بھی ایک اچھا نمونہ ہے۔ (وحید اختر)

ہندوستان میں صبا کی ایجنسیاں

- بھٹاچاریہ سپلیٹی۔ پوسٹ سورناپور ضلع ۲۴ پرگنہ (مغربی بنگال)
- آزاد کتاب گھر۔ نیو مارکٹ، ساکچی بازار۔ جمشید پور
- دلشاد عالم قاضی پور خرد، گورکھپور (یوپی)
- علی خزانہ۔ اسنسول
- انوار احمد خاں۔ نیوز پیپر ایجنٹ، اعظم گڈھ (یو، پی)

بازگشت

۵۷-۳-۱۴ _____ حیدرآباد دکن

"صبا" میں ذرا اچھے افسانے رکھا کیجیے (میں اپنے آپ کو بھی مطعون کر رہی ہوں) آج کل تنقید کرنا تو دشمنی مول لینا ہے ورنہ دو چار جملے تو لکھ ہی ڈالتی ـــــ ویسے عقلمند کو اشارہ کافی ہوتا ہے ـــــ (مگر سوال یہ ہے کہ آپ عقلمند ہیں بھی یا نہیں) واجدہ

۵۷-۳-۱۴ _____ لاہور

میرزا صاحب (مرزا ادیب) سے لے کر آپ کا پرچہ پڑھتا رہتا ہوں۔ حق تو یہ ہے کہ ہندوستان میں (ایک آدھ پرچے کو چھوڑ کر) صرف یہی ایک پرچہ ہے جو ادب و ادب کی صحیح معنوں میں خدمت کر رہا ہے۔

انور خواجہ

۵۷-۳-۱۵ _____ جمشید پور

"صبا" کے تدریجی ارتقا کو دیکھ کر بے حد مسرت ہوتی ہے۔ مبارک باد قبول کیجیے۔ منظر شہاب

۵۷-۳-۱۹ _____ بنگلور

"صبا" کے متعلق تفصیلی طور پر لکھنا چاہتا تھا لیکن خط ویسے ہی کافی طویل ہو چکا ہے۔ مختصراً اتنا عرض کروں گا اگر ناممکن نہ ہو تو حصۂ نظم میں زبان و بیان کی صحت کا تھوڑا بہت خیال رکھا کیجیے۔ اس حصہ کا بنظر غائر مطالعہ آپ پر ظاہر کر دے گا کہ شاذ تمکنت سے لے کر نشور واحدی تک نے کیسی کیسی فاش غلطیاں کی ہیں۔ افسوس غلطیوں سے زیادہ اس بات پر ہے کہ یہ لوگ ذرا سی کوشش سے ان اسقام کو دور کر سکتے تھے لیکن اس کے باوجود بے نیازی برتی جاتی ہے۔ محمود ایاز

۵۷-۳-۱۹ _____ حیدرآباد دکن

بازگشت میں جیسا کہ آپ کا خیال ہے صرف توصیفی خط ہی نہ چھپیں بلکہ ان میں کچھ نہ کچھ تنقیدی پہلو بھی ہو درست ہے۔

شاذ کی نظم سارے پرچے کی جان ہے۔ ویسے حصہ نظم کافی اچھا ہے۔ راحلؔ میں کافی صلاحیتیں معلوم ہوتی

ہیں۔ نئے فنکاروں کو اسی طرح ابھارا جا سکتا ہے۔ تاب نے بہت ہی خوبصورت غزل پیش کی ہے۔
یہ نینا کاش کون صاحب[1] ہیں۔ افسانوی تکنیک سے بالکل نابلد معلوم ہوتے ہیں۔ رام لال کا افسانہ برا نہیں ہے اور بس۔ مقتدیٰ علی

۲۰-۳-۵۷ حیدرآباد دکن

مضامین کے حصے میں وحید اختر کو دیکھ کر حیرت ہوئی "تحلیل نفسی کی بنیادوں" پر وحید اختر کا مضمون چلتا ہوا اور مدلل ہے۔ ان سے کچھ اور لکھوائیے۔
نظموں میں عزیز قیسی اور شاذ تمکنت کی نظمیں بہت ہی پیاری ہیں۔ رضی اختر شوق اور راحل گونے ہیں لیکن ان کی نظموں میں نئے فنکاروں کا بوداپن نہیں ہے۔ غزلوں میں نشور واحدی اور ابن احمد تاب کی غزلیں خوب ہیں۔
افسانوی حصہ میں رام لال کی کہانی غنیمت ہے اور بقیہ کہانیاں ٹائیں ٹائیں فش۔ حفیظ قیصر

۲۰-۳-۵۷ علیگڈھ

صبا کا ——— LATEST پرچہ خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب کے یہاں دیکھا پسند آیا۔ وحید اختر صاحب کا مضمون خاص طور پر پسند آیا۔ اس قسم کے مضامین کی اردو میں سخت کمی ہے۔ قابل تعریف ہیں وہ لوگ جو اس کمی کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ افسانوں کا حصہ بھی بڑا جاندار ہے۔ (احمد اسحاق نعمانی)

۲۰-۳-۵۷ حیدرآباد دکن

"صبا" کا تازہ شمارہ دیکھا بحیثیت مجموعی پہلے شمارے سے خاصا بہتر ہے۔ وقت پر نکلا کرے تو اور اچھا ہو جائے۔ افسانوں سے مجھے زیادہ دلچسپی رہتی ہے۔ اس لیے پہلے اسی کو پڑھتا ہوں۔ اس مرتبہ رام لعل کا افسانہ عمدہ ہے۔ ہربنس سنگھ دوست کا افسانہ بھی گوارا کہا جا سکتا ہے۔ لیکن آمنہ ابوالحسن اور نینا کاش کی کہانیاں بہت معمولی ہیں۔ پرچہ ان کے بغیر بھی مکمل ہو سکتا تھا۔ براہ کرم کہانیوں کے انتخاب میں سختی برتیے۔
(محمد صادق)

ہندوستان میں "صبا" کی ایجنسیاں

- مسلم نیوز پیپر ایجنسی۔ سرائے حکیم۔ علی گڈھ (یو۔پی)
- افضل نیوز ایجنسی، مسلم بازار۔ گریڈیہ (GIRIDIH)
- نیس بک ہاؤس منڈی بازار برہان پور (مدھیہ پردیش) • جمہور لائبریری مومن پورہ گلبرگہ

[1] نینا کاش صاحب نہیں صاحبہ ہیں

مجلسِ مشاورت

حبیب الرحمٰن
فضل الرحمٰن
ڈاکٹر یوسف حسین خاں
ڈاکٹر طاہر علی خاں مسلم
رائے جانکی پرشاد
سیّد محمد
عالم خوندمیری
ڈاکٹر حفیظ قتیل
دلاور علی خاں
رضیہ بیگم
• خاور
عابد علی خاں
• مکاتب: محمد مظہر
• زرِ سالانہ
ہندوپاک سے آٹھ روپے
شششاہی
پانچ روپے

منظور شدہ محکمۂ تعلیمات حکومتِ حیدرآباد

مجلسِ ادارت

• سلیمان اریب
• حسینی شاہد
• مغنی تبسّم

جلد ۳ — شمارہ ۵

۱۹۵۷ء

قیمت

۶۵ نئے پیسے

صبا

فون ۵۴۰۲

پرنٹر پبلشر: سلیمان اریب • ۱۷ مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ • مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد دکن

اس شمارے میں

	پہلی بات		۳
	سخن گسترانہ بات	شاہد صدیقی	۶
	بازگشت	محمود ایاز	۸
		رام لعل	
		آمنہ ابوالحسن	
		علی حماد عباسی	
		حامد محسن	
• نظمیں :-	چھیڑ خوباں سے	اثر لکھنوی	۱۴
	تحفے	مخدوم محی الدین	۱۹
	کالی گھٹا	ابوظفر عبدالواحد	۲۶
	سہارا	شمیم کرہانی	۲۹
	اعتراف	سردار الہام	۳۰
	رات کے زنداں سے	دانش فرازی	۳۱
	آج کی شام	راشد آذر	۳۲
	شیش محل	سید حرمت الاکرام	۳۴
• مضامین :-	حیدرآباد کے چند مرحوم شعرا	خواجہ حمید الدین شاہد	۳۵
	دیہاتی رقص	احمد کمی	۵۰
• غزلیں :-		اثر لکھنوی	۵۲
		پرویز شاہدی	
		منظر شہاب	تا
		مظہر امام	
		اظہر سعید	۵۹
		بشر نواز	
• رباعیات :-		باقر مہدی	۶۰
• افسانہ :-	سفید پوش	کرتار سنگھ دگل	۶۲
• طنز و مزاح :-	یوم غالب	کوشر چاندپوری	۶۷

پہلی بات

ادھر پچھلے چند دنوں سے "صبا" کے لکھنے اور پڑھنے والوں کے جو خطوط ہمیں موصول ہو رہے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ "صبا" کی مقبولیت میں آئے دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس سے ہمارا حوصلہ بڑھتا ہے لیکن محض حوصلہ افزا خطوط کے سہارے کوئی پرچہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس لیے ہم اپنے پڑھنے والوں سے درخواست کریں گے کہ وہ زیادہ سے زیادہ خریدار بنا کر رسالے کی مالی حالت بہتر بنانے میں ہمارا ہاتھ بٹائیں اور لکھنے والوں سے خواہش کریں گے کہ وہ "صبا" کے لیے خود لکھیں اور دوسرے ساتھیوں سے بھی لکھوائیں۔ "صبا" کے معیار کو بلند کرنے کی ذمہ داری صرف مجلس ادارت پر عائد نہیں ہوتی بلکہ تمام لکھنے والوں پر بھی عائد ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اردو کے تمام لکھنے والے "صبا" کو اپنا رسالہ سمجھتے ہیں اور ان کی تمنا ہے کہ پرچہ نکلتا رہے لیکن اس کے باوجود ایک بڑی تعداد لکھنے والوں کی ایسی ہے جس نے ابھی تک ہمارے ساتھ عملی تعاون نہیں کیا اور اگر کیا تو بہت کم۔ آج جب کہ اردو کے رسائل ایک ایک کر کے بند ہوتے جاتے ہیں اور جو سخت جان زندہ ہیں وہ سسک رہے ہیں لکھنے والوں پر لازم آتا ہے کہ جو رسائل جاری ہیں ان کے ساتھ پورا پورا قلمی تعاون کریں۔ ورنہ ان کی سہل انگاری ان رسائل کے مستقبل کو بھی تشویشناک بنا دے گی جو ہر قسم کی دشواری کے باوجود جاری ہیں۔

ہمیں خوشی ہے کہ بازگشت کا کالم دلچسپ اور جان دار ہوتا جا رہا ہے ابتدا میں صرف ایسے خطوط آ رہے تھے جن میں تنقیدی عنصر کم اور تعریف کا رنگ گہرا ہوتا تھا لیکن اس دفعہ جو رائیں موصول ہوئی ہیں وہ بڑی جچی تلی، جاندار، انتباقی اور تعمیری ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگلی اشاعتوں میں انھیں خطوط پر رائیں لکھی جائیں گی۔

علی حماد عباسی صاحب نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ ادیب خود تنقیدی سے کام لیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ تجویز بہت اہم اور مفید ہے۔ لیکن ہمیں اندیشہ ہے کہ ہمارے ادیب، شاعر اور نقاد خود تنقیدی کا حق ادا کر سکیں گے۔ شاید یہ سوال بھی اٹھے کہ فن کار اور تخلیقی قوتوں پر یہ ایک طرح کا احتساب ہے۔ بہرحال ہم اس سلسلے میں اپنی رائے لکھنے سے پہلے اپنے ساتھیوں سے خواہش کریں گے کہ وہ اس بارے میں اظہار خیال کریں۔

حضرت اثر لکھنوی کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے۔ وہ شاعر بھی ہیں اور نقاد بھی۔ اس شمارے میں آپ ان کے دونوں روپ دیکھیں گے۔ حضرت فراق گورکھپوری کی ایک غزل "صبا" کی پچھلی اشاعت میں شائع ہوئی تھی اثر صاحب

نے اسی غزل پر غزل کہی ہے اور اس کی تنقید بھی کی ہے ـــــ اساتذہ کی نوک جھونک سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ قارئین اس بحث کا اسی نقطۂ نظر سے مطالعہ کریں گے۔

مخدوم کی شاعرانہ شخصیت ہمارے ذہنوں پر اس قدر چھائی ہوئی ہے کہ ان کی نثر نگاری کو ہم نے بھلا دیا ہے "تیگور اور ان کی شاعری" "پھول بن" اور "ہوش کے ناخن" کا مصنف کہانیاں اور تنقیدی مضامین بھی لکھ چکا ہے اور آج پھر "سرخ سویرا" کا شاعر آپ کی خدمت میں "نثری تحفے" پیش کر رہا ہے۔ یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا اور توقع ہے کہ پسند کیا جائے گا۔

جناب کوثر چاندپوری ملک کے مشہور اور پرانے افسانہ نگار ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ وہ پہلی بار "صبا" کی محفل میں شریک ہو رہے ہیں لیکن ہماری محفل میں وہ ایک مزاح نگار بن کر آئے ہیں۔ اپنے مضمون "یوم غالب" میں انھوں نے آج کل کے مشاعروں اور پیشہ ور شاعروں پر جو طنز کیا ہے اور غالب کے اشعار کی جو پیروڈی کی ہے وہ بہت کامیاب ہے۔ ہم تو کہیں گے کہ وہ افسانوں کے ساتھ اس قسم کے مزاحیہ اور طنزیہ مضامین بھی ضرور لکھا کریں۔

پچھلی اشاعت میں ہم نے اعلان کیا تھا کہ "سخن گسترانہ بات" کا فیچر مستقل رہے گا اور اس عنوان کے تحت مستقل طور پر عالم خوندمیری لکھا کریں گے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہم نے عالم صاحب کی کوتاہ قلمی" کی شکایت بھی کی تھی سو اس شکایت کے جواب میں انھوں نے دوسری ہی اشاعت میں ہمیں مضمون نہیں دیا چنانچہ اس دفعہ کی "سخن گسترانہ بات" شاہد صدیقی نے لکھی ہے۔ شاہد صدیقی جو نہ صرف ایک منجھا ہوا غزل گو، بلکہ ایک تجربہ کار جرنلسٹ اور نثر نگار بھی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ فیچر مستقل تو رہ سکتا ہے لیکن اس کا لکھنے والا مستقل نہ رہے تو کوئی ہرج نہیں ہے۔

اس شمارے میں افسانوں کا حصہ بہت مختصر ہے۔ عام پڑھنے والے افسانوں میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں اور ویسے بھی ہمارے ادب میں افسانوں کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے اور اس کی طرف سے بے توجہی نہیں برتی جانی چاہیئے لیکن اس دفعہ افسانے ہمیں بہت تاخیر سے موصول ہوئے اس لیے مجبوراً ایک ہی افسانہ دیا جا رہا ہے۔

ریویو کے لیے ہمارے پاس بہت سی کتابیں آئی ہوئی ہیں۔ اس فیچر کو ہم مستقل رکھنا چاہتے ہیں لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ ہمارے تبصرہ نگار حضرات بروقت ریویو کر دیا کریں۔ اس دفعہ باوجود مسلسل یاددہانی اور تقاضے کے کسی نے ریویو لکھ کر نہیں بھیجا۔ ہم ان مصنفین اور ناشرین سے معذرت خواہ ہیں جنھیں اپنی کتابوں پر ریویو کا انتظار ہوگا۔ موصولہ کتابوں پر ریویو جون اور جولائی کے شماروں میں آئے گا۔

اگست ۵۷ء میں "صبا" کا "جنگ آزادی نمبر" شائع ہوگا۔ اس میں جنگ آزادی اور ہماری سیاسی، تہذیبی اور ادبی زندگی پر اس کے جو اثرات مرتب ہوئے ان پر مضامین کے علاوہ ۱۸۵۷ء سے متعلق جو چیزیں لکھی

گئی ہیں ان کا انتخاب بھی شائع کیا جائے گا۔

اس بار "صبا" کا سرورق حبیب عبدالرحمٰن نے بنایا ہے۔ حبیب عبدالرحمٰن حیدرآباد کے ان ابھرتے ہوئے حسن کاروں میں سے ہیں جن کا مستقبل نہایت تابناک ہے۔ تین چار سال قبل وہ گورنمنٹ کالج آف فائن آرٹس سے امتیازی حیثیت سے ڈپلوما حاصل کر چکے ہیں۔ واٹر کلر پینٹنگ ان کا خاص میدان ہے۔ حبیب کو ان کی مصاویر پر اب تک کئی انعامات مل چکے ہیں۔

صبا ایک "فرہادی مضمون" ہے جس کا تصویری اظہار بہت مشکل ہے لیکن حبیب نے خطوط کی ہم آہنگی روشن اور تاریک حصوں کے معنی خیز تضاد اور رنگوں کے فن کارانہ امتزاج سے سرورق میں جان ڈال دی ہے۔

ملنا تمن کا غیر سے کوئی جھٹ کوئی سچ مچ کہے
کس کس کا منہ موندوں سجن کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

ابوالحسن تاناشاہ

یوں کراچی میں ہوں جس طرح سے کوفے میں حسین
سب شہادت کے ہیں آثار چنا جور گرم

جوش ملیح آبادی

شاہد صدیقی

سخن گسترانہ باتیں

شعر و ادب کی ترقی میں صحیح تنقید کے اثرات جو کام کرتے رہے ہیں ان سے ہم آپ سب واقف ہیں لیکن یہاں مسئلہ کا یہ پس منظر نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے کہ میں نے تنقید کے ساتھ اس کی صحت کو ایک شرط کے طور پر پیش کیا ہے، جس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اکثر تنقید صحیح نہ ہو تو وہ شعر و ادب کے ارتقار کی راہوں میں ایک دیوار بھی بن سکتی ہے جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے گو اس میں سائنٹفک اور اصولی تنقید کو پیدا ہوئے زیادہ مدت نہیں گذری پھر بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تنقید کا عمل مختلف شکلوں میں اس وقت سے جاری ہے جب سے کہ ہماری زبان نے ابتدائی سانسیں لینی شروع کی تھیں۔ مختصر یہ کہ فیر منظم قسم کی تنقیدیں اور ایسی تنقیدیں جو نیک نیتی کے باوجود آج کے معیار تنقید پر پوری نہیں اتر سکتیں اردو میں ابتدا ہی سے موجود رہی ہیں۔ اگر آپ اردو شاعری کے کردار اور اس کی رفتار پر گہری نظر ڈالیں تو پتہ چلے گا کہ ان مشاعروں نے جو کبھی کبھی موکوں کی شکل اختیار کر جاتے تھے کردار کو سنوارنے اور رفتار کو تیز کرنے میں کافی حصہ لیا ہے۔ اساتذۂ سخن جو اپنے اپنے شاگردوں کی ٹولیاں لے کر مشاعروں میں شریک ہوتے تھے، ان کا مقصد محض یہی نہیں ہوتا تھا کہ اپنے اشعار پر سبحان اللہ اور جزاک اللہ کے نعرے بلند کرائیں بلکہ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر موقعے کو ثو اپنی داد کے انداز سے حریف مقابل کی غلطیوں اور خامیوں کو بھی EXPOSE کرتے چلیں اور اس طرح عام مشاعروں میں شریک ہونے والوں پر اپنی مہارت فن کا سکہ جمادیں ادب کی دوسری اصناف کے سلسلے میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اردو زبان کا کوئی دور تنقید سے خالی نہیں اور پرانے مکتبی نظام کا کوئی فارغ التحصیل شخص اپنی کسی کتاب کو اس وقت تک منظر عام پر نہیں لا سکتا تھا جب تک کہ وہ اس کے اساتذہ کی نظروں سے نہ گذر چکی ہو، اور ان کی خوشنودی حاصل نہ کر چکی ہو، غالب نے اپنے متعلق جس وقت یہ کہا کہ ؎

نوشت در دیوان غزل، تا مصطفےٰ خاں خوش نہ کرد

تو اس کا مفہوم سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ غالب مرحوم اپنے شاعرانہ پندار اور دعوئے زباندانی کے باوجود مصطفےٰ خاں کو شعر فہمی کے سلسلے میں ایک آئیڈیل کی حیثیت دیتے تھے اور یہی مقام ان کے نزدیک مولانا فضل حق اور مفتی صدرالدین کو بھی حاصل تھا۔

ادب کا کوئی طالب علم ان بیش بہا اثرات سے انکار نہیں کرسکتا جو حالی کے مشہور مقدمہ شعر و شاعری نے اردو پر ڈالے میرے خیال میں اس کتاب کی اہمیت کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ اس کے ذریعہ جو تنقید کی گئی ہے اس میں خلوص نیت کا ایک تعمیری عنصر شامل ہے، یہ بات ہمیں اس دور کے اکثر تذکروں میں بھی ملتی ہے، اور اگر مولوی محمد حسین آزاد کے تذکرہ آب حیات کو نظر انداز کر دیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تذکرہ نگاروں نے تنقید کی صحت مندانہ روایات کا دامن امکانی حد تک ہاتھوں سے جانے نہیں دیا۔

بہر حال اردو شعر و ادب کی ترقی میں تنقید کا حصہ ہمیشہ نمایاں رہا ہے اور ہم اپنے نقادوں کے خواہ وہ کسی لباس میں ہمارے سامنے آئیں اس احسان کو کسی وقت بھی فراموش نہیں کرسکتے کہ ان کی شعوری یا غیر شعوری کوششوں نے اس زبان کو اس منزل تک پہنچایا، آج ہم اسے دیکھ رہے ہیں لیکن سلسلۂ خیالات کا یہی وہ موڑ ہے جہاں میں اپنے دل کے چور کو ظاہر کر دینا چاہتا ہوں۔ اور اس اندیشے کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ گذشتہ کچھ دنوں سے اردو زبان میں تنقید نے جو حیثیت اختیار کرلی ہے وہ کسی طرح بھی مسرت آفریں اور اطمینان بخش نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مختصر سے مضمون میں اس اندیشہ کے اسباب کو وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ پھر بھی میں کوشش کروں گا کہ چند ایسے اشارے کر دوں جو اس موضوع پر سوچنے والوں کی مدد کرسکیں اور ان سطور کی بنیاد پر کوئی ایسی مہم شروع کی جائے جو آج کل کی تنقید کو زیادہ تعمیری اور مفید بنا سکے۔

یہ بات ہم سب کو ماننی پڑے گی کہ تنقید کا عمل انتہائی شرافت اور دیانت داری کا متقاضی ہے اور تنقید نگار کی حیثیت اکثر و بیشتر اس منصف کی سی ہوتی ہے جو کسی کا بیان سننے کے بعد اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے فیصلہ صادر کرتا ہے۔ اس مثال کی روشنی میں سب سے پہلے تو یہ ضروری ہے کہ فیصلہ صادر کرنے والا ضروری قوانین اور ضوابط سے واقف ہو، دوسرے یہ کہ طبیعتاً غیر جانبدار ہو، اس نوبت پر پہنچ کر نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے آج کے کئی نقاد ان معیاروں پر پورے نہیں اترتے ان میں سے کچھ تو ایسے ہیں جو انگریزی زبان میں سوچتے ہیں اور اردو تصانیف کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مختلف زبانوں سے واقفیت اور معلومات کی وسعت ہر شعبۂ ادب میں اور خاص کر تنقید نگاری کے سلسلے میں مفید اثرات پیدا کرتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہم اس بنیادی حقیقت کو بھی پس پشت نہیں ڈال سکتے کہ ایک نقاد کے لیے سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ جس زبان کی تصنیف و تالیف پر رائے زنی کر رہا ہے اس سے اچھی طرح واقف ہو، شاعری کی کوئی کتاب اگر کسی ایسے شخص کے ہاتھوں میں بغرض تبصرہ دے دی جائے جو شعر کو وزن کے ساتھ پڑھنے کی قدرت بھی نہیں رکھتا تو یہ دو طرفہ ظلم ہوگا، یعنی اس شاعری کی کتاب کا مصنف اور نقاد دونوں ایک مصیبت میں پھنس کر رہ جائیں گے، اسی طرح اگر آغا حامد حسن کا مجموعۂ مضامین کسی ایسے تبصرہ نگار کے حوالے کر دیا جائے

باقی صـ۱۳۱ پر

بازگشت

بنگلور ۱۵ اپریل ۵۷ء

"صبا" موصول ہوا۔ شکریہ۔ عالم خوندمیری صاحب کا مضمون کافی خیال انگیز ہے۔ ذہنی آزادی کا جو تصور انھوں نے پیش کیا ہے وہ علمی اور فلسفیانہ گفتگو کی حد تک ٹھیک ہے لیکن عملی نقطہ نظر سے ناممکن اور انسانی فطرت اور نفسیاتی تقاضوں کے خلاف ہے ــــ برٹرنڈ رسل نے بھی اپنے مضامین ... ESSAYS ON SCEPTICISM میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا تھا اس قسم کی ذہنی آزادی (یا انارکی) کے سب سے بڑے داعی اور مبلغ کرشنامورتی ہیں۔ ان کی تحریرات ضرور عالم خوندمیری صاحب کی نظر سے گذری ہوں گی۔ یہ حقیقت ہے کہ کسی بھی نظریہ سے وابستگی انسان میں عصبیت پیدا کر دیتی ہے اور یہ عصبیت انسانوں کے درمیان انفرادی اور اجتماعی طور پر خلیج اور دوری پیدا کر دیتی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ آخر وسیع النظری اور رواداری کی حدود کا تعین بھی ہونا چاہیئے یا نہیں؟ خیر و شر، حق و باطل میں فرق اور امتیاز کرنے کا، زندگی اور اس کی اقدار کے تعین کا معیار کیسے مقرر کیا جانا چاہیئے انسان کے لیے ایک ضابطۂ حیات کی ضرورت سے تو کسی کو انکار نہیں ہوگا اور کسی بھی ضابطۂ حیات کو تسلیم کرنا گویا زندگی کے متعلق اپنے نقطہ نظر اور زندگی کے ساتھ اپنے تعلق اور رشتے کی نوعیت کا اعلان کرنا ہے۔ یہ خیال کہ دنیا کے تمام انسانوں کے لیے ایک ضابطۂ حیات ایک نقطہ نظر مقرر کیا جا سکے کافی دل خوش کن سہی لیکن اس کے ممکن العمل ہونے کے بارے میں کسی خوش فہمی کا امکان نہیں ہے۔

بنیادی بات تو یہ ہے کہ ایک آدمی کی کسی تحریک مذہب یا مکتب خیال سے وابستگی کی ضروریات خالص نفسیاتی ہوتی ہیں۔ اس پراسرار کائنات کی ہیبتناک وسعت، موت کی تلخ حقیقت اور وقت کی غارتگری کے احساس سے قطع نظر زندگی کی عام مجبوریاں اور محرومیاں ہی ایک عام آدمی کی کمر توڑ دینے اور اس کی بے بسی اور بے بضاعتی کا احساس دلانے کے لیے کافی ہیں۔ ان لمحات میں عقیدہ کی قوت SAFETY VALVE کا کام دیتی ہے۔ اسے آپ حقیقت سے آنکھیں چرانا کہہ لیجئے یا رجعت پسندی لیکن کسی ایک مذہب، جماعت یا تحریک سے وابستگی فرد کو تحفظ اور قوت کا جو احساس دیتی ہے اس سے انکار ممکن نہیں اس تحفظ اور قوت کی

حقیقت اور اس کے نفسیاتی پس منظر کی تفصیل اقبال کے ایک شعر میں لاشعوری طور پر آ گئی ہے۔

عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں
کہ برفتراک صاحب دولتے بستم سر خود را

اپنے عزائم کی شکست میں عرفانِ حق کا راستہ ڈھونڈنے کی کوشش کو ہم فراری ذہنیت تو کہہ لیں لیکن اس فرار میں گریز جس NEUROSIS ذہنی امراض کی کثرت اور خودکشی کی بڑھتی ہوئی شرح کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، اس کا کیا علاج؟

عصبیت اور تنگ نظری کو دور کرنے کے لیے جن لوگوں نے مذہب کے خلاف آواز اٹھائی ان کی نیک نیتی میں شک نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن ان کی ساری مخلصانہ کاوشوں کا نتیجہ اگر کچھ نکل سکا تو وہ یہ کہ انسان سے پرانے عقائد چھین کر نئے عقائد دے دیئے گئے اور ان نظریات سے وابستگی نے وہی صورت حال پیدا کر دی اس سلسلہ کو اگر ختم کرنا ہے تو ہمیں انسان کی زندگی اور کائنات کے پس منظر میں اک مکمل اکائی کی حیثیت سے مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ بحث کافی تفصیل اور وقت کی متقاضی ہے۔ لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ عالم خوندمیری صاحب نے اپنے مضمون میں نظریات و عقائد کا سرے سے جھگڑا ہی ختم کر دینے کا جو راستہ تجویز کیا ہے وہ دراصل ذہنی انتشار بے نظمی، بے راہروی اور انارکی کی طرف لے جانے والا ہے۔

اب لکھنے ہی بیٹھا ہوں تو لگے ہاتھوں اس شمارے کی دو ایک چیزوں پر بھی اظہار رائے کر دوں۔ افسانوں کے انتخاب میں بہت زیادہ سختی کی ضرورت ہے۔ "اندھیرا اجالا" پنج سالہ پلان کی اسکیم کے تحت لکھا ہوا افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ محترمہ آمنہ ابوالحسن کا افسانہ "آئینے" میں شائع ہو چکا ہے، اور افسانے کا مرکزی خد و خال بڑی حد تک سلیم سلیم کے دس بارہ سال پیشتر شائع شدہ افسانہ "نگاہیں" کی یاد دلاتا ہے۔ ویسے محترمہ آمنہ کے گذشتہ اور اس افسانے سے افسانہ نگار کے نفسیاتی مطالعہ کا کافی مواد ملتا ہے۔ "میرا ہم میرا دوست" اور "جب برف گرتی ہے" جیسے افسانے لکھنے والے کے قلم سے "کشمیر کی بیٹی" پڑھ کر تعجب ہوا۔ افسانہ پر آپ نے جو اداریہ میں COMMENT کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ اس افسانے کو غیر ضروری اہمیت بھی دے رہے ہیں۔ نظموں میں محترمہ شفیق فاطمہ شعریٰ اور جناب وحید اختر کی منظومات حصہ نظم کا حاصل ہیں۔ دیگر نظمیں دوسرے اور تیسرے درجہ کی ہیں۔

تبصروں کے بارے میں خاص طور پر درخواست کروں گا کہ اس حصہ کو مثالی بنانے کی کوشش کیجئے۔ انگریزی پرچوں میں یہ حصہ خاصے کی چیز ہوتا ہے، ہمارے ہاں نیاز دور (مرحوم) اور نگار کے علاوہ دوسرے پرچوں میں بہت کم اس کی اہمیت کا بالالتزام خیال رکھا جاتا ہے۔ اگر صرف رسمی اور اشتہاری قسم کا تعارف مقصود ہے تو پھر

شاذ تمکنت اور محترمہ جیلانی بانو کے تبصرے ٹھیک ہیں۔ وحید اختر صاحب کے تبصرے اچھے ہیں۔

انور معظم کی غزل کے دو تین شعر بہت اچھے ہیں۔ اثر مجیدی صاحب "پلٹ گئی ہے" "ٹوٹ گئی ہے" کے ساتھ "چھوٹ گئی ہے" باندھ گئے ہیں۔ میری غزل کے ایک مصرعہ میں "بزم مستی" چھپ گیا ہے۔ اصل مصرعہ ہے "بزم مستی سے ہے یک گام پہ منزل گہہ ہوش" ازراہ کرم تصحیح کر دیجئے۔ محمود ایاز

لکھنؤ ۲۰ اپریل ۵۷ء

تازہ "صبا" ملا۔ قریب قریب سب پڑھ چکا ہوں۔ بازگشت کے صفحات آخر کی بجائے شروع میں رکھ دیکھئے تو کیسا رہے؟ بیشتر انگریزی اور ہندی کے رسائل میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ کہانیوں کا حصہ اس بار بھی کمزور ہے رامانند ساگر کی کہانی میں کہانی پن کم ہے لیکن پروپگنڈہ زیادہ ہے اور وہ بھی بیکار اور بیثر موثر۔ آمنہ ابوالحسن کی کہانی دلچسپ کہی جا سکتی ہے۔ رتن سنگھ کی کہانی میں ایک موثر پلاٹ تو ملتا ہے لیکن اسے فنکارانہ طریقے سے پیش نہیں کیا گیا۔ غیر ضروری جزئیات کی بھرمار نے حقیقی کیرکٹر کو سامنے آنے ہی نہیں دیا۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا مضمون (یا فاکہ) کافی دلچسپ ہے۔ کاش اسے پوری محنت سے اور مسلسل طور پر لکھا جا سکتا۔ مغنی تبسم نے سردار جعفری کے ان ریمارکس پر جھنجھلا کر یہ مضمون لکھا ہے جو انھوں نے منٹو کی کتاب "سیاہ حاشیے" میں محمد حسن عسکری کا دیباچہ پڑھ کر اپنی کتاب "ترقی پسند ادب" میں کیے ہیں۔ سردار جعفری نے اگر جیالا منٹو اور کرشن چندر کے فن کا تقابل کیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ محمد حسن عسکری نے "سیاہ حاشیے" کے دیباچہ میں بھی ایسا کیا تھا۔ اور اس میں محمد حسن عسکری نے جو جو غلط بیانیاں کیں ان کا جواب دینا نہ صرف اکیلے سردار جعفری کے لیے بلکہ کچھ اور لوگوں کے لیے بھی ضروری تھا۔ اگر محمد حسن عسکری کے اس دیباچہ کو پوری دیانتداری سے پڑھا جائے تو ان کی یہ ذہنیت صاف طور پر ننگی ہو جاتی ہے کہ وہ کرشن چندر کو منٹو سے کم تر ثابت کرنا چاہتے تھے۔ اس بات کی ضرورت انھیں کیوں محسوس ہوئی۔ اس کا صحیح راز تو وہ خود جانتے ہیں یا پھر منٹو مرحوم کو معلوم ہوگا۔ ویسے بھی ہمیں ان کی اسلامی ادب کی تھیوری سے بہت کچھ اشارہ مل تو جاتا ہے۔ میں اس بات کو یہاں پھر دہرانے کی ضرورت سمجھتا ہوں (جیسا کہ میں نے اپنے مضمون "منٹو اور اس کا فن" میں کہا تھا) منٹو کے بیشتر سیاہ حاشیے اپنی ادبیت اور تاثر کی بنا پر ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اس تلخ حقیقت کے باوجود کہ اس کتاب کو اور خود منٹو کو بھی محمد حسن عسکری نے اپنے دیباچے سے بہت نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ مغنی تبسم نے اپنے مضمون کو صرف سردار جعفری کے ریمارکس تک ہی محدود رکھا ہے۔ بہتر ہوتا کہ وہ منٹو کے مخالفین کے مجموعی رجحان کا جائزہ لیتے۔ مجاز مرحوم پر غفور انیس کی نظم اچھی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ آپ کتابت کی طرف خاص طور پر توجہ نہیں دے رہے ہیں۔ ضرور توجہ دیجئے۔ راہی معصوم رضا

حیدرآباد ۲۰ اپریل ۵۷ء

"صبا" عین انتظار کے عالم میں ملا اور میری چشم منتظر نے اسے اس طرح قبول کیا جیسے کوئی پیاسا بیچ ریگستان

میں پانی۔ سہ پہر کا وقت گرمی کی شدت ایسے میں تم ہی سوچو "صبا" نے کیا کام کیا ہوگا۔ خوشی اس بات کی ہے کہ اس بار تم نے صبا کو بہت اچھا ترتیب دیا ہے مواد کے لحاظ سے یہ ایک قابل قدر ترقی ہے۔ زیدی صاحب اور رضوی صاحب کو البتہ میں نے ابھی نہیں پڑھا مگر اس سے ہٹ کر بہت سی اچھی چیزیں پڑھنے کو ملیں۔ عالم صاحب کا مضمون مغنی کا مضمون ارا ساگر کا افسانہ کیفی اور غفور انیس کی نظمیں اور غزلوں میں افور معظم کی غزل اور اثر مجیدی اور قمر ساحری کے چند شعر مگر اس تعریف کے ساتھ ساتھ ایک ذرا سا اعتراض بھی ــــ

برائے مہربانی عالم صاحب سے کہو اپنی سخن گسترانہ بات کو ذرا آسان زبان میں لکھیں تاکہ لوگ جو پڑھیں اسے صحیح طور پر سمجھ سکیں ایسا نہ ہو بات الفاظ کی سخت چٹانوں کے درمیان گھر کے صدائے بازگشت بن جائے۔ ساگر کا افسانہ بہت پیارا ہے مجھے بہت پسند آیا۔ تم نے اسے چھاپ کر اچھا کام کیا ہے۔ کیفی کا تو خیر کہنا ہی کیا مگر غفور انیس نے بھی اس بار مجاز پر بڑی پیاری نظم کہی ہے۔ ان کی اس تدریجی ترقی پر میری دلی مسرت۔ اپنے بارے میں بھی چند نئے ساتھیوں کی رائیں پڑھیں کسی نے کہا ہے نا "فکر ہر کس بقدر ہمت اوست" اس میں اور کیا کہوں۔

مجھے یہ پتہ نہیں کہ بازگشت بھی تنقید کی زد میں آتا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو کوئی بات نہیں اور اگر آتا ہے تو ایک منٹ ادھر بھی ــــ

واجدہ کا احساس پیش بندی بڑے عجیب احساس کا حامل ہے ان سے پوچھو آخر اپنے آپ کو مطعون کرنے کی وجہ کیا ہے ــــ ہاں آخر یہ SELFPROTECTION کیوں ــــ ہے کیا وہ محض کسی کی دشمنی کے خوف سے حق کی حمایت نہ کریں گی؟ ان سے کہو تنقید کھلے دل سے کریں صاف گوئی صرف تلخی ہی نہیں دلکشی بھی ہوتی ہے اور ہاں ذرا اہم غریبوں کے حال پر مہربانی کرو اگر نگرانی نہیں کر سکتے تو نہ سہی مگر کاتب صاحب سے یہ ضرور کہو کہ الفاظ کھانہ جائیں اور جملے کا مفہوم پورے کا پورا نہ تبدیل کر دیں بڑی کوفت ہوتی ہے۔ آمنہ ابوالحسن

اعظم گڑھ ۲۲ اپریل ۵۷ء

"صبا" کو لوگوں نے یہاں بہت پسند کیا۔ شاہراہ مرحوم کے بعد تو "صبا" کو یہاں کے ادبی حلقوں نے آنکھوں سے لگانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور ہر کوئی یہی محسوس کر رہا ہے کہ جیسے بھی ہو "صبا" کو زندہ رہنا چاہیئے۔

اپریل ۵۷ء کا پرچہ اچھا خاصہ ہے۔ عالم خوندمیری صاحب کا مستقل فیچر بہت ہی غضب ہے انھوں نے باتیں بہت ہی سوجھ بوجھ اور گہرائی کے ساتھ کہی ہیں۔ کہیں کہیں پر وہ ذرا ABSTRACT ہو گئے ہیں۔ پھر بھی جن مسائل کی طرف انھوں نے اشارے کیے ہیں وہ سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کے مستحق ہیں۔ ان سے آئندہ بھی لکھواتے رہیئے۔

کیفی اعظمی کی نظم "اجنبی" بہت ہی حسین ہے۔ مجھے تو مدت کے بعد اردو میں لذیذ رومانیت سے بھرپور اتنی اچھی نظم پڑھنے کو ملی ہے۔

آپ کو ایک بار میں نے مشورہ دیا تھا (شائد سمو کانفرنس میں) کہ آپ صبا میں "اپنی تنقید آپ" کا سلسلہ شروع کیجئے اور ادیبوں اور شاعروں سے کہئے کہ وہ خود REALISTIC INTROSPECTION سے کام لے کر اپنی تنقید خود کریں اس سے ادب و شعر کی تخلیق کے مسائل کی بہت سی الجھنیں دور ہو جائیں گی اور اس سے لکھنے والوں کا بڑا فائدہ ہوگا۔ آپ اس پر ذرا دھیان دیجئے۔ مخلص۔ ماں عباسی

بمبئی ۲۲ اپریل ۵۶ء

یہ خط ایک ضروری کام کے سلسلے میں لکھ رہا ہوں شائد آپ کو اس کا علم ہوگا کہ ساہتیہ اکیڈمی کی طرف سے اردو شعراء کا ایک انتخاب شائع ہو رہا ہے اور اس میں اختر الایمان کا نام اس لیے نہیں شامل کیا گیا ہے کہ مولانا آزاد کو اس نام کی ترکیب غلط معلوم ہوتی ہے۔ میں آپ کو اس لیے خط لکھ رہا ہوں کہ اردو کے ہمدردوں اور ادیبوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ "اردو کے سب سے بڑے صاحب طرز ادیب" مولانا آزاد کس قسم کی ذہنیت کا اظہار کر رہے ہیں ان کا رویہ اس وقت بدل سکتا ہے جب کہ اس قسم کے غیر ادبی سلوک پر شدید احتجاج کیا جائے۔ اگر یہ انتخاب مولانا کے لیے شائع کیا جا رہا ہے تو ساہتیہ اکیڈمی اس کا اعلان کرے ورنہ یہ انتخاب ہر طرح سے ایک نمائندہ انتخاب ہونا چاہیئے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اپنے پرچے میں اس کے خلاف آواز بلند کریں گے۔ ادبی جمہوریت میں آمرانہ احکامات کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ باقر مہدی

کراچی ۲۲ اپریل ۵۶ء

یہاں تک لکھا تھا کہ ڈاکیہ اپریل کا شمارہ بھی لے آیا۔ کہانیوں کو چھوڑ کر مضامین اور نظموں کا حصہ دیکھا ہے زور صاحب کا، جعفر ٹلی، چونکہ آپ کے اصرار کا نتیجہ ہے لہٰذا اس پر اس سے پیدا شدہ تاثر کی چھاپ ہے بے حد سرسری ہے اور بڑا ABRUPT ختم ہوا ہے ـــ غالب پر جو مضمون ہے وہ خواہ مخواہ لکھا گیا ہے اور ناحق چھاپا گیا ہے، معاف کیجئے گا اس طرح لکھنے پر مجبور ہوں ـــ بھلا بتلائیے کونسی نئی بات کہی گئی ہے؟

منٹو اور ترقی پسند ادب کے بارے میں بھی سن لیجئے ـــ یہ کہنا غلط ہے کہ منٹو کا بہترین افسانہ ہے، خود منٹو اس کو اپنے تیسرے درجہ کے افسانوں میں شمار کرتا تھا ـــ اور یہ جملہ، کبھی یہ واقعیت نگاری صرف واقعہ کی عکاسی تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے، کہیں وہ حقیقت نگاری کی حدوں کو چھوتی نظر آتی ہے اور کہیں تو اس کی سرحدوں سے پار ہو گئی ہے ـــ محل نظر ہے بالخصوص، سرحدوں سے پار بھی ہو گئی ہے، کا ٹکڑا ـــ

حصۂ نظم جو آپ کی گرفت ہے ـــ کبھی ڈھیلی، کبھی مضبوط! منظور ضیائی

دہلی ۲۳ اپریل ۵۶ء

"صبا" کا تازہ شمارہ اس وقت میرے زیر مطالعہ ہے۔ بہت ساری چیزیں پڑھ چکا ہوں۔ کہانیوں کا حصہ بڑا بھرپور ہے، خاص طور پر آمنہ ابوالحسن کی کہانی "زخم" بڑی خوبصورت ہے، حالانکہ اس سے پہلے موصوفہ کی

جو کہانی "صبا" میں چھپی تھی وہ بڑی زنگ خوردہ اور مایوس کن تھی شعری حصہ میں بہت ساری چیزیں بے زار لمحے کی پیداوار معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن کیفی اعظمی کی نظم "آبجی" نے اس کی تلافی کر دی ہے۔ وحید اختر اور راحل کی نظمیں بھی اچھی کہی جا سکتی ہیں۔

سخن گسترانہ بات والے مستقل فیچر کو بڑی آب و تاب سے اس سلسلے کو جاری رکھیئے۔ فراق اور زد رصاحب کی صبا میں شمولیت سے بھی پرچہ اور دقیع ہو گیا ہے۔ تبصروں میں کوئی خاص بات نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تبصرے عجلت میں لکھے گئے ہوں۔

حامد محسن

سخن گسترانہ بات

بقیہ

جو دہلی کے محاوروں پر عبور نہیں رکھتا تو ہمیں آغا صاحب کی شکایتیں سننے کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔

اس سرسری گفتگو سے میرا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ تنقید کے معاملے میں QUALIFICATION کے سوال کو غیر اہم نہیں سمجھا جائے۔

دوسری اہم بات نقاد کی غیر جانبداری ہے، اور اگر کوئی اضافت پسند شخص ان تمام تنقیدوں کو جو آج کل ہمارے شاعروں اور ادیبوں پر لکھی جا رہی ہیں غور سے پڑھے ——— اور خود بھی غیر جانبدار رہنے کی کوشش کرے ——— تو یہ نتیجہ نکالنا ضروری ہے کہ بہت کم تنقیدیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں ہم لغوی معنوں میں تنقید کہہ سکیں ورنہ اکثر و بیشتر یا تو یہ ہوتا ہے کہ کوئی بہت بڑا نقاد اپنے کسی شاعر دوست کی کتاب پر اظہار رائے کرتے ہوئے اسے ہندوستان کا سب سے اچھا شاعر لکھ مارتا ہے، یا پھر مصنف اور نقاد کے تعلقات خراب ہوئے تو ہمارے مصنف کو تیسرا درجہ بھی نہیں ملتا۔

میں نے بہت ہی نیک نیتی اور بڑے دکھ کے ساتھ اپنے ان خیالات کا اظہار کیا ہے اور چونکہ وقت نہیں ہے اس لیے اپنے دعوے کو مدلل بنانے کے لیے مثالیں پیش کرنا ضروری نہیں سمجھا ہے لیکن مجھے معلوم ہے کہ بات یہاں ختم نہیں ہوتی بلکہ یہاں سے تو اصل بات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، اور اسی لیے میں کوشش کر رہا ہوں کہ ایسی تنقیدوں کی زیادہ سے زیادہ مثالوں کو اکٹھا کر لیا جائے جو غیر مستحق لوگوں نے لکھی ہیں اور جانبدارانہ انداز میں لکھی ہیں تاکہ موجودہ دور میں تنقید جیسی اہم قوت کی گمراہی کا پورا نقشہ سامنے آجائے اور ادب سے ذوق رکھنے والے حضرات یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ جس تنقید کے دامن میں ہماری نثر نے اور ہماری شاعری نے نشو و نما حاصل کی ہے آج وہی تنقید کہیں اس کے راستے کا کانٹا بنی ہوئی تو نہیں ہے؟

اثر لکھنوی

چھیڑ خوباں سے

مکرمی۔ تسلیم

حضرت فراق گورکھپوری کے اس چیلنج کے جواب میں
قلم کا زور تنقیدوں میں ناحق صرف کرتے ہیں
غزل اک ایسی کہہ لائیں حریفوں میں اگر دم ہو

ایک غزل حاضر ہے اور ان کی غزل کی تنقید۔ اگر آپ کے مصالح میری بکواس کو شائع کرنے کی اجازت نہ دیں تو محصول ڈاک ادا کیے بغیر واپس کر دیجئے

والسلام۔ اثر

نوٹ:۔ رسالہ "صبا" حیدرآباد دکن کے شمارہ (۴) جلد (۲)، ۱۹۴۰ء میں حضرت فراق گورکھپوری کی ایک غزل شائع ہوئی ہے جس کا ایک شعر ہے:۔

قلم کا زور تنقیدوں میں ناحق صرف کرتے ہیں　　غزل اک ایسی کہہ لائیں حریفوں میں اگر دم ہو

ان کا مخاطب صحیح میں ہی ہوں کیونکہ تنقیدی مضامین میں ان کی شاعری کا پول کھولتا رہتا ہوں۔ ان کے چیلنج کے جواب میں میں نے غزل کہہ دی مگر یہ اعتراف ہے کہ ان کی ایسی نہیں کیونکہ اغلاط و ہفوات کا پشتارہ نہ بنا سکا۔ اس طرف توجہ دلانے کو الگ ایک مضمون لکھ دیا ہے۔ اب اگر فراق صاحب میں دم ہو تو میری غزل کا جائزہ لے کر اس کی خامیاں اور کمزوریاں دکھائیں اور ان کی غزل پر جو میں نے اعتراضات کیے ہیں ان کو رد کریں؛ ہمیں گو ہمیں میداں۔

غزل

مزا برباد یوں کا جب ہے، اے دل وہ مژہ نم ہو　　محبت کی ہے یہ توہین اپنا آپ ماتم ہو
جو ذوقِ خود ستائی اک سراپا ناز کا کم ہو　　پلک جھپکانے میں شیرازۂ کونین برہم ہو
سنا کر مجھکو کہتا ہے ستمگر اور ہنس ہنس کر　　مداوا کیوں وہ ڈھونڈے جو رہینِ لذتِ غم ہو

خموشی معنیٔ دارد کہ در گفتن نمی آید — اگر وہ کم سخن گرم سخن ہو کیا ہی عالم ہو
مذاق عشق و خودداری جزاک اللہ جزاک اللہ — وہی گریہ ہے جس سے ضبط زخم دل کا سرہم ہو
بہار آرائی جلوہ بقدر ہمت دل ہے — نہ کیوں پیش نظر ہر لحظہ تازہ ایک عالم ہو
جہاں یہ حال ہو دل کا عبث فکر مداوا ہے — جگر ہو ٹکڑے ٹکڑے اک ذرا بھی درد اگر کم ہو
یہی شوریدگی عشق کا پیہم تقاضا ہے — کہ وہ زلف مسلسل اور برہم اور برہم ہو[1]
کہیں تقلید میں بھی خوبیٔ تخلیق ہوتی ہے — حریف زلف محبوباں بھلا کیا زلف پرچم ہو[2]
نہیں اب ہوش اتنا بھی ہجوم نامرادی میں — نہ ہو کس حسرت برباد کا اور کس کا ماتم ہو
گداز دل بھی شامل ہو جو میری طرح اشکوں میں — لپکتے شعلے کا ہر قطرۂ شبنم پہ عالم ہو
بھلا گفتار کا کیا دخل اس بزم تماشا میں — جہاں بیتابیٔ دل کا حیا سے خیمہ مقدم ہو
عجب وہ راز ہے جس کا کیا ہے پاسباں مجھکو — نفس تلوار بن جائے زباں دل کی جو محرم ہو
یہی منشا ہے پاکی کا یہی جوہر ہے پاکی کا — مثال آہوئے رم دیدہ اپنے سائے سے رم ہو
کرشمہ سازیٔ حسن جہاں افروز زار ے توبہ — جہاں تک شرح کرتے جاؤ راز عشق مبہم ہو
شراب عشق کے اک جرعہ کے بدلے نہ لے ہرگز — اگر سرمایۂ عیش دو عالم بھی فراہم ہو
غرور عشق و ناز حسن سے کچھ کم نہیں ، یعنی — جو سر جھک جائے سجدے میں تو غیرت سے جبیں نم ہو

جو کج اندیش ہیں کیا واقف اسرار ہستی ہوں
اثر گمراہیوں کا ان کی تم کو کس لیے غم ہو

فراق صاحب کی ہمطرح غزل کا جائزہ

ا لب رنگیں کی وہ باتیں کہ ہر لفظ ایک عالم ہو — ملاقاتوں کی وہ راتیں ابد اک آن سے کم ہو

رنگیں کے لغوی معنی ہیں رنگا ہوا کوئی رنگ ہو۔ سرخ کی قید نہیں۔ لب سے لال مخصوص ہے یاقوت بھی سرخ ہوتا ہے۔ ان امور کو ذہن میں رکھتے ہوئے لب رنگیں سے لب لعلیں کہیں بہتر ہوتا۔

---

۱ یہ نہ سمجھا جائے کہ مقطع میں اس قسم کی تکرار فراق صاحب کا پٹینٹ ہے:

فراق اب تو نئے سرے سے زمانے کو سنوارنا ہے نظام زندگانی اور برہم اور برہم ہو
میں نے ۱۹۳۹ء کے لگ بھگ کہا تھا ؎
ستم سے آزمائش کرنے والوں کو خدا رکھے ... محبت اور محکم اور محکم ہوتی جاتی ہے

۲ زلف پرچم ، علم کا پھریرا۔ صرف فراق صاحب کی آسمانی کے لیے لکھتا ہوں کہ شاید ان کے سینے علم سے باہر ہو۔

زبان کی لطافتوں کے ماہر جانتے ہیں کہ لفظ کی جگہ حرف کا صرف بلیغ تر ہوتا ہے۔ مصرع ثانی میں ابد کی مناسبت سے آن کی جگہ لفظ و تفنن زیادہ موزوں ہوتا۔ علاوہ برایں مطلع کی ردیف ہو کی جگہ ہے کا تقاضا کر رہی ہے ہو سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ معشوق کو درس دے رہے ہیں کہ تیری باتیں ایسی ہونی چاہئیں کہ ہر لفظ ایک عالم ہو۔ ردیف کی کمزوری سے قطع نظر میرے درست کردہ مطلع کے مقابل فراق صاحب کا اصلی مطلع پڑھیے۔ مجھے امید ہے کہ ان کی لٹریری شاعری کا اندازہ ہو جائے گا۔

لب لعلیں کی وہ باتیں کہ ہر اک حرف عالم ہو ملاقاتوں کی وہ راتیں ابد اک وقفہ سے کم ہے

۲ یہی ہر گردش چشم فسوں گر کا تقاضا ہے کہ نظم زندگی رہ رہ کے برہم ہو منظم ہو

ہر گردش مہل۔ صرف گردش کہیے۔ آنکھ کے لیے تقاضا سے اشارہ کہیں زیادہ موزوں ہوتا۔ دوسرے مصرع کی بندش "رہ رہ کے برہم ہو، منظم ہو" دہقانیت کی غماز ہے۔ رہ رہ کی جگہ پیہم ہزار درجہ بہتر ہوتا۔ برہم اور منظم سے ہم قافیہ ہونے کی وجہ سے موسیقیت میں اضافہ ہونے کے علاوہ رہ رہ کے سے وہ بلاوقفہ تغیر و تسلسل کا مفہوم ادا نہیں ہوتا جو پیہم سے ہوتا ہے۔ لہٰذا شعر کی یہ صورت بہتر ہوتی۔

یہی گردش کہ اس چشم فسوں گر کی اشارہ ہے نظام زندگی پیہم منظم اور برہم ہے

کوئی چیز پہلے منظم پھر برہم ہوگی لہٰذا فراق صاحب کے شعر میں پہلے منظم پھر برہم ہونا چاہیے۔ ایک ہو بیکار رہا یہ نقص بھی دور ہو گیا۔

۳ کہاں ملتی ہے اتنی فرصت غم دور گردوں میں دل گم گشتہ کہاں اے ہم نشینو آج ماتم ہو

سوال پیدا ہوتا ہے کہ دل گم گشتہ صرف قائل شعر کا ہے یا اس کی اور ہم نشینوں کی مشترکہ ملکیت ہے۔ فرض کر لیا کہ دل گم گشتہ سے آپ ہی کا دل مراد ہے تو عجیب ہم نشیں ہیں کہ آپ کے شریک صحبت ہونے کے باوجود آپ کے ساتھ جاں کاہ یعنی گم شدگی دل کا علم نہیں۔ اب آپ سے ضبط نہیں ہو سکتا اور تجویز پیش کرتے ہیں کہ یہ فرصت غنیمت ہے دل گم گشتہ کا ماتم ہو جائے (توبہ میں بھولا ماتم ہو)۔ شعر میں دل کی پیٹک، حزن و ملال یا اثر اندازی کا کہیں نام نہیں علاوہ برایں ماتم دل خوں شدہ ستم زدہ یا الم گشتہ کا ہوتا ہے نہ کہ دل گم گشتہ کا جس کی بازیافت یا پتہ چل جانے کا امکان ہے۔ محض تصنع اور ٹھنڈے ٹکڑے۔

اثر نے کم سے کم تیس برس ادھر فراق صاحب کی تازہ مزخرفات سے کہیں بہتر کہا تھا۔

تجھے بھی کرتے ہیں رخصت خیال یار ٹھہر ابھی تو اپنے دل خوں شدہ کا ماتم ہے

(از بہاراں مطبوعہ ۱۹۳۹ء)

(کیا کیا جائے اب زمانہ ہی اپنے منہ میاں مٹھو بننے کا آ گیا ہے۔ اثر)۔

۴ وہی ہے زخم پنہاں خشک ہوکر جو لہو دے دے وہی ہے درد دل جو اور بڑھا جائے اگر کم ہو

زخم پنہاں خشک ہونے کی حالت میں لہو دیتا ہے تو کیا تر ہونے کی حالت میں پن چھٹا ہوتا ہے۔
پہلا مصرع مہمل دوسرا غنیمت ہے۔

۵ ہمیں اے زندگی کچھ غیب کو پیغام دینا ہے فراز عرش سے اترے خدا بھی آج آدم ہو

واہ ری بیہودہ لفاظی اور دریدہ دہنی۔ پیام غیب کو دینا ہے مگر پیغام رسانی کے لیے خدا کو بشکل آدم بلایا جا رہا ہے۔ زبان ایسی کچی کہ آدم ہو بجائے آدم ہو کر استعمال کیا جاتا ہے۔ زندگی سے خطاب میں نہ معلوم کیا بلاغت ہے اور اس سے کیا مطلب ادا ہو رہا ہے۔ اگر آپ ایسے ہی کچے گھاگ میں تو خود زندگی کو پیغام دیجیے۔

۶ ہم آہنگ اس قدر ہے شاعر فطرت سے یہ خلقت کہ سیارے نکل جائیں اگر میری پلک نم ہو

پہلے مصرع کا بے ڈھنگا پن زبان حال سے فریاد کر رہا ہے۔ حضرت فراق مدظلہٗ شاعر فطرت ہیں اور یہ خلقت غالباً تمام کائنات یا نظام سیارگاں ہے۔ یہ شاعر فطرت اس قدر بلند پایہ ہے کہ آب دیدہ ہو تو سیارے پانی کی طرح بہنے لگیں۔ اور میرا خیال ہے یہ حضرت اگر بھوں بھوں یا چمکوں پہکوں بھی روئیں تو سیاروں کا گھلنا کیسا آنکھ بھی نم نہ ہو بلکہ کرنوں کا ٹھینگا دکھا کر ٹمائیں ٹمائیں فش کہیں اور قہقہہ لگائیں۔

بقول شخصے ؎ تو کمار زمیں را نکو ساختی کہ با آسماں نیز پرداختی

۷ وصیت کر رہا ہوں آج آنے والی نسلوں کو کچھ ان سے کہہ سکوں اے درد بے پایاں ذرا کم ہو

مجھے ہمیشہ یہ الجھن رہی کہ فراق صاحب شاعر کس رخ سے ہیں۔ ان کے متعدد اشعار نامونوں ہوتے ہیں۔ زبان تو بڑی چیز ہے معمولی الفاظ کے محل استعمال کا وقوف نہیں۔ اب اسی شعر میں دیکھ لیجیے دونوں مصرعوں میں توافق زمانی پیدا نہیں ہوتا جب تک پہلے مصرع میں بجائے وصیت کر رہا ہوں کے وصیت کرنے والا ہوں نہ کہیے۔ سامنے کی بات تھی مگر فراق صاحب کو سوجھے بھی۔

وصیت کرنے والا ہوں میں آنے والی نسلوں کو بس اتنی دیر کو اے درد بے پایاں ذرا کم ہو

۸ تری قربت کی حاصل ہو سعادت یہ کہاں ممکن قریب اپنے سے ہو جاؤں اب اتنا تو ذرا غم ہو

قربت کی سعادت نصیب ہونا کسی بزرگ کی خدمت میں شرف حضوری حاصل ہونا ہے۔ تری کی ضمیر معشوق کی طرف سمجھی جائے تو بڑا لطف آئے۔ کوئی قرائن ایسے موجود نہیں جن سے خدا کی طرف اشارہ پایا جائے بلکہ دیکھا تو یہ گیا ہے کہ فراق صاحب خدا کو صرف ٹھٹھول کے لیے مانتے ہیں (قلم سے بے اختیار ٹھٹھول کی جگہ ٹلے بازی نکل رہا تھا)۔
دوسرے مصرع میں الفاظ اب اور ذرا دونوں برائے بیت ہیں۔ "اپنے سے قریب ہو جاؤں اتنا تو غم ہو" مطلب پورا ہو گیا۔

۹ بھری دنیا کے سونے پن سے تنگ آکر یہ کہتا ہوں یہاں کیا کچھ نہیں ہے تو مگر کیسے فراہم ہو

شاعر غزا کو یہ بھی خبر نہیں کہ فراہم کرنا جمع کرنا یا اکٹھا کرنا ہے اور شعر میں فراہم کی جگہ لفظ میسّر کے صرف کا موقع تھا۔

۱۰ھ شعور کائنات اس طرح کوئی دے نہیں سکتا — مری نظروں سے عالم کو جو دیکھیں اور عالم ہو

اس طرح کی بلاغت کا صرف وہی اندازہ کر سکتے ہیں جو فراق صاحب کا پیالہ پیے ہیں کیونکہ شعور کائنات کی عظمت کا احصار لفظ ایسا ہوتا ہے نہ کہ اس طرح سے اس فقرے کو اگر کوئی ربط ہے تو فراق صاحب کے مختلف پیتروں سے ہے۔ آگے آیئے۔

۱۱ھ مری تحریر کا ہر نقطہ خال روئے زیبا کر — ہر اک شوشہ و مرکز میں لب جاں بخش کا خم ہو

اگر فراق صاحب کی دعوی نے ان کا فرمان واجب الاذعان "مری تحریر کا ہر نقطہ خال روئے زیبا کر" مان لیا تو غریب کے چہرے کا کیا رنگ ہوگا۔ بھنگتی مکھیوں کے گچھے کے گچھے نظر آئیں گے۔ ہر اک شوشہ کا مرکز میں واو کا اعلان بجائے خود آواز دینے کے اور بالفتح بجائے بالضم ہونے کے ایسی طفلانہ غلطی ہے جس کا مرتکب ایک مبتدی بھی نہ ہوگا میں فارسی کے متعلق کہہ رہا ہوں۔ عربی کی عبارت میں واو عطف کا اعلان ہوتا ہے اور بالفتح ہوتا ہے مگر اس باب میں اردو فارسی کی تبع ہے نہ کہ عربی کی۔ "خال روئے زیبا کر" کی دہقانیت شوشہ و مرکز میں واو عطف بالفتح و باعلان۔ تاہم فراق صاحب میر و غالب حسرت و اقبال الغرض تمام شعرائے ماضی و حال سے اشرف و افضل تھے تو اے چرخ گرداں تو۔

۱۲ھ کلام با اثر ہو سر بسر پیغام رحمت کا — گداز قلب سے آنکھوں کی چنگاری بھی شبنم ہو

پیام رحمت اب تک خدا اور انبیائے مرسلین سے مختص تھا اب فراق صاحب خدائی فوجدار بن بیٹھے۔ اشک گرم کو چنگاری سے تشبیہ دیتے تھے اب وہ مجسم چنگاری بن کر آنکھوں میں مقیم ہے تاہم شبنم کی طرح خنک و رقیق ہے۔

میرا دیوان مطبوعہ ہے ورنہ فراق صاحب کے شاہکار کے ہوتے یہ شعر قلمزد کر دیتا۔

آگ لگ جائے ایسے اشکوں کو — جیسے چنگاریاں ارے توبہ

۱۳ھ قلم کاز و رتنقیدوں میں ناحق صرف کرتے ہیں — غزل اک ایسی کہہ لائیں حریفوں میں اگر دم ہو

غزل میں نے کہہ دی۔ اس کا پایہ جو کچھ ہو۔ مگر غالباً اتنے اغلاط کا پوٹ تو نہ ہوگی۔

۱۴ھ فراق اب تو زمانے کو نئے سرے سے سنورنا ہے — نظام زندگانی اور برہم اور برہم ہو

ایسی پیش بینی و پیشگوئی ایسے ہی زبردست و ملہم بالغیب شاعر کو سجتی ہے مگر آثار زمانہ کچھ ایسے ہیں کہ اس کی آرزو پوری ہونے تک نہ بانس رہے گا نہ بانسری۔

مخدوم محی الدین

تحفے

قلم

امن عالم اور دنیا کے مزدوروں کی عالمگیر تحریک کے سلسلے میں مجھے ۹ مارچ ۱۹۵۳ء سے ۲۹ جولائی ۱۹۵۵ء تک یورپ، ایشیا اور افریقہ کے کئی ملکوں میں کہیں ایک بار اور کہیں ایک سے زائد بار جانے، رہنے سہنے، لوگوں سے ملنے جلنے اور دوست بنانے کا موقع ملا۔ مجھے آزردہی رہ گئی کہ سمندری سفر کروں۔ کوئی ڈیڑھ لاکھ میل کا سفر ہوائی رہا۔ اس سفر کی بے شمار یادیں اب بھی دل کو تڑپاتی ہیں۔ کچھ نقوش تو اتنے گہرے ہیں کہ باوجود مرور زمانہ کے مٹنے کا نام نہیں لیتے۔ جہاں کہیں اور جب کبھی سفر کی داستان چھڑ جاتی ہے تو ہزاروں تصویروں کا ہجوم پوری تفصیل کے ساتھ سامنے کھڑا ہو کر تقاضہ کرتا ہے کہ "پہلے ہم بولیں گے" کوئی کہاں تک روکے۔ اچھا ہے کہ دل کا یہ بوجھ ہلکا ہو جائے۔

مخدوم محی الدین

صاحب قلم، رنگا چاری (آرٹسٹ) تلنگانہ کی جدوجہد میں گرفتار بھی ہوا اور مارا بھی گیا، مگر اس کا قلم پراگ میں آج تک زندہ ہے جو نہ کبھی گرفتار ہوا اور نہ کسی نے اسے گولی مار کر ختم کیا۔ اس یادمیں بوڈاپسٹ کے مزدوروں کی نشانی ایک اور قلم میری زندگی کے انمول خزانوں میں سے ایک بڑے جتن سے ہندستان میں محفوظ ہے۔

۱۹۴۰ء ــــ حیدرآباد میں رضاکار دور حکومت کے عروج کا زمانہ تھا ہم روپوش تھے ساتھیوں سے تاقیکہ کام نہ ہو ملنا جلنا بھی ناممکن تھا، ایک رات (غالباً برسات کی رات تھی) رنگا چاری میرے پاس آیا، ہندرا کے ساتھ ضروری کام سے۔ ملاقات سے ہم دونوں بے حد مسرور تھے۔ کمرے کی مدھم روشنی میں ہم لوگ چائے بناتے جاتے تھے اور پیتل کے پیالوں میں پیتے جاتے تھے۔ بغیر دودھ کی چائے اور باتیں، باتیں، باتیں۔

ان دنوں فیوچک کی خود نوشتہ یادداشت پھانسی کے سایہ میں NOTES FROM THE GALLOWS شایہ ہندستان آگئی تھی مگر ہمارے ڈونوں تک نہیں آئی تھی مگر کیرالا کے ایک ساتھی نے اس کے جستہ جستہ ٹکڑے ٹائپ کر کے ..... مجھے دیئے تھے۔ میں نے رنگا چاری کو فوچیک کے بارے میں جتنا معلوم تھا بتایا۔ ڈن کی مدھم روشنی میں

کئی بار رنگا چاری کے جوان چہرے پر میں نے عجیب و غریب قسم کی چمک دیکھی۔ وہ بھی فیوچک کی زندگی، آزمائش اور کامیاب و بے مثال موت سے مسرور اور مطمئن نظر آرہا تھا۔

بادل گھرے ہوئے تھے بارش تھم چکی تھی، مرغ بانگ دے رہے تھے، چراغ ٹمٹما رہا تھا، مگر روشن دان سے باہر اجالا ابھر رہا تھا۔

رنگا چاری کو سورج نکلنے سے پہلے ہی میرے پاس سے چلا جانا تھا، اس نے کاغذات کو اپنے تھیلے میں حفاظت سے رکھا، برساتی اوڑھی مسکراتے ہوئے مگر کسی قدر غمزدہ انداز میں مجھ سے کہا "اچھا کامریڈ اب چلتے ہیں" جانے سے پہلے اس نے اپنا پارکر قلم یہ کہتے ہوئے دیا کہ "اسے رکھیے" ان دنوں میرے پاس قلم نہیں تھا، فیوچک کی یاد میں، وہ چلا گیا..... میرے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ لیکن قلم ہمیشہ میرے ساتھ رہتا۔ بہت دنوں تک پتہ نہیں چلا کہ رنگا چاری کہاں ہے۔ پولیس ایکشن ہوا پھر بھی معلوم نہ ہوسکا کہ اس کا کیا ہوا، جیلوں میں بھی وہ لاپتہ، باہر بھی لاپتہ معلوم ہوا کہ وہ گرفتار ہوا اور پنجابی رجمنٹ نے اسے گولی کا نشانہ بنا دیا ـــــ قلم میرے لیے اور بھی عزیز ہوگیا۔

۱۹۵۱ء میں ایک رات روپوشی کے ہی عالم میں ہم دو ساتھی ملے، میں اندراج میرے ڈن پر، صبح قلم غائب تھا، میں پریشان ہوگیا، میں نے کوریر کے ذریعے راج کے پاس چٹھی بھیجی کہ میرا قلم واپس بھجوا دو۔ تین دن کے بعد خبر ملی کہ راج گرفتار ہوگئے، دل بیٹھ گیا، راج بھی گیا اور قلم بھی، ان دنوں گرفتاری کے بعد زندگی کا بہت کم بھروسہ رہتا تھا چھٹے دن اطلاع ملی کہ قلم گوپال کے پاس ہے میں نے گوپال کو لکھا، دوسرے دن خبر ملی کہ گوپال بھی گرفتار ہوگیا۔ راج گوپال اور قلم کا صدمہ ختم ہی نہیں ہوا تھا کہ میں خود دھر لیا گیا۔ جیل سے چھوٹنے کے بعد ۱۹۵۲ء میں امّو کے پاس سے قلم مل گیا جو گرفتاری سے پہلے گوپال نے مجھے دینے کے لیے دیا تھا۔ نہ پوچھیے کس قدر مسرت ہوئی، رنگا چاری اور فیوچک سے دوبارہ ملاقات کی مسرت، یورپ کے سفر میں بھی قلم میرا رفیق رہا۔

بوڈاپسٹ میں عالمی امن کی کونسل کی میٹنگ ۱۳ر جون ۵۲ء سے ہونے والی تھی، ہندستانی نمائندوں میں میں بھی ایک تھا۔ ہمارے ڈیلیگیشن میں ڈاکٹر سوکھے، آنکار ناتھ ٹھاکر اور ہندستان کی اور کئی ممتاز ہستیاں تھیں۔ ہم لوگ ۹ر جون کو بمبئی سے اڑے، قاہرہ، روم سے زورک پہنچے، زورک میں ایک دن ٹھیر کر ۱۱ر کو پراگ پہنچے۔ پراگ یورپ کے خوبصورت اور قدیم شہروں میں سے ہے جو وسط یورپ میں تہذیب و تمدن، علم و فن صنعت و حرفت کا بہت بڑا مرکز رہا ہے۔ مجھے اسی دن ویانا جانا تھا۔ ویانا سے کونسل کے اجلاس میں شرکت کے لیے ۱۳ر کو بوڈاپسٹ پہنچنا تھا ـــ پراگ والے اپنے شہر کو پیار سے "سو میناروں والا شہر" کے نام سے یاد کرتے ہیں چیکوسلواکیہ کی مزدوروں کی انجمن کو میرے وہاں آنے کی پہلے ہی سے اطلاع تھی، پراگ کے ہوائی اڈے سے لائے جانے کے بعد ہم سب ہندستانی ایک ہوٹل میں ٹھیرائے گئے۔ میں لونج میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک اونچا پورا نوجوان چشمہ لگائے

ہوئے تھا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ہوٹل کا شیشہ دار دروازہ کھول کر داخل ہوا، اور متجسس نگاہوں سے ہم سب ہندستانیوں پر نظر ڈالنے لگا۔ میں نے بڑھ کر اس سے ملاقات کی اور فوراً مجھے مزدوروں کے کلب "شاہی محل" کی عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ میرے چیک ساتھی کا نام ہولب تھا جو چیک ٹریڈ یونین کونسل (ROH) کے بین الاقوامی محکمہ کا نگران تھا۔

میرے چیک ساتھی نے ایک گھنٹہ میں موٹر کے ذریعہ شہر کی سیر کرائی اور ہم مزدوروں کے کلب (شاہی محل میں قدیم ہوٹل ہے جو کسی زمانہ میں صرف چیک سرمایہ داروں کے لیے مخصوص تھا۔ اب یہ مزدوروں کا کلب ہے) میں دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے پہنچ گئے اسی شام مجھے براگس لاوا جانا تھا اور پھر وہاں سے وینا۔

کلب کا طعام خانہ عورت مرد مزدوروں سے بھرا ہوا تھا۔ میزیں سلیقے سے چنی ہوئی تھیں، طعام خانے کے ایک گوشے میں ناچ اور سنگیت کاروں کی جگہ تھی، یہ ایک چھوٹا سا چبوترہ تھا جو اسٹیج کا کام دیتا تھا۔ کلب کی سکریٹری ایک معمر عورت نے اسٹیج پر سے کچھ کہا۔ کھانے کی میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں نے خوب تالیاں بجائیں۔ ہولب نے حاضرین سے تعارف کرایا۔ میرا اسٹیج پر آنا ہی تھا کہ سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ اور سب لوگ کھڑے ہو گئے۔ میری زندگی میں یورپ آنے کا یہ پہلا موقع تھا اور وہ بھی ایک کمیونسٹ ملک میں جہاں مزدور طبقہ حکمران طبقہ ہے۔ جہاں کے لوگ امن اور سوشلزم کی تعمیر کر رہے ہیں اور جو ہندستان سے پرخلوص دوستانہ تعلقات کو اور بھی مستحکم کرنے کے لیے کوشاں ہیں، رفیقانہ استقبال اور تعظیم نے مجھے جذبات سے مغلوب کر دیا۔ میں نے بھی تالیاں بجائیں مگر بے ساختہ آنکھوں میں آنسو بھر آئے، مسرت اور رفاقت کے آنسو۔ ہولب نے کان میں کہا "دو چار لفظ بول کر یہ جنگ ہے جنگ آزادی سناؤ" (ہولب مجھے شاعر کی حیثیت سے جانتا تھا اور اس نظم سے بھی واقف تھا میں نے مختصر سی تقریر کی۔ ہندستان اور چیکوسلواکیہ کی مشترکہ تمناؤں اور مقاصد آزادی، امن اور سوشلزم کا ذکر کیا۔ اس سلسلہ میں فیوچک کے بارے میں کہا کہ یہ بین قومی ہیرو، ہندستان کے مزدور طبقہ کے جانبازوں کے لیے کس طرح جوانمردی، ثابت قدمی اور قربانی کا نمونہ رہا ہے، میں نے رنگا چاری کا بھی تذکرہ کیا، نظم بھی سنادی، تالیاں تھیں کہ کم نہیں ہوتی تھیں، لوگوں کے چہرے نور محبت سے اور بھی سرخ ہو گئے تھے میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ میں نے رنگا چاری کا دیا ہوا قلم جیب سے نکالا اور یہ کہا کہ "فیوچک اور رنگا چاری کی یاد میں، ہندستان اور چیکوسلواکیہ کی ہم مقصد جدوجہد کی یادگار میں ایک قلم بطور تحفہ قبول ہو" اس پر ایک اور ریلا تالیوں کا بہت دیر تک جاری رہا۔ کھانے کے فوراً بعد ہی ہولب اور میں اسٹیشن چلے گئے ۔۔۔ دیانا سے ہوتے ہوئے میں بوڈاپسٹ پہنچا، امن کونسل میں شرکت کی۔ روزانہ دنیا بھر کے نمائندے کسی نہ کسی کارخانے، کلب، کھیت میں جاتے تھے۔ رات میں تھیٹر جاتے اور پیرا دیکھتے تھے۔ مجھے بھی شہر کے کئی کارخانوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔

ہر جگہ بحث و مباحثہ اور دونوں ملکوں (ہندستان اور ہنگری) کی مزدور تحریک کے تجربات، معلومات کا تبادلہ ہوتا۔ ایک یونین میں اس کے صدر اور سکریٹری اور دوسرے کارکن، بڑی تفصیل سے ہندستان کے بارے میں پوچھتے رہے۔ بوڈاپسٹ کی گلی گلی میں سڑکوں، ہوٹل، کونسل ہال کے سامنے تھیٹر، کارخانہ، کھیت غرض کہ ہر جگہ محبت بھری نظروں مسکراہٹوں کا طوفان تھا۔

ایک دن صبح ابھی میں اپنے کمرے ہی میں تھا کہ میری ترجمان آگینی نے آکر مجھ سے کہا کہ نیچے چلو تم سے ... مزدوروں کا ایک ڈیلیگیشن ملنے آیا ہے۔ ایسی ملاقات میرے لیے بالکل نئی تھی۔ بوڈاپسٹ کے قیام میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا، پھر اس طرح دل کو تسلی دی کہ شاید کسی کارخانے میں آنے کی دعوت دینے آئے ہوں گے۔ پھر بھی میں نے آگینی سے کہا کہ ہندستانی ڈیلیگیشن کے سکریٹری رمیش سے مل کر طے کرلو، پروگرام بنانے کا انتظام رمیش کے ذمہ ہے۔ آگینی نے اصرار کیا کہ میں چلوں۔ سیڑھیوں سے اتر کر لوبچ میں آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بڑے ہال میں لوگ حسب معمول صوفوں پر ٹولیاں بنا کر بیٹھے ہیں، کچھ کھڑے ہیں۔ منتظمین، والنٹیرز آجا رہے ہیں۔ اسی ہجوم میں چھ عورتیں قطار بنا کر کھڑی ہیں۔ آگینی مجھے ان کے پاس لے گئی، ان میں سے ایک جو ڈیلیگیشن کی لیڈر تھی، آگے بڑھی اور ایک کیس مجھے پیش کیا، یہ کہہ کر کہ فیکٹری کے مزدوروں نے آپ کے لیے بھیجا ہے۔ کیس میں ایک فوٹن پن اور ایک پنسل تھی میں کچھ دیر تو چپ رہا۔ خوشی۔ حیرت، استعجاب کے ملے جلے جذبات کے ساتھ پھر میں نے کہا، "فیکٹری کی یونین گئے تو کئی دن ہوگئے"۔ اس پر سپر لیڈر نے کہا "بات یہ ہوئی آپ سے یونین کے دفتر میں بات چیت کے بعد ہم نے فیکٹری کے مزدوروں سے آپ کی ملاقات کی رپورٹ کی اور ہمچاری کے اس قلم کے واقعہ کا بھی ذکر کیا جو آپ نے پراگ کے مزدوروں کو بطور یادگار دے دیا ہے، تو یہ سن کر بوڈاپسٹ فیکٹری کے مزدوروں نے کہا تو پھر کامریڈ کے پاس اب کوئی قلم نہیں ہے یہ قلم انھیں لے جاکر دو، اور اسی بناء پر یہ قلم آپ کی خدمت میں بطور تحفہ نذر ہے"۔ پھر ایک بار میں فرط جذبات سے مغلوب ہوگیا اور اپنے آپ کو سنبھال کر میں نے شکریہ ادا کیا۔

اجنبی

پراہا — ۱۱ جون ۵۳ء

پردیس میں، مانئے یورپ کے کسی سرمایہ دار ملک میں اگر ایسا ہی حادثہ پیش آتا تو کیا ہوتا؟ زبان نہ آئے جیب میں پائی نہ ہو، اور آپ رات کے (۱۲) بجے ایک اجنبی شہر میں پہنچیں تو کیا ہو؟

پلب کی یہ ادا مجھے بہت پسند آئی کہ ٹکٹ بھی دیا اور توشہ بھی ساتھ کر دیا۔ پراگ سے برانس لاوا ریل کے ذریعہ کوئی آٹھ گھنٹوں کا سفر ہے۔ پلب نے کہا کہ ترین برانس لاوا رات میں ۱۲ بجے پہنچے گی۔ اسٹیشن پر ROH کا نمائندہ مجھے لینے کے لیے موجود ہوگا۔ میں نے احتیاطاً اس ساتھی کا نام، حلیہ، دفتر کا پتہ اور ٹیلیفون نمبر بھی لے لیا۔

انجن سے لے کر آخری ڈبے تک گلیاری ہے لوگ اس سرے سے اس سرے تک آجا سکتے ہیں۔ صوفوں کی طرح گدازنشستیں، ڈبہ سجرا ہوا، مگر بھرا نہیں ہے، گلیاری میں کچھ لوگ کھڑے ہیں۔ ڈبوں میں سگریٹ پینا منع ہے سگریٹ نوشی کے لیے الگ کمرے ہیں، چلتی ہوئی ٹرین، بدلتے ہوئے مناظر سبزہ زار، راستہ میں کئی شہر، صابون کا شہر، جوتوں کا شہر، شکر کا شہر، سب صنعتی شہر۔

مسافر بظاہر میری موجودگی سے کسی تجسس کا اظہار نہیں کر رہے تھے۔ میرے برابر دو مرد تھے، سامنے دو مرد اور ایک لڑکی۔ لڑکی گردن نیوڑھائے لمبی لمبی سلائیوں سے اون بن رہی تھی، مرد کتاب پڑھ رہے تھے یا باتیں کر رہے تھے دبی آواز میں۔

ہم سب ایک دوسرے کی زبان سے نابلد تھے، لڑکی ٹوٹی پھوٹی انگریزی بول لیتی تھی، کچھ لوگوں نے مجھ سے کچھ پوچھا، لڑکی مترجم کا کام کرتی رہی، وہ قانون کی طالب علم تھی۔ آٹھ گھنٹے باتوں باتوں میں کٹ گئے۔ ۱۲ بجنے میں چند ہی منٹ باقی ہیں لوگ سامان سنبھال رہے ہیں، اگلا اسٹیشن براٹس لاوا ہے۔ میرا دل ایک نئے ساتھی سے ملنے اور ایک نئے شہر کو دیکھنے کے اشتیاق سے معمور تھا۔

گاڑی رکی، کھڑکی میں سے میری نظروں نے سارے پلیٹ فارم کا جائزہ لیا، آنکھیں ایک پست قد گٹھیلے قسم کے نوجوان کو ڈھونڈھ رہی تھیں جو کسی قدر ترچھا دیکھتا ہے۔ شلاز۔ میرا ذہن بار بار اس نام کو دہرا رہا تھا۔ لوگ ٹرین سے اتر کر چلے گئے۔ کپڑوں کا بکس لیے کچھ دیر پلیٹ فارم پر کھڑا رہا۔ گاڑی جا چکی تھی، پلیٹ فارم خالی ہو چکا تھا، گیٹ بند ہو رہا تھا، شلاز کا کہیں پتہ نہ تھا۔ میں باہر آگیا، رات کے ۱۲ بجکر ۱۰ منٹ پر مطلع ابر آلود، ہلکی ہلکی سردی سنسان سڑک سامنے ٹرام آئی۔ مسافروں کو لے کر کھڑکھڑاتی ہوئی غائب ہوگئی۔

ایک اجنبی تن تنہا، بے زبان، بے زر بکس لیے سلواکیہ کے سب سے بڑے شہر براٹس لاوا کی سڑک پر چپ چاپ کھڑا گھٹا ٹوپ اندھیرے میں آسمان کو بے بسی کے عالم میں تک رہا ہے۔ کیا کیا جائے، پریشانی ضرور تھی مگر اطمینان بھی تھا یہ کوئی سرمایہ دار دیس کا شہر، لندن یا پیرس تو نہیں ہے، جس کی بے مہری کے قصے سن چکا ہوں مگر کہاں جائیں، رات کہاں گذارے ..... ہلب صاحب کی اس طرز مہمان نوازی پر ہنسی بھی آرہی تھی۔

اندھیرے میں سے ایک جسم حرکت کرتا ہوا دکھائی دیا، اس شخص نے آکر ہمدردانہ انداز میں کچھ پوچھا، کچھ سمجھ میں نہ آسکا۔ میرے لیے یہ مشکل کہ کس زبان میں اپنی افتاد کو سمجھاؤں سڑک کی روشنی میں جب اس کا چہرہ ذرا صاف دکھائی دیا تو میں نے پہچانا کہ وہ میرا ہم سفر ہے جو ٹرین میں میری بغل کی نشست پر بیٹھا تھا۔ زبان کی دیوار کو توڑتے ہوئے اس نے دو لفظ انگریزی میں بولے میں نے کچھ اشاروں اور کچھ انگریزی کی مدد سے اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کی کوشش کی۔ ROH کا نام، پتہ ٹیلیفون نمبر لکھ کر بتایا۔ کچھ سکنڈ چپ رہنے کے بعد اس نے میرا بکس اٹھا لیا، اور کہا "۶۵۱۶ چلو۔ ٹرام"

"ہوم" (گھر) ٹیلیفون "SEE" یعنی دیکھیں گے۔ میں نے اس تقریر کا جواب صرف ایک لفظ سے دیا "OOO" یعنی اچھا۔

آخری ٹرام۔ ٹرام میں سوار ہو کر ہم ایک جگہ اتر گئے، بکس اٹھائے ہوئے ہم دونوں چپ چاپ گھر تک چلے گئے وہ آگے میں پیچھے، رات کا سناٹا، کشادہ گلیاں، پکے مکانات، شاداب درختوں سے ڈھکے ہوئے، ہلکی ہلکی سردی اس اڈوینچر میں مجھے اب لطف آنے لگا تھا مگر شلاز کے خلاف طرح طرح سے غصہ بھی آرہا تھا۔

گھر پہنچ گئے، گیٹ، صحن، برآمدہ، دروازہ کھلا تو کشادہ سجا ہوا کمرہ، قالین کا فرش، صوفے دیواروں پر کچھ تصویریں آتش دان، نکل پیس پر فوٹو، چھوٹی چھوٹی مورتیاں، پردے، جھالر، ٹیلیفون۔

کمرے کی تیز روشنی میں میزبان دوست کو اچھی طرح دیکھنے کا موقع ملا وہ ایک خوش رو شائستہ نوجوان تھا اس نے اپنا کارڈ دکھایا۔ وہ بجلی کا مزدور تھا، ہم دونوں نے مسکرا کر مصافحہ کیا، اس کی بیوی اور بچہ بغل کے کمرے میں سو رہے تھے، اس نے پوچھا "TEA" چائے پئیں گے گردن ہلا کر جلدی سے کہا "OOO" یعنی ہاں۔ وہ بغل کے کمرے میں گیا اور بہت جلد واپس آکر ٹیلیفون ملانے لگا۔ ہر دو منٹ کے بعد وہ مایوسی سے کہتا "NO" یعنی جواب ندارد۔ سفید گون پہنے ہوئے اس کی بیوی کمرے میں آئی۔ اس نے تعارف کرایا، اس کی آنکھوں میں نیند سے بیدار ہونے کے آثار اور چہرے پر اچھنبا اور خوشی کے جذبات تھے وہ باورچی خانہ میں چائے بنانے چلی گئی۔ چال میں انبساط تھا۔

میزبان دوست کی ناکام کوشش پر اب مجھے رحم آنے لگا تھا، بغیر بات چیت کیے کئی بار ڈائل پر اس کی انگلیاں حرکت کرتی رہیں۔ میرے جی میں کئی بار آیا کہ کہوں کام مرید اب زیادہ تکلیف نہ کرو۔ دو بج رہے ہیں، رات کی رات یہیں ٹھہر جاتے ہیں ہر حج ہی کیا ہے صبح دیکھا جائے گا، قالین یا صوفہ آرام کرنے کے لیے بہت کافی ہے۔ مگر یورپ کی ریت رسم الگ ہے۔

بھابی کشتی میں چائے کی تین پیالیاں لیے آگئی۔ ہم تینوں نے چائے پی، اشاروں اور انگریزی لفظوں کی مدد سے ہم بات چیت کرتے جاتے تھے اور ہنستے بھی جاتے تھے۔ بھابی اندر گئی اور اپنے بچے کو لا کر دکھایا۔ سال ڈیڑھ سال کا ننھا موٹا تازہ خوش رنگ بچہ، ہندستانی بچا کو دیکھ رہا تھا اور وہ بھی عجیب عالم میں، وہ اس کی زندگی کا بہت اہم اور عجیب واقعہ تھا۔ پیار سے ہم بچوں کو چومنے کے عادی ہیں۔ مگر اُدھر یہ حرکت کچھ اچھی نہیں سمجھی جاتی، میں نے بچے کے سامنے صرف چٹکی بجائی اور ٹھڈی کو پیار سے چھوا، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر وہ مجھے گھور رہا تھا۔ ماں باپ بہت خوش تھے بھابی بچے کو لیے خدا حافظ کہہ کر چلی گئی سونے کے لیے۔ میں نے میزبان ساتھی سے کہا کہ اب چلو کسی ہوٹل میں، کوشش فضول ہے۔ ڈینوب کے کنارے ایک شاندار ہوٹل میں داخل ہوئے۔ استقبالی کمرے میں سوائے پورٹر کے کوئی نہ تھا، میزبان دوست نے اس سے میرا قصہ کہہ دیا اور صبح کام پر جانے سے پہلے مل کر خبر لینے کا وعدہ کر کے چلا گیا اور صبح وہ آیا بھی۔ میں کمرے کی چابی لے کر لفٹ کے ذریعہ تیسری منزل پر ایک کمرے میں پہنچ گیا، نیند اچاٹ ہو گئی تھی ملائم گداز

صاف ستھرے گرم بستر میں پڑا رہا۔ بھوک اور پریشانی لُب کا دیا ہوا توشہ نکالا، روٹی گوشت کھایا نہیں گیا۔ بوتل کھول کر پانی پینے کی کوشش کی، کھارا سوڈا۔ وہ بھی رکھ دیا۔ کپڑے پہن کر سیڑھیوں سے نیچے اترا۔ لفٹ چلانے والا بوڑھا، لفٹ کے اندر ہی تپائی پر بیٹھے بیٹھے ٹانگیں پھیلائے، گردن لٹکائے ٹوپی آنکھوں پر ڈالے غٹ سو رہا تھا، میں نے وقت دیکھا پانچ ہی بجے ہیں، ٹیلیفون آپریٹر کے آنے میں اور ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔

کبھی کبھی یہ خیال بھی آتا کہ لاکھ مزدور راج سہی نظم و نسق بھی تو ایک چیز ہے، فرض کرو کسی سے کوئی ربط قائم نہ ہو سکا تو ہوٹل کا بل کون دے گا، اور کھانے کا کیا ہوگا۔ لفٹ والے بڑے میاں کو میں نے جگا دیا۔ بوڑھے نے خمار آلود آنکھوں سے مجھے دیکھا، پھر اشارے میں پوچھا کیوں نیند نہیں آئی کیا؟ اور ایک گرتا باکہ جب تک پیٹ میں شراب نہ ہو، نیند کہاں آتی ہے، موٹی موٹی انگلیاں اس نے میرے پیٹ میں ٹھونسیں، میں نے اشارے سے تین انگلیاں بتائیں یعنی چلو تیسری منزل پر۔

بڑی بے چینی سے گھنٹہ بھر کمرے میں گذارا، نیچے آیا چہل پہل شروع ہو چکی تھی کمرے کھل رہے تھے، لوگ سیڑھیوں، لفٹ اور لونج میں آ جا رہے تھے۔ ٹیلیفون کا لڑکا بھی آ چکا تھا، میں نے اپنا نمبر دے دیا، سلواکیہ کی کمیونسٹ پارٹی کی علاقائی کانفرنس کے ڈیلی گیٹس اسی ہوٹل میں مقیم تھے، دن نکل گیا ریل پیل اور ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ اس ہنگامے میں ایک اجنبی کبھی ادھر، کبھی ادھر گھومتا پھرتا رہا۔ ہر پانچ دس منٹ کے بعد ٹیلیفون پر خبر لیتا رہا۔ جواب ندارد اب تو میں نے فیصلہ کر لیا اور آدھ گھنٹہ دیکھ کر پراگ کو ٹیلیفون کر کے لب صاحب سے پوچھوں کہ "جناب! واہ"

ٹھیک آٹھ بجے ٹیلیفون کے لڑکے نے ایک کرسی بتا کر کہا کہ یہاں سے ہلو نہیں۔ میں کرسی پر بیٹھے دروازہ پر نظریں گاڑھے رجال الغیب کا منتظر رہا۔ ٹھگنا سا شلاز گول ترچھی ٹوپی لگائے بھاری کوٹ پہنے تیزی سے میری طرف بڑھا اور خندہ پیشانی سے بغلگیر ہو کر مجھے اٹھا لیا اور چومنے لگا۔ بغیر اس کا لحاظ کیے کہ میں کس قدر غصہ میں ہوں۔

چلو ناشتہ کر لیں، اس کے ساتھ ایک دبلا پتلا نوجوان بھی تھا۔ میں نے کہا جناب آپ رات کہاں تھے، شلاز نے اس انداز میں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں کہا جب تم رات میں براٹس لاوا کی سڑکوں پر مارے مارے پھر رہے تھے، میں گھر میں مزے کی نیند سو رہا تھا، اور خراٹے بھرنے کی آواز منہ سے نکال کر ہنسنے لگا۔ جواب نہیں اس شخص کا بھی ——— میں نے دل ہی دل میں کہا۔ شلاز نے کہا میرے آنے کی اطلاع اسے اب ہی آٹھ بجے دفتر پر ملی۔ کلرک نے رات میں پیام نہیں پہنچایا کیونکہ وہ اس کام پر نیا سا تھی ہے۔ چھریرے بدن کا نوجوان ڈرائیور تھا۔ ہم تینوں نے مل کر ایک رستوراں میں ناشتہ کیا گرم گرم، ہم بہت دوست بن گئے، اور صرف باتیں کرتے رہے، ڈرائیور ساتھی نے اپنے بچے اور بیوی کی تصویر دکھائی اور کہا کہ اب وہ شام میں انجینیرنگ کی جماعتوں میں تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ چیکوسلواکیہ اور آسٹریا کی سرحد پر پہنچے، شلاز مجھے آسٹریا اور سوویت کی مشترکہ چوکی میں لے گیا وہاں ایک سفید بالوں والی عورت ساتھی۔ ڈبلیو ایف ٹی او دینا کے مزدوروں کی انجمن کی طرف سے مجھ لینے کے لیے پہلے ہی سے موجود تھی۔ ایک دوسرے سے رخصت ہونے کا لمحہ بھی آ پہنچا، گو تھوڑی دیر کی دوستی تھی مگر دل گرفتہ تھے کہ اب جدا ہونا ہے، مصافحہ کیا بغلگیر ہوئے شلاز نے تو کسی قدر ضبط سے کام لیا مگر ڈرائیور ساتھی کی آنکھیں بھر آئیں اور بے اختیار آنسو ٹپکنے لگے۔ موٹر کے دریہ میں دیا نا چلا گیا۔

ابوظفر عبدالواحد

کالی گھٹا

ایک قصیدہ نما نظم

جمہوریت کے بعض نازک اور پیچیدہ مسائل پر

تمہید:۔ سیکولرازم، اور اخلاقی مزاج

خدا سے بیر جب نام خدا ہے — ہر اک نا اہل، اپنا نا خدا ہے
حریم دل میں بیٹھا نا۔ خدا، ہے — حرم نا آشنا، قبلہ نما ہے
دلوں میں کار فرما نا۔ خدا ہے[1] — بھرے ساغر ہیں خالی میکدہ ہے
خدائی، نا۔ خدا[2] ئی کر رہی ہے — فتن کی راہ، ہر راہِ خطا ہے
ہوئی اخلاص سے خالی خدائی — زباں پر عام، نام نا۔ خدا ہے
بیاں کیا کیجئے کیا ماجرا ہے — عزیزو! ابتلا ہی ابتلا ہے
جو ہونا چاہیئے، ہرگز نہ ہوگا — جو چاہا تھا نہ ہو، وہ ہو رہا ہے
ہر اک تخلیق میں شانِ تخلل — ہر اک بیت اک خلا اندر خلا ہے
سیاست کی ہر اک رسم دلاویز — زبانِ دل کا بھونڈا ترجمہ ہے
دیانت کی کمی۔ بازار کالے — عجب سنسار کی کالی گھٹا ہے

کوئی کہتا ہے سُن کر "ایم نا[3] نا"
زبانِ شیخ پر "قالو بلیٰ" ہے (گریز)

---

[1] و [2] لفظ، نا خدا، کے ایہام سے کام لے کر اس لفظ میں ایک نئی معنویت پیدا کی گئی ہے۔ اس طرح "نا۔ خدا" یعنی خدا منفی خدا اور نا۔ خدائی بھی "سیکولرازم"۔

[3] تلگو زبان کا لفظ ہے "نا نا" یعنی زبان۔ بولی۔ "ایم" کیا۔ یعنی "قالو بلیٰ" کیا بولی ہے۔

تشبیب :- (مسئلہ زبان و زیاں)

(۲)

ترقی ہی کا چرچا جا بجا ہے — بتائیں کیا ہے بے جا، کیا بجا ہے
گئو رکشا سے کیا حاصل ہے پیارے — چلا رکشا کہ رکشے میں مزہ ہے
نہیں جب پاس تیرے میرے دھیلا — تو مجھ کو کیوں پلاتا ساقیا، ہے؟
تری بولی بھی ہندی، یہ بھی ہندی — بتا اردو نے تیرا کیا کیا ہے
ہمیں سے سیکھ کر ہم سے ہی اڑنا! — پپیہوں کو سکھانا پریت کیا ہے؟
نہ کریوں فرق ماتا ہو کہ ماتا — یہی جمہوریت کا اقتضا ہے

سنبھل کر یاں قدم رکھنا مری جاں
ہر اک یاں سر پھرا مانی ملا ہے

مسلسل تضاد :-

(۳)

کمر پٹہ بندھا ہے مکر و فن کا — کوئی نازک کمر بل کھا رہا ہے
سیاست کے نئے ہیں چھکے پنجے — ہے افراط زر، اور عنقا غذا ہے
جو منصوبہ ہے، کاغذ پیرہن ہے — غریبوں کا گھروندا بے دیا ہے
لبوں پر سنتے ہیں "میٹر"[۵] لگیں گے — نظر کے سامنے اب کربلا ہے
معیشت کی ادھر وہ سرگرانی — نئی ڈیمج سے ادھر پیسہ چلا ہے
کہاں ہے دیس میں آسودہ حالی — کہ اٹکل پر یہ مکتب چل رہا ہے
ہزاروں گھاٹ کے ہیں اور نہ گھر کے — بتا دے صاف کیا تیری رضا ہے

نہ لے جمہوریت کا نام، آمر!
تری جمہوریت اک مضحکہ ہے

مستقل درد سر :-

(۴)

نشیمن چاک دامن چاک دل چاک — جنوں پرور ہماری ایکتا ہے

---

۴ دکن کی خواتین کا چلتا ہوا روزمرہ، جسے بھرپور معنویت اور سنجیدگی کے ساتھ پہلی بار استعمال کیا گیا ہے۔
۵ METRE (انگریزی) = پیمانۂ آب

کشاکش ہے میان پاک و ناپاک — جہنم، ارضِ پاک ایشیا ہے
شقاوت ہے دلوں میں کارفرما — دلِ افسردہ، وطن کی ماتا ہے
ہوے بدنام اہمسا اور اسلام — کہ ہمسایوں کے سر پر چھتیا ہے
یہ جمع و خرچ اپنے سب ہیں بے سود — زباں جب درد سے ناآشنا ہے

زبوں حالی[۵] ہوئی گو اپنی کلہ اژ[۵] — یہ پتنی[۵] اپنی بے ماتا پتا ہے
نہیں ہیں گاہکوں کے پاس گو، دام — ترا "گودام"[۹] ساماں سے پٹا ہے
دکانوں میں رمی بلبوں[۱۰] کی بارات — خریداروں کے دل میں جھٹپٹا ہے
ہر اک شاطر، شرارت پر تلا ہے — دھڑے بندی میں ہر اک مبتلا ہے
خیانت[۱۱] ہے خوشامد[۱۲] سے بغل گیر — خباثت، منزلِ بے فاصلہ ہے
طلاقت ایک طاقت کا خلا ہے — غرض، نامختتم یہ سلسلہ ہے

غرورِ اکثریت بے بنا ہے — یہ ساگر، بوندوں بوندوں سے بنا ہے
اُسی دو بوند سے تو بھی بنا ہے — نہ جانے کیوں تجھے یہ طنطنہ ہے
ترے شاکی ہیں سارے شیعہ سُنّی — ترا اپنا[۱۳]، تبرا[۱۴] پرائی بنا ہے
ہے بھارت سماج، اقلیت چنا ہے — ہمیں بھی تیری ماتا نے جنا ہے
سُجھے کوئی تو گلخن کھل کھلائے — ترے گلشن کی کیسی یو جنا ہے؟
اقلیت پہ خاص الخاص نظریں — یہ کیسا نیاسے؟ کیسی بھاونا ہے؟
ظفر کو ضد ہے تیرے مکر و فن سے — کہ اُس کا پیشہ، کارِ انبیا ہے

نشانِ راستِ بازاں، سرفروشی
ہتی دستی صداقت کا صلہ ہے

---

۵ و ۸ مجازاً، گو سیاسی حیثیت سے ہم آزاد ہیں۔ ۸ معاشی حیثیت سے ہم اسی طرح بے بس ہیں۔
۹ گودام انگریزی لفظ (GODOWN) سے۔ ذخیرہ بازوں کی خارستانیوں کی طرف اشارہ ہے۔
۱۰ انگریزی (BULBS)۔ برقی قمقمے۔ ۱۱ و ۱۲ سرمایہ داری اور اقتدار کا گٹھ جوڑ
۱۳ اکثریت کی طرف اشارہ ہے۔ ۱۴ غوغائی اور فسادی

شمیم کرہانی

سہارا

خارِ صحرا ہی نہیں، حاصلِ صحرائے حیات
اس بیابان میں کلیاں بھی کھلا کرتی ہیں
دن کی لو دھوپ کی ماری ہوئی کتنی روحیں
رات کی چھاؤں میں تاروں سے ملا کرتی ہیں

حاصلِ میکدۂ زیست ہے غفلت لیکن
اسی غفلت میں کبھی ہوش بھی آجاتا ہے
ہجر کا دورِ خزاں ہی نہیں رہتا دائم
موسمِ شانہ و آغوش بھی آجاتا ہے

کوئی پیکر ہے نہ پرتو ہے نہ پرچھائیں ہے
پھر بھی محسوس یہ ہوتا ہے کہ ہے ساتھ کوئی
وحشتِ غم سوئے صحرا جو اٹھاتی ہے قدم
بڑھ کے رکھ دیتا ہے شانے پہ مرے ہاتھ کوئی

خواب کے موڑ پہ ملتی ہے سحر کی منزل
جگمگا اٹھتی ہیں سوئی ہوئی آنکھیں دل کی
غم دوراں کے دھندلکے میں جو ملتی ہے نگاہ
مسکرا دیتی ہیں روتی ہوئی آنکھیں دل کی

پھر اٹھاتا ہوں جو تیشہ تو زمیں کے دل سے
دلِ نازک کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے
دست و پا سعیِ مسلسل سے جو تھک جاتے ہیں
تو کہیں سے ترے آنچل کی ہوا آتی ہے

خشک ہو جاتی ہے بھیگی ہوئی محنت کی جبیں
کشش کوہکنی دل میں جواں ہوتی ہے
دشت بیرنگ کو ملتا ہے گلابی پیغام
دودھ کی نہر پہاڑوں سے رواں ہوتی ہے

شہد کے جام بھی ہیں، شیر کے پیمانے بھی
زہر ہی زہر نہیں دہر میں پینے کے لیے
کر ہی دیتی ہے اشارہ نگہِ ساقیٔ زیست
مل ہی جاتا ہے سہارا کوئی جینے کے لیے

سردار الہام

اعتراف

ہاں فقط جرمِ محبت کا خطاوار ہوں میں
میں نے ذرّوں کو بھی خورشیدِ درخشاں سمجھا
مورِ بے مایہ کو ہم دوشِ سلیماں سمجھا
تیرے جلوے کو حریفِ مہ کنعاں سمجھا
تیرے اقرار کو تمہیدِ بہاراں سمجھا
میں نے سمجھا تھا کہ تابندہ سحر جاگ اٹھی
نور ہی نور ہے اب ظلمتِ شب ختم ہوئی
وہی پرحول فضائیں تھیں وہی دشت و دمن
تیرگی اوڑھ کے نکلی تھی بہاروں کا کفن
وجہ عبرت تھے تمناؤں کے اجڑے مدفن
دل کو درپیش تھا اک مرحلۂ دار و رسن
ناچتے شعلوں کی زد میں تھا گلستانِ حیات
حسرتِ مرگ نمایاں تھی بعنوانِ حیات

وقت نے بڑھ کے الٹ دی رخِ زیبا کی نقاب
اور پھر اٹھ گئے مشتاق نگاہوں کے حجاب
ذہن و ادراک پہ طاری تھے تمناؤں کے خواب
دل تشنہ کو ہر اک سمت نظر آئے سراب
ہنس کے پھر زہر بھرا جام اٹھایا میں نے
دہر کو نغمۂ منصور سنایا میں نے
بے وفائی کا گلہ کر کے بھلا کیا لیں گے
دلِ مجروح کو سو ڈھنگ سے سمجھا لیں گے
جو تری بزم کو ٹھکرا کے چلے آئے ہیں
اب غمِ زیست، غمِ دہر کو اپنا لیں گے
عشق کہتا ہے تمناؤں کا ماتم نہ کرو
شکرِ ایام کرو اور کوئی غم نہ کرو
اے خوشا جذبِ وفا آج بھی شرمندہ ہوں میں
ہاں فقط جرمِ محبت کا خطاوار ہوں میں

دانش فرازی

رات کے زنداں سے

جانے کون کہ کس وادی میں خوابیدہ ہیں گیت ہمارے
مطلعِ قید ہے کس زنداں میں، چپ ہیں کیوں آکاش کے تارے
کچھ بھی کاش بتا سکتے، یہ چاند، یہ بادل، یہ نظارے
سرکش یہ کہسار کی چوٹی، چنچل یہ ندیوں کے دھارے
رات کے گہرے سناٹے میں کس کس سے میں پوچھ رہا ہوں

کن آنکھوں کے شیش محل میں اتری خوابوں کی شہزادی
جاگ رہا ہوں غم کا مارا۔ میری ہستی ہے فریادی
ڈگر ڈگر، پر ناچ رہی ہے، بانہیں پھیلائے بربادی
مانگ نکالے کہاں کھڑی ہے جانے یہ صبحِ آزادی
رات کے گہرے سناٹے میں کس کس سے میں پوچھ رہا ہوں

وہ طوفان کس دریا میں ہے، جس سے دل ظالم کاڈوبا
کہاں ہے وہ جلوہ کہ جس سے چمک اٹھے دھرتی کا ماتھا
دل سے ملا ہر دل کا رشتہ، انساں نے انسان کو سمجھا
اُس جلوے کو گلشن گلشن، وادی وادی، صحرا صحرا
رات کے گہرے سناٹے میں کس کس سے میں پوچھ رہا ہوں

کہاں گئی تہذیب کی عظمت، انساں کی توقیر کہاں ہے
چاروں سمت ہی دیواریں ہیں، کوہ شکن تدبیر کہاں ہے
مجرم خود رہبر ہے اپنا، بسملا و تقریر کہاں ہے
خواب نظر آتے ہیں لاکھوں، خوابوں کی تعبیر کہاں ہے
رات کے گہرے سناٹے میں کس کس سے میں پوچھ رہا ہوں

مل جائے پیغام ہی کوئی تاروں کی خاموش زباں سے
نس نس میں اک آگ لگی ہے آہوں کی خاموش فغاں سے
پہنچا ہوں بے تاب کہاں میں، نکلا تھا افسوس کہاں سے
کوئی تو آواز دے آخر زہرہ سے یا کاہکشاں سے
رات کے گہرے سناٹے میں کس کس سے میں پوچھ رہا ہوں

راشد آذر

آج کی شام

جب کبھی دل میں تری یاد جواں ہوتی ہے
پھر سے ہر سوئے ہوئے غم کو جگا دیتی ہے
شام تنہائی کی تصویر لیے آتی ہے
خامشی درد کا احساس بڑھا دیتی ہے

آج تنہائی میں پھر تیرا خیال آتا ہے
گزرے لمحات تخیل کو سجا دیتے ہیں
وقت کی راکھ میں سوئے ہوئے یادوں کے شرر
دل میں بے نام سی اک آگ لگا دیتے ہیں

سرسراتا ہوا تخیل کا رنگیں آنچل
آج بے رنگ سا احساس میں لہراتا ہے
آج اٹھتا ہے امنگوں کا جنازہ دل سے
میری دنیا میں اندھیرا سا نظر آتا ہے

وہ کتابیں جو ترے ساتھ پڑھا کرتا تھا
آج بے آسرا بچوں کی طرح روتی ہیں
جب مجھے اپنی تمنا کا خیال آتا ہے
مری خوشیاں مرے احساس میں غم ہوتی ہیں

فصل اگتی ہے تو ہر زخم ہرا ہوتا ہے
خونِ دل رنگِ شفق بن کے بکھر جاتا ہے
پاس سے تیرے گزرنے کی صدا آتی ہے
تجھ کو پانے کا جنوں اور نکھر جاتا ہے

دورِ امید کا مبہم سا دیا جلتا ہے
دل کے ویران سے مرقد پہ کلی کھلتی ہے
آج پھر تیرے کرم تیری عنایت کے طفیل
دردِ کو آہِ محبت کو فغاں ملتی ہے

آج کی شام کسی اور کا زرّیں دامن
تیری کھلتی ہوئی کلیوں سے مہک جائے گا
میرے اشکوں کی چتاؤں کو سلگتے پا کر
تیری بے چین امنگوں کو قرار آئے گا

سوچتا ہوں کہ ترے لطف و تبسم کے بغیر
زندگی کتنی بھیانک سی نظر آئے گی
ذہن میں تیری نگاہوں کے کنول کھلتے ہیں
رات اب آنکھوں ہی آنکھوں میں گزر جائے گی

آج کی شام مرے دل میں خیال آتا ہے
یارِ عشق میں جاں دے کے امر ہو جاؤں
یا تو سینے میں جلائے ہوئے حسرت کا دیا
زیست کی راہ پہ مائل بہ سفر ہو جاؤں

سیّد حرمت الاکرام

شیش محل

چاندانی رات سے کہہ دو کہ چھپا لے چہرہ
چوٹ کھائے ہوئے جذبات کی خاکستر سے
سوچتا ہوں کہ بایں تلخیٔ آلام جہاں؟
میرا پندارِ خرد زیست کی اس منزل میں
کس نے فردا کے جزیرے میں بلا کر مجھ کو
میرے احساس کی ویران گذرگاہوں میں
چھیڑتا ہے دلِ بے تاب کو اک جلوۂ نو
اور ماضی کے اندھیروں سے ابھر کر ہر بار
جاگ جاگ اٹھتی ہے اندیشۂ فردا کی تڑپ
میری ہر سانس ہے اک حادثۂ غم مجھ پر
سوچتا یہ ہوں کہ دو سال سے جن نظروں کی
کون سا تیر نیا آج ادھر سے آیا
چھاؤں میں وعدوں کی ہے قافلۂ شوق رواں
پیچ و خم کا یہ تقاضا ہے کہ بچ بچ کے چلو
دل میں لہراتی ہے اک تازہ کسک تازہ امید
بیتے لمحوں کے خرابے سے حیات آئی ہے
کون جانے لبِ رخسار کے اس طوفاں میں
کون جانے کہ گرفتارِ خمِ کاکل کو

آنکھ اٹھاتا ہوں تو دل اور دھڑک اٹھتا ہے
کوئی شعلہ، کوئی انگارہ بھڑک اٹھتا ہے
کس طرح اک نئے افسانے کا آغاز ہوا!
حسن کے سامنے کیسے سپر انداز ہوا!
روح کے ساز پہ اک گیت نیا گایا ہے!
کون اس طرح دبے پاؤں چلا آیا ہے؟
جھلملاتے ہوئے لمحات کا پیغام لیے
تجربے آئے ہیں آئینۂ انجام لیے
یہ نیا پیار نہ راس آیا، تو پھر کیا ہوگا؟
حادثہ اور کوئی گذرا، تو پھر کیا ہوگا؟
زد پہ رہ کر بھی کوئی چوٹ میں کھا ہی نہ سکا
وار سے جس کے میں اپنے کو بچا ہی نہ سکا
کس طرف جائے گا، پہنچے گا کہاں کیا معلوم؟
کیسا چھایا ہے یہ راہوں پہ دھواں، کیا معلوم؟
اپنے دامن میں دہکتے ہوئے کچھ پھول لیے
میرے ارمانوں کی سنولائی ہوئی دھول لیے
کشتیٔ شوق کو ساحل بھی ملے گا کہ نہیں؟
صلۂ ذوقِ سلاسل بھی ملے گا کہ نہیں؟

کون بتلائے، خبر کس کو کہ کل کیا ہوگا؟
کس سے پوچھوں یہ مرا شیش محل کیا ہوگا؟

خواجہ حمید الدین شاہد

حیدرآباد کے چند مرحوم شعراء

بزرگو اور دوستو! آج کی مجلس میں چند ایسے بزرگوں اور ساتھیوں کی یاد تازہ کرنا چاہتا ہوں جو کل تک ہمارے ساتھ تھے اور آج ہم سے چھوٹ کر اس دنیا میں چلے گئے ہیں جہاں ہم سب کو ایک نہ ایک دن جانا ہے۔ جب وہ زندہ تھے تو شعر و سخن کی محفلیں ان کے نغموں سے گونج اٹھتی تھیں آج نہ وہ ہیں اور نہ ان کے نغمے۔ ادبی محفلوں اور مشاعروں میں ہماری نظریں صاحبزادہ میکش، صفی اورنگ آبادی، عبدالقیوم خاں باقی، سید علی منظور، لطیف ساجد اور مرزا عصمت اللہ بیگ کو ڈھونڈتی رہ جاتی ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی دکھائی نہیں دیتا جب نگاہیں مایوس ہوجاتی ہیں تو ان کی یاد بے طرح دل کو ستاتی ہے پھر یہ شعر پڑھ کر ہم ان کی یاد ہی سے اپنے دل کو تسلی دے لیتے ہیں ؎

جانے والے کبھی نہیں آتے جانے والوں کی یاد آتی ہے

آسمانِ شعر و سخن کے یہ چھ ستارے ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئے لیکن ان کے کلام کی نورانی کرنیں اردو دنیا کو ہمیشہ منور کرتی رہیں گی۔ یہ مختصر سا مضمون تعارفی انداز میں لکھا گیا ہے۔ کلام پر تبصرے یا تنقید کو محض طوالت کے اندیشے سے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

صاحبزادہ میکش

آج سے لگ بھگ بائیس ۲۲ سال پہلے کی بات ہے جب صاحبزادہ میکش سے میری ملاقات عثمانیہ کالج میں ہوئی تھی۔ ہم دونوں ایک ساتھ انٹرمیڈیٹ کی جماعت میں داخل ہوئے تھے۔ ان کا تعلق خانوادۂ آصفی سے تھا اور شاید یہی وجہ ہو کہ ان میں ایک خاص آن بان تھی۔ سانولا رنگ، چہرہ بدن، غنچہ دہن، غزالی آنکھیں، کمانی بھنویں، ستواں ناک، سبک نقشہ سر پر ترکی ٹوپی ایک طرف کو ذرا جھکی ہوئی ہمیشہ شیروانی پہنتے تھے۔ آنکھوں میں غضب کی چمک تھی اگر میں انھیں سرکتی آنکھیں کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ کم سخن اور اس سے بڑھ کر کم آمیز لیکن ان کی مقناطیسی شخصیت نے سب کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ جب یونیورسٹی اورینٹ کی عارضی عمارتوں میں منتقل ہوئی تو میکش کو وہاں کا شاعرانہ ماحول اور ہوسٹل کی زندگی کی رنگارنگی اتنی پسند آئی کہ وہ ہوسٹل میں رہنے لگے۔ یہاں میکش کی شعری صلاحیتوں کو پروان چڑھنے کے کافی مواقع ملے اس دور کے نوخیز شاعروں میں مخدوم، وجد، شعیب حزیں اور صمد رضوی ساز بھی ہوسٹل

میں رہتے تھے۔ ایسی شعر پرور فضا میں میکش کے جوہر چمکنے لگے اور انھوں نے اس زمانے میں بڑی اچھی اچھی نظمیں لکھیں۔ ان کے کلام کے پہلے مجموعہ "گریۂ تبسم" کی اکثر نظمیں اور غزلیں اسی دور کی پیداوار ہیں۔ میکش نے اپنی ایک نظم میں ہوٹل کی زندگی کی داستان اس طرح بیان کی ہے ؎

جھومتی تھی میرے لب پر بھی تبسم کی بہار — تھا کبھی میں بھی اسی ماحول میں آزار بکار
کائناتِ کیف و مستی نوجوانی تھی مری — اک مجسم شعر گویا زندگانی تھی مری
جنگلوں کی دلکشی میں گھومتا پھرتا تھا میں — کوہساروں کی جبیں کو چومتا پھرتا تھا میں
وقت کی رو میں وہ عشرت کا زمانہ بہہ گیا — اس کا ایک خوشگوار تخیل داغ بن کر رہ گیا

جس تیز رفتاری سے میکش کی شاعری پروان چڑھتی گئی اسی انداز سے وہ اپنی عمر کی منزلیں بھی طے کرتے گئے۔ وہ ایک شعلۂ جوالہ بن کر چمکے اور بہت جلد بجھ بھی گئے۔ ان کی بے وقت موت نے یہ ثابت کر دیا کہ ان کی برق رفتاری بے سبب نہ تھی۔ میکش چمنستانِ شعر و ادب کا ایک ایسا گل نورس تھا جو پوری طرح کھلنے نہ پایا کہ مرجھا گیا اُس کے ہر شعر پر چمن اندر چمن اور بہار اندر بہار کا گمان ہوتا ہے۔ ان کی جدت طبع اور پہلو دار طبیعت پر سب کو حیرت ہوتی تھی۔

علامہ اقبال سے میکش کو بڑی عقیدت تھی جس کے اثرات ان کے کلام میں جا بجا نمایاں ہیں۔ جب اقبال کے انتقال کی خبر ملی تو میکش کی عقیدت پر غم کی بجلی گر پڑی جب میں ان سے ملنے کے لیے ان کے گھر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ اپنے کمرے میں نہایت ہی افسردہ اور ملول بیٹھے ہیں کچھ دیر بعد ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے چلتے ہوئے میں نے ان سے کہا کہ اگر تم کل تک ایک نظم اقبال پر لکھ دو تو میں جانوں کہ واقعی تم شاعر ہو۔ میکش نے دوسرے ہی دن صبح نظم اس تحریر کے ساتھ میرے ہاں بھیج دی "تم نے کہا تھا کہ اگر اقبال پر نظم نہ لکھی تو تم شاعر ہی نہیں۔ لو خدا نے شاعر بنا دیا۔ نظم مرسل ہے" اس نظم کے چند اشعار یہ ہیں ؎

آسمانوں سے گذر جاتی تھی جس کی جستجو — بندگی میں جس نے کی تھی اپنے رب سے گفتگو
کس لیے روتا ہے اس کی موت پر اے کم نظر — موت اک موہوم پردہ ہے ثباتِ زیست پر
مردِ مومن مسکراتا ہے اجل کو دیکھ کر — قید و بندِ زندگی کے ماحصل کو دیکھ کر
محرمِ منزل تھا رستہ میں ٹھہر سکتا نہیں — کہہ رہی ہے زندگی اقبال مر سکتا نہیں

میکش کا ذوقِ سخن بہت ہی نکھرا ہوا اور سلجھا ہوا تھا۔ تخیل بلند اور پاکیزہ تھا۔ ادائے مطلب پر پوری قدرت حاصل تھی اور یہ باتیں ایک نوعمر شاعر کے لیے بظاہر غیر معمولی تھیں۔ چنانچہ حضرت احمد نے میکش کی بعض غزلیں سن کر اپنے خاص انداز میں فرمایا تھا کہ "کہنے والا کوئی اور ہے" میکش کا کلام حسنِ خیال اور لطفِ بیان کا

ایک ایسا مرقع ہے جس میں زندگی کے نقوش کو فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے ان کی شاعری کے موضوع اور نقطۂ نظر عصر حاضر سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ قدیم اساتذۂ سخن کے اسالیب بیان سے بڑی مشابہت رکھتے ہیں ان کے کلام میں تنوع، جدت، ترنم اور موسیقی سب کچھ موجود ہے۔ جہاں شاعر نے عشق و محبت کے راگ گائے ہیں وہیں کسان مزدور اور وطن کی عظمت کو بھی فراموش نہیں کیا ہے۔ "گریۂ تبسم" کی نظموں میں رومانیت اور احساس زیادہ ہے وہ کبھی عشق و محبت کی رنگین وادیوں میں گھومتے ہیں، اور کبھی حقیقت کے چہرہ سے نقاب الٹنے کی کوشش کرتے ہیں، کبھی اپنے ماحول سے اتنے دل برداشتہ ہو جاتے ہیں کہ اپنے لیے ایک تخیلی دنیا بسانا چاہتے ہیں۔ ان کے کلام کا دوسرا مجموعہ "نوید" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ جس میں شاعر نے انقلابات زمانہ سے متاثر ہو کر نظمیں کہی ہیں میکش نے بچوں کے لیے بھی کئی نظمیں لکھی تھیں اور اپنی زندگی ہی میں ان کو مرتب بھی کر لیا تھا۔ لیکن افسوس کہ وہ اب تک شائع نہ ہو سکیں۔ ڈاکٹر زور صاحب کی تحریک پر گولکنڈہ کے تاریخی آثار پر نظمیں لکھ کر نہ صرف شاندار دور ماضی کی یاد تازہ کر دی بلکہ قطب شاہی تہذیب و تمدن کو زندۂ جاوید بنا دیا۔ نظمیں "کھوے ہوؤں کی جستجو" کے عنوان سے "سب رس" کے میکش نمبر میں شائع ہو چکی ہیں۔ "گریۂ تبسم" میکش کے حساس دل اور ان کی وارفتہ طبیعت کا آئینہ دار ہے۔ ان نظموں اور غزلوں میں شدت احساس، بلندیٔ فکر اور اضطراب و عمل پورے شباب پر ہے۔ میکش نے "شاعر" کے عنوان سے جو نظم کہی ہے اس سے ان کی طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے ؎

خیالِ ناقدری ہے نہ فکرِ کینہ دوری — شباب و شعر نے دی ہے مجھے وہ بے خبری
ہزار بار گری برق غم جلا نہ سکی — مجھے ملی ہے ازل سے متاعِ خوش بسری
مرے خیال کی دنیا مٹا نہیں سکتی — زمین کی گردش پیہم فلک کی فتنہ گری

میکش نے اپنی ایک نظم "اندھا" میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ شاید اردو شاعری میں بالکل نئی چیز ہے بصارت سے محروم انسان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو جس انداز سے پیش کیا گیا ہے اس کی تعریف نہیں ہو سکتی ہے ؎

سنتا ہے حسنِ شمس و قمر دیکھتا نہیں — یعنی نظامِ شام و سحر دیکھتا نہیں
اس کے بھی پیرہن پہ گلوں کے داغ ہیں — دنیا کو چاہتا ہے مگر دیکھتا نہیں
اس کو سنبھال لیتی ہیں ہر بار ٹھوکریں — چلتا ہے اور راہ گذار دیکھتا نہیں
اس کو سکون چاہیے جینے کے واسطے — رہتا ہے اور اپنا ہی گھر دیکھتا نہیں

جذب و مستی اور اضطراب و بے قراری کے عالم میں میکش کے دل پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ پکار اٹھتا ہے ؎

قرار بے قراریوں کا نام ہے شباب میں — سکون زیست پا رہا ہوں عہد اضطراب میں
عمل کے جام میں شراب علم پی رہا ہوں میں — کہ زندگی کو زندگی بنا کے جی رہا ہوں میں
مری حریم آرزو میں یاس کا گذر نہیں — بہار بے خزاں ہوں میں خزاں کا مجھکو ڈر نہیں

"پریم پرچار" میں وہ اس طرح اپنے احساسات کا اظہار کرتے ہیں ؎

کوشش کی بلندی دیتا ہوں پھر مجبوری کی پستی کو
شرمندۂ لغزش کرتا ہوں پھر بادۂ عشق کی مستی کو
اک بار بسانا چاہتا ہوں پھر دل کی اجڑی بستی کو
پھر چھیڑ کے بربط ہستی کو میں پریم کا گیت سناتا ہوں

میکش کے کلام کا دوسرا مجموعہ "نوید" گریۂ وتبسم کے چھ سات سال بعد شائع ہوا۔ "نوید" کا میکش "گریہ وتبسم" کے میکش سے ذرا مختلف ہے۔ اس کی نظمیں انقلابی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ میکش کی زندگی کا آخری زمانہ بڑے کرب و مصیبت میں گذرا، دق جیسا موذی مرض گھن کی طرح انھیں کھا رہا تھا اور معاشی پریشانیوں نے انھیں بے بس اور مجبور کر دیا تھا۔ میکش نے نئی پود کے نام اپنے ننھے بچے فہیم کی معرفت جو پیغام دیا ہے اس سے میکش کی دلی کیفیات اور تاثرات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ؎

میرے بچے میرے دل کی آرزو میرے فہیم — میرے ارمانوں کی دنیا میرے گلشن کی نسیم
اس جہنم زار کو جنت بنائے جا ابھی — اس سکون عارضی میں مسکرائے جا ابھی
تجھ کو کیا معلوم دنیا ہے ابھی تک ناتمام — جستجو منزل کی کر دیتی ہے اکثر بے مقام
تجھ کو کیا معلوم مرگ و زیست کی یہ کارگہ — کس طرح بنتی ہے نغمہ کس طرح بنتی ہے آہ
تو سمجھ سکتا تو سمجھاتا کہ فکر روزگار — کس طرح آسودگی سے چھین لیتی ہے بہار

نظموں کی طرح میکش کی غزلیں بھی اپنا ایک مقام رکھتی ہیں ان میں شاعر نے اپنے دلی جذبات اور قلبی واردات کی جس خوبی سے عکاسی کی ہے اس کو بیان نہیں کیا جا سکتا، بلکہ محسوس ہی کیا جا سکتا ہے ؎

گرتے گرتے ان کا دامن تھام لے — گرنے والے لغزشوں سے کام لے
تیری ناکامی بھی کام آ جائے گی — اپنی ناکامی سے کچھ تو کام لے

ڈرتے ڈرتے گناہ کرتا ہوں — تیری جانب نگاہ کرتا ہوں
یہ بھی کوئی گناہ ہے شاید — آج ترک گناہ کرتا ہوں

شراب ناب کو دو آتشہ بنا کے پلا — پلانے والے نظر سے نظر ملا کے پلا
کہیں نگاہ کی مستی بھی حل نہ ہو جائے — کہ جامِ مے کی طرف سے نظر ہٹا کے پلا
پلا ہر ایک کو ہر ایک پر نوازش کر — مگر یہ شرط ہے پہلے مجھے پلا کے پلا

کہتے ہیں کہ موت ہمیشہ زندگی میں سے بہتر کا انتخاب کرتی ہے۔ ۱۲ فروری ۱۹۶۲ء کے منحوس دن موت نے میکش کو ہم سے چھین لیا اور اب وہ درگاہ حضرت محمد حسینؒ کے شہر خموشاں میں اپنی رفیقۂ حیات رفعت لیق کے ساتھ ابدی نیند سو رہا ہے۔

صفی اورنگ آبادی

حیدرآباد کے اردو غزل گو شاعروں میں صفی اورنگ آبادی کا ایک خاص مقام تھا۔ وہ اپنے رنگ تغزل اور اسلوب بیاں کے تنہا موجد تھے لیکن اس کے باوجود ان کے کلام کی شہرت ان کی انتہائی خودداری اور قناعت پسندی کی وجہ سے صرف دوستوں اور شاگردوں کے محدود حلقہ میں ہی رہی۔ انھوں نے اپنی شاعری کو شہرت اور نام و نمود کا وسیلہ نہیں بنایا۔ وہ نہایت پرگو شاعر تھے۔ عمر بھر غزل کہتے رہے۔ انھوں نے اپنی زندگی ہی میں ایک عرصہ قبل اپنا دیوان "پراگندہ" کے نام سے مرتب کر لیا تھا۔ لیکن وہ اس کو چھپا نہ سکے۔ دیوان کے طبع نہ ہونے کے بارے میں اپنی ایک غزل میں اس طرح اشارہ کیا ہے ؎

یہ پراگندہ ہے جو کچھ بھی غنیمت ہے صفی
میں غریب آدمی دیوان کہاں سے لاؤں

دیوان کی اشاعت میں تاخیر کا سبب ان کی مالی مشکلات سے زیادہ ان کا خاص انداز طبیعت اور باریک بین نظر تھی۔ جو معیار ان کے پیش نظر تھا شاید اس کے موافق حالات پیدا نہ ہو سکے۔ انتقال سے چند مہینے قبل حضرت صفی نے مجھے کسی کام سے یاد فرمایا تھا اثنائے گفتگو میں دیوان کا ذکر چھڑا تو فرمایا کہ "مجھے بے حد شرمندگی ہے کہ اب تک میں ادارۂ ادبیات اردو کو اپنا کلام اشاعت کے لیے نہ دے سکا۔ اس کی وجہ میری صحت کی خرابی ہے میں خود اپنے کلام کو صاف خط میں نہیں لکھ سکتا اور مجھے ایسا کوئی نظر نہیں آتا جو اس کام کو میری مرضی کے مطابق انجام دے سکے۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ میرا کلام غلط سلط چھپ جائے اب اس کی ایک ہی صورت ہے کہ آپ وقت نکال کر میرے ہاں آ جائیں۔ میں کہتا جاؤں اور آپ لکھتے جائیں"۔ میں نے ان سے کہا کہ "گرمیوں کی چھٹیوں میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا اور اس کام کی تکمیل ہو جائے گی"۔ یہ زمانہ کی ستم ظریفی ہے کہ چند دن بعد ہی ان کی صحت بگڑ گئی اور وہ بیماری سے جانبر نہ ہو سکے۔

حضرت صفی حیدرآباد کی قدیم تہذیب کا مکمل نمونہ تھے، شرافت نفس اور خودداری ان کے نمایاں جوہر

تھے۔ آداب مجلس کا ان کو بڑا خیال رہتا تھا۔ فرقِ مراتب کو وہ ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے۔ ان کی گفتگو کا انداز بھی عجیب تھا، مختصر الفاظ میں جلد جلد اپنا مطلب ادا کرکے بات کو فوراً ختم کر دیتے تھے۔ عمر بھر کوئی مستقل ملازمت نہیں کی، صرف خاص سے (۱۹) روپے وظیفہ ملتا تھا اور بعض شاگرد، اہل ثروت اور علم دوست ان کی رقمی اعانت کرتے تھے۔ عمر بھر کسی کے آگے دست دراز نہیں کیا۔ بڑی خودداری اور آن بان سے بسر کی۔ غم حیات کو بھلانے کے لیے شراب اور شاعری سے اپنا دل بہلاتے تھے۔ پولیس ایکشن کے بعد ان کی معاشی حالت بہت خراب ہوگئی اور بڑی تنگدستی اور افلاس میں اپنی زندگی کے آخری دن گذار رہے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے ان سے کہا تھا کہ "حکومت ہند شاعروں اور ادیبوں کو وظیفے دے رہی ہے اگر آپ کی طرف سے بھی ایک درخواست بھیجی جائے تو کیا حرج ہے"۔ انھوں نے اس تجویز کی مخالفت نہیں کی، افسوس کہ ان کی درخواست منظوری کے مرحلے طے کرنے بھی نہ پائی تھی کہ ان کا پیمانۂ زندگی لبریز ہوگیا۔

غزل کو صفی صاحب کی طبیعت سے خاص مناسبت تھی انھوں نے رنگ تغزل میں ایسا نکھار پیدا کیا جو اپنی آپ نظیر ہے وہ غزل کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ غزل کی ساری خصوصیات پر ان کی گہری نظر تھی۔ جذبات نگاری معاملہ بندی، محاورہ بندی میں انفرادیت پیدا کرلی تھی۔ الفاظ کے صحیح اور برمحل استعمال پر بڑی مہارت رکھتے تھے زبان کا چٹخارہ اور انداز بیان کا بانکپن ان ہی کا حصہ تھا۔ شاعرانہ صلاحیتوں کے علاوہ ان کا وسیع مطالعہ اور بالخصوص عروض و قواعد زبان سے کامل آگاہی ان کی قادرالکلامی کا باعث ہیں۔ زبان اور انداز بیان اتنا سادہ اور سلیس ہے کہ ہر آدمی بقدر ظرف ان کے کلام سے لطف اندوز ہوتا ہے وہ ان معنوں میں عوامی شاعر تھے۔ میں نے اپنے بچپن میں عام لوگوں کو ان کی غزلیں مزے لے لے کر گاتے سنا ہے موسیقی کی کوئی محفل ایسی نہ ہوتی جہاں ان کی غزلیں گائی نہ جاتی ہوں، ان کی جو غزلیں زبان زد عام تھیں ان کے بعض اشعار اب تک مجھے یاد ہیں ؎

ادا پیدا نظر سے شان رخ سے آن تیور سے — ترے قربان آخر دل ہے کس کس کے لیے تڑپے

ہمیں معشوق کو اپنا بنانا تک نہیں آتا — بنانے والے آئینہ بنا لیتے ہیں پتھر سے

کسی کا رزق رکتا ہے در خلاق اکبر سے — صفی پتھر کے کیڑے کو غذا ملتی ہے پتھر سے

کسی کو جب سے دیکھا ہے دکھائی کچھ نہیں دیتا — سوائی میری نظر کو دوستو کس کی نظر دیکھو

اسے دیکھا ہے جس کے دیکھنے کو لوگ مرتے ہیں — نظر بازو ہماری بھی ذرا حد نظر دیکھو

خیال آپ کا جب ذرا آگیا — تڑپنے میں ہم کو مزا آگیا

سمجھتا ہوں سب کچھ مگر دوستو — یہ دل ہے جدھر آگیا آگیا

وہ ہم جول کے بیٹھیں تو اٹھتی ہیں انگلیاں — کیا مل کے بیٹھتے نہیں دنیا میں چار لوگ

جس سے نہ مل سکے اسے بدنام کر دیا کیا کیا کمال کرتے دنیا میں یار لوگ

حضرت صفی ایک فطری شاعر تھے قدرت کی طرف سے جو دل و دماغ انھیں عطا ہوا تھا وہ داخلی شاعری کے لیے نہایت موزوں تھا زبان و بیان کی ندرت سے کام لے کر معمولی سے معمولی خیال کو نئے ڈھنگ سے پیش کرتے تھے ؎

سب کو کیا کیا بندھی ہیں امیدیں وہ ذرا بھی جو مسکرایا ہے
اس نے شرما کے منہ جو پھیر لیا میں نے سمجھا اُدھر بلایا ہے
اے صفی وقت کو برا نہ کہو وقت پیغمبروں پہ آیا ہے

اچھے گن دیکھا اچھی شکل نہ دیکھ سنکھیا بھی سفید ہوتی ہے
جھک کے ملنا بڑی کرامت ہے اس سے دنیا مرید ہوتی ہے
اس کے وعدے پہ جی رہا ہوں صفی ہائے کیا شئے امید ہوتی ہے

ہر ایک چیز پھر گئی آنکھوں کے سامنے ___ اس انجمن کا ذکر مجھے انجمن ہوا
اللہ کو پکار اگر کوئی کام ہے ___ غافل ہزار نام کا یہ ایک نام ہے
ہر ذرہ کائنات کا سرمست عشق ہے ___ قربان جاؤں آپ کہاں ہیں کہاں نہیں
ہر دل عزیز ہونے کے قابل تو میں نہ تھا ___ دیکھو کہ مجھ میں کوئی تمھاری ادا نہ ہو
کب سے ہوں کیا بتاؤں تلاش بہار میں ___ اک پھول بھی نہ تھا چمن روزگار میں
اب ہوں وہاں خیال کو جس جا اماں نہیں ___ چپ ہوں کہ عام فہم مری داستاں نہیں
جو چیز عیش دو عالم سے بے نیاز کرے ___ وہ درد دل ہے خدا جس کو سرفراز کرے
اگر قائم محبت کا کوئی معیار ہو جائے ___ محبت کرنے والو زندگی دشوار ہو جائے
کون یہ آفت زدہ رہتا ہے کوچے میں ترے ___ شب کو اک آواز آتی ہے الٰہی کیا کروں"
ہم سے تو اس کے واسطے بھی بددعا نہ ہو ___ دشمن برا سہی مگر اس کا برا نہ ہو

انتقال سے کچھ ذرا پہلے صفی اکثر یہ شعر گنگناتے تھے ؎

چراغ زندگی مدھم ہے لیکن چراغ آرزو مدھم نہیں ہے

صفی جیسا باکمال شاعر جس بے اعتنائی اور ناقدر شناسی کا شکار ہوا ہے اس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے

کم ہے خود حضرت صفی نے اپنے کلام میں اس کی طرف اشارے کیے ہیں ؎

کس پہ ہنسی ہے خاک ہونے تک خاک ہوتے ہی کیمیا ہوں میں

صفی بھی کس قدر نادان ہے شاعر ہوا تو کیا اسے لوگوں سے جیتے جی امید قدردانی ہے

سیّد علی منظور

حیدرآباد کے ان چند نامور شاعروں میں سے تھے جس کا کلام ایک عرصہ سے ملک کے بلند پایہ ادبی رسالوں میں شائع ہوتا تھا۔ شاید ہی کوئی ایسا رسالہ ملے جس میں ان کی کوئی نظم یا غزل شائع نہ ہوتی ہو۔ ساقی، ہمایوں، ادبی دنیا، شاہکار، سب رس میں ان کلام اکثر چھپتا تھا۔ ان کی شاعرانہ عظمت اور کمال سخنوری کے سب قائل تھے ان کی شہرت سرزمین دکن تک محدود نہ تھی بلکہ ہندوستان و پاکستان کی ادبی دنیا میں ان کی شاعری کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ ۱۹ ستمبر ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دارالعلوم اورینٹل کالج اورنگ آباد کی مشہور درسگاہ نظامیہ میں حاصل کی اپنے خالو علامہ شمسی سے فارسی اور عربی پڑھی۔ مدراس یونیورسٹی سے امتحان منشی فاضل میں کامیابی حاصل کی محکمۂ طبابت میں ۳۰ تا ۶۰ کی جائیداد پر تقرر ہوا اور ساری عمر تنزل گریڈ کلرک ہی رہ کر وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے وظیفہ کے دو ڈھائی سال بعد ۱۱ نومبر ۱۹۵۵ء میں ان کا انتقال ہوا۔ بچپن سے شاعری کا ذوق تھا۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام منظور کے نام سے شائع ہوا تھا۔ ادارۂ ادبیات اردو سے ان کے کلام کا دوسرا مجموعہ "نمود زندگی" اور ۱۹۵۲ء میں تیسرا مجموعہ "ترجمان زندگی" شائع ہوا۔

حضرت سید علی منظور ایک پختہ مشق اور پرگو شاعر تھے ان کی شاعری ان کے میلان طبع کی آئینہ دار ہے سادگی و پرکاری، محاکات اور جذبات نگاری ان کے کلام کی نمایاں خصوصیتیں ہیں۔ ان کا شمار اردو کے ان شاعروں میں ہوتا ہے جو زندگی کی ترجمانی کو شاعری کی اساس قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے اس معیار کو نہ صرف ہمیشہ پیش نظر رکھا بلکہ اس خصوص میں انفرادی شان پیدا کی۔ ان کی شاعری میں صداقت، خلوص، پاکبازی اور زندگی کی پرانی اور نئی قدروں کا صحت بخش امتزاج پایا جاتا ہے۔ وہ ایک گوشہ نشین اور قناعت پسند بزرگ تھے۔ وضع داری کا بڑا پاس تھا۔ ساری زندگی انتہائی عسرت اور تنگ دستی میں بسر ہوئی لیکن اس درویش خدامست نے کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کیا۔ خودداری اور عزت نفس کا اتنا احساس تھا کہ کبھی کسی صاحب ثروت کی محفل میں اصرار کے باوجود شرکت نہیں کی۔ ان کی ساری زندگی میر تقی میر کے اس شعر کی مصداق تھی ؎

اے تاج شہ نہ سر کو فرو لاؤں تیرے پاس

ہے میر معتقد سند اس کی کلاہ کا

جن لوگوں سے ان کو خلوص تھا ان کے ہاں ضرور جاتے اور اس قدر انکساری اور فروتنی سے ملتے کہ دوستوں کی گردن شرم سے جھک جاتی۔ دوستی کے پکے اور اپنی وضع کے ایک ہی انسان تھے۔ تقریباً ہر ہفتہ ان سے ملنے کا اتفاق ہوتا تھا لیکن کبھی وہ اپنی غریبی اور تنگ دستی کا اشارۃً بھی ذکر نہیں کرتے تھے۔ ان کی آمدنی ان کے خاندان کی گذر بسر کے لیے بالکل ناکافی تھی اور وظیفہ کے بعد تو اور بھی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن ان کے پائے توکل ... کو کبھی لغزش نہ ہوئی۔ ہماری زبان کا ایک ایسا شاعر افلاس میں پیدا ہوا، افلاس میں جیا اور افلاس ہی میں مر گیا ان کی نظموں کا سرمایہ غزلوں کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے۔ ان کا غیر مطبوعہ کلام ابھی اتنا ہے کہ ایک ضخیم مجموعہ مرتب ہو سکتا ہے۔ ان کی غزلوں کی بعض زمینیں خود ان ہی کی نکالی ہوئی ہیں۔ یہ ان شاعروں میں سے نہیں تھے جو کسی مشہور شاعر کی غزلوں کو سامنے رکھ کر غزل لکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تخلف غزلوں کے چند اشعار بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں جس سے ان کے رنگ تغزل کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ؎

اب کیا گلہ کروں عدم التفات کا — میری نگاہ یاس نے سب کچھ جتا دیا
بڑھتے ہوئے شعور میں گم ہو رہا ہوں میں — احساس حسن آپ نے اتنا بڑھا دیا

یہ ہے مرے دل امیدوار کا عالم — فضا میں جیسے ہو لرزاں ستارۂ سحری
جہاں آ کر گلے ملتے ہیں دکھ سکھ — وہیں جا کر بھٹک جاتے ہیں راہی

مجھے دیکھ کر مسکرانے لگے — سنورنے سے جب ان کو فرصت ملی
ستاروں نے ہل چل مچا دی ادھر — ادھر مجھ کو دم بھر جو راحت ملی

انھوں نے اپنی ایک نظم "پاکیزہ کردار" میں اپنی طرز زندگی کا اس طرح نقشہ کھینچا ہے ؎

جو میری حقیقت سے ہیں بے خبر — وہ حیران ہیں میرے افلاس پر
مگر مجھ سے واقف ہیں بالغ نظر — میں بحر شرف کا ہوں روشن گہر
نہیں گرچہ کپڑے مرے زرق برق — مری شان میں پھر بھی آیا نہ فرق
شرافت کے جوہر ہیں تابندہ تر — ادب میرا کرتے ہیں سب خوش بسر

ایک دوسری نظم "مفقود و موجود" کے چند بند یہ ہیں جن میں شاعر نے چبھتے ہوئے انداز میں طنز کیا ہے ؎

کروں کس کی خاطر میں سیر چمن — چمن میں وہ سرو رواں ہے کہاں
بس اے ہر بہاں ختم کر پرسشیں — بتا دے وہ نا مہرباں ہے کہاں

کم ہے خود حضرت صفی نے اپنے کلام میں اس کی طرف اشارے کیے ہیں ؎

کس بیرسی ہے خاک ہونے تک خاک ہوتے ہی کیمیا ہوں میں

صفی بھی کس قدر نادان ہے شاعر ہوا تو کیا اسے لوگوں سے جیتے جی امید قدردانی ہے

سیّد علی منظور

حیدرآباد کے ان چند نامور شاعروں میں سے تھے جس کا کلام ایک عرصہ سے ملک کے بلند پایہ ادبی رسالوں میں شائع ہوتا تھا۔ شاید ہی کوئی ایسا رسالہ ملے جس میں ان کی کوئی نظم یا غزل شائع نہ ہوتی ہو۔ ساقی، ہمایوں، ادبی دنیا، شاہکار، سب رس میں ان کلام اکثر چھپتا تھا۔ ان کی شاعرانہ عظمت اور کمال سخنوری کے سب قائل تھے ان کی شہرت سرزمین دکن تک محدود نہ تھی بلکہ ہندوستان و پاکستان کی ادبی دنیا میں ان کی شاعری کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ ۱۹ ستمبر ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دارالعلوم اورسٹی کالج اور حیدرآباد کی مشہور درسگاہ نظامیہ میں حاصل کی اپنے خالو علامہ شمسی سے فارسی اور عربی پڑھی۔ مدراس یونیورسٹی سے امتحان منشی فاضل میں کامیابی حاصل کی محکمۂ طبابت میں ۳۰ تا ۶۰ کی جائیداد پر تقرر ہوا اور ساری عمر ترقی گریڈ کلرک ہی رہ کر وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے وظیفہ کے دو ڈھائی سال بعد ۱۱ نومبر ۱۹۵۵ء میں ان کا انتقال ہوا۔ بچپن سے شاعری کا ذوق تھا۔ ان کا پہلا مجموعہ "کلام منظور" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ ادارۂ ادبیات اردو سے ان کے کلام کا دوسرا مجموعہ "نمود زندگی" اور ۱۹۵۶ء میں تیسرا مجموعہ "ترجمان زندگی" شائع ہوا۔

حضرت سید علی منظور ایک پختہ مشق اور پرگو شاعر تھے ان کی شاعری ان کے میلان طبع کی آئینہ دار ہے سادگی و پرکاری، محاکات اور جذبات نگاری ان کے کلام کی نمایاں خصوصیتیں ہیں۔ ان کا شمار اردو کے ان شاعروں میں ہوتا ہے جو زندگی کی ترجمانی کو شاعری کی اساس قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے اس معیار کو نہ صرف ہمیشہ پیش نظر رکھا بلکہ اس خصوص میں انفرادی شان پیدا کی۔ ان کی شاعری میں صداقت، خلوص، پاکبازی اور زندگی کی پرانی اور نئی قدروں کا صحت بخش امتزاج پایا جاتا ہے۔ وہ ایک گوشہ نشین اور قناعت پسند بزرگ تھے۔ وضع داری کا بڑا پاس تھا۔ ساری زندگی انتہائی عسرت اور تنگ دستی میں بسر ہوئی لیکن اس درویش خدامست نے کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کیا۔ خودداری اور عزت نفس کا اتنا احساس تھا کہ کبھی کسی صاحب ثروت کی محفل میں اصرار کے باوجود شرکت نہیں کی۔ ان کی ساری زندگی میر تقی میر کے اس شعر کی مصداق تھی ؎

اے تاج شہ نہ سر کو فرو لاؤں تیرے پاس
ہے میر معتقد سنداس کی کلاہ کا

جن لوگوں سے ان کو خلوص تھا ان کے ہاں ضرور جاتے اور اس قدر انکساری اور فروتنی سے ملتے کہ دوستوں کی گردن شرم سے جھک جاتی۔ دوستی کے پکے اور اپنی وضع کے ایک ہی انسان تھے۔ تقریباً ہر ہفتہ ان سے ملنے کا اتفاق ہوتا تھا لیکن کبھی وہ اپنی غریبی اور تنگ دستی کا اشارۃً بھی ذکر نہیں کرتے تھے۔ ان کی آمدنی ان کے خاندان کی گذر بسر کے لیے بالکل ناکافی تھی اور وظیفہ کے بعد تو اور بھی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن ان کے پائے توکل ... کو کبھی لغزش نہ ہوئی۔ ہماری زبان کا ایک ایسا شاعر افلاس میں پیدا ہوا، افلاس میں جیا اور افلاس ہی میں مر گیا ان کی نظموں کا سرمایہ غزلوں کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے۔ ان کا غیر مطبوعہ کلام ابھی اتنا ہے کہ ایک ضخیم مجموعہ مرتب ہو سکتا ہے۔ ان کی غزلوں کی بعض زمینیں خود ان ہی کی نکالی ہوئی ہیں یہ ان شاعروں میں سے نہیں تھے جو کسی مشہور شاعر کی غزلوں کو سامنے رکھ کر غزل لکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مختلف غزلوں کے چند اشعار بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں جس سے ان کے رنگ تغزل کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ؎

اب کیا گلہ کروں عدم التفات کا — میری نگاہ یاس نے سب کچھ جتا دیا
بڑھتے ہوئے شعور میں گم ہو رہا ہوں میں — احساس حسن آپ نے اتنا بڑھا دیا

یہ ہے مرے دل امیدوار کا عالم — فضا میں جیسے ہو لرزاں ستارۂ سحری
جہاں آ کر گلے ملتے ہیں دکھ سکھ — وہیں جا کر بھٹک جاتے ہیں راہی

مجھے دیکھ کر مسکرانے لگے — سنورنے سے جب ان کو فرصت ملی
ستاروں نے ہل چل مچا دی ادھر — ادھر مجھ کو دم بھر جو راحت ملی

انھوں نے اپنی ایک نظم "پاکیزہ کردار" میں اپنی طرز زندگی کا اس طرح نقشہ کھینچا ہے ؎

جو میری حقیقت سے ہیں بے خبر — وہ حیران ہیں میرے افلاس پر
مگر مجھ سے واقف ہیں بالغ نظر — میں بحر شرف کا ہوں روشن گہر
نہیں گرچہ کپڑے مرے زرق برق — مری شان میں پھر بھی آیا نہ فرق
شرافت کے جوہر ہیں تابندہ تر — ادب میرا کرتے ہیں سب خوش بسر

ایک دوسری نظم "مفقود موجود" کے چند بند یہ ہیں جن میں شاعر نے چبھتے ہوئے انداز میں طنز کیا ہے ؎

کروں کس کی خاطر میں سیر چمن — چمن میں وہ سرو رواں ہے کہاں
بس اے ہر بہاں ختم کر پرسشیں — بتا دے وہ نا مہرباں ہے کہاں

ثنا خوانِ ہندوستاں ہیں بہت — مہی خواہ ہندوستاں ہے کہاں
یہ رسمی ثنا خواں نہ آئیں ادھر — خلوص آفریں خوش بیاں ہے کہاں
شعورِ بہار و خزاں مٹ گیا — تمیزِ بہار و خزاں ہے کہاں
متاعِ دلِ شادماں لٹ گئی — نشاطِ دلِ کامراں ہے کہاں
عیاں ہے عنادِ دلِ حاضریں — خلوصِ دلِ رفتگاں ہے کہاں
کہاں خانخاناں کہاں مان سنگھ — وہ رسم و رہِ دوستاں ہے کہاں

حضرت منظور پرانے سانچوں میں ڈھلے ہوئے ہونے کے باوجود نئے تقاضوں سے بے خبر نہیں تھے بلکہ انھوں نے قدیم و جدید کے امتزاج کو بڑی خوبی سے نبھایا ہے ؎

زیبا ہے مجھے اپنا انداز سخن گوئی — پروا نہ کروں بالکل خوش ہو کر خفا کوئی
میں سر پہ جگہ دے کر ماضی کی بیاضوں کو — برتوں گا نئے ڈھب سے موجودہ تقاضوں کو
حاضر پہ بھلا کیوں کر غائب کا پڑے پرتو — فرسودہ تفکر سے شاداب ہو فکر نو ؟

عبدالقیوم خاں باقی

جامعہ عثمانیہ کے ہونہار سپوت تھے۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۰۶ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ جامعہ عثمانیہ سے فارسی ادب میں ایم اے کی ڈگری لی پھر دو سال تک ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۳۰ء میں سررشتہ تعلیمات میں مدرس ہو گئے۔ ۱۹۴۲ء میں شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کی جونیر لکچراری پر ان کا تقرر ہوا۔ دارالعلوم کالج، چادرگھاٹ کالج اور آخر میں نظام کالج میں اردو کے لکچرار کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ باقی صاحب کو طالب علمی کے زمانے ہی سے شعر و ادب، آرٹ اور موسیقی سے گہری دلچسپی تھی۔ ستار بہت اچھا بجاتے تھے اور فن مصوری میں کافی مہارت تھی۔ کئی انگریزی نظموں اور منظوم ڈراموں کا اردو نظم میں ترجمہ کیا بالخصوص جرمن زبان کے شاعر گوئٹے کے منظوم ڈراما "فاؤسٹ" کو اردو نظم میں منتقل کر کے اپنی قابلیت کا ثبوت دیا۔ ان کو شعر و ادب اور فنون لطیفہ سے فطری لگاؤ تھا۔ علمی و ادبی اور تنقیدی موضوعات پر کئی مضامین لکھے جو مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ رسالہ جامعہ دہلی میں ان کے نو مضامین شائع ہوئے تھے جن میں سے یوسف زلیخا، اقبال اور فانی بہت کامیاب اور دلچسپ ہیں۔

باقی صاحب حسن کارانہ دل و دماغ لے کر پیدا ہوئے تھے اس لیے وہ اکثر ادب اور شاعری کے جمالیاتی پہلو پر غور و فکر کرتے رہتے تھے، اور اس موضوع پر ان کے مضامین بھی شائع ہو چکے ہیں۔ پی ایچ ڈی کے لیے انھوں نے جو موضوع منتخب کیا وہ "اردو شاعری کا جمالیاتی مطالعہ" تھا۔ اس پر انھوں نے بہت کچھ تحقیقاتی کام کیا تھا اگر کچھ دن اور زندہ

رہتے تو اس مقالہ کی تکمیل ہوجاتی اور اردو ادب میں ایک اچھا اور مفید اضافہ ہوتا۔ باقی صاحب کا مطالعہ بہت وسیع تھا خاص کر انگریزی ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔ میرے خیال میں باقی صاحب نے اپنے ساتھیوں میں سب سے زیادہ مطالعہ کیا اور سب سے زیادہ لکھا لیکن یہ زمانہ کی ستم ظریفی ہے کہ ان کی ادبی تخلیقات زیور طبع سے آراستہ نہ ہوسکیں۔ ادب میں حسن کارانہ اظہار کے وہ بڑے حامی تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ادب برائے زندگی کے بھی وہ قائل تھے۔ ادب میں جمالیاتی پہلو کو نظر انداز کرنا انھیں گوارا نہ تھا۔ ادب میں زندگی کی قدروں کو حسن کارانہ انداز سے سمونے کی وہ ہمیشہ کوشش کرتے رہے۔ انھوں نے غزلیں بھی لکھیں اور نظمیں بھی لیکن غزلیں نسبتاً کم ہیں۔ غزل کی زبان، انداز بیان اور خیالات پرانی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے بھی جدت مضامین سے خالی نہیں۔ چھچھلے خیالات کو وہ اپنے خاص انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان اشعار کو سننے کے بعد آپ کو اس کا اندازہ ہوجائے گا ؎

گر دیکھنا ہے عشق کا آئین اضطراب — سینے میں اور درد محبت بڑھا کے دیکھ
اے حسن اب سکوں کا زمانہ نہیں رہا — تھوڑا سا کائنات کا پردہ اٹھا کے دیکھ

شکستہ سازمیں یہ سوز عشق کیا کہنے — ستارے چھوتے ہیں میرے گنگنانے سے
مری حیات میں باقی امید و یاس کہاں — مجھے ہے کام فقط قسمت آزمانے سے

مرحبا اے جذبۂ عشق آفریں صد مرحبا — حسن بن جاتی ہے دنیا جس طرف جاتا ہوں میں
میرا کھل جانا حقیقت میرا سمجھا جانا حیات — راز بن کے راز کے آداب سمجھاتا ہوں

باقی صاحب نے مختلف موضوعات پر نظمیں کہی ہیں۔ زندگی کا نفسیاتی تجزیہ، مشاہدات اور شعور کی پختگی ان کے کلام میں جگہ جگہ پائی جاتی ہے اور نشاط زندگی اور روحانیت کی جھلک جابجا دکھائی دیتی ہے۔ انسان میں تنہائی کے احساس کو وہ زوال انسانیت قرار دیتے ہیں علامہ اقبال کے فلسفۂ زندگی اور شعر و ادب میں ان کے بتائے ہوئے راستوں پر چلنے کی آخری دم تک کوشش کرتے رہے۔ ان کی ایک نظم ہے "ولی کا پیغام" اس کے چند بند یہ ہیں ؎

نیاز عشق کی ٹھوکر لگا نہ ماتھے کو — کہ تیری روح تڑپتی ہے غم اٹھانے کو
الٹ لباس کہ فرسودہ کاریاں ہیں بہت — نظر اٹھا کہ نئی پردہ داریاں ہیں بہت
تجھے شباب کا پروردگار بننا ہے — مری حیات کی اک یادگار بننا ہے

مقبرۂ رابعہ دورانی کہنے کو تو تاج محل کی نقل ہے لیکن بجائے خود حسن کارانہ تعمیر کا ایک حسین نمونہ ہے اس کے پرسکون ماحول میں شاعر کی زندگی کا ہر لمحہ جذبات و احساسات کی ایک دنیا لیے ہوئے آتا ہے اور شباب

شعر کا ایک نغمہ چھوڑتے ہوئے گذر جاتا ہے۔ باقی صاحب نے اس بقرہ پر جو نظم کہی ہے اس میں ایک سوال کیا ہے کہ مقبرہ حسین کیوں بنایا جاتا ہے کیا حسن و غم میں کوئی ربط باہمی ہے ؎

کس در سے چھڑنے لگا پھر ساز محبت — کس سمت سے آنے لگی آواز محبت
ہے درد کی دنیاؤں کا اک آئینہ خانہ — کس شان سے ہے جلوہ شاعم کا فسانہ
صورت گر بیداد اس انداز سے کی ہے — گویا غم جاں مطلع حسن ازلی ہے

باقی صاحب کچھ اور دن زندہ رہتے اور ان کی تخلیقات نظم و نثر کتابی صورت میں شائع ہو جاتیں تو ان کی شاعرانہ خوبیوں اور ادبی خدمات کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ وہ اس کام کو پورا نہ کر سکے اگر ان کی یادگار باقی رکھنی ہے تو ان کے رشتہ داروں اور ادبی اداروں کو اس طرف توجہ کرنی چاہیے ورنہ ایک ادیب و شاعر کا سرمایۂ حیات دستبرد زمانہ سے نہ بچ سکے گا۔

لطیف ساجد

میکش کے بعد حیدرآباد کے دوسرے جوانمرگ شاعر لطیف ساجد تھے۔ مجھے ان سے زیادہ ملنے کے مواقع نہیں مل سکے۔ جب وہ یونیورسٹی میں داخل ہوئے تو میں یونیورسٹی چھوڑ چکا تھا۔ جب یہ سٹی کالج میں پڑھتے تھے تو اس وقت مخدوم محی الدین وہاں بحیثیت استاد کام کرتے تھے۔ مخدوم کی شخصیت و شاعری سے سٹی کالج کے طلبا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چونکہ لطیف ساجد کی فطرت میں شاعرانہ صلاحیتیں موجود تھیں اس لیے مخدوم کے مشوروں نے ان کے پروان چڑھانے میں بہت مدد کی۔ یہی زمانہ ان کی شاعری کے آغاز کا ہے۔ پروفیسر ابوالنظر عبدالواحد جو علم عروض میں بدطولیٰ رکھتے ہیں اس نوخیز شاعر کی استادانہ رہنمائی فرمائی اور لطیف ساجد کالج کے ایک مقبول شاعر بن گئے۔ اسی زمانہ میں انھوں نے ایک نظم "نوجوان بیوہ" لکھی اس کے بعد ان کی نظمیں اور غزلیں مختلف رسالوں میں شائع ہونے لگیں۔ اعلیٰ تعلیم کے حاصل کرنے میں معاشی زبوں حالی کی وجہ سے طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر یہ باہمت نوجوان دیوانہ وار شمع علم کا پروانہ بنا۔ انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد جامعہ عثمانیہ میں شریک ہو کر بی۔ اے کی ڈگری لی۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد انھوں نے کچھ دنوں اخبار کے دفتروں میں کام کیا لیکن انھیں اتنا معاوضہ نہیں ملتا تھا کہ فراغت سے زندگی بسر ہو سکے۔ اس کے بعد اورنگ آباد کے ریڈیو اسٹیشن میں انھیں ملازمت مل گئی۔ جہاں ذہنی سکون کے ساتھ ساتھ تھوڑی بہت معاشی خوش حالی نصیب ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد مارکٹنگ آفس میں بحیثیت مہتمم امور ہوئے اور انتقال کے وقت تک اسی خدمت پر رہے۔ لطیف ساجد نے اپنی معاشی پریشانیوں کو بھلانے کے لیے مے نوشی کا سہارا لیا۔ لیکن یہ سہارا ان کی موت کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ ان کو ایک ایسی سخت بیماری ہو گئی تھی جس سے وہ جانبر نہ

ہو سکے۔ بیماری کے آخری دنوں میں ان کو دواخانہ میں شریک کر دیا گیا تھا۔ علاج معالجہ کے باوجود ان کا مرض بڑھتا گیا ان کا جسم سرتاپا ایک آبلہ بن گیا تھا۔ بالآخر ۲۰ فروری ۱۹۵۵ء کو ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

لطیف ساجد کی شاعری میں وقت کے ساتھ ساتھ نکھار پیدا ہوتا گیا۔ ان کی اکثر نظموں اور غزلوں میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کا اظہار ہے۔ چونکہ وہ ایک حساس دل رکھتے تھے اس لیے زندگی کا معمولی سے معمولی حادثہ ان کے خیالات و احساسات میں ایک ہیجان برپا کر دیتا تھا ان کی شاعری میں دردناک صداؤں اور مصیبت زدہ انسانوں کی آہ و بکا سنائی دیتی ہے ان کا ایک خاص انداز فکر تھا اور انھوں نے عام روش سے ہٹ کر ایک الگ راستہ پیدا کر لیا تھا۔ لطیف ساجد کے ابتدائی کلام کو دیکھنے سے ان کے غور و فکر کے ارتقاء کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی ایک نظم "زوال و عروج" میں سرمایہ داری پر اس طرح طنز کرتے ہیں ؎

طمطراق زر سے ہے افلاس سرگرم ستیز — خرمن مفلس یہ منڈلاتی ہے برق شعلہ ریز
فرق ایواں پر نظر آتا ہے تاج بے کسی — زر پرستوں کی اجل پر ہنس رہی ہے زندگی

لطیف ساجد نے اپنی ایک اور نظم "نور و ظلمت" میں یہ بات ظاہر کی ہے کہ انسانیت ابھی پابزنجیر ہے آزادی کا تصور خوش خیالی سے بڑھ کر نہیں۔ وہی کہنہ رسم و قیود باقی ہیں البتہ ان کی شکلیں بدلی ہوئی ہیں ؎

چمن چمن روش برق خود سری ہے وہی — زبان گل پہ ابھی مہر خامشی ہے وہی
ادائے صبر وہی طرز رہزنی ہے وہی — نئے لباس میں آئین بندگی ہے وہی
اٹھو کہ اذن تبسم نہیں ملا دل کو — بڑھو کہ حسرت طوفاں نہیں ہے ساحل کو
وہ سرخوشی جسے آزاد جام ہونا ہے — وہ نغمگی جسے دنیا میں عام ہونا ہے
وہ روشنی جسے انساں مقام ہونا ہے — وہ زندگی جسے ماہ تمام ہونا ہے
بہار گل میں نہیں کیف ارغنوں میں نہیں — خروش جہد مسلسل میں ہے سکوں میں نہیں

ساجد کی اکثر نظموں میں ایک ایسے نوجوان کی آرزو تڑپتی ہوئی دکھائی دیتی ہے جو کبھی سرکشی پر آمادہ ہے اور کبھی زندگی کی تلخ حقیقتوں سے دل شکستہ ؎

معلوم نہیں کس نے سنایا تھا یہ پیغام — جینا ہے تو تسکین تمنا کا نہ لے نام
ساجد وہ سکوں بخشئ طوفاں کی کہانی — مدت سے ہے تلخی کش بے مہریٔ ایام

ساجد نے زمانے کی بے مہریوں اور طوفان حوادث سے کبھی راہ فرار اختیار نہ کی بلکہ مایوسی میں بھی انھیں امید کی کرن دکھائی دیتی تھی اور وہ آگے بڑھتے ہی گئے ؎

ہر تمنا مضمحل ہر آرزو ناکام تھی — زندگی میری شکار گردش ایام تھی

آج لیکن ہنستیں لے کر طرب کے زمزمے — اک کرن امید کی پھوٹی جبین یاس سے
اب مری محفل میں غم آنکھیں دکھا سکتا نہیں — میری نظروں سے کوئی نظریں ملا سکتا نہیں

لطیف ساجد کی شاعری نے پندرہ سال کی قلیل مدت میں ارتقار کی کئی منزلیں طے کر لی تھیں۔ ان کی بے وقت موت نے ایک ابھرتے ہوئے شاعر سے اردو زبان و ادب کو محروم کر دیا۔

مرزا عصمت اللہ بیگ

عصمت حیدرآباد کے ایک صاحب طرز انشا پرداز اور ظرافت نگار شاعر تھے وہ ہمیشہ نثر و نظم میں کچھ نہ کچھ کہتے رہتے تھے۔ ان کے مضامین رسالوں اور اخباروں میں شائع ہوتے تھے۔ شعر و سخن کی محفلوں میں وہ اپنے ظریفانہ کلام سے اہل محفل کو خوب ہنساتے تھے۔

پیدائش کے لحاظ سے دلی ان کا وطن ہے لیکن ۱۱ سال کی عمر میں حیدرآباد آگئے یہیں تعلیم پائی اور میٹرک پاس کرنے کے بعد محکمۂ تعلیمات میں ملازم ہو گئے۔ سر راس مسعود ناظم تعلیمات کے زمانہ میں بلاک سازی کی ٹریننگ کے لیے کلکتہ بھیجے گئے۔ اور واپسی پر دارالطبع جامعہ عثمانیہ میں بلاک سازی کے شعبہ میں تقرر ہوا اور ۱۹۵۲ء میں وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ ۱۹۴۲ء میں ایک ماہوار رسالہ "جیت" فوجیوں کی دلچسپی کے لیے نکالنا شروع کیا جو چار سال تک جاری رہا۔ آخری زمانہ میں ایک ہفتہ وار "تماشا" نکالتے تھے۔ ۲۸ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو انتقال ہوا۔ ان کی بعض تصانیف یہ ہیں:-

زرین حکایات۔ ہمارا ہندوستان منوسانی کی کتاب OUR INDA کا ترجمہ، رفیق اردو داں۔ کاک ٹیل (مزاحیہ نظموں کا مجموعہ)۔

ان کے انتقال کے بعد ان کے فرزند جناب فکر حیدرآبادی کی کوششوں سے "عصمت میموریل پبلیکیشن کمیٹی" قائم کی گئی جس کی طرف سے "یوم عصمت" ہر سال منایا جاتا ہے۔ اس کی طرف سے عصمت مرحوم کے ظریفانہ کلام کا مجموعہ "انوار تبسم" حال ہی میں شائع ہوا ہے جس کا پیش لفظ اور دیباچہ سابق چیف منسٹر ڈاکٹر بی رام کشن راؤ اور سابق وزیر تعلیم شری گوپال راؤ اکبوٹے نے تحریر فرمایا ہے۔ شری پی نہنت راؤ سابق نائب وزیر مال نے بحیثیت صدر کمیٹی اس کتاب پر عرض حال لکھا ہے۔

عصمت مرحوم نہایت منکسر المزاج اور شریف الطبع انسان تھے۔ سرکاری مصروفیتوں کے بعد جو بھی وقت ملتا تھا علمی و ادبی کاموں میں صرف کرتے تھے۔ چونکہ طبیعت میں ظرافت و مزاح کا عنصر غالب تھا اس لیے ان کے مضامین اور نظموں میں ظریفانہ رنگ ہر جگہ دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے اپنے زمانے کی سماجی اور قومی کمزوری پر بڑے اچھے

انداز میں طنز کیا ہے۔ ان کی زندہ دلی اور بذلہ سنجی کے عکس ان کی شاعری میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ ہنسی ہنسی میں بڑے پتے کی باتیں کہہ جاتے ہیں اور سننے والوں کے دلوں پر ان کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ "انوار تبسم" سے ان کے چند اشعار نمونہ کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں ؎

بنگلوں پہ وزیروں کے لگاتے رہو چکر ـــــ گردش میں رہو صورت پرکار ہمیشہ
نوٹوں کو رکھو سامنے پھر دیکھو تماشا ـــــ جاتا ہے اُدھر ووٹ کہ آتا ہے اِدھر ووٹ
اس کان سنو بات کو اس کان اڑا دو ـــــ یہ کام کی ہے بات اِدھر آئے اُدھر جائے
عجیب طرح سے یاروں نے ہند کو بانٹا ـــــ کہیں کمیں نہ رہے اور کہیں مکاں نہ رہے
واعظ کی گل افشانی کا بس یہ ہے خلاصہ ـــــ سو بار چنانچہ ہے تو سو بار وغیرہ
عصمت کو نہیں ملتا کبھی لفظ جو موزوں ـــــ لے آتا ہے اشعار میں بیکار وغیرہ

عصمت مرحوم کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے میں پرنسپل سجاد مرزا صاحب سابق معتمد تعلیمات کا بہت بڑا حصہ ہے یوں تو صاحب موصوف جس کسی میں جوہر قابل دیکھتے ہیں اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ لیکن عصمت مرحوم پر ان کی خاص نظر عنایت تھی اور ہمیشہ علمی و ادبی کاموں میں اپنے مفید مشوروں اور مالی امداد سے ان کا دل بڑھاتے رہتے تھے۔ چنانچہ عصمت مرحوم نے ان کی قدر افزائیوں کا اس طرح اعتراف کیا ہے ؎

قدر افزائی کچھ ایسی کی ہے اہل علم کی ـــــ ذرہ سے سورج بنے قطرہ سے دریا ہو گئے

اس مضمون میں حیدرآباد کے چند مرحوم شاعروں پر سرسری طور پر لکھا گیا ہے۔ اگر موقع اور فرصت ملے تو اس موضوع پر ایک سیر حاصل تذکرہ تحریر کرنے کا ارادہ ہے۔ (اردو مجلس میں پڑھا گیا)

بقیہ

دیہاتی رقص

ناچنے والے گوالے اور گوپیاں ہندوستان کے ہر گوشے میں نظر آتی ہیں۔

ان کے علاوہ بھی اور کئی قسم کے رقص ہیں جن سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے کسانوں کے تہواروں اور میلوں میں شرکت کرنی چاہیئے۔ جہاں آرٹ اپنی تمام سادگیوں کے ساتھ نظر آتا ہے۔ اس وقت ان کی وجدانی کیفیت دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ دنیا میں نہ کوئی فکر ہے نہ غم، نہ رنج ہے نہ مصیبت، نہ کوئی چھوٹا ہے نہ بڑا، نہ راجا ہے نہ پرجا۔

احمد سکی

دیہاتی رقص

ہندوستان کی قدیم اور پرانی معاشرت اور سادہ زندگی کے اصل نمونے دیکھنے ہوں تو ذرا دیہات کی سیر کیجیے۔ جہاں قدم قدم پر آپ کو سکون و راحت اور مسرت و شادمانی کے سوتے ابلتے دکھائی دیں گے۔ دیہات کا محنت کش مزدور اور کسان پھونس کی ٹوٹی پھوٹی تاریک اور دھوئیں سے اٹی ہوئی جھونپڑی میں رہتا ہے۔ گرمی ہو یا سردی پھٹے پرانے چیتھڑوں میں زندگی گذارتا ہے پھر بھی اس کی پیشانی پر شکن نہیں پڑتی۔ بچے دھول خاک میں کھیلتے اور مٹی کے گھروندے بنانے میں مگن رہتے ہیں۔ اور ہمارے یہ "ان داتا" لہو پسینہ ایک کر کے ہماری روزی کا سامان فراہم کرتے ہیں، خود تکلیفیں برداشت کر کے ہمیشہ راحت پہنچانے میں منہمک رہتے ہیں۔ غریبی ان کے حسن کو مٹی میں ملا دیتی ہے۔ شدید محنت وقت سے پہلے ان کی کمر دوہری کر دیتی ہے اس کے باوجود یہ "دھرتی کے لال" بھگوان اور خدا پر اعتقاد راسخ رکھتے ہیں۔ اور اپنے دکھوں اور تکلیفوں کو ہنستے کھیلتے جھیل جاتے ہیں۔

جس وقت ہمارے شہری "بلاکشان محبت" کوئے یار کی جانب روانہ ہوتے ہیں اس سے بہت پہلے یہ سرشار ان محنت اپنے گھروں سے کل کر کندھوں پر ہل رکھے بیلوں کو ہانکتے اور گنگناتے ہوئے کھیتوں کا رخ کرتے ہیں۔ چل چلاتی دھوپ میں جب دھرتی کا سینہ چیرتے ہیں اس وقت بھی چہرے پر شگفتگی اور لبوں پر نغمہ ہوتا ہے اور جب تمام دن کی عرق ریزی کے بعد شام کو تھکے ماندے گھر کی جانب لوٹتے ہیں اس وقت بھی ان کے ہونٹوں پر ترنم کی لہریں ہوتی ہیں گویا وہ زندگی کی تمام تلخیوں کو نغمہ و تبسم کی شیرینی میں گھول لینے کے عادی بن چکے ہیں۔ یوں تو ان کی روزمرہ زندگی ہی تبسم ریز اور نغمہ بکنار ہوتی ہے لیکن میلوں اور تہواروں کے موقعوں پر تو جیسے دلی جوش و مسرت کے سوتے رقص و موسیقی کی مدھر جھنکار کے ساتھ پھوٹ پڑتے ہیں۔ ہولی، دیوالی، پونم، ناگ پنچمی، بسنت پنچمی، شیوراتری، جنم اشٹمی اور دسہرہ کے موقع پر تو ان کی مسرتوں اور شادمانیوں کی کوئی حد ہی نہیں رہتی۔

جس طرح ان کی زندگی سیدھی سادی ہوتی ہے اسی طرح ان کے رقص و نغمات میں بھی بہت سادگی ہوتی ہے ہندوستان ایک وسیع و عریض ملک ہے جس کے ہر صوبہ کی چند مخصوص روایات اور امتیازات ہیں۔ ان امتیازات کی جھلکیاں ہیں تہذیب و معاشرت اور رسوم و عقائد میں بھی نظر آتی ہیں۔ چنانچہ دیہاتوں میں بھی اسی قسم کی امتیازی

خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

گاؤں والوں کے گیت اور رقص سیدھے سادے اور دل پر اثر کرنے والے ہوتے ہیں حتیٰ کہ بھیل سنتھال اور ناگا قبائل بھی اپنے مخصوص گیتوں اور ناچوں کا قابل قدر ذخیرہ رکھتے ہیں۔ دیہاتی باوجود ان پڑھ ہونے کے اپنے خاص قسم کی نغمہ سرائی اور رقص فرمائی سے ماحول کو وجد آگیں بنا دیتے ہیں۔ ان کے گیتوں کی دھنیں پر کیف اور رقص کا انداز مدہوش کن ہوتا ہے۔ ان کے آرٹ کو آپ کسی کسوٹی پر بھی پرکھیں اگر آپ واقعی خود فنکار ہیں، آپ کو آرٹ سے حقیقی دلچسپی ہے اور آپ میں ذوق لطیف کی کمی نہیں ہے تو یقیناً ان دیہاتی گیتوں کو سن کر اور رقص کی دل فریب سحر کن دیکھ کر آپ کسی دوسری ہی دنیا میں پہنچ جائیں گے۔ اور آپ کا دل بھی اس آرٹ سے محبت کرنے لگے گا۔ اودے شنکر کو آج فن رقص میں بین الاقوامی شہرت اور مقبولیت حاصل ہے لیکن شاید آپ کو یہ معلوم نہ ہوگا کہ اس عظیم فن کار نے اپنی کم سنی میں ایک دیہاتی چمار کا رقص دیکھا تھا اور اسی سے اتنا متاثر ہوا کہ اسے رقص سے محبت ہوگئی۔

اس مختصر مضمون میں ہندوستان کے مختلف گوشوں کے دیہاتی ناچوں کی تفصیل بیان کرنا مشکل ہے۔ اس لیے میں قارئین کے لیے ایک اجمالی جھلک پیش کرتا ہوں۔

راجستھانی رقص | اگر کبھی بارش کی قلت ہوجائے تو اندر دیوتا کو منانے کے لیے بڑے عجیب اور انوکھے ناچ پیش کیے جاتے ہیں۔ میواڑ کے دیہاتوں میں لڑکیاں ناچتی گاتی ہوئی پاس پڑوس کے گاؤں میں جاتی ہیں اور وہاں سے سب سے اچھی بھینس لاکر کالی دیوی کی بھینٹ چڑھاتی ہیں تاکہ وہ خوش ہوکر بارش کا حکم دیدے بعض اوقات اگر کچھ دور پر بارش ہو تو بھیل لوگ بھاگے بھاگے وہاں جاتے ہیں اور بارش میں کودتے اچھلتے آہستہ آہستہ اپنے کھیتوں کی طرف رخ کرتے ہیں تاکہ اندر دیوتا کو اس جانب لبھا کر لے جائیں۔ اندر دیوتا کے استقبال کے لیے ایک آراستہ پالکی بھی تیار رکھی جاتی ہے۔

جنوبی ہند کا ناچ | جنوبی ہندوستان کے دیہاتوں کا بھی "رقص باراں" بہت مشہور ہے۔ رقص کرنے سے ایک دن پہلے رقاص برت رکھ کر پوجا پاٹ کرتے ہیں۔ رقص کے دن بھی صبح سویرے سے بیدار ہوکر غسل کرتے اور پوجا پاٹ شروع کردی جاتی ہے اس کے بعد بڑا پجاری نقارہ پر چوٹ مار کر رقص کے آغاز کا اعلان کرتا ہے۔ آہستہ آہستہ دھنیں گونجتی اور رقص کی تھرکنیں بڑھتی جاتی ہیں۔ پھر نقارہ سے نکلنے والی پرزور آواز کے ساتھ رقاص چاروں طرف چکر لگا کر رقص کرتے ہیں۔ خاص رقاص ہاتھ میں تلوار لے کر اسے ادھر ادھر گھماتا اور چمکاتا ہے اور آخر میں ایک کیلے کے دو ٹکڑے کرکے اندر دیوتا کے بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ پھر جوش و خروش

کے ساتھ تلوار گھما کر مدرائیں لیتا ہے، اور آہستہ آہستہ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر بارش کے لیے دعا کرتا ہے۔

آسامی رقص | آسام میں مینڈکی کی شادی بڑی دھوم دھام سے کی جاتی ہے۔ وہاں کے رہنے والوں کا خیال ہے کہ مینڈک اندر دیوتا کے چہیتے ہیں اس لیے ان کی شادی سے دیوتا خوش ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے برخلاف آسام ہی کے بعض علاقوں میں مینڈکوں کو طرح طرح کی اذیتیں دے کر رقص کیا جاتا ہے۔ تاکہ دیوتا اپنے "بھگتوں" کی نجات کے لیے برس پڑیں۔

بنگالی رقص | بنگال کے بعض دیہی علاقوں میں عورتوں کے ذریعہ ایک عجیب قسم کا رقص پیش کیا جاتا ہے جسے دیکھنے کے لیے نوجوانوں کو بڑی صعوبتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ رات کی تاریکی چھا جانے کے بعد عورتیں اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی اندر دیوتا کی مورتیاں ڈھولک اور منجیروں کے ساتھ گاتی ناچتی کسی سنسان مقام کی طرف نکل جاتی ہیں۔ جیسے جیسے چاند اونچا ہوتا ہے ویسے ویسے وہ اپنی چولیاں اور لہنگے اتارتی ہوئی رقص و لغو میں مست ہو جاتی ہیں۔ ان کے گیت بھی عریاں اور بے حجابانہ ہوتے ہیں۔ اگر اندر دیوتا اس ناچ سے خوش ہو جائیں اور پانی برسنے لگے تو ان کی مورتی کا بڑے جوش و خروش اور دھوم دھام سے جلوس نکالا جاتا ہے۔

اس قسم کے رقص بعض بیرونی ممالک میں بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً سائبیریا میں ایک عورت صرف پتوں کا لباس پہن کر ناچتی گاتی سڑک پر نکلتی ہے۔ لوگ اپنے گھروں سے اس کے اوپر پانی کی بوچھار کرتے ہیں۔

آج اس ترقی پسند دور میں ہم ان توہمات کا مذاق اڑاتے ہیں، لیکن وہ لوگ بڑی خوش عقیدگی کے ساتھ یہ رسوم ادا کرتے ہیں اتفاق سے انھیں اکثر کامیابی بھی حاصل ہو جاتی ہے۔

بھیل ناچ | بھیلوں کا سب سے مشہور ناچ "گوری" ہے جس میں شیوجی کی زندگی کی عکاسی کی جاتی ہے جو شخص شیو کا رول ادا کرتا ہے اسے "رائے بوریا" کہتے ہیں وہ چہرے پر ڈراونی نقاب ڈال کر اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ رقص کرتا ہے جو زنانہ لباس میں اوما اور پاروتی کا پارٹ ادا کرتے ہیں۔ اس کے ساتھی رقاص ایک قسم کا انگرکھا پہنتے ہیں جسے "جگا" کہتے ہیں۔ رقص گاہ کے عین وسط میں ترشول گاڑ دیا جاتا ہے اور رقص شروع ہو جاتا ہے۔ اس رقص کے ذریعہ نیکی بدی اور صدق و کذب کے فرق کو بڑے موثر اور دلآویز انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔

سنتھال رقص | سنتھالوں کے ساتھ ان کی عورتیں بھی رقص کرتی ہیں۔ ایک بڑا سا ڈھول گلے میں لٹکا کر ایک شخص اونچی سی جگہ پر کھڑا ہو جاتا ہے اور تال دینا شروع کرتا ہے اس کی تال پر عورتیں

اور مرد لہراتے ہوئے پودوں کی طرح ہاتھوں سے تالیاں اور پیروں کی ہلکی تھاپ کے ساتھ آگے پیچھے ہوتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہوا بانسری کی دل فریب آواز میں گاتی ہوئی بہہ رہی ہے پھر تھوڑے تھوڑے وقفہ سے دوسرے لوگ بھی اس میں شریک ہو جاتے ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے جیسے یہ رقص کبھی ختم ہی نہیں ہوگا۔ اس رقص میں سیکڑوں سنتھال پیروں کی تھپک اور دلآویز لے پر جھومتے ہوئے ایسے مست و بے خود ہو جاتے ہیں کہ انھیں نہ اپنا ہوش باقی رہتا ہے نہ فکر ماسوا۔ کبھی کبھی عورتیں اور مرد اپنی جداگانہ قطاریں بنا کر ایک دوسرے کی کمر تھامے رقص کرتے ہیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے رقص کے حسن اور دل کشی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

گونڈ ناچ | گونڈوں کا بھی اسی قسم کا ایک رقص ہے جسے کرم" ناچ کہتے ہیں اس میں محبت اور کائنات کی جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں۔ ڈھول بجانے والا گتوں کو تبدیل کرتا جاتا ہے تاکہ ناچنے والوں کو پیروں کی رفتار کم زیادہ کرنے کا موقع مل سکے۔ یہ رقص اس قدر دل کش ہوتا ہے کہ ناچنے والوں کے ساتھ تماشائیوں پر بھی وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

ناگا رقص | ناگا قبائل اپنے رقص میں تلوار اور بھالے استعمال کر کے اپنی جنگجویانہ ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان کا لباس رنگ برنگا، کانچ کے موتیوں سے پٹا اور پروں سے سجا ہوتا ہے۔ یہ لوگ سروں پر جانوروں کے سینگ بھی لگا لیتے ہیں۔

لیکن مذہبی، تاریخی، اخلاقی اور مزاحیہ قصوں کو ناچ گا کر بیان کرنے کا رواج تقریباً پورے ہندوستان میں ہے۔ اور شمال سے زیادہ دکن میں اس قسم کے رقص کچھ زیادہ دل کش و دلآویز انداز میں پیش کیے جاتے ہیں۔

آسام میں نوجوان لڑکے اس قسم کی کہانیاں بڑی خوبی سے پیش کرتے ہیں۔ دکھنی اڑیسہ میں "درسوکئی" نامی رقص بہت مقبول ہے۔ مالابار میں ایسے رقاص کو "تھولال" کہتے ہیں جو بہت قلیل معاوضہ پر سرِ راہ رقص دکھانے لگتا ہے۔

یہ "تھولال" رامائن، مہابھارت یا پران کے قصوں کو سناتا ہے۔ اگر آپ اس کی زبان سے واقف نہیں تب بھی اس کی حرکات و سکنات، شیریں آواز اور دلکش انداز رقص آپ کی تفریح کا سامان فراہم کر سکتا ہے۔ بھوپال کے گونڈ پیروں میں گھونگھرو باندھ کر اور کنگھری بجا کر بھوپال کی تاریخ بیان کرتے ہیں جو رانی کملاپتی سے شروع ہو کر آخری مرازی خیل فرمانروا نواب حمید اللہ خاں پر ختم ہوتی ہے اس کہانی میں ٹیپ کا مصرعہ یہ ہوتا ہے کہ:-

"لڑیں گے بھڑیں گے پر رہیں گے بھوپال میں"

دیہاتوں میں بھی رقص کی سب سے مقبول قسم کرشن کنھیا کا رقص ہے۔ کرشن کی سریلی بنسری کی لے پر مست ہو کر

(بقیہ صفحہ ۹۹ پر)

اثر لکھنوی

آئی بہار تو بھی سا غر کشاں چلا آ
گل میں ہے جوش بادہ تا گلستاں چلا آ

دیتی ہے کام اب تک میری زباں چلا آ
کیا کیا ہیں آرزوئیں کر دوں بیاں چلا آ

اس بے قرار دل کو یکساں ہے یہ بھی وہ بھی
نا مہرباں چلا آ۔ یا مہرباں چلا آ

خود دیکھ لے کہ دل میں تیرے سوا کوئی ہے
دم بھر کے واسطے ہی او بدگماں چلا آ

پُر کیف ہیں فضائیں سرشار ہیں ہوائیں
رعنائیاں بڑھا تا اے کام جاں چلا آ

ایسی حیا اگر ہے تیری حیا کے صدقے
بکھرائے رخ پہ زلفِ عنبر فشاں چلا آ

تاریکیوں میں گھر کر کب سے بھٹک رہا ہوں
اے نورِ صبح گاہی پھر ناگہاں چلا آ

دیکھو جدھر کھلی ہے دکّان خود فروشی
کیا ہے مآلِ ہستی دینے نشاں چلا آ

ورد زباں رہے گا پیہم اثرؔ کا مصرع
"آئی بہار تو بھی سا غر کشاں چلا آ"

پرویز شاہدی

بٹیں گے دل سے معرکۂ رہ گذر کے بعد
لیں گے سفر کا جائزہ ختمِ سفر کے بعد

اٹھنے کو ان کی بزم میں سب کی نظر اٹھی
اتنا مگر کہوں گا کہ میری نظر کے بعد

سب زور ہو رہا ہے مری سرکشی پہ صرف
کیا ہوگا حالِ دار و رسن میرے سر کے بعد

اچھا نہ تھا تو اتنا برا کب تھا حالِ دل
درد اور بڑھ گیا کرمِ چارہ گر کے بعد

کوئے ستم سے گذریں تو شوریدگانِ عشق
ہنسنے لگیں گے زخمِ جگر زخمِ سر کے بعد

مضبوطیٔ قفس پہ تھا صیاد لاف زن
چپ لگ گئی معائنۂ بال و پر کے بعد

برقِ ستم کی نذر کروں بھی تو کیا کروں؟
اب کیا بچا ہے آگ لگانے کو گھر کے بعد

زنداں سے نکلیں بھی تو کہاں جائیں گے اسیر
دیوار سی کھڑی نظر آتی ہے در کے بعد

بے خواب کر رہے ہیں شبِ غم کے مرحلے
آنکھیں جھپک نہ جائیں طلوعِ سحر کے بعد

ہوگا طویل اور بھی افسانۂ وفا
اہلِ جفا کے طنطنۂ مختصر کے بعد

پرویز کا کلام ہے جانِ جنونِ شوق
کیا ہوگا اس کی وحشت دیوانہ گر کے بعد

منظر شہاب

طلب کی شرط لگا دی تھی مدعا نہ ملا
ہزار شکر مجھے دستِ التجا نہ ملا

غمِ جراحتِ یاراں نہیں مگر افسوس
سلیقہ مند کوئی نشترِ آزما نہ ملا

بہ وقتِ رشک بھی آدابِ دلدہی کا لحاظ
مجھے رقیب سا باوضع خوش جفا نہ ملا

میں خود ادا ہی سہی، زعمِ حسن تو ٹوٹا
بلا سے عاشقِ صادق کا مرتبہ نہ ملا

یہ اختلافِ معانی، یہ نو بہ نو تفسیر
حدیثِ زیست کا ہم رنگ ماجرا نہ ملا

شہابؔ سرحدِ عقیدت میں لوگ کہتے ہیں
کہ ترے بعد بھی تجھ سا غزل سرا نہ ملا

مظہر امام

جو راز کہ خود ہی ظاہر ہو، اس راز کو افشا کیوں کیجئے
خاموشیٔ لب ہی کافی ہے، فریاد کو رسوا کیوں کیجئے

جب تیری تمنا چھوڑ کے بھی جینے کے سہارے اور ملیں
اے جذبِ محبت! تو ہی بتا، تیری ہی تمنا کیوں کیجئے

کچھ صاف بھی ان سے کہہ نہ سکے اور بات بھی دل کی کہہ ڈالی
جو بات ادھوری ہی اچھی، اس بات کو پورا کیوں کیجئے

فرقت کی سلگتی راتوں میں یادوں کے کنول ہی جلتے ہیں
شبنم کی سی ٹھنڈک ہو جس میں، اس آگ کو ٹھنڈا کیوں کیجئے

اے گردشِ دوراں! تجھ سے تو ہم آنکھ مچولی کھیل چکے
اک اوٹ ہے زلفِ جاناں کی اس سے بھی کنارا کیوں کیجئے

زخموں ہی سے تازہ ہیں اے دل اک زخم خائی کی یادیں
جو ٹیس بھی ہے وہ رنگیں ہے ان رنگوں کو پھیکا کیوں کیجئے

ہلکا سا تبسم ہی ان کا، کیا ہوگا محبت کا بدلہ؟
جب دل کی یہ قیمت ہو نقصان کا سودا کیوں کیجئے

یہ راہِ ترقی ہے اے دل! منزل سے پرے بھی ہے منزل
ہے طولِ سفر ہی رازِ سفر، منزل کی تمنا کیوں کیجئے

توصیفِ لب و رخسار اے مظہرؔ! آزاد ہے اب زنجیروں سے
خود حسن کے جلوے بکھرے ہیں، الفاظ کو پیرایا کیوں کیجئے

اظہر سعید

بس ایک جذبۂ غم تھا سو وہ بھی کم دیکھا
یہ مرحلہ بھی سرِ منزلِ الم دیکھا

اجل بھی تھی تو مداوائے دردِ زیست مگر
دلِ خراب نے جینے ہی میں بھرم دیکھا

وہ روشنی ہمیں جس کے لیے سحر تھی عزیز
سحر ہوئی تو اسی روشنی کو کم دیکھا

کیا جو غورِ دلِ وکائنات دل پہ کبھی
تو ہر خیال تری آرزو میں ضم دیکھا

خوشا وہ شاہدِ نازآفریں کہ جس کے لیے
دل و دماغ کو وابستہ و بہم دیکھا

اب اپنے دیدۂ پرنم کو لے کے جائیں کہاں
کہ آج انھیں بھی بہت دادخواہِ غم دیکھا

بلائے جاں تھا تغافل پہ جی تو لیتے تھے
بلا ہے جاں ہمیں جب سے ترا کرم دیکھا

نوید اہلِ معانی کہ آج اظہر کو
تمام خوں شدۂ کاغذ و قلم دیکھا

بشر نواز

تڑپے ہیں ہم بھی درد کے ماروں کے ساتھ ساتھ
جاگا کیے ہیں راتوں کو تاروں کے ساتھ ساتھ

ہر پھول عکسِ عارضِ گل فام بن گیا
آئی تمھاری یاد بہاروں کے ساتھ ساتھ

ٹھکرائیں کس کو، کس کو گلے سے لگائیں ہم
طوفاں بھی مل رہے ہیں کناروں کے ساتھ ساتھ

ہم جانتے ہیں قیمتِ خورشیدِ صبحِ نو
ہم نے بھی دل جلائے ہیں تاروں کے ساتھ ساتھ

ہر چیز جاوداں ہے بہار و خزاں ہی کیا
نظریں اگر نہ بدلیں نظاروں کے ساتھ ساتھ

کل رات دل پہ ایک قیامت گذر گئی
بھڑکے شرارِ غم بھی ستاروں کے ساتھ ساتھ

باقر مہدی

رُباعیات

کچھ دیر بھی ہم ساتھ نہیں رہ سکتے
افسوس کہ اک بات نہیں کہہ سکتے
کہتے ہیں کہ جیتے ہیں محبّت کے لیے
الزام محبّت کا نہیں سہہ سکتے

مانا کہ ہر اک طرح کے حائل غم ہیں!
آجاؤ کہ پھر بزم میں تنہا ہم ہیں!
ملتے ہیں کہاں ایسے محبّت والے؟
اس دور میں دیوانے بہت ہی کم ہیں!

اک خواب کی مل سکتی ہے اب بھی تعبیر
ہاں عشق کے ہاتھوں ہی بنے گی تقدیر
مجبوری کی تہمت نہ لگاؤ دل پر
خود پہنی ہے تم نے یہ سنہری زنجیر

کیوں قہرِ خداوندِ مجازی سے ڈرو؟
آزاد رہو بندہ نوازی سے ڈرو!
محمود کی الفت کا زمانہ یہ نہیں
ڈرنا ہے تو پھر رسم ایازی سے ڈرو!

سو طرح کے صدموں سے گذرنا کیسا
جینا ہے تو گھٹ گھٹ کے یہ مرنا کیسا
یہ لوگ کبھی ہم کو نہ جینے دیں گے
لڑنا ہے زمانے سے تو ڈرنا کیسا

یہ کس نے کہا تم سے محبّت نہ کرو!
دل تڑپے مگر عشق کی جرات نہ کرو!
مانا کہ غلامی کے ہو عادی لیکن
کہتا ہے بھلا کون بغاوت نہ کرو!

طوفان نیا پھر سے اٹھا، دیکھیں تو
دیوار گری، شور ہوا دیکھیں تو
اک جست میں طے راہِ محبّت ہوگی
روکے گا تمھیں کون، ذرا دیکھیں تو

کہتے رہیں یہ لوگ کہ اچھّا نہ ہوا
وہ کون سا عاشق ہے کہ رسوا نہ ہوا
آزاد رہو اپنی محبّت کے لیے
یہ کیا ہے کہ پہلے کبھی ایسا نہ ہوا

کرتار سنگھ دُگل

سفید پوش

سنتی سوچتی وہ جگو کا کہنا کیوں مانے۔ پھر اس کا دل کہتا شاید جگو نے اس پر جادو کر دیا ہے۔ اور سنتی جو کچھ کہتا کرنے کو تیار ہو جاتی۔ تیار تو ہو جاتی لیکن کچھ دیر بعد پھر اپنا من بدل لیتی۔

کئی بار جب جگو اسے لاتیں مار رہا ہوتا تو وہ اس کی طرف اس طرح دیکھتی جیسے کہہ رہی ہو "میں مر جاؤں گی میں مر جاؤں گی اور پھر تم کس کو اس طرح مارو گے؟" اور پھر سنتی سوچتی اس پر جگو نے جادو کر دیا ہے، وہ کیسے مر سکتی ہے۔ اور سنتی جگو کی لاتیں کھاتی رہتی۔

جگو چاہتا کہ ایک بھیڑ کی طرح سنتی اس کے پیچھے لگی رہے۔ جدھر وہ جاتا ادھر وہ جائے۔ جہاں وہ ٹھہرتا وہ وہاں ٹھہرے۔ جہاں وہ بیٹھتا وہاں وہ بیٹھے، جو وہ کرنے کو کہے وہی سنتی کرے۔ جیسے اس کی پہلی پتنی پریتو کیا کرتی تھی۔

اور جگو سوچتا وہ اس کو کوئی مشکل کام کرنے کو تھوڑی کہتا تھا۔ بازی گروں میں وہ بھی تھے جو اپنی عورت کے سر پر سیب رکھ کر اسے تیر سے اڑا دیتے۔ ہر بار وہ کرتب کرتے، ہر بار عورت کی جان کو خطرہ ہوتا۔ ایک رتی بھر نشانہ ادھر ادھر ہو جائے تو تیر ماتھے پر لگ سکتا تھا۔ آنکھ کو چیر کر نکل سکتا تھا۔ اور وہ جو اپنے بچے کو ٹوکرے کے نیچے رکھ کر اسے کبوتر بنا دیتے تھے۔ اور وہ جو اپنی گھر والی کو لٹا کر اس کے اوپر کپڑا ڈال اس کی گردن پر چھری پھیر دیتے تھے۔ سنتی کو اس کا جب خیال آتا تو اس کو اپنا پیشہ کہیں اچھا لگتا۔ وہ جگو کی لاتوں کو بھول جاتی۔

پر جگو کا پیشہ اتنا خوفناک تھا۔ سنتی لاکھ اپنے آپ کو سمجھاتی پر اس کے دل میں جگو کے لیے نفرت پیدا ہو جاتی اور وہ کوئی نہ کوئی بات ایسی کر بیٹھتی جو جگو کو بہت بری لگتی، اور جگو کہتا میں تجھ سے پیشہ کروں گا۔ تیری مینڈیولی میں موم لگا کر تجھے کوٹھے پر بٹھاؤں گا اور سنتی تھر تھر کانپنے لگتی جو جگو کہتا وہی کرنے کے لیے تیار ہو جاتی۔ تیار تو وہ ہمیشہ ہو جاتی مگر کر وہ کچھ نہ سکتی۔

جگو ایک آنکھ سے کانا تھا۔ جب کبھی اس کی چھوٹی ہوئی آنکھ کا ذکر آتا تو وہ کہتا وہ اس کے پیشہ میں کام آئی تھی۔ جگو کا ایک بازو ٹیڑھا میڑھا تھا، یہ بازو بھی جگو کا اپنے پیشہ میں ٹوٹا تھا۔ جوڑنے والے نے جوڑ تو دیا لیکن

ہڈی الٹی بیٹھ گئی۔ جگو کی ایک ٹانگ بالکل ہی کٹی ہوئی تھی۔ لیکن بیساکھیوں کے سہارے جگو ایسے چلتا جیسے اسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ راہ چلتے سنتی بار بار پیچھے رہ جاتی۔ وہ اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کی طرف جب دیکھتی تو جگو ہمیشہ اسے یاد دلاتا۔ "نیک بخت یہ ٹانگ تین بار ٹوٹی ہے۔ پہلی بار ٹخنوں تک کاٹی گئی، دوسری بار گھٹنوں تک اسے اتار دیا گیا اور تیسری بار پٹے سے کاٹنی پڑی تھی۔ آری سے اسے الگ کیا گیا تھا۔"

اور پھر جگو نے اپنی پہلی بیوی کو اپنے ساتھ کام میں لگا لیا تھا۔ کتنے دن پرتو نے اس کا کام خوب چلائے رکھا۔ بھیانک سے بھیانک موقعوں پر اس کو چوٹ تک بھی کبھی نہ آئی۔

"جس کو راکھے رام پیارا۔ مارنہ ساکے کوئے" اس کی بیوی لگایا کرتی تھی۔ اور جگو حیران ہوتا۔ کئی ماہ ہو گئے تھے وہی کام اس کی بیوی کرتی تھی جو جگو خود کرتا تھا۔ پر اس کے کبھی خراش تک نہیں آئی تھی۔

اور پھر ایک شام جب جگو اپنی جھگی میں لوٹا اس کی بیوی اس کے ساتھ نہیں تھی۔ باقی سب بازی گر کہتے کہ جگو کی وہ کہیں بھاگ گئی تھی، پر جگو ہمیشہ سنتی کو بتاتا کہ اپنی پہلی گھر والی کو ٹوکرے کے نیچے لٹا کر اس نے کبوتر بنا یا تھا اور پھر وہ اس سے عورت نہ بن سکی۔ کبوتر بن کر اس کے ہاتھوں سے پھر کر کے اڑ گئی۔ اب بھی جب جگو کی جھگی پر کوئی چتکبری کبوتری آ بیٹھتی تو سنتی سوچتی شاید جگو کی پہلی بیوی ہی بار بار پھیرے کاٹتی ہے۔

سنتی کو جگو کا ڈیل ڈول اچھا لگا تھا۔ اگرچہ اس کی ایک ٹانگ نہیں تھی۔ ایک بازو ٹیڑھا تھا۔ ایک آنکھ بہہ گئی تھی پر سنتی نے جگو کو دو ٹانگوں کے ساتھ، دو بازوؤں کے ساتھ، دو آنکھوں کے ساتھ بھی دیکھا تھا۔ اور جب اس کی ماں نے جگو کا نام لیا تو وہ اس کے ساتھ بیاہ کو تیار ہو گئی۔

سنتی سوچتی جو کچھ بھی جگو کام کرتا تھا وہ ضرور ستھرا ہو گا۔ وہ دوسرے بازی گروں کی طرح کبوتر اور مرغیاں پالتا تھا اور نہ سانپوں کے پیچھے پھرتا تھا، نہ دوسرے بازی گروں کی طرح وہ جڑی بوٹیاں ڈھونڈتا تھا، نہ دارو درمل کرنے کے دعوے کرتا تھا، نہ ٹوٹکے بتاتا تھا، نہ ٹوٹکے کرتا تھا، جگو کا نام کبھی کسی نے چوری ڈاکے کے سلسلے میں بھی نہ سنا تھا۔

پر جب پہلی بار جگو سنتی کو اپنے کام پر لے گیا وہ اپنے تئیں کے پیشے کو دیکھ کر ہکی بکی رہ گئی۔ سر سے لے کر پاؤں تک اس کے پسینہ آ گیا۔ کتنی دیر وہ تھر تھر کانپتی رہی اس کو چکر آنے لگے۔ اس کو جگو میں ایک قصائی نظر آیا۔

"اس سے تو" وہ سوچتی "میں کسی ....." پر وہ کس کے ساتھ بیاہ کرتی۔ بازی گروں کے سارے کام مشکل تھے اور اپنے گاؤں میں کسی نے اس کے لیے حامی نہیں بھری تھی۔ اور پھر بازی گر ادھر آ نکلے اور اس کی ماں نے اسے جگو کے پلے باندھ دیا۔

اس طرح سنتی اپنے خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھی کہ جگو نے اس کے دل کی بات سمجھتے ہوئے سامنے والی سات منزلہ عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ ایک آدمی ساتویں منزل سے رسیوں کے ساتھ لٹک کر دیوار کی مرمت کر رہا تھا۔ سڑک سے

جہاں سنتی اور جگو کھڑے تھے وہ مزدور ایک پتلے کی طرح لگ رہا تھا اور بس ــــ

اور سنتی کہنے لگی، "ہائے کہیں رسی ٹوٹ جائے تو! کہیں اس کا ہاتھ نہ اچک جائے! ہائے کیسے چمگادڑ کی طرح لٹکا ہوا ہے! ہوا چلتی ہے تو جھولنے لگ جاتا ہے۔ یہ تھکتا نہیں؟ اس کو چکر نہیں آتے؟ کتنی دیر اور اسی طرح لٹکا رہے گا۔۔۔۔" اس طرح سوال کرتی سنتی اپنے پتی کے پیشے کو جیسے بھول گئی تھی۔

ابھی وہ فیصلہ بھی نہیں کر پائی تھی کہ سامنے سڑک سے ایک موٹر کو آتا دیکھ کر جگو نے سنتی کو سڑک پر دھکیل دیا، ابھی موٹر دور ہی تھی کہ سنتی آنکھیں بند کیے چلاتی ہوئی لوٹ آئی۔ موٹر تو آ رہی تھی۔ وقت فضول گنوانے کی بجائے جگو خود سڑک پر اتر گیا جیسے اس کی پتنی کوئی چیز سڑک پر گرا آئی ہو، اور وہ اسے اٹھانے لگا ہو، موٹر والے نے جگو کو بچانے کی کوشش کی لیکن جس طرف موٹر ہوئی جگو اسی طرف ہو گیا، ایسے جیسے گڑبڑا کر آدمی فیصلہ نہیں کر پاتا۔ پھر موٹر اس کے اوپر آ گئی اور جگو آپ ہی آپ گر پڑا۔ موٹر جگو سے کوئی ایک فٹ کی دوری پر روک لی گئی۔ جگو مٹی دھول میں لت پت ہو گیا تھا۔ اس کے کان کے پاس سے لہو کی ایک دھار بہہ رہی تھی۔ موٹر والے باہر نکلے۔ پہلے تو وہ جگو کو ڈانٹنے لگے، پھر لہو بہتا دیکھ کر چپ ہو گئے۔ اتنے میں سنتی نے واویلا مچانا شروع کر دیا۔ جیسا کہ اسے جگو نے پہلے ہی سمجھا دیا تھا۔ موٹر والے سیٹھ نے جگو کی مٹھی میں دس کا نوٹ پکڑا دیا، اور موٹر چلی گئی۔

موٹر کچھ ہی آگے بڑھی تھی کہ جگو کھل کھلا کر ہنس پڑا ایک خراش کے ۱۰ روپے! اور پھر سنتی بھی اس کی ہنسی میں شامل ہو گئی۔

جگو نے سنتی کو سمجھایا کہ موٹر والے جہاں تک ممکن ہو کسی کو نیچے نہیں لیتے۔ ہاں ٹرکوں اور لاریوں کے نزدیک نہیں جانا چاہیے۔ موٹر والا تو موٹر کو تباہ کر لے گا مگر کسی کو نیچے آنے سے ضرور بچائے گا۔ اور پھر موٹروں والے تو زیادہ تر دفتروں کے افسر یا سرمایہ داروں کے ڈرائیور ہوتے ہیں۔ کسی کو ان سے نقصان ہو جائے تو جو کچھ بھی ان کے پاس ہو دے کر جان چھڑا لیتے ہیں، چاہے ان کا کوئی قصور بھی نہ ہو۔ کچہریوں سے یہ لوگ بڑے ڈرتے ہیں اور پھر قصور چاہے کسی کا ہو ہمدردی اس کے ساتھ ہوتی ہے جس کو چوٹ آئی ہو۔ موٹر والا تو ہمیشہ قصوروار ٹھیرایا جاتا ہے۔

اور پھر جگو اس طرح کسی موٹر کے نیچے آتا تھا کہ کسی کو پتہ ہی نہ لگتا کہ یہ جان بوجھ کر گھائل ہو رہا ہے۔ کبھی یوں لگتا جیسے وہ سڑک پار کر رہا ہے۔ کبھی یوں لگتا کہ جیسے وہ اپنی راہ جا رہا ہے اور موٹر والے سوچتے ان کا اندازہ غلط ہو گیا تھا اور مارے شرمندگی کے وہ کسی بھی قیمت پر جان چھڑانے کو تیار ہو جاتے۔

جگو نے سنتی کو بتایا جب اس کا پانچ ٹوٹا اسے پچاس روپے لے تھے۔ جب اس کی آنکھ چھوٹی سو روپے پاؤں کی بازی پر پھر سو، گھٹنے کے وقت ڈیڑھ سو اور جب اس کی پوری ٹانگ کاٹنی پڑی تھی تو اس نے دو سو روپے کمائے تھے، دو سو روپے اور ہسپتال کا سارا خرچ۔

جگو کہتا موٹر کے نیچے اس طرح آنا چاہیے کہ نہ زیادہ چوٹ لگے اور نہ دوسرے کو پتہ چل سکے کہ جان بوجھ کر اس نے ایسا کیا ہے۔ اور حادثہ کے بعد واویلا مچا کر اور رو دھو کر موٹر والے کے پاس جتنے پیسے ہوں بٹور لینے چاہئیں۔ ایک نہ ایک اپنا آدمی ساتھ ضرور ہونا چاہیے جو لوگوں کو اکٹھا کر سکے ان کی ہمدردی حاصل کر سکے۔

جگو کہتا اس نے جب کبھی بھی اپنا کوئی عضو تڑوایا ساتھ جان بوجھ کر تڑوایا تھا۔ جب اسے زیادہ پیسوں کی ضرورت ہوتی وہ اپنے آپ کو زیادہ گھائل کر لیتا اور جب پرنتو موٹر کے نیچے آئی۔ . . . . " اور پھر جگو ایک دم چپ ہو گیا۔ اس نے تو سنتی کو کہا تھا کہ اس کی پہلی بیوی کبوتر بن کر اڑ گئی تھی۔

سنتی جگو کے پیشے میں کسی طرح شامل نہ ہو سکی تاہم جب وہ سڑک پر پاؤں رکھتی اس کو لگتا جیسے اسے چکر آ رہے ہوں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا وہ سڑک پر کھڑی رہتی اور موٹر والا موٹر بچا کر نکل جاتا۔

ایک بار سنتی بالکل سڑک کے درمیان جا کھڑی ہو گئی۔ موٹر والے نے بڑی مشکل سے اس سے کوئی ایک گز دور موٹر روک لی، اور پھر نیچے اتر کر تڑاق تڑاق سنتی کو چانٹے جڑے۔ جگو آگے ہوا، اسے بھی اس نے دھکا دے کر گرا دیا اور خود موٹر میں بیٹھ کر چل دیا۔

جگو کا اصول تھا کہ وہ ایک سڑک پر صرف ایک بار حادثہ کرنے کی کوشش کرتا اور ایک شہر میں زیادہ دن کبھی نہ ٹھہرتا۔ سنتی اس کا کہا مان کر آگے تو ہو جاتی لیکن اس کا تیر ہمیشہ چوک جاتا۔ کئی بار تو موٹر ابھی سو قدم دور ہوتی اور وہ پہلے ہی ڈر کے مارے چلانے لگ جاتی۔ بے ہوش ہو کر گر پڑتی اور موٹر والے گھور گھور کر اس کی طرف دیکھتے بچ کر نکل جاتے۔ پھر سنتی کو ماں بننے کی امید ہو گئی۔ ان دنوں لاکھ جگو اس سے لڑتا وہ باہر قدم نہ رکھتی اور پھر سنتی ماں بن گئی اب تو جگو کی مجال نہیں تھی کہ سنتی کو اپنے کام کے لیے اشارہ تک کر سکے۔

لیکن جگو کی مصیبت یہ تھی کہ اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ اس کا بڑھاپا زور اس کی ایک ہی آنکھ کو دیکھ کر موٹر والے سنبھل جاتے اور اس کو چوٹ نہ لگنے دیتے۔ کوئی دن ہی ہوتا جو اس کا داؤں لگتا۔ اور اس طرح اس کا روزگار کئی دن سے مندا ہو گیا تھا۔

سفید پوش جگو اور کوئی کام نہیں کر سکتا تھا۔ جگو بھوکا رہ لیتا پر بازی گروں میں اپنی سرداری بنائے رکھتا، مگر اس کا یہ بھرم زیادہ دیر نہ رہ سکا۔ جگو کو ایسے لگتا جیسے جیون کے تانے بانے اس کے ہاتھوں سے چھوٹ رہے ہوں، چھوٹتے جا رہے ہوں۔

اور پھر ایک بار کئی دنوں تک جگو کے گھر چولھا ٹھنڈا رہا۔ شہر کی سڑک پر کھڑا ہو ہو جگو ہار گیا تھا، اور اپنے بچے کی ماں کی طرف اس کی مجال نہیں تھی ایک بار دیکھ بھی سکے۔ جب سے ماں بنی تھی۔ سنتی تو جیسے شیرنی ہو گئی تھی۔

بیروزگاری کا فکر ہر گھڑی جگو کو گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا۔ بھوک، ضرورتیں، غریبی۔ جگو گھلتا جا رہا تھا۔ چار دن پانچ پانچ دن فاقے کاٹ لیتا پر میلے کپڑوں سے کبھی باہر قدم نہ رکھتا۔

پھر ایک دن جگو کا بچہ بیمار ہوگیا۔ ساری رات اس کو بخار چڑھا رہا۔ ساری رات وہ کھانستا رہا۔ صبح جگو اسے اٹھا کر دواخانہ لے گیا۔ سنتی کا اپنا جی ٹھیک نہیں تھا وہ ساتھ نہیں گئی۔ دوپہر کو جب جگو لوٹا سنتی نے دیکھا وہ خوش خوش تھا۔ بچہ کی دوائی تھی وہ لایا۔ روٹی پھانے کو آٹا بھی لایا گھی بھی لایا۔

اگلے دن جگو بچے کو پھر دواخانہ لے گیا، بچہ کچھ ٹھیک ہوگیا تھا۔ سنتی ابھی بھی تندرست نہیں تھی اور جب جگو لوٹا تو بہت ہی خوش تھا۔ وہ اپنے سنتی اور بچے کے لیے کپڑے خرید لایا تھا۔

تیسرے دن جگو اور بچے کو شہر گئے کوئی دو گھنٹہ ہوگئے تھے دھوپ میں بیٹھی سنتی کو ایک دم جیسے بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ اس کے دل میں کوئی بات آئی اور وہ ویسی کی ویسی شہر کی طرف دوڑی۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔ وہ بے چینی کے عالم میں گھنٹہ گھنٹہ کی مسافت دھونڈ رہی تھی کہ آخر اس نے اسے ایک پیڑ کے نیچے کھڑے ہوئے دیکھ لیا۔

سامنے سڑک پر اڑتی ہوئی ایک موٹر آرہی تھی اور سنتی کو پتہ تھا کہ جگو کیا کرنے والا ہے۔ وہ گولی کی طرح بھاگی جگو سے اپنا بچہ چھین لیا۔ موٹر تو نزدیک آچکی تھی۔ اپنے شکار کے لیے تیار گڑھ بڑا کر جگو خود سڑک پر کود پڑا۔ جگو سڑک پر گیا اور موٹر نے اسے لپیٹ میں لے لیا۔ بائیں طرف کے پہیے نے اس کو گیند کی طرح اچھال کر آگے پھینکا اور پھر داہنی طرف کا اگلا پہیہ بھی اور پچھلا پہیہ بھی اس کے سر پر سے گذر گیا۔

جگو کا سارا مغز باہر آگیا۔ دودھ جیسے سفید کپڑے خون اور مٹی میں لت پت ہوگئے۔ اور سنتی کے دیکھتے کے دیکھتے موٹر والا یہ جا وہ جا ہوگیا۔

حیدرآباد میں شہر کا قدیم ترین ہوٹل

عزیزیہ ہوٹل ہے

جہاں صبح و شام ہندوستانی طریقے سے ماہر فن باورچیوں کے ہاتھوں تیار کئے ہوئے کھانے مل سکتے ہیں، صفائی اور پاکیزگی اس ہوٹل کا امتیازی نشان ہے۔ کم کرایہ پر صاف ستھرے اور ہوادار کمرے مل سکتے ہیں

پتہ یاد رکھئے عزیزیہ ہوٹل

ناپلی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن فون ۴۳۱۶

کوثر چاندپوری

یومِ غالب

شہرِ خموشاں میں غیر معمولی چہل پہل نظر آرہی ہے خوشبودار دھواں ہر طرف ناچتا پھر رہا ہے کہیں کہیں دیئے بھی جھلملا رہے ہیں سردیوں کی اندھیری اور لمبی رات میں عجیب رونق بلکہ زندگی پیدا ہوگئی ہے آج یہاں زندہ اور مردہ شاعروں کے تعاون سے "یومِ غالب" منایا جارہا ہے جس میں مشہور اور ممتاز فن کار شریک ہو رہے ہیں۔ چند کے نام یہ ہیں۔ حضرت بہتان جھگڑالوی، گھنٹا گورستانی، جمال اندھیر نگری، سوہن مرگھٹ نواسی، گمنام شہرت پوری، شری بے تک ہرجائی، جناب کرگس اٹلی نشین۔ عورتوں کی نمائندگی محترمہ نکہت بیمار فرمارہی ہیں اس لیے نہیں کہ وہ موت اور زندگی کی درمیانی منزلیں طے کررہی ہیں بلکہ اس لیے کہ غالب پر ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور آل انڈیا ریڈیو سے بھی وہ غالب پر ایک تقریر نشر کرچکی ہیں نو بج رہے ہیں ایک بوڑھے گورکن نے چند نوجوانوں کی مدد سے ایک پختہ مقبرے کے سامنے "مائکروفون" لاکر کھا ہے اور فرش بھی بچھادیا ہے۔ ایک طرف کچھ کرسیاں رکھ دی گئی ہیں جن کے درمیان ایک لائن صوفوں کی ہے مائک کی چمک مقبرے کی چھت پر لگے ہوئے سنہرے کلس پر طنز کرنے لگی ہے۔ دفعتہً بجلی کے قمقمے جگمگا اٹھے ہیں، دیوں کی جھلملاہٹ ان کی تیز روشنی میں دب گئی ہے لیجئے اب ہڈیوں کے ڈھانچے رینگتے ہوئے جلسہ گاہ کی طرف آرہے ہیں ان کے جسم اور چہروں سے گوشت غائب ہوچکا ہے دانت ہنسنے کے انداز میں کھلے ہوئے ہیں آنکھوں کے گڑھوں میں خفیف سی چمک موجود ہے بعض کے چہروں پر ڈاڑھی لہرارہی ہے درحقیقت یہ ڈاڑھی نہیں ہے بلکہ اس کے بالوں کا سایہ ہے جو ظاہر کررہا ہے کہ ان کی سوکھی ٹھوڑیوں پر کسی زمانہ میں شاندار ڈاڑھیاں بھی رہ چکی ہیں، ڈھانچے مسلسل آتے جارہے ہیں اور فرش پر بیٹھتے جارہے ہیں۔ میدان بھرتا جارہا ہے وہ دیکھئے پکی قبروں سے بھی کچھ ڈھانچے نکلنا شروع ہوگئے ہیں انھوں نے رنگین اور قیمتی چادریں اوڑھ رکھی ہیں ان کا نام اور سن وفات دروازوں پر لگے ہوئے کتبوں پر لکھا ہوا ہے اسی لیے آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ یہ اونچے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور امتیاز کے طور پر انھیں ریشمی چادریں اوڑھنے کی اجازت دیدی گئی ہے معاہدے کی رو سے مرنے کے بعد بھی انھیں کچھ سہولتیں حاصل ہیں اور یہ معاہدے اتنے مضبوط ہیں کہ ٹوٹ نہیں سکیں گے، چاہے عالم بالا میں کتنی ہی اصلاحات ان کی وجہ سے رکی رہیں۔ ان کے کچھ نوکر بھی آس پاس کی دھنسی ہوئی کچی قبروں

ہیں رہتے ہیں وہ ضرورت کے وقت ان کی خدمت کرتے ہیں اس وقت بھی چند ملازم ادب سے سر جھکائے آگے پیچھے چل رہے ہیں۔ یہ چادر پوش ڈھانچے نہایت شان و شوکت کے ساتھ صوفوں اور کرسیوں پر بیٹھتے جا رہے ہیں ان میں ایک ڈھانچہ بہت ممتاز ہے اسے درمیان میں ایک صوفے پر جگہ دی گئی ہے، سینے ایک ڈھانچہ مائک کے سامنے کھڑا کچھ کہہ رہا ہے۔ یہ شری بے تک ہر جائی ہیں جو دو گھنٹہ قبل پاس کے مرگھٹ سے تشریف لائے ہیں اور بحیثیت سکریٹری کام کریں گے وہ فرما رہے ہیں۔

یہ گورستان کا پہلا مشاعرہ ہے جو "غالب ڈے" پر منعقد کیا جا رہا ہے اور اس کے براڈ کاسٹ کرنے کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ کچھ زندہ فنکار بھی ہماری خصوصی دعوت پر شریک ہو رہے ہیں وہ حضرات روانہ ہو چکے ہیں لیکن آپ ہی اپنے پیروں پر آ رہے ہیں اس لیے چند منٹ کی دیر ہو گئی ہے ٹھیک دس بجے ہم مشاعرے کی کارروائی شروع کر دیں گے۔ اعلان کی گونج ابھی فضا میں باقی ہے کہ زندہ یا یوں کہئے کہ قریب الموت شاعروں کا ایک غول بھی آ گیا ہے آنے والے آداب و تسلیمات بجا لا کر ایک طرف بیٹھ گئے ہیں اور شری بے تک ہر جائی پھر مائک پر اعلان کر رہے ہیں

ساتھیو! ـــــ مشاعرہ کا آغاز ہو رہا ہے اور حضرت جاموش کو ہماری تحریک صدارت کے لیے تشریف لا رہے ہیں وہ بہت موٹے تازے آدمی ہیں اور خم ٹھوک کر کھڑے ہو گئے ہیں اور اس انداز سے مائک کی سمت آگے بڑھ رہے ہیں جیسے اپنے کسی حریف سے نبرد آزما ہونے جا رہے ہوں۔ اب وہ مائک پر آ گئے ہیں اور گلا صاف کرنے کے بعد اس طرح بول رہے ہیں جیسے ایک مرغ دوسرے مرغ کو ماتھے دیکھ کر بانگ دے رہا ہو۔ وہ فرما رہے ہیں۔

گورستان کے اس کامیاب تاریخی اور شاندار مشاعرے کی صدارت کے لیے میں نواب شکست یار جنگ بہادر کا نام پیش کرتا ہوں۔ آپ شہر خموشاں کے سب سے بڑے جاگیردار ہیں بہت بڑا رقبہ آپ کے زیر نگیں ہے، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں سرکار کمپنی بہادر کی طرف سے آزاد فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے شاندار پسپائی کے بعد محض ثواب دارین حاصل کرنے کے لیے شہید ہو گئے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ حضرات اس تحریک سے اتفاق کریں گے، تائید کے لیے غوک تالابی اچکتے ہوئے تشریف لا رہے ہیں اور مائک کو مضبوطی سے پکڑ کر فرما رہے ہیں۔

نواب شکست یار جنگ میرے استاد جناب فدوی کے شاگرد ہیں یعنی میرے استاد بھائی ہیں، صدارت ان کی میراث ہے۔

تراغ نورپوری غوک صاحب کو پیچھے ہٹا کر کہنے لگے ہیں فدوی نواب شکست یار جنگ کے وظیفہ خوار تھے انھیں چھ روپے مہینہ اور چار من گیہوں ان کی سرکار سے ملا کرتے تھے جو اب بھی ان کے جانشینوں کو مل رہے ہیں وہ عمر بھر نواب صاحب کی شان میں قصیدے لکھتے رہے اور جب انھوں نے شیر کا شکار کھیلتے وقت دو آدمیوں کو بھی گولی کا نشانہ بنا دیا تھا تب بھی انھوں نے ایک بہاریہ قصیدہ نظم کیا تھا نواب صاحب کا پورا دیوان ان ہی کا

ان ہی کا لکھا ہوا ہے۔ یہ مشاعرہ بالکل جمہوری اور عوامی ہے اس لیے نواب صاحب کی صدارت کسی طرح مناسب نہیں ہے
مجمع میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں ہر شخص اپنی اپنی کہہ رہا ہے اور شری بے تک اپیل کر رہے ہیں۔
شانتی! ــــ شانتی!!
ایک دم گمنام شہرت پوری کھڑے ہو کر فرمانے لگے ہیں۔
جمہوری اور عوامی جلسوں کی صدارتیں عام طور پر ایسے ہی حضرات کا حصہ بن گئی ہیں میری رائے میں نواب شکست یار جنگ بالکل موزوں ہیں۔
شغال بیابان پوری اس اختلاف کا حل پیش کرنے کے لیے کہہ رہے ہیں، اور ان زندہ حضرات کو آخر کیوں بلایا گیا ہے انھیں میں سے کسی کو صدر کیوں نہ بنا دیا جائے، اس پر شری بے تک کے کہنے سے جاموش کوہستانی نے اپنی تحریک واپس لے لی ہے اور یار جگت پوری نے فتنہ جنگ پوری کو مسند صدارت پر آنے کی دعوت دی ہے جس کو سب نے منظور کر لیا ہے۔ البتہ زندہ شاعروں میں سے بے چین جہنمی مقابلہ کے لیے تیار ہو گئے ہیں وہ کہہ رہے ہیں کہ میری ڈاڑھی بھی فتنہ صاحب سے بڑی ہے اور شق شاعری بھی ان سے زیادہ ہے، اس لیے صدارت پر میرا ہی حق پہنچتا ہے، ان کی یہ آواز قریب بیٹھے ہوئے شاعروں کی آواز میں دب کر رہ گئی ہے جو کہہ رہے ہیں کہ صدارت کا ڈاڑھی اور چوٹی سے کوئی تعلق نہیں، نہ مشق سے کوئی واسطہ ہے۔ جناب فتنہ جنگ پوری تالیوں کی گونج میں مسکراتے اور پان چباتے کرسیٔ صدارت کی طرف دوڑ رہے ہیں مسلسل چیر زدیے جا رہے ہیں نواب شکست یار جنگ کی پیشانی پر غصہ کا شعلہ بھڑک اٹھا ہے۔ قریب کھڑا ملازم اسے بجھانے کی کوشش کر رہا ہے، اس کی زبان سے خوشامدانہ الفاظ اور اشعار نکل رہے ہیں فتنہ جنگ پوری کسی ہوئی شیروانی پہنے ہیں، آنکھوں میں سرمہ لگا ہوا ہے، گلوبند اس طرح گلے میں پڑا ہوا ہے جیسے سپیرا گردن میں سانپ لپٹا لیتا ہے وہ خوب تن کر بیٹھ گئے ہیں۔ شری بے تک نے جلدی جلدی فہرست تیار کر لی اور وہ صدر کے سامنے رکھ دی گئی ہے ابھی کسی شاعر کو پکارا نہیں گیا ہے اور سب لوگ دھوئیں کے ایک مرغولے کو دیکھ رہے ہیں جو ایک دم فضا میں بل کھانے لگا ہے پتہ چلا ہے کہ قریب کی ساد جیوں سے کچھ ارباب ذوق تشریف لے آئے ہیں۔ یہ سب پرانے زمانے کے خطاب یافتہ ہیں کسی کی پیشانی پر رائے بہادر لکھا ہے اور کسی کے ماتھے پر صرف رائے صاحب کے مٹے ہوئے حروف چمک رہے ہیں، نواب شکست یار جنگ کے اشارے پر انھیں بھی عزت کے ساتھ کرسیوں پر بٹھا دیا گیا ہے۔ ان کے بیٹھتے ہی بہتان جھگڑالوی نے صدر کی اجازت کے بغیر ہی فہرست دیکھنے کا مطالبہ کیا ہے اور ایک آنکھ پر مٹھی کی دوربین لگا کر فہرست دیکھ لی ہے وہ کہہ رہے ہیں کہ مجھے ترتیب پر اعتراض ہے اس میں شاعروں کے مراتب کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ شری بے تک فرما رہے ہیں کہ جہاں تک زندہ حضرات کا تعلق ہے ہم نے عمر کے اعتبار سے ان کے نام درج کیے ہیں اور مردہ شاعروں میں سال وفات کا لحاظ رکھا گیا ہے یعنی سب سے

پہلے مرنے والے کا نام سب کے بعد لکھا گیا ہے اور سب سے آخر میں مرنے والے کو پہلے پڑھوایا جا رہا ہے۔ بہتان جھگڑالوی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر کہہ رہے ہیں کہ یہ طریقہ بالکل غلط ہے ہو سکتا ہے کہ شاگرد پہلے مرگیا ہو اور استاد کا بعد میں انتقال ہوا ہو اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ استاد کم عمر اور شاگرد بالکل بوڑھا کھوسٹ ہو اس کے علاوہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص قطعی فطری قسم کا شاعر ہو اور وہ ان لوگوں سے اچھا کہہ لیتا ہو جو عمر میں اس سے بڑے ہوں۔

حضرت فتنہ نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ جواباً ارشاد فرمایا ہے کہ فطری شاعر کوئی نہیں ہوتا یہ ایک مہمل سی بات ہے اور اگر کوئی ہوتا بھی ہے تو استاد اسے فن کے سانچے میں ڈھال کر بالکل غیر فطری بنا لیتا ہے اور اسی وقت سند فراغت دیتا ہے جب اس کے فن کا ہاتھی مضامین کی چونٹیوں کو پیروں سے روند نے میں خوب مشاق ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ترتیب یہی رہے گی۔ بہتان جھگڑالوی خاموش احتجاج کے طور پر مشاعرے سے واک آوٹ کر گئے ہیں اور چند دوستوں کو ساتھ لے کر نواب شکست یار جنگ کے مقبرے کی آڑ میں ہونگ کرنے کی نیت سے جا بیٹھے ہیں ادھر شری بے تک نے جاہل علاموی کو چکا لیا ہے اور وہ اکڑ کر فرما رہے ہیں مطلع سنیئے شاید کسی قابل ہو میں نے ایک نئی بات کہنے کی کوشش کی ہے۔ پچاس سال پہلے بہت سی چیزیں نہ تھیں جواب موجود ہیں ہماری شاعری میں ان نئی چیزوں کو بھی شاعرانہ مناسبت کے ساتھ آنا چاہیئے۔

سب کہاں کچھ بن کے ٹیمائر سنایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیاں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

داد تحسین کا شور بلند ہو رہا اور مطلع پھر سنا جا رہا ہے۔ جاہل علاموی اپنے لبوں پر فخریہ مسکراہٹ پیدا کر کے فرما رہے ہیں اسی مضمون کو دوسرے مطلع میں بہ تبدیل قافیہ پیش کرتا ہوں۔

سب کہاں کچھ صورت انجم میں عریاں ہوگئیں
خاک میں کیا لڑکیاں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

دوسرے مطلع پر غوک صاحب تنقید کر رہے ہیں کہ لفظ "عریاں" میں ذم کا پہلو موجود ہے اس پر نظر ثانی کی جائے۔ جاہل علاموی کہہ رہے ہیں کہ غوک صاحب نے لفظ "پنہاں" کو نظر انداز کر دیا جو "عریاں" کی ضد واقع ہوا ہے۔ پھر اس میں ایک نکتہ اور بھی ہے وہ یہ کہ شاعر ترقی پسند ہے زندگی بھر اسے بھوک اور عریانی کی شکایت رہی اور وہ انقلاب، انقلاب پکارتا رہا یہ انقلاب مرنے کے بعد آیا نظام اور سماج بالکل تبدیل ہوگیا۔ چنانچہ جو لڑکیاں جیتے جی عریاں رہیں انھیں مرتے ہی کفن میں لپیٹ دیا گیا۔

زندہ باش!۔۔۔۔ جناب فتنہ جنگ پوری کے منہ سے بے اختیار یہ جملہ نکل گیا۔ اس پر جاہل علاموی نے

احتجاج کیا ہے کہ یہ لفظ ماحول کے مناسب نہیں ہے اسے واپس لیا جائے جن غریبوں نے مرکر لباس حاصل کیا ہے انھیں یوں نہیں کوسا جاسکتا اب وہ زندہ ہوکر پھر مصائب میں مبتلا نہیں ہوسکتے۔

شری بے تک نے جواب دیا ہے کہ یہ بات محض حوصلہ افزائی کے لیے کہی گئی ہے ورنہ آبادی اتنی بڑھ گئی ہے کہ مکانات ملنے مشکل ہوگئے ہیں ایسی صورت میں شاعر جو اپنے سماج کا ترجمان ہوتا ہے۔ شہر خموشاں کے کسی آدمی کو واپس آنے کی دعوت نہیں دے سکتا یہ اور بات ہے کہ زندہ آدمی ان مقبروں یا سمادھیوں میں سے اپنے رہنے کے لیے کوئی جگہ پسند کرلے، بحث ختم ہوتے ہی جاہل صاحب ایک شعر عنایت فرمارہے ہیں

قبر سے باہر بھی آئیں وہ تو اس کا کیا علاج
گالیاں تھیں یا دجنھیں وقف نسیاں ہوگئیں

مجمع خاموش ہے داد بالکل نہیں مل رہی ہے اور جاہل صاحب مایوس ہوکر دوسرا شعر ارشاد فرمارہے ہیں۔

ہم منسٹر ہیں ہمارا فرض ہے حفظ وقار
کرسیاں جب مل گئیں بالائے ایماں ہوگئیں

داد کا طوفان امنڈ آیا ہے چرزدیے جارہے ہیں اور شعر دوبارہ پڑھنے کی درخواست کی جارہی ہے، جاہل صاحب اسے ٹھکرا کر نیا شعر پڑھ رہے ہیں۔

قبر سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتی ہے بھوک
سختیاں اتنی ہوئیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

اب جاہل صاحب مقطع پر پہنچ گئے ہیں۔

یوں ہی گر پڑھتا رہا جاہل تو اے اہل جہاں
دیکھنا تم اپنی حوروں کو کہ رقصاں ہوگئیں

لیجئے اب شری بے تک کا نمبر آگیا ہے وہ آپ ہی اپنا نام پکارنے کے بعد فرمارہے ہیں۔

پنچ ورشی یوجنا کا کام ہونا چاہیے
یعنی اطمینان سے مرگھٹ میں سونا چاہیے

صاحب صدر نے ارشاد فرمایا ہے کہ بے تک صاحب یہ غالب ڈے ہے شعر غالب ہی کے سلسلے کا ہونا چاہیے بے تک یہ سن کر چونک پڑے ہیں اور بالکل برجستہ فرمارہے ہیں۔

میں نے کہا کہ بزم شعر غیر سے چاہیے تھی
سن کے جناب صدر نے سب کو بھگا دیا کہ یوں

شری بے تک اپنی جگہ بیٹھ گئے ہیں اور زاغ نور پوری اسٹیج پر آ گئے ہیں وہ ایک محترمہ کی طرف اشارہ کر کے فرما رہے ہیں۔

ہے تمہاری قبر میری قبر کے بالکل قریب
خلد کا اک در ہے گویا گور کے اندر کھلا

اس پر ہر طرف سے پر وٹیسٹ کیا جا رہا ہے۔ زاغ صاحب کے اشارے کو جنسی جذبہ کا مظاہرہ خیال کیا جا رہا ہے جس کا شہر خموشاں میں کبھی ذکر تک نہیں آسکتا زاغ صاحب برہمی کا اندازہ کر کے چپ چاپ اپنی جگہ جا بیٹھے ہیں اور مقبرے کی طرف سے لگاتار آوازیں آ رہی ہیں۔ زاغ صاحب کی ایک اور غزل ہو گی، ان کا یہی شعر پھر سنا جائے گا شری بے تک نے ان آوازوں کی طرف دھیان دیئے بغیر شغال بیاباں پوری کو پکار لیا ہے اور وہ جناب صدر سے پوچھ رہے ہیں، کیا مجھے بیٹھ کر پڑھنے کی اجازت ہے؟

اس پر ایک آواز آئی کہ آپ تو کھڑے ہونے کی حالت میں بھی بیٹھے ہوئے معلوم ہو رہے ہیں۔ ایک آواز اور آ رہی ہے کہ اگر شغال صاحب کو بیٹھ کر پڑھنے کی اجازت دے دی گئی تو میں لیٹ کر پڑھنے کا مطالبہ کروں گا۔ شری بے تک ان آوازوں کو دبانے کے لیے شغال صاحب سے کہہ رہے ہیں کہ غزل جلدی شروع کیجئے شغال صاحب نہایت رسیلے ترنم میں پڑھ رہے ہیں۔

ہر چند کہ جیتے ہو الکشن کی لڑائی
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

پھر رخ بدل کر نہایت عجلت کے ساتھ کہہ رہے ہیں شعر سنیئے۔

بس کہ ہوں ہمدم الکشن میں بھی آتش زیر پا
بوئے آتش دیدہ ہے بیلٹ مرے صندوق کا

اور فوراً ہی فخریہ انداز میں ایک شعر اور عطا فرما رہے ہیں۔

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے زوجۂ بیمار گھر میں خاک نہیں

اور پھر بغیر سانس لیے کہہ رہے ہیں کہ ایک شعر اور سنیئے۔

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک زوجۂ دلگیر سو ہے

اب محترمہ نکہت بیمار کی باری آ گئی ہے جو موت اور زندگی کے درمیان "سنگ میل" کی حیثیت رکھتی ہیں

مجمع کی نگاہیں ان کے بکھرے ہوئے بالوں اور اترے ہوئے چہرے پر لگی ہوئی ہیں اور وہ دھیرے دھیرے اسٹیج کی سمت آرہی ہیں شری بے تک نے انھیں اسٹیج پر آنے کے لیے سہارا دیا ہے، اور محترمہ نکہت ان سے پانی مانگ رہی ہیں گلاس انھیں دیدیا گیا ہے وہ ایک گھونٹ پینے کے بعد فرما رہی ہیں۔

ان آنسوؤں سے خون کے گھر آگئی تھی میں
جی خوش ہوا ہے آپ کو گلنار دیکھ کر

مقطع ارشاد ہوا ہے ؎

سر رولنا وہ نکہت بیمار و زار کا
یاد آگیا مجھے تری پیزار دیکھ کر

محترمہ نکہت نے پانی کا پورا گلاس پی لیا ہے اور اسٹیج سے اترتے وقت وہ کچھ لڑکھڑا رہی ہیں ان کی یہ لغزشیں سب کی توجہ کا مرکز بن گئی ہیں۔

اب زندہ شاعروں کی نوبت آگئی ہے اور جناب گفتار گورستانی ڈاڑھی سلجھانے کے لیے جیب سے کنگھا نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن وہ کہیں ایسا الجھ گیا ہے کہ نکل ہی نہیں رہا اور شری بے تک کہہ رہے ہیں اب ہمارے ممتاز اور مشہور فن کار جناب گفتار گورستانی کو سنیئے، گفتار یہ سنتے ہی اپنی جگہ سے کھڑے ہوگئے ہیں پاجامہ کا ایک پائنچا اونچا ہے دوسرا بہت نیچا وہ پاجامہ کو ایک ہاتھ سے اوپر سرکاتے دوسرے ہاتھ میں عینک سنبھالے نہایت مجنونانہ انداز سے مائک تک آگئے ہیں اور دونوں ہاتھ شیروانی کی جیبوں میں ٹھونس کر بہت سے کاغذ نکال لیے ہیں اور جلدی جلدی انھیں الٹ پلٹ کر رہے ہیں لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہنس رہے ہیں۔ گفتار صاحب اپنے کام میں مصروف ہیں بہت دیر کے بعد مطلوبہ پرچہ عینک کے خانہ میں مل گیا ہے اور وہ پوری بدحواسی کے ساتھ فرما رہے ہیں۔

دے دیئے تھے جو اس قدر اطفال
گھر بھی یارب کئی دیئے ہوتے

پھر فوراً ارشاد فرما رہے ہیں۔

ملی ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنی ہے کار و زارت نصیب خاں کے لیے

اور بغیر سانس لیے تیسرا شعر بھی سنا ڈالا ہے ہیں۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک خاکہ وزارت کا
ہیولیٰ ہے الکشن کا تو خونِ گرم و وٹر کا

آوازیں آرہی ہیں بس ختم کیجئے اور گفتار صاحب تن کر فرما رہے ہیں ایک تو اور سناؤں گا اور مائک کا بوسہ لیتے ہوئے پڑھ رہے ہیں۔

پرچم سرخ ہے ڈالر کو فنا کا پیغام
میں بھی ہوں ایک ترنگے کی نظر ہونے تک

ان کے جاتے ہی شری بے تاب کہہ رہے ہیں کہ اب کرگس اعلیٰ نشین تشریف لا رہے ہیں، اور وہ اپنے کانپتے ہاتھ مائک پر آگئے ہیں۔ کوٹ کی جیب سے بوتل کی گردن نظر آرہی ہے ان کا یہ شعر اکثر ہی اکھڑی اکھڑی سانسوں میں بہت بے معنی کے ساتھ سنا جا رہا ہے۔

ہوگا کوئی ایسا بھی جو کرگس کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے سیہ فام بہت ہے

ہر طرف سناٹا طاری ہے کرگس صاحب چڑھ کر دوسرا شعر سنا رہے ہیں۔

ملتی ہے انھیں داد تو خوش ہوتے ہیں کرگس
ملتی ہے مجھے داد تو کہتے نہیں ہاں اور

اب شری سوہنی مرگھٹ نواسی کا نام پکارا جا رہا ہے لیکن وہ موجود نہیں ہیں ایک ہلکی سی آواز آرہی ہے۔ سوہنی صاحب ذرا قریب کے شراب خانے تک چلے گئے ہیں، ابھی آتے ہوں گے۔ اتنے میں وہ تیزی سے مشاعرے کی طرف آتے نظر آگئے ہیں اور کوئی چیخ کر کہہ رہا ہے۔

ٹھہریئے، وہ آگئے! ــــ سوہنی صاحب بال بکھیرے آنکھوں پر رنگین چشمہ چڑھائے ہونٹوں پر زبان پھیرتے تشریف لا رہے ہیں اور آتے ہی ڈانٹ کر کہہ رہے ہیں۔

ڈالر کے مت فریب میں آجایو اسد
عالم تمام محو زر و سرمایہ دار ہے

جلدی ہی دوسرا شعر عطا ہوا ہے۔

ہاں کھائیو مت فریب ڈالر
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

وقت کافی ہو چکا ہے اور لوگ اٹھنا شروع ہو گئے ہیں صاحب صدر ڈر رہے ہیں کہ ان کا نمبر آنے تک صرف گورکن ہی رہ جائے گا، اور سارے ڈھانچے غائب ہو جائیں گے ان کا اندیشہ غلط نہیں ہے۔ ہڈیوں کے ڈھانچے آہستہ آہستہ قبروں کی طرف جانے لگے ہیں۔ شری بے تاب بھی مجمع کا رنگ دیکھ کر گھبرا رہے ہیں اور

ایک جماہی لینے کے بعد جمال اندھیر نگری کو مائک پر بلا رہے ہیں۔ جمال صاحب جلدی سے یہ شعر سنا کر چلے گئے ہیں

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا
کہ اس میں دانۂ گندم ہی جزو اعظم ہے

نوبتِ غوک تالافی تک پہنچ گئی ہے وہ خار آلود آنکھوں کو ملتے، جھومتے جھامتے مائک پر آ گئے ہیں اور تھرآئی ہوئی آواز میں گا کر فرما رہے ہیں۔

پھر منسٹر کو بے قراری ہے
یعنی جو یائے کار و لاری ہے

اب بے چین جنتی کو آواز دی گئی ہے وہ سوتے سوتے چونک پڑے ہیں اور پیٹ میں غذا کا بوجھ لیے بھاری قدموں سے چلتے مائک پر آ گئے ہیں اور ارشاد ہو رہا ہے۔

ادب سے میرے ذوقِ کشمکش ہر اک مکلڑ ہے
نہیں خود ہی منسٹر میں مرا گھر بھر منسٹر ہے

گمنام شہرت پوری کو فہرست از بر یاد ہے وہ آواز دینے سے پہلے ہی مائک کی طرف لپک رہے ہیں آتے ہی شعر عطا فرماتے ہیں۔

وٹوں سے گذر کر غم نہ ہووے
کرسی جو نہیں تو ڈر نہیں ہے

اب بیار حکمت پوری ہی باقی رہے ہیں اور سننے والوں میں سے نصف سے زیادہ جا چکے ہیں سماد ھیوں سے آئے ہوئے جہان بھی چلے گئے ہیں۔ لیکن نواب شکست یار جنگ جمے ہوئے ہیں جیسے مشاعرے کا دوسرا دور ان کی صدارت میں شروع ہونے والا ہو یا وہ کوئی تقریر جھاڑنے والے ہوں۔ ان کے آس پاس اور لوگ کرسیوں پر پہلو بدل رہے ہیں۔ بیار صاحب کو بے تاب جی نے فہرست کے اشارے سے بلا لیا ہے اور وہ ارشاد فرما رہے ہیں۔

ہائے اس ہمسر جبریل کی قسمت ہمدم
جس کی تقدیر میں لکھا ہو منسٹر ہونا

پھر جلدی سے فرماتے ہیں۔

منصبِ لیڈری کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولیِ ہر راہنما میرے بعد

اور فوراً ہی ایک شعر اور ارشاد ہو رہا ہے۔

نہ لڑ بھائی پرسنل سے اگر اس نے شکایت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے کلرکوں پر

اب جناب صدر کی نوبت آگئی ہے مگر وہ سوچ رہے ہیں کہ سننے والے کہاں ہیں جی چاہ رہا ہے کہدیں کہ میں نہیں پڑھتا مگر مشکل یہ ہے کہ یوم غالب کی روداد میں شاعر کی حیثیت سے نام نہ آئے گا۔ وہ نواب شکست یار جنگ کی طرف اجازت طلب نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں نواب شکست یار جنگ ہاتھ ہلا کر کہہ رہے ہیں کہ میں کچھ نہیں پڑھوں گا میں تو صرف اس لیے بیٹھا ہوں کہ دیکھوں میری شان میں بھی کوئی شاعر قصیدہ پڑھتا ہے یا نہیں صاحب صدر کھڑے ہو گئے ہیں۔ اور جھک کر "مائک بوسی" کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے ہونٹ اچانک مائک سے چھو گئے ہیں اور وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اچھل کر اس طرح دور ہٹ گئے ہیں جیسے مائک نہ ہو آگ کا پھن ہو۔ جو انھیں ڈس لینا چاہتا ہو۔ شری بے تک تسلی کے طور پر فرما رہے ہیں۔

ارشاد قبلہ!

اور وہ حاکمانہ لب و لہجہ میں پہلے نواب شکست یار جنگ کی مدح میں ایک رباعی ارشاد فرما رہے ہیں جسے سنتے ہی نواب صاحب کا چہرہ دمک اٹھا ہے لیکن سامعین ناگواری کا اظہار کر رہے ہیں۔ رباعی ختم کرتے ہی جناب صدر ایک شعر پڑھ رہے ہیں۔

خدا کو سونپ گر مشتاق ہے تو اپنے بونس کا
فروغ طالع مزدور ہے موقوف قسمت پر

شری بے تک سرگوشی کے انداز میں کہہ رہے ہیں کہ حضور دوسرا شعر پڑھیے یہ تو غالب کا چربہ معلوم ہوتا ہے، اور جناب فتنۂ غصہ میں بھر کر فرما رہے ہیں۔

تم غالب ہی کے چربے کو لیے پھرتے ہو ہم نے تو سینکڑوں مرحوم شاعروں کے چربے ادھیڑ کر رکھ دیے ہیں بات یہ ہے کہ کنواں کھود کر پانی نکالا جا سکتا ہے لیکن غور و فکر کے بعد بھی نیا مضمون ڈھونڈ لینا اپنے بس کی بات نہیں شاعری کا بھرم ان چربوں ہی کی بدولت قائم ہے۔ لیکن آپ کی فرمائش پوری کیے دیتا ہوں۔

لڑتے ہو سسٹروں سے جو ہر روز بار بار
پہنچانتے نہیں ہو ابھی ڈاکٹر کو تم

جناب صدر بغیر کسی فرمائش کے محض اپنے ذاتی اختیارات کی طاقت پر ایک شعر اور سنانے لگے ہیں۔

بپا رہتا ہے گھر میں شور بچوں کے لڑنے سے
ہماری دید کو خواب زلیخا عار بستر ہے

آخر میں شری بے تک شکریہ ادا کرنے کے بعد مشاعرہ ختم کر رہے ہیں۔ ادھر وہ بوڑھا گورکن مرغ کی بانگ سنتے ہی گھنٹی بجا رہا ہے اور ڈھانچے قبروں کی جانب بھاگ رہے ہیں، نواب شکست یار جنگ جناب صدر کا ہاتھ تھام کر کہہ رہے ہیں۔

آیئے آپ میرے ساتھ آیئے مدت سے کسی اچھے شاعر کی درآمد نہیں ہوئی۔

میں زندہ ہوں حضرت!

گھبرایئے نہیں اس مرحلہ کو سر کر لیا جائے گا ہم زندگی بھر آدمی مارتے رہے ہیں اب کیا آپ کو بھی نہیں مار سکتے دونوں میں زور آزمائی ہو رہی ہے، لیکن مشاعرہ ختم ہو چکا ہے اس لیے ہمارا یہاں ٹھہرنا بیکار ہے!

علم بڑی دولت ہے!

اپنے ذوق کی تسکین اور ذہنی نشوونما کے لیے ہمیشہ اچھی کتابوں کا مطالعہ کیجئے

ہندو پاکستان کے مشہور اہل قلم حضرات کی مشہور کتابیں آپ ہم سے طلب کیجئے گا۔ ہمارے یہاں ہر وقت اچھے کتابوں کا اسٹاک موجود رہتا ہے۔ چند کتابیں حسب ذیل ہیں

عروسہ ناول، از اے آر زبیدہ خاتون۔ قیمت چھ روپے۔ سوز شب غم ناول۔ از سلیم چودھری قیمت چار روپے۔ بغیر عنوان کے ایک نفسانی ناول از منٹو۔ قیمت تین روپے۔ شکاری عورتیں منٹو کے آخری زمانے کے افسانے۔ قیمت دو روپے۔ آزاد غلام افسانے۔ از ابراہیم جلیس قیمت دو روپے دودھ کی قیمت افسانے از پریم چند قیمت دو روپے چار آنے۔ دیہات کے افسانے از پریم چند قیمت تین روپے۔ زنداں نامہ ہندو پاکستان کے مشہور ترقی پسند شاعر فیض احمد فیض کا مجموعۂ کلام قیمت دو روپے

ہر آرڈر پر محصول ڈاک علاوہ

ملنے کا پتہ

بھٹاچاریہ پبلشی

پوسٹ سوناپور، ضلع ۲۴ پرگنہ (مغربی بنگال)

ادارۂ ادبیاتِ اردو کی جدید مطبوعات

گاندھی جی ادارے کی طرف سے بچّوں اور بالغوں کے لیے مشاہیرِ ہند کے حالاتِ زندگی سادہ اور آسان زبان میں مرتب کرا کے شائع کی جاتی ہیں۔ چنانچہ حیدرآباد کے ایک پختہ مشق شاعر خورشید احمد صاحب جامی سے گاندھی جی کی حیات نظم میں مرتب کرائی اور یہ کتاب گاندھی جی کی ایک عمدہ تصویر کے ساتھ بچّوں اور ان پڑھ بالغوں کی خاطر جلی حروف میں خاص اہتمام سے چھپوائی گئی ہے: صفحات ۳۲: قیمت بارہ آنے

سروجنی دیوی مولوی وزیر حسن صاحب نے اپنے مخصوص انداز بیان میں مرتب کی ہے جو اردو دنیا میں ایک خاصہ کی چیز ہے۔ یوں بھی اردو میں سروجنی نائیڈو پر اب تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔ وزیر حسن صاحب چونکہ ان کے چھوٹے فرزند کے دوست ہیں اس لیے انھوں نے سروجنی نائیڈو کی نجی زندگی بڑی خوبی سے قلم بند کی ہے اور ان کی نظموں سے بھی بہت پر لطف اور اہم مواد حاصل کیا ہے۔ اس کتاب میں سروجنی نائیڈو کے بعض نظموں کے ترجمے بھی شامل ہیں: صفحات ۱۰۵: قیمت دو روپے۔

حیدرآباد کے بڑے لوگ ان میں نہایت اہم اور مفید تاریخی و سیاسی و سماجی معلومات نہایت بے باکی سے قلم بند کی گئی ہیں اور جدید حیدرآباد کی کے معماروں کا تذکرہ درج ہوگیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے حیدرآباد کی گذشتہ نصف صدی کی زندگی سامنے آجاتی ہے، اور ان اصحاب کی خدمات اجاگر ہو جاتی ہیں جنھوں نے اس مرحوم ریاست کی بیداری اور ہمہ جہتی ترقی کے لیے بے لوث خدمات انجام دیں۔ دکن کی تاریخ میں یہ کتاب ایک خاص اہمیت اور خصوصیت کی حامل رہے گی: صفحات: ۱۵۲: قیمت دو روپے۔

میاں دادخاں سیاح اور ان کا کلام مرتبہ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی ایم، اے، پی ایچ ڈی پروفیسر اردو جوگیشوری کالج بمبئی میاں دادخاں سیاح اردو کے ایک عجیب و غریب شاعر، ادیب اور سیاح تھے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب نے ان کے نام بہت دلچسپ خطوط لکھے ہیں اور سیاح نے غالب کے مخالفوں کے دندان شکن تحریری جواب دیئے ہیں۔ اتفاق سے سیاح کا دیوان دستیاب ہوگیا ہے جس کو مدنی صاحب نے بڑی محنت سے مرتب کرلیا اور سیاح کے حالات زندگی بھی معتبر ذرائع سے فراہم کرکے اور ایک تحقیقی کتاب کی صورت میں لکھ کر ادارہ کو اشاعت کے لیے روانہ کیے۔ یہ کتاب ادارے نے خاص اہتمام کے ساتھ با تصویر شائع کی جو تاریخ ادب اردو اور غالبیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک نادر تحفہ ہے: بڑی سائز صفحات: ۹۶: قیمت دو روپے۔

ملنے کا پتہ

ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد دکن



REFRESH WITH

Rooh afza

گرمی کے موسم میں روح افزا تراوٹ اور فرحت پہنچاتا ہے۔
اس لذیذ شربت کا ایک گھونٹ حلق سے اُترتے ہی فرحت محسوس ہوتی
ہے۔ دماغ تازہ ہوجاتا ہے۔ بدن میں ایک نئی رُوح معلوم ہونے لگتی ہے
اور آدمی از سرِ نو تازہ دم ہوکر کام کے لیے آمادہ ہوجاتا ہے۔

رُوح افزا

مزے دار ——— اور ——— تازگی بخش

ایک بوتل میں ایک سیر دو چھٹانک روح افزا ہوتا ہے جس میں عموماً سولہ بڑے گلاس شربت کے بنتے ہیں

مقامی اسٹاکسٹ سے خریدیے

ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی



قیمت فی بوتل ہر مقام پر
علاوہ مقامی ٹیکس دو روپے آٹھ آنے۔

چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا

جہاں تک قافلۂ نوبہار جائے گا مدینہ دربار کی
خوشبو ملے گی اور جہاں قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا
وہیں آپ کو مدینہ دربار اگربتی ملے گی

فون نمبر ۲۸ پوسٹ بکس ۵

مدینہ پرفیومری ورکس ۔ چک بالاپور (میسور اسٹیٹ)

(مدینہ اڈورٹائزرس)

منظور شدہ محکمہ تعلیمات حکومت حیدرآباد

مجلس مشاورت

حبیب الرحمٰن
فضل الرحمٰن
ڈاکٹر یوسف حسین خاں
ڈاکٹر طاہر علی خاں مسلم
رائے جانکی پرشاد
سید محمد
عالم خوندمیری
ڈاکٹر حفیظ قتیل
دلاور علی خاں
رضیہ بیگم

مجلس ادارت

- سلیمان اریب
- حسینی شاہد
- مغنی تبسم

- خازن
عابد علی خاں
- کاتب: محمد مظہر
- زرسالانہ
ہند و پاک سے آٹھ روپے
ششماہی: پانچ روپے

جلد ۳ ——— شمارہ ۶

سنہ ۱۹۵۷ء

قیمت

۷۵ نئے پیسے

ٹیلی فون: ۵۴۰۲

پرنٹر پبلشر: سلیمان اریب • ۱۷ مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ۔ حیدرآباد دکن • نشو و نما پرنٹنگ پریس حیدرآباد دکن

اس شمارے میں

	پہلی بات		۳
	سخن گسترانہ بات		
• تحفے :-	یورپ کا لکھنو ــــ دیانا	عالم خوندمیری	۴
• مضامین :-	زبان کا مسئلہ	مخدوم محی الدین	۷
	کتبات اور شاعری	خواجہ غلام السیدین	۱۶
		غلام ربانی	۲۴
• غزلیں :-		شاہد صدیقی	۳۸
اور		سلیمان اریب	۳۹
• نظمیں :-		سلام مچھلی شہری	۴۰
		خورشید احمد جامی	۴۱
• چیدہ خوباں سے :-	خط اور دو غزلہ	فراق گورکھپوری	۴۲
	دامن کو ذرا دیکھ	برق موسوی	۴۶
• کہانیاں :-	انتقام	جیلانی بانو	۵۶
	عیدی	آمنہ ابوالحسن	۶۲
	جی کا جنجال	واجدہ تبسم	۷۲
• بازگشت :-	شاخِ نبات	واجدہ تبسم	۸۱
	ابوالعلامہ	کلیم اللہ	
	عوض سعید	علی آفتاب	
	غیاث صدیقی	سلیم صدیقی	
	متین سروش	منظر ضیائی	تا ۸۷
• تبصرے :-	کتب خانہ نواب سالار جنگ	حسینی شاہد	۸۸
	اردو شاعروں کا انتخابی سلسلہ	وحید اختر	
	آگ میں پھول	مغنی تبسم	

پہلی بات

ہم "صبا" کو ہر ماہ بہ پابندی و بروقت نکالنے کی انتہائی کوشش کرتے ہیں لیکن ناسازگار حالات کی عناں گیری برابر جاری ہے۔ اس دفعہ مالی مشکلات کے ساتھ کاغذ کی کمیابی بھی باعث تاخیر ہوئی۔

یہ دراصل جون کا شمارہ ہے لیکن ہم اسے جون اور جولائی کا مشترکہ شمارہ بنانے پر مجبور ہیں۔ مشترکہ شمارے کی حیثیت سے ہم چاہتے تھے کہ اس کی ضخامت بڑھا دی جائے لیکن تیس چالیس صفحات اور بڑھانے کا مطلب یہ ہوتا کہ اور دیر ہوتی اس لیے برائے نام چند صفحات کا اضافہ کیا جا رہا ہے امید ہے کہ قارئین ہماری مجبوریوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے "صبا" کی توسیع اشاعت میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لیں گے اور ہماری مالی حالت کو بہتر بنانے میں مدد کریں گے تاکہ یہ "معذرت خواہی" کا سلسلہ ختم ہو۔

اس تاخیر و تعویق کے باوجود یہ شمارہ کمیت کے لحاظ سے نہ سہی کیفیت کے لحاظ سے کافی وزنی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اس کی بہت سی چیزیں ـــ کیا مضامین، کیا منظومات اور کیا افسانے ـــ بہت پسند کی جائیں گی۔

پچھلے شمارے میں فراق صاحب کی ایک غزل پر (جو "صبا" کے پچھلے سے پچھلے شمارے میں شائع ہوئی تھی) آپ نے اثر صاحب کی تنقید پڑھی تھی۔ فراق صاحب نے حسب توقع اس تنقید کا تفصیلی جواب بھیجا ہے اور اس کے علاوہ ایک خط اور تیر کی ایک غزل پر دو غزلہ بھی۔ چونکہ خط اور دو غزلہ پہلے آیا تھا اور اس کی کتابت ہو چکی تھی اور اثر صاحب کی تنقید پر برق موسوی صاحب کا ایک مفصل مضمون بھی موصول ہو چکا تھا اور اس کی کتابت بھی ہو چکی تھی اس لیے فراق صاحب کے مضمون کے لیے گنجائش نکالی نہ جا سکی۔ ویسے بھی صرف اثر صاحب کی تنقید شائع ہونے کے بعد قارئین کا جو ردعمل ہے اور جو "بازگشت" میں دیا جا رہا ہے اس کو نظر انداز نہ کرتے ہوئے ہمیں سوچنا ہے کہ اس سلسلے کو جاری رکھا جائے یا نہیں کیونکہ ہمارے یہ دونوں بزرگ ـــ حضرت فراق و حضرت اثر معاف فرمائیں ـــ باوجود اپنے بلند مرتبہ کے ایک دوسرے پر جب بھی کچھ لکھتے ہیں تو اس میں تنقید و اصلاح سے زیادہ ذاتیات کا پہلو آجاتا ہے اور قابل اعتراض حد تک آجاتا ہے اور ظاہر ہے کہ آج کے زمانے میں فراق اور اثر کو انشا و مصحفی کی طرح نہیں "لڑنا" اور نہیں "لڑوانا" چاہیے۔

عالم خوندمیری

سخن گسترانہ بات

الہ آباد میں ادیبوں کے سمینار میں جہاں ادیبوں کی آزادی اور مملکت سے ان کے روابط پر بحث کی گئی وہیں یہ سوال بھی زیر بحث رہا کہ منصوبے کی کامیاب تکمیل میں ادیب کس حد تک اور کس حیثیت سے حصہ لے سکتے ہیں۔ ادیب صرف ادیب نہیں ہیں اور ظاہر ہے کہ شہریوں کی حیثیت سے ملک کی تعمیر جدید میں انھیں اپنا بھی حصہ ادا کرنا ہے جب سارا ملک نئے خطوط پر حرکت کر رہا ہو اور صدیوں کی طویل نیند کے بعد ایک نئی بیداری کی لہر دوڑ رہی ہو ادیب تعمیر اور تشکیل کے اس عظیم ڈرامہ سے بے تعلق نہیں رہ سکتے۔ صرف شہری کی حیثیت سے نہیں بلکہ ادیب کی حیثیت سے بھی انھیں جوش اور ولولہ کے ساتھ حصہ لینا ہوگا۔ اور اس شعور کی تخلیق اور نشو و نما کے فرض کو ادا کرنا ہوگا جس کے بغیر منصوبہ بندی محض پیداوار کو بڑھانے کا ایک ذریعہ بن کر رہ جائے گی، اور انسانی اقدار سے اس کا تعلق ٹوٹ جائے گا۔ منصوبہ بندی کے پچھلے تجربوں میں اس پہلو کو عام طور پر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قومی دولت میں اضافہ اور معاشی معیار میں ترقی کے ساتھ ساتھ انسانوں کے ذہنی افق میں وسعت پیدا نہ ہو سکی اس لحاظ سے ادیب منصوبہ بندی کے مسائل سے بے نیاز نہیں رہ سکتے لیکن الہ آباد کے اس سمینار میں ہندوستان کے بعض مصنفوں اور ادیبوں نے جن میں ہندی کے مشہور شاعر پنت جی جیسے ادیب بھی شامل ہیں ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے جن کے خطرناک امکانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اس سوال پر کہ ادیب اور مملکت کے روابط کس نوعیت کے ہوں، پنت جی کا خیال ہے کہ ادیب کو مملکت کے منشاء اور مملکت کے مقاصد سے انحراف نہیں کرنا چاہئے آزادی سے پہلے ہمارے ملک میں اس سوال کا جواب آسان تھا، ادیب بھی دوسرے تمام انسانوں کی طرح ایک سامراجی نظام کے خلاف برسرپیکار تھے اور ایک ایسی ظلم پرور مملکت سے تعاون اور اس کے مقاصد سے اتفاق کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن آزادی کے بعد اس ربط میں بنیادی تبدیلی آگئی ہے۔ اس بات کو مانتے ہوئے بھی پنت جی کے نقطہ نظر سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا، دنیا کی کوئی مملکت اتنی مثالی نہیں ہو سکتی کہ فرد اور مملکت کے تصادم کے امکانات ختم ہو جائیں اور مملکت فرد کی آزادی کی پوری طرح محافظ بن جائے۔ مملکت کا یہ رجحان کہ زیادہ سے زیادہ اقتدار کو مرکز کر لیا جائے اور فرد کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر تسلط حاصل کر لیا جائے ایک ایسا فطری رجحان ہے کہ جب تک معاشرہ کے تمام افراد اور خصوصاً باشعور افراد اس رجحان کے خلاف مسلسل مزاحمت نہ کریں اور اس رجحان سے ہمیشہ آگاہ نہ رہیں فرد کی آزادی

کا تحفظ ممکن نہیں، میرا خیال ہے کہ ایک وسیع جمہوری مملکت میں بھی جس میں سیاسی اور معاشی اقتدار محنت کرنے والے انسانوں کو حاصل ہو یہ خطرہ بہرحال موجود رہتا ہے سیاسی اور معاشی اقتدار کے استعداد سے حاصل ہونے والی اخلاقی طاقت اقتدار کے سیاسی اور قانونی ذرائع سے ہٹ کر ایک بنیاد زیادہ عطا کر دیتی ہے جب ایک ایسی وسیع جمہوری مملکت میں بھی یہ ضروری ہے کہ سماج اور مملکت، مملکت اور فرد کے درمیان حدِ فاصل برقرار رکھی جائے تو ظاہر ہے کہ کسی طبقاتی سماج میں مملکت کو اس بات کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ افراد کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر تسلط حاصل کرے اور ادیب اور اہلِ فکر مملکت کے مقاصد کی تکمیل میں محض ایک ذریعہ بن جائیں۔

یہ ایک خوشی کی بات ہے کہ ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس اور الہ آباد کے سمینار میں ادیبوں کی ایک بڑی تعداد نے اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھا۔ الہ آباد سمینار کا یہ فیصلہ کہ حکومتی اداروں اور تنظیموں کو جیسے کل ہند ساہتیہ اکیڈیمی ہے عصری ادب کی اشاعت کا حق نہ دیا جائے، ایک دانشمندانہ فیصلہ نظر آتا ہے، عصری ادب کی اشاعت کے فرض کی تکمیل خود ادیبوں کی تنظیموں کو کرنی چاہیئے اور حکومت کا فرض ہے کہ وہ سیاسی مقاصد اور سماجی مفروضات سے قطع نظر ایسی ادبی تنظیموں کی مالی امداد کرے۔ حکومت کی کوئی ایجنسی ادب اور تہذیب کے مسائل میں ایک واقعی خارجی اور بے غرضانہ نقطۂ نظر نہیں رکھ سکتی کبھی سماجی مفروضات مائل ہوں گے تو کبھی بااقتدار افراد کی ہمہ دانی، موزوں انتخاب کا راستہ روکے گی کبھی کسی ادبی تحریک کی مخالفت ایک ادیب کے حقیقی ادبی کارناموں کو تسلیم کرنے میں رکاوٹ بن جائے گی تو کبھی کسی ادیب کے نام کی ترکیب کسی وزیر کی کبیدگیٔ خاطر کا باعث بنے گی۔ یہ محض اندیشے نہیں ہیں بلکہ ساہتیہ اکیڈیمی کے مختصر سے دور میں ان اندیشوں کی توثیق ہونے لگی ہے۔ ابھی چند دنوں پہلے ساہتیہ اکیڈیمی نے یہ فیصلہ کیا کہ عصری ادب کا ایک نمائندہ انتخاب شائع کیا جائے ـــ خود یہ بات غور طلب ہے کہ چند افراد پر مشتمل ایک کمیٹی کیسے ایک نمائندہ انتخاب کے فرض کی تکمیل کر سکتی ہے ـــ سنا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مرکزی وزیرِ تعلیم کو ایک جدید اردو شاعر اختر الایمان کے نام کی ترکیب غلط نظر آئی اور اسی بنا پر ان کے کلام کو نظر انداز کر دیا گیا۔ کبھی تو یہ کہا جاتا تھا کہ بھلا نام میں کیا رکھا ہے، اور اب یہ معلوم ہوتا ہے کہ نام ہی سب کچھ ہے ـــ اگر اختر الایمان زبان کے قواعد کے لحاظ سے غلط ہے تو گستاخی معاف ابوالکلام بھی اسی طرح ایک بے معنی سا نام معلوم ہوتا ہے۔ اگر ایک دوسرا وزیر اسی بنا پر مولانا ابوالکلام کی ادبی حیثیت سے انکار کر دے کہ نام بامعنی ہونا چاہیئے تو ہمیں یقین ہے کہ مولانا ابوالکلام اس حماقت کو تسلیم کرنے پر کبھی اتفاق نہیں کریں گے۔ ادیبوں کے بارے میں عصری فیصلہ کبھی بھی قطعی قرار نہیں دیا جا سکتا، ادب کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ آنے والے زمانے کا فیصلہ اکثر عصری فیصلے سے مختلف رہا ہے۔ ایک ادیب کی شہرت اور مقبولیت یا عدم مقبولیت محض ادبی معیارات کی پابند نہیں ہوتی موجودہ سماج میں ایسے غیر ادبی "معیارات" کی تعداد میں پرانے شاہی یا رئیسانہ سماج کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اضافہ ہو گیا ہے، ایک حکومت ایک معمولی باغبان کو ماہر نباتیات بنا سکتی ہے تو دوسری

حکومت ایک معمولی شاعر کو شاعرِ اعظم کے اعلیٰ رتبہ تک پہنچا سکتی ہے۔ ایک ادبی تنظیم کے ادبی ناظم کو بین الاقوامی رتبہ حاصل ہو جاتا ہے تو ایک دوسرے درجہ کے ناول نویس کو محض اس بنا پر غیر معمولی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے کہ چند اتفاقات یا حادثات نے مستند پبلسٹر مہیا کر دیئے تھے۔ مجھے تو اندیشہ ہے کہ کہیں یہ اور اسی قسم کے ایسے بہت سے غیر ادبی معیارات حقیقی ادب کے سرچشموں کو خشک نہ کر دیں اور ادیب شہرت اور مقبولیت کی خاطر ادبی تنظیموں کو زیادہ اور ادب کو کم ہی اہمیت کا مستحق قرار نہ دیں۔ ظاہر ہے کہ مقبولیوں اور اسی قسم کے دوسرے حکومتی امور میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے ادیبوں کو اشاعت اور لوگوں تک پہنچنے کے زیادہ مواقع حاصل رہیں گے اور ان ادیبوں کیلئے جو ایک حد تک گمنامی اور بے غرضی کو اچھے ادب اور آرٹ کی تخلیق کے لیے ضروری تصور کرتے ہیں افلاس اور فاقہ کشی کے سوا دوسرا کوئی راستہ نہیں رہے گا۔ ایلیا ہرن برگ نے اپنے ایک حالیہ ناول THAW میں ایسے دو فنکاروں کو پیش کیا ہے جن میں سے ایک فنکار محض اس بنا پر گمنامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے کہ وہ خوبصورت مناظر کی تصویر کشی کرتا ہے لیکن نئی نئی مشینوں کی مبالغہ آمیز عکاسی نہیں کر سکتا ــــ اب یہ دوسری بات ہے کہ خود ہرن برگ کی مقبولیت میں ان کی مادی صناعت کو کہاں تک دخل ہے اور کس حد تک خالص ادبی معیارات کی بنا پر ہرن برگ مقبول ہیں۔ ہمارے ملک میں یہ اندیشے اور خطرات ابتدائی منزل میں ہیں لیکن ان کے بڑھتے ہوئے اثرات کو نظر انداز کرنا آسان نہیں ہے۔ بدقسمتی سے بت شکن ادیبوں کی ایک اچھی خاصی تعداد پرانی بت شکنی کے ثمرات سے مستفید ہو رہی ہے اور شاید انھیں یہ بات مناسب نظر نہ آتی ہو اور مصلحت ان کا دامن تھام لیتی ہو کہ ان رجحانات کے خلاف آواز بلند کریں۔ کیا نوجوان ادیب بھی خالص ادبی معیارات کے پرچم کو بلند رکھنے کی کوشش کریں گے یا مقبولیت اور شہرت کے آسان اور نسبتہً کم وقت طلب ذرائع اختیار کریں گے اس سوال پر بڑی حد تک ہمارے ادبی مستقبل کا انحصار ہے!!۔

ہندو پاک کی ممتاز افسانہ نگار خاتون ــــ جیلانی بانو

کے افسانوں کا پہلا مجموعہ

روشنی کے مینار

نیا ادارہ، لاہور

اپنی روایتی خوبصورتی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ نیا ادارہ کا نام اب کتابوں کے حسن و دلکشی کے ساتھ ساتھ بلند معیارِ ادب کا بھی نشان بن گیا ہے

"روشنی کے مینار" اگست ۱۹۵۷ء میں منظرِ عام پر آ رہی ہے

مخدوم محی الدین

یورپ کا لکھنؤ — ویانا

ویانا میں لگ بھگ ایک سال رہنے کا موقع ملا۔ شاید اس لیے یورپ کے دوسرے شہروں کے مقابلے میں اسے کسی قدر زیادہ جانتا ہوں، لوگوں کو ہر رنگ میں دیکھنے کی کوشش کی ہے، گھروں میں، کارخانوں، دفتروں میں تفریح گاہوں، ناچ رنگ کی محفلوں میں، اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے رنگ (RING) پر مظاہرہ کرتے ہوئے بھی لوگوں کو زندگی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور زندگی کی تاب نہ لاکر خودکشی کرتے بھی، پستی، بلندی شادی غمی کے نظارے، ذہن کے تہہ خانوں میں کچھ جاگ رہے ہیں، کچھ سو رہے ہیں جنھیں جگانا ہوگا اور یہ سب ایک نشست میں ہو نہیں سکتا، اس سے پہلے کیا یہ ضروری نہیں کہ خود آسٹریا کے بارے میں جس کی راجدھانی ویانا ہے مختصر طور پر کچھ کہا جائے؟ لوگوں کی نفسیات کو سمجھنے میں یہ تاریخی پس منظر مفید ہوگا۔

آسٹریا دسط یورپ کی ایک چھوٹی سی ریاست ہے جس کی آبادی (۷۰) لاکھ سے زیادہ نہیں، جس کی زبان جرمنی ہے صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ ہے جہاں سرمایہ دارانہ جمہوری نظام رائج ہے۔ رودلف کے زمانے (سنہ ۱۲۷۹ء) سے لے کر ہاپسبرگ خاندان کے آخری بادشاہ (سنہ ۱۹۱۸ء) تک آسٹریا اور اس کی راجدھانی ویانا تجارت، تہذیب و تمدن، صنعت و حرفت کا گہوارہ اور دنیا کے لیے جاذب نظر رہے ہیں۔ اس کے شمال میں چکوسلواکیہ، مشرق میں ہنگری، جنوب میں اٹلی اور یگوسلاویہ اور مغرب میں جرمنی اور سوئٹزرلینڈ ہیں۔ پہلی جنگ عظیم تک ہاپسبرگ خاندان کی شاہی رہی، جوزف آسٹریا کا شہنشاہ اور ہنگری کا بادشاہ رہا، آخری بادشاہ اور آخری شہنشاہ، جس کے زیر نگیں، آسٹریا، ہنگری کے علاوہ پولینڈ، بوہیمیا (چکوسلواکیہ) بوسینیا (یوگوسلاویہ) وغیرہ کے اکثر حصے تھے۔ یہ شہنشاہ (۵) کروڑ انسانوں پر حکومت کرتا تھا۔ سنہ ۱۸۴۸ء کے انقلاب فرانس کے زیر اثر یورپ کے اور ملکوں کی طرح ہنگری اور آسٹریا کے عوام نے بھی علم بغاوت بلند کیا، مگر انقلاب کامیاب نہ ہو سکا۔ سنہ ۱۹۱۷ء کے بولشوک انقلاب روس نے سامراج پر ضرب کاری لگائی اور لیبری طاقتیں کمزور ہوئیں، عوام کو آگے بڑھنے کا حوصلہ اور موقع ملا۔ بہت سے ملکوں کی طرح آسٹریا نے سنہ ۱۹۱۸ء میں شاہی کو ختم کر کے جمہوریہ ہونے کا اعلان کیا۔

دو جنگوں کے بیچ میں آسٹریا میں بڑی اتھل پتھل ہوئی۔ دوسری جنگ کے بعد شکست خوردہ جرمنی نے فوجی طاقت کے بل بوتے پر ملک گیری اور انتقام کے جذبے سے پاگل ہو کر فاشزم اور ہٹلر کو جنم دیا، جس کے جھنڈے سے پر جرمن نسل کی برتری، کمیونسٹ دشمنی اور یہودیت دشمنی کے ساتھ دنیا کو تسخیر کرنے کا نعرہ تھا۔ آسٹریا بھی شمال میں جرمنی سے ملا ہوا ہے اس اثر کی زد میں آئے بغیر کیسے رہ سکتا تھا۔ ویانا کے بہادر مزدوروں نے سنہ ۱۹۳۴ء میں اپنے حاصل شدہ حقوق اور جمہوریت کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہو کر ہتیار اٹھا لیے۔ "مارکس ہاز" مزدوروں کی بستی جنگی قلعہ میں

بدل گئی، آسٹریا کے حکمران سرمایہ دار طبقہ نے ہٹلر سے ساز باز کر کے ملک سے غداری کی اور سوشیل ڈیموکریٹس نے فاشزم کے خلاف عوام کو تیار کرنے کے بجائے کمیونسٹ دشمنی کا شکار ہو کر فاشزم کے سامنے ہتیار ڈال دیئے۔ ویانا کے ۱۰۰ سے زائد مزدور مارے گئے اور ملک ہٹلر کے چنگل میں آگیا، آسٹریا جرمنی کا ہی ایک حصہ قرار پایا۔ دوسری جنگ کے کامیاب اختتام یعنی ہٹلری فاشزم کے خاتمہ کے بعد از روئے معاہدہ سوویت یونین، امریکہ، برطانیہ اور فرانس نے آسٹریا کو اپنے مشترکہ قبضہ میں لے لیا۔ ۱۹۵۵ء میں سب سے پہلے سوویت یونین نے آسٹریا کی حکومت سے فوجیں ہٹالینے کا معاہدہ کیا۔ اس شرط کے ساتھ کہ آسٹریا امن اور غیر جانبداری کی پالیسی پر عمل پیرا رہے گا۔ بعد میں دوسری طاقتوں نے بھی معاہدے کیے، اب وہاں غیر ملکی فوجیں نہیں ہیں، آسٹریا ایک آزاد جمہوریہ ہے جہاں سرمایہ دارانہ نظام ہے آسٹریا کی راجدھانی ویانا وسط یورپ کا حسین و جمیل شہر ہے جو اپنی عمارتوں کے طرز تعمیر، علم طب اور فن موسیقی، نفاست نزاکت میں شہرہ آفاق ہے، یہ شہر لندن، پیرس اور ماسکو کے مقابلے میں چھوٹا ہے جس کی آبادی (۱۸۱۰) لاکھ ہے جس کے شمال اور مشرق میں ڈینوب بہتا ہے، جنوب اور مغرب میں آلپس کی پہاڑیوں کے سلسلے کی آخری حد ہے۔ پہاڑیوں پر انگور کے کھیت اور ویانا کے وہ مشہور جنگل (WOODS VIENNA) ہے جس نے عوام کے مزاج پر اور خاص کر شاعروں اور سنگیت کاروں تخیل اور فن پر ساحرانہ اثر ڈالا ہے۔

متحدین کے قبضہ کے زمانے میں ویانا پانچ زون میں بٹا ہوا تھا، سوویت، امریکی، برطانوی، فرانسیسی اور انٹرنیشنل زون، لوگ ایک زون سے دوسرے زون میں آجا سکتے تھے۔ کوئی رکاوٹ نہیں تھی، ۱۹۵۵ء تک ویانا کے چہرے پر جنگ کی خراشیں موجود تھیں، ہٹلر نے جاتے جاتے اور عمارتوں کے ساتھ ساتھ ویانا کے مشہور زمانہ آپیرا ہاؤز پر بمباری کر کے تباہ کر دیا تھا جو پچھلے برس درست ہونے کے بعد کھل گیا ہے جس کی پہلی رات کے لیے ایک سال پہلے سے ٹکٹ بک ہو چکے تھے۔ ویانا اپنی خوش مزاجی، نفاست و نزاکت میں مجھے یورپ کا لکھنؤ معلوم ہوتا ہے۔ جرمن جیسی زبان بھی جو سننے میں کرخت اور بولنے میں سخت معلوم ہوتی ہے ویانا میں آکر نرمی اور مٹھاس پیدا کر لیتی ہے لوگ بات بات پر شکریہ، مہربانی اور آداب کرتے ہیں، شراب، موسیقی، رقص اور سیر و تفریح کے شیدائی ہیں، یورپ کے اور ملکوں کے مقابلہ میں یہاں کی عورتیں پکوان میں تکلف کے لیے مشہور ہیں۔

ویانا میں ہی نہیں بلکہ پورے آسٹریا میں جتنی تعداد نازی پارٹی کے ممبروں کی تھی کسی اور ملک میں نہیں رہی اور فوج میں بھرتی بھی یہاں سے خوب ہوئی۔ میں نے وہ مقامات بھی دیکھے جہاں محبان وطن کو نازی گرفتار کر کے اذیت پہنچاتے اور بالآخر جیل بھیج دیتے یا مار ڈالتے تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ فاشزم کے مقبوضہ ملکوں میں سب سے کم مدافعت یہیں رہی۔ آسٹریا کی ایک دوست نے مجھ سے کہا کہ ہٹلر کی فوج میں ویانا والوں کی مدافعت صرف ان کا جرمن لہجہ تھا اور کچھ نہیں۔ دو جنگوں نے اس خوش مزاج قوم کا تانا بانا بکھیر دیا ہے۔ اسے اپنے بھولپن .. کی بہت قیمت

ادا کرنی پڑی ہے، یہاں کے لوگ گیت ان کی خوش مزاجی اور غمگینی کے امتزاج کے اچھے آئینہ دار ہیں۔

ویانا کا ایک نفسیات کا پروفیسر خجالت کے لہجہ میں مجھ سے کہا کرتا تھا کہ "یار تم ویانا کا زوال دیکھ رہے ہو۔ عروج دیکھنے کے قابل تھا۔ موسیقی اچھلتی تھی، تین سو آرکسٹرا تھے، تھیٹر، اوپرا، قہوہ خانے، ہندوستانی نوابوں اور راجاؤں سے آباد رہتے تھے، شوخ اور چنچل حسین لڑکیاں بازوؤں میں چٹکیاں لے لے کر سرگوشیاں کرتی نظر آتی تھیں، نامہ و پیام عہد و پیمان ہوتے تھے اب دیکھو کیا حال ہوگیا ہے، پورے شہر میں تین آرکسٹرا کا پنپنا مشکل ہوگیا ہے اور قہوہ خانوں میں میں اور تم بیٹھے ہوئے ہیں کرسیاں خالی پڑی ہیں"

تیسری عالمی ٹریڈ یونین کانگریس کا ویانا کی طرف سے استقبال کرتے ہوئے ویانا کے ایک بزرگ مزدور رہنما نے دنیا کے نمائندوں سے کہا تھا۔ ویانا کی حسین سڑکوں پر جب آپ چلیں گے تو ویانا کے تین لاکھ بے روزگار لڑکے لڑکیاں بھی آپ کے ساتھ چلتے ہوں گے آپ انھیں نہ بھولیے"

ویانا میں

صبح ۱/۲ ۸ بجے سے ۱/۲ ۵ بجے شام تک کام کرنے کے بعد "خوش ذائقہ" کھانے کی تلاش اور "وقت گذارنے" کا کام حل تو شروع شروع میں بلائے جان بنا ہوا تھا، سنیچر کے بارہ بجے سے سوموار کی صبح تک ہفتہ وار چھٹی کا گذارنا بھی ایک مسئلہ تھا۔

ایشیا کے ایک ملک کو ایک ضروری خط، مزدوروں کی عالمی کانگریس کے سلسلہ میں بھجوانا تھا، میں نے اپنی اسٹینو ٹائپسٹ کو مسودہ لکھوا دیا۔ سنیچر کا دن تھا، کام ۱۲ بجے ختم ہو جاتا ہے، اس دن دفتر کے کینٹین میں کھانے پر ٹائپسٹ سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا کہ کھانے کے بعد خط کو پورا کر دو، تاکہ آج ہی کی ڈاک سے روانہ کیا جا سکے، وہ ہنس کر کہنے لگی "سوموار کی صبح کو ملیں گے" اس جواب سے مجھے خوشی نہیں ہوئی۔ وہاں کے کام کرنے کا نہج ہی یہی ہے۔ لوگ آٹھ گھنٹے روزانہ سکنڈ سکنڈ کی پابندی کے ساتھ ہڑی تن دہی سے کام کرتے ہیں اور فرصت کے اوقات کو جان سے زیادہ عزیز رکھ کر اپنا پروگرام بناتے ہیں۔ یورپ کے مزدوروں نے جینے کے قابل اجرت (LIVING WAGE) آٹھ گھنٹے روزانہ کا کام ہفتہ میں دو یا ڈیڑھ دن کی چھٹی کے علاوہ سال میں پندرہ دن سے لے کر ایک مہینہ کی تنخواہ کے ساتھ چھٹی کے حق کو سالہا سال کی شدید جدوجہد کے بعد حاصل کیا ہے اور وہ اس کا استعمال خوب جانتا ہے۔ آسودگی کے ساتھ ہی انسان کو فرصت کے مشاغل کی سوجھتی ہے بقول سودا، ہمارا تو یہاں یہ حال ہے ؎

یاں فکر معیشت ہے تو واں دغدغۂ حشر
آسودگی حرفیست یہاں ہے نہ وہاں ہے

فرصت اور فراغت سے محرومی نے کام اور کام کی وجہ سے زمانے نے ہمیں جن عادتوں پر مجبور کر دیا ہے ان سے یورپ

ہیں چھوٹکارا نصیب ہوتا ہے مگر دھیرے دھیرے۔

میرے دماغ میں ایک غلط خیال یہ جما ہوا تھا کہ یورپین کارکن وقت کی پابندی کے نام پر مشرقی مسائل کو تیزی سے حل نہیں کرتے ہیں۔ کام اتنا تھا کہ اتوار کے دن کام نہ کرنا، تضیع اوقات معلوم ہوتا تھا، میں نے فیصلہ کیا کہ اتوار کو بھی کام کروں اس خیال پر ہماری ایک انگریز ساتھی پہلے تو مسکرائی، پھر سنجیدگی سے کہا آؤ، مگر، یہاں کوئی نہیں ہوگا۔ ایک اتوار کو جب میں کام کے شوق میں دفتر آیا تو سوائے تنظیمی اسٹاف کے جو باری باری سے دن رات کام کرتا ہے، دوسرے شعبوں میں سناٹا ہے میں اپنے کمرے میں بمشکل دس منٹ بھی نہ بیٹھا ہوں گا کہ مارے سردی کے ہاتھ پاؤں اکڑنے لگے۔ کمرہ کو گرم کرنے والا کوئلہ ڈالنے والا مزدور بھی تو اتوار کو چھٹی مناتا ہے، میں دفتر سے نکل کر چلایا اور پھر کبھی اس "شوق فضول" کی جرأت نہ ہوئی۔

اندرا سین گپتا، ہندستانی ساتھی نے اپنے دوستوں سے ملا دیا، جن میں سے اکثر و بیشتر انگریزی جانتے تھے، اٹھارہ زبانیں بولنے والے کوئی ڈیڑھ سو تو خود ہمارے دفتر کے ساتھی تھے۔ ان کے علاوہ ویانا کے احباب کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا، اجنبیت اور اکیلے پن کا جان لیوا احساس جاتا رہا۔ رنگ (RING) دو رویہ درختوں سے ڈھکی ہوئی ایک حسین شاہراہ پرانے شہر کو گھیرے ہوئے ہے جو اپنی دل کشی اور زیبائش کی وجہ سے دنیا کی مشہور اور خوبصورت شاہراہوں میں سے ایک ہے، زمانہ قدیم سے یہ شہر فنکاروں، عالموں، سنگیت کاروں کی آماجگاہ رہ چکا ہے۔ بادشاہوں اور خصوصاً ملکہ ماریا تھریشا کے عہد میں دنیا کی ایک بڑی شہنشاہیت کی راجدھانی کی حیثیت سے اس قدیم شہر نے بڑی ترقی کی، مشہور شاہی محل، گرجا گھر، شاہراہیں، گلی کوچے، تھیٹر، آپیرا، دکانیں، باغ اور اطلے، موریاں، قہوہ خانے، میوزیم، مدرسے زیادہ تر اسی رنگ پر ہیں، یا رنگ کے اندر قدیم شہر میں۔

اب جہاں یہ شاہراہ ہے کسی زمانہ میں یہیں قدیم شہر کی فصیل تھی۔ صلیبی جنگوں کے زمانہ میں ترک ویانا کی اس فصیل تک پہنچ چکے تھے مگر ۱۶۸۳ء میں یہاں ترکوں کو شکست کھا کر پسپا ہونا پڑا۔ بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے تحت جب فصیل ٹوٹی اور شاہراہ بنی تو اس پر سوائے سرمایہ دار کے مزدوروں کو قدم رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ ویانا کے مزدوروں نے اس سڑک پر چلنے کے حق کو مسلسل جد وجہد کے بعد حاصل کیا، اب تو یہ عالم ہے لاکھوں مزدور اپنے مظاہرے اسی سڑک پر کرتے ہیں اور جب کبھی سرمایہ دار سے ٹکر لینے کی ضرورت ہوتی ہے وہ کہتے ہیں "چلو رنگ پر"۔ جارج سے بہتر مجھے کوئی اور نہیں ملا، جو اس قدیم شہر کی شکل و صورت اور مزاج سے روشناس کرا سکے، جارج منصور بھی تھا اور رشا عرب بھی، اس کی ماں ایک سنگیت کار تھی جو اساتذہ کی قدیم دھنوں سے اپنے مہمانوں کی ضیافت کیا کرتی تھی۔ جارج شہر کے چپہ چپہ سے واقف تھا اسے اپنے شہر سے بلا کا پیار تھا۔ اور پیار میں گہرائی تھی۔

ایک دن ہم دونوں نے موزارٹ کافی ہاؤز میں سیاہ تلخ کافی پی اور شہر کی سیر کو نکلے۔ پختہ دو منزلہ، سہ منزلہ مکانات شاہی محلات، استفانی کا شہرہ آفاق کلیسا اور دوسرے گرجا گھروں کی اندرونی سجاوٹ کلاس، تنگ گلیاں اور ان کے پُراسرار موڑ خاص دلکشی رکھتے ہیں۔ اب آپ یکایک ایک دروازے میں داخل ہوتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ کسی گھر میں جا رہے ہیں۔ پردہ چھت دار گلی ہے، پتھر صحن، حوض، فوارے بعض اوقات تو یہ احساس ہوتا ہے کہ پرانی دہلی، بنارس یا اجین جیسے اپنے ہی شہر میں گھوم رہا ہوں۔ شہر کی یہ ادا مجھے بہت پسند آئی، طرز تعمیر میں، قدیم سے لے کر جدید تک ہر طرز تعمیر کی عمارتیں ملتی ہیں۔ رومنسک (ROMANISQU) طرز کی سادگی، گاتھک طرز کا دبدبہ اور سنجیدگی باروق (BARUQU) طرز کا جذبۂ آزادی دل پر دیرپا اثر چھوڑتے ہیں۔ انسان کی طرح شہروں کا بھی ایک کردار ہوتا

ہے۔ نئی دہلی باوجود اپنی جدید عمارتوں کے بالکل سپاٹ ہے، بہ مقابل پرانی دلی کے، ویانا کا یہ قدیم حصہ تو یوں بھی دل چھین لیتا ہے کہ یہاں قدیم لوباس کے ساتھ ساتھ نئی چمک دمک کی آمیزش ہے، جارج نے پرانے شہر کی گلیوں میں ایک مکان کی طرف انگلی سے اشارہ کرکے بتایا کہ (MOZART) نے یہاں فلاں آپیرا لکھا تھا، فلاں مکان میں (BEETHOVEN) نے فلاں سمفنی لکھی تھی، فلاں مکان سے اس کا فلاں عشق وابستہ ہے، تو مجھے ہندوستانیوں کی اپنی ہندی یادگاروں سے بے رخی پر رونا آگیا، وہاں ایسی عمارتیں قومی ورثہ کی حیثیت سے محفوظ ہیں، مگر پرانی دلی کے کوچہ بلی ماراں میں غالب کا گھر، کسی ہندوستانی دواخانہ کا گودام بنا ہوا ہے، سروجنی نائیڈو کا گولڈن تھرشولڈ جس سے ہماری زندگی کی گرانقدر یادیں وابستہ ہیں اب ایک معمولی ہوٹل بن کے رہ گیا ہے۔ کسی کے دل کو دھکا نہیں لگتا۔ افسوس تو اس بات کا ہے۔

دو گھنٹے تک پیدل چلنے کے بعد تھک کر ہم نے ایک رسٹوراں میں پناہ لی یہ وہ احاطہ ہے جہاں ۱۸۴۸ء کے انقلاب میں طلبا نے حصہ لیا تھا، انھیں گلیوں میں وہ قدیم رسٹوراں بھی ہے جہاں دنیا کے مشاہیر موزارٹ، بیتھوون سے لے کر بڑے بڑے سیاس اور عالم بیٹھا کرتے تھے۔ ایک کمرہ میں ان مشاہیر کے دستخط دیواروں پر اب تک موجود ہیں اور سیاحوں کی دلچسپی کا اب بھی یہ مرکز ہے۔ یہیں وہ زمین دوز شراب خانے ملتے ہیں جہاں داخل ہوکر انسان صدیوں پرانے طلسماتی ماحول میں گم ہوجاتا ہے۔ اندھیرا اندھیرا دبی دبی سی روشنی، قدیم دل آویز عمارتیں، قدیم دیواریں پرانے ساز و سامان ہتھیار، صراحیوں، جام اور صلیبوں سے سجی ہوئی تھی کہ ماحول میں سچائی پیدا کرنے کے لیے ایک جگہ چھت کے لٹکتے ہوئے جالے تک محفوظ رکھے گئے ہیں۔ یہاں سوائے مرد عورت اور شراب اور سنگیت اور رقص کے ہر شعبے پر قدامت کا رنگ چھایا ہوا ہے جسے جدید انسان کے خلاق ہاتھ نے اور بھی نکھار دیا ہے۔

جارج کی ماں نے ایک شام کھانے پر بلایا تھا وہاں حسن اتفاق سے ہنری سے ملاقات ہوئی جس نے ہندوستان پر جرمن زبان میں ضخیم کتاب لکھی ہے، مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی کہ اس کتاب میں میری نظم "تلنگانہ" کا ترجمہ بھی موجود ہے۔ ہنری اور جارج کی ماں کھاتے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ جارج نے اتنے میں میری تصویر بناڈالی آئیل میں، مجھے نہ سجائی، ہو بہو کر پلانی کی شبیہ میں انکار کر رہا تھا کہ میں ایسا نہیں ہوں مگر وہ اصرار کرتا رہا کہ نہیں تم ایسے ہی ہو میں آج تک قائل نہیں ہو سکا کہ وہ شبیہ میری ہے۔

اپنا کھانا اپنا گانا

کامریڈ ڈانگے کی بیوی نے جنھیں ہم سب تائی کہہ کر پکارتے ہیں یورپ جاتے ہوئے مرچ مسالے کی شیشی میرے ساتھ کر دی تھی۔ دفتر کا کیانٹن ہو یا کوئی رسٹوراں دو شیشی برابر ساتھ رہتی۔ میرے۔ کھانا پروسنے والی لڑکیاں پوچھتیں کیا یہ پپرکا (PAPRICA) مرچ ہے تو میں (YA) ہاں کہہ کر ولایتی کھانا زہر مار کرتا۔ مگر ایک مہینے کے اندر وہ سارا مرچ مسالہ ختم ہوگیا۔

"اپنا کھانا اپنا گانا" بزرگوں کے قول میں کتنی سچائی ہے اس کا تھوڑا بہت ۔ اندازہ ہمیں خود ہندوستان میں ہو جاتا ہے۔ جہاں زبانوں اور تہذیبوں کی طرح ذائقہ اور پکوان میں باوجود بظاہر یکسانیت کے بلا کا تنوع موجود ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اور فنون کی طرح قبائل اور قوموں نے کھانے پینے کے فن کو بھی ترقی دے کر اپنا اپنا ذائقہ پیدا کرلیا جس کے بنانے میں عضویاتی عمل، آب و ہوا، معاشی مسائل کے علاوہ تہذیب و تمدن، مذاہب کے حلال و حرام کی

تفریق اور بے بنیاد تعصبات نے بھی گہرا اثر ڈالا ہے جو تسلسل اور تواتر کی وجہ سے عادت بن گئے ہیں۔ ترغیب و تحریص کے اکسانے میں ان عوامل کا بڑا عمل دخل ہے۔ جو غیر شعوری طور پر اپنا کام کرتے ہیں۔

ویانا میں میرا ایک ہندوستانی دوست جین تھا، جو ذبح ہی نہیں تھا۔ مگر دسمبر کی سردیوں میں بھی وہ دہی چاول اور سبزی پر گذارہ کرتا تھا۔ اس سے پوچھو کہ "بھئی یہ کیا" تو کہتا "عادت"۔ اور اس کی فلسفیانہ اور جمالیاتی توجیہہ بھی کر دیتا۔

کئی ہندوستانی اور پاکستانی احباب برسوں سے ماسکو میں ہیں۔ مگر جب کبھی کوئی ہندوستانی ان کے ہاتھ لگ جاتا ہے تو بڑے ترسے ہوئے انداز میں کہتے ہیں "یار مرچ مسالہ بھیجو ہندوستان سے مرتے ہیں اپنے مزے کے لیے"۔

تاشقند میں مفتی اعظم، بادشاہ خاں اور ان کے معاجزادے حاجی ضیاالدین کے ہاں جب ہم ہندوستانی مہمان مدعو تھے تو بار بار بارک اللہ کی رکعت کان میں پڑتی اور میز پر کئی قسم کے نان، کباب، قورمہ، شوربہ پلاؤ دیکھا ان کے نام، ان کا رنگ ان کی خوشبو اور ان کے ذائقہ نے ذہن سے یہ محو کر دیا کہ ہم کسی غیر ملک میں ہیں۔ بنگالی ساتھی چٹرجی نے کہا "بھیا یہ تو اپنا ہی کھانا ہے دوسرے حکم تک کھاتے رہو"۔ کئی مسلمان مختلف ملکوں کے ایسے ملے جو شراب تو شوق سے پیتے ہیں مگر سور کے گوشت سے نفرت کرتے ہیں۔ بہت سے ہندو ایسے ملے جو مرغ، مچھلی، جھینگا تو چٹ کر جاتے ہیں مگر گائے کے گوشت کے نام سے چڑتے ہیں۔

خود یورپ میں گھوڑے کا گوشت لوگ کھاتے ہیں مگر غریب لوگ ابلا ہوا سوکھا، پسا ہوا گوشت ہوتا ہے جسے سلامی کہتے ہیں جو روزانہ لوگ ہر کھانے پر شوق سے کھاتے ہیں۔ جب میں نے کہا کہ یہ گدھے کا گوشت ہے تو ہمارے دوست بگڑ گئے اور کہنے لگے کہ اس کے اظہار کی کیا ضرورت تھی یہ ہم اس لیے نہیں کھاتے ہیں کہ گدھے کا گوشت ہے بلکہ اس لیے کہ لذیذ ہے۔

چین میں ایسے بھی سبزی خور موجود ہیں، جنھوں نے دودھ کو چکھا تک نہیں وہ اسے بھی گائے کا ایک حصہ سمجھ کر حرام قرار دیتے ہیں کیکڑے کا مزہ تو ناشتہ میں مرغوب غذا ہے۔ روس کے کیویار، تازہ مچھلی کے انڈے دنیا کی نفیس غذاؤں میں سے ایک ہے مگر بہت سے لوگوں کو بچتے نہیں چین میں سانپ کھایا جاتا ہے۔ میں نے کیانٹن میں چینی احباب سے فرمائش کی کہ سانپ کھلائیے تو وہ ہنس کر ٹال گئے کہ خزاں کے موسم میں آؤ تو کھلائیں گے حالانکہ میں نے دیکھا کہ بازار میں سانپ بک رہے تھے شاید اس خیال سے کہ کہیں میں قے نہ کر دوں ان دوستوں نے اچھا کیا کہ میری فرمائش پوری نہیں کی مگر میں نے دیکھا کہ خود ہندوستان میں قبائلی لوگ اور وہ لوگ جنھیں "جرائم پیشہ" کا نام دیا جاتا تھا زندگی کے تقاضوں سے کیا کیا نہیں کھاتے ہیں۔ بہار کے کوئل کے کان کن چپکے سے آپ کو دعوت دیں گے "سانپ کھاؤ گے بھیا"۔

پینے کا بھی یہی حال ہے۔ پینے والے اور نہیں پینے والے دونوں قسم کے لوگ ہر جگہ موجود ہیں۔ ہمارے ہاں کچھ آب و ہوا کے اثر سے کچھ مذہبی اور سیاسی احکامات اور روایات کے تحت زہد و تقویٰ اور ریاکاری عام ہے۔ مگر لوگ اچھی بری جیسی بھی ملے پی لیتے ہیں۔ پینے والے تو وہاں بھی پیتے ہیں جہاں کہا جاتا ہے کہ ممانعت ہے۔ مگر خانہ کشید مضر صحت شراب پی کر اپنی صحت و عافیت کو خراب کر لیتے ہیں۔

یورپ میں شراب، غذا اور تہذیب کا جزو ہے۔ مگر کہیں قانونی طور پر منع نہیں ہاں اسکنڈی نیوین ممالک

جیسے ڈنمارک، ناروے، سویڈن اور فن لینڈ میں سوشیل ڈیموکریٹس کی حکومتوں نے پینے پر پابندیں ضرور لگادی ہیں۔ فن لینڈ میں تو کمیونسٹ پارٹی نے اپنے ممبروں پر قطعی حرام کردی ہے۔ پینے والوں کو پارٹی سے نکال دیا جاتا ہے۔ کمیونسٹ ممالک میں قانونی طور پر منع نہیں البتہ بچپن ہی سے نئی نسل کو الکحل کے مضر اثرات سے واقف کرا دیا جاتا ہے چنانچہ سوویت یونین میں نوجوانوں میں شراب سے زیادہ دودھ، پھلوں کا رس بہت مقبول ہیں۔ ویانا میں مدرسین کی بین الاقوامی کانگریس میں ایک روسی نوجوان بیٹھا بیئر پی رہا تھا۔ میں نے کہا (VODKA) وڈکا اپنی قومی شراب کیوں نہیں پی رہے ہو، تو اس نے کہا "وڈکا سے مجھے نفرت ہے"۔ چین کے لوگوں نے ہمیں فخر سے بتایا کہ شراب کا استعمال چین میں بڑھ رہا ہے کیونکہ لوگوں کی خوشحالی بڑھ رہی ہے۔ مگر وہ روز نہیں بلکہ ہفتہ میں ایک آدھ بار پی لیتے ہیں۔ پہلے تو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی تھی اب بڑے پیمانے پر سب پیتے ہیں۔

یورپ میں بھی ایسے لوگ ہیں جو گوشت شراب اور سگریٹ سے پرہیز کرتے ہیں۔ مگر ایسے خاصانِ خدا خال خال ہیں۔ بہت سے ملکوں کی سیاحی نے یہ حقیقت تو روشن کردی کہ حضرت انسان ایک ایسے جانور ہیں جو زندہ رہنے کے لیے سب کچھ کھاتے ہیں۔ نہ صرف کھاتے ہیں بلکہ ذائقہ دار بنا کر، لطف لے کر کھاتے ہیں ــــ اور پیتے بھی ہیں۔

راحتِ جاں

میری ولفورڈ، انگریز۔ لڑکی نہ صرف اچھی جرنلسٹ تھی بلکہ اچھی ماں، اچھی بیوی اور اچھی دوست ہونے کے علاوہ پکانے میں بھی استاد تھی۔ اس کا امریکی نژاد شوہر جان، اقتصادیات کا عالم عجیب خصوصیات کا نوجوان تھا۔ اسے عورتوں کے بناؤ سنگھار سے چڑ تھی، کہتا کہ مردوں کو اپنی طرف راغب کرنے کے لیے عورتیں ایسا کرتی ہیں۔ ناچ بھی اسے پسند نہیں تھا۔ کہتا کہ ناچ میں جو تھکن ہوتی ہے وہ ایک دو میل پیدل چلنے سے بھی پوری ہوسکتی ہے۔ میری نے اب تک خیام کا صرف نام سنا تھا پڑھا نہیں تھا۔ میں نے ویانا کے ایک دوست سے مانگ کر خیام کا انگریزی ترجمہ (فٹز جیرلڈ کا) اسے دیا۔ کچھ دیر بعد میں نے پوچھا کیا رائے ہے تمہاری خیام کے بارے میں۔ تو میری نے کسی قدر معذرت خواہی کے انداز میں کہا کہ جان نے خیام پڑھنے کے بعد کہا کہ کیا تم خیام پر ایک گھنٹہ ضائع کروگی؟ خیام کے اقتصادی نظریہ کو میں تمہیں دو منٹ میں سمجھا دوں گا بغیر پڑھے اس نے کتاب مجھے لوٹا دی، حقائق کی توجیہہ میں جان کا لفظ نظر بڑی حد تک میکانکی تھا۔

میں نے یہ قصہ ایرانی دوست ایرج اسکندری کو سنا دیا جو ان پر شاق گذرا۔ ایرج اسکندری ایران کی تودہ پارٹی کے سربرآوردہ قائد اور اس کی حکومت کے وزیر تھے۔ رجعت پرستوں کے ہاتھوں تودہ حکومت کی معزولی کے بعد وہ ویانا میں مقیم تھے ــــ نوآبادیاتی ــــ ممالک کی سیاست اور معیشت کے متعلق وسیع معلومات اور ان پر گہری نظر رکھتے تھے۔ سیاسی ہم خیالی کے ساتھ ہند ایرانی کلچر کے صدیوں پرانے رشتے بھی باہمی خلوص اور محبت کی بنیاد تھے

ایرج اسکندری کو حافظ و خیام کے علاوہ بہت سے جدید شعرائے فارسی (ہند و ایرانی) کے بھی ہزاروں شعر زبانی یاد تھے۔ ہم جب کبھی ملتے تو فارسی اشعار ہی میں گفتگو ہوتی۔ میں نے ان سے خاص طور پر ملک الشعرا بہار کی ایسی نظمیں جو اس سے پہلے نہ کہیں پڑھی تھیں نہ سنی تھیں۔ ایسے بھی موقعے ہوئے کہ کاظمی ان اشعار کو خوش الحانی کے ساتھ خاص ایرانی لہجہ اور طرز میں سناتا۔ مہین، اس کی بیوی گوشت بھونتی اور علی لہسن تراشتا اور کلام کے نکات سمجھاتا جاتا۔ ان تمام نعمتوں کا ویانا میں اکٹھا ہو جانا قدرت کی بے بہا دین تھی۔ میں ایرج اسکندری اور جان کے مزاج اور طبائع کے اختلاف کا لطف لیتا رہا۔ جان کو قائل کرنے کی کوشش فضول تھی۔ جان دوسری جنگ عظیم میں فاشسٹوں کے خلاف امریکی فوج میں بڑے عہدے پر فائز تھا مگر اب وہ اپنے وطن سے دور ویانا میں بے وطنی کے دن گذار رہا تھا کیونکہ امریکہ کے جنگ باز حکمران اس کے امن عالم اور بین قومی دوستی اور جنگ کے خلاف خیالات کو خطرہ سمجھ کر امریکہ میں داخل ہونے نہیں دیتے ہیں۔ الزام یہ تھا کہ وہ کمیونسٹ ہے مگر جان کھانوں کا شوقین تھا اور وہ بھی تیز کھانوں کا۔ کھانے کے وقت میز پر وہ پیاز، مرچ اور لہسن کاٹ کاٹ کر مہمانوں کی طرف بڑھاتا اور خود بھی مزہ لے کر کھاتا تھا۔

ذائقہ کی تلاش میں میں نے ویانا کے معروف اور غیر معروف سب ہی مقامات آزما ڈالے۔ فرنچ، اطالوی، روسی چینی، ہنگریرین، یوگوسلاوی سب کھانوں کا مزہ چکھا۔ ایک دو رسٹوراں ایسے ملے جہاں شام کا کھانا اپنے ڈھب کا مل جایا کرتا تھا۔ فٹ پاتھ کے کنارے شیشہ کی الماریوں میں لال لال مرچ کے گچھے، راہروؤں کو کام و دہن کی آزمائش کی دعوت دیتے ہیں اس کے نظارہ ہی سے منہ میں پانی آجاتا تھا اور احباب تو تقریباً تبدیلی ذائقہ کے لیے تیز کھانے گوارا کر لیتے مگر جان ایک ایسا تھا جو مزہ لے کر کھاتا۔ کھانوں کا ذائقہ تو خیر عام یورپین گھرانوں سے ہٹ کر کسی قدر تیز ہوتا تھا مگر ان کے نام بھی میرے لیے کچھ کم ترغیب کا باعث نہیں تھے۔ کوفتہ، قورمہ، کباب سیخ، شامی کباب، ایک اور کھانا جس کا نام تھا "شمشیر سلطان عبدالحمید" جو شاید محض مرچ کی تیزی کی مناسبت سے رکھا گیا ہے اور آخر میں ترکی میٹھا "راحت جاں" جسے ایران میں "راحت حلقوم" کہتے ہیں ذائقہ کی تکمیل کر دیتا۔ یہاں نہ صرف سیاح سفارت خانوں کے آفسر اور عملے والے بلکہ خود ویانا کے چٹورے ہر شام جمع ہوتے ہیں۔ رسٹوراں کی خاموش فضا میں سنگیت کے استادوں کی دھنیں ہلکے ہلکے سروں میں دل و دماغ پر خوشگوار اثر ڈالتی رہتی تھیں اور کانچ کی خوشنما انگیٹھیوں پر تازہ اور گرم گرم غذا میزوں پر پروسی جاتی۔ سردیوں میں قاب سے نکلتی ہوئی بھاپ، منظر میں اشتہا انگیز فضا پیدا کر دیتی تھی۔ یہ مزیدار کھانے سربیا اور مقدونیہ کے ہوتے جن پر ترکوں کی تہذیب کا گہرا اثر ہے۔ کام ختم کر کے فٹ پاتھ پر لگی ہوئی چھوٹی چھوٹی دکانوں پر گرم گرم (SA SEGS) ساسیج، چٹنی کے ساتھ بطور ناشتہ کھا لیا کرتا، اور شام میں اگر جیب میں پیسے ہوتے تو مرچوں والے رسٹوراں میں چلا جاتا۔ ایسا کھانا مہنگا تھا۔ اور گاہے گاہے نصیب ہوتا تھا۔

ہندوستان کے مقابلہ میں یورپ میں عام طور سے لوگوں کی صحت بہتر ہے جس میں آب و ہوا اور معاشی ترقی کے

ساتھ ساتھ غذا کو بڑا دخل ہے، غذا متوازن ہے، قوی ذائقہ کے پیش نظر جدید طب کی ہدایتوں پر عمل کرتے ہوئے دل و دماغ اور جسمانی صحت کے لیے ضروری اجزا غذا میں شامل ہیں۔ گوشت، روٹی، سبزی، چکناہٹ، پھل، الکحل، کافی وغیرہ میں غذا کے بہت عناصر شامل رہتے ہیں۔ مگر اچھی یا بری غذا کا انحصار اس پر بھی ہے کہ ہماری آمدنی کیا ہے؟ جس کی زبان پر مچھر، بگھارے بیگن، ابلاڑے کی بھاجی، کھٹی دال، قیمہ میتھی کی بھاجی چڑھے ہوئے ہوں اس کے سامنے یورپ کا خوانِ نعمت بھی ہیچ تھا۔ مگر آہستہ آہستہ ولایتی غذا گوارا ہونے لگی تھی۔ ایک دن میری نے کھانے پر بلایا کہا کہ ہندوستانی کھانا کھاؤ گے تم آج، میں کسی قدر وقت سے پہلے ہی ان کے گھر پہنچ گیا۔ میری نے گیاس کے چولھے پر چاول، ترکاری گوشت آدھ پون گھنٹے میں بنا دیئے۔ جان نے برتن دھوئے اور میز چن دی۔ اس دوران میں میں ان کی بچی سارا سے کھیلتا رہا جو مجھے میری ماں بن کر تھپک تھپک کر سلاتی اور کہتی کہ آنکھیں بند کرو۔ اس کی ماں سلانے کے لیے جو جو ترکیبیں کرتی ہوگی سارا نے وہ سب مجھ پر صرف کر دیں۔

میرے علاوہ ایک انگریز شاعر اور اس کی بیوی، ایک آسٹریائی مزدور اور اس کی انگریز بیوی بھی مدعو تھے۔ میں نے تو صرف مشروم ٹماٹو گوشت کا سالن چاول کے ساتھ کھایا۔ واقعی ہندوستانی سالن تھا میں حیران کہ میری نے آخر یہ بنایا کیسے؟ وہی مرچ مسالہ وہی خوشبو، وہی رنگ وہی ذائقہ۔ مہینوں بعد اس دن موچھوں پر تاؤ پسینہ آگیا دوسرے اور کسی کو تو کچھ نہیں ہوا مگر میں پیچش میں مبتلا ہو کر تین دن تک فراش رہا۔

کچھ دن بعد روما میں عالمی امن کونسل کے اجلاس میں روسی شاعر تخنوف سے ملاقات ہوئی جن سے میں پاریسٹ میں مل چکا تھا، پوچھا کہ یہاں کی غذا کیسے چل رہی ہے؟ میں نے کہا کہ اب معدہ "اس قدر" مہذب ہو گیا ہے کہ وہ ہندوستانی غذا کے خلاف بغاوت کر رہا ہے۔

میرزا ادیب کا زندۂ جاوید کارنامہ

صحرا نورد کے خطوط

کا

مصوّر ایڈیشن

چھپ گیا ہے

چھ روپے ——— مکتبۂ اردو لاہور

خواجہ غلام السیدین

زبان کا مسئلہ

مجھے بہت خوشی ہے کہ میں آج ایک دو سال پرانا وعدہ پورا کر رہا ہوں۔ ہندی پرچار سبھا نے عرصہ ہوا مجھے اپنے سالانہ کنونکیشن میں شریک ہونے کے لیے بلایا تھا۔ لیکن خدا بھلا کرے دفتری دھندوں کا کہ ان کی وجہ سے اب تک نہ آسکا۔ اس دیر کی معذرت کے ساتھ ساتھ مجھے آپ کا دلی شکریہ ادا کرنا ہے کہ آپ نے اس موقع پر مجھے یاد کر کے میری عزت بڑھائی۔ یہ احساس اس حالت میں اور زیادہ ہو جاتا ہے جب کوئی شخص یہ جانتا ہو کہ اسے اس عزت کو پانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میری زندگی پڑھنے پڑھانے میں اور دفتر کی چکی چلانے میں گذری ہے۔ زبان اور ادب کی خدمت کا کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا۔ البتہ انتاضرور سچائی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جو لوگ یہ کام کرتے ہیں ان کی میرے دل میں عزت ہے اور ان کے کام کے لیے پریم۔ ایسے ہی خاموش تمری کاموں کے ذریعہ قومیں بنتی ہیں۔ ہندی پرچار سبھا کے کام اور اس کی خاموش خدمت سے میں واقف ہوں لیکن نہ اس قدر جتنا ہونا چاہیئے۔ البتہ اس موقع پر آپ کے کام کو دیکھ کر یہ واقفیت بڑھ گئی ہے۔ مجھے کل ہی آپ کے کاموں کی ایک رپورٹ پڑھنے کا موقع ملا جس سے اندازہ ہوا کہ آپ نے دھیرے دھیرے پچیس برس میں اس کو کس طرح بڑھایا اور پھیلایا ہے۔ لیکن کسی کام کی قدر و قیمت کا اندازہ محض اس کے پھیلاؤ سے نہیں ہوتا بلکہ اس کے مقصد کی معقولیت اور دیانت سے ہوتا ہے۔ اگر مقصد کو سمجھداری کے ساتھ مقرر کیا گیا ہے تو تھوڑا کام بھی دور تک پہنچتا ہے اگر مقصد ہی درست نہیں تو جتنا بھی آپ آگے بڑھیں گے یا تیز چلیں گے اصل منزل اور دور ہوتی چلی جائے گی۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ آپ نے زبان کے بارے میں جو پالیسی رکھی ہے اس میں گاندھی جی کی نظر اور ہدایات کا فیض جاری ہے اور (اگر میں انکسار کے ساتھ عرض کر سکوں) اس میں مجھے ان خیالوں کا عکس بھی نظر آتا ہے جو زبان کے پرچار اور اس کے بنانے کے سلسلے میں برسوں سے میرے دل اور دماغ پر حاوی رہے ہیں۔ آپ نے اپنی رپورٹ میں اس پالیسی کو جس طرح بیان کیا ہے اس کو دھرانا بے موقعہ نہ ہوگا۔ ہم چاہتے ہیں کہ دیوناگری لپی میں ہندی زبان ملک کی عام زبان بنے۔ لیکن اس میں جو لفظ باہر سے آکر داخل ہو گئے ہیں ان کو قائم رکھا جائے اس زبان کو ایک ایسی سادہ اور میٹھی زبان بنانے کی ضرورت ہے کہ وہ کسی خاص طبقے یا جماعت کی زبان نہ سمجھی جائے بلکہ عام

جنتا کے دل کی پکار بن سکے۔ یعنی ہم ہندی کے اس اسٹائل اور روپ کے حامی ہیں جس کا ذکر ملک کے ودھان میں میں کیا گیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ سبھا سیاست اور زبان اور جاتی جھگڑوں سے بالکل الگ رہے اور مقامی زبانوں کی ترقی میں حصہ لے۔ اس طرح وہ بھی ۔ پھلے پھولیں گی اور ہندی ان کے اور ملک کے سارے حصوں کے درمیان ایک پُل کا کام دے گی"۔ کارکنوں کی یہ پالیسی ہر طرح قدر کے قابل ہے اور یہ خوشی کی بات ہے کہ زبان کے اس طوفان میں جس نے پچھلے دس برس میں اپنا سر اٹھایا ہے آپ کے قدم نہیں ڈگمگائے۔

اس موقع پر آپ کے کاموں کے بارے میں کسی مفصل تنقید کی ضرورت نہیں کیونکہ یہاں زیادہ تر دوست ایسے ہیں جو اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ایک لاکھ آدمیوں کو ہندی پڑھانا۔ قیدیوں اور ہریجنوں کی تعلیم کا انتظام کرنا، استادوں کو ٹریننگ دینا۔ دو اسکول اور ایک کالج چلانا، پستکالیوں کا قائم کرنا اور علمی اور عام دلچسپی کی کتابوں کا شائع کرنا۔ جن میں بچوں، بالغوں اور تعلیم یافتہ لوگوں کے مذاق کی چیزیں شامل ہیں۔ ایک اچھے پریس کا قیام، یہ سارا پروگرام آپ کے مقصد کی خوبی اور وسعت کا ثبوت ہے۔ مجھے خاص طور پر اس بات کی خوشی ہے کہ آپ کی اس سنستھا نے صرف حکومت ہی سے نہیں بلکہ دوسری زبانوں کی انجمنوں سے بھی مل جل کر کام کیا ہے اور ان کے ساتھ قدم ملا کر آگے بڑھنے کی کوشش کی ہے زبان کی سیوا میں تنگ خیالی اور سرمایہ داری بڑی خطرناک چیزیں ہیں۔ شکر ہے کہ آپ نے اپنے دامن کو ان سے پاک رکھنے کی کوشش کی ہے، میں اس بات پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔

دوستو! دیس کے آزاد ہونے کی وجہ سے ہم پر بہت سی نئی ذمہ داریاں اور نئے بوجھ پڑے ہیں۔ لیکن تمام کٹھنائیوں کے باوجود ہمارا فرض ہے کہ ہم ہمت اور خوش دلی کے ساتھ انہیں اٹھائیں اور کتنے بہت سے اور مختلف کام ہیں یہ۔ دیس کی مالی حالت کو سدھارنا اور جنتا کی زندگی کے معیار کو بڑھانا ہے صنعت و حرفت اور کھیتی باڑی کو پھیلانا اور نئے ترقی یافتہ راستوں پر ڈالنا ہے دیس سے بیماری اور جہالت کو نکالنا ہے۔ دلوں سے تنگی اور دماغوں سے اندھیرے کو نکالنا ہے۔ ریت رسم اور ذات پات کے جو بندھن ہماری زندگی کو لوہے کی سی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں ان کو توڑنا ہے۔ دو صدیوں کی غلامی نے ہماری رچناتمک شکتیوں کو جو زنگ لگا دیا ہے اس کو صاف کرنا ہے۔ ملک میں جو دل توڑنے والے بھید بھاؤ پیدا ہو گئے ہیں، جن کی وجہ سے خود آزادی کی سندر کشتی بھنور میں آتی معلوم ہوتی ہے ان کو ختم کرنا ہے، اور صرف دیس کے اندر ہی نہیں بلکہ دیس کے باہر دنیا میں بھی جو آج گویا ہمارے دروازے پر آکر کھڑی ہو گئی ہے۔ امن و شانتی کے خیال کو پھیلانا ہے، ورنہ اندیشہ یہ ہے کہ ہماری ساری تہذیب اور تمدن ہمارے کلا کے امر شاہکار ہماری قدریں ہماری زندگی کے سنہری اصول جنھوں نے صدیوں کی جانچ کرنے والی آنکھوں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا ہے، ہمارے بھگتوں کے گیت، ہمارے صوفیوں کا تصوف، ہمارے ادیبوں کا ساہتیہ، یہ سب چیزیں جنگ کی آگ میں بھسم ہو جائیں گی۔ اسی وجہ سے تو

شاعر نے آج سے پچاس برس پہلے یہ سندیسہ دیا تھا ؎

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

میں اس موقع پر یہ ذکر کیوں کر رہا ہوں۔ ایک تو یہ یاد دلانے کے لیے کہ ہماری قومی زندگی کی بنیو محض دھن دولت اور قوت کی تلاش پر نہیں رکھی گئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بلکہ بعض اخلاقی سدھانتوں پر رکھی گئی ہے جن کا پالن ہمارا فرض ہونا چاہیئے، اس بات کو بار بار دھرانے کی ضرورت ہے۔ آج کی دنیا میں اور خود ہمارے دیس میں ایسے لوگ اور گروہ موجود ہیں جو چاہے زبان سے ان اصولوں کا دم بھریں لیکن اصل میں ان کے من میں زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ ہر ممکن طریقے سے اپنے لیے دولت، قوت اور اختیار حاصل کریں۔ موجودہ دور کی تباہ کاریوں کے رعب میں آکر ان کا خیال یہ ہو گیا ہے کہ شانتی کا پیغام خواہ وہ پرانے رشیوں، منیوں اور نبیوں اور صوفیوں نے دیا ہو یا گاندھی اور نہرو کی زبان اور دل سے نکلا ہو اس زمانہ کی ضرورتوں سے اس کی آب و ہوا سے اس کی راج نیتی سے میل نہیں کھاتا۔ یہ زمانہ تو قوت اور اہنسا کی رسہ کشی کا ہے۔ مدت ہوئی ایک مشہور انگریز اخبار نویس نے اس بھٹکی ہوئی ذہنیت کی تصویر ان لفظوں میں کھینچی تھی۔

"اب کسے فکر ہے کہ تصویریں بنائے یا شاعری کرے یا زبان کے میدان میں معنی پیدا کرے۔ ملنے کی ساعت کے بارے میں دماغ لڑائے۔ یہ تو ایسا معلوم ہوگا جیسے روم میں آگ لگی ہو اور کوئی بیٹھا بانسری بجائے۔ کسے فکر ہے کہ اخبار اور رسالے اور کھاتہ پروشائی یا بضاعیں فکر انگیز جملے بکھیرے۔ وہ تو جنگ کے نقار خانے میں طوطی کی آواز بن جائیں گے یا ان۔ ۔ ۔ ۔ آشاؤں اور سپنوں کا نوحہ پڑھے جواب باسی ہو گئی ہیں۔ اب فکر کا چراغ جلانے سے کیا حاصل۔ پیادہ فوجوں (اور ہوائی جہازوں اور ٹینک اور ہائیڈروجن بموں) کے مقابلے میں ایک نقاد کی یا زبان جاننے اور سکھانے والوں کی کیا حیثیت ہے"

مگر میں صاف طور پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ یاس اور نا امیدی کا پیغام ہے۔ اگر ہمیں زندگی کو ایک سندر روپ میں ڈھالنا ہے تو ہمیں مادّی قدروں کے ساتھ ساتھ لیکن اس سے کہیں زیادہ ادبی اور اخلاقی قدروں سے رشتہ جوڑنا ہوگا اور دیس میں اس زندگی کی عمارت بنانے کے لیے نئی بنیادیں ڈالنی ہوں گی۔ ان بنیادوں میں ایک بہت اہم بنیاد زبان ہے جو فرد اور قوم دونوں کی زندگی میں اس طرح رسی بسی ہوئی ہے جس طرح شریر میں آتما یا جگ میں روشنی۔ زبان ہی کے ذریعہ ہمارے وچاروں میں صفائی پیدا ہوتی ہے اور دل کی بات سانچے میں ڈھل کر سامنے آتی ہے۔ اسی کی مدد سے ہم اپنے پاس اور دور کے ساتھیوں کے ساتھ بات چیت کرتے اور میل جول رکھتے ہیں۔ ورنہ ہماری حالت ایسی ہوتی ہے جیسے ایک بہت بڑے ساگر میں پھیلے ہوئے جزیرے جن کا ایک

دوسرے کے ساتھ کوئی سمبندھ نہ ہو۔ یہی زبان ہے جو کہیں بچوں کی توتلی بولی کی شکل میں ہمارا دل لبھاتی ہے یا کہیں ٹیگور کے گیتوں کے سانچے میں ڈھل کر دلوں کو ٹھنڈک پہنچاتی ہے، کہیں ابوالکلام آزاد کی تقریر اور سروجنی دیوی کی شاعری بن کر ان میں آگ لگاتی ہے ہمت اور جوش اور حوصلے کی آگ اور کہیں گاندھی کی سیدھی سادی دل سے نکل کر دل میں اتر جانے والی بولی میں دنیا کو پریم اور شانتی کا پیغام پہنچاتی ہے۔ کتنی بڑی نعمت ہے یہ خدا کی! جس نے انسان کو دوسرے تمام حیوانوں سے الگ اور اونچا کر دیا ہے۔ اس شان سے کہ انسان کی تعریف ہی "حیوان ناطق" یعنے بولنے والا جانور قرار پائی۔ لیکن کیسے اچنبھے کی بات ہے یہ دوستو اور عزیزو کہ یہی زبان بجائے دلوں کو جوڑنے کے دلوں کو توڑنے کا ذریعہ بن جاتی ہے اور اپنی زبان سے محبت جو ایک قدرتی اور شریفانہ جذبہ ہے۔ دوسری زبانوں سے نفرت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ زبان تو ایک امر اور امٹ دھن ہے اور جو شخص اس کو بولتا اور برتتا ہے وہ اس دھن میں شریک ہو جاتا ہے جو شخص ایک زبان جانتا ہے وہ مقابلتہً غریب ہے دھنوان نہیں جو شخص کئی زبانیں جانتا ہے وہ زبان بھی جو اس نے اپنے ماں کے دودھ کے ساتھ پائی ہے اور وہ زبانیں بھی جو دوسروں نے اپنی ماؤں کے دودھ کے ساتھ پی ہیں وہ بہت زیادہ دولت کا مالک ہے۔ ان کی بدولت اس کے لیے دوسرے لوگوں اور ملکوں کی تہذیب اور تمدن ذکر و فکر، ساہتیہ اور کلا، سائنس اور فلسفے کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ لیکن نہ معلوم یہ کیا ستم ظریفی ہے کہ بجائے اس سیدھی سادی اور صاف بات کو سمجھنے کے نہ صرف ہمارے دیس میں بلکہ دنیا بھر کی تاریخ میں زبان کے جھگڑے فتنوں نے نفرت اور تعصب کی آگ کو بھڑکایا ہے۔ اس وقت دنیا بھر کا ذکر تو کیا کروں لیکن پچھلے چند سالوں میں ہندوستان کے صوبوں اور ریاستوں ہی میں نئی تقسیم کے وقت جو فتنہ بپا ہوا اس کی یاد ابھی تک کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے۔ ہمارے دل میں جی چاہتا ہے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر جو آپ کی دعوت نے مجھے دیا ہے نہ صرف آپ کے کام کو سراہوں کہ آپ دیس کی مختلف زبانوں کے بیچ میں مفاہمت کے پل بنا رہے ہیں بلکہ ان سب لوگوں کے دلوں کو ٹھنڈا کروں جنھوں نے اس گر کو نہیں پہچانا بلکہ اپنی ناسمجھی اور ضد سے زبان کی تلوار کے ذریعہ بھارت ماتا کے ٹکڑے کرنے کی کوشش کی ہے۔ معاملہ صرف ہندی اردو کا نہیں ہندی انگریزی کا نہیں ہندی اور غیر ہندی زبانوں کا نہیں بلکہ ساری زبانوں کے باہمی رشتے کا ہے۔ ہمارے اس دیس میں جہاں کثرت بھی ہے اور وحدت بھی۔ دوئی بھی ہے اور ایکتا بھی جو بہت سی دور دراز کی تہذیبوں اور دیہار دھاراؤں کا سنگم ہے ہمارے لیے عقل کا راستہ ایک ہی ہے کہ ہم سب زبانوں کا سواگت کریں کہ وہ ہمارے پیارے دیس کی زبانیں ہیں۔ ہم اپنی مادری زبان اس لیے سیکھیں کہ اس زبان میں ہم دیہاروں اور بھاؤناؤں کو زیادہ سے زیادہ خوبصورتی کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔ ہندی زبان سیکھیں کہ وہ ملک کے ایکتا کو ظاہر کرنے اور مضبوط کرنے کا ذریعہ ہے۔ دیس کی دوسری زبانیں سیکھیں کہ وہ ہمارے دوستوں اور پڑوسیوں اور دیس باسیوں کی

زبانیں ہیں۔ دوسرے ملکوں کی بھاشاؤں کو سیکھیں خاص کر انگریزی کو جس کے ذریعہ ہم نہ صرف مغرب کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑ سکتے ہیں بلکہ دنیا کے دوسرے دیسوں کے ساتھ بھی بات چیت میل جول لین دین کر سکتے ہیں۔ اس میں جھگڑے اور فساد کا تلخی اور تشدد کا موقع کونسا ہے؟ میں یہ نہیں کہتا کہ ہر شخص کو سب زبانیں سیکھنی چاہئیں۔ یہ تو ممکن ہی نہیں۔ لیکن یہ ضرور کہتا ہوں کہ ہر شخص کو حق ہے کہ وہ جتنی زبانیں چاہے سیکھے۔ اپنی زبان اچھی طرح سے سیکھے اور اس میں تعلیم پائے اور ہندی کو اس حد تک پڑھے کہ ملک کے کسی حصہ میں بھی خود کو اجنبی سا محسوس نہ کرے۔ ہندی اور اُہندی زبانوں کا جھگڑا اس وجہ سے بھی بے معنی ہے کہ ان کے میدان الگ الگ ہیں۔ دکھن اور یورپ کے پرانتوں میں اگر ایسی زبانیں بولی جاتی ہیں جن کا رشتہ ہندی سے دور کا ہے تو اس کے یہ معنی تو نہیں کہ اپنے دور کے رشتہ داروں کے ساتھ ایک گھر میں امن اور آشتی کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ اور یہ گھر کوئی تنگ یا چھوٹا سا گھر بھی تو نہیں ہے۔ دنیا کی آبادی کا کوئی پانچواں حصہ اس گھر میں رہتا ہے۔ ہندی کو ان سب زبانوں کی دین سے اپنی جھولی کو بھرنا ہے تاکہ وہ ملک کے دل کی دھڑکن اور پکار کی ترجمانی کر سکے اور ساتھ ہی ان سب زبانوں کو ہندی کا کھلے دل سے سواگت کرنا ہے تاکہ وہ اس کو بھی اپنی ہی دولت میں شمار کریں۔

اس سلسلے میں ہندی، ہندوستانی اور اردو کا قصہ بھی اٹھتا ہے اس کا کارن سمجھنے سے تو میں بالکل ہی معذور ہوں بلکہ شائد یہ کہنا چاہیے کہ سمجھ تو سکتا ہوں ایک حد تک لیکن اس قضیے کو بڑھانے والوں کی سمجھداری میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کارن تو یہی ہے کہ انگریزوں نے دلوں میں فرق ڈالنے کے لیے جہاں اور بہت سی تدبیریں اختیار کیں وہاں ہندی اور اردو کے فرق کو چمکایا اور بڑھایا اور تف ہے ہماری بھول اور نادانی پر کہ ان دونوں زبانوں (بلکہ ایک ہی زبان کے دو سنگاروں) کو بنانے میں ہم سب نے جو حصہ لیا تھا اس کو بھلا کر ہم ان کی چال میں آ گئے اور اپنا مشترک ورثہ قبول کرنے سے انکار کر دیا ؎

وائے بر سادگیٔ ما کہ فسونش خوردیم
رہزنے بود کہ دور رہ مردم زد

افسوس ہے ہماری سادگی پر کہ ہم اس کے جھانسے میں آ گئے۔ ایک ڈاکو سنتا جوگھات میں آ بیٹھا اور اس نے راستہ چلتوں کا راستہ کاٹ ڈالا۔ اور ایسا کاٹ ڈالا کہ ابھی تک ہم صحرا میں بھٹک رہے ہیں۔ پھر اس کے بعد جب ہماری بدقسمتی ہندوؤں اور مسلمانوں کے جھگڑوں کی شکل میں ظاہر ہوئی تو ہندی کو ہندوؤں کے ساتھ اور اردو کو مسلمانوں کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا اور جو زہر اور کڑواہٹ سیاسی رشتوں میں پیدا ہوئی تھی وہ منہ اور زبان میں بھی سرایت کر گئی ملک کی تمام زبانوں میں کوئی زبان بھی ہندی کے اس درجہ قریب نہیں جتنی اردو۔ دونوں زبانوں میں ساٹھ فیصدی سے زیادہ لفظ ایک ہیں۔ زبان کا عام کینڈا اور گریمر ایک ہے سارے فعل اور بیشتر اسم

ایک ہیں۔ فرق جو ہے وہ زیادہ تر اسمائے صفت کا ہے جو زبان کی آرائش اور تراش و خراش کے لیے استعمال ہوتے ہیں، اور اس کے سنگھار کا ذریعہ ہیں۔ اردو نے یہ سنگھار کا سامان زیادہ تر فارسی عربی سے لیا اور ہندی نے سنسکرت سے۔ لیکن اس کے باوجود وہ ابتداء میں اس قدر گھلی ملی اور شیر و شکر تھیں کہ مدت تک اردو نے ہندی کے نام کو اپنایا اور اس کے ساتھ کبھی غیریت کا خیال دل میں نہ آیا۔ دونوں زبانوں کے لیکھکوں اور ودوانوں نے بھی تنگ دلی نہیں دکھائی بلکہ ہندی کے شبد ساگر میں ہزاروں عربی، فارسی اور خالص اردو کے لفظ اور اردو کی مستند لغات میں ہزاروں ہندی اور سنسکرت سے نکلے ہوئے لفظوں نے مہمانوں کی حیثیت سے پناہ لی۔ اور بولنے والوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور میزبانوں کی طرح ان کی آؤ بھگت کی۔ اردو زبان کے بہت سے شاہکار اس تحریک کی گواہی دیتے ہیں۔ دور کیوں جایئے اقبال کا یہ شوالہ۔ حالی کی مناجات بیوہ ۔ راجہ رادھیکا پرشاد سنہا کی نثر (جس کو ہندی والے ہندی، اردو والے اردو اور ہندوستانی والے ہندوستانی کہہ سکتے ہیں) اس بات کا ثبوت ہیں کہ اردو میں ہندی لفظوں کی کھپت بشرطیکہ سلیقے کے ساتھ کی جائے اس کی سندرتا کو بگاڑتی نہیں سنوارتی ہے۔ اس طرح اردو فارسی لفظ صرف شبد ساگر کی پونجی میں جمع نہیں بلکہ انھوں نے شاعری اور ادب کے علاوہ ہندوؤں کی مقدس کتابوں رامائن اور مہا بھارت کے ترجموں میں بھی بار پایا ہے۔ اس لیے اردو ہندی کا بیر عقل کی دشمنی ہے اور پرائے شگون کے لیے اپنی ناک کٹانا۔ اگر اردو کی چیزیں ہندی لپی اور ہندی کی اردو رسم الخط میں شائع کی جائیں اور لکھنے والے دور بھاگنے کے بجائے ایک دوسرے کے قریب آنے کی کوشش کریں اور قبول عام کو اپنی کسوٹی بنائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ دونوں زبانیں ایک دوسرے کی دولت سے مالا مال نہ ہوں۔ کہاں سے زبان لاکر کہوں کہ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ لفظوں کا جغرافیہ نہیں ہوتا۔ ان کے باپ دادا کی تلاش ان کے ابتدائی وطن کی کھوج لگانے کی کوشش علمی ریسرچ کے لحاظ سے تو اچھی چیز ہے لیکن اگر اس کا مقصد ان کی ذات پات کی چھان بین کر کے ان کا حقہ پانی بند کرنا ہے تو اس سے زیادہ حماقت کیا ہو سکتی ہے۔ جو لفظ ہماری زبان میں آکر کھپ گیا وہ ہمارا ہے چاہے سنسکرت سے آیا ہو یا فارسی سے یا انگریزی سے یا دلندیزی سے اس کو ہاتھ سے دینا اپنے دھن کو برباد کرنا ہے۔ اردو میں ہندی کے جو سندر لفظ ہیں ان کو آدر اور پریم کے ساتھ اپنائیے۔ اس کو زبردستی شدھ کرنے کی کوشش سنسکرت کے اپریچت شبدوں کی ٹھونس ٹھانس اردو فارسی لفظوں کو شہر سے نکالنے کا جذبہ یہ چیزیں تو ہماری قومی تہذیب اور پریم پرا کے خلاف ہیں۔ ایک زمانہ اردو پر بھی ایسا ہی گذرا ہے جب اس میں ایک تنگ دلی اور عربی اور فارسی لفظوں کی اندھی بھرمار سے ایک سختی اور اجنبیت پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ ذرا جلد ہی سنبھل گئی۔ اب اس کی قوت اور زندگی اسی میں ہے کہ وہ جنتا کی بول چال سے اپنا رشتہ نہ توڑے اور مجھے یقین ہے کہ ہندی کے سچے سیوکوں اور پریمیوں کی آشا اور کوشش بھی یہی ہے کہ وہ بھی اس ڈگر پر چلے اور اس منزل کی

طرف قدم اٹھائے۔ جوں جوں دلوں میں صفائی ہوگی زبان بھی صاف ہوتی چلی جائے گی کیونکہ اس کو کسی مصنوعی تحریک کے ذریعہ یا سرکاری حکم سے نہ بدلا جاسکتا ہے نہ بگاڑا جاسکتا ہے نہ بنایا جاسکتا ہے۔ وہ تو لوگوں کی بول چال اور میل جول سے پیدا ہوتی ہے اور ان کے دلوں اور دماغوں کی ترجمانی کرتی ہے اور پھر ادیبوں اور شاعروں اور دوسرے لیکھکوں کی محنت اور خلاقی اور کلاکاروں کی پتیسا سے اس میں تراش خراش آتی ہے اور اس کے طبعی وہ بنتی اور سنورتی اور رنگ روپ لاتی ہے۔ دنیا کے اتہاس میں زبانوں کی ترقی ہمیشہ اسی ڈھنگ سے ہوئی ہے۔ ہم اس کے خلاف نہیں جاسکتے۔ ہمارے لیے یہ مسئلہ صرف زبان کا نہیں بلکہ ملک کی ایکتا اور قوم کی زندگی کا ہے دلوں کو ملانے کے لیے ایک ملی جلی صاف اور شستہ زبان کی ضرورت ہے اور زبان کو بنانے کے لیے دلوں کے میل اور محبت کی۔ یہ مسئلہ ہمارے دیس کے سارے دوسرے سوالوں سے زیادہ اہم ہے۔ اگر ہم نے اپنے خیالات اور جذبات میں ایکتا اور ہم آہنگی پیدا نہیں کی۔ اگر ہم دیس کے لوگوں میں وہ (EMOTIONAL INTEGRATION) نہیں لاسکے جس پر آئے دن پنڈت نہرو زور دیتے رہتے ہیں تو ملک کے بھوشن کا وہ سندر نقشہ جس کا خواب ہمارے نیتا اور کوی اور مفکر دیکھتے آئے ہیں خطرے میں پڑ جائے گا۔ لیکن یہ خیال رہے کہ ہمیں یہ وحدت کثرت کی گونا گونی میں پیدا کرنی ہے۔ ہم یہ نہیں کرسکتے کہ ۳۵ کروڑ لوگوں کے وچاروں اور الگ الگ طور طریقوں پر ایک اسٹیم رولر چلا کر انھیں زبردستی ایک ہی سانچے میں ڈھال دیں وہ راستہ ڈکٹیٹر شپ کا راستہ ہے جس کو ہم نے کبھی سوچا رہنیں کیا اور ہم کبھی سوچا رنہیں کریں گے۔ ہمیں اپنے دل اور دماغ کے دریچے کھلے رکھنے ہیں تاکہ ان میں سارے سنسار کی حیات بخش کرنیں اور ہوائیں داخل ہوسکیں جب کبھی ہم نے اپنے دیس کی اور پردیس کی اچھی چیزوں کا سواگت کیا ہے اور انھیں کھلے دل سے اپنایا ہے دیس آگے کی طرف بڑھا ہے جب کبھی ہم نے ان دروازوں اور کھڑکیوں کو بند کرلیا ہے اور پانی کے بہاؤ میں زور نہیں رہا قومی زندگی سست اور افسردہ اور پچھڑی ہوئی رہ گئی ہے۔ زبان کے معاملے میں بھی ہمیں اسی اصول کو اپنانا ہے۔ جو لوگ اور سنستھائیں ہندی پرچار میں . . . . . کام کررہی ہیں انھیں خاص طور پر اس بات کو یاد رکھنا چاہیئے کہ دلوں کی گرہ محبت سے کھلتی ہے اس کو قینچی سے نہیں کاٹا جاسکتا۔ اگر انھیں یہ یقین ہوگا کہ ہندی ایکتا اور پریم کی راج دوت بن کر آرہی ہے وہ خوشی کے ساتھ اس کا سواگت کریں گے۔ اگر انھیں یہ اندیشہ ہوگا کہ وہ ایک حاکم زبان بن کر دوسری زبانوں کا حق چھیننا یا ان کی آتما میں روڑے اٹکانا چاہتی ہے تو وہ اس کا مقابلہ کریں گے۔ اس لیے اس معاملے میں صرف یہی کافی نہیں کہ آپ کی نیت صاف ہو بلکہ ان لوگوں کو اطمینان دلانا ضروری ہے جن کے لیے آپ کام کررہے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ دلوں کے میل کو اور بھید بھاؤ کے جذبے کو دور کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس کی رگیں سرطان کی طرح قوم کے جسم کے اندر پھیلی ہوئی ہیں۔ لیکن اس کا علاج صرف ایک ہے اور وہ ہے انصاف کی پالیسی۔ سب زبانوں کے ادھیکاروں کے ساتھ انصاف اور ان کو ہنسی خوشی کے ساتھ ان کا حق دینے کے لیے آمادگی۔ دنیا کے جتنے کٹھن جھگڑے ہیں خواہ وہ کسی میدان

میں ہوں ان سب کی بنیاد انیاے پر ہے۔ شاعر نے سچ کہا تھا کہ ؎

دل صاف ہو کس طرح کہ انصاف نہیں ہے
.... انصاف ہو کس طرح کہ دل صاف نہیں ہے

دلوں کو صاف کیجئے کھوٹ کپٹ کو نکالیے انصاف کا دامن تھامیے اور پھر دیکھیے کہ کس طرح مشکلوں کے پہاڑ رائی بن جاتے ہیں۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ ہندی پرچار سبھا نے اتنے برسوں میں کبھی اس اصول کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا بلکہ یہاں دوسری زبانوں کی جو سنستھائیں ہیں ان کے ساتھ مل جل کر کام کیا ہے اور راسی اسکیموں کو ہاتھ میں لیا ہے۔ جن کے ذریعہ یہ سب زبانیں ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہو سکتی ہیں اور ایک دوسرے کی دولت سے لابھ اٹھا سکتی ہیں۔ یہی راستہ شرافت، رواداری و سمجھداری کا راستہ ہے ورنہ زبان کی بنیاد پر اگر ملک میں بہت سے پاکستان بن گئے تو میں آپ کو بشارت دیتا ہوں کہ اس کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیں گے۔ ملک کے تمام بہی خواہوں کا فرض ہے کہ وہ اس اندیشہ کی روک تھام کریں اور ان میں شامل ہیں نہ صرف ہمارے سیاسی لیڈر بلکہ ہمارے ادیب اور شاعر اور اسکولوں اور کالجوں کے ودیارتھی اور اساتذہ اور سماج سیوک اور وہ سب لوگ جو اپنی تعلیم یا پوزیشن کی بدولت دوسروں کے خیال پر اثر ڈال سکتے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ جسے ہم سب کو مل جل کر جیتنا ہے۔

نیا دور کا آئندہ شمارہ

"طویل کہانی نمبر" ہوگا

"طویل کہانی نمبر" مئی کے اواخر تک شائع ہو رہا ہے۔

طویل کہانی نمبر میں آپ کے یہ لکھنے والے شامل ہیں

غلام عباس۔ عزیز احمد۔ ممتاز شیریں۔ انتظار حسین
بلونت سنگھ۔ شوکت صدیقی۔ ابو الفضل صدیقی
ضمیر الدین احمد۔ صادق حسین۔ انور عظیم، واجدہ تبسم

اور دوسرے

منیجر۔ نیا دور۔ کراچی ۵

مہر نیمروز

ماہنامہ ——— کراچی

پاکستان کا معیاری اور صحت مند ادبی جریدہ
جسے تمام بلند پایہ ادیبوں اور شاعروں کا تعاون حاصل ہے

پاکستان میں ارسال زر کا پتہ

محمد حسان، دفتر مہر نیمروز، ہاؤسنگ یونین ایریا کراچی ۵

ہندستان میں ارسال زر کا پتہ

شاہ محمد زید۔ خانقاہ سلیمان
پھلواری شریف، ضلع پٹنہ

غلام ربّانی

کتبات اور شاعری

کتبے پڑھنا بڑی دیدہ ریزی اور پتہ ماری کا کام ہے مگر یہ کام دلچسپ بہت ہے اور جتنا دلچسپ ہے اتنا ہی اہم بھی ہے۔ خصوصاً ہندوستان کے کتبے پڑھنا بہت ضروری ہے کیونکہ قدیم ہندوستان کے بڑے تاریخی مواخذ یہی کتبات ہیں۔ بات یہ ہے کہ پہلے زمانے میں یہاں تاریخ لکھنے کا رواج نہیں تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ قدیم ڈراموں، قصص، روایات، تاریخی افسانوں اور رزمیہ نظموں میں ملک کے بعض فرمانرواؤں اور ان کے کارناموں کا ذکر موجود ہے بلکہ بعض قصّوں کے ہیرو یہاں کے راجا مہاراجا ہیں اور پوری کہانیاں ان کے گرد گھومتی ہیں مگر یہ کتابیں تاریخ کی تعریف میں نہیں آتیں۔ کوئی سوا سو (۱۲۵) برس سے ہندوستان کے کتبوں کا مطالعہ جاری ہے اور محض ان ہی کتبات کا طفیل ہے کہ ہندوستان کی قدیم تاریخ بہت کچھ مدوّن ہوگئی ہے۔

ہمارے ملک کا ہر حصہ کتبوں سے مالا مال ہے۔ یہ قدیم تحریریں، مختلف قسم کے پتھروں اور چٹانوں پر موجود ہیں۔ پرانی لاٹھوں، میناروں، اور قلعوں کے دروازوں پر ہیں۔ مذہبی عمارتوں کے ستون اور دیواریں ان سے خالی نہیں۔ دیوی دیوتاؤں کے پالیوں پر بھی ہیں، لوہے، تانبے، پیتل، کانسی کی تختیوں اور سونے چاندی کے برتنوں، مہروں پر بھی ہیں، بعض جگہ لکڑی میں بھی محنت کیے گئے ہیں۔ قدیم مٹی کے برتنوں اور مہروں پر بھی ہیں۔ یہ کتبے کھروشٹی، سنسکرت، پالی، پراکرت، مرہٹی، تلگو، کنڑی، تامل، ملیالم، عربی اور فارسی وغیرہ مختلف زبانوں میں ہیں مگر آج کی اس مختصر صحبت میں صرف فارسی کتبات سے بحث کی جائے گی۔ ان میں ایسے کتبوں کا ذکر نہیں ہوگا جو تاریخی اہمیت رکھتے ہیں یا خطاطی کے نایاب نمونے ہیں۔ صرف وہ کتبے لیے جائیں گے جو نظم میں ہیں اور شاعری کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔

پٹھانوں کے ابتدائی دور کے کتبے عربی اور فارسی میں ہیں، یہ عموماً سیدھی سادی نثر میں ہیں جن میں سلاطین وقت کے نام ان کے لمبے چوڑے القاب کے ساتھ کندہ ہیں۔ ہندوستان میں فارسی کا سب سے پرانا کتبہ اٹاوہ (ضلع جھانسی) میں ہے یہ کتبہ علاءالدین خلجی نے ۱۳۰۳ء میں اس قصبہ کے پارسی دروازہ کی تعمیر کے وقت نصب کروایا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ پٹھانوں کی حکومت میں آئے دن انقلاب کی آندھیاں آتی رہتی تھیں جس سے اس عہد میں ادب کچھ ترقی نہ

کرسکا، البتہ لودھیوں کے زمانہ میں ملک میں تعلیم عام ہوگئی اور ادبی مذاق بھی اچھا ہوگیا تھا۔ اس عہد کے کتبے نظم میں بھی ہیں۔ جس طرح مختلف زبانوں میں ادب میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، اسی طرح ہر عہد کی تحریر کو دیکھ کر اس کی عمر کا اندازہ بھی بدل جاتا ہے اور ماہرین کتبات پرانی تحریر کو دیکھ کر اس کی عمر کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ ٹیچانوں کے عہد کے کتبے عموماً خط نسخ میں ہیں یا ثلث میں، ان میں اگر تاریخ کندہ نہ ہو تو بھی ماہرین ان کے خط کی وضع سے ان کو پہچان لیتے ہیں۔

مغلوں کا زمانہ علم وفن کی ترقی کا زمانہ تھا چنانچہ اس عہد میں کتبات کا معیار بھی بلند ہوگیا تھا بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ کتبہ نویسی ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ تاریخ گوئی کا رواج بہت پرانا تھا، چنانچہ یادگار کی نوعیت کے لحاظ سے اس کا مادہ تاریخ نکالا جاتا اور اس کو دل نشین پیرایہ میں نظم کردیا جاتا تھا۔ اگر کتبہ نثر میں ہوتا تو پوری عبارت مقفیٰ اور مسجع ہوتی تھی۔ اس زمانہ میں کتبوں کے لیے شعر کہنا ہر کس وناکس کا کام نہیں تھا اس کے لیے بڑے بڑے اساتذہ پر نظر پڑتی تھی اور جو کتبے شاہی فرمان سے نصب ہوتے تھے وہ عموماً ملک الشعراء سے لکھوائے جاتے تھے۔ محمد معصوم بکھری اکبری دور کا شاعر تھا۔ نامی تخلص کرتا تھا۔ اکبر کے عہد کے بہت سے کتبے نامی کے کہے ہوئے ہیں جو قندھار۔ آگرہ۔ فتح پور سیکری، ناگور، مانڈو، دھار، اجین وغیرہ دوسرے مقامات پر موجود ہیں۔ نامی کے کلام میں درد بہت ہے اس کے بعض اشعار اور دیگر (ضلع بیدر) کی عمارتوں پر بھی موجود تھے۔

آگرہ کے قلعہ میں جہانگیری محل اور دیوان خاص بڑی پاکیزہ عمارتیں ہیں۔ دیوان خاص شاہجہاں کا بنوایا ہوا ہے اس پر کلیم کا ایک طویل کتبہ موجود ہے۔ مرزا طالب کلیم ہمدانی شاہجہاں کے دربار کا ملک الشعرا تھا۔ مولانا شبلی نے شعر العجم میں اس کی معنی آفرینی کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس کتبہ میں بھی اس نے بلند پروازی دکھائی ہے۔ کتبہ کا مطلب ہے .....

"اس قصر دلکشا کی کرسی اتنی بلند ہے کہ اکبرآباد کا سر عرش سے جا لگا ہے۔ اس کے کنگرے آسمان کی ..... پیشانی سے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے سپہر کے "س" کے دندانے۔ اس ایوان میں سجدہ کرنے سے پیشانی کی بڑی تحریر مٹ جاتی ہے۔ رعایا کا احوال بادشاہ پر روشن ہے وہ یہاں تک جانتا ہے کہ لوگ رات کو خواب میں کیا دیکھتے ہیں۔ اس رونق اور آرائش کا مکان آسمان نے زمین کے پردے پر کہیں نہیں دیکھا۔ اس کی چھت آفتاب کے مانند درخشاں ہے اور آسمان اس کے نیچے سایہ کی طرح پھیلا ہوا ہے۔"

اصل کتبہ یہ ہے:۔

ازیں دل کشا قصر عالی بنا — سرا کبرآباد شد عرش سا
بود کنگرش از جبین سپہر — نمایاں چوں دندانِ سین سپہر

سجود درایں سرائے سرور — کند سہ نوشت بداز جبہ دور
شرافت یکے آید درشان او — سعادت در آغوش ایوان او
رہ جور از بیش و کم بستہ است — بہ زنجیر عدلش ستم بستہ است
بہ نازم بہ زنجیر کر عدل شاہ — ہمہ چشم شد در رہ دادخواہ
بر احوال مردم چناں درحساب — کہ داند چہ بنید شبہا بخواب
در ایوان شاہی بصد احتشام — چو خورشید بر چرخ بادا مدام
چو ایوان او عالم آرائی شد — سر خاک از او آسماں سائی شد
شہنشاہ آفاق شاہ جہاں — کہ نازد بہ او روح صاحب قراں
بایں رونق و زیب و زینت مکاں — ندیدہ بر و ی زمیں آسماں
بود صحن بامش چو سیمائے مہر — بر یرش فتادہ چو سایہ سپہر
بتارنجیش اندیشہ آورد او — در فیض شد باز از چار سو
چنیں گفت طبع حقائق شناس — سعادت سرائے و ہمایوں اساس

۱۰۴۶ ۱۰۴۶

اس کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہاں نے زنجیر عدل لٹکوائی تھی، اس کا ذکر کسی تاریخ میں نہیں ہے۔
قلعہ بیدر (دکن) میں رنگین محل کے کتبوں کی شان ہی نرالی ہے، یہاں ندرت خیال کے ساتھ کتبوں کی تیاری میں بھی جدت دکھائی ہے۔ سیپ کے خوبصورت پرچھیں تیار کر کے ان کو اعلیٰ قسم کے سنگ موسیٰ میں پچی کیا گیا ہے پچی کاری بڑی نفاست سے کی گئی ہے اور سیپ کی چمک دمک سے کتبہ میں جان پڑ گئی ہے۔ محل کی اندرونی محراب پر یہ کتبہ ہے:

ہر در شہیں کہ در صدف دارد عشق — از بہر نثار در گہت دارد عشق
عاشق شود آنکس کہ رایدزدرت — گویا در دبام تو می بارد عشق

پولیمین کی کھڑکی پر یہ اشعار ہیں:۔

اے منظر دیدہ از جمالت روشن — وی کردہ چو در در صدف سینہ وطن
بخرام بہ شہ نشین خلوت گہ دل — کز بہر تو آراستہ شد ایں گلشن

یہاں کی مسجد سولہ کھم میں ایک کتبہ تھا جو اس مسجد کا نہیں تھا کسی دوسری جگہ سے لاکر رکھ دیا گیا تھا۔ اب یہ کتبہ قلعہ کے اثری عجائب خانہ میں محفوظ ہے۔ اس کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کے زمانے میں

قلندر خاں حاکم بیدر نے کوئی ایوان بنوایا تھا۔ عمارت تو زمانے کی نذر ہو گئی اس کا یہ کتبہ باقی رہ گیا ہے۔ عمارت اور تل میں کوئی وجہ شبہ نہیں ہے مگر شاعر نے جو مادہ تاریخ نکالا ہے اس میں بڑی دلآویز تشبیہ دی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

بدور شاہ عالمگیر غازی — کہ از عدلش شدہ گیتی منور
قلندر خاں بہار باغ دولت — کہ از بویش جہاں گشتہ معطر
بہ پیش آفتاب دست جودش — بود دریا و کاں از ذرہ کمتر
رواقے ساخت مہر یادگارے — کہ باشد زیر ایں فیروز منظر
پئے تاریخ او از طارم چرخ — ندا آمد کہ "خال روی بیدر"

۱۰۸۸

خوبصورت ایوانوں اور عالیشان محلوں کے نام ایسے رکھے جاتے ہیں جن سے شکوہ اور عظمت ظاہر ہو۔ ان کتبوں میں بھی سطوت اور جبروت کا اظہار ہوتا ہے مگر بعض اوقات انسان کو اپنی مجبوری اور بے بسی دکھائی دے جاتی ہے۔ لال قلعہ دلی کے مثمن برج میں جو کتبہ ہے، اس میں یہی بے مایگی ظاہر کی گئی ہے؛

اشعار یہ ہیں :۔

ای بندہ پای قفل بر دل ہشیار — وی دوختہ چشم پای در گل ہشیار
عزم سفر مغرب و رو با مشرق — ای راہ رو پشت بہ منزل ہشیار

لال قلعہ کا دیوان خاص اپنے وقت کا سب سے خوبصورت ایوان تھا جس کی قسمت میں تخت طاؤس لکھا تھا۔ یہ عمارت سر سے پاؤں تک مرصع تھی مغلوں کے زوال کے زمانے میں اس پر تباہی آئی اور اس کے تمام قیمتی پتھر نکال لیے گئے، مگر اس کا حسن اب بھی باقی ہے، یہ وہ زلف ہے جو بگڑنے میں بھی بنا کی۔ اس کے شمال اور جنوب کی محرابوں پر سونے سے لکھا ہوا ہے :۔ اگر فردوس بر روی زمین است

ہمین است و ہمین است و ہمین است

عمارت جس قدر خوبصورت ہے اس کا یہ کتبہ بھی انتہائی حسین ہے اور یہ کہنا مشکل ہے کہ آیا دیوان خاص کے لیے یہ شعر کہا گیا ہے یا اس شعر کے لیے دیوان خاص بنوایا گیا ہے۔ یہ عمارت ۱۶۳۹ء میں تعمیر ہوئی اور سو سال بعد یعنی ۱۷۳۹ء میں اسی جگہ نادر شاہ تخت طاؤس پر بیٹھا اور اس کے سامنے محمد شاہ مفتوح کی حیثیت سے پیش ہوا لیکن تیموری خاندان کو اس سے بھی برا دن دیکھنا تھا، ۱۸۵۷ء میں اسی دیوان میں بہادر شاہ پر بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا۔ جب یہ بدنصیب بادشاہ پیشی کے لیے اس جنت میں لایا جاتا ہوگا تو اس شعر پر ضرور نظر پڑتی ہوگی اور نہ معلوم اس پر کیا گذرتی ہوگی۔

پہلے زمانے کے فرمانروا تخت کو شاندار بنانے کا بہت خیال رکھتے تھے اس کی زینت کے لیے وہ آسمان کے تارے

توڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ بہمنی سلاطین کا تخت فیروزہ اپنے وقت کا سب سے مشہور تخت تھا۔ یہ تاریخی تخت بیدر کے تخت محل میں تھا۔ لیکن مغلوں کے "تخت طاؤس" کی شان اور ہی تھی۔ ایسا جوہر نگار تخت دنیا کے کسی فرمانروا کو شاید ہی نصیب ہوا ہو۔ شاہجہاں نے اس کے لیے قدرتی سے کتبہ لکھوایا تھا یہ کتبہ تخت طاؤس کے اندر کی طرف زمرد سے لکھوایا گیا تھا۔ کتبہ طویل ہے، چند اشعار پیش ہیں:۔

زہے فرخندہ، تخت پادشاہی — کہ شد ساماں بتائید الٰہی
فلک روزے کہ می کردش مکمل — زرخورشید را بگداخت اول
بحکم کارفرما صرف شد پاک — بمینا کاریش مینای افلاک
خبر ایں تخت از زرد گوہر چہ مقصود — وجود بحرکاں را حکمت ایں بود
رساند گر فلک خود را بپایش — دہد خورشید و مہ را در نمایش
خراج بحرکاں پیرایۂ او — پناہ عرش و کرسی سایۂ او
در اطرافش بود گل ہائے مینا — فروزاں چوں چراغ طور سینا
شب تار از فروغ لعل و گوہر — تواند صد فلک را داد اختر
چو تاریخش زباں پرسید از دل — بگفت او رنگ شاہنشاہ عادل

مسلمانوں سے پہلے ہندوستان میں باغوں پر توجہ نہیں دی جاتی تھی، مغلوں کو باغوں سے عشق تھا انھوں نے جگہ جگہ خوبصورت باغ لگوائے اور ان کو حوضوں، نہروں، فواروں اور جھرنوں سے آراستہ کیا ان باغوں کے دروازوں بارہ دری اور دوسری عمارتوں پر کتبے بھی تھے، لاہور کے شالامار باغ پر یہ کتبہ نصب کیا گیا تھا:۔

چوں شاہ جہاں پادشاہ حامی دیں — آراستہ شالامار با طرز متیں
تاریخ بناء ایں از رضواں جستم — گفتا کہ بگو "نمونہ خلد بریں"

شالامار کے پاس شاہجہاں کی بیٹی سلطان جہاں کا باغ تھا۔ اس کا نام گلابی باغ تھا باغ تو اب نہیں رہا مگر اس کا دروازہ قائم ہے جس پر یہ کتبہ چینی کے بیل بوٹوں میں موجود ہے۔

خوشا باغے کہ دارد لالہ داغش — گل و خورشید و مہ زیبد چراغش
ز تقویم خرد پرسید غازی — "گلابی باغ" شد تاریخ باغش

اورنگ زیب کے زمانے میں قلعہ قندھار (دکن) میں کوئی باغ لگوایا تھا اس کا کتبہ ایک برج کی گھونگٹ کی دیوار میں نصب ہے۔ کتبہ کے آخری اشعار یہ ہیں:۔

بدور شاہ عالمگیر غازی — بنا فرمود باغ از اوج تقدیر

زہے باغے کہ از نظارہ او بگرد سرمہ گردد نور تحریر
پئی تاریخ او از ہیبر دانش بپرسیدم بگفت از حسن تقریر
بیغزای پنج چوں اندر حسابش شود تاریخ سالش "رشک کشمیر"

باغ حسام اودگیر (دکن) میں دو کتبے محمد معصوم نامی کے لکھے ہوئے ہیں ان میں سے ایک اندھیری محل کی مغربی دیوار میں نصب ہے، دوسرا قلعہ داری بیدر میں ہے اور اودگیر کا کتبہ یہ ہے:-

تواں کرد ایں تمام عمر را معروف آب و گل
کہ شاید یک دمے صاحب دلے درے کند منزل

یہ کتبہ "مانڈو" (مالوہ) میں بھی ہے۔ بیدر کا کتبہ:-

ساختم ایں خانہ راتا دوستی منزل کند
ورنہ عاقل عمر خود کے صرف آب و گل کند

سرائیں، تالاب، پل، کنوئیں اور باولیاں بھی کتبوں سے خالی نہیں۔ مشہور مورخ خافی خاں کو نظام الملک اول نے اپنے ہاں دیوان کا عہدہ دیا تھا وہ کچھ عرصہ دکن میں رہا، نرسا پور کی باولی اسی کی یادگار ہے، کتبہ یہ ہے:-

چشمۂ شیریں دریں قصبہ نبود کز زلالش تشنہ را لب تر نبود
ساخت خافی خاں چنیں چاہ لطیف موج آبش جسم را جوہر نبود
ہاتفی گفت از پئی تاریخ سال چشمۂ پاکیزہ از کوثر نبود

یلگندل (ضلع کریم نگر) کی باولی میں رای بندرابن کا کتبہ موجود ہے۔ اس کے باپ بھاڑامل کو شاہجہاں کے زمانہ میں 'رای' کا خطاب ملا تھا اور اس کو داراشکوہ کا دیوان مقرر کیا گیا تھا۔ بندرابن اورنگ زیب کے زمانے کا مورخ ہے، "لب التواریخ" اس کی مشہور تاریخ ہے، باولی کا کتبہ یہ ہے:-

در زمان خدیو دریا دل شاہ اورنگ زیب شاہ زمن
چشمۂ ساخت فی سبیل اللہ از پئی خلق رای بندرابن
سال تاریخ او ز ہاتف غیب فیض جاری ندا رسید بمن

حیدرآباد (دکن) میں طلیاباد دروازہ کے قریب ایک بہت بڑی باولی ہے، اس پر یہ کتبہ ہے:-

داد توفیق خالق اکبر کند سلطاں قلی چہ خوشتر
ساخت مسجد برای عند اللہ دار دامید شافع محشر
لعنت اللہ بر آں کہ بفروشد ہر کہ ایں را خود شود کافر

گفت تاریخ چاہ بیت اللہ ہاتفش 'جوئی چشمۂ کوثر'

دکن میں اور جگہ بھی ایسے کتبے ہیں جن میں اس قسم کی لعنت بھیجی گئی ہے یا بددعا دی گئی ہے۔

نلدرگ (ضلع عثمان آباد) میں پانی محل کے لیے ندی کا جو بند باندھا گیا ہے، اس پر ابراہیم عادل شاہ کے زمانے کا یہ کتبہ موجود ہے:-

از حضرت شاہ دیں پناہ منصور شد پیر محمد عادین نامور
در بستن ایں سد بتوفیق الہ شد ہی شد چو سد سکندر مشہور
از دیدن ایں چشم مجاں روشن می گردد و چشم دشمناں گردد کور
از دل کردم سوال و تاریخش گفت کایں سد ملطف شاہ ماند معمور

بمبئی سے ۸۰ میل جنوب مشرق میں دہابل ایک گمنام جگہ ہے، کسی زمانہ میں یہ مقام بہت اہم تھا، اس نے کئی حکومتوں کے انقلاب دیکھے ہیں۔ یہاں ایک شکستہ جامع مسجد کے پاس زمین پر ایک کتبہ نصب ہے۔ یہ ایک شاہی فرمان ہے، جو دونوں زبانوں میں ہے۔ پتھر کے ایک رخ پر فارسی کتبہ ہے اور دوسری طرف اس کا مطلب مرہٹی زبان میں کندہ ہے۔ اس زمانہ میں یہاں یہ رواج تھا کہ کوئی صاحب جائیداد لاولد مرجاتا تو اس کی جائیداد پر حکومت کا قبضہ ہو جاتا تھا اس سے زیادہ تر ہندو رؤسا، اور جاگیردار متاثر ہوتے تھے۔ سلطان نے اس رسم کو ختم کر دیا۔ اس زمانہ میں شاعری کا زور تھا چنانچہ فرمان بھی ذیل کی نظم میں کندہ کر دیا گیا ہے۔

امیر کبیر ان ملک شیخ علی کہ بد نائب دابل از حکم شاہ
جو دیدند مردم کہ دیں پرور است بعرضش رساندند کز دیر گاہ
ہر آں کس کہ اولاد صلبی ندارد اگر ہست ہندو و دگر دیں پناہ
پس از فوت او ہر چہ ماند متاعش چہ مال و منال و قبا و کلاہ
ہمہ می گرفتند حکام دابل ازیں رسم بد عالمی شد تباہ
پذیرا شدہ التماس خلائق بسی داشتہ پاس خاطر نگاہ
بسر نوبت خویش عبدالرسول چناں امر کردہ کہ از حکم شاہ
بہ ہندو مسلماں معاف ست لاشک تصدق بود ارثہ جم سپاہ
کہ ہر کس کہ باشد زہر دو فریق کند گر تخلف بود روسیاہ
بدیں عہد میثاق و پیماں درست نوشتند و کردند حق را گواہ

شاہجہاں کی زندگی کے آخری سات سال نظر بندی میں گذرے۔ جب وہ آگرہ کے قلعہ میں بند تھا تو اس کی بیٹی

جہاں آرا اس کے ساتھ رہی اور باپ کے مرتے دم تک اس کی خدمت کرتی رہی۔ اس نے ثابت کر دیا کہ بیٹی کفن کی سوئی ہوتی ہے۔ جہاں آرا کی قبر حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ میں ہے۔ مزار کے سرانے مرحومہ کا یہ شعر کندہ ہے:۔

بغیر سبزہ نہ پوشد کسے مزار مرا
کہ قبر پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است

دریا گنج دلی میں ایک مسجد زینت النسا کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مسجد اورنگ زیب کی بیٹی زینت النسا بیگم کی ہے اس کے بلند مینار بہت دور سے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں زینت النسا بیگم کی قبر پر یہ کتبہ ہے:۔

مونس ما در لحد فضل خدا تنہا بس است
سایۂ از ابر رحمت قبر پوش ما بس است

بابر آگرہ میں مرا اس کی قبر کابل میں ہے۔ جہانگیر نے اس پر کتبہ نصب کرایا جس میں اپنے جد امجد کی اولوالعزمی اور شجاعت کو اس طرح بیان کیا کہ ہے کہ جب وہ اس دنیا میں ملک و دولت و اقبال غرض تمام عالم اجسام پر قبضہ کر چکا تو عالم ارواح کو فتح کرنے چلا گیا۔ کتبہ کا کچھ حصہ یہ ہے:۔

بادشاہے کز جبینش تافتے نور الٰہ
آں ظہیر الدین محمدؐ بود بابر بادشاہ
با شکوہ و دولت و اقبال عدل و داد دیں
داشت از توفیق و فیض و فتح و فیروزی سپاہ
عالم اجسام را بگرفت و شد روشن روان
بہر فتح عالم ارواح چوں نور نگاہ
شد چو فردوسش مکاں رضواں زمن تاریخ جست
گفتمش فردوس دائم جائی بابر بادشاہ

جہانگیر نے انارکلی کے مدفن پر مقبرہ تعمیر کروایا تھا۔ اس میں بہت اعلیٰ قسم کا سنگ مرمر استعمال ہوا تھا۔ جو زمانے کی دست برد کے نذر ہو گیا۔ قدرت بعض وقت بڑی ستم ظریف ہو جاتی ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے زمانے میں بہت دنوں تک یہ عمارت پروٹسٹنٹ چرچ کے طور پر استعمال ہوتی رہی اور اس کا نام "سینٹ جیمس چرچ انارکلی" مشہور ہوا۔ مقبرہ پر خود جہانگیر کا شعر کندہ ہے جس کا ایک ایک لفظ محبت اور یاس میں ڈوبا ہوا ہے، کتبہ یہ ہے:۔

تا قیامت شکر گویم کردگار خویش را
آہ گر من باز بینم روی یار خویش را

شعر کے نیچے مجنوں سلیم اکبر کندہ ہے۔

انسان چاہے اپنے منہ سے نہ کہے مرنا نہیں چاہتا، مگر مرنا ضروری ہے تو پھر اس کی خواہش ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد کچھ دن اور زندہ رہے۔ اس کے لیے وہ بہت کچھ کرتا ہے ایک یہ کہ قبر پر مقبرہ بنواتا ہے چنانچہ بہت سے عالی شان مقبرے مرنے والوں نے اپنی زندگی ہی میں تعمیر کرا لیے تھے۔ ان مقبروں پر بے شمار کتبے ہیں۔ ابراہیم کے روضۂ بیجاپور میں کتبوں کو سنگ خارا میں جالی کی طرح تراشا گیا ہے۔ ان مشک کتبوں کے چند اشعار سنیئے:۔

در عجب ماند آسماں از ارتفاع ہیں بنا
سر برآوردہ از زمیں گوید مگر چرخے جدا
روضۂ فردوس از ایں روضۂ طراوت بردہ وام
ہر ستونش در لطافت سروے از باغ صفا
بہر تاریخش صلا دادہ ملک از اوج فلک
یادگار تاج سلطاں ایں بنائے دلفزا

احمد نگر کے قریب ایک مقبرہ نظام شاہوں کے عہد کا ہے اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

ما عاشقم کشتہ شدن اعتبار ماست — شمشیر عشق تیز ز سنگ مزار ماست
بے زخم تیغ عشق ز عالم نمی رویم — بیروں شدن ز معرکہ بے زخم عار ماست
ما یاد جود سنگ ملامت سلا ستیم — گویا کہ سنگ ہا ہی ملامت حصار ماست
ما را اگر نہ یار سوی دار می کشد — ساقی بیار می کہ دمی گیرد و آر ماست
چوں کاتبی خوشیم کہ در دور خط یار — عالم معطر از قلم مشکبار ماست

اس کے نیچے کی پٹی پر جو اشعار ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غالب خاں کا مقبرہ ہے جو کسی لڑائی میں مارا گیا۔ "خان شہید" سے تاریخ نکلتی ہے۔

بیدر میں احمد شاہ ولی بہمنی کے مقبرہ پر بہت سے اشعار سنہری حروف میں نقش ہیں۔ یہ کلام حضرت نعمت اللہ کرمانی کا ہے جس میں دنیا کی بے ثباتی اور انسان کی بے مائگی بیان کی گئی ہے لیکن اس موضوع پر جیسے موثر اشعار مقبرہ علی بربد پر ہیں ایسے ہندوستان کے کسی مقبرہ میں یہ رباعیاں شیخ فریدالدین عطار کی ہیں جن کو چینی کے حروف میں لکھا گیا ہے۔ علی بربد بربد شاہیوں میں سب سے طاقتور سلطان تھا، اس کی آواز اس کی قبر سے سنیئے:۔

ای ہم نفساں چوں اجل آید بسرم — از پائی درافتادم و خوں شد جگرم
دی تازہ گلے بودم اندر چمن باغ — امروز فروریختہ ہم بال و پرم
یاران و عزیزاں بسر خاک من آیند — وز خاک بپرسند نشان و خبرم

گر خاک جہاں جملہ بر بال بہ بیرند ـــــ حقا کہ نیابند نشان و اثر من
رفتم بہ چناں جائی کہ باز آمدنم نیست ہم نیست امیدم کہ کس آید بسر من
عطار دلے دارم از دیدۂ خوں غرق ـــــ حقا کہ نیاید دو جہاں در نظر من
دریغا کہ بے ما بسے روزگار بروید گل و بشگفت نو بہار
کسانے کہ از ما بغیب اندر اند ـــــ بیایند و بر خاک ما بگزرند
دامن کشاں کہ می روم از رہگزر زیں فردا غبار کالبدش بر ہوا رود
خاکت دار استخواں رود ای نفس خیرہ چشم ـــــ ماند سر ہر واں کہ در و تو تیا رود
تفرج کناں در ہوا و ہوس گزشتیم بر خاک بسیار بس
کرا جاودان ماندن امید ماند چو کس را نہ بینی کہ جاوید ماند

اولیائے کرام بادشاہ تو نہیں ہوتے مگر حکومت ان کی بھی ہوتی ہے۔ سلاطین اپنی سطوت اور شوکت سے لوگوں کے دلوں پر سکہ بٹھاتے ہیں اور اولیاء اللہ محبت کی مٹھی مار سے دلوں پر قبضہ کرتے ہیں۔ جب کوئی تاجدار ظلم پر اتر آتا تو یہ بے تاج کے بادشاہ اسے ٹوک دیتے تھے اور اس میں وہ اپنی جان پر بھی کھیل جاتے تھے۔ ان کی درگاہوں مقبروں اور خانقاہوں میں بے شمار کتبے ہیں، ان کے نمونے ملاحظہ ہوں۔ بیدر میں شیخ عبدالقادر جیلانی کی خانقاہ کے دروازے پر یہ اشعار کندہ ہیں:۔

با مادو سہ دل مباش یک دلہ کن وز ہر چہ کہ غیر باشد آں را یلہ کن
یک صبح باخلاص بیا بر در من گر کار تو بر نیاید آنگہ گلہ کن

ناگور (راجپوتانہ) میں خانقاہ تارکین کے دو کتبے ملاحظہ ہوں:۔

نامی بکشا چشم بصیرت در باب بنیاد زمانہ ہمچو نقشے است بر آب
باتو گویم کہ حاصل دنیا چیست بیداری یک زماں و باقی ہمہ خواب

ایک دوسرے مزار پر:۔

ای ہر کہ دریں گنبد آباد رسید گر با دل غمناک و گرشاد رسید
از بہر خدا و ند تعالیٰ و تقدس ما را بہ یکے فاتحہ فریاد رسید

حضرت سلطان نظام الدین اولیا نے کئی بادشاہوں کا زمانہ دیکھا بعض ان سے خوش نہیں تھے یہاں تک کہ سلطان غیاث الدین تغلق نے آپ کو دلی چھوڑنے کا حکم دیا۔ ان سلاطین کے مقبرے بے چراغ پڑے ہیں اور حضرت کی درگاہ میں زائرین کا میلہ سا لگا رہتا ہے اور بڑی دھوم سے عرس ہوتا ہے۔ اس میں کئی کتبے ہیں مگر دروازہ

پر ایک مصرع کندہ ہے جو ایک قطعہ کے معنی دیتا ہے اور زائر کے دل پر خاص اثر پیدا کرتا ہے، مصرع یہ ہے :-

"شاہاں چہ عجب گر بہ نوازند گدا را"

پالتو جانوروں کو دفن کرنے کا رواج بہت پرانا ہے یہاں تک کہ اہرام مصری میں انسانی ممی کے ساتھ کتے بلیوں کی ممیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ مختلف مقامات پر کتوں کی قبریں ہیں۔ احمد نگر میں ہاتھی کی قبر ہے۔ یہ وہ ہاتھی تھا جو تالی کوٹ کی جنگ میں لڑا تھا۔ اس نے رام راج کو سونڈ سے اٹھا کر مہاوت کے حوالے کیا تھا۔ چنانچہ ہاتھی اور مہاوت کی قبر پر کتبہ بھی ہے۔ پٹن (ضلع اورنگ آباد) میں گھوڑے کی قبر پر طویل کتبہ ہے، یہ گھوڑا مرزا ایرج کا تھا جو عبدالرحیم خانخاناں کا بیٹا تھا۔ کتبہ نثر میں ہے مگر آج کل کی نظم سے کم نہیں ملاحظہ ہو۔

"در دریای سلطنت و بختیاری، مفخر خاندان اہبت و کامگاری کہ ہنوز از گل صد برگ عمر شریفش شانزدہ برگ شگفتہ دراین مصاف شبر نصرتش خرطوم فیلان مست شگافتہ و رخش دولتش افسر سروران بہ نعل شکستہ بتاریخ ۲۰ ذی قعدہ ۱۰۰۱ ہم عنان فتح و نصرت در حین مراجعت از جنگ طاغیان حبش و دکن کہ از ہژدہ ہزار کم نبودند با چہار ہزار سوار در موضع کھیر کہ بفتح آباد مشہور گردانیدہ بمنزل پٹن نزول اجلال فرمود۔ رخش دلیرش کہ نہنگ خون آشام دریائے مصاف بود دراین معرکہ بدستیاری او داد دستی دادہ بود نہ بہوائے سبزہ عدن بفردوس خرامید و بجزائے حسن عمل۔"

بایں تشریف کہ در زمانہا کانقش فی الحجر مذکور است

در زمانہا تیز باقی ماند تحریر فی غرہ شہر ربیع الاول ۱۰۰۱ھ

جہانگیر بھی عجیب طبیعت لایا تھا، ایک دن اجمیر میں بھاٹیا مندر کے پاس سے گذر رہا تھا وہاں ایک چٹان زمین سے ابھری ہوئی دکھائی دی، حکم دیا اس چٹان کو بیٹھے ہوئے ہاتھی کی شکل میں تراش دیا جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی اور چٹان کا ہاتھی بن گیا۔ اس کے دائیں پہلو پر یہ شعر کندہ ہے :-

تاریخ فیل سنگ شد از ملک الہ ایں کوہ پارہ نیل جہانگیر بادشاہ

مہروں اور تلواروں پر عموماً ان کے مالکوں کے نام کندہ ہوتے ہیں لیکن مغلوں نے اس میں بھی جدت دکھائی ہے ابوالفضل نے اکبر کی مہروں کو تفصیل سے بیان کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ عدالتی کارروائیوں میں جو مہریں استعمال ہوتی تھیں ان پر یہ شعر کندہ ہے :-

راستی موجب رضائے خداست کس ندیدم کہ گم شد از رہ راست

شاہجہاں کی تلوار کے قبضے پر شہنشاہ کا نام کندہ تھا مگر وہ بھی شعر کے سانچے میں ڈھل گیا ہے :-

ہست ایں شمشیر خاص ثانی صاحب قرآن شاہ غازی بادشاہ بحر و بر شاہجہاں

توپیں شکل صورت میں اس قدر بے ڈول سی ہوتی ہیں کہ ان پر اعلیٰ شاعرانہ خیالات کا اظہار ذرا مشکل ہے لیکن شاعر بھونڈی سے بھونڈی چیز میں بھی حسن تلاش کر لیتا ہے۔ چنانچہ توپوں کے کتبے دلچسپی میں دوسروں سے کم نہیں ان کے نام بھی شاعرانہ ہیں جوان پرکندہ ہیں، فتح رہبر، اژدھا پیکر، ملک میداں، دل کھنڈل، فتح لشکر، صف شکن، ظفر پیکر، قلعہ کشا، فتح جنگ، آتش بار وغیرہ ناموں نے ان توپوں کی شکل صورت اور رنگ روپ پر پردہ ڈال دیا ہے قلعہ گولکنڈہ کے پیلہ برج پر اورنگ زیب کی مشہور توپ "فتح رہبر" رکھی ہوئی ہے۔ یہ قلعہ کے محاصرہ کے وقت استعمال ہوئی تھی اس پر خط نستعلیق میں یہ رباعی کندہ ہے:۔

تا صراحی خندہ تعلیم از لب دلبر گرفت
آتش جست از دہان او و مجلس در گرفت
می طپید دل بہر وصل امانی داند کہ سوخت
شعلۂ جانسوز او تا خصم را در بر گرفت

اسی قلعہ میں ایک توپ قلعہ کشا ہے، اس پر یہ شعر ہے:۔

ہر کہ آمد بجہان اہل فنا خواہد بود
آنکہ پایندہ و باقی است خدا خواہد بود

بیدر کی ایک توپ کا کتبہ سنیئے:۔

جذا توپے پر آشوبے کہ از رعد بلند
کر کند گوش فلک را بر کند کوہ از وطن
از پئی خصمان شاہنشہ دین بکشودہ است
تا کند یکبارگی خصمان سراندر دہن

انگریزوں اور سکھوں کی پہلی لڑائی جو عہد نامہ پر ختم ہوئی اس میں انگریزوں نے ۲۵۰ توپوں پر قبضہ کیا تھا جو کلکتہ بھیج دی گئیں۔ ان میں سے ۳۸ توپوں پر کتبے تھے، ان کے نمونے ملاحظہ ہوں:۔

قوی طالع شاہ رنجیت سنگھ — ہمہ ملک را زیر کردہ چو خنگ
کھڑک سنگھ شہزادہ عالی مکاں — کہ دانای کوراں بود ہادراں
فتح جنگ شد در زمانے تیار — کہ ہفدہ صد و بود ہشتاد و چار
جمعدار ایں توپ شد رای سنگھ — کہ در جاں فشانی است او بے درنگ

سمت ۱۸۸۴

ایک توپ پر یہ شعر ہے :-

چو اژدرہا بجان و دل بسے داغ کہن دارم
مدر کن اے رقیب از من کہ آتش در دہن دارم

قطعہ: ہست ایں توپ مہر بیلی رام — با نقش گفت فتح و نصرت نام
خرب آتش فشاں و برق شرار — صبح اعدا ز دود او چوں شام

ایک اور توپ کا کتبہ :-

ہست ایں توپ اژدہائے وہاں — از دم خود شرار برق فشاں
بیک آواز خود کند ناگاہ — بخت دشمن چو دود خویش سیاہ
در عہد بادشاہ رنجیت سنگھ — عمل راے سنگھ توپ ساز
سمت ۱۸۸۰

ہندوستان میں ہزاروں حکمراں گذرے ہیں، ان کے مختلف سکوں کی تعداد کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ ان سکوں پر انسان، چرند، پرند، درخت، پھل، پھول، سانپ، بچھو، دریا، پہاڑ، چاند، سورج، دیوی، دیوتا، غرض دنیا بھر کی چیزیں نقش ہیں۔ مغل فرمانرواؤں نے اس میں بھی اپج سے کام لیا اور اپنی اشرفیوں پر اشعار نقش کرائے۔ سکوں پر اشعار دینے کے مسکوکات میں ایک جدت تھی، جس کو مغل بادشاہ اخیر دم تک نبھاتے رہے۔ شعر کے دونوں حصے ایک رخ پر نقش ہوتے تھے اور دوسری طرف بادشاہ کا نام اور سنہ وغیرہ ثبت ہوتا تھا۔ سکہ کے ایک رخ پر پورا شعر جلی خط میں نقش ہوتا تھا۔ فارسی رسم الخط کی کرامت تھی، یہ صلاحیت اسی میں ہے کہ کم سے کم جگہ میں زیادہ سے زیادہ مضمون آسکتا ہے۔ جہانگیر کی چند اشرفیوں کے اشعار سنیئے :-

روی زر را ساخت نورانی بزنگ مہر و ماہ
شاہ نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

تضا بر سکۂ زر کرد تصویر — شبیہ حضرت شاہ جہانگیر
جہاں فروز با جبر گشت سکہ زر — دلورم نام جہانگیر شاہ اکبر
حروف جہاں گیر و اللہ اکبر — ز روز ازل در عدد شد برابر ۲۸۹

اس شہنشاہ نے ایک اشرفی پر اپنے نام کے ساتھ نورجہاں کا نام بھی نقش کرایا تھا۔ شعر میں یہ مضمون باندھا گیا ہے کہ نورجہاں کے نام سے سونے کی قیمت سوگنا ہوگئی ہے، شعر یہ ہے :-

بحکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور — بنام نورجہاں بادشاہ بیگم زر

اکبر نے الہ آباد کا قلعہ بنوایا اور اسی دار الضرب سے اشرفی جاری کی اس پر یہ شعر تھا:۔

ہمیشہ چوں زر خورشید و ماہ روشن باد بشرق و غرب جہاں سکہ الہ آباد

اس پر کسی بادشاہ کا نام موجود نہیں ہے۔ بعض ماہرین مسکوکات کا خیال ہے کہ جہانگیر نے اپنی بغاوت کے زمانے میں یہ اشرفی جاری کی تھی۔

مغل فرمانروا جب کسی مہم پر جاتے تھے تو ان کے لشکر کے ساتھ دار الضرب بھی ہوتا تھا، جب وہ کسی مقام کو فتح کرتے تو وہیں سے اپنے نام کا سکہ جاری کرتے تھے اس دار الضرب کا نام "اردو" تھا۔ ہندوستان کی تمام زبانوں میں اردو کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کا سکہ بھی چل چکا ہے اور اب تک اس کا نام سکوں پر موجود ہے۔ اردو کا ایک شعر سنیئے:۔

باد رواں تا کہ بود مہر و ماہ
سکۂ "اردوئے" جہانگیر شاہ

گجرات اور دکن کے سلاطین کے سکوں پر بھی کہیں کہیں اشعار نظر آتے ہیں۔ قطب شاہیوں کے ابتدائی دور میں سلاطین بہمنی کے سکے جاری تھے اور بیجانگر کے ہن بھی چلتے تھے۔ چنانچہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے سکہ پر ایک شعر موجود ہے جس میں جعلی سکہ بنانے والے پر لعنت بھیجی گئی ہے۔ شعر یہ ہے:۔

تنزہ فلوس شاہی بیوستہ بہ لعنت الٰہی

سلطان محمد عادل شاہ کے ایک سکہ پر یہ شعر نقش ہے:۔

جہاں ازیں دو محمد گرفت زینت و جاہ
یکے محمد مرشد دوم محمد شاہ

ختم کرنے سے پہلے یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ اس مضمون کی تیاری میں یوں تو اور کتابوں سے بھی کتبات لیے گئے ہیں مگر زیادہ تر مواد "اپی گرافیا انڈو مسلمکا" سے لیا گیا ہے۔ یہ جرنل حکومت ہند کی جانب سے شائع ہوتا تھا اس میں اسلامی کتبات چھپتے تھے۔ کوئی ۲۰ سال تک یہ رسالہ ڈاکٹر غلام یزدانی اورینٹل ای کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ آپ کی ۔۔۔ سبکدوشی کے بعد تیرہ سال کے عرصہ میں "اپی گرافیا انڈو مسلمکا" کا صرف ایک نمبر پچھلے سال نکلا ہے اس میں حکومت کی جانب سے یہ اعلان ہے کہ آئندہ سے یہ رسالہ علاحدہ شائع نہیں ہوگا بلکہ "اپی گرافیا انڈمکا" کے ضمیمہ کے طور پر چھپا کرے گا۔ (اردو مجلس میں پڑھا گیا)

شاہد صدیقی

حیات مشکل آساں نہیں تو کچھ بھی نہیں
اگر یہ درد ہی درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

فضائے یاس میں ناکامیوں کی ظلمت میں
چراغِ شوق فروزاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

مری نگاہ کہ ہے اُس نظر سے وابستہ
حریفِ گردشِ دوراں نہیں تو کچھ بھی نہیں

چلی ہے لے کے دوانوں کو جستجوئے بہار
قدم قدم پہ گلستاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

وہ زندگی جو محبت میں لازوال ہوئی!
اجل سے دست و گریباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

کوئی فسانہ ہو یا مثنوی و نظم و غزل
حدیثِ عظمتِ انساں نہیں تو کچھ بھی نہیں

سلیمان ادیب

مئے کی جتنی عظمت ہے اس سے کم سمجھتے ہیں
جامِ مئے کو دیوانے جامِ جم سمجھتے ہیں
زندگی کی راہوں میں گو بھٹک گئے لیکن
تیری زلف کے مارے پیچ و خم سمجھتے ہیں
اپنے غم کا افسانہ میں سُنا کے پچھتایا
میرے غم کو اہلِ دل اپنا غم سمجھتے ہیں
دوستی کے پردے میں دشمنی بھی دیکھی ہے
کون کتنا مخلص ہے یہ بھی ہم سمجھتے ہیں
بات اپنے مطلب کی جب کوئی نہیں کرتا
تم بھی کم سمجھتے ہو ہم بھی کم سمجھتے ہیں
ایک بار کی شہرت ساری عمر چلتی ہے
میں پیوں جو پانی بھی لوگ رم سمجھتے ہیں

سلام مچھلی شہری

سلسلۂ آفتاب

(حضرت امیر خسرو کی بارگاہ میں عقیدت کے کچھ پھول)

زمیں پر اگر دیوتا کچھ نہ ہوتے تو انسان شاید پریشاں ہی رہتا
نظارے تو ہوتے، بہاریں تو ہوتیں مگر گلشنِ فکر ویراں ہی رہتا
حقیقت کا مفہوم واضح نہ ہوتا اگر دل نشیں کلپنائیں نہ ہوتیں
کوئی خاص منظر نکھر ہی نہ پاتا جو اس کے لیے کچھ فضائیں نہ ہوتیں
حقیقت کی ان ضو فشاں منزلوں میں حسیں خواب مسکرانے لگے ہیں
بزرگوں نے جو دیپ روشن کیے تھے وہی دیپ پھر جگمگانے لگے ہیں
کلا اور سنگیت کے دیپ پھر سے مقدّس فضاؤں میں جلنے لگے ہیں
زہے عہدِ حاضر کہ حافظ کے بربط پہ میرا کے نغمے مچلنے لگے ہیں
مبارک کہ وادیٔ گنگ و جمن میں کلا کو نئی زندگی مل رہی ہے
مبارک کہ پھر "طوطیِ ہند خسرو" کے افکار کی روشنی مل رہی ہے
نئی روشنی میں نئے تاج محلوں میں، اجنتاؤں کا جنم ہونے لگا ہے
ہمارے "کلا مندروں" سے قریب آج روٹھا ہوا دھرم ہونے لگا ہے
ملی ہے ضیا بار تعبیر جس کی وہی خواب پہلے بھی دیکھا گیا تھا
مبارک وطن کی سحر کہہ رہی ہے کہ یہ آفتابوں کا اک سلسلہ تھا!!

("ادارۂ نظامیہ" دہلی میں ۱۹ مئی، ۵۵ کو یوم خسرو کے موقع پر پڑھی گئی)

خورشید احمد جامی

ہزیمت

تو مرے غم کا مداوا ہے یہی سمجھا تھا
تجھ کو پاکر مری تقدیر سنور جائے گی
تیرے عارض کی سحر خواب تمنا بن کر
مری دنیائے محبت میں نکھر جائے گی
نور و نکہت کی فضاؤں میں جواں باہوں میں
زندگی دور سے آئی ہے ٹھہر جائے گی

تجھ کو پاکر بھی ہوں بیگانۂ آرام و سکوں
درد دل بجھ نہ سکا چاک جگر سل نہ سکا
تیرے آغوش کی مہکی ہوئی تنہائی میں
شوق افسردہ مسرت سے گلے مل نہ سکا
مسکراہٹ کے کنول ہیں ترے لب پر لیکن
غنچۂ خاطر ناشاد مرا کھل نہ سکا

جب بھی چاہا کہ ترے پیار میں لے جان وفا
اپنی امید کو فردوس بداماں کر لوں
ترے رخسار شفق رنگ کی شامیں لے کر
اپنے ارمانوں کی تسکین کا ساماں کر لوں
ترے الطاف مسلسل کی ضیا پاشی میں
اپنی خوشیوں کے خد و خال فروزاں کر لوں

جب بھی چاہا تو ہوا یہ کہ نہ جانے کیونکر
یک بہ یک ہاتھ سے دامان طرب چھوٹ گیا
میری ہر ایک تمنا مری ہر اک خواہش
پاس آکر مرے چپکے سے کوئی لوٹ گیا
جاگ اٹھے مرے انفاس میں کتنے ہی شرار
اور اس عشرت حاصل کا فسوں ٹوٹ گیا

دیکھتا یہ ہوں کہ احساس کے آئینے میں
عکس ماحول کے چہرے کا ابھر آیا ہے
زخمی گردش دوراں ہے امنگوں کا شباب
گرد آلام نے ہر نقش کو دھندلایا ہے
جیسے تاریک و شکستہ سی عمارت کے قریب
ملگجی صبح نے آنچل کوئی لہرایا ہے

فراق گورکھپوری

خط اور دو غزلہ

مئی کا "صبا" ملا۔ اس میں اثر لکھنوی نے میری غزل کا جواب لکھا ہے اور میری غزل پر تنقید بھی فرمائی ہے۔

جس شخص کی ایک غزل ایک شعر ایک مصرعہ ایک رباعی ایک نظم ایک نثر پارہ فقرہ کسی کو متاثر نہیں کر سکا ایسا کس بنا پر اس ادیب کرے تو کیا کرے۔ بقول شخصے جب یہ حضرت اثر اپنا کلام سنانا شروع کرتے ہیں تو کنوئیں میں چھاندنے کو جی چاہتا ہے۔ جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے کلام میں نہ تو کہیں جوشِ بیان ہے، نہ زورِ کلام ہے، نہ کہیں نرمی اور نہ گھلاوٹ ہے، نہ آنسوؤں کی تھرتھراہٹ ہے، نہ نشاط کی مسکراہٹ، نہ رنگینی، نہ شگفتگی نہ غنائی عناصر، نہ احساس لامحدود نہ رمزیت، نہ فضا آفرینی، نہ خیر و برکت کے عناصر، نہ آفاقی ادب کی آوازِ بازگشت، لہجے میں تہہ داری، نہ سپردگی، اس کلام بے روح میں نہ نفسیاتی نکات، نہ حیرت و استعجاب، نہ انفرادیت، نہ طہارت، نہ بلندی، نہ گہرائی، نہ ہمہ گیری، نہ سوز و گداز و تاثیر، نہ نادر و نازک تشبیہیں و استعارے، نہ جادو بیانی، نہ تالیفِ قلب کا کوئی سامان، نہ اظہارِ شخصیت، نہ وجد آفرینی نہ نمک نہ حلاوت نہ دل گرفتگی، نہ جاذبیت، نہ حسنِ تعبیر، نہ لہجے کی بے اختیاری نہ وہ ملکوتی صفات جن سے انسان کے کلام پر الہام کا گمان ہونے لگتا ہے۔ نہ چوٹ کھایا ہوا دل، نہ معصومی، نہ سادگی نہ پُرکاری، نہ کچھ۔ البتہ اشعار تقطیع سے نہیں گرتے بقول ڈاکٹر تاثیر مرحوم۔ اتنی مدقوق شاعری کسی قابل ذکر شاعر نے کی ہی نہیں۔ کمزوری، نقاہت، بے رنگی، بے کیفی، سوناپن۔۔۔۔۔ بناوٹ، ایک بے جان گھٹن، سٹراپن اس شاعری کے طرۂ ہائے امتیاز ہیں۔

امام غزل میر کی غزل پر ایک دو غزلہ حاضر کر رہا ہوں جسے پڑھ کر میاں اثر لکھنوی پھڑک تو کیا اٹھیں گے بھڑک ضرور اٹھیں گے۔ یہ بے چارے اپنی نظم سے مردہ STILL BORN شاعری کو اسی طرح کلیجے لگائے پھر رہے ہیں جیسے بندریا اپنے مردہ بچے کو سینے سے اس وقت تک لگائے پھرتی ہے جب تک بدبو سے تنگ آکر اسے پھینک دینے پر نہ مجبور ہو جائے۔

میں نے ایک واقعہ مجاز و جوش ملیح آبادی کے منہ سے اثر کے متعلق سن کر یقین ان کا (اثر کا) نام بتائے ہوئے شائع کر دیا تھا۔ اسی وقت سے اور پھر اپنی فطری کم بینی سے مجبور ہو کر اثر لکھنوی بغیر کوئی ٹکٹ لگائے FREE FOR ALL وہ کرتب دکھا رہے ہیں کہ ادب کے سرکس کے وہ PRIZE CLOWN یعنی انتہائی مضحکہ خیز اکڑ بن گئے ہیں۔ خواجہ آتش کا یہ شعر بھلا رکھا ہے ؎

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

ایک شعر اثر لکھنوی کی غزل کے متعلق عرض کیا ہے ۔۔ سنیے :-

پھیکی غزلوں پہ جو چھیڑا تو کہا جھنجھلا کر
تم بڑے وہ ہو تمہیں مار کے ٹکڑے کر دیں

اطمینان رکھیے ابھی وہ مہینوں تک اپنے کرتب دکھاتے جائیں گے اور میری طرف سے داد اداکاری بھی پاتے جائیں گے۔
"مارے گجن کے مری جائیں حسن تنکو ناہیں" آپ سے ملیے آپ ہیں جناب اثر لکھنوی۔

آپ کا
فراق

میر کی غزل پر دو غزلہ

میر

جو جو ظلم کیے ہیں تم نے سو سو ہم نے اٹھائے ہیں — داغ جگر پہ جلائے ہیں، چھاتی پہ جراحت کھائے ہیں[1]
تیغ دریغ نہیں ہے اس کی بسمل گہیں کسو سے بھی — ہیں تو شکار لاغر ہم، پر ایک امید پر آئے ہیں
خم سے لگی میخانے کے دیوار بھی اپنے گھر کی ہے — لطف پیر مغاں سے عجب کیا ہم آخر ہمسائے ہیں
شوق ہے غم میں بے صبری ہے آہ کسو کو کیا کہیے — اچھے اپنے جی کو ہم نے آپ ہی روگ لگائے ہیں
محو سخن ہم فکر سخن میں رفتہ ہی بیٹھے رہتے ہیں — آپ کو جب کھویا ہے ہم نے تب یہ گوہر پائے ہیں
دیکھیں طرف ہے کون سی جس سے تیغ ناز بلند کرے — ہم نے بھی تو اس ہی جہت سے فرق نیاز جھکائے ہیں
تب تھے سپاہی اب ہیں جوگی آہ جوانی یوں کاٹی — ایسی تھوڑی رات میں ہم نے کیا کیا سوانگ بنائے ہیں
کس کو ایسی بے خبری تھی جس کے بولے تو چونکا — سو ٹھوکر نے ان پلکوں کی کتنے فتنے جگائے ہیں
کون وہ ایسا ظالم تھا استاد فن عیاری کا — اتنے سن میں جس نے تجکو ایسے فریب سکھائے ہیں

میر مقدس آدمی ہیں تھے سبحہ بکف سے خانے میں
صبح جو ہم بھی جا نکلے تو دیکھ کے کیا شرمائے ہیں

فراق

ہم ہیں کہاں کے رہنے والے اور کہاں سے آئے ہیں — کس رخ سے قربت ہے ہمیں کن زلفوں کے سائے ہیں
ایک عظیم "اب" ہے کہ اسی کی پرچھائیں وقت گزراں — ماضی و حال و مستقبل سب چلتے پھرتے سائے ہیں[2]

---

[1] میر نے بعد کے اشعار میں ہا مخلوط کی قید قوافی میں نہیں رکھی۔ فراق

[2] نہ کوئی ماضی ہے نہ حال نہ مستقبل، صرف ایک عظیم اب (ONE BREAT NOW) ہے۔ افلاطون

رنج و غم یاس و حرماں کیف و مستی امید و نشاط
رنگ ہا رنگ ترے جلوے میرے لیے کیا کیا لائے ہیں

دل کی تمنا بر آنا بھی اک نازک طنز پنہاں
چشم کرم ہوتے ہی کسی کی ہم کیا کیا شرمائے ہیں

یہ طفلی و شباب و پیری یاد رہے گی عالم کو
اتنی چھوٹی رات میں ہم نے کیا کیا سوانگ رچائے ہیں

منزل و مقصد دو تو نہیں ہیں حسن و عشق کی دنیا میں
تم بھی سوئے دل آؤ ہم بھی آئے آئے ہیں

کار عظیم اہل فن کا ہے تہذیب وجداں و شعور
اہل عمل زور بازو سے یہ تو نہیں کر پائے ہیں

"بادل گرجا بجلی چمکی کوئل بولی پھول کھلے"[1]
ہم سر گلشن اس موسم میں ساماں سامان لائے ہیں

بھینی بھینی بو آتی ہے آگئی نصل بہاری کیسا
ڈالی ڈالی نورس غنچے کچھ کچھ رنگ بھی لائے ہیں

ان کی پنکھڑیوں پر قرباں آٹھ صنتوں کے گلزار
آج تو اس کے لب رنگیں نے وہ گل تر برسائے ہیں

نور سحر نے چوم کے وہ رخ اپنی قسمت چمکائی
موج صبا نے چھو کے وہ گیسو ان کیا کیا بل کھائے ہیں

میاں اثر نے رنگ میر میں کہہ کر کیا کیا جھک مارا[2]
ہم بھی رنگ میر میں دیکھو کیسی غزل کہہ لائے ہیں

پارۂ ابر سہ تھے اک دن دیکھیں نہ دیکھیں جس کو فراق
ملک سخن پر اک مدت سے اب تو ہمیں ہم چھائے ہیں

۲

میری غزل میں جوش بیاں کے وہ دریا لہراتے ہیں
جعفر علی اثر نے جن میں کیا کیا غوطے کھائے ہیں

روز و شب دونو تھے جلو میں جب وہ ادھر کو آئے ہیں
پرچم مہر و ماہ کہکشاں ساتھ ساتھ لہرائے ہیں

رات تو اس کی آمد آمد ڈھا گئی ہل چل پر ہل چل
مثل شعلہ شمع انجمن اہل بزم تھرائے ہیں

انتظار تقدیر بشر ہے سعی قرب تدبیر بشر
آؤ نہ آؤ آپ میں ہم تو اک مدت سے آئے ہیں

ہم پہ ان آنکھوں کی بجلی گرتی رہی ہے۔ گردش چرخ
ہم کو کیا تڑپائے گی ہم تڑپے تڑپائے ہیں

ماتم خانۂ عشق میں سن لے اپنے جور و ستم کا ذکر
رند ہی رندی آوازیں ہیں سب کے لہجے بھر آئے ہیں

ایک پیام آزادی ہے پیچ و تاب اسیری بھی
زلف سیاہ کی قید میں ناحق ہم کیا کیا گھبرائے ہیں

دیکھ ہماری شعلہ نوائی ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھے جن میں
ان راتوں کو دل ظلمت میں ہم چراغ جلائے ہیں

دیکھ کے جن کو غیب کی آنکھیں جھک جھک سی جاتی تھیں
ساقی ہم نے تیری بدولت وہ ساغر چھلکائے ہیں

کس سے ملے کس سے نہ ملے اجنبیوں کی دنیا میں
آہ پرائے بھی تو ہیں اپنے۔ اپنے بھی تو پرائے ہیں

---

[1] صفی لکھنوی کا مصرعہ ہے۔ فراق

[2] جعفر علی خاں اثر لکھنوی جن کا ایک مصرعہ بھی کسی کی زبان پر نہیں چڑھ سکا۔ اس مقبولیت کے کیا کہنے۔ فراق

کیوں باہم بیگانہ رہیں کچھ ہم وطنی کا پاس کریں — تم جس دیس سے آئے ہو ہم بھی تو وہیں سے آئے ہیں[1]
میرے لب و لہجہ کو بھی دیکھیں یوں تو ہر بیگانے ہی اکثر — جو رستم بیداد و تغافل کس کس کے گن گائے ہیں
سن سن کر سر دھنتی رہیں گی آنے والی نسلیں بھی — آج میرے اشعارِ غزل فردا کو وجد میں لائے ہیں
ہیں ارمانِ عشق باشندے آنکھ اوجھل دنیاؤں کے — اے دلِ زار یہ تیرے مہماں دور دور سے آئے ہیں
گزرو گے جو ہماری خاک سے طرفہ چراغاں دیکھو گے — زیرِ زمیں بھی لپک جاتے ہیں زخم وہ دل پر کھائے ہیں

ایسی بھی کیا غم کی بے خبری آنکھیں تو کھولو فراق ذرا
بڑی منتوں سے ہم اس کو گھیر سے گھیرے لائے ہیں

---

[1] وجہ بیگانگی نہیں معلوم — تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں (میر)

علم بڑی دولت ہے!

اپنے ذوق کی تسکین اور ذہنی نشو و نما کے لیے ہمیشہ اچھی کتابوں کا مطالعہ کیجئے

ہندو پاکستان کے مشہور اہل قلم حضرات کی مشہور کتابیں آپ ہم سے طلب کیجئے گا۔ ہمارے یہاں ہر وقت اچھے کتابوں کا اسٹاک موجود رہتا ہے۔ چند کتابیں حسب ذیل ہیں

عروسہ ناول، از اے آر زبیدہ خاتون قیمت چھ روپے • سوز شبِ غم ناول، از سلیم چودھری قیمت چار روپے • بغیر عنوان کے ایک نفسیاتی ناول، از منٹو قیمت تین روپے • شکاری عورتیں منٹو کے آخری زمانے کے افسانے قیمت دو روپے • آزاد غلام افسانے از ابراہیم جلیس قیمت دو روپے • دودھ کی قیمت افسانے از پریم چند قیمت دو روپے چار آنے • دیہات کے افسانے از پریم چند قیمت تین روپے • زنداں نامہ ہندو پاکستان کے مشہور ترقی پسند شاعر فیض احمد فیض کا مجموعہ کلام قیمت دو روپے۔ ہر آرڈر پر محصول ڈاک علاوہ

ملنے کا پتہ

بھٹاچاریہ پبلسٹی

پوسٹ سوناپور، ضلع ۲۴ پرگنہ (مغربی بنگال)

برق موسوی

دامن کو ذرا دیکھ.....

حضرت جعفر علی خاں اثر لکھنوی کہنہ مشق شاعر بھی ہیں، سخن فہم بھی اور نقاد بھی، آپ کی شاعری کی عمر ہمارے اکثر شعرا کی عمروں سے زیادہ ہے۔ آپ نے بڑے معرکہ کی غزلیں کہی ہیں اور کثر سے کثر نقادوں سے داد تحسین حاصل کی ہے۔

ہر شاعر اور فنکار میں ہزاروں خوبیوں کے ساتھ ساتھ چند کمزوریاں بھی ہوتی ہیں۔ بعض شعراء میں "حفظ ذات" سے ہٹ کر ایک غلط قسم کی انفرادیت، جس کو انفرادیت سے زیادہ انانیت یا بالفاظ دیگر "ہمچو ما دیگری نیست" کا جذبہ یا خبط کہنا چاہیئے — پیدا ہو جاتا ہے۔

"خطائے بزرگاں گرفتن، خطاست" سے مجھے انکار نہیں۔ لیکن اعتراض کی نیت سے نہیں بلکہ خلوص کے ساتھ آداب بزرگاں کو ملحوظ رکھتے ہوئے، ادبی زبان اور شکوہ کے انداز میں اگر میں یہ کہوں تو شاید "خطا" سمجھی جائے گی کہ حضرت فراق گورکھپوری کے تعلق سے حضرت اثر نے غلط قسم کے "ہمچو ما دیگری نیست" کے جذبہ کا مظاہرہ کیا ہے — مجھے حضرت اثر کی وسیع القلبی اور عالی ظرفی سے توقع ہے کہ وہ خود بھی میری اس صاف گوئی پر برا نہ مانیں گے تاکہ مجھے ادبی زبان سے یہ کہنے کا موقع نہ ملے ؎ عارف کہ بر غبد، تنک آب ست ہنوز

اس مضمون سے میرا مقصد نہ تو حضرت فراق کی صفائی ہے اور نہ حضرت اثر کی تردید۔ بلکہ کامل فیر جانبداری اور احتساب نفس کے ساتھ "ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں" کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ؎

ایں گناہ ایست کز در شہر شما نیز کنند

جہاں حضرت فراق سے سہو ہوا ہے، وہیں حضرت اثر بھی سہو اور خطا سے نہیں بچ سکے ہیں۔ غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے۔ شاعر بھی انسان ہے۔ اس سے غلطی کا سرزد ہونا یقینی ہے۔ غالب، انیس، حافظ اور سعدی بھی سہو سے نہیں بچ سکے۔ چونکہ سہو و نسیاں تقاضائے بشری ہے۔ اس لیے ایسی لغزشیں معاف کر دی جانے کے قابل ہیں — لیکن جہاں سہو کی تکرار اور غلطی پر اصرار ہو، اور ساتھ ہی چیلنج اور یہ دعویٰ بھی کہ میرا کلام "اغلاط و ہفوات کا پشتارہ نہیں — تو ایسا دعویٰ کرنے والا کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت اثر نے "صبا" کے تازہ شمارے میں "چھیڑ خوباں سے" کے عنوان کے تحت تحریر فرمایا ہے:-

"رسالہ 'صبا' حیدرآباد دکن کے شمارہ (۴) جلد (۳)، ۵۶ء میں حضرت فراق گورکھپوری کی ایک غزل شائع ہوئی ہے جس کا ایک شعر ہے ؎

قلم کا زور تنقیدوں میں ناحق صرف کرتے ہیں غزل اک ایسی کہہ لائیں حریفوں میں اگر دم ہو

ان کا مخاطب صحیح میں ہی ہوں کیونکہ تنقیدی مضامین میں ان کی شاعری کا پول کھولتا رہتا ہوں ان کے چیلنج کے جواب میں میں نے غزل کہدی، مگر یہ اعتراف ہے کہ ان کی ایسی نہیں، کیونکہ اغلاط و ہفوات کا پشتارہ نہ بنا سکا۔ اس طرف توجہ دلانے کو الگ ایک مضمون لکھ دیا ہے۔ اب اگر فراق صاحب میں دم ہو تو میری غزل کا جائزہ لے کر اس کی خامیاں اور کمزوریاں دکھائیں اور ان کی غزل پر میں نے جو اعتراضات کیے ہیں ان کو رد کریں۔ ہمیں گود ہمیں میداں ہے"

اس موقع پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حضرت اثر کا یہ عمل ایسا ہی ہے جیسے کوئی کانچ کے مکان میں رہنے والا دوسرے کانچ کے مکان والے پر پتھر پھینک مارے ـــــ حضرت اثر نے اپنی جو غزل جائزہ کے لیے پیش فرمائی ہے اس کو پڑھنے کے بعد اس کہاوت کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ "دوسروں کی آنکھ کا شہتیر دیکھنے والوں کو اکثر اپنی آنکھ کے تنکے سجھائی نہیں دیتے" کہنے کو تو حضرت اثر نے اس غزل میں "بہت زور مارا" ہے۔ لیکن "نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب" والی بات ہے۔ اشتہار شعر کی اس غزل کے اشعار ؎

سب کے سب ہیں نظری ایک پہ بھی صاد نہیں

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس غزل میں نہ صرف خامیاں اور کمزوریاں ہیں بلکہ فاش لفظی و معنوی غلطیاں بھی۔ مثلاً زیر بحث غزل کا یہ شعر ؎

کہیں تقلید میں بھی خوبی تخلیق ہوتی ہے
حریف زلف محبوباں بھلا کیا "زلف پرچم" ہو

"زلف پرچم" پر حضرت اثر نے فٹ نوٹ تحریر فرمایا ہے:۔

"زلف پرچم" علم کا پھریرا۔ صرف فراق صاحب کی آگاہی کے لیے لکھتا ہوں کہ شائد ان کے مبلغ علم سے باہر ہو"

یہ فراق صاحب کو آگاہ کرنے کی بھی ایک رہی جب کہ آپ خود اس لفظ کی حقیقت سے آگاہ نہیں ـــ "پرچم" کے اصل معنے خود "پھریرے" کے اور مجازاً زلف کے ہیں۔ اس لیے "زلف پرچم" کہنا ایسا ہی ہے جیسے "شب برات کی رات"۔ اس وقت میرے سامنے بڑی بڑی لغتیں نہیں ہیں اور یوں بھی پرچم جیسے لفظ کی تحقیق کے لیے لغت دیکھنا تحصیل حاصل ہے۔ بقول خاقانی ؎ نیست مداح تو محتاج صراح و قاموس

تاہم حضرت اثر کو مطمئن کرنے کے لیے اردو، فارسی کے جو لغات اس وقت میرے سامنے ہیں ان کا حوالہ دینا ضروری

سمجھتا ہوں۔

۱۔ غیاث اللغات ۔ فارسی ۔ نولکشور ۔ صفحہ (۸۳) "پرچم" بالفتح و جیم فارسی نیز مفتوح۔ چیزی ست کہ از ابریشم سیاہ طیار ساختہ بر سر علم زند و بجاز نوئی گاؤ کوہی را نیز می گفتہ باشند۔

سراج اللغات و در برہان و لطایف نوشتہ کہ بمعنی دُم گاؤ کوہی ست و بجاز بمعنی زلف و کاکل نیز می آید۔

۲۔ فیروز اللغات ۔ اردو چھٹا ایڈیشن۔ مطبوعہ امرتسر۔ صفحہ (۳۰۷) پرچم ۔ فارسی ۔ مذکر۔ پھریرا۔ کپڑا جو جھنڈے پر باندھا جاتا ہے ۔ (۲) زلف کاکل۔ قصہ یہ ہے کہ حضرت اثر نے "زلف علم" کے قیاس پر "زلف پرچم" بنالیا جس پر "ایجاد بندہ اگرچہ گندہ" کی مثال صادق آتی ہے۔ "زلف علم" صحیح ترکیب ہے۔ جیسا کہ عرفی نے کہا ہے ؎

نریں باد پریشاں نکنم زلف علم را

لیکن اس قیاس پر "زلف پرچم" مہمل محض ۔ اس کے قطع نظر غالب کے اس شعر سے بھی واضح ہوگا کہ "پرچم" الگ چیز ہے اور "علم" الگ ؎

بادا علمت کبک خرامندہ و گردوں
چوں بیضہ زیر پرچم تہ پر باد علم را

پرچم پھریرا ہے اور علم وہ نیزہ ہے جس پر پھریرا لگایا جاتا ہے۔

یہ تو لفظی بحث تھی۔ آیئے اب حضرت اثر کے اس شعر کو معنوی اعتبار سے جانچیں ؛ ؎

کہیں تقلید میں بھی خوبیٔ تخلیق ہوتی ہے

تقلید میں تخلیق کی خوبی نہیں ہوتی ـــــ لیکن یہ نظریہ غلط ہے ـــ بقول افلاطون ـــ انسان خصوصاً شاعر فطرت کا نقال ہے وہ فطرت کی نقل اتارتا ہے۔ لیکن نقل کو اصل فطرت (تخلیق) سے کہیں زیادہ بڑھا دیتا ہے۔ حیات کے کسی شعبہ میں دیکھ لیجئے ۔ یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہوجائے گی کہ تقلید، بیشتر تخلیق سے زیادہ مکمل اور بے عیب ہوا کرتی ہے۔ مثال کے طور پر غبارہ کو لیجئے۔ فضا میں پرواز کرنے کے سلسلے میں اولین تخلیق تھی۔ اب موجودہ زمانہ کے طیارہ کو دیکھئے جو غبارہ کو دیکھ کر اس کی تقلید میں بنایا گیا ہے۔ غور کیجئے خوبی غبارہ میں تھی یا موجودہ طیارے میں ہے اگر "غبارہ" "خوب" تھا تو طیارہ "خوب تر" ہے۔ نقش ثانی ہمیشہ نقش اول سے بہتر ہی ہوا کرتا ہے ـــ ارتقا کے سوتے خشک نہیں ہوئے۔ دنیا برابر آگے بڑھ رہی ہے۔ ہر تخلیق ایک نامکمل اور دھندلا خاکہ ہوتا ہے جس کو بعد کے آنے والے مکمل کرتے ہیں اس میں رنگ بھرتے ہیں۔ ہر تخلیق اور ساری کائنات ابھی نامکمل ہے بقول اقبال ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کُن فیکون

یہ جداگانہ بحث ہے کہ تخلیق کی یہ ناتمامی ہی، ذات تمام کا پتہ دیتی ہے۔ تخلیق کو "اولیت" حاصل ہے۔ لیکن "اکملیت" نہیں۔ تقلید کو اولیت حاصل نہیں لیکن اکملیت ضرور حاصل ہے۔ دنیا میں کوئی تخلیق مکمل نہیں بہت کم خیالات ایسے ہیں جن کو تخلیق یا ORIGINAL کہا جا سکے۔ عموماً خیال سے خیال پیدا ہوتا ہے دیئے سے دیا جلتا ہے۔ انسان تقلید پر مجبور ہے وہ دوسروں کے تجربات سے استفادہ کرتا ہے پھر اپنے تجربات اس پر مستزاد کرتا ہے۔

تقلید میں تخلیق کی خوبی ہوتی ہے یا نہیں۔ ۔ اس کو شعر و ادب میں جائج لیجئے! رودکی نے شاہنامہ کے ابتدائی چند سو شعر کہے تھے۔ یا بالفاظ دیگر شاہنامہ کی تخلیق کی تھی۔ فردوسی نے رودکی کی تقلید میں شاہنامہ کی تکمیل کی۔ اب بتایئے رودکی کی تخلیق میں خوبی ہے یا فردوسی کی تقلید و تکمیل میں! اردو زبان میں بقول بعضے قطب شا نے مثنوی کی تخلیق کی۔ انیس نے اس ابتدائی تخلیق کو معراج کمال پر پہنچایا۔ اب بتایئے قطب شاہ کی تخلیق میں خوبی ہے یا انیس کی تقلید و تکمیل میں۔ امیر خسرو نے اس خیال کی تخلیق کی تھی ؎

اے گل چو آدمی نزمیں گو چگونہ اند
آں روئے ہا کہ در تہ گردفنا شدند

دیکھئے غالب نے تخلیق کے اس ابتدائی خاکہ میں رنگ بھر کر اس کی خوبی کو کس طرح دوبالا کر دیا ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

سعدی کے اس ابتدائی خیال کو ؎

از ورطۂ ما خبر ندارد
آسودہ کہ بر کنار دریاست

حافظ نے کس طرح مکمل کر کے تقلید کو تخلیق سے بڑھا دیا ؎

شب تاریک و بیم موج و گردابی چنیں حائل
کجا دانند حال ما سبکساران ساحل ہا

تخلیق اک حسن بلیغ ہے۔ اور تقلید جو جدت اور تکمیل کے مقاصد لیے ہوئے ہوتی ہے، اس حسن بلیغ پر اضافہ کر کے اس کو نکھارتی ہے ؎

مشاطہ را بگو کہ بر حسن بلیغ دوست
چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسد

مندرجۂ بالا مثالوں سے یہ ظاہر ہو گا کہ ایک شاعر ایک آرٹسٹ جو نظیر کا قائل ہوتا ہے وہ نقل کو اصل فطرت اور تخلیق سے کہیں زیادہ حسین بنا دیتا ہے۔ تخلیق کی خامیوں کو دور کرتا ہے۔ بشرطیکہ وہ نرا نقال نہ ہو بلکہ اس میں جدت اور تکمیل کا جوہر ہو۔ ان مسلمات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اگر حضرت اثر کے اس مصرعہ کو ؎

کہیں تقلید میں بھی خوبیٔ تخلیق ہوتی ہے

یوں پڑھا جائے ؎

کہیں تقلید میں بھی "خامیٔ" تخلیق ہوتی ہے

تو میں سمجھتا ہوں کہ بدیہات کے عین مطابق ہوگا۔

حضرت اثر کا دوسرا شعر ؎

یہی منشا ہے پاکی کا، یہی جوہر ہے پاکی کا
مثال آہوئے رم دیدہ اپنے سایہ سے رم ہو

؎ آہوئے رم دیدہ" جی ہاں!" خشک باگندہ بہروزہ" ۔ آہوئے رمیدہ ۔ آہوئے صیاد دیدہ ۔ آہوئے رم خوردہ آہوئے رم زدہ ۔ یہ تمام ترکیبیں اساتذہ کے کلام میں نظر آتی ہیں ۔ جیسے غالب ؎

میں دشت غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں
مجھ سے مانوس ہوئے میرے پریدہ طرطی
رام ہو جا کبھی اے میرے رمیدہ آہو

میرزا وحید ؎ رشتۂ جذب محبت نکند کوتاہی
چہ شد ای رم زدہ آہوئے بیاباں شدہ

لیکن "آہوئے رم دیدہ" کی نہ کہیں دیدہ ہے نہ شنیدہ ۔ میں شکر گزار رہوں گا حضرت اثر کا اگر وہ عرفی، بیدل، خسرو یا غالب کے کلام سے "آہوئے رم دیدہ" کی سند پیش فرمائیں ۔

لغت میں "رم" کے معنے "ڈر ۔ وحشت اور گریز" کے ہیں ۔ فیروز اللغات صفحہ (۶۶۴) ۔ بنا بریں یہاں آہوئے رم دیدہ کی بجائے رم خوردہ درست ہو سکتا ہے ؎

مثال آہوئے رم خوردہ اپنے سایہ سے رم ہو

اس لفظی اصلاح کے بعد، معنوی غلطی ابھی اپنی جگہ برقرار ہے ؎

یہی منشا ہے پاکی کا یہی ہے جوہر پاکی
مثال آہوئے رم دیدہ اپنے سایہ سے رم ہو

پاکی کا یہ منشا ہے کہ ہرن کی طرح اپنے سایہ کو دیکھ کر چوکڑی بھری جائے ۔ یعنی ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ ۔ یا ؎

پہلے تو رد عمل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

"پاکی" کے عام معنے جیسا کہ سب جانتے ہیں ۔ طہارت کے ہیں ۔ اب سوال یہ ہے کہ طہارت کا یہ منشا کیسے ہو سکتا ہے کہ اچھا خاصا آدمی "کوری پیٹھ بچھیرے" کی طرح اپنے سایہ سے بدکتا رہے ۔ یوں بھی سایہ سے بدکنا، اپنے آپ سے گریز کرنا صحت مندانہ علامت نہیں ۔

حضرت اثر کا تیسرا شعر ؎

عجب وہ راز ہے، جس کا کیا ہے، پاسباں مجھ کو
نفس تلوار بن جائے، زباں دل کی جو محرم ہو

"راز" کا "پاسباں" نہیں ہوتا ۔ "در" کا پاسباں ہوتا ہے ۔ راز کے لیے "امین" یا "رازداں" کہنا چاہیے ۔ اس کے قطع نظر غالب کے اس مکمل شعر کے ہوتے ہوئے لفاظ بدلنے کی کیا ضرورت تھی ؎

ایں رازکہ در سینہ نہاں ست نہ وعظ است
بردار تواں گفت و بہ ہر نتواں گفت

قریب قریب اسی مضمون کو صائب (غالب) نے بھی ادا کیا ہے ؎

عجب سوز است اندر دل اگر گویم زباں سوزد
وگر دم در کشم، ترسم کہ مغز استخواں سوزد

حضرت اثر کا چوتھا شعر ؎

بھلا گفتار کیا دخل اس بزم تماشا میں
جہاں بے تابیٔ دل کا حیا ہے خیر مقدم ہو

"بے تابیٔ دل" کا اظہار "بزم تماشا" میں نہیں خلوت میں کیا جاتا ہے۔ بلکہ احتیاط وفا، اور رضا کوشی کا تقاضا یہ ہے کہ خلوت میں بھی بے تابیٔ دل کا اظہار نہ ہو، حرف مطلب زبان پر نہ آئے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے ؎

خلوت میں ان کے کیسے یہ کثرت ہو بار یاب
کیوں جائیں ان کے سامنے ارماں لیے ہوئے

اس کے قطع نظر "گفتار" کی پھر بھی پذیرائی ہو سکتی ہے۔ لیکن بے تابیٔ دل کا اظہار جو کم حوصلگی اور بوالہوسی کی طرح سنگین جرم ہے کس طرح روا رکھا جا سکتا ہے۔ وہ تو خیر گذری کہ "حیا" سے خیر مقدم کیا گیا۔ کسی اور طریقے سے کیا جاتا تو ..... !۔ حیا سے خیر مقدم کرنے کا یہ مضمون غالب کے پاس موجود ہے ؎

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد، شرما جائے ہے مجھ سے

حضرت اثر کا پانچواں شعر ؎

"خموشی معنیٔ دارد کہ در گفتن نمی آید"
اگر وہ کم سخن گرم سخن ہو کیا ہی عالم ہو

آپ نے فارسی کا ایک مصرع مستعار لے لیا۔ خیر اچھا کیا۔ لیکن اردو گرہ ایسی لگائی کہ فارسی مصرع "خموشی" کے باوصف زبان حال سے کہہ رہا ہے: "طنبورہ من چہ می سرآید؟ یہ گرہ ایسی ہی ہے جیسے کوئی صبا رفتار گھوڑے کے ساتھ آرٹیل بیل" کو جوت دے۔ یہاں "اجتماع نقیضین" واقع ہوا ہے: "خموشی" "کم سخنی" نہیں۔ اور کم سخنی، خموشی نہیں دونوں میں کھلا اور نمایاں فرق ہے۔ یہ بحث جداگانہ ہے کہ خموشی "عین تکلم" ہے اور "تغافل" "عین اعتنا" جیسے ملا ظہوری کہتا ہے ؎

تو نظر باز نہ ای، ورنہ تغافل نگر است
تو زباں فہم نہ ای، ورنہ خموشی سخن است

جب آپ خموشی کو تسلیم کر رہے ہیں تو پھر "کم سخن" کہنا غلط۔ کم سخنی، خموشی اور "بسیار گوئی" کی درمیانی حالت کو کہا جاتا ہے۔ اس لیے دوسرا مصرعہ یوں درست ہو سکتا ہے

"خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید" — زباں سے وہ جو ہاں "کہدیں نہ جانے کیا ہی عالم ہو

چھٹا شعر ؎ نہیں اب ہوش اتنا بھی ہجوم نامرادی میں
نہ ہو کس حسرت برباد کا اور کس کا ماتم ہو

جب آپ حسرتوں کی تقسیم کر رہے ہیں ایک حسرت اور دوسری حسرت میں فرق و امتیاز کر رہے ہیں، تو معلوم ہوا کہ آپ "ہوش" میں ہیں۔ اس لیے "نہیں اب ہوش" کہنا وہی "طنبورہ مَن" والی بات ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہاں حضرتِ اشرف وہ بات کہنا چاہتے تھے جو غالب نے اپنے اس شعر میں کہی ہے ؎

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

ساتواں شعر ؎ مذاقِ عشق و خودداری جزاک اللہ جزاک اللہ
وہی گریہ ہے جس کا ضبط زخمِ دل کا مرہم ہو

اے جزاک اللہ! "ضبطِ گریہ" زخمِ دل کے لیے مرہم ہوتا ہے یا SEPTIC اور SEPSIS! رونا تو دل کی بڑاس نکال دیتا ہے۔ آنسو کا ہر قطرہ زخمِ دل کے لیے پھایا ہو جاتا ہے ـــــ برخلاف اس کے ضبطِ گریہ سے نہ صرف یہ کہ زخمِ دل ناسور بن جاتا ہے بلکہ دم اکھڑ جاتا ہے ؎ دم اکھڑ جائے گا اس ضبط سے، کر نوحہ گری
چیختا کیوں نہیں منہ ڈھانپ کے رونے والے!

آٹھواں شعر ؎ جو ذوقِ خود نمائی اک سراپا ناز کا کم ہو
پلک جھپکانے میں شیرازۂ کونین برہم ہو

کیا غالب کا یہ مضمون اس آسانی کے ساتھ اپنایا جا سکتا ہے ؎

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

ذوقِ خود نمائی کے "صرف" کم ہونے سے شیرازۂ کونین برہم نہیں ہو سکتا۔ ہاں ذوقِ خود نمائی کا عدم، شیرازۂ کونین درہم برہم کر سکتا ہے۔ مصرعِ اول میں لفظ کم زائد محض ہے۔ اسی طرح لفظ "اک" بھی۔ اک کی بجائے "اس" ہونا چاہیے۔ دوسرے مصرع میں جھول ہے۔ تیر نشانہ پر نہیں۔ دوسرا مصرع یوں درست ہو سکتا ہے ؎

جھپکتے ہی پلک، شیرازۂ کونین برہم ہو

نواں شعر ؎ سُنا کر مجھ کو کہتا ہے ستمگر اور ہنس ہنس کر
مداوا کیوں وہ ڈھونڈے جو رہینِ لذتِ غم ہو

"سنا کر مجھ کو کہتا ہے" روزمرہ اور بول چال کے خلاف ہے۔ پہلا مصرعہ یوں ہونا چاہیے ؎

سنا نے مجھ کو کہتا ہے ستمگر غیر سے ہنس کر

دوسرے مصرعے میں "ڈھونڈے" کی بجائے "چاہے" ہونا چاہیے۔ کیونکہ انسان خیال سے عمل کی جانب بڑھتا ہے خواہش جستجو کا پیش خیمہ ہوتی ہے ؎ مداوا کیوں وہ چاہے جو رہینِ لذتِ غم ہو

پندرھواں شعر ؎ جہاں یہ حال ہو دل کا، عبث فکر دلدا ہے
جگر ہو ٹکڑے ٹکڑے اک ذرا بھی درد اگر کم ہو

درد کے کم ہونے سے جگر کا ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا ـــــ بلبل کی انتڑیوں میں رگِ گل کی پھانس ہے۔ موازنہ کیجئے۔ حضرتِ اثر کے شعر میں اور اس فلمی شعر میں کیا فرق ہے ؎

اس دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا

سولہواں شعر ؎ بہار آرائیِ جلوہ بقدرِ ہمتِ دل ہے
نہ کیوں پیشِ نظر ہر لحظہ تازہ ایک عالم ہو

غالباً حضرتِ اثر یہ مضمون ادا کرنا چاہتے تھے ؎

ہر لحظہ نیا طور، نئی برقِ تجلی
اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

لیکن بُرا ہو "آورد" کا۔ "جلوہ آرائی" کو "آرائیِ جلوہ" کہہ بیٹھے۔

مطلع ؎ مزا بربادیوں کا جب ہے اے دل وہ مژہ نم ہو
محبت کی ہے یہ توہین اپنا آپ ماتم ہو

حضرتِ اثر کا یہ مطلع پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ آواز کہیں سنی ہوئی ہے ؎

یارب صدائے دل سے تو کان آشنا سے ہیں، یہ آواز آرہی ہے یہ کب کی سنی ہوئی

ہاں اچھا یاد آیا ؎ الفت کا جب مزہ ہے کہ وہ بھی ہوں بے قرار
دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

دیکھئے حضرتِ اثر کے مذکورہ بالا مطلع کے مضمون کا ایک "معارضی پہلو" یوں بھی ہو سکتا ہے۔ جدت طرازِ طبیعت مضمون کو اس طرح الٹ دیتی ہے ؎

مزا بربادیوں کا جب ہے ان کو ہو خوشی حاصل
یہ توہینِ وفا ہوگی اگر ان کو مرا غم ہو

مقطع ؎

جو کج اندیش ہیں کیا واقفِ اسرارِ ہستی ہوں
اثر گمراہیوں کا ان کی تم کو کس لیے غم ہو

"جا چھوڑ دیا، مردِ مسلماں سمجھ کر"۔ میں مقطع پر تنقید نہیں کروں گا۔ کیونکہ مجھے "راستِ اندیشہ" ہے کہ مقطع میں کوئی "سخن گستاخانہ بات" آپڑے گی اور حضرتِ اثر مجھ کو "کج اندیش" سمجھ کر میری "کج اندیشی" کا غم نہیں کریں گے اور ممدوح کا غم نہ کرنا میری "گمراہی" پر دلالت کرے گا۔

مضمون کافی طویل ہو گیا۔ اب میں اپنے اس مضمون کے "آہوئے رم دیدہ" کو "شاخِ بستہ" کرنے سے پہلے، یعنے مضمون ختم کرنے سے پہلے دو باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ ایک ہنسی کی بات، دوسرے سنجیدہ۔ ہنسی کی بات یہ ہے کہ میں نے بھی حضرتِ اثر کی زمین میں ایک شعر کہنے کی جرأت کی ہے ؎

دسواں شعر ؎ یہی شوریدگیٔ عشق کا پیہم تقاضا ہے
کہ وہ زلفِ مسلسل اور برہم اور برہم ہو

پہلے مصرعہ میں "شوریدگی" کا نہیں بلکہ "آشفتگی" کا محل ہے۔ دوسرے مصرعہ میں "زلفِ مسلسل" کی بجائے "زلف مشوش" کہنا درست ہے۔ دیکھئے انشا کے اس شعر میں ؎

بل بے کمر کہ زلف مسلسل کے بوجھ سے
کھاتی ہیں تین تین بل اک گدگدی کے ساتھ

زلف مسلسل کا صحیح استعمال ہے۔ لیکن حضرت اثر کے شعر میں لفظ "برہم" کی مناسبت ملحوظ رکھتے ہوئے زلف مشوش ہونا چاہیئے۔ جو لوگ الفاظ کا مزاج پہچانتے ہیں وہ اس نازک فرق کو سمجھ سکتے ہیں۔

گیارھواں شعر ؎ شرابِ عشق کے اک جرعہ کے بدلے نہ لے ہرگز
اگر سرمایۂ عیش دو عالم بھی فراہم ہو

پہلے مصرعہ میں "دو" کے "آ" جانے کی وجہ سے سقمِ صوتی پیدا ہو گیا ہے۔ یہ شعر یوں درست ہو سکتا تھا ؎

شرابِ عشق کی اک بوند بھی دے کر نہ لے ہرگز
اگر خمخانۂ عیشِ دو عالم بھی فراہم ہو

بارھواں شعر ؎

کرشمہ سازیٔ حسنِ جہاں افروز ارے توبہ
جہاں تک شرح کرتے جاؤ رازِ عشق مبہم ہو

پہلے مصرعہ میں حسن کی صفت "جہاں افروز" بتائی گئی ہے۔ جب حسن کی صفت جہاں افروزی ہے تو پھر رازِ عشق کو مبہم کی بجائے آشکار بلکہ اظہر من الشمس ہونا چاہیئے۔ کیونکہ جہاں افروزی کا تقاضا یہی ہے۔ اگر میں یہاں "ماروں گھٹنا اور پھوٹے آنکھ" کہوں تو کیا برمحل نہ ہوگا؟!! اس کے قطع نظر "عروضیوں" کے نقطہ نظر سے اگر پہلے مصرعہ کی تقطیع کی جائے تو "افروز" کا "ز" تقطیع سے گر جاتا ہے :-

کرشمہ سا ۔ زیٔ حسن ۔ جہاں افرو ۔ ارے توبہ
مفاعیلن مفاعیلن ۔ مفاعیلن ۔ مفاعیلن

تیرھواں شعر ؎

گدازِ دل بھی شامل ہو جو میری طرح اشکوں میں
لپکتے شعلہ کا ہر قطرۂ شبنم پہ عالم ہو

پہلے مصرعہ میں گداز کا محل نہیں بلکہ "سوز" کا محل ہے۔

چودھواں شعر ؎ غرورِ عشق، نازِ حسن سے کچھ کم نہیں یعنی
جو سر جھک جائے سجدہ میں تو غیرت ہے جبیں نم ہو

"یعنی" (برائے وزن) کے قطع نظر۔ دوسرے مصرعہ کی جھول اور "نم" کے مکرر قافیہ کے عیب کو اس طرح دور کیا جا سکتا تھا ؎

جبیں غرقِ عرق ہو جائے، سر سجدہ میں گر خم ہو

میرے دل کو جلا کر کر دیا ہیرو شیما تم نے
کہو سچ سچ کہ تم معشوق ہو یا جوہری بم ہو

چونکہ سائنس کی تحقیق ابھی ایٹم تک پہنچی ہے۔ اس لیے میں ایک ہی شعر پر اکتفا کرتا ہوں آئندہ جیسے جیسے تحقیق آگے بڑھتی جائے گی میں بھی اپنے اس شعر کی بنیاد پر فاضلے کی اینٹیں جما جما کر "دو منزلہ" سہ منزلہ چار منزلہ پنج منزلہ غزل کہتا جاؤں گا۔

دوسری سنجیدہ بات یہ کہ شاعر منتہی ہو یا مبتدی اس سے کسی نہ کسی غلطی کے سرزد ہونے کا نہ صرف امکان عقلی بلکہ بقول ملا جامی "امکان بے عقلی" بھی ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے "صبا" کے اسی زیر بحث شمارہ میں حضرت جوش کا ایک شعر چھپا ہے ؎

یوں کراچی میں ہوں جس طرح سے کوفہ میں حسینؑ
سب شہادت کے ہیں آثار جنا جو ر گرم

اس شعر میں ایک تاریخی غلطی اور ایک لفظی غلطی ہے۔ تاریخی غلطی یہ کہ امام حسین علیہ السلام کوفہ نہیں گئے بلکہ کربلا گئے۔ آپ کوفہ کے ارادے سے نکلے ضرور تھے۔ لیکن راستہ میں مشہور شاعر فرزدق سے ملاقات ہوئی۔ کوفہ کے حالات دریافت کرنے پر فرزدق نے کہا:۔ کوفیوں کے دل آپ کے ساتھ ہیں لیکن ان کی تلواریں یزید کے ساتھ۔ ان کے ہاتھ یزید کے ہاتھ بک چکے ہیں۔ یہ سن کر آپ کوفہ گئے بغیر ہی کربلا چلے گئے۔ لفظی غلطی یہ کہ "طرح" کے بعد "سے" زائد محض ہے۔ جوش اس مضمون کو ستو رنگ سے باندھ سکتے تھے۔ ممکن ہے ان سے کچھ سہو ہو گیا ہو۔ اس مثال سے واضح ہو گیا کہ غلطی بڑے بڑے سے شاعر سے ہو سکتی ہے۔ لیکن جو شاعر انصاف پسند اور وسیع النظر ہوتا ہے وہ اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتا ہے اور آئندہ ایسی غلطی سے بچتا ہے۔ لیکن جس میں انصاف کا جوہر نہیں ہوتا وہ اعتراف کرنے کی بجائے کج بحثی پر اتر آتا ہے۔ ایسے ہی شاعر کی نسبت زمانہ کا فیصلہ ہے ؎

ہر زہ مشتاب و پئے جادہ شناساں بر گیر
اے کہ در راہِ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت

شہر آرزو

باقر مہدی کی نظموں، غزلوں اور رباعیات کا انتخاب۔
اس میں آرزوؤں کے شہروں کی تباہی و بربادی کی کہانیاں۔
اس میں ایک درجن غیر مطبوعہ نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔

جلد شائع ہو جائے گا قیمت ۳ روپے

ملنے کا پتہ:۔ ۲۱۔ ارکیڈیا بلڈنگ، بمبئی ۸

جیلانی بانو

انتقام

دادی کو سب کی پیدائش کا وقت یاد تھا۔
جس وقت چاہو ذرا سی کوک بھر دو رسن لو۔
"میں جیسہ کے چھلّے میں جا رہی تھی جس وقت باتر پیدا ہوا ہے۔ اس دن میں نے گلابی جالی کا دوپٹہ اوڑھا تھا اودے غلطاں کا پائجامہ اور ہری گرنٹ کا کرتا پہنا تھا۔ اندر والے دالان میں بیٹھی عطر لگا رہی تھی۔ دروازے پر کہار کھڑے تھے ادھر بلاتن دہی کے لیے پیسے مانگ رہی تھی کہ دلہن نے مجھے پکارا ۔ اے اماں جی ۔۔۔ اماں جی ۔۔۔ میں نے بدحواسی کے مارے عطر کی شیشی کھلی چھوڑ دی خس کا عطر تھا۔ پچاس برس پرانا ۔ آج کل تو سو روپے تولہ بھی نہ ملے ۔۔۔

دادی کوئی بات سنانے بیٹھتی تو اتنی تفصیل بیان کرتی تھیں کہ جی ڈوب جاتا۔ گھر کے ہر چھوٹے بڑے کی آنکھوں میں اپنی پیدائش کا منظر یوں جم گیا تھا جیسے وہ خود موقع دار رات پر موجود تھا۔

سب اصرار کر کے دادی سے تفصیل سنتے۔

مگر سارہ کو اپنی پیدائش کا ذکر کبھی پسند نہ آتا تھا۔ وہ چاہتی تھی دادی اس قصے کو بالکل بھول جائیں۔ مگر دادی کو تو سنک تھی۔ جس بات کے پیچھے پڑ گئیں تو لتے لیے بنا نہ چھوڑتیں۔ خصوصاً جب سرد کی ضد اور بے ہودگیوں کا ذکر ہو رہا ہو تو وہ ادبدا کے لاکھوں بار کی گھسی پٹی کہانی شروع کر دیتیں۔

مجھے تو کل کی سی بات یاد ہے ابھی آٹھ برس ہی تو ہوئے ہیں سرد کی پیدائش کو ۔۔۔ دلہن نے کوئی جتن نہ چھوڑا تھا۔ رسیاں تک پھاندیں۔ سارے شہر کی دائیوں اور ڈاکٹروں نے اپنی سی کر ڈالی۔ مگر یہ لونڈیا تو دلہن کی کوکھ کو چیک کر رہ گئی تھی ۔۔۔ ادھر سے اختر میاں کا چوبیس گھنٹے تیہا تھا کہ چار بیٹیاں ہو چکی ہیں اور اب پھر ۔۔۔

سارہ کٹ کے رہ جاتی۔ اماں ابا کے خلاف نفرت کا ابال سا اٹھتا۔ کاش ایک بار پھر وہ وقت واپس آ سکتا تو وہ سب کی اوقات پر سات بار تھوک کر چلی جاتی۔

"اختر میاں کی بے قراری تھی کہ پاؤں زمین پہ نہ ٹکتے تھے ۔۔۔" دادی نوّے میل فی گھنٹے کی رفتار

سے کہی چلی جا رہی تھیں۔

"کمر پر ہاتھ باندھے دالان میں ٹہلے جا رہے تھے ـــ لڑکا ـــ لڑکا ـــ لڑکا ـــ

میں اپنی مرجان والی تسبیح لیے دعا مانگ رہی تھی کہ اللہ ہو کی مشکل آسان کرے۔ مگر بچا سوں بار اختر میاں نے میرا وظیفہ تڑوا دیا ـــ اماں اس بار تو لڑکے کی دعا کیجئے۔ اماں لڑکی کو پالنے کے لیے تو ڈھیروں روپیہ چاہیے۔ بھئی ہمارے پاس تو کچھ ہے نہیں چھٹی تو اب آپ کو کرنی پڑے گی ـــ مارے اترا ہٹ کے ڈاکٹرنی کو بلا لائے ـــ

اوہنہ بس کرو اماں جی ـــ" سارہ تلملا کے رہ گئی۔

اور دولہ بھائی کے بھائی اسے یوں دیکھنے لگے جیسے وہ کاغذ کا برادہ تھی جسے اس کے باپ نے چمکتے ہوئے سونے کے دھوکے میں لاٹری سے نکالا تھا۔

مسہری پر پاؤں لٹکائے وہ کھسیانی سی بیٹھی رہی۔ خشک گلے سے کچھ گنگناتے ہوئے اس نے پنکھے کے پنکھے نکال نکال کر پھینک دیے۔ مگر دولہ بھائی کے بھائی، جو رقیہ باجی کو گھورے جا رہے تھے اب اپنی عینک کا رخ سارہ کی طرف گھمائے تھے۔ لیکن رقیہ باجی کی طرح شرما شرما کے اترانے کی بجائے وہ غصہ میں پھنکی جا رہی تھی۔

"اور دادی ایک بار ابا میاں نے انھیں مسہری کے نیچے جو پھینک دیا تھا" باقر دادی کو مزید تفصیلات دیا کرتا تھا۔ مجبوراً سر دو اٹھ کے دوسرے کمرے میں بھاگی۔

آج تو دن بھر اسے انگاروں پر لوٹنا تڑا۔ دولہ بھائی کے وہ طوطے کی ناک والے بھائی کیا آئے تھے کہ سارا گھر تہ و بالا ہو گیا۔ سب ان کی خاطر تواضع میں بچھے جا رہے تھے۔ اماں چولھے کے پاس ٹہی ہوئی تھیں۔ رقیہ باجی ان کے آس پاس سے بچوں کو مار مار کے بھگا رہی تھیں ان کے سفید کپڑوں پر کسی بچے کا ہاتھ سمی پڑ جاتا تو رقیہ باجی کو دھکا سا لگتا تھا۔ ساری دنیا کے سڑے بسے لطیفے اور پڑوسیوں کی برائیاں ان کے خرگوش کی طرح لمبے لمبے کانوں میں انڈیلی جا رہی تھیں اور وہ بلبلوں کی آواز میں ہنسے جا رہے تھے۔ خود بات کرتے یوں ناک میں بولتے تھے جیسے ٹیاؤں ٹیاؤں کر رہے ہوں۔ کواڑ کی آڑ میں کھڑی ہو کر اس نے ذرا سا پٹ کھولا اور گردن نکال کے زور سے چیخی۔ ٹیاؤں ٹیاؤں ـــ

باقر کا بھی ہنسی کے مارے برا حال تھا۔ اگر وہ ذرا دیر پہلے اس کا منہ نہ چڑا چکی ہوتی تو باقر ضرور ہنستا۔

حد ہو گئی اماں نے انھیں نادرہ باجی کے بھاگنے کا قصہ بھی سنا ڈالا۔

"ابھی لوگ عشا کی نماز پڑھ کے لوٹے بھی نہ تھے جو وکیل صاب کے ہاں میں پڑی ہے"

یعنی کے دن دھاڑے ـــ؟ طوطے کی ناک نے پلٹ کر رقیہ باجی کو دیکھا جو دالان کا تھم پکڑے جانے کیا سوچ رہی تھیں۔

"ادا لڑکیا ـــ سب کے منہ پر کالک لگا گئی۔ ہمارے وکیل صاب روز ڈوب مرنے کو دوڑتے ہیں۔

"کم بخت خود ڈوب مرتی ہے" دادی بھی قریب آ بیٹھیں۔

مگر اس بار نہ تو طوطے بولے اور نہ بلبلیں ہنسیں۔ اماں اور دادی اس گرم خبر کے ایسے سرد استقبال پر کھسیا سی گئیں اور سارہ بہت خوش ہوئی۔

آج صبح ہی سلیٹ پر اس کی باقر اور بنو سے زبردست لڑائی کے بعد "کٹی" ہو چکی تھی۔

ویسے تو باقر ایک آدھ گھنٹے کے بعد ہی لڑائی بھول جایا کرتا تھا۔ مگر آج پے در پے شکستیں کھانے کی وجہ سے سر دکو جب جب موقع ملا اس نے باقر کا منہ چڑا دیا۔ اور باقر نے اس کے سینے پر مونگ دلنے کے لیے آج بنو کو جامن کے جھاڑ پر چڑھایا تھا۔ اس نے بڑے خوفناک انداز میں یہ خبر دادی کو سنائی مگر بنو پھر بھی پٹنے سے بچ گئی تھی۔

اب اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے ۔۔؟

بڑی دیر تک وہ رقیہ باجی کے گلابی دوپٹے کا لچکا ناخنوں سے نوچتی رہی۔ پھر قینچی مل گئی تو دولہا بھائی کی کتابوں میں سے بڑی نفاست کے ساتھ بیل بوٹے کاٹنے بیٹھ گئی۔ مگر ایک بھی ڈھنگ کا نہ کٹا۔

آج سارے گھر سے وہ بیزار ہوئی جا رہی تھی۔

گھر کیا اچھا خاصہ مرغیوں کا ڈربہ تھا۔ ذرا دیر کو سب اکٹھے ہوئے اور تو تو میں میں شروع ہو گئی۔ مرگھنے بلیوں کی طرح وہ اور بنو آمنے سامنے آتے ہی مار کٹائی شروع کر دیتی تھیں۔ ادھر باقر کو ضد تھی کہ جب بیٹھے گا اسی کرسی پر یوں تو باقر کو گولیوں اور پتنگوں سے فرصت ہی کب ملتی تھی کہ سبق یاد کرتا۔ مگر سارہ کو یوں ناک سڑک سڑک کر، پسینے میں شرابور بال کھلے، سلیٹ پر تھوک ہتھیلیوں سے ملتے دیکھتا تھا تو بس حرص سوار ہو جاتی۔ یہ ضد کہ بیٹھوں گا تو اپنی کرسی پر۔ پہلے تو وہ باقاعدہ وکیلوں کی طرح بحث جاتی، کوسے دیتی اور پھر مارتی۔ مگر باقر کا بدن پتھر سا تھا الٹے اسی کے ہاتھ دکھنے لگتے۔

سنسناتی دوپہر میں سب تھک ہار کر سو رہے تھے۔

صرف رقیہ باجی، دولہا بھائی اور وہ طوطے کی ناک والے بیٹھے کارڈز کھیل رہے تھے اور ٹیاؤں ٹیاؤں کی آواز سے کمرہ گونج رہا تھا۔ اگر دادی کو خشکی کا مرض نہ ہوتا تو وہ بھی سو جاتیں ـــــ ہائے کیا خود مختاری کا زمانہ ہوتا وہ۔!

مگر اب تو سوتے وقت اماں سب کی لگامیں دادی کو تھما دیتی تھیں دادی کو ان فجروں کو روکنے کے لیے ہزاروں گر یاد تھے۔ کبھی آباؤں کی پیدائش کا حال سنا رہی ہیں، کبھی پریوں کی کہانیاں، یا پٹاری کھول کر خربوزے کی مینگنیں کھلاتیں۔ مٹھی مٹھی مجھنیں سب کی انگلیوں کو چھوا دیتیں۔ ذرا بھی آنکھ بچتی تو سارہ ان کی بغچہ میں سے کپڑوں کی کترنیں گڑیوں کے لیے چرا لاتی تھی۔

مگر آج اس کا جی دادی سے بھی کھٹا ہو گیا تھا۔

بیچ کمرے میں کھڑی وہ بڑی دیر تک سر کھجاتی رہی۔ آہستہ سے رقیہ باجی کی صندوقچہ کھول کر دو چار الائچیاں منہ میں ڈال لیں ڈبیہ میں سے سلے کے تار نکال کر انھیں خوب کھینچ کھینچ کر لمبا کیا۔ پھر چاروں طرف کوئی شجر ممنوعہ تلاش کرنے لگی۔ جانے کیوں لوگوں کو یہ غلط فہمی تھی کہ وہ جو چیز بھی چھولے یا توڑ جائے گی یا گندی ہو جائے گی۔

اچانک وہ اچھل پڑی۔ الماری کے اوپر ٹیا دن ٹیادں کا کیمرہ رکھا ہوا تھا۔ کیمرہ چھونے کے لیے اس کے ہاتھوں میں چُل ہونے لگی۔ آج صبح رقیہ باجی اس طوطے کی ناک کے ساتھ بغیر میں گئی تھیں اس نے زبردستی رقیہ باجی کو پکڑ پکڑ کے ان کے بے شمار فوٹو لیے تھے۔ باقر یا ٹبو جا کے کھڑے ہو جاتے تو انھیں مار کر بھگا دیا جاتا۔

اسے ٹبو کی طرح تصویریں اتروانے کا اتنا شوق نہ تھا جتنا کیمروں کو چھو کر دیکھنے کا تھا۔

اس کے اندر رقیہ باجی بند ہیں۔ اماں کے پلنگ پر کھڑے ہو کر اس نے کیمرہ اتارا اور اس کے سوراخ میں آنکھ گڑو دی۔ اندر پٹا پٹ اندھیرا بھرا پڑا تھا۔ رقیہ باجی کہیں دکھائی نہ دیں۔ تھرتھراتے ہاتھوں سے اس نے جلدی جلدی سارے پیچ گھما ڈالے۔ پر جانے کیسے اس کا ہاتھ ایک بٹن پر گیا اور ڈبہ پٹ سے کھل گیا۔ مگر اندر سے کچھ نہ نکلا۔ ایک کاغذ کی پٹی لپٹی ہوئی تھی۔ سخت مایوسی ہوئی خیر اس نے جلدی جلدی توڑ مروڑ کے پٹی اس میں ٹھونسنا چاہی کہ اماں نے کروٹ بدلی اور وہ دھکا کھا کر نیچے گر پڑی۔

شور سن کر سب سے پہلے رقیہ باجی آئیں اور پھر قیامت آ گئی۔

جانے کیا کیا ہوا۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ سوجھا ہوا گال لیے کھڑکی میں بیٹھی روئے جا رہی تھی لاتوں اور گھونسوں کے اس اندھیاؤ میں اسے صاف ایک بات یاد رہی کہ چلاتے وقت طوطے کی ناک سے یوں آواز آ رہی تھی جیسے کتے کا پلا رو رہا ہو۔

خوب خوب برسنے کے باوجود لوگوں کو اس پر اتنا غصہ آ رہا تھا کہ اب کسی کو نیند نہ آ رہی تھی۔

"بچاری کو دن بھر اماں جی مارتی رہیں۔" جانے کیوں دولہا بھائی کو اس پر رحم آ رہا تھا۔

"اس سے تو اچھا ہے کہ پھر بھنگن کو دیدو۔" اب معلوم ہوا کہ کیسی گھن بھری ہمدردی تھی۔

"اے واہ کیوں دے دوں۔ آٹھ برس تک پالا ہے تو اب پل ہی جائے گی۔"

یہ ماں کا انتہائی لاڈ تھا۔

مگر وہ تو اب اس طرح ہرگز نہ پلے گی۔ آج اس نے طے کر لیا۔

اماں تو اس کی پکی دشمن تھیں — ایک اماں ہی کیا۔ سب ہی اس کی بات کو یوں ٹال جاتے جیسے بہرے ہوں۔ ہر روز وہی کتے کے کفن جیسی منحوس ڈوپٹیا اوڑھ کے ماسٹر سے پڑھنے چلے جا رہے ہیں کبھی عید بقرعید کورنگ گھ

کپڑوں کے ڈھیر آتے تو وہ بھی رقیہ باجی کی حرص میں اماں کے پاس جا بیٹھتی۔
"میں تو اس سرخ کپڑے کا کرتا سلواؤں گی" وہ کپڑا سینے پر پھیلا کے دیکھنے لگتی۔
"اونہہ میلا کیے دے رہی ہے رقیہ باجی اس کے پسینے اور میل میں لتھڑے ہوئے ہاتھوں سے کپڑا چھین لیتیں۔
"میں تو اس کپڑے کا سلواؤں گی" وہ نرمے ہوئے ہاتھوں سے کپڑے کو اب بھی سہلائے جاتی۔
"لو اس میں سرخ دھوکرتے سی دو" اماں کوئی ذلیل سی چینٹ نکال کر رقیہ باجی کو تھما دیتیں۔
وہ لاکھ سر پٹکتی، اس کپڑے کو ہرگز ہرگز چھونے کی قسمیں کھاتی مگر آخر کو وہی گھگھیا پیٹا پڑتی جو رقیہ باجی سے کبھی ٹھیک نہ سلی۔ کبھی آستین تنگ، کبھی گریبان سر میں اٹک جاتا اور پہناتے وقت وہ خوب جھنجھوڑیاں دیتیں۔
دالان میں دادی آموں کا مربہ بنا رہی تھیں۔ ٹبوا در با قر آس پاس مکھیوں کی طرح منڈلا رہے تھے۔ چاشنی تو وہ بھی دو ایک بار شیرے میں انگلیاں ڈبو کر چاٹ ہی لیتی۔ مگر اس وقت تو وہ دنیا کی ساری رنگینیوں سے بیزار ہو چکی تھی۔ بغاوت کی آگ میں اس کا رواں رواں سلگ رہا تھا۔
ٹیکا ٹیک دوپہر یا میں لگی دم سادھے پڑی تھی۔ گرم گرم لُو کے چھپا کے اس کا منہ جھلسے دے رہے تھے اور آنکھوں میں مٹی کے ذرے کانٹوں کی طرح چبھنے لگے۔ کہیں دور سے ملائی کے برف والے کی ٹھنڈی ٹھنڈی آواز آ رہی تھی مگر پر دھتا موچی سر جھکائے کھٹ پٹ کر رہا تھا۔ اس کے کالے بدن پر پسینے کی چکا چوند سے نگاہ نہ ٹھہرتی تھی۔ کبھی کبھی سر پر رومال ڈالے لوگ ظہر کی نماز کو مسجد جا رہے تھے۔
دو چیلیں لڑتی جھگڑتی ایک دوسرے کو دھکے دیتی ہوئی آئیں اور موری میں ایک جھپٹا مار کے پھر اڑ گئیں۔ دوسری چیل چلاتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے بھاگی۔
اچانک اس کی نگاہ ایک کاغذ کی پڑیا پر گئی جو سڑک کے بیچ میں پڑی ہوئی تھی۔
یہ باقر کی کمارستانی تھی۔ گرم دوپہریوں میں جب کوئی کام نہ رہتا تو وہ خالی کاغذ کی پڑیاں باندھ کے سڑک پر ڈال دیتے تھے۔ پھر کھڑکی میں بیٹھے انھیں اٹھا کے کھولنے والوں کا تماشہ دیکھا کرتے ــــ یہ بڑا مزے دار کھیل تھا۔
اس وقت بھی وہ سب بھول بھال کے تماشہ دیکھنے لگی۔
کئی لوگ اسے روندتے ہوئے گذر گئے۔ البتہ چوک کی طرف سے جب پرانے کنستر خریدنے والے نے اسے دیکھا تو اپنی رفتار تیز کر دی۔ سر نے ایک زوردار قہقہہ کی تیاری کر لی تھی مگر جب ایک بہشتی نے لپک کر پڑیا اٹھائی تو اس کا دل دھک سے ہو گیا۔ جیسے آبا میاں دالان میں ٹہل رہے ہوں ــ لڑکا ــ لڑکا ــ لڑکا ــــ
اور پھر بہشتی نے پڑیا پھینک دی جیسے اندر سے سارہ نکلی ہو۔
اس نئی ذلت پر انتقام کا جذبہ بری طرح پھڑکنے لگا۔
کٹڑکی کے پٹ کو زور زور سے بجاتے میں اس نے انتقام کے بہت پلان بنائے۔ اس کے گالوں پر تو صرف

ٹیاؤں ٹیاؤں کی انگلیاں ابھری ہوئی تھیں مگر دل میں بہت ہی اگلی پچھلی نفرتیں ابھرنے لگیں۔ اسے سب سے زیادہ غصہ تو دادی پر آرہا تھا اور ان سے زیادہ ابا میاں پر ــــ اور اماں کو تو ــــ

اندھی کنوئیا میں گر جاؤں ــــ ؟ ایک بڑا رومینٹک سا خیال روشن ہوا۔

بڑا مزہ آئے گا۔ رقیہ باجی کے کھیل میں بیٹھے بٹھائے کھنڈت پڑے گی۔ لوگ زبردستی اسے زعفران کا شربت پلائیں گے۔ انار کھلائے جائیں گے۔ جیسے اماں بے ہوش ہوئی تھیں تو کھلائے گئے تھے۔ سب کی روتے روتے آنکھیں سرخ ہو جائیں گی۔ ممکن ہے اماں سرخ کپڑے کا کرتا بنانے پر راضی ہو جائیں ــــ ؟

مگر جوں ہوں اس نے اپنی موت کی فلم کو مجھی سخت مایوس ہو گئی۔

یہاں تو اٹھتے بیٹھتے لوگ اس کی موت کو یاد کرتے ہیں۔ اور دادی کے لیے تو مرنا کوئی بات ہی نہ تھی۔ جب سے نادرہ بھاگی تھی وہ دن رات یہی کہتیں کہ اس سے تو مرجاتی تو وکیل ساب کو صبر آجاتا۔

بھاگ جاؤں! اس نے مسرت سے بے حال ہو کر سوچا۔

پھر تو ابا میاں کی آواز وکیل چچا کی طرح بیمار بلی کی سی ہو جائے گی۔ مونچھیں لٹک کر ہونٹوں پر گر جائیں گی۔ اماں کو بھی نادرہ کی طرح غشی کے دورے پڑیں گے اور دادی ہاتھ مل کے کہیں گی اس سے تو مرجاتی تو اچھا تھا۔ خاندان کی ناک کٹ گئی۔ نادرہ کے گھر والوں کی ہونق صورتیں اسے یاد آئیں تو خوشی کے مارے ہاتھ پاؤں پھٹکنے لگی ہائے وہ گھر والوں کو کتنی بڑی سزا دے سکتی ہے۔

بڑی پھرتی کے ساتھ اس نے اپنے دکھتے ہوئے وجود کو سمیٹا اور دالان سے گذرتے وقت پلٹ کر گھر پر اس نے ایک چھلتی ہوئی نگاہ ڈالی۔

"ابھی لوگ ظہر کی نماز پڑھ کے بھی نہ لوٹے تھے جو ہمارے گھر میں پٹس پڑ گئی۔ میں بیٹھی آموں کا مربہ بنا رہی تھی۔ باقر ایک کیری کی پھانک چرا کے دالان میں بھاگا جا رہا تھا۔ ادھر امتیاز میاں کے بھائی کارڈز کھیلتے میں بطخوں کی طرح قیں قیں ہنس رہے تھے کہ ــــ

دادی سب کو یہ قصہ سنایا کریں گی۔

چوک میں سے سرپٹ دوڑتے میں وہ چاہتی تھی سب اسے دیکھ لیں کہ وہ گھر سے بھاگی ہے۔

آمنہ ابوالحسن

عیدی

جب سے کمال آیا تھا گھر کی حالت ہی کچھ عجیب ہو گئی تھی ایک عجیب سی چہل پہل اور رونق گھر کے کونے کونے سے سمٹ کر ہر طرف بکھر گئی تھی اور بچے بڑوں کا تو سوال ہی کیا معلوم ہوتا تھا گھر کی دیواریں تک زبان حال سے پکار پکار کر کہنے لگی ہیں "زندگی زندہ دلی کا نام ہے۔" زندہ دلی کی یہ پرچھائیاں وسیع و عریض ہالوں اور صاف ستھرے سجے سجائے کمروں سے اتر کر باورچی خانے کی اس چوکی تک بھی جا پہنچی تھیں جہاں ہر وقت اپنی میلی اوڑھنی کو بڑی احتیاط سے سر پر جمائے آنکھیں نیچی جھکائے دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے کام میں مگن ہوا کرتی اور رابعہ بیگم جو کبھی رابعہ دلہن بھی تھیں۔ ۔ ۔ ۔ کام کے دوران میں کبھی ایک تھکی تھکائی نظر اپنی لخت جگر مہرو پر ڈال کر ان آنسوؤں کو ساڑھی کے آنچل سے آنکھوں ہی میں رگڑ دیا کرتیں جو مہرو کی حالت پر ہر وقت باہر آنے کے لیے بے قرار ہوا کرتے۔

نانی اماں نے اپنا مستقل مشغلہ سرے سے ترک کر دیا تھا اور قرآن شریف کو اچھی طرح جزدان میں لپیٹ کر سرہانے والی الماری کے تابدان میں احتیاط سے رکھوا دیا تھا۔ خالہ کا تو کچھ پوچھنا ہی نہ تھا وہ نظر بھر کر اپنی پروین کو دیکھتی بھی نہ تھیں کہ کہیں اسے نظر نہ لگ جائے اور اماں ـــــ اماں کے ہاتھ گو اب بھی تیزی سے سروتے کے ساتھ مصروف کار ہوتے مگر جہاں بھی انھیں یہ شبہ گذرا کہ کمال ان کی طرف آنے لگا ہے وہ جھٹ کشتی یا تابدان میں جما سروتے کو صافی میں رکھ پاندان دور سرکا دیتیں اور اپنا کھڑا ہوا گھٹنا اس طرح ٹھاہ دیتیں جیسے کہہ رہی ہوں آؤ بیٹا کمال یہاں سر رکھ کر لیٹ جاؤ تاکہ میں تمھیں خاندان کی اونچ نیچ سمجھا سکوں ـــــ

کمال کی اس عادت سے سب ہی واقف تھے وہ جتنا سیماب صفت اور شریر تھا اتنا ہی "امیدی" بھی ـــــ جہاں بھی اس نے کسی کو بیٹھے دیکھا جھٹ اپنا سر اس کی "مانڈی" پر رکھ دیتا اور پھر بڑے دلر ابا انداز میں پوچھتا ـــ ہاں تو نانی اماں پھر کیا ہوا ـــ؟ نانی اماں کے قصے ختم ہونے ہی نہ پاتے یہاں تک کہ سارا گھر تھک جاتا مگر کمال اماں کی مانڈی پر سر جمائے بڑی دلچسپی سے سب کچھ سنا کرتا اور جہاں کسی نے نانی اماں کو ٹوکا وہ فوراً بول اٹھتا ـــــ ہاں تو نانی اماں پھر کیا ہوا ـــــ آگے کہو ـــ

بھابی کمال کی اس عادت سے بہت بیزار تھی جہاں اس نے کمال کو دیکھا جھٹ اطراف کی چیزیں سمیٹ کر اٹھ کھڑی

ہوتی جیسے بڑی مصروف ہو۔ مگر کمال بھی ایک ہی گھاگ وہ باتوں میں مگن اس طرح لیٹا رہتا جیسے اطراف کی کچھ خبر ہی نہ ہو اور جب بھابی اس کی مصروفیت سے مطمئن ہو کر چپ کے سے پیچھے آ بیٹھتی تو وہ ایک ہی جست میں اس کے پاس پہنچ جاتا اور بغیر کسی انتظار کے اس کے زانو پر سر رکھے ٹوٹی باتوں کا سلسلہ جوڑنا شروع کر دیتا۔ کمال کی فرمائش پر نانی اماں کی ناتوان بوڑھی آواز فضا میں کپکپاتی اور اماں اور خالہ کے دلچسپ چہمٹوں کے ساتھ ساتھ سارے خاندان کا شجرہ اس کے سامنے کھل جاتا۔ اسے آئے ہوئے ابھی پندرہ دن بھی نہیں گذرے تھے پھر بھی یہ پتہ تو چل ہی گیا تھا کہ پورے خاندان میں کس کس کے گھر کتنی لڑکیاں ہیں اور کونسا گھرانہ اپنی امارت اور سلیقہ مندی میں مشہور ہے اور کونسا بے پناہ دولت کے باوجود بدسلیقگی میں اور کونسا اپنے افلاس میں۔

"مگر نانی اماں یہ تو بتائیے بھابی میں آپ کو ایسی کونسی خوبی نظر آئی جو آپ انھیں یوں اٹھا لائیں" وہ کن انکھیوں سے بھابی کی طرف دیکھ کر مسکراتا اور ساتھ ہی ساتھ تعریفوں کو بھی سنتا جاتا جو اس سوال کے جواب میں دہرائی جاتیں۔ سب ہی جانتے تھے، بوٹے قد والی نرم و نازک بھابی نانی اماں کی بڑی چہیتی نواسی بہو تھی اور کسی کی مجال نہ تھی کہ اس کی طرف آنکھ بھر کر بھی دیکھ سکتا مگر اس سوال کے ساتھ ہی بھابی اپنی جگہ اور سمٹ جاتی اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی کانٹوں دار جھاڑی ان سے لپٹ پڑی ہے اور اب چھڑائے نہیں چھوٹتی یوں تو وہ بڑی ہنس مکھ تھی اور اپنے سب ہی دیوروں سے بہت بے تکلف مگر جانے کیوں کمال سے وہ بہت گھبراتی اس کے چمکیلے بالوں اور صاف شفاف آنکھوں میں نہ جانے وہ کونسی چیز مچلا کرتی جو بھابی کو بوکھلا دیا کرتی اور اپنی ساری خود اعتمادی کے باوجود بھی اسے یہ وہم ہونے لگتا کہ یہ چھلے دار بال اس کے اطراف لپٹے جا رہے ہیں اور یہ روشن خوبصورت آنکھیں چمکدار قندیلوں کی طرح اس کے سارے وجود پر چھائی چلی جا رہی ہیں ـــ بھابی جتنا اس سے کتراتی وہ اتنا ہی اس کے پیچھے پھرا کرتا اور کسی ایسے موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیتا جب بھابی اسے بیٹھے ہوئے مل جاتی۔

رمضان کے دن تھے سحری ختم ہو چکی تھی سب لوگ روزے کی نیت باندھ چکے تھے اور اب صحن میں پڑے ہوئے تختوں پر اطمینان سے بیٹھے اِدھر اُدھر کی گپ شپ میں مصروف تھے تاکہ فجر کا وقت ٹل نہ جائے اور نماز سے فارغ ہو کر سب آرام کی نیند سو سکیں ـــ رمضان کے دنوں میں گھر میں گانا بجانا بالکل بند ہوتا، اور نانی اماں جو اب سارے کاموں سے ریٹائرڈ ہو چکی تھیں اس بات پر کڑی نظر رکھا کرتیں کہ کہیں کوئی نماز سے تو غافل نہیں ہو گیا ہے اور کسی نے دھیمے سے ریڈیو تو نہیں کھول دیا اس معاملے میں وہ اپنی چہیتی بہو اور لاڈلی نورس تک کو نہ چھوڑتیں ـــ "اے دلہن میں نے کہا اب بس کام چھوڑ دکھیں نماز قضا نہ ہو جائے اور بٹی پر دین تم بھی اٹھو کیوں آنکھوں کی دشمن ہو رہی ہو بھلا یہ بھی کوئی سینے سمانے کا وقت ہے؟ اندھیرا اجلال رہا ہے کیا سینے کے لیے دن نہ نکلے گا بیٹی ـــ" وہ نند بھاوج کو ٹوکتیں اور پھر ایک سرسری نظر اماں اور خالہ پر ڈالتیں جو تخت کے ایک گوشے پر جائے نماز بچھائے سر پر رنگین اوڑھنی کا گلدانا

مارے ہاتھ میں تسبیح لیے قبلہ رو بیٹھی ہوتیں اور نانی اماں کا سر فخر و محبت سے اونچا ہو جاتا اور ان کی لڑکھی آواز فرطِ محبت سے کپکپا جاتی ــ "خدا سب کو ایسی نیک توفیق دے" ــ وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر با آواز بلند کہتیں اور تھوڑی دیر کے لیے ہر طرف سناٹا چھا جاتا۔ بھابی کی دلچسپ باتیں اور پروین کے دبے دبے قہقہے رک جاتے، باورچی خانے کی گھما گھمی بند ہو جاتی اور ایک عجیب سا تقدس سارے گھر پر چھا جاتا سب لوگ نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے تو ایسے وقت بقول نانی اماں کے ساری بدروحیں گھبرا کر آسمان کی طرف پرواز کر جاتیں اور پاک فرشتے اپنا سایہ سارے گھر پر پھیلا دیتے۔

وقت یوں بھی نہیں ٹھہرا کرتا اور رمضان کا مہینہ تو خصوصیت سے مصروفیت کا ہوتا ہے روزہ، نماز، افطاری اور پھر سحری ــــ روزے کی تھکن، نماز کی پابندی قرآن شریف کی تلاوت اور شام کی تیاریاں ــ درمیان میں تھوڑا بہت وقت جو مل جاتا وہ بھی سونے یا باتیں کرنے میں کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جاتا اور پھر جب سے کمال آیا تھا مہمانوں کی بھی خاصی آمد و رفت تھی۔ بھابی کو تو فرصت برائے نام ہی ملتی مگر پروین بھی زیادہ تر اپنے کمرے ہی میں رہتی اسے باتوں ہی باتوں میں نانی اماں نے یہ اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ کمال اس کا ہونے والا دولہا ہے اور وہ شرم و لحاظ جو کنواری لڑکیوں کا خاصہ ہوتا ہے اس کا خیال اسے ہمیشہ رکھنا چاہیے۔

پروین نے گو اچھی تعلیم و تربیت پائی تھی مگر گھر کے سخت ماحول نے اس کی طبیعت میں کچھ ایسی شرم و حیا بھر دی تھی جواب اس کی طبیعت کا ایک لازمی جزو بن گئی اسی لیے نانی اماں کی حکم عدولی یا نافرمانی اس کے بس کی بات بالکل نہ تھی یہی وجہ تھی کہ صرف تنہائی میں ہی وہ بھابی کی چھیڑ چھاڑ کا شانہ بنتی اور جب بھابی مصروف ہوتی تو وہ سارا وقت اپنے کمرے میں پڑھنے یا سینے میں گذار دیا کرتی۔ نٹنگ اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا اس لیے بڑی بڑی سلائیوں پر ہمیشہ اس کی انگلیاں اتنی تیزی اور مہارت سے چلتیں جیسے کوئی مشین اپنے تمام کل پرزوں کے ساتھ۔ سردیوں کے لیے کسی کو کوئی اونی کپڑا باہر سے خریدنے کی ضرورت نہ ہوتی سب ہی کچھ گھر میں تیار ہو جاتا ــ

عید کو صرف دو روز باقی تھے نئے نئے کپڑے سیے اور بنے جا رہے تھے نانی اماں عینک لگائے احکام صادر کر رہی تھیں اماں اور خالہ ماں کو سامنے بٹھائے باورچی خانے کے بکھیڑے سلجھا رہی تھیں اور بھابی اور پروین مشین سامنے رکھے کپڑوں کے رنگین ڈھیر میں الجھے بالکل کسی درزی کی دکان کا سماں پیش کر رہی تھیں۔ کمال باہر سے ٹہلتا ہوا آیا اور آتے ہی نانی اماں کی گود میں دراز ہو گیا ــ "بہت تھک گیا ہوں نانی اماں ٹھنڈا پانی پلوائیے" ــ وہ بڑے فرمائشی انداز میں بولا اور نانی اماں ایک دم چونک کر اپنی تھرتھراتی انگلیوں کو اس کے بالوں میں الجھا کر بڑے نرم مگر فہمائشی انداز میں بولیں ــ "لے ہے بیٹا اس طرح کا مذاق نہ کیا کرو ــ روزہ مکروہ ہو جائے گا"

"روزہ ــ تو کیا میں روزہ ہوں ــ" کمال نے سنجیدگی بھری معصومیت سے پوچھا۔

"اے اب تم یہ بھی بھول گئے۔ سحری میں میرے ہی ہاتھ سے تو کھلایا تھا ــ کیوں دلہن" ــ؟ وہ مشین پر

بیٹھی ہوئی دلہن سے مخاطب ہوئیں اور پروین یکایک چونک کر بولیں ــــ جی ــــ جی ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کمال نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور پھر خلاف توقع نانی اماں کی گود سے ایک دم اٹھ بیٹھا ــــ نظر جما کر اس نے مشین کی طرف دیکھا، رنگوں کا ایک طوفان سا بکھرا ہوا تھا اور بھابی بیر بہوٹی بنی اس طوفان میں مل ہوتی جا رہی تھی اور پھر اس کی نگاہ ٹھٹکی پروین چپ چاپ لمبی لمبی پلکوں میں آنکھیں چھپائے قینچی ہاتھ میں لیے پھیلتے کپڑے کو اپنی انگلیوں کی گرفت میں سنبھال رہی تھی۔ کمال کو اس وقت وہ ہمیشہ سے زیادہ حسین نظر آئی ــــ حسین اور معصوم ــــ مگر جلدی اس کی نگاہ اچٹ گئی اور دور صحن کے اس پار اس چھوٹے سے کمرے پر جا جمی جہاں دہلیز پر بیٹھی مہرو پھٹے پرانے کپڑوں میں پیوند لگا رہی تھی ــــ کمال نے یکایک نانی اماں سے پوچھا ــــ "ہاں تو نانی اماں آپ نے خاندان کے سب ہی لوگوں کے بارے میں مجھے بتا دیا مگر یہ نہ بتایا کہ رابو ممانی اس حالت کو آخر کیوں کر پہنچیں ــــ ؟

سوال چونکا دینے والا تھا۔ نانی اماں نے تھوڑا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا مگر ان کی مدد کرنے والا اس وقت وہاں کوئی نہ تھا، خالہ اور اماں چولھے کے پاس مصروف تھیں اور بھابی مشین پر ــــ سنبھل سنبھل کر بولیں ــــ "بیٹا حالت کو سنی بری ہے وہی تو کھاتی ہیں جو ہم سب کھاتے ہیں اور اسی گھر میں رہتی ہیں جہاں ہم تم سب رہتے ہیں بس فرق صرف اتنا ہے کہ تھوڑا محنت کام زیادہ کر لیتی ہیں سو یہ کوئی بری بات تھوڑی ہی ہے۔ تم ہی بتاؤ گھر کا کام کون نہیں کرتا میں تو خیر چلنے پھرنے سے معذور رہوں مگر تمہاری اماں، خالہ، بھابی اور پروین تک تو سب ہی کرتے ہیں ــــ"

نانی اماں نے فرق کی جو حد فاصل تمام گھر والوں اور رابو ممانی کے درمیان کھینچی تھی وہ کمال کی نظر میں کچھ جچی نہیں اس لیے بولا ــــ مگر ممانی ہمارے ساتھ رہتی کیوں نہیں سب سے الگ تھلگ صحن کے اس پار ایک اکیلی چھوٹی سی کوٹھری میں کیوں پڑی ہیں اور پھر مہرو ــــ آخر وہ بھی تو پروین کی ہم عمر ہے پھر وہ کیوں دن رات چولھے میں گھی آگ اور دھوئیں کا شکار ہوا کرتی ہے کیوں نہیں بھابی سے گھل مل کر باتیں کرتی کھیلتی ہیں اماں کی گود میں سر رکھ کر لیٹتی کیوں نہیں آپ کے ہاتھ سے کھانا کھاتی ــــ آخر کیوں ــــ ؟ میں نے تو اسے آج تک اس طرف آتے نہیں دیکھا کیا وہ ان ساری آسائشوں کی مستحق نہیں ــــ ؟" کمال جانتا تھا کہ یہ موضوع نانی اماں کے لیے ناگوار ترین ہے اور وہ اس پر کبھی کسی سے بات کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتیں۔ اسے یاد تھا کہ ایک بار جب وہ بچپن سے جا کر چوکی پر مہرو کے قریب بیٹھ گیا تھا تو نانی اماں کا مزاج کتنا بگڑ گیا تھا پھر بھی ــــ اس نے کن انکھیوں سے دیکھ کر نانی اماں کی بے انتہا محبت کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اس بات کو چھیڑ ہی دیا ــــ

"اے لو ــــ انھیں کسی نے منع تھوڑا ہی کیا ہے کہ وہ اس طرف نہ آئیں تم دیکھو تو خیر سے دلہن نے مہرو کے لیے عید کے کپڑے بھی سی دیئے ہیں ــــ" نانی اماں کی انگلی کی سیدھ میں کمال نے دیکھا شاموا اور اطلس کے درمیان چھینٹ کا ایک جوڑا بھی بڑی بے ترتیبی سے پڑا ہوا تھا ــــ "اور بیٹا جن عورتوں کے شوہر مر جاتے ہیں ان کے لیے دنیا میں

رہ ہی کیا جاتا ہے کام کاج ہی میں تو وہ اپنی باقی زندگی گذار دیتی ہیں ـــــ" نانی اماں کی آواز اپنے اکلوتے جواں سال بیٹے کی موت یاد کر کے بالکل تھرا گئی اور چند ملگجے آنسوان کی آنکھوں سے ڈھلک کر ان جھریوں دار رخساروں پر بہتے چلے گئے رابعہ کی شادی کو ابھی ایک سال ہی ہوا تھا اور ننھی مہر و عالم وجود میں آنے ہی والی تھی کہ ان کے جواں سال بیٹے کا دل کی حرکت بند ہو جانے کی وجہ سے اچانک انتقال ہو گیا۔ اسی دن سے وہ اس بچی کو منحوس اور بہو کو بدفال سمجھتی تھیں اور یہی وجہ تھی کہ گھر کی بڑی بہو ہوتے ہوئے بھی شوہر سے محروم ہو جانے کے بعد رابعہ دلہن ساس اور نندوں کے ہاتھوں کٹ پتلی بنی ماماؤں کی سی زندگی گذار رہی تھیں اسی گھر میں جہاں کبھی وہ بڑے ٹھاٹ سے راج پاٹ کیا کرتی تھیں اور ان کی اکلوتی بچی مہرو ـــــ سب کی نگاہوں کا نشا باپ کے چھوڑے ہوئے ورثے اور رتبے سے محروم سب کے آرام و اطمینان کی خاطر محنت کی سخت چکی کے درمیان اپنی نوخیز جوانی کو سمیٹے شب و روز پستی چلی جا رہی تھی۔

"تو آپ سمجھتی ہیں ماموں ابا کی موت کی قصوروار رابعہ ممانی ہیں ـــ" کمال نے پوچھا۔

"اور نہیں تو کیا۔ قدم کی برکت بڑی چیز ہوتی ہے بیٹا جب سے رابعہ بیاہ کے آئی میرا بیٹا ایک دن بھی اچھا نہ رہا اور خدا کی مار اس بچی پر اس کی پیدائش کیا ہوئی میرے بیٹے کی موت کا پیغام ہو گئی" نانی اماں اپنی جلی کو کھ پر بلک بلک کر رونے لگیں اور روتے ہی روتے کچھ دیر کے لیے رک کر بولیں۔

"ایک تمھاری خالہ بھی ہے جب بیاہ کر گئی تو بیٹا اللہ رکھے تمھارے خالو کی نوکری میں ترقی ہوئی اور جب پروین پیدا ہوئی تو ـــ تو گھر میں دھن کی بارش ہو گئی غدار کھے وہ نائب تحصیلدار سے تحصیلدار بن گئے ـــ" نانی اماں کہتی رہیں اور کمال خلاؤں میں ٹکٹکی جمائے زندگی کے اس اتار چڑھاؤ پر سوچتا رہا وہ کمال جو ہنسنے اور شرارت کرنے کے لیے پیدا ہوا تھا آج پہلی بار زندگی کے سیاہ رخ سے نقاب اٹھا کر اس کے چھپے ہوئے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا ـــ اس دن جب سحری کے بعد سب سو گئے تو وہ چپکے سے نظر بچا کر رابعہ ممانی کی کوٹھری میں داخل ہو گیا ـــ مہر و زمین پر میلی سی سوزنی بچھائے غفلت کی نیند سوئی پڑی تھی اور رابعہ ممانی ایک ٹک نظر جما کر آسمان کے ستاروں کو دیکھے جا رہی تھیں کمال جب بالکل قریب پہنچا تو وہ چونک کر ایک دم اٹھ بیٹھی اور کمال کو اپنے اس قدر پاس دیکھ کر پہلے تو بوکھلا سی گئیں پھر دونوں ہاتھ اس طرح کھول دیے جیسے اسے اپنے سینے میں بھر لینا چاہتی ہوں۔

"ممانی ـــ" وہ اس پراسرار ماحول سے گھبرا کر آہستہ سے بولا اور ممانی کی آنکھوں سے پندرہ سال کی رکی تھمی گنگا جمنا بہہ نکلی بغیر کچھ کہے اس نے اپنا سر دھیرے سے ممانی کی گود میں رکھ دیا اور بڑے اطمینان سے لیٹے ہوئے بولا۔

ـــــ ابھی تک جاگ رہی ہو ممانی ـــ سوئیں نہیں ـــ؟" اور ممانی نے جواب دینے سے پہلے ایک بار نیچے بچھی ہوئی میلی چادر کو اور پھر کمال کے صاف ستھرے کپڑوں کو دیکھا اور ان کی خاموش آنکھوں سے یہ ڈرعلانیہ طور پر

جھانکنے لگا کہ اگر اس طرح لیٹنے سے تمھارے کپڑے میلے ہو گئے تو..... تو..... مگر کمال نے کوئی پروا کیے بغیر اپنے دونوں پیر پھیلا دیئے اور بولا "آپ..... آپ مہرو کو کسی اسکول میں کیوں نہیں داخل کروا دیتیں ——" ممانی زندگی میں پہلی بار یہ انوکھا سوال سن کر گھبرا سی گئیں پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولیں "کون اسے اسکول بھیجے گا اور جو وہ چلی بھی جائے تو —— تو گھر کا کام کون سنبھالے گا بیٹا —— پکانا، برتن مانجھنا سب ہی کچھ تو ہے میری تو آنکھیں اب اس قابل بھی نہیں رہیں ——" اور پھر ممانی کا گلا اپنی پچھلی پندرہ سالہ مصیبت کی ماری زندگی پھر آیا اور ان کی آواز ان کے حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ کمال نے ان میٹالی آنکھوں کو غور سے دیکھا جو روتے روتے شاید اب بالکل ماندسی ہو چلی تھیں اور اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا "میں عید کے بعد ملازمت پر چلا جاؤں گا آپ میرے ساتھ چلی چلیں ہم وہاں مہرو کو کسی اچھے اسکول میں داخل کروا دیں گے اور..... اور..... مگر اس سے پہلے کہ کمال کچھ اور بھی کہتا ممانی نے فرط مسرت اور شدت جوش سے لرزتی آواز میں کہا —— کمال —— اور ان کی آواز ان کے درد کے بھنس کر رہ گئی اور آنسوؤں کا بہتا ہوا تیز رفتار دھارا رخساروں پر یوں جم کر رہ گیا جیسے کسی نے تیز رو دریا کے سامنے بند باندھ دیا ہو۔ دو منٹ کے لیے کمرے میں گہرا سناٹا چھا گیا جسے صرف مہرو کی سانسوں کے زیر و بم کی خفیف سی آواز توڑ رہی تھی اور بس ——

"مگر بیٹا تم ایسا نہ کر سکو گے ——" ممانی نے ذرا سنبھل کر کسی انجانے خوف سے لرز کر کہا۔ کمال ان کی گود سے اٹھ بیٹھا اور بڑے استوار لہجے میں بولا —— "آپ اس کی فکر نہ کریں"

رات نے اپنے پھیلے گیسو سمیٹ کر اکٹھا کر لیے تھے اور اب صبح بڑے دلکش انداز میں قدم قدم اترتی آسمان کی بلندیوں سے زمین کی طرف چلی آ رہی تھی کمال اٹھ کھڑا ہوا ممانی نے جھک کر اس کے ماتھے کو چوما اور کمال نے ایک اٹھتی ہوئی نگاہ سوتی ہوئی مہرو پر ڈالی میلے سے نیلے دوشالے میں اسے ایسا لگا جیسے چاند صبح کی آمد پر آسمان کے دبیز نیلے پردوں کے پیچھے اوجھل ہو رہا ہو اور دھیرے چپکے سے باہر نکل آیا۔

اگلا دن اس طرح گذر گیا کہ نہ ہی کمال کو اس کی جرہوئی اور نہ ہی ممانی کو —— ممانی کے لیے پندرہ سال بعد ایسی صبح طلوع ہو رہی تھی جو واقعی عید سے کسی طرح کم نہ تھی اور کمال کے لیے تو صبح ایک ایسی انوکھی اور میٹھی کھٹک لیے طلوع ہوئی تھی جس سے وہ آج تک ناواقف تھا جو اس کے دل میں نہ پروین کو دیکھ کر پیدا ہوئی تھی اور نہ ہی سہیلی کو چھیڑ کر۔

عید کا دن اچھا خاصا قیامت کا دن تھا گھر میں سمان بڑے آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ نانی اماں کے احکام، اماں اور خالہ کی جھڑکیاں، بھابی اور پروین کی تیاری اس پر ابا، خالو ابا اور بڑے بھیا کی دھوم دھام، ناشتہ کرنا، عیدگاہ جانا اور پھر سب سے عید ملنا ——

ابا، خالو ابا اور بڑے بھیا سے عید مل کر وہ سب سے پہلے نانی اماں کے پاس آیا۔

"نانی اماں ـــ تسلیمات ـــ" وہ قدمبوس ہونے کے لیے جھکا اور نانی اماں نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے چٹ چٹ بلائیں لے کر کہا ـــ "نظر بد دور آج تو بالکل شہزادہ لگ رہا ہے ـــ" قریب ہی سے خالہ نے کہا ـــ کپڑوں نہ ہو لباس سے آدمی کی ہیئت ہی بدل جاتی ہے بھلا دیکھو تو آج کی اور روز کی شکل میں کتنا فرق ہے ہوا وہ بھی کوئی لباس ہوا بالکل فرنگیوں جیسا ـــ ڈھیلا ڈھالا بے ڈھنگا قمیص اور پتلون ـــ میں تو باز آئی ـــ" اور پھر انھوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ممتا بھر کے اسے اس طرح تولا جیسے کہتی ہوں ـــ ماشاء اللہ کیا کہنے ہیں نظر نہیں لگتی اور اس کو کچھ بھی نہیں ہوا جب ایک دن ایسے ہی مشجر کی شیروانی اور تاش کی سنہری دستار لگائے میری پروین کو بیاہنے آئے گا تو لوگوں کی آنکھیں واقعی چکا چوند ہو جائیں گی ـــ مانو چاند آسمان سے زمین پر اتر آیا ہو"

نانی سے مل کر وہ خالہ کی محبت بھری نگاہوں کے سائے میں اماں کی طرف بڑھا اور پھر ایک لمحے کے لیے اسے ایک بالکل نیا سا احساس ہوا جیسے سکون اور اطمینان کا لازوال خزانہ اس کے سر پر اپنا ٹھنڈا سایہ کیے ہوئے ہے۔ یہ ماں کا سینہ تھا کتنا پرسکون اور امیدوں سے بھرپور، یہاں سے بڑھ کر وہ بھابی کے پاس چلا ـــ خطرہ محسوس کر کے بھابی پہلے ہی سنبھل گئی۔

آج تو بھیا کی موت ہے" وہ جھک کر بھابی کے کان میں بولا بھابی نے ہنس کر تھپڑ اٹھایا آج یہی دیور جس کے آگے ہمیشہ ان کی خود اعتمادی نے چوٹ کھائی اور جس سے بچنے اور دور رہنے ہی میں انھیں ہمیشہ اپنا بھلا نظر آیا بالکل بچے کی طرح لگا نہ جانے کیوں ماں نہ ہوتے ہوئے بھی ممتا کی محبت اور جوش بھابی کے سینے میں ابل پڑا اور انھوں نے جھٹ اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا ـــ "چلے کدھر ـــ پہلے اپنی موت کا سامان تو دیکھتے جاؤ ـــ"

کمال نے مڑ کر دیکھا بازو والے دروازے سے پروین اس طرح نمودار ہو رہی تھی جیسے رات کے دھندلے آسمان پر چودھویں کا پورا چاند ـــ

"اوہ ـــ" وہ مسکرایا اور قریب جا کر بولا ـــ "آداب عرض کرتا ہوں ـــ سنا ہے آج آپ بھی عیدی دینے والی ہیں ـــ لائیے ـــ" اس نے اپنا ہاتھ پروین کے آگے پھیلا دیا۔ پروین اس ناگہانی اور غیر متوقع حرکت پر سٹپٹائی اور لاچار نظروں سے بھابی کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہی ہو ـــ "اس مصیبت کو لائی ہو تو خود ہی دور کرو"

بھابی نے پروین کی بے چارگی کو محسوس کیا اور جھٹ سے بولی ـــ "بے شرم کہیں کے۔ لاج نہیں آتی ـــ اگر نانی اماں نے دیکھ لیا تو ـــ؟"

"تو میں کیا کروں ـــ میں نے کونسا قصور کیا ہے۔ کہہ دوں گا بھابی مجھے مقتل میں لیے جا رہی ہیں ـــ"

"ہائے اللہ" ـــ بھابی اپنی جگہ ڈول کر رہ گئی اس نے تو سوچا بھی نہ تھا کہ یہ ہمیشہ شرارت کرنے والا لڑکا اتنا ذہین بھی ہو سکتا ہے ـــ بولی ـــ "بس اب آگے بڑھو۔ بہت ہو چکا ـــ"

"جو حکم ۔" وہ تعمیل حکم میں ذرا سا جھکا اور بولا ۔۔۔ "چلیے آپ کو بھی پہنچا دوں، بھیا کب سے کمرے میں اکیلے انتظار کر رہے ہیں ۔"

"ہٹ" بھابی پھر اسے مارنے دوڑیں اور وہ ہاتھ پکڑ کر بولا ۔" بھابی ۔ تم ہو کتنی ۔ اتنی ذرا سی تو ہو میں تو تمھیں ایک ہاتھ سے اٹھا لوں پر بھیا ۔۔۔" وہ پلٹ کر مسکرانے لگا۔

"بھیا ذرا کمزور ہیں ۔۔" اس نے جلدی سے کہا اور اس سے پہلے کہ بھابی اپنی پوری طاقت سے اس پر حملہ آور ہوتی ان کی زد سے بچتا بچاتا نکلا چلا گیا۔

بھابی نے اس کے جاتے ہی اطمینان کا لمبا سانس لیا اور ماتھے سے پسینہ پونچھنے لگیں ۔۔ "خدایا کتنا شریر ہے" وہ دھیرے سے بڑبڑائیں اور پیر دبین ۔۔۔ وہ اپنی جگہ بت کی طرح کھڑی یہ سب کچھ دیکھتی رہی اور جب کمال چلا گیا تو اس کی نظریں آہستہ آہستہ پلٹ آئیں۔

کاش کمال مڑ کر دیکھتا پھر اسے نظر آجاتا کہ ان نظروں میں اس کے لیے کیا کچھ نہیں ۔۔ آرزو، ارمان، التجا اور سکھ و اطمینان کا ایک لمبا سہانا سپنا مگر وہ تو چھلاوے کی طرح آیا اور گذرا چلا گیا جیسے کوئی پھول اپنی خوشبو فضا میں چھوڑ کر کسی ان دیکھے انجانے گلچین کی جھولی میں جا پڑا ہو۔

اس گھما گھمی سے ہٹ کر جب وہ صحن کے اس پار پہنچا تو دیکھا مہرو کمرے کے ایک کونے میں کھڑی اپنے ایک ہاتھ سے رات کی ہندی جھڑا رہی ہے اس نے اب تک نہ کپڑے ہی بدلے تھے اور نہ ہی بال بنائے تھے بھابی کا سیا ہوا چھینٹ کا جوڑا فرش پر ایک طرف دھرا ہوا تھا اور وہ روزمرہ کے میلے کپڑوں ہی میں اب تک ملبوس تھی۔ پہلے تو اس نے سوچا ممانی کی خبر سو جو دگی میں کمرے میں جانا ٹھیک نہیں پھر نہ جانے کیا سوچ کر وہ دبے قدموں آگے بڑھا اور چپکے سے اپنے دونوں ہاتھ اس کی آنکھوں پر رکھ دیئے ۔۔

"کون ۔۔" مہرو کا سارا جسم خوف اور ڈر سے لرز کر چلایا۔

"بوجھو ۔" کمال نے آہستہ سے کہا۔

مہرو نے زور لگا کر ہاتھ اپنی آنکھوں سے ہٹا دیئے اور پھر کمال کو اپنے آگے پا کر حیرت و استعجاب کی ایک چیخ اس کے ہونٹوں پر آئی مگر کمال نے جھٹ اپنے ہاتھ سے اس چیخ کو وہیں روک دیا۔

"چلاؤ نہیں ۔ ذرا دھیرے بولو۔ کیا مجھے شہر بدر کرانے کا ارادہ ہے ۔۔؟" وہ بولا

"آپ ۔۔" مہرو مارے ڈر کے تھر تھرائی۔

"ہاں میں ۔۔ تمھیں تعجب ہے ۔" کمال کی آنکھوں میں کچھ ایسی نرم چمک اتر آئی کہ مہرو کا دل بے تحاشہ دھڑکنے لگا اس نے تو کبھی خواب میں بھی یہ نہ سوچا تھا کہ چاند اس طرح آسمان سے اتر کر بے کھٹکے اس کے کمرے میں

چلا آئے گا، سہانے سپنے جو صرف اس کی بند آنکھوں میں تھرتھرایا کرتے تھے یوں زندہ و متحرک ہو کر اس کی کھلی آنکھوں کے آگے آ مجسم ہوں گے۔

خدا کے لیے جایئے ۔ کوئی دیکھ نہ لے ۔۔۔" وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھال کر بولی ۔" میں منت کرتی ہوں یہاں نہ ٹھہریئے ۔۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھ کمال کے آگے جوڑ دیئے۔

" نہ گھبرا و مہرو میں جا رہا ہوں واقعی مجھے یہاں نہ آنا چاہیئے تھا مگر ۔۔۔ مگر وہ ایک منٹ کے لیے ہکلایا اور پھر الفاظ جما جما کر بولا مگر تم جانتی ہو آج عید ہے سب تحفے لے رہے ہیں، دے رہے ہیں میں بھی تمہارے لیے ایک تحفہ لایا ہوں تم اسے قبول کر لو میں یہاں سے چلا جاؤں گا ۔" اس نے ملتجی آنکھوں سے مہرو کی طرف دیکھا۔

وہ کچھ نہ سمجھ سکی زندگی میں آج پہلی بار کسی نے اس سے ایسے التجا آمیز انداز میں بات کی تھی اور پھر وہ بھی کون۔ ۔۔۔ کمال ۔ جو سارے لوگوں کی آنکھوں کا تارا تھا سارے گھر کا راج دلارا ۔۔۔۔ اس نے دھیرے دھیرے اپنی آنکھیں اوپر اٹھائیں جیسے کہنا چاہتی ہو ۔" تو جلدی سے دے دو اور چلے جاؤ ۔۔۔"

اس کی آنکھوں کو اس طرح اوپر اٹھتے دیکھ کر کمال آہستگی سے آگے بڑھا اس نے دھیرے سے مہرو کے دونوں ہاتھ پکڑے ۔ تازہ مہندی کی بھینی بھینی مہک اور سرخ خون سی ہتھیلیاں کمال کا سر ایک منٹ کو چکرا سا گیا بے خودی کی سی حالت میں اس نے آگے بڑھ کر مہرو کو اپنی دونوں باہوں میں سمیٹ لیا اور پھر دھیرے دھیرے کسی مقناطیسی اثر سے کھنچتا ہوا وہ جھکا اور پھر تڑپ کر اس نے اپنے جلتے ہوئے گرم ہونٹ مہرو کے نرم کومل ہونٹوں پر رکھ دیئے ۔

ایک ثانیہ اس حالت میں گذرا پھر وہ فوراً اس سے الگ ہو کر بولا ۔" تمہاری عیدی ۔۔۔ اور اب لاؤ میرا تحفہ ۔۔۔" اس نے اپنا ہاتھ کسی مجبور سائل کی طرح مہرو کے سامنے پھیلایا مگر اس میں اتنا دم ہی نہ رہ گیا تھا کہ وہ کچھ دے سکتی۔

" نہیں روگی ۔۔۔ خیر نہ سہی میں آج تمہاری اماں سے اپنا حق مانگوں گا ۔۔۔۔ ہاں آج ۔۔۔ اس خوشی و مسرت کے دن ۔ عید کا تحفہ ۔۔۔۔ جانتی ہو کیا ۔۔۔۔ ؟ اس نے پھر دھیرے سے مہرو کی بے جان تھوڑی کو اونچا اٹھایا اور پھر جھپٹ کر باہر نکل آیا ۔۔۔۔ اس کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے اور آنکھیں ایسی متوالی جیسے ابھی ابھی جام منہ سے ہٹایا ہو۔

دروازے کی دراز سے رالبو بیگم نے یہ سب کچھ دیکھا ان کی آنکھیں تیزی سے بھیگتی چلی گئیں ۔۔۔۔ یہ آنسو بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں یہ صرف غم ہی پر نہیں برستے بلکہ خوشی کے موقع پر بھی آپ ہی آپ بہنے لگتے ہیں۔ انھوں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر خدا کی بارگاہ میں شکریہ ادا کیا کہ بالآخر ان کا حق جو پندرہ برس سے دن دھاڑے لوگوں کی آنکھوں

میں دھول ڈال کر چھپنا جا رہا تھا آج پھر انہیں واپس مل گیا۔ آنسو پونچھ کے وہ جلدی سے کمرے میں داخل ہوئیں اور میز کی طرف دیکھے بغیر کانپتے ہاتھوں سے اس گٹھری کو کھولنے لگیں جس میں ایک ایک چیز کر کے نہ جانے انھوں نے کیا کچھ جمع کر رکھا تھا اب وہ وقت آ گیا تھا کہ وہ یہ ساری چیزیں تن تنہا نہ دیکھیں بلکہ دنیا کو بھی بتا دیں کہ اپنی اکلوتی بیٹی کے لیے وہ یہی کچھ بڑی محنت سے جوڑ کر جمع کر سکی ہیں۔

ادھر خالہ اماں مہمانوں سے کہہ رہی تھیں ــــ ارے ایسی ایسی تو ابھی بہت سی عیدیں آئیں گی مدار کھے پروین اور کمال کو ان کے صدقے میں ہم بھی اپنی آرزوئیں پوری کر لیا کریں گے۔ ذرا دیکھو تو میں نے اس شادی کے لیے کیا کچھ نہیں جمع کیا ہے ــــ بڑے بڑے صندوق کھلنے لگے اور مہمانوں کے ساتھ ساتھ خالہ اماں اور نافی اماں کی ناتواں آنکھوں میں بھی روشنی کی ایک تند لکیر تیرتی چلی گئی۔

کمال نے برآمدے میں رک کر یہ سب کچھ دیکھا ایک معنی خیز مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی اور وہ اسی طرح مسکراتا ہوا تیزی کے ساتھ باہر نکل کر چلا گیا جیسے اسے اتنی لمبی فرصت نہ رہی ہو کہ ایک منٹ رک کر ہی اس بیش بہا سامان پر ایک نظر ڈال لیتا۔

حیدرآباد میں شہر کا قدیم ترین ہوٹل

عزیزیہ ہوٹل ہے

جہاں صبح و شام ہندوستانی طریقے سے ماہر فن باورچیوں کے ہاتھوں تیار کیے ہوئے کھانے مل سکتے ہیں۔
صفائی اور پاکیزگی اس ہوٹل کا امتیازی نشان ہے۔ کم کرایہ پر صاف ستھرے اور ہوادار کمرے مل سکتے ہیں
یہ پتہ یاد رکھیئے

عزیزیہ ہوٹل

ناپلی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن فون ۴۳۱۶

واجدہ تبسم

جی کا جنجال

بڑے میاں دسترخوان پر سے اٹھے ۔ ہاتھ دھوئے ۔ کلی کی اور رومال سے منہ پونچھتے ، آنگن میں آ تخت پر چڑھ ، پاؤں سمیٹ کر بیٹھ گئے ۔

"ارے بنّے ۔ خلال کی ڈبیہ تو لائیو ۔" حسب معمول انھوں نے ہانک لگائی ۔

بنّے ڈبیہ لے کر آیا تو چپکے سے پوچھا ۔ "کیوں بے بنّے یہ قبلہ کدھر ہے ۔؟"

بنّے ہنستے ہنستے دوہرا ہوگیا اور ساروں میں سنا گیا ۔ "ارے بڑے ابا قبلے کو پوچھتے ہیں ۔"

اب بات تو اتنی قابل تعجب بھی نہ تھی ۔ کون سے سجدوں میں سر دیئے بیٹھے تھے کہ قبلے کعبے کی خبر ہتی مگر پھر بھی حیرت کی تو بات ہی تھی ۔

"چپ بے ہنسے جاتا ہے نامعقول ۔" بڑے ابا نے گھرکی دی اور بنّے بگڑے تیور دیکھکر کھسک گیا ۔ بڑے ابا نے ڈبیہ کھولی ۔ نیم کی تیلی نکالی اور خلال کرنا شروع کردی ۔

کھٹکے سے دادی بی کی آنکھ کھل گئی ۔ کمنمی آنکھوں سے انھوں نے دیکھا ۔ بڑے ابا لوٹا اٹھاکر باہر نکل رہے تھے ۔ دادی بی کو کیا پڑی تھی کہ پیچھا اٹھاتیں ۔ کروٹ لے کر سو رہیں ۔ مگر پانچ دس منٹ بھی نہ گذرے ہوں گے کہ بڑے زور زور سے نماز پڑھنے کی آواز آنے لگی ۔ ہلکا ہلکا اندھیرا تھا ۔ دادی بی نے وہیں تکیے سے سر اٹھاکر دیکھا ۔ بڑے ابا نماز پڑھ رہے تھے ۔!!

نیند دادی بی کی آنکھوں سے اڑکر دور بھاگ گئی ۔ اک دم اٹھ کر بیٹھ گئیں ۔ آنکھیں مل مل کر دیکھا کہ یہ بڑے ابا ہی ہیں ! وہی تو تھے ۔ ہری چوخانی کی تہبند اور ڈھیلا چار کلی کا ململ کا کرتا پہنے سر پر آڑی ٹوپی رکھے بڑے جلال میں آئے پڑھے چلے جا رہے تھے ، اللہ اکبر ۔ اللہ اکبر ۔

صبح دادی بی نے اٹھ کر سب سے کہا ۔ "لے سنتے ہو جی ۔ صبح منہ اندھیرے نماز پڑھ رہے تھے ۔"

"کیا بات کرتی ہو اماں ۔؟ بھلا بڑے بھائی اور نماز پڑھیں ۔؟؟"

بات اتنی بعید از قیاس تھی کہ دادی بی کے لاکھ یقین دلانے پر بھی کسی کو یقین نہ آیا۔

بڑے ابا بھی بس اپنی طرح کے ایک ہی تھے ـــــ ہر حرکت اوچھی اور ہر عادت نرالی ـــ دادی بی کو کیسا کیسا غصہ آتا ان کے خلال کرنے پر ـــــ مگر یہ سنتے کہاں تھے ـــــ بڑے ابا کا معمول تھا کہ ہر کھانے کے بعد خلال کرتے ـــ گدر بھر کے بچے بچھواڑے کے نیم نیچے سے تیلیاں جمع کر کے لاتے اور گڈیاں سی بنا بنا کر رکھ لیتے ـــ بڑے ابا پیسے پیسے کو ایک ایک گڈی خریدتے تھے اور مزے سے خلال کرتے ـــ روز کا معمول تھا ادھر کھانے پر سے اٹھے ـــ کلی کی، ہاتھ دھوے، کاندھے پر پڑے رومال سے منہ پونچھتے آنگن میں آ، تخت پر چڑھ، پاؤں سمیٹ کر بیٹھ گئے اور آواز لگائی ـــ

"ارے تینے ذرا خلال کی ڈبیہ تو لائیو"

ادھر ڈبیہ آئی اور خلال چلنی شروع ہوگئی ـــ دادی بی جل کر بولتیں ـــ

"اے ہاڑ پٹے نے لکڑیاں چلا چلا کر اچھے خاصے دانت موئے کھل کھلے کر لیے"

اب یہ تو دادی بی بھی جانتی تھیں کہ دانت کھل کھلے ہو رہے تھے یا واقعی خلال نے اپنا رنگ بتایا تھا ـــ بڑے ابا دادی بی کے بچوں میں سب سے بڑے تھے ـــ چھوٹے چھوٹے بہن بھائیوں کی شادی ہوگئی ہوا گئی ـــ بچے چھوڑ پوتے نواسوں والے ہوگئے مگر بڑے ابا وہی کے وہی رہے۔

بڑے میاں اور چھوٹے میاں کی نسبت ساتھ ہی ساتھ بھیجی گئی تھی۔ اب یہ تو اللہ ہے جسے چاہے نوازدے ـــــ مگر بات دراصل یہ تھی کہ چھوٹے میاں دیکھنے دکھانے میں بھی اچھے تھے اور ذرا چار حرف پڑھ گئے تھے ـــ بیٹی والوں نے چھوٹے میاں کو تو ہاں کا جواب دے دیا اور بڑے میاں کے لیے صاف کہہ دیا ـــ

"ہماری بیٹی بہتیا میں بہہ کر تھوڑی آئی ہے کہ اٹھا ماریں ـــ"

اب صاف سیدھی طرح جواب ملتا تو کیا برائی تھی ـــ؟ مگر انھوں نے تو بس منہ پھوڑ طعنہ بہتیا کا دیا ـــ بڑے میاں کو وہ تن تنا کر غصہ آیا کر سارے میں پٹ دیا ـــ

"شادی وہ کرے جس نے ستورہ کا گوشت کھایا ہو ـــ"

اب بھائی بند سمجھا رہے ہیں ـــ دوست احباب سو سو باتیں ملا رہے ہیں ـــ بجائے اس کے کہ قسم توڑتے الٹے برس پڑے ان ہی پر، اور بولے ـــ "شادی کروں گا تو دو باپوں کی اولاد سمجھ لینا"

یہ گالی تو صاف دادی بی پر پڑتی تھی ـــــ بھلا دادی بی نے ایسا کیا قصور کیا تھا کہ ایسی باتیں سننے کو ملیں ـــ؟

"جائے مواچولھے بھاڑ میں ـــ ہماری عزت لوٹے لیتا ہے"

اور دادی بی نے تو نہ سہر کے قسم کھائی کہ "شادی کرنے کا بولوں تو دو مردوں کی جورو سمجھ لینا" لو بھئی اب ماں ہی دخل نہ دیں تو کس کی چندیا کھجلائی تھی کہ منہ سے چوں بھی کرتا ـــ ؟؟

سیلاب کا پانی اور جوانی کا زور روکے نہیں رکتا ـــ بڑی پارسائی کا دعویٰ کیے بیٹھے تھے بڑے میاں ـــ آگے پیچھے سے، اندھیرے اجالے میں، کونے کھدرے میں جہاں کسی کا منہ دیکھا اور باچھوں سے رال ٹپکی ـــ یہ ضرور تھا کہ شادی نہ کرنے کا جو تہیہ کیا تھا سو پورا کر دکھایا ـــ مگر یہ تو سارے خانوادے کو معلوم تھا کہ حضرت بری باتوں میں پڑ گئے ہیں ـــ ایسے اولجھن دادی بی نے کاہے کو دیکھے ہوں گے ـــ بیٹے سے تو ابولا بندھا تھا مگر پھوپھی خالہ سے کہلوایا بھی کہ ـــ "ارے حرامزادے ـ چھوڑ یہ چال ـــ سیدھی طرح رہ ـــ" مگر وہ تو اس کانوں سنتے اس کانوں اڑا دیتے ـــ!

جھوٹ سچ کوں اڑائے ـــ اللہ کو منہ دکھانا ہے ـــ سامنے عاقبت ہے ـــ سننے میں تو یہی آتا تھا کہ بڑے میاں نے لال منہ کی بندریا بھی نہ چھوڑی ـــ شہر بھر میں ہر کنکالہ کا پتہ ان ہی سے پوچھ لو ـــ فلانی کی آواز میں رس ہے ـــ فلانی کی آنکھ میں زہر ہے ـــ اس کا جوبن چٹا پڑتا ہے ـــ اس کے بدن میں مستی ہے ـــ ارے ایک بات تھی! یہاں تو جب بڑے میاں بیٹھ گئے دفتروں کے دفتر کھل گئے ـــ بس بڑے میاں ہیں اور رنگا رنگی باتیں ـــ

پیپل کی ٹیک والی مسجد سے لگ کے سوایتوں کا محلہ تھا ـــ ان میں روہیلے بھی تھے ـــ جو سرحد پار کر کے ہندوستان باہر سے آئے تھے ـــ ان کی عورتیں کیا تنومند کیا چوڑی چکلی ہوتیں کہ بڑے میاں ایسوں کی رال تو ٹپکتی ہی تھی ـــ بڑے مسجدوں کے ملا بھی دم چھوڑ دیتے ـــ ان ہی میں ایک خان پٹھان بھی تھا ـــ نام و نام تو کس کو معلوم تھا سب خان صاحب خان صاحب بولتے تھے ـــ اس کی ایک چھوکری تھی ـــ نام تھا گلابو تھی بھی کم بخت گلابی گلابی ـــ سفید چکنی مٹی میں جیسے گلاب کی پتیاں گوندھ کر اللہ میاں نے اسے انسان کے روپ میں ڈھالا تھا ـــ کرتا سدا کھلے گلے کا پہنتی ـــ یہ جھونگل کی جھونگل چاندی کی زنجیر ـــ موٹے موٹے بٹنوں میں اٹکی ہوئی آدھے بٹن کھلے ـــ آدھے بٹن بند ـــ اور چلتی تو ایسی ٹھمک ٹھمک کر کہ بوٹی بوٹی جگ چھوڑ دیتی ـــ بال بال اچھل اچھل کر چلتے ہوؤں کو مخاطب کرتا ـــ کھلی رکھنے کی جگہ کو بند رکھتی اور بند رکھنے کی جگہ کو ہوا کھلاتی پھرتی ـــ بیٹی تو ایسی ہی تھی پر باپ بڑا ناک والا تھا ـــ اپنے بھائے تو بیٹی کو سات پردوں میں بٹھا کر رکھتا مگر وہ حرافہ سارے باڑے میں کدکڑے لگاتی پھرتی ـ دیکھنے والوں کی آنکھیں کون بند کرے ـــ سامنے آتی چیز تو سب ہی دیکھتے ہیں ـــ اوروں بھی چڑھتا جا نکس ـــ سے چھپا رہ سکتا ہے؟

بڑے میاں نے بھی دیکھا۔ دیکھا کیا بس ریجھ گئے اور ایسے ریجھے کہ دادی بی کی تجوری سے ان کے چڑھاوے کے چھ تولے کے کنگن لے جا کے بدمعاشوں کے ہاتھ سونپ آئے کہ کیسا بھی کر کے وہ لونڈیا اڑا لاؤ۔ ان کا کیا جاتا تھا تاک میں رہے اور موقع ملتے ہی اسے اٹھا لائے۔ انھوں نے جی بھر کے کھیل کھیلے۔ خوب خوب باغ بانی کی۔ باپ کو پتہ چلا اس نے تیرے میرے کو بلا کر گواہیاں ثابت کیں اور بڑے میاں دھر لیے گئے۔

وہ تو جیسی بھی بڑی بھگت گئے مگر دادی بی کا اور سب ہی کا یہ خیال تھا کہ اب کبھی وہ تیری میری لڑکی پر دانت نہیں جھکائیں گے مگر بڑے میاں کی جوانی کا زور بھی وہ زور تھا کہ بارہ گھوڑے بھی ہیچ تھے۔ جانے کدھر کی مستی بھری پڑی تھی کہ کھری باتوں کی چارپائیاں لوٹ لوٹ کر چور اکر ڈالتے۔ نواڑ کے پلنگوں کا تو ذکر ہی کیا تھا۔ دادی بی نے آنگن سے سارے پلنگ چارپائیاں اٹھوا کر ان کے لیے تخت ڈلوا دیا تھا۔

انھوں نے تو جب سے دو باپوں کا طعنہ دیا تھا ماں نے منہ پھیر لیا تھا مگر یہ بڑی سعادت مندی سے اب بھی روزانہ صبح ماں کو سلام کرنے جاتے۔ اب یہ ماں کے دل پر تھا کہ دعا دے دے یا بددعا دے دے۔ منہ سے بھلے ہی کچھ کہہ لیں مگر دل ہی دل میں اب بھی بھڑکتی تھیں۔ سارے میں بدنامی ہو گئی تھی اس پر کڑھتی بھی تھیں۔

"اب جو کر لیا سو کر لیا۔ ابھی بھی مونڈی کاٹا دھاندل گھائی مچاتا پھرتا ہے۔ چین سے گھر کیوں نہیں جوڑ لیتا۔" ان کے کانوں تک مگر پہنچاتا کون۔؟ اور پہنچ بھی جاتی تو مانتا کون۔؟

بنے غلال کی ڈبیہ لاتا اور یہ دانتوں کی خیر لینی شروع کر دیتے۔ دانت دیکھو تو یوں بھاگنے کو آمادہ جیسے بچے "چھپا چھپائی" میں ایک دوسرے کو لوٹنے پر تلے ہوں۔ اگوشت میں ڈھیلا پن بھی آرہا تھا۔ دو چٹکیوں میں پکڑنے سے مچی سی ہاتھ میں آجاتی تھی۔ کہاں تو یہ عالم تھا کہ بدن کو ہاتھ لگاؤ تو ایسا کسا بندھا تھا کہ ستار جیسی دھن دھن آواز نکلتی۔ مگر اتنے گئے گذرے ہو کر بھی ہرگنوں پورے تھے۔ نماز تو شبیر میاں کے جنم کے وقت ہی پڑھی ہو تو پڑھی ہو۔ اور اب شبیر میاں اللہ کے فضل سے دو بچوں کے باپ تھے۔ عیدالفطر عید کی نمازوں سے تو خدا واسطے کا بیر تھا۔ عیدالفطر عید جیسے دنوں میں بھی، کہ برس کا ایک دن ہوتا ہے۔ مزے سے دس گیارہ بجے اٹھتے۔ منہ ہاتھ دھو باہر نکل جاتے۔ اور پھر وہی رات کے بارہ بجے۔ دو بجے اور تین بجے کی خبر لاتے۔ کبھی تو سورج نکلے اپنی صورت دکھاتے۔ بچے بولتے۔ "ابے آبا۔ نماز پڑھو نا۔"

تو تن تنا کر بولتے۔ "تمھارے جنازے کی نماز پڑھیں گے۔ ابھی سے کیا پڑھنا۔"؟

نیاز۔ نذر گیارھویں سے یوں دور بھاگتے جیسے پکا دین دار نمازی، شراب کباب سے بھاگے۔ اب تو عمر پچاس سے بھی ڈھلک رہی تھی۔ اس عمر میں تو سب ہی سنبھل جاتے ہیں۔ ان کا ڈھنگ سب سے

نرالا تھا بلکہ دو ہاتھ اونچے ہی تھے ۔

کمال میاں کی شادی کا وہ دھوم دھمکا تھا کہ لوگ راتوں کو سوناتک بھول گئے ۔ بڑے گھر کی بیٹی اٹھائی ۔ کسی بات کی کمی نہ تھی ۔ یہاں بھی ہر چیز سیر کو سوا سیر ۔ رت جگے ہوتے ۔ تلن ہوتے ۔ گگلے پوریاں ۔ چونگے تلے جاتے اور ڈھولک پر وہ تھاپیں پڑتیں کہ بڑے بڑے مسٹر بھی نیند سے چونک چونک پڑتے ۔ چڑھ جاتے ۔

گرمیوں کے دن تھے ۔ بڑے میاں اپنے معمول کے مطابق تین بجے رات کے لگ بھگ بازار سے لوٹے ۔ ساتھ میں دوستوں کی ایک منڈلی بھی تھی ۔ اچھے خاصے گھر بار یوں کو بیویوں سے تڑوا دیتے ۔ بولتے ۔

"ارے میاں بازار کی ہانڈی میں جو مزہ ہے وہ گھر کی ہانڈی میں کہاں ۔" ؟ ایسے چکے دیتے کہ جانے والے پالتو کتا بن ساتھ ہو لیتے ۔

لوٹے تو رت جگے کی دھوم تھی ۔ آنگن بیچ منڈوا پڑا تھا ۔ پھولوں پتوں سے لہکتا مہکتا ۔ وہ گڑبڑ ۔ وہ شور شر کہ توبہ ۔ منڈوے تلے گیت ہو رہے تھے ۔ اور ڈھولک پر تھاپ پر تھاپ پڑ رہی تھی ۔

جی کا جنجال موا باجرہ لائے ۔

میں نکو بولی باجرہ ۔

تم کائے کو لائے باجرہ ۔

وہ بیچ میں جو موٹی موٹی آنکھوں والی الھڑ سی چھوکری تھی وہ تان اٹھاتی اور سب ساتھ دیتیں ۔ وہ اپنی پتلی سی ناک چڑھا کر "نکو" اس مزے سے بولتی کہ جی لوٹ پوٹ ہو جاتا ۔

جب میں وہ باجرہ چھڑنے کو بیٹھی

بھونسہ اڑا اڑا جائے موا باجرہ !

اور پھر بھونسے سے بچنے کے لیے اس نے آنکھوں پر، اس زاویے سے منہ بنا کر ہاتھ رکھا کہ بڑے میاں وہیں ڈھیر ہو گئے ۔

میں نکو بولی باجرہ

تم کائے کو لائے باجرہ

پتلی سی ناک "نکو" پر بار بار چڑھتی اترتی ۔

جب میں وہ باجرہ پھٹکنے کو بیٹھی

آنکھیں پھوٹی جائیں موا باجرہ

رات کے تین بھی تو بج رہے تھے ۔ اس نے اپنی نیند بھری موٹی موٹی آنکھیں سب کے سامنے کھول کر زور سے بیچ لیں ۔

آنکھیں پھوٹی جائیں موا باجرہ !

اور پھر زور کی تھاپ دی ۔

میں نکو بولی باجرہ !

بڑے میاں کا دل چاہا سارا باجرہ خود ہی چن چنا کر صاف کر دیں ۔

جی کا جنجال موا باجرہ لائے ۔

باجرے کی تکرار چلتی رہی اور بڑے میاں وہیں کھڑے رہے ۔ صبح صبح جب اندھیرا چھٹ رہا تھا اور صبح کی ہلکی ہلکی روشنی بھرپور اجالے سے بدل رہی تھی ۔ بڑے میاں وہیں دوسروں پر کھڑے اس کو گھورے جا رہے تھے ۔ اس کو، جو وہیں، ڈھول کے پاس بے فکری سے ٹانگیں پھیلا کر سو گئی تھی اور ان کی نیند اڑا گئی تھی ۔

جانے کیا نیکی دل میں آئی ۔ اس کی طرف سے کوئی برا خیال دل میں نہ آیا ۔ جھٹ سوچ لیا بس اسی سے شادی کر لیں گے ۔ اتنے گئے گذرے ہو کر بھی لاکھوں پر بھاری تھے بڑے میاں ۔ کون تھا جو بیٹی نہ دیتا بھلا لوگ مرد کی عمر نہیں دیکھتے اس کا دھن دیکھتے ہیں اور دھن کی یہاں کیا کمی تھی ۔ ؟

بڑے میاں نے ہاتھ پاؤں چلائے تو پتہ چلا کہ بڑے گھر والوں کی پوتی ہے ۔ انھوں نے ماں کے آگے جا کے ہاتھ پاؤں جوڑے ۔ خوشامدیں کیں ۔ ماں دو مردوں کی جورو ٹھہریں وہ الگ ۔ خود دو باپوں کے اولاد ٹھہرے ۔ مگر دل کی چوٹ تھی سہا کیسے تھی ۔ تو بہ تلا کر کے قسم لوٹائی اور ماں کے قدموں میں گر کر گذرے دنوں کی معافی مانگ لی ۔

دادی بی بڑے ٹھسّے سے گئیں ۔ پوپلے منہ سے پوپلے منہ والے بیٹے کا پیام لیکر ۔ اور بڑے آبا گویا شرف بہ اسلام ہو گئے ۔ ایسی نیکیاں بھری بی بی تھی کہ اس کی زندگی میں آتے ہی بڑے میاں ساری بدی بھول بیٹھے اور اس دن کئی زمانے بعد دادی بی نے دیکھا کہ بڑے میاں لوٹا اٹھا کر باہر نکل گئے ۔ اور پھر کنکھی آنکھوں سے یہ بھی دیکھا کہ بڑے میاں پٹاپٹ سجدے کر رہے ہیں ۔ بار بار ماں کو لڑکی والوں کے پاس بھیجتے کہ آماں کیسا بھی کر کرا کام کروا دو ۔ اور خود سجدوں پہ سجدے کیے جاتے ۔ اللہ میاں سے دعائیں بھی یوں مانگتے جیسے برابر کے دوست احباب سے باتیں کر رہے ہوں ۔

ہمارے اللہ میاں آپ کیا سمجھتے ہیں اس کو بھگا نہیں سکتا ۔ ؟ مگر مولیٰ اب میرا دل خود نہیں چاہتا ۔ بھول ہے

اللہ میاں پھول ـــــ بس اب تو دل چاہتا ہے کہ شریف مردوں کی طرح گھر بیٹھ کر زندگی کروں ـــ"!
اللہ میاں کو رشوت کا لالچ بھی دیتے ـــ" ارے پانچوں وقت کی نماز پڑھا کروں گا ـــ رمضان کے روزے رکھوں گا ـــ ہاں قرآن شریف بھی پڑھوں گا ـــ"
مزید سفارشی وسیلے بتاتے ـــ" اگر اتنے پر بھی آپ راضی نہیں تو روزانہ یٰسین شریف کی بھی تلاوت کروں گا ـــ ورنہ میں زہر کھالوں گا اور خودکشی کا عذاب آپ پر ہی پڑے گا ـــــ اللہ میاں مجھے سچ مچ ہاجرہ سے عشق ہوگیا ہے ـــــ"!
اللہ میاں کے کان کھلے تھے شاید ـــ یا پھر بڑے میاں کی دعاؤں ہی میں اثر ہوگا ـــ لے دے ہوئی بھی مگر یہیں یہاں بھی شامیانہ بن کر سب عیبوں کو ڈھانک گیا ـــ بڑی دوڑا دوڑی کے بعد ہاں ہوگئی ـــ بڑے میاں کے مانو زمین پر پاؤں نہ پڑتے تھے ـــ ہاں ہوتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ وضو بنا قرآن شریف لے کر بیٹھ گئے اور دو پارے پڑھ کر آنحضرت کے نام بخش دیئے ـــ اماں بھی خوش پہ خوش تھیں ـــ اور پرانی باتیں بھول بھال کر شادی کے کام کاج میں گم تھیں۔
اور قاضی صاحب نے جب پوچھا ہے ـــ" ہاجرہ بیگم اتنے اتنے مہر کے عوض قبول ہے ـــ" تو بڑے میاں آسمانوں پر اڑے چلے جارہے تھے ـــ کہیں دور سے بولے ـــ
" جی ہاں ـــ جی ہاں ـــ جی ہاں ـــ"
ڈھم ڈھم ڈھم ڈھول پٹ گیا ـــ گویا اعلان ہوگیا کہ لو جی بابل بیٹی پرائی ہوگئی ـــ
دسترخوان بچھے ہوئے تھے ـــ صفیں کی صفیں بیٹھتیں ـــ کھانا کھا کر جگہ خالی کر دیتیں ـــ پھر دوسری صف بیٹھتی ـــ بڑے میاں پھولوں، گجروں اور سہرے سے لدے پھندے، سر پہ زری کا صافہ باندھے ہاتھ دھونے کے لیے کسی سلاچی لوٹے کی طرف بڑھے ـــ سیڑھیاں اترتے ہیں تو پاس ہی سے سسکی سی سنائی دی ـــ آگے بڑھے تو کونے میں سایہ سا کانپ رہا تھا ـــ بولے ـــ
" ادھر کون ہے ـــ؟ کھانا کھا چکے ـــ"؟
ہوں نا ہاں ـــــ
" ارے بھئی جواب نہیں دیتے ـــ چوروں کی طرح کیا کھڑے ہو ـــ"؟ اور بڑے میاں نے ہاتھ پکڑ کر سامنے کھینچ لیا ـــ
" ارے چنو سائی کے بیٹے ہو ـــ کیا نام ہے میاں تمہارا ـــ؟ بھول ہی گیا میں تو ـــ ہاں ہاں یاد آیا ـــ ظفر میاں اچھے تو ہو ـــ"؟
بڑے میاں نے ان کی آنکھوں میں جھانکا ـــ ہائیں ـــ رو رہے ہو تم ـــ" وہ آنکھیں پھاڑ کر بولے

—" ہوا کیا — ؟ گھر میں تو سب اچھے ہیں —" ؟

" جی ہاں سب ہی اچھے ہیں بس میں ہی نصیبوں کا پورا ہوں —" وہ ڈوبتی آواز سے بولے —

" بات کیا ہے میاں —" بڑے میاں نے پیار سے پوچھا —

اک دم ظفر میاں عورتوں کی طرح پھپھک پڑے —" اپنی قسمت کی سیاہیوں کا شمار کروں تو میں پورے طور سے برسات کی رات بن چکا ہوں — کہیں اجالا نہیں — روشنی کی ہلکی سی رمق نہیں —" !!

" عورتوں کی طرح روئے جاتے ہو بات بتاتے نہیں — ہوا کیا ؟ کہیں گھر تو نیلام پر نہیں اٹھ گیا —" ؟

چنو میاں بے چارے بڑے اچھے دن دیکھے بیٹھے تھے — بڑے نانا کے زمانے میں دروازے میں ہاتھی جھولتا تھا — اصطبل میں اصیل گھوڑے ایک نہ دو پورے آٹھ تھے — ان پر جھکا جھول چاندی کے گہنے — ارمان بھرے دم تھے بے چارے — لگی سواری کے لیے تھی — ایسی چھک چھک چھن چھن کرتی آتی کہ لوگ ایک میل پرے سے ہی بولنا شروع کر دیتے —

" ارے ہٹنا میاں — حویلی والوں کے گھر کی سواری آ رہی ہے —"

دل کے بھی ایسے ویسے نہ تھے — پورے گاؤں میں اپنے اونچے ہاتھ کے لیے مشہور تھے — چاند گھٹتا بڑھتا رہتا ہے — برے دن آئے اور ایسے آئے کہ گھر کی اچھی بری چیز بک بکا کر کوڑی بن گئی — کہاں تو وہ ہاتھی گھوڑے اور بگھیاں — اور کہاں یہ حال کہ جوتیاں چٹخاتے پھرتے مگر کوئی پاس بٹھا کر سلام لینے کا بھی روادار نہ تھا — بڑے میاں کے گھر والوں میں بس اتنی ہی بات بڑی اچھی تھی کہ اپنے پرائے، امیر، غریب، چھوٹے بڑے سب کی خیر خبر لیتے رہتے — اب نصیبوں سے ایک مکان بچ رہا تھا، مکان کا ہے کو تھا اچھا خاصا ڈھنڈار تھا — کچھ بھی تھا مگر سر چھپانے کو آسرا تو تھا — اس کی بھی سن گن مل ہی رہی تھی — بڑے میاں یہی سمجھے شاید نیلام اٹھ رہا ہوگا —

بڑے شاعرانہ انداز میں ظفر میاں بولے —

" مکان کا تو نہیں — میرے ارمانوں کا نیلام اٹھ گیا — چاندی کی طاقت واقعی بہت بڑی ہوتی ہے —" !

بڑے میاں بچہ تو تھے نہیں — سناٹے میں آ گئے — تھوڑی دیر چپ رہے پھر بڑی صلاحیت سے پوچھا —

" ہاجرہ سے محبت کرتے ہو —" ؟

" جی ہاں — اور وہ بھی مجھ سے کرتی ہے —" ظفر میاں جیسے عدالت کے سامنے حلفیہ بیان دینے پر تل گئے —

" آپ کو یاد ہوگا آپ کے پیام جانے کے کئی دنوں بعد تک جواب نہ ملا تھا — ہاجرہ کہتی تھی میں زہر کھالوں گی — یا نہیں تو بس ظفر سے شادی کروں گی — اور اس کے فریب ماں باپ کہتے تھے آپ ایسا داماد ہار بار نہیں ملا کرتا — مگر جیت آپ ہی کی ہونی تھی اور ہوئی —" وہ چھوٹے بچوں کی طرح آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رو پڑے —

"اب یہاں کھڑا تھا کہ ہاجرہ ڈولی چڑھے گی تو اس پر سے یہ گوندنیاں نچھاور کر دوں گا ۔ ہماری محبت تو اسی کے تلے پروان چڑھی ۔ پانچ سال سے ہم ساتھ رہنے کا سوچتے آئے تھے مگر . . . . ."

"چھی ۔ مرد ہو کر روتے ہو ۔ آؤ میرے ساتھ ۔ آنسو پونچھ ڈالو ۔ پونچھ لو ۔ بس پونچھ بھی ڈالو ۔"

دیوان خانے میں ابھی قاضی صاحب اور باراتی بیٹھے ہوئے تھے ، بڑے میاں پھولوں سے لدے پھندے ، ظفر میاں کا ہاتھ پکڑے داخل ہوئے ۔ دو ایک منٹ تو ادھر ادھر دیکھتے رہے پھر بیچوں بیچ جا کر کھڑے ہو گئے اور سپاٹ لہجے میں بولے ۔ "میں مظہر میاں ، ہاجرہ بیگم کو تین بار طلاق دیتا ہوں ۔" !

"طلاق ۔" ؟ ؟ سب سناٹے میں آ گئے ۔

دو چار منٹ خاموشی رہی ہو گی کہ ۔ اک دم سبھن بھناہٹ سی ہونے لگی ۔ بڑے میاں نے قدرے سختی سے ہاجرہ کے باپ کو مخاطب کیا ۔

"میاں جی آپ کو معلوم تھا نا کہ آپ کی بیٹی ظفر میاں سے محبت کرتی ہے ۔ ؟ پھر بھی لے کر میرے پلے باندھ دی ۔ میں ایسی اوباش لڑکی کو اپنی بیوی نہیں بناؤں گا ۔" ان کی آواز ڈوب رہی تھی مگر وہ سنبھل گئے ۔

"مہر میں ابھی دیئے دیتا ہوں ۔"

دولہن والے گھر سے بڑے میاں کا گھر دور ہی کتنا تھا ۔ لپکتے ہوئے گئے اور جھولی بھر روپے لیے آ گئے ۔ کھن کھن بھری محفل کے سامنے گن دیئے اور گرج کر بولے ۔

"قاضی صاحب پڑھا دیجئے اس بدچلن کا نکاح ۔ ابھی ظفر میاں کے ساتھ ۔" یہ کہہ کر انھوں نے اپنا سہرا اتار کر ظفر میاں کے سر باندھ دیا ۔ اپنی جامدانی کی لچکن اتار کے ظفر میاں کو پہنا دی ۔

ان کی آنکھوں میں نمی گھل رہی تھی ۔ مدھم اور نرم آواز سے بولے ۔ "جاؤ میاں ۔ خوش رہو ۔ کھاؤ پیو عیش کرو ۔ میں تم دونوں معصوم فرشتوں کے لیے اپنی نیک تمنائیں اور دعائیں بھیجتا ہوں ۔" !

دسترخوان بچھے ہوئے ہی تھے ۔ بڑے میاں نے دو چار الٹے سیدھے نوالے زہر مار کیے ۔ کھانے پر سے اٹھے ۔ ہاتھ دھوئے ۔ کلی کی اور رومال سے منہ پونچھتے باہر آ ، پلنگ پر چڑھ کر بیٹھ گئے ۔ پاؤں سمیٹ کر آواز دی ۔

"ارے بھئی خلال دینا ذرا ۔" !

کسی نے ہاتھ میں نیم کی تیلی تھما دی اور خلال چلنی شروع ہو گئی ۔ ! !

بازگشت

۲۱ رمئی ، ۵۰ء ——————— حیدرآباد

"صبا" دن بدن معیاری ہوتا جارہا ہے۔ خصوصاً چند ماہ سے تو رسالہ کافی اچھا نکل رہا ہے۔ نظموں اور غزلوں کا حصہ دوسرے رسالوں کے مقابلے میں کافی جاندار رہتا ہے۔

اثر لکھنوی کی غزل فراق کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہے۔ ہاں انہوں نے فراق کی غزل میں جو غلطیاں بتائی ہیں وہ کچھ کچھ ٹھیک ہیں۔ مگر ان کے اظہار کا طریقہ بہت ہی غلط اور غیر مہذب ہے۔ اساتذہ کی نوک جھونک دلچسپ ضرور ہوتی ہے مگر اس میں بھی سنجیدگی ہونی چاہیئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو دشمن ہیں جو کسی نہ کسی طرح ایک دوسرے کو نیچا دکھانا چاہتے ہیں۔ عبارت میں جب جھنجھلاہٹ اور گالی گلوچ آجاتی ہے تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ دوسرے کی شخصیت سے متاثر اور مرعوب ہیں اور اگر آپ کسی کو اپنے سے کم سمجھتے ہیں تو اس کی غلطیوں کو بڑے ہی دوستانہ انداز اور سنجیدگی سے ظاہر کردیتے ہیں۔ جب اثر صاحب فراق کی شاعری کا پول کھولنے کا دعویٰ کرتے ہیں تو ان کو چاہیئے کہ وہ مہذب طریقوں سے دلیلیں دے کر یہ ثابت کریں۔

افسانوں کی طرف تو مخدوم کے تحفے پسند آئے۔ شاہد صدیقی نے "سخن گسترانہ بات" میں کوئی خاص بات نہیں کہی۔

شاخ نبات

۲۲ رمئی ، ۵۰ء ——————— حیدرآباد

مخدوم کے "تحفے" پاکر بس مزہ آگیا۔ یہ فراق واثر تو بہ ہے۔ انھوں نے بچوں کو بھی مات دے دی۔ اچھا جی اگر میں کہوں کہ آپ "صبا" میں ایک سرے سے افسانے چھاپنا ختم ہی کردیجئے تو کیسا رہے؟ واجد تبسم

۲۳ رمئی ، ۵۰ء ——————— حیدرآباد

زمانہ کس قدر ناقدر شناس ہے اس کا اندازہ صبا کے نئے پرچہ کو دیکھنے کے بعد ہوا۔ عزیز محترم اثر لکھنوی نے فراق کی غزل پر جو تنقید کی ہے، قطع نظر اس کے کہ وہ کہاں تک صحیح ہے اس بات کی غماز ہے کہ اب ادبی پرچے بھی آج کی بے ہودہ اور سطحی صحافت کے گھٹیا اصولوں کو اپنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ اساتذہ کی نوک جھونک سے مشق لوگ فائدہ ضرور اٹھا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ کوئی تعمیری مقصد اس میں پنہاں ہو ——— یہ کیا بات ہوئی کہ دو پہلوان ہو

کسی اکھاڑے کی تلاش میں تھے۔ ان کے لیے اکھاڑہ فراہم کر دیا جائے ـــــ "صبا" کی اشاعت دوسرے طریقوں سے بھی تو بڑھائی جا سکتی ہے۔

"صبا" سے مجھے دلچسپی ہے ـــ اس لیے کہ حیدرآباد کی روایات اور شمالی ہند والوں کے تعصب سے میں خوب واقف ہوں۔ بعض خوش فہم یہاں تک کہتے ہیں کہ دکن میں کوئی شاعر پیدا ہی نہیں ہوا ـــ آپ اپنے نظریہ کے بل بوتے پر شاید وحدت کائنات کے قائل ہوں ـــ اور میری یہ بات بلا دلیل آپ کے دل میں جگہ نہ پا سکے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ادب میں اجارہ داری، انانیت اور تعصب کا ذمہ دار صرف شمال والوں کا پندار اور دکن والوں کا تجاہل عارفانہ ہے ـــ یہ کوئی اتہام نہیں ہے میرے پاس دلائل ہیں۔ آئندہ کبھی بیان کروں گا۔

ڈاکٹر ابو العلائی

نئی دہلی ـــــــــــــــــــ ۲۵ مئی، ۵۶ء

ابھی "صبا" کے پچھلے نمبر کے بارے میں کچھ لکھنے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ آج نیا نمبر بھی مل گیا۔ پچھلے نمبر میں عالم کا مضمون پڑھ کر بڑی حیرت بھی ہوئی اور دکھ بھی۔ مغنی کا مضمون بھی پڑھا۔ عالم کا مضمون پڑھ کر تو احساس ہوا کہ وہ آہستہ آہستہ ادب برائے ادب والوں کی صف میں پہنچ رہے ہیں۔ یہ بھی جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ ترقی پسند ادب کی تحریک مر چکی ہے اور اس کا کوئی رول نہیں رہا۔ یہ بات وہ لکھ بھی نہیں کر سکتے جو (تم نے ان کا مضمون ساہتیہ اکادمی کے مجموعے میں پڑھا ہوگا) ترقی پسند ادب کے مخالفین میں سے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ ترقی پسند مصنفین کی تنظیم ویسی باقی نہیں رہی جیسی کہ پہلے تھی، اور شاید آج کے نئے حالات میں ممکن بھی نہیں لیکن ترقی پسند تحریک کسی انجمن کا تو نام نہیں ہے۔ یہ تو نام ہے ادب کے اس نظریہ کا جو ادب اور ادیب کو سماج اور زندگی سے الگ نہیں کرتا۔ جو ادب برائے زندگی کا ادب کی افادیت کا قائل ہے۔ اور آج کتنے ادیب ہیں جو اس نظریہ کے خلاف ہیں؟ جتنے بڑے شاعر ادیب، نقاد اردو زبان کے ہیں۔ ان میں ادب برائے ادب والوں کی کتنی تعداد ہے؟ اگر آج کچھ لوگ ان منفی پہلوؤں پر تنقید کر رہے ہیں جو ترقی پسند تحریک میں داخل ہو گئے تھے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ اس کی بنیادی باتوں کے خلاف ہیں۔ تم تو ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس میں شریک ہوئے تھے۔ وہاں بھی کچھ لوگوں نے ادب برائے زندگی اور ادب کی بحث چھیڑی تھی اور تم کو یاد ہوگا کہ اس صف آرائی میں ادب برائے ادب والے کتنی چھوٹی اقلیت میں تھے۔

جب آپ ادب برائے زندگی کو مانتے ہیں تو پھر اپنے لیے IVORY TOWER نہیں بنا سکتے۔ آپ کو سماج کی عائد کردہ کچھ پابندیوں کو قبول کرنا ہوگا۔ یہ پابندیاں کتنی ہوں گی۔ اس پر بحث ہو سکتی ہے۔

سوویٹ یونین اور بعض دوسرے ملکوں میں کمیونسٹ سماج کے بعض منفی پہلوؤں پر سخت تنقیدیں کی گئیں تو

بعض لوگ اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ مارکسی اصول ہی سرے سے غلط ہیں۔ بالکل یہی بات ترقی پسند تحریک کے بارے میں ہو رہی ہے۔ میرا ارادہ ایک تفصیلی مضمون لکھنے کا ہے بشرطِ فرصت۔ میں جون کی چوتھی تاریخ کو مدراس جا رہا ہوں وہاں سے کولمبو جاؤں گا۔ جون کے آخر میں حیدرآباد پہنچوں گا۔ اور کوشش کروں گا کہ دو میں یہ مضمون لکھوں بھیجنے کیلئے کچھ کتابوں کی ضرورت ہے جو شاید وہاں مل جائیں گی۔

کلیم اللہ

۲۶ مئی ۵۰ء ——— نئی دہلی

کل کی ڈاک میں "صبا" ملا۔ اس بار نظموں میں شمیم کرہانی کی نظم "ستارا"، راشد آذر کی "آج کی شام" خصوصیت سے پسند آئیں۔

ادھر مقطع میں آپ اپنے منہ میاں مٹھو" بننے کی وبا سرعت سے پھیلتی جا رہی ہے۔ جسے لگام دینے کی ضرورت ہے اس شمارہ میں منظر شہاب اور پرویز شاہدی کی غزلیں میری اس بات کا ثبوت ہیں۔

چھیڑ چھاڑ اور شخصی عناد سے پیدا ہونے والی تنقید کے ڈانڈے ہمیشہ تنقیص سے جا ملتے ہیں۔ اثر صاحب کی تنقید بھی اسی کا شکار ہو کر رہ گئی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ سلسلہ کچھ اچھے نتائج کو سامنے لا سکے گا۔ تاہم فراق صاحب کی جن کمزوریوں کی طرف انھوں نے سخت انداز میں توجہ دلائی ہے۔ اس سے انکار ناممکن ہے۔

شاہد صدیقی کی "سخن گسترانہ بات" اپنے اختصار کے باوجود خیال آفریں ہے۔ مخدوم کے "سفر نامے" کو تحفۃً قبول کیا جا سکتا ہے۔ آخر صبا میں کہانیوں کا حصہ کب بلند ہوگا؟ اس طرف دو چار ماہ سے تو آپ نے ایک بھی ایسی کہانی شائع نہیں کی جس کی تعریف کی جا سکے۔ اور اس بار تو صبا میں صرف ایک ہی کہانی شائع ہوئی ہے طرفہ یہ کہ وہ کہانی بھی اتنی عجیب و غریب ہے کہ پڑھ کر ہنسی آتی ہے۔ اگر یہ کہانی کرتار سنگھ دگل کی بجائے کسی اور غیر معروف سردار جی نے لکھی ہوتی تو معاف کیجئے آپ اسے زندگی بھر نہ چھاپتے۔

واہمہ کے تعلق سے آمنہ ابوالحسن کا خطاں کی شکست خوردہ ذہنیت کی غمازی کر رہا ہے۔

عوض سعید

۳۰ مئی ۵۰ء ——— حیدرآباد

صبا کا تازہ پرچہ ملا۔ اثر لکھنوی نے تنقید سے زیادہ تنقیص کی طرف توجہ دی ہے۔ یہ سلسلہ دلچسپ ہا یوں کہیے کہ باعث دلچسپی رہے گا۔ مخدوم کے "تحفے" پر اثر ہیں۔ ابوظفر عبدالواحد کی نظم "کالی گھٹا" دل پر جبر کر کے پڑھنا پڑتی ہے۔

جوش کے ایک شعر کو آپ نے جلی حروف میں چھاپا ہے۔ مجھے کسی پہلو سے اس میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی کہیں اچھا ہوتا اگر آپ وہ جگہ خالی رکھتے۔

علی آفتاب

۴ جون ۵۰ء ——— حیدرآباد

"مئی صبا" ملا۔ حضرت اثر لکھنوی کی غزل اور تنقیدی مضمون پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی کیونکہ غزل "سونا" ہے اور مضمون

سہاگ" حضرت فراق گورکھپوری کے چیلنج کے جواب میں حضرت اثر لکھنوی نے جو غزل پیش کی ہے اس کو پڑھنے کے بعد نہ صرف اثر صاحب کی تنقید کا معیار معلوم ہوتا ہے بلکہ ان کا "مذاقِ شعر گوئی" اور "مقصدِ شاعری" بھی۔

شیخ ناسخ کو فن و قواعد سے اس قدر عشق تھا کہ وہ ہر اس شعر کو جس میں کوئی فنی غلطی نہ ہو (اور جو موزوں ہو) "جانِ ایمانِ شاعری" سمجھتے تھے۔ ناسخ کی غزل کا ایک مطلع ملاحظہ فرمائیے ؎

جو اُس پری سے شبِ وصل میں رکاوٹ ہو
مجھے بھی ایک جنازہ ہو یا چھپر کھٹ ہو

بھلا فراق صاحب اس چھپر کھٹ والی شاعری کو کیا جانیں اور اس کی کیا قدر کریں۔ اس لکھنوی چھپر کھٹ" میں تو نزاکت چاشنی محاورہ، آدابِ تقدیم و تاخیر، بُعدِ زمانی و مکانی اور لطیف طنز و مزاح کے علاوہ بے شمار ہ جان لیوا ادائیں بھی ہیں لیکن فراق صاحب ان سے بے خبر ہیں۔ بالآخر اثر صاحب نے تہیہ کر لیا کہ وہ "تنقید کے پھول برسا کر (قلم سے بے اختیار" پھوار" کر کے نکل رہا تھا) فراق صاحب کو اس فنِ لطیف کی جانب متوجہ فرمائیں گے چنانچہ اثر صاحب کے حسب ذیل جملے "فن تنقید" کی تاریخ میں تا ابد تابناں و درخشاں رہیں گے۔ اور کیا تعجب کہ مستقبل قریب میں انھیں "فن تنقید" میں بنیادی حیثیت حاصل ہو جائے۔ جملے ملاحظہ ہوں۔

۱۔ "ان کا مخاطب صحیح میں ہی ہوں کیونکہ تنقیدی مضامین میں ان کی شاعری کا پول کھولتا رہتا ہوں"

۲۔ "زلف پر چمِ علم کا سہرا۔ صرف فراق صاحب کی آگاہی کے لیے لکھتا ہوں کہ شاید ان کے مبلغ علم سے باہر ہو"

۳۔ "میرے درست کردہ مطلع کے مقابل فراق صاحب کا اصلی مطلع پڑھیے مجھے امید ہے کہ ان کی لنڈوری شاعری کا اندازہ ہو جائے گا"

۴۔ "علاوہ بریں ماتم، دل خوں شدہ، ستم زدہ یا الم گشتہ کا ہوتا ہے نہ کہ دل گم گشتہ کا جس کی بازیافت یا پتہ چل جانے کا امکان ہے۔ محض تصنع اور ٹھنڈے مخرے"

۵۔ "اثر نے کم سے کم تیس برس ادھر فراق صاحب کی تازہ مزخرفات سے کہیں بہتر کہا تھا"

۶۔ "واہ ری بیہودہ لفاظی اور دریدہ دہنی"

۷۔ "یہ حضرت اگر جھوں جھوں اور چھکوں پھکوں بھی روئیں تو ستاروں کا پگھلنا کیسا آنکھ بھی نم نہ ہو"

۸۔ "مجھے ہمیشہ یہ الجھن رہی کہ فراق صاحب شاعر کس رخ سے ہیں۔ ان کے متند اشعار ناموزوں ہوتے ہیں۔ زبان تو بڑی چیز ہے معمولی الفاظ کے محل استعمال کا وقوف نہیں"

۹۔ "خال روئے زیبا کر" کی دہقانیت شوشہ در مرکز میں واؤ عطف بالفتح و باعلان۔ تاہم فراق صاحب میر و غالب حسرت و اقبال الغرض تمام شعرائے ماضی و حال سے اشرف و افضل۔ تفو بر تو ائے چرخ گرداں تفو"

حضرت فراق گورکھپوری (جیسے بڑے شاعر) کے متعلق حضرت اثر لکھنوی (جیسے استاد) نے (اپنی پاکیزہ زبان میں) جو کچھ

ارشاد فرمایا ہے وہ نوجوان شاعروں اور نقادوں کے لیے "مشعل راہ" ہے۔

خصوصاً سنجیدگی فکر، اصول تنقید کی پابندی، شعر سمجھنے اور سمجھانے کا انداز، اصلاح دینے کی خواہش میں خلوص نیت و علم کا اظہار (معاف کیجئے) تنگ نظری، حسد اور طنز تشنیع سے اجتناب آخر صاحب کی نمایاں خصوصیات معلوم ہوتی ہیں ؎

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

اریب صاحب ایک بات اور عرض کر دوں "صبا" میں ایک عرصہ سے سنجیدہ اور متوازن ادب شائع ہوتا رہا ہے اور مجھے امید ہے کہ آئندہ بھی ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ "صبا" کو انشا اور مضحکہ کا اکھاڑہ نہ بنائیے۔ ہم ابھی وہ تمام غیر ادبی زیادتیاں نہیں بھلا سکے جو چند پڑھے لکھے ادیبوں نے میر، غالب، اقبال، فراق اور فیض کے ساتھ کی تھیں۔ بعد میں تلافی کے طور پر قصیدے لکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ بہرحال آپ کے لیے احتیاط ضروری ہے۔ "صبا" کی مقبولیت اور ترقی کا سہرا آپ کے سر ہے۔ غیاث صدیقی

۵ رجون، ۵۰ ——— پدا پلی

صبا اب کی بار بہت دیر سے یعنی ۳۰ مئی، ۵۰ کو ملا۔ مخدوم کے تحفے اگر صبا میں شامل نہ ہوتے تو پرچہ بالکل بے جان معلوم ہوتا شاہد صدیقی کا مضمون موجودہ ماحول میں واقعی قابل غور ہے۔

یہ جان کر سخت حیرت ہوئی کہ ساہتیہ اکیڈمی کی طرف سے اردو شعرا کا جو انتخاب شائع ہو رہا ہے اس میں اختر الایمان کی نظم کو اس لیے شائع نہیں کیا جا رہا ہے کہ ان کے نام کی ترکیب غلط ہے۔ مولانا آزاد کی اس ذہنیت کے خلاف یقیناً زبردست آواز اٹھانی چاہیئے یہاں تک کہ اگر وہ انتخاب شائع ہو تو اس میں اختر الایمان کی نظم شامل رہے ورنہ ناشاعر اس مجموعہ سے بائیکاٹ کریں۔

سلیم صدیقی

۵ رجون، ۵۰ ——— حیدرآباد

مئی کا صبا ملا۔ بہ حیثیت مجموعی پرچہ جاذب نظر ہے، پہلے کی بہ نسبت کتابت، طباعت اور ترتیب کو آپ نے ترقی دی ہے حصہ نظم و نثر برابر کے نظر آتے ہیں لیکن پرچے کے معیار کو اور بلند کرنے کی ضرورت ہے!

"پہلی بات میں پہلی مرتبہ اداریہ کی شان پیدا ہوئی ہے۔ آپ نے خود تنقیدی کو احتساب کا درجہ جانے کیوں دیا؟ تنقیدی خود شکستگی نہیں، بلکہ عرفان ذات کا ذریعہ ہے۔ یہ زمانہ شعوری آرٹ کا ہے۔ اس لیے یقین ہے کہ اکثر ادیب شاعر جو یقیناً بے شعور نہیں ہیں، بغیر کسی عالمانہ غور کے اپنے فن کو تنقید کی کسوٹی پر کسنے میں مسرت محسوس کریں گے۔ اس لیے ناقدین کو بھی ان کے فکر و نظر کو پرکھنے اور جانچنے اور ان کا معیار مقرر کرنے میں آسانی ہوگی۔ آپ کو یاد نہیں رہا کہ کچھ دن پیشتر خود میں نے یہ تجویز پیش کی تھی۔ بہت دن ہوئے جامعہ دہلی مرحوم نے فراق وغیرہ سے ان کے اپنے فن کے بارے میں لکھوایا تھا

باقر مہدی کے خط میں اختر الایمان کے متعلق مولانا آزاد کی رائے پڑھ کر سخت حیرت ہوئی۔ نہ جانے انھوں نے یہ رائے

ذوق کے کس معیار پر قائم کی۔ اگر ابوالکلام کی ترکیب درست ہے تو اختر الایمان کی ترکیب بھی درست ہے۔

آپ کی یہ رائے ٹھیک ہے کہ سخن گسترانہ بات کے مصنف بدلتے رہیں اس سے تازگی اور تنوع برقرار رہے گا۔ لیکن شاہد صدیقی صاحب نے جو بات اس موضوع کے تحت کہی ہے وہ ناتمام ہے۔ اسے پڑھنے کے بعد یہ خیال ہوتا ہے کہ خود سخن گسترانہ بات لکھنے والوں پر QUALIFICATION کی شرط لگادی جائے۔ اصل ضرورت QUALIFICATION یا بڑی بڑی جامعاتی اسناد کی نہیں بلکہ علم و مطالعہ کے صحیح زاویہ سے استعمال، اپنی زبان کی روح، عصری ضرورتوں، تقاضوں اور سیلانات کو سامنے رکھ کر گہری نظر، ایمانداری، فراخدلی اور وسیع المشربی سے تنقید کرنے اور جس کسی کے پاس "ادبی جمال" ہو اسے اجاگر کرنے کی اور کج رویوں اور کوتاہیوں پر ٹوکنے کی ضرورت ہے ــــ کئی نقاد اعلیٰ علمی سند اور وسیع مطالعہ رکھنے کے باوجود تنگ نظری، جانبداری اور بے ذوقی کا اظہار کرتے ہیں، مثلاً ڈاکٹر سید عبداللہ نے ۱۹۵۶ء کی شاعری پر مضمون لکھا تھا تو انھیں ادبِ لطیف اور ماہ نو کے باہر کوئی شاعر نظر نہیں آیا۔ اسی طرح خلیل الرحمان اعظمی نے سردار جعفری اور سجاد ظہیر اور بعض دوسرے ناقدین کی جانبداری اور تنگ نظری پر مقالہ لکھا ــــ اور صحیح لکھا، مگر خود بھی جانبداری اور احباب نوازی کے شکار ہوگئے ــــ شکیل الرحمان اور خلیل الرحمان اعظمی نے غزل پر مضامین لکھے تو اس میں خالص نظم گو شعراء کو بھی شریک کرلیا، مثلاً کیفی اعظمی وغیرہ کو۔ یہی حال احتشام حسین اور ڈاکٹر محمد حسن کا بھی ہے۔

اسی طرح اصول تنقید بھی شاعر شاعر کی نسبت سے بدلتا رہتا ہے اس کی مثال سردار جعفری کی فیض اور فراق پر تنقیدیں ہیں۔ بعض ناقدین چند معروف شاعروں اور ادیبوں کے نام لکھنے کے بعد لکھ دیتے ہیں کہ فہرست اور بڑی بھی ہوسکتی ہے، گویا انھوں نے تنقید لکھ کر پڑھنے والوں اور شاعروں اور ادیبوں پر بڑا احسان کیا ہے ــــ اگر پڑھنے والے خود فہرست کو مرتب کرسکتے ہیں تو ان کی تنقیدی نگارشات کا کیا مطلب ہے ــــ کیا ضرورت ہے اس کے بغیر بھی پڑھنے والا کچھ نہ کچھ رائے رکھتا ہی ہوگا؟

بہرحال شاہد صدیقی نے جو سوال اٹھایا ہے وہ لائق توجہ ہے۔ نیا نہیں ہے اس سے پیشتر وامق جونپوری اور خلیل الرحمان اعظمی وغیرہ اس موضوع پر لکھ چکے ہیں۔ پھر بھی ضرورت اس ذہنیت کے خلاف جنگ کرنے کی ہے۔ ہمارے ناقدین کو چاہیئے کہ انگریزی ادب کے حوالوں کے ساتھ انگریزی کی تعریفی، تخلیقی اور ایماندار تنقید کا معیار بھی سامنے رکھیں۔

اساتذہ کی نوک جھونک زبان و ادب کے طالب علموں کے لیے دلچسپ بھی ہوتی ہے اور فائدہ مند بھی، مگر فراق صاحب اور اثر صاحب کی نوک جھونک، انشا اور مصحفی کے تبذیل معرکوں کی یاد تازہ کردیتی ہے۔ ہم ان دونوں بزرگوں سے علمی بحث اور لطیف طنز و خوش مذاقی کی توقع رکھتے ہیں۔ مگر افسوس کہ ذاتیات کا عنصر اتنا غالب اور ہلکی سطح پر اتر آتا ہے کہ بسا اوقات رنج ہوتا ہے۔ اثر لکھنوی صاحب فراق گورکھپوری صاحب کو شاعر مانیں یا نہ مانیں وہ تمام غلطیوں اور کوتاہیوں کے باوجود اسی طرح بے مثال شاعر ہیں، جیسے حضرت اثر لکھنوی اپنے اشعار کی بے کیفی اور بے اثری کے باوجود ایک مسلم الثبوت استاد فن اور

نکتہ دانِ زبان و سخن ہیں، رہی عروض کی غلطیوں کی بات تو بڑے بڑے اساتذہ اس سے نہ بچ سکے۔ خود خلیل نے کہا تھا۔ انا اکبر من العروض۔ اور مولانا روم بھی کہہ گئے ہیں۔ من نہ دانم فاعلاتن فاعلات ــــ اب کہیئے؟

اثر صاحب نے جو نا پختہ غزل پیش فرمائی ہے ــ وہ واقعی اکثر و بیشتر صحیح اشعار پر مشتمل ہے۔ مگر ایسے اشعار بھی موجود ہیں جو محل نظر ہیں۔ اسی طرح انھوں نے فراق صاحب کی غزل پر جو تنقید و اصلاح فرمائی ہے۔ کئی جگہ درست ہے مگر کئی جگہ خود انھوں نے ٹھوکریں کھائی ہیں۔ بعض جگہ ان کا اعتراض محض مکتبۂ فکر کے اختلاف کے باعث ہے ــ میں اس پر بھی کچھ لکھتا۔ مگر بیماری خط کی طوالت سے مانع ہے۔

ہاں حمید الدین شاہد کا مضمون پڑھ کر ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ انجمن ترقی اردو اور ادارۂ ادبیات اردو مکتبہ صفی اورنگ آبادی۔ ساجد، باقی، علی منظور اور ان کے علاوہ حیدرآباد کے زندہ شاعروں کے کلام کو شائع کرنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔

متین سرروش

کراچی ــــــــــــــــــــــــ ۱۰ جون ۵۰ء

اس بار "صبا" کا دورنگی ٹائیٹل واقعی خوبصورت ہے۔ "سخن گسترانہ بات" وقیع اور جاندار ہونی چاہیئے ــــ اس وقت تو اس کی حیثیت ٹیبل ٹاک سے زیادہ نہیں ــــ جناب اثر اور فراق کی چشمک ــــ بس عبرت ہی عبرت ہے اس میں ــــ ایسا احساس برتری نفسیاتی طور پر شکست خوردگی کا غماز ہوتا ہے۔ اب وہ جناب اثر ہوں کہ جناب فراق! اگر یہ تنقیدی انداز نیاز فتحپوری اور پروفیسر رشید لکھنوی کا سا ہوتا تو کوئی بات بھی تھی مگر اس سے تو بچگانہ مرحوم کے "ادب خبیث" کی یاد تازہ ہوتی ہے، غرض کہ یہ بحث ادبی کم اور شخصی زیادہ ہے جس سے بدمزگی اور بے لطفی پیدا ہوتی ہے۔

"شفیدبوش" کے کردار کی ORIGINALITY پر مجھے شبہ ہے۔ ادھر شوکت صدیقی بھی کچھ اس سے ملتا جلتا کیرکٹر پیش کر چکے اور ویسے یہ "پیرو فی مغربی" والی بات ہے۔ حصۂ نظم نسبتاً زیادہ جاندار ہے۔ آپ نے لکھنے والوں سے بجا طور پر اپیل کی ہے۔ کاش یہ صدا بہ صحرا نہ ثابت ہو۔ منظور رضیائی

تشہیر کا بہترین ذریعہ

مدینہ اڈورٹائزرز

۱۰ - شیرشاہ روڈ، حیدرآباد (دکن)

تبصرے

کتب خانہ نواب سالار جنگ کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست

مرتبہ:- نصیر الدین ہاشمی
سائز:- بڑی تقطیع
صفحات:- ۸۴۶
کاغذ:- اچھا، کتابت وطباعت: اوسط
قیمت:- (مجلد مع گرد پوش) بارہ روپے
ملنے کا پتہ:- دفتر معتمد کمیٹی نواب سالار جنگ مرحوم دیوان ڈیوڑھی۔ حیدرآباد دکن۔

نواب سالار جنگ ان جاگیرداروں میں تھے جو آرٹ اور ادب کا اچھا ذوق اور اس سے زیادہ آرٹ اور ادب کے شہ کاروں اور نایاب نمونوں کے جمع کرنے کا شوق رکھتے ہیں۔ انھوں نے قدیم آثار، تاریخی نوادر، مشرقی اور مغربی آرٹ کے انمول اور نایاب نمونوں کا جو ذخیرہ چھوڑا تھا، اس کو ایک میوزیم کی صورت میں ترتیب دیا جا چکا ہے۔ جس کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ کس طرح ایک فرد واحد اتنا متنوع اور بیش بہا ذخیرہ جمع کرنے میں کامیاب ہو سکا۔

میوزیم کی طرح سالار جنگ کا کتب خانہ بھی نایاب مخطوطات اور کم یاب مطبوعات سے بھرا پڑا ہے۔ مرتب فہرست کا بیان ہے کہ انگریزی کتابوں کے علاوہ کتب خانے میں عربی، فارسی، ہندی اور ترکی کی تیس ہزار سے زائد کتابیں موجود ہیں۔ جن میں دس ہزار مخطوطات ہیں۔ اردو کے (۱۰۴۵) مخطوطات بھی ان میں شامل ہیں جن کی وضاحت زیر نظر ہے۔

تعجب ہے کہ اسٹیٹ کمیٹی نے کتب خانے کی ترتیب، فہرستوں کی تیاری، مخطوطات کی اشاعت کے کام میں اتنی دلچسپی نہیں لی جتنی کہ میوزیم کی ترتیب میں لی۔ حالانکہ اس کام کی اہمیت بھی کچھ کم نہیں۔ قابل مبارکباد ہے انجمن ترقی اردو حیدرآباد جس نے مخطوطات کی فہرست کی ضرورت کو محسوس کیا اور اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے کر بعجلت ممکنہ سرانجام دیا۔

نصیر الدین ہاشمی مرتب فہرست ہذا دکن کے محقق کی حیثیت سے ہندوستان گیر شہرت رکھتے ہیں۔ انھوں نے یورپ میں اپنے قیام کے زمانے میں انگلستان، اسکاٹ لینڈ اور پیرس کے کتب خانوں کا تفصیلی معائنہ کیا اور اپنی تحقیق کا حاصل "یورپ میں دکھنی مخطوطات" کے نام سے ۱۹۳۲ء میں شائع کیا۔ موصوف کے اپنے تحقیقی کام کے دوران انڈیا آفس، رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن، بوڈلین

لائبریری آکسفورڈ، یونیورسٹی لائبریری کیمبرج، قومی کتب خانہ پیرس وغیرہ کی فہرستوں کا بھی گہری نظر سے مطالعہ کیا اور تصحیح کا کام انجام دیا جس کو بہت سراہا گیا۔ زیر تبصرہ فہرست کی ترتیب کے وقت موصوف کو اپنے اس تجربے سے فائدہ اٹھانے کا پورا پورا موقع ملا۔ انھوں نے بڑی حد تک ڈیوی کے اصول کے مطابق جو فہرستوں کی ترتیب کے وقت پیش نظر رکھا جاتا ہے یہ فہرست مرتب کی ہے لیکن بعض مقامات پر اس سے انحراف بھی کیا ہے۔

ہاشمی صاحب نے کتابوں کو ۱۰ ابواب اور ۲۴ فنون کے تحت تقسیم کیا ہے۔ اصول ابواب یہ ہیں۔ اسلامیات، مذہب فلسفہ و منطق، سائنس، کارآمد فنون، فنون لطیفہ، لسانیات، ادبیات اور تاریخ۔ ان میں سے ہر باب کی پھر ذیلی تقسیم الگ کی گئی ہے۔

فہرست کا آغاز نواب مہدی نواز جنگ بہادر صدر نشین کمیٹی کے پیش لفظ سے ہوتا ہے جس کے بعد حبیب الرحمٰن صاحب نے عرض حال کے عنوان کے تحت فہرست کی ترتیب کے بارے میں اظہار خیال کیا، جس کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ انجمن ترقی اردو حیدرآباد نے چار پانچ سال ہوئے فیصلہ کیا تھا کہ حیدرآباد کے مشہور کتب خانوں میں جو اردو مخطوطات ہیں ان کی وضاحتی فہرستیں تیار کروائی جائیں۔ اس سلسلہ میں کتب خانۂ آصفیہ، عجائب خانہ حیدرآباد، سنٹرل ریکارڈ آفس اور کتب خانہ سالار جنگ کی قلمی اور کتابوں کی فہرستیں مکمل ہو چکی ہیں۔ ہم انجمن کو اس اہم کام کی تکمیل پر مبارک باد دیتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ دوسری فہرستیں بھی جلد از جلد شائع ہو جائیں گی۔ یہ کام عام آدمی کی دلچسپی کا نہ سہی انجمن کا بہت بڑا کارنامہ سمجھا جائے گا۔

پیش لفظ اور عرض حال کے بعد ہاشمی صاحب نے حرف آغاز اور کچھ فہرست ہذا کے بارے میں کے عنوانات کے تحت نواب سالار جنگ کے خاندانی حالات پر روشنی ڈالی ہے اور ان کے کارناموں کو اجاگر کیا ہے۔

فہرست کے محاسن اور معائب کا صحیح اندازہ تو اس وقت ہوگا جب وہ استعمال میں آئے گی۔ اور اس کے مندرجات اصل مخطوطات کے مطابق پائے جائیں گے لیکن جہاں تک صرف فہرست کے مطالعہ سے اس کے متعلق عام رائے قائم کرنے کا تعلق ہے کہا جا سکتا ہے اس کی ترتیب میں ہاشمی صاحب کو بڑی محنت اور دماغ سوزی کرنی پڑی ہے اور انھوں نے اس کو زیادہ سے زیادہ مفید، کارآمد اور معلوماتی بنانے کی ممکنہ کوشش کی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ محققین کے لیے یہ فہرست بہت کارآمد ثابت ہوگی اور اس سے وہ نہ صرف ایک بڑے کتب خانے کے مخطوطات سے واقف ہو سکیں گے بلکہ تحقیق کے لیے نئے نئے میدان ہاتھ آئیں گے۔

فہرست میں ایک چیز بری طرح کھٹکتی ہے اور وہ ہے زبان۔ نظر ثانی کے موقع پر کم از کم صحت زبان پر توجہ دینا بہت ضروری ہے۔ بحالت موجودہ پڑھنے والے کو زبان کی غلطیوں کی وجہ سے الجھن سی ہوتی ہے۔

کتاب کی قیمت بھی کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ ایک فہرست پر ہی کیا موقوف "سلسلۂ یوسفیہ" کے تحت جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں ان سب کی قیمتیں بہت زیادہ ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کتابوں کو شائع ہوئے برسوں ہوئے لیکن ابھی

تک ان کی بڑی تعداد فروخت نہ ہو سکی۔ یہ کتابیں جب چھپی تھیں اس وقت لاگت بھی بہت کم آتی تھی۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ قیمتوں پر نظر ثانی کی جائے تاکہ یہ کتابیں زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکیں، اور نواب سالار جنگ نے جس مقصد کے تحت ان کی اشاعت کی اسکیم بنائی تھی وہ پورا ہو۔

حسینی شاہد

اردو شاعروں کا انتخابی سلسلہ

۱۔ اختر شیرانی (۲) فیض (۳) مجاز (۴) اختر انصاری
۵۔ شاد عارفی (۶) احمد ندیم قاسمی (۷) مجروح (۸) عرش ملسیانی

انجمن ترقی اردو ہند (علیگڈھ) نے اردو کے جدید شاعروں کا انتخابی سلسلہ شائع کیا ہے۔ ہر کتاب کی قیمت بارہ آنے ہے اب تک اس سلسلے کی مندرجہ بالا آٹھ کتابیں شائع ہوئی ہیں، ابھی پہلے سیٹ میں جذبی، مخدوم، وجد، کیفی، جاں نثار اور اثر کی کتابیں زیر طبع ہیں۔ انجمن نے یہ سلسلہ اس لیے شروع کیا ہے کہ وہ لوگ جو کسی مجبوری کی بنا پر کسی شاعر کا سارا کلام نہیں پڑھ سکتے اس شاعر کے رنگ سے متعارف ہو جائیں اور انھیں اس کے تفصیلی مطالعے کی خواہش پیدا ہو، جدید شاعروں کو زیادہ سے زیادہ عوام تک پہنچانے کے لیے یہ ایک اچھا اور لائق ستائش اقدام ہے۔ جسے عوام میں یقینی طور پر مقبول ہونا چاہیے۔

تمام شاعروں کا انتخاب کلام بڑی حد تک نمائندہ ہے لیکن کہیں کہیں کمی ہے کہ بعض شاعروں کے انتخاب میں ان کی کچھ نمائندہ چیزیں نہیں آسکی ہیں۔ مثلاً اختر شیرانی کے انتخاب میں "اٹھ ساقی اٹھ للوارا اٹھا" کی کمی کھٹکتی ہے۔ مجاز کے انتخاب میں "آوارہ" "نوراں" "رات اور ریل" کی عدم شمولیت حیرت ناک ہے، اس طرح زندہ شاعروں کے انتخاب میں بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید انتخاب کے وقت ان کی اپنی رائے نہیں لی گئی۔ اس طرح سے یہ انتخاب زیادہ نمائندہ ہو سکتا تھا۔

نئے شاعروں کے اس انتخابی سلسلے کی زیر طبع کتابوں میں اثر لکھنوی کا نام دیکھ کر تعجب ہوتا ہے، اگر اس سلسلے میں اثر کو شریک کیا جا سکتا ہے تو پھر جگر، فراق، جوش اور دوسرے پرانے شاعروں کو بھی شامل کیا جانا چاہیے، اسی طرح پروفیسر شور، نشور واحدی، اختر الایمان، ن۔م۔ راشد، ساحر لدھیانوی اور چند دوسرے شعراء کا انتخاب بھی ضروری ہے کیونکہ سرور صاحب نے تعارف میں یہ لکھا ہے کہ کوشش کی گئی ہے کہ اس سلسلے میں موجودہ دور کے سارے اہم اور قابل ذکر شعراء آجائیں۔ میرا خیال ہے کہ ان شاعروں کے نہ ہونے سے ہماری جدید شاعری کے بہت سے پہلو تشنہ اور کئی گوشے تاریکی میں رہ جائیں گے۔

اس انتخابی سلسلے میں شاد عارفی کا نام دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کیونکہ ہمارے ادب میں پچھلے چند سال پہلے جو تنگ نظری آگئی تھی اس کی وجہ سے کئی اہم شاعر اور ادیب نظر انداز کر دیے گئے تھے۔ بعض کو اب تک ان کا مناسب مقام نہیں مل سکا ہے۔ مگر یہ امر بجائے خود کافی امید افزا ہے کہ اب ہمارے نقادوں اور انتخاب کرنے والوں کی نظریں شاد عارفی پر بھی پڑنے لگی ہیں۔ شاد عارفی کا لب و لہجہ، اسلوب، مزاج بالکل نیا ہے، اسی طرح ان کی شاعری کے موضوعات میں بھی غضب کا نیا پن اور انفرادیت ہے یکساں آوازوں کے ہجوم میں اگر کوئی آواز سب سے الگ سنائی دے تو وہ فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے اور شاد عارفی کی

یہی خوبی ہے یہی نہیں بلکہ ان کی نظمیں اور غزلیں ہماری شاعری میں لب و لہجے، انداز و اسلوب اور موضوعات کے تنوع کی بھی ضامن ہیں۔ امید کی جاسکتی ہے کہ انجمن ترقی اردو ہند ایسے اور دوسرے شعراء کو بھی نظر انداز نہ کرے گی جن کے پاس انفرادیت اور اپنی آواز ہے۔

انجمن ترقی اردو کا یہ انتخاب ایک مستحسن اقدام ہے اور یہ انتخابی سلسلہ اس قابل ہے کہ ہر ادب دوست اور باذوق کے گھر کی زینت بن سکے قیمت بھی زیادہ نہیں ہے اس لیے آسانی سے طلباء عوام اور خواص سب ہی ان کتابوں کو خرید کر انجمن کے اشاعتی پروگرام کی توسیع میں ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔

آخر میں ایک بات اور عرض کرنی ہے وہ یہ کہ اگر اس طرح کلاسیکی شعراء کا انتخاب بھی شائع کیا جائے تو اردو زبان و ادب کی بڑی خدمت ہوگی کیونکہ بہت سے قدیم شعراء کے دواوین اس قدر کم یاب ہیں کہ بازار میں تو کیا بڑے بڑے کتب خانوں میں نہیں ملتے۔ اگر انجمن اس طرف توجہ کرے تو قدیم شعراء کے انتخابی سلسلے کو بھی ایسی ہی مقبولیت حاصل ہو سکتی ہے۔ (وحید اختر)

آگ میں پھول

حمایت علی شاعر کا پہلا مجموعہ کلام اور ان کی نو دس سال کی فکر سخن کا نچوڑ ہے۔ حمایت علی شاعر کا نام ہندوستان اور پاکستان کے ادبی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ان کی نظمیں اور غزلیں آئے دن مختلف معیاری ادبی جرائد میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ حمایت علی شاعر ان شاعروں میں سے ہے جن کے لیے شاعری نہ تو ذریعہ معاش ہوتی ہے اور نہ محض دل بہلائی اور وقت گذاری کا ذریعہ۔ ان کی شاعری میں کسک اور خلش ہے جو زندگی کے فوارد سے پیدا ہوتی ہے۔

اس مجموعے میں مختلف رومانی اور سماجی نظموں اور غزلوں، رباعیوں اور قطعات کے علاوہ ایک طویل نظم "بنگال سے کوریا تک" بھی شامل ہے جو غالباً اس مجموعے کی سب سے اچھی نظم ہے۔ امن کے موضوع پر اردو میں بے شمار نظمیں لکھی ہیں لیکن ان میں سے صرف چند ہی پڑھی جانے کے قابل ہیں اور ان میں سے ایک "بنگال سے کوریا تک" بھی ہے۔ یہ نظم ایک کہانی ہے جو آپ بیتی کے انداز میں بیان کی گئی ہے۔ بنگال اور کوریا اس میں تمثیلی علامتیں ہیں۔ اس نظم کے کئی حصے ہیں۔ ہر حصہ اپنی جگہ ایک مکمل نظم ہے ہر نظم دوسری نظم سے ایسی پیوست ہے کہ تسلسل اور روانی میں کہیں فرق نہیں آیا ہے یہ نظم بہت زیادہ طویل بھی ہو سکتی تھی لیکن شاعر نے اختصار اور ایجاز سے کام لے کر اسے طولانی ہونے سے بچالیا۔ اس کی وجہ سے نظم کا مجموعی تاثر بہت بڑھ گیا ہے۔ اس نظم کا ہیرو جنگ میں شریک رہ کر اس کی تباہ کاریاں دیکھنے کے بعد گھر لوٹتا ہے۔ جنگ کے اثرات اس کے وطن تک پہنچ چکے ہیں۔ "دوسری زندگی" کے دو بند ملاحظہ کیجیے۔

زندگی کے ہر ایک گوشے میں — ایک اک چیز کا رد و باری تھی
کھیت کے کھیت تھے گھروں میں دفن — اور بھوکی غذائی ساری تھی
ہر تجوری میں قبر کی مانند — موت کی جونے فیس جاری تھی
دیر تا کعبہ کوئی روکاں ہو — ہر طرف تو رکی شہ یاری تھی

جنگ تو ختم ہو چکی تھی مگر ـــــ جنگ ایک ایک گھر میں جاری تھی
تنگ آ کر نہ جانے کتنی بار ـــــ دل نے سانسوں کا ساتھ چھوڑ دیا
لیکن اکثر مرے عزائم کو ـــــ ایک بچی نے ہنس کے توڑ دیا

جنگ کے معاشی اثرات کی تصویر مختصر لفظوں میں کس خوبی سے کھینچ دی گئی ہے آخری دو شعروں میں ایک طویل کہانی سموئی ہوئی ہے۔

شعلۂ بے دود، آخر شب، ادھ جلی کہانی، شکست خواب، اجنبی مہمان، اور غم فردا بھی اس مجموعے کی اچھی نظمیں ہیں ان نظموں کی موسیقیت، خیالات کی ترتیب اور توازن، لب و لہجے کی گھلاوٹ اور تاثر کی شدت ایسی خصوصیات ہیں جو ہماری توجہ کو مرکوز کر لیتی ہیں۔

حمایت علی شاعر ترقی پسند شاعر ہیں ایک مخصوص فلسفۂ حیات پر ایقان رکھتے ہیں جو "اشتراکیت" ہے۔ غم ذات ہو، غم حیات ہو یا غم کائنات وہ ہر مسئلہ کو ایک خاص زاویہ سے دیکھتے ہیں۔ جا بجا جمالیاتی اور معاشی قدروں کے ربط کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اس کتاب کے پیش لفظ میں ایک جگہ لکھتے ہیں "میں نے زندگی کو ہمیشہ مادی حدود میں دیکھا ہے اور انہیں مادی حدود میں اس کی تصویر کشی کی ہے۔ میرا محبوب وہی ہے جو زندگی میں میرا محبوب ہے۔ میری طرح گوشت و پوست کا انسان۔ ظاہر ہے کہ اس کے محسوسات انسانی محسوسات سے مختلف نہیں ہو سکتے۔ اگر مجھے اس سے عشق ہے تو اس نے بھی مجھے چاہا ہے۔ اگر میں اسے اپنا نہ سکا تو میں نے گریباں چاک کرنے کی بجائے سماجی حالات میں اپنے عشق کی ناکامی کا جواز تلاش کیا ہے اور اسے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اور اگر میں نے اسے پا لیا ہے تو سماجی زندگی میں اس کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔" اس اقتباس کو پیش کرنے سے میرا مقصد آپ کو اس مجموعے کی شاعری کے حدود اربع سے واقف کرانا تھا۔ اسے پڑھنے کے بعد آپ کو اس مجموعے میں کوئی خالص عشقیہ یا رومانی یا منظری نظم نہ ملے تو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ عشق اور حسن کے تعلق سے شاعر کا رویہ وہی ہے جو ساحر لدھیانوی کا ہے۔ شاعر نے بھی "حسن زر پرست" کو اپنی بعض نظموں کا موضوع بنایا ہے۔

زندگی کے بارے میں کسی فلسفے کو اپنانا بری بات نہیں ہے۔ لیکن جب کوئی فلسفۂ حیات اپنی روشنی سے حیات و کائنات کے مختلف مظاہر کو ان کی اصلی صورت میں بے نقاب کرنے کی بجائے من کار کی آنکھ پر رنگین عینک چڑھا دیتا ہے تو فن کا انجام ظاہر ہے۔ اشتراکی حقیقت نگاری کے نام پر ہمارے ادب میں کیسے کیسے "انمول جواہر" بھرے پڑے ہیں وہ سمجھ دار اور متوازن دل و دماغ رکھنے والے قارئین کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہیں ـــــ چنانچہ ساحر لدھیانوی کی طرح حمایت علی شاعر بھی کہیں کہیں کلیت کا شکار ہو گئے ہیں..... اگر کوئی چاند کو دیکھ کر اس دیوے سے کڑھنے لگے کہ وہ روٹی کے مشابہ ہے مگر اس کی بھوک نہیں مٹا سکتا تو آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہو سکتا ہے ـــ آپ صرف اس سے ہمدردی کر سکتے ہیں۔ اس کا علاج تو کسی مطب ہی میں ممکن ہے۔ شاعر کی نظم "مژدۂ نو" میں اسی قسم کی جذباتیت جھلکتی ہے کسی سیاسی یا معاشی نظام کو ہدف ملامت بنانے کے لیے اپنی بچی کی موت کا سہارا لینے میں اور جاگیرداری نظام کو مطعون کرنے کی خاطر تاج محل کی تحقیر روا رکھنے

میں ایک سی ذہنیتیں کارفرما نظر آتی ہیں۔ اس قسم کی جذباتیت نے شاعر کے لہجے میں کہیں کہیں حقارت آمیز تلخی پیدا کر دی ہے بڑا شاعر بننے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے وہ اس تلخی کو رنگینی سے بدلیں اور فن کی نشاطی اور جمالیاتی قدروں کا احترام کرنا سیکھیں۔

حمایت علی شاعر فطرتاً نظم گو شاعر ہیں۔ غزل یار باشی کی صنف سے ان کا مزاج نہیں ملتا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو ایسی اصناف کے پیچھے ضائع نہ کریں۔ اردو میں اچھی طویل نظموں کی بہت کمی ہے وہ اس طرف توجہ کریں تو اپنے لیے بہت جلد جگہ پیدا کر لے سکتے ہیں۔ اس موقع پر میں نظم نگاری کے تعلق سے چند باتیں عرض کروں گا۔ آٹھ دس سال پہلے اردو شاعری میں موضوع اور ہیئت کے کچھ تجربے کیے گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاعری میں اظہار خیال کے لیے نئی راہیں ٹٹولی جا رہی ہیں۔ لیکن ادھر عرصہ سے یہ جستجو قریب قریب مفقود ہو گئی ہے۔ آج کے نظم نگار شاعر مقررہ اصناف سے انحراف کرتے جھجکتے ہیں۔ کبھی جی چاہا تو بندوں میں اشعار کی ترتیب اور تعداد میں کچھ ردو بدل کر لیا اور بس۔ اردو شاعری میں نظم آزاد اور نظم معریٰ کے پروان چڑھنے کے امکان بہت وسیع ہیں۔ اس طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے اس سے قطع نظر نظم نگاری کے لوازم اور فنی اصولوں سے بالعموم شعرا بے نیازی برتتے ہیں۔ غنیمت ہے کہ حمایت علی شاعر کی نظموں میں ایسی بے راہ روی زیادہ بار نہیں پا سکی ہے مگر بند بازی اور قافیہ پیمائی ان کی بعض نظموں میں بھی نظر آتی ہے۔ کہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محض ذرا سی عدم توجہی سے اچھی خاصی نظم مکمل من پارہ بننے سے رہ گئی ہے۔ "بگال سے کوریا تک" کا خاتمہ موثر اور فطری نہیں ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ نظم کا اختتام قاری کی توقع کے مطابق ہی ہو لیکن نظم اس طرح ختم ہونی چاہیئے کہ پڑھنے والا محسوس کرے کہ اس نظم کا خاتمہ اس سے ہٹ کر ہو ہی نہیں سکتا۔

ان امور کے علاوہ زبان و بیان کی بعض ایسی خامیاں اس مجموعے میں نظر آتی ہیں جو ذرا سی توجہ سے دور ہو سکتی تھیں۔

حمایت علی شاعر کا اپنا اسلوب یا اسٹائل ابھی پوری طرح متعین نہیں ہوا ہے۔ ان کے لب و لہجے میں کبھی اور ساحر کے لہجہ کی آمیزش ہے۔ کہیں کہیں فیض کی صدائے بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ شاعر نے اس مجموعے کو چھپوانے میں جلدی کی۔ عام طور پر شاعر پہلا مجموعہ چھپوانے کے بعد مطمئن یا مایوس ہو کر بیٹھ رہتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ حمایت علی شاعر اس روایت کو نہیں اپنائیں گے۔ ابھی اردو شاعری کو ان سے اچھی توقعات وابستہ ہیں۔

"آگ میں پھول" صوری اور معنوی ہر لحاظ سے اردو شاعری کے قارئین کے لیے ایک حسین تحفہ ہے۔ کتابت صاف ستھری ہے مگر غلطیوں سے بالکل پاک بھی نہیں ہے۔ طباعت نفیس کاغذ اوسط درجے کا اور سرورق خوبصورت ہے اس کتاب کا حجم ۱۹۲ صفحے ہے اس لحاظ سے قیمت تین روپے نامناسب نہیں ہے۔

مغنی تبسم

انجمن ترقی اردو ہند

کے

ادبی حلقہ

کی

رکنیت قبول فرمایئے

انجمن کی نئی کتابیں

زنداں نامہ	فیض احمد فیض	۲/۴
ذکر حافظ	سجاد ظہیر	۲/۴
نقد غالب	مرتبہ۔ مختار الدین احمد	-/۱۰
ترقی پسند ادب (نیا ایڈیشن)	سردار جعفری	۳/۱۲
تنقیدیں (مضامین)	خورشید الاسلام	۴/۸
یادگار حالی (نیا ایڈیشن)	صالحہ عابد حسین	۴/۴
انتخاب جدید	آل احمد سرور	-/۳
انتخاب کلام میر	مولوی عبدالحق	۲/۸
اردو صرف و نحو	〃 〃 〃	-/۱
اسلام کے علاوہ مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ	ڈاکٹر محمد عزیز	۵/۸

شرائط رکنیت ادبی حلقہ

- حلقے کی رکنیت کی فیس سالانہ -/۳۰ روپے ہے۔ یکمشت یا دس دس کی چار ماہی قسطوں میں۔
- حلقہ ممبروں کو ہر سال -/۲۵ روپے کی کتابیں اور انجمن کا ششماہی رسالہ قیمتی -/۱۰ روپے اور انجمن کا ہفتہ وار اخبار قیمتی -/۳ روپے کل -/۳۸ روپے کی مطبوعات پیش کرے گا۔
- ارکان کو بقدر -/۲۵ روپے انجمن کی مطبوعات میں سے اپنی پسند کی کتابیں منتخب کرنے کا حق ہوگا۔ محصول ڈاک رکن کے ذمہ ہوگا۔
- -/۳۰ روپے کے عوض -/۳۸ روپے کی مطبوعات مندرجہ بالا صورت میں دی جائیں گی۔ اس کے علاوہ اگر کوئی رکن انجمن کی دوسری کتابیں خریدے گا تو ۲۵ فیصد کمیشن دیا جائے گا۔

مزید تفصیلات کے لیے:۔

جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ

سے خط و کتابت کیجئے

ادارۂ ادبیات اُردو کی جدید مطبوعات

گاندھی جی ادارے کی طرف سے بچوں اور بالغوں کے لیے مشاہیر ہند کے حالات زندگی سادہ اور آسان زبان میں مرتب کرا کے شائع کی جاتی ہیں۔ چنانچہ حیدرآباد کے ایک پختہ مشق شاعر خورشید احمد صاحب جامی سے گاندھی جی کی حیات نظم میں مرتب کرائی اور یہ کتاب گاندھی جی کی ایک عمدہ تصویر کے ساتھ بچوں اور ان پڑھ بالغوں کی خاطر جلی حروف میں خاص اہتمام سے چھپوائی گئی ہے: صفحات ۳۲: قیمت بارہ آنے۔

سروجنی دیوی مولوی وزیر حسن صاحب نے اپنے مخصوص انداز بیان میں مرتب کی ہے جو اردو دنیا میں ایک خاصہ کی چیز ہے۔ یوں بھی اردو میں سروجنی نائیڈو پر اب تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔ وزیر حسن صاحب چونکہ ان کے چھوٹے فرزند کے دوست ہیں اس لیے انھوں نے سروجنی نائیڈو کی نجی زندگی بڑی خوبی سے قلم بند کی ہے اور ان کی نظموں سے بھی بہت پر لطف اور اہم مواد حاصل کیا ہے۔ اس کتاب میں سروجنی نائیڈو کے بعض نظموں کے ترجمے بھی شامل ہیں: صفحات ۱۰۵: قیمت دو روپے۔

حیدرآباد کے بڑے لوگ ان میں نہایت اہم اور مفید تاریخی و سیاسی و سماجی معلومات نہایت بے باکی سے قلم بند کی گئی ہیں اور جدید حیدرآباد کے معماروں کا تذکرہ درج ہو گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے حیدرآباد کی گذشتہ نصف صدی کی زندگی سامنے آجاتی ہے، اور ان اصحاب کی خدمات اجاگر ہو جاتی ہیں جنھوں نے اس مرحوم ریاست کی بیداری اور ہمہ جہتی ترقی کے لیے بے لوث خدمات انجام دیں۔ دکن کی تاریخ میں یہ کتاب ایک خاص اہمیت اور خصوصیت کی حامل رہے گی: صفحات: ۱۵۲: قیمت دو روپے۔

میاں دادخاں سیاح اور ان کا کلام مرتبہ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی ایم اے، پی ایچ ڈی پروفیسر اردو جوگیشوری کالج بمبئی۔ میاں دادخاں سیاح اردو کے ایک عجیب و غریب شاعر، ادیب اور سیاح تھے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب نے ان کے نام بہت دلچسپ خطوط لکھے ہیں اور سیاح نے غالب کے مخالفوں کے دندان شکن تحریری جواب دیئے ہیں۔ اتفاق سے سیاح کا دیوان دستیاب ہو گیا ہے جس کو مدنی صاحب نے بڑی محنت سے مرتب کر لیا اور سیاح کے حالات زندگی بھی معتبر ذرائع سے فراہم کر اور ایک تحقیقی کتاب کی صورت میں لکھ کر ادارہ کو اشاعت کے لیے روانہ کیے۔ یہ کتاب ادارے نے خاص اہتمام کے ساتھ با تصویر شائع کی جو تاریخ ادب اردو اور غالبیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک نادر تحفہ ہے: بڑی سائز، صفحات: ۹۶: قیمت دو روپے۔

ملنے کا پتہ

ادارۂ ادبیات اردو خیریت آباد حیدرآباد دکن

انفیوزا

اِنفلوئنزا کے حملہ سے بچاتی ہے!

● **انفیوزا** جسم میں مدافعت کی طاقت پیدا کرتی ہے اور انفلوئنزا کو پیدا نہیں ہونے دیتی حفظ ماتقدم کے طور پر اس کی ایک خوراک رات کو سوتے وقت استعمال کریں۔

● مرض کی صورت میں انفیوزا کی تین خوراکیں صبح دوپہر اور شام استعمال کریں۔ یہ مرض کو جڑ سے دور کرے گی۔ اور کمزوری پیدا نہیں ہونے دے گی۔

● انفیوزا ہمدرد لیبارٹریز کی ایک قابل فخر پیشکش ہے جس میں قدیم فراست اور تجربہ کو جدید فنی دانائی کی ٹکنیک سے کامیابی کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔

● انفیوزا ہمدرد کے ان تجربات کا حاصل ہے جو اسے ۱۹۱۸ کے انفلوئنزا کی خطرناک وبا سے کامیاب مقابلہ میں حاصل ہوئے تھے۔ ۱۹۱۸ میں بھی اس وبا کے کامیاب علاج کا سہرا طبِ یونانی کے سر بندھا تھا۔ اور اب بھی تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی۔



قیمت فی شیشی
صرف ۲/- روپیہ

اپنے قریبی اسٹاکسٹ سے طلب فرمائیں۔

ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی

احمد اینڈ کمپنی ڈسٹری بیوٹرس، ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی فون نمبر (۲۶۰۵۷) نزد تاج آرکارٹر قریب مسجد جامع مارکٹ حیدرآباد

صبا

دی نظام شوگر فیکٹری لمیٹڈ

مشرق کا سب سے بڑا شکر سازی کا کارخانہ

شکر اور الکحل

منظور شدہ سرمایہ —— ۲،۰۰،۰۰،۰۰۰ روپے

سرمایۂ جاریہ —— ۱،۴۶،۴۰،۰۰۰ روپے

ہیڈ آفس: عابد روڈ، پوسٹ باکس ۱۰۹۔ حیدرآباد دکن۔ کیبل اور ٹیلیگرام "SUGAR"

فیکٹری: شکر نگر۔ سنٹرل ریلوے۔ فون ۴۷۰۴، ۴۹۳۷، ۴۸۷۶، ۴۹۹۶

مینجنگ ایجنٹس کے نمائندے

دی حیدرآباد کنسٹرکشن کمپنی لمیٹڈ

ہر قسم کی انجینیرنگ کنسٹرکشن کے ماہران خصوصی

عابد روڈ۔ حیدرآباد۔ دکن

ادارۂ ادبیات اردو کی جدید مطبوعات

گاندھی جی ادارہ کی طرف سے بچوں اور بالغوں کے لیے مشاہیر ہند کے حالات زندگی سادہ اور آسان زبان میں مرتب کرا کے شائع کی جاتی ہیں۔ چنانچہ حیدرآباد کے ایک پختہ مشق شاعر خورشید احمد صاحب جامی سے گاندھی جی کی حیات نظم میں مرتب کرائی اور یہ کتاب گاندھی جی کی ایک عمدہ تصویر کے ساتھ بچوں اور ان پڑھ بالغوں کی خاطر جلی حروف میں خاص اہتمام سے چھپوائی گئی ہے۔ صفحات ۳۲ قیمت بارہ آنے۔

سروجنی دیوی مولوی زبیر حسن صاحب نے اپنے مخصوص انداز بیان میں مرتب کی ہے جو اردو دنیا میں ایک خاصہ کی چیز ہے۔ یوں بھی اردو میں سروجنی نائیڈو پر اب تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔ زبیر حسن صاحب چونکہ ان کے چھوٹے فرزند کے دوست ہیں اس لیے انھوں نے سروجنی نائیڈو کی نجی زندگی بڑی خوبی سے قلم بند کی ہے۔ اور ان کی نظموں پر بھی بہت پُر لطف اور اہم مواد حاصل کیا ہے۔ اس کتاب میں سروجنی نائیڈو کے بعض نظموں کے ترجمے بھی شامل ہیں: صفحات ۱۰۵: قیمت ایک روپے۔

حیدرآباد کے بڑے لوگ ان میں نہایت اہم اور مفید تاریخی و سیاسی و سماجی معلومات نہایت بے باکی سے قلم بند کی گئی ہیں اور عہد حیدرآباد کے معماروں کا تذکرہ درج کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے حیدرآباد کی گذشتہ نصف صدی کی زندگی سامنے آجاتی ہے اور ان اصحاب کی خدمات اجاگر ہو جاتی ہیں جنھوں نے اس مرحوم ریاست کی بیداری اور ہمہ جہتی ترقی کے لیے بے لوث خدمات انجام دیں۔ دکن کی تاریخ میں یہ کتاب ایک خاص اہمیت اور خصوصیت کی حامل رہے گی: صفحات ۱۵۲: قیمت دو روپے۔

میاں دادخاں سیاح اور ان کا کلام مرتبہ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی ایم اے، پی ایچ ڈی پروفیسر اردو جوگیشور کالج بمبئی میاں دادخاں سیاح اردو کے ایک عجیب و غریب شاعر، ادیب اور سیاح تھے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب نے ان کے نام بہت دلچسپ خطوط لکھے ہیں اور سیاح نے غالب کے مخالفوں کے دندان شکن تحریری جوابات دیئے ہیں۔ اتفاق سے سیاح کا دیوان دستیاب ہو گیا ہے جس کو مدنی صاحب نے بڑی محنت سے مرتب کر لیا اور سیاح کے حالات زندگی بھی معتبر ذرائع سے فراہم کر کے اور ایک تحقیقی کتاب کی صورت میں لکھ کر ادارہ کو اشاعت کے لیے روانہ کیے۔ یہ کتاب ادارہ نے خاص اہتمام کے ساتھ باتصویر شائع کی جو تاریخ ادب اردو اور غالبیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک نادر تحفہ ہے: بڑی سائز: صفحات ۹۶: قیمت دو روپے۔

ملنے کا پتہ

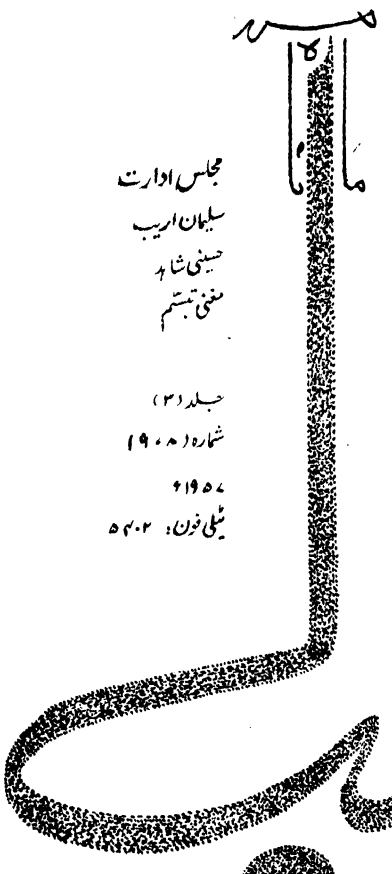
ادارۂ ادبیات اردو خیریت آباد حیدرآباد دکن

منظور شدہ محکمۂ تعلیمات حکومت آندھرا پردیش

مجلسِ مشاورت

حبیب الرحمٰن
فضل الرحمٰن
ڈاکٹر یوسف حسین خاں
ڈاکٹر طاہر علی خاں مسلم
رائے جانکی پرشاد
سیّد محمد
عالم خوندمیری
ڈاکٹر حفیظ قتیل
دلاور علی خاں
رضیہ بیگم
خازن: عابد علی خاں
کاتب: محمد مظہر

زرسالانہ
ہند و پاک سے آٹھ روپے
ششماہی پانچ روپے
قیمت: ۵۰ نئے پیسے



مجلس ادارت

سلیمان اریب
حسینی شاہد
مغنی تبسم

جلد (۳)
شمارہ (۸، ۹)
۱۹۵۷ء
ٹیلی فون: ۵۴۰۲



پرنٹر پبلشر۔ سلیمان اریب ۔ ۱۷ مجری گاہ معظم جاہی مارکٹ ۔ مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد دکن

اس شمارے میں

پہلی بات ۵
قرارداد یوم اردو ۶

● تحفے

عید اور خود کشی — مخدوم محی الدین ۷

● مضامین

اردو شاعری میں سکول کی روایت — ڈاکٹر محمد عقیل ۱۱
انیسویں صدی کے نصف اول کی دہلی کی ایک جھلک — ضیاالحسن فاروقی ۲۱
سفینۂ غزل اور فیض — شمیم کرہانی ۲۸
غالب — نئی کتاب — شکیل الرحمٰن ۳۰

● غزلیں

نشور واحدی — محمود ایاز ۳۴
مظہر امام — اظہر عید
قمر ساحری — غفور انیس تا
زبیر رضوی — بشیر بدر ۴۱

● افسانہ

جو مئے تھی بہادی مٹی میں — علی حماد عباسی ۴۲

● ڈرامہ

کانٹوں میں پھول — ہربنس سنگھ دوست ۴۹

● طنزیہ

مقدمے — احمد جمال پاشا ۶۲

● نظمیں

تلاش سایۂ گل میں — مغنی تبسم ۶۶
حال دل لکھوں کیوں کر — بشر نواز ۶۷
موڑ — راشد آذر ۶۹

● سنہ ۱۸۵۷ء

۱۸۵۷ء — گوپی چند نارنگ ۷۱
۱۸۵۷ء اور حیدرآباد — نصیرالدین ہاشمی ۷۹
اندولن — عزیز قیسی ۸۷
تنویر آزادی — حسن نعیم ۸۹

● تبصرے

زنداں نامہ — وجیہ اختر ۹۰
ذکر حافظ — عالم خوندمیری تا
سقراط — غلام ربانی ۹۷

● بازگشت

شاہد صدیقی — شفیقہ فرحت ۹۸
شکیل الرحمٰن — مظہر امام
ہربنس سنگھ دوست — حسن نعیم تا
احمد جمال پاشا — دانش فرازی
عبدالستار فاروقی — مقتدیٰ علی
کوثر چاندپوری — رام لعل ۱۰۳

فیض الانصاری

پہلی باتیں

● گو ہم نے یہ تصفیہ کیا تھا کہ اگست کا شمارہ جنگ آزادی نمبر ہوگا لیکن اہل قلم حضرات کی عدم دلچسپی نے ہمیں جھوٹا بنا دیا۔ باوجود کوشش کے ہم مضامین (سوائے دو مضامین کے جو شریک اشاعت ہیں) کی فراہمی میں ناکام رہے اور اب مجبوراً عام نمبر پیش کر رہے ہیں لیکن یہ عام نمبر بھی کافی جاندار اور متنوع ہے اور ہمیں یقین ہے کہ پچھلے شماروں کی طرح اسے بھی پسند کیا جائے گا۔ اسے اگست اور ستمبر کا مشترکہ شمارہ سمجھنا چاہیئے۔

ہمارا خیال ہے کہ آزادی نمبر پیش نہ کر سکنے کی تلافی اسی طرح ہو سکتی ہے کہ پچھلی ایک صدی میں اردو شاعری میں جو وطن دوستی کا سنہایاں رجحان رہا ہے یا جنگ آزادی میں اردو شاعری نے جو قابل فخر حصہ لیا ہے اسے ضبط تحریر میں لایا جائے اور اس موضوع کے تحت آنے والی نظموں اور غزلوں وغیرہ کا انتخاب پیش کیا جائے چنانچہ شاعری کے انتخاب کا کام شروع ہو چکا ہے اور مختلف ادوار مثلاً ۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۰ء تک کے دور پر حسینی شاہد، ۱۹۰۰ء سے ۱۹۱۴ء تک کے دور پر وحید اختر، ۱۹۱۴ء سے ۱۹۳۶ء تک کے دور پر اختر حسن، ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک کے دور پر عالم خوندمیری اور ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء تک کے دور پر معنی مبسم اور اس کے علاوہ غزل کے تعلق سے ڈاکٹر حفیظ قتیل اور شاہد صدیقی سے مضامین لکھوائے جا رہے ہیں ـــــ دیکھئے مضمون نگار حضرات اس بار بھی ہمیں سرخرو ہونے کا موقع دیتے ہیں یا نہیں؟

● ابن احمد تاب اور شانتی رنجن بھٹا چاریہ ہمارے دو پرانے ساتھی ہیں۔ تاب حیدرآباد کے ایک مقبول غزل گو شاعر ہیں اور شانتی رنجن بنگالی اور ساتھ ہی اردو کے ایک نوجوان ادیب ہیں اور کلکتہ سے "فلم ویکلی" نکالتے ہیں۔ افسوس کہ یہ دونوں ساتھی دق جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ان کو موت کے منہ سے بچانے کے لیے ہماری اپیل ہے کہ ہم ادیب اور شاعر ـــــ خاص طور پر وہ جو صاحب استطاعت ہیں ـــ ان کی تھوڑی بہت مالی امداد کریں تاکہ ان کا معقول علاج ہو سکے اور یہ صحت یاب ہو کر ادب کی کچھ خدمت کر سکیں۔

تاب کو حمید الدین شاہد لکچرار چادر گھاٹ کالج حیدرآباد دکن کی معرفت اور شانتی رنجن کو پوسٹ سوناپور ضلع ۲۴ پرگنہ (مغربی بنگال) کے پتے پر روپیہ بھیجا جا سکتا ہے۔

قرارداد "یوم اردو"

انجمن ترقی اردو ہند کی اردو کانفرنسیں منعقدہ ۳۰، ۴ جولائی میں طے پایا تھا کہ ۲۵ اگست ۱۹۵۷ء کو ملک بھر میں "یوم اردو" منایا جائے۔ اس سلسلے میں اس روز جو قرارداد جلسوں میں پاس کرکے مقامی حکومت اور مرکزی حکومت کو بھیجی جائے گی وہ اشاعت کے لیے ہمارے پاس بھیجی گئی ہے اور اسے ہم ذیل میں شائع کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

یہ جلسہ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اردو ایک جدید ہندوستانی زبان اور ملک کی قومی زبانوں میں سے ہے۔ یہ ہندوستان کی مشترک تہذیب کی ایک قابل فخر یادگار ہے۔ اسے ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں، عیسائیوں کی متحدہ کوششوں نے جنم دیا اور پروان چڑھایا۔ اس کا ایک شاندار ادبی سرمایہ ہے جو انسان دوستی، جمہوریت پسندی اور اخلاقی اقدار کی وجہ سے ملک و قوم کے لیے باعث فخر ہے۔ اس کے بولنے، سمجھنے اور لکھنے پڑھنے والے ہمارے ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں اور خصوصاً دہلی، اتر پردیش اور بہار میں قابل لحاظ تعداد میں آباد ہیں۔ دفاتر، عدالتوں، علمی کاموں اور تعلیم کی ہر منزل کے لیے اس کا استعمال ہوا ہے۔ ہندی، انگریزی اور بنگالی کے بعد سب سے زیادہ اخبار اس زبان میں شائع ہوتے ہیں اردو بولنے والے ملک کی سب سے بڑی لسانی اقلیت ہیں جس کی تعداد ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے اعتبار سے بھی ایک کروڑ ۲۵ لاکھ ہے۔

یہ جلسہ محسوس کرتا ہے کہ آزادی کے بعد اردو دشمن طبقہ کو اس کا حق نہیں ملا اور مختلف ریاستوں میں اس کے استعمال پر پابندیاں لگائی گئیں جس کی وجہ سے اردو داں طبقہ قومی تعمیر میں جوش و خروش سے حصہ نہیں لے سکا اور اس طرح پورے ملک کو نقصان ہوا۔

یہ جلسہ صدر جمہوریہ کو یاد دلاتا ہے کہ انجمن ترقی اردو ہند کا وفد فروری ۱۹۵۴ء میں ان سے ملا تھا اس کی درخواست کا ابھی تک کوئی جواب نہیں ملا جس کی وجہ سے اردو داں طبقہ میں بڑی بددلی اور بے اطمینانی ہے۔

یہ جلسہ صدر سے درخواست کرتا ہے کہ وہ دہلی، اتر پردیش اور بہار میں دفعہ ۳۴۷ کے تحت اردو کو اردو رسم الخط میں سرکاری اور علاقائی زبان قرار دیں تاکہ ابتدائی و ثانوی تعلیم اردو میں ہو سکے اور عدالتوں، دفاتر اور سرکاری اعلانات میں اردو کا بھی استعمال ہو اور اس طرح اردو داں طبقہ کو قومی زندگی میں پورا حصہ لینے کا موقع مل سکے۔

نیز یہ جلسہ پنجاب، آندھرا، بمبئی، راجستھان، مدھیہ پردیش، میسور، مدراس اور کلکتہ میں بھی اردو بولنے والوں کے لیے سہولتیں فراہم کرنے کی درخواست کرتا ہے۔

یہ جلسہ امید کرتا ہے کہ صدر جمہوریہ جلد سے جلد اس مسئلے پر توجہ کرکے ہندوستان کی اس سب سے بڑی لسانی اقلیت کی خلش اور بے چینی کو دور کریں گے تاکہ وہ پورے جوش اور انہماک کے ساتھ وطن اور انسانیت کی خدمت کر سکے۔

(آل احمد سرور)

مخدوم محی الدین

عید اور خودکشی

سب لوگ اسے "موتے" یعنی ماں کہہ کر پکارتے تھے، دیانا میں پوں تو ہر شرک پر، ہر گلی اور ہر نکڑ پر ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ درجہ کے کیفے مل جاتے ہیں، مگر موتے کے کیفے کا جواب نہ تھا۔ بعضہ میں چار پانچ دن تو بالکل سناٹا رہتا۔ البتہ جمعہ کو جو تنخواہ کا دن ہوتا چہل پہل رہتی، چھوٹا سا کمرہ جس میں بمشکل دس پندرہ آدمی بیٹھ سکتے تھے، بھرا ہوا نظر آتا۔ جمعہ، سنیچر اور اتوار کی شام میں عام طور سے مزدور، ملازم پیشہ، چھوٹے کاروباری، طالب علم، بے روزگار اور کچھ شتبلڑکے اور لڑکیاں جمع ہوتے، رات گئے تک کھاتے پیتے، ہنستے بولتے، ناچتے گاتے اور چلے جاتے، جھگڑے بھی ہوتے مگر شاذ و نادر۔

غریب طالب علم ہارمونیکا اور دوسرے ساز بجاتے، یہی اس کیفے کا آرکسٹرا تھا، حاضرین ان پر ناچتے گاتے اور طالب علموں کو سب لوگ حسب مقدور پیسے دیتے جن سے وہ اپنے جیب خرچ اور تعلیمی اخراجات کی تھوڑی بہت تکمیل کر لیتے تھے۔ یہ کیفے میرے ہوٹل کے نیچے فرش پر تھا، پراٹر (PRATER) دیانا کا ۶ مربع میل باغ سامنے ہی ہے، جہاں ہر روز میلہ سا لگا رہتا ہے، طرح طرح کے کھیل تماشے بچوں سے لے کر بوڑھوں تک کو اپنی طرف کھینچتے ہیں، یہیں وہ (۲۱۱) فٹ اونچی بڑا پہیا ہے جس میں جھولے لگے ہوئے ہیں اور جہاں سے لوگ رات میں جگمگاتے دیانا کا نظارہ کرتے ہیں۔ ہوٹل آتے جاتے موتے سے میری علیک سلیک ہو جایا کرتی تھی اور کبھی کبھی موتے کے کیفے میں بھی وقت گذار لیا کرتا تھا۔ تنہائی بے اکثر اکیلی ہی رہتیں، مجھ سے میرے حالات پوچھتیں، معنی خیز انداز میں یہ سوال بھی کر دیتیں "کیا تم دیانا میں خوش ہو؟"

میں نے موتے کو ہنستے ہوئے بہت کم دیکھا۔ ایک گاہک کی کیفے میں نہ ہوتا مگر وہ ایران جیسے سفید فریم کا چشمہ لگا کر حساب کتاب میں یا پکوان میں مصروف رہتیں۔ موتے کے دوستوں میں دو تین افراد ایسے تھے جو اکثر پابندی سے شام میں آیا کرتے تھے، ایک تو اسٹل کی نرس تھی، عمر ہوگی کوئی ۳۵ کے لگ بھگ، شوہر کو چھوڑ چکی تھی، کبھی کبھی اسے مردوں سے نفرت ہے، ڈیوٹی ختم کر کے آنے کے بعد یہ میز صاف کرنے، کھانے پینے کی چیزیں میز پر لا کر رکھنے کا کام کر دیا کرتی تھی اس کے چہرے پر راہبوں کی سی اداسی اور اس کی نیلی آنکھوں میں غم کا گہرا سمندر نظر آتا تھا، بہت کم ہنستی، جب ہنستی تو معلوم ہوتا کہ طنز کر رہی ہے۔ اب اس کا دنیا میں کوئی نہیں تھا، سوائے اس کی دس برس کی بچی کے اور منہ بولی ماں موتے کے، دوسرا جرنلسٹ تھا جس کی عمر (۴۰) سے متجاوز تھی جس کے سر میں ایک بال بھی نہ تھا انگریزی بہت اچھی بولتا تھا، وہ مجھے ہمیشہ "ڈیر سٹر" کہہ کر مخاطب کرتا

انگریز قوم کا بے انتہا شاخواں، چرچل سے لے کر میری پولٹ تک سب انگریز اس کی نظر میں برابر تھے، چرچل کی مخالفت کر دو تو وہ برا مانتا، کہتا کہ کوئی انگریز برا نہیں۔ جس انگریز قوم نے مجھے جنگ میں پناہ دی وہ بری نہیں ہو سکتی۔" جب ہٹلر نے میرے خاندان کے ۲۳ آدمیوں کو یہودی کہہ کر بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا تو کس نے مجھے پناہ دی؟" وہ پوچھتا جنگ کے دوران میں بچ بچا کر، لندن پہنچ گیا تھا جہاں کسی جہاز میں اسے نوکری مل گئی تھی، وہ یہودی تھا اور اکیلا تھا۔ ہفتہ میں ایک دو دن اس کیفے میں نظر آتا بہت خاطر مدارات کرتا، کبھی کبھی وہ مجھے دوسرے کیفے میں لے جا کر میرے ساتھ بلیرڈ کھیلتا۔

دسمبر میں حضرت مسیح کی ولادت کی عید کے زمانے میں ایک شام میں موتے کے کیفے میں بیٹھا ہوا تھا، نرس اور جرنلسٹ بھی تھے، موتے میری میز پر بیٹھی ہمیشہ کی طرح میرے گھر اور بچوں کے بارے میں سوالات پوچھ رہی تھی اس شام وہ ٹھہر ٹھہر کر، رک رک کر سوالات کرتی جا رہی تھی پھر دریافت کیا، "کیا تمھیں ہماری یہ عید پسند ہے؟" میں نے کہا کیوں نہیں۔" لوگ بہت خوش و خرم نظر آتے ہیں، بڑی دھوم دھام ہے شہر میں، اس جواب پر موتے رونے لگی، آنسوؤں کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے وہ میز سے اٹھ کر کاؤنٹر پر چلی گئی۔

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ موتے کیوں رو رہی ہے۔ جرنلسٹ کے چہرے پر غیر معمولی سنجیدگی تھی اتنا باتونی شخص بالکل چپ تھا۔ میں نے نرس سے پوچھا کیا بات ہے موتے رو کیوں رہی ہے؟ غمگین آنکھوں سے اس نے مجھ پر طنزیہ نظر ڈال کر کہا "آپ جانتے ہیں موتے کا کیفے کیسے چلتا ہے، کرسمس کی عید تو ایسی عید ہے جس میں خاندان والے سال میں ایک بار ملتے ہیں، ماں باپ بچے رشتہ دار یہ عید گھر میں مناتے ہیں۔ تمھیں تو معلوم ہے موتے کا شوہر اور اس کا اکلوتا بیٹا جنگ میں مارے جا چکے ہیں، موتے کو ان کی یاد آ رہی ہوگی، مفلسی اتنی ہے کہ سردیوں میں موتے کے پاس گرم کوٹ اور جوتا خریدنے کے لیے پیسہ نہیں، اب وہ روئے نہیں تو کیا کرے۔" میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا، گرم کوٹ اور جوتا، کون دلائے گا۔ موتے کو اور اس کے بیٹے اور شوہر کو کون واپس لوٹائے گا۔ . . . . . رات میں ولیم نے کھانے کی دعوت دی تھی، وہ اور میں ٹرام میں ویانا کی سڑکوں پر سے گذر رہے تھے، ویانا کی دکانیں اپنی سجاوٹ میں مشہور ہیں عید کے موقع پر ان کا حسن دوبالا ہو گیا تھا، کرسمس کا درخت اور اس میں رنگ برنگی، روشن قمقمے اکثر دکانوں میں دکھائی دے رہے تھے۔ حضرت مسیح سے پہلے بھی پیگن (PAGAN) عہد میں یورپ کے لوگ یہ تہوار منایا کرتے تھے۔ جاڑوں کی اندھیری رات میں چراغ جلا کر تاریکی کو دور کیا جاتا، انڈے اور خرگوش کھائے جاتے، یہ راتیں افزائش نسل انسانی کے لیے بہت موزوں سمجھی جاتی تھیں، گو اب مذہبی رنگ چڑھ گیا ہے مگر لوگ کھانے پینے، پہننے اوڑھنے اور ملنے ملانے پر خرچ کرتے ہیں، سال میں ایک عید مناتے ہیں مگر ڈھنگ کے ساتھ، سال بھر اس کا اہتمام رہتا ہے۔

ولیم کوئلر کی کمان کا خاندانی مزدور تھا، اس کے بیوی بچے ویانا میں ہی رہتے تھے وہ کمان کنوں کے انٹرنیشنل میں کام کرتا تھا

ولیم، فیاض اور دردمند دل رکھتا تھا، چھوٹا ہو یا بڑا ہر شخص سے خندہ پیشانی اور گرم جوشی سے ملتا، جب وہ ہنستا تو آنکھ کے گوشوں پر لال لال جھریاں شعاعوں کی طرح نکل آتیں، وہ مجھ سے اکثر کہا کرتا MAK, I AM THE FIRST ENGLISH COLONY AND NOT YOU یعنی میک، انگریز کا پہلا غلام میں ہوں، تم نہیں ہو، اس کے چہرے پر محبت یا نفرت کے دو ہی جذبے حاوی رہتے مگر جب کچھ زیادہ پی لیتا تو آنکھیں بند کر کے دلیش زبان کا ایک درد انگیز گیت گانے لگتا جو کوئلہ کی کانوں کے مزدوروں کی مناجات ہے جس کا متن لال جھنڈا اور دھن مسیحی دعاؤں کی سی ہے، اس وقت اس کے چہرے کی ایک ایک شکن کان کنی کی دردبھری داستان بن کر ابھرتی جاتی۔ ولیم کے پاس اور احباب بھی مدعو تھے، جاپانی، انڈونیشیائی، عرب، اسرائیلی، ہسپانوی اور آسٹریائی، کھانے پینے، گپ شپ اور گیتوں کے بعد بالآخر وہ مقام آیا جہاں ولیم نے اپنا محبوب دلیش گیت کان کنوں کی مناجات شروع کیا، محفل پر افسردگی چھانے لگی، محفل میں ویانا کی پولیس کا ڈاکٹر بھی موجود تھا جو ویانا کے ایسے ایسے حالات بیان کر رہا تھا کہ عید کی رات بھیانک معلوم ہونے لگی، اس نے کہا ویانا میں کرسمس کی رات جتنی خودکشیاں ہوتی ہیں سال بھر میں کسی اور وقت نہیں ہوتیں اس رات کا ایک اور ہی ویانا نظاروں کے سامنے تھا، بیتھوون اور موزارٹ کی رسیلی دھنوں کا نہیں بلکہ ان کی خودکشی کا۔

میں اور ایک اسرائیلی دوست جیبی ٹکسی لے کر اپنے ہوٹل آنے کے ارادے سے ولیم کے گھر سے نکل گئے۔

شوفر سے میں نے پوچھا کیا تم انگریزی جانتے ہو، اشارہ سے جواب دیا نہیں، میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی جرمن میں پتہ بتایا اور ہم چلے۔ میں اور جیبی عرب اسرائیل اور امن پر باتیں کر رہے تھے، شوفر ہماری باتوں سے دلچسپی لے رہا تھا، اس سے رہا نہ گیا، انگریزی میں اس نے پوچھا کیا بات کر رہے ہیں آپ، کس ملک کے ہیں آپ لوگ"

ہم نے کہا، تم تو انگریزی نہیں جانتے تھے؟ اس نے کہا "اتنی تو بول لیتا ہوں"

"میں ہندوستانی ہوں اور یہ اسرائیلی عرب ہیں"

اس نے بھی اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ میں اب جنگ نہیں چاہتا، میں کسی کو بھی خاکی وردی میں دیکھنا نہیں چاہتا، موٹر چلانے کے ساتھ ساتھ وہ اپنی کہانی بھی سناتا جا رہا تھا، اس نے کہا ایک اتوار کو میری شادی ہوئی اور پیر کو مجھے فوج میں بھرتی کر کے محاذ جنگ پر بھیج دیا گیا۔ گیارہ برس جنگ کے ہولناک تجربہ کے بعد جب میں ویانا لوٹا تو شہر میں میرا گھر نہیں تھا، جرمن نازیوں نے جاتے جاتے بم گرا کر نیست و نابود کر دیا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ میری بیوی کہاں ہے۔ میری بیٹی گیارہ برس کی ہو چکی تھی، میں اسے دیکھنے کے لیے بے چین تھا مگر پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے آخر کار میں اپنی بیوی اور بیٹی سے ملا، اب میں نہیں چاہتا کہ جنگ ہو، وہ ہندوستان اور امن کی پالیسی کا بھی بیچ بیچ میں ذکر کرتا، ہوٹل پر موٹر رکی، شوفر نے اتر کر دروازہ کھولا اور پرتپاک طریقے سے مصافحہ کیا اور کہا آسٹریا اور ہندوستان دوست ہیں، آپ ہندوستان کے عوام کو ہمارا پیام پہنچائیں کہ ہم دوستی اور امن چاہتے ہیں"

شوفر کی گفتگو سے متاثر خاموش ہم اپنے کمروں کو چلے گئے۔

میرے ذہن کے افق پر رہ رہ کر ڈاکٹر کا وہ جملا بھرتا "دیانا میں عید کی رات جتنی خودکشیاں ہوتی ہیں کبھی اور نہیں ہوتیں" بار بار موتے کا خیال آنے لگتا۔ "کیا تمھیں ہماری یہ عید پسند ہے" اس کا آنسو چھپا کر کوٹر پر چلا جانا، سب ایک بار جاگ اٹھتا، اس کا سوال اور اس کے آنسو اب کسی تشریح کے محتاج نہ تھے۔

طبیعت میں تھکن تھی، دیر سے اٹھا، صبح اداس اداس سی نظر آرہی تھی، ناشتہ کے ارادے سے موتے کے کیفے میں گیا، دروازہ بند تھا، تشویش شروع ہوگئی، موتے کبھی اس وقت دروازہ بند تو نہیں رکھتی تھی۔

تین دن تک کیفے بند رہا۔ عید ختم ہوگئی، کاروبار شروع ہوگئے سڑکوں اور گلی کوچوں کی ویرانی جاتی رہی مگر موتے کا کیفے بند تھا، میں نے واردات اور دوستوں کو سنائی وہ کیا کرتے سن کر چپ چاپ ہو جاتے۔

یکم جنوری کو ہم سمیرنگ پہاڑ پر سال نو منانے کے لیے صبح صبح ہوٹل سے نکلے، سردی غضب کی تھی، گھر کی چھتیں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں، سڑکوں اور فٹ پاتھ پر بھی برف کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ ننگ درختوں کی تیز تیز شاخیں آسمان کو تک رہی تھیں، جب موتے کے کیفے کے پاس سے گذرا تو دروازہ کھلی پایا دروازہ کھول کر بے تحاشہ اندر چلا گیا، اندھیرا اندھیرا تھا باورچی خانہ میں بتی جل رہی تھی، میری خوشی کی اور حیرت کی انتہا نہ تھی کہ موتے زندہ ہے، میں نے اونچی آواز میں بے چینی سے کہا "اتنے دنوں سے تو کہاں تھی موتے" اس نے کچھ جواب نہ دیا صرف یہ کہا "سوپ گرم گرم ہے پیتے جاؤ" نہ گرم کوٹ ہٹانا جوتا، نہ شوہر ہٹانا بیٹا، موتے تین دن تک کمرے میں بند پڑی رہی۔ نرس اور جرنلسٹ پھر نہیں ملے۔

●

پچھلے تین ماہ کے عرصہ میں مولانا آزاد سبحانی جیسے بڑے عالم دین اور خطیب، صاحبزادہ آفتاب علی خاں حیدرآبادی جیسے خوشگو شاعر، مجید لاہوری اور احمق پھپھوندوی جیسے اونچے درجے کے مزاح نگار شاعروں اور آغا طاہر نبیرۂ آزاد کے انتقال کی خبریں یقیناً ہم سب کے لیے ایک بڑا سانحہ ہے ؎

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آب بقائے دوام لے ساقی

ڈاکٹر محمد عقیل

اردو شاعری میں اسکول کی روایت

"ہر دور کے پسندیدہ رجحانات اس دور کے حکومت کرنے والے طبقے کے پسندیدہ رجحانات ہوا کرتے ہیں"[1]
(کارل مارکس اور اینگلز)

اگر لکھنؤ میں اودھ شاہی اقتدار کے ساتھ ساتھ اردو شاعری نے اپنا رخ نہ بدلا ہوتا تو شاید اردو شاعری میں اسکولوں کا سوال شعوری طور پر پیدا ہی نہ ہوتا۔ کیا لکھنو سے پہلے اردو شاعری کے اسکول قائم تھے؟۔ کیا کسی نے شعر و ادب کا مطالعہ اس نظر سے کرنے کی کوشش کی تھی؟۔ کیا دہلی میں اردو شاعری کا چرچا شروع ہونے پر یا اس سے پہلے لکھنو میں شعر و ادب کی محفلیں نہ تھیں یا دہلوی شعرا کے لکھنؤ آنے سے پہلے لکھنؤ اور نواح لکھنو میں شعر و شاعری کا وہی معیار تھا جو دہلی میں تھا؟ ان میں سے بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا پتہ کچھ نہیں چلتا اور جن کا پتہ چلتا بھی ہے ان کے لیے تاریخی شواہد کا مہیا کرنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ کام اس لیے بھی آسان نہیں ہے کہ تذکرے جو اس سلسلے میں مدد دے سکتے تھے وہ تقریباً اس موقع پر خاموش ہیں[2]۔ صرف قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ ممکن نہیں کہ اردو زبان یا تاریخ جو اس وقت شمالی ہندوستان کی محبوب اور مروجہ زبان ہو رہی تھی اس کا لکھنو میں وجود نہ رہا ہو۔ ہمارا خیال ہے کہ یہاں کا طرز سخن تھوڑے بہت مقامی، لسانی اور صوتی تغیر کے ساتھ دہلی

---

[1] MANIFESTO OF THE COMMUNIST PARTY - تھوڑے بہت تغیر کے ساتھ یہی بات محمد حسین آزاد کے یہاں بھی ملتی ہے۔ آب حیات میں لکھتے ہیں "جب رواج عالم کا راجہ ہولی کھیلتا ہے تو بڑے بڑے معقول و وضع دار اشخاص اس کی چھینٹیں فخر سمجھ کر سر و دستار پر لیتے ہیں۔ پس وہ اور ان کے معاصر ملک چھوڑ کر کہاں چلے جاتے۔" (آب حیات)

[2] خم خانۂ جاوید میں لالہ سری رام نے قاضی مولوی محمد صادق خاں اختر کا تذکرہ کیا ہے جو غازی الدین حیدر کے زمانے میں لکھنو میں تھے۔ ان کے اشعار اختر لکھنوی نے "چمن بے مثال" میں شائع کیے ہیں جنھیں پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ نے انھیں کا رنگ اپنایا تھا اختر بنگال کے رہنے والے تھے معلوم نہیں کہ یہ طرز سخن انھوں نے کہاں پیدا کیا تھا۔

سے متاثر ہوگا اور اسی کی تائید کرتا رہا ہوگا کیوں؟ کیونکہ شخصی حکومت میں درباری مذاق بہت کچھ حکومت کے مذاق پر مبنی ہوا کرتا ہے۔ یہ بات یہاں پر بڑی سادگی کے ساتھ کہہ دی گئی ہے اور اپنی بات منوانے کے لیے مارکس اور اینگلز اور آزاد کے اقتباسات پہلے ہی پیش کر دیئے گئے ہیں۔ مگر کیا ضروری ہے کہ ان اقتباسات کو کلیۃً مان کر انسان اپنے ذہن میں ابھرے ہوئے سوالات کو منتشر کر دے۔ ایسا ممکن نہیں ہے اور اس لیے ہمیں اردو شاعری کے ہر دور کے سماج، اس کے انفرادی مذاق اور حکومت کے اثرات کا جائزہ لینا پڑے گا۔

اردو کے علمبرداروں کا ایک بڑا طبقہ پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے جو اس بات پر مُصر ہے کہ اردو شاعری میں اسکول کی روایت بے بنیاد ہے۔ اس میں الجھنا محض تضیع اوقات ہے یہ ہمارے مختلف طبقات میں بٹے رہنے کا سبب ہے کہ ہم اس نہج پر سوچنے کے عادی ہو گئے ہیں ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ جو باتیں دہلی میں شاعری کے لیے ضروری سمجھی گئیں وہی لکھنو میں بھی ضروری قرار دی گئیں، شاعری کے بنیادی اصول جو دہلی میں قائم کیے گئے وہ لکھنو میں بھی برتے گئے۔ بحر، وزن، شہرت اور فن کا لحاظ دہلی میں بھی رکھا گیا، لکھنو میں بھی یہی چیزیں شعر و سخن کی زیب و زینت کا باعث سمجھی جاتی رہیں۔ اگر محض ردیف قافیہ اور رکیک خیالات کی ایک خاص قسم کی پابندی اور استعمال ہی لکھنو کو دہلی سے ممیّز کرتے ہیں تو ردیف کا دم چھلّا اور اس طرح کے خیالات دہلی میں بھی شاہ نصیر، ذوق اور ظفر کے یہاں مل جاتے ہیں۔ چنانچہ جن لوگوں نے ان شعراء کے کلام کا اچھی طرح مطالعہ کیا ہوگا وہ اچھی طرح واقف ہوں گے کہ "فلک پہ بجلی، زمیں پہ باراں" اور "سر پر طرّہ ہار گلے میں" بعینہٖ ویسے ہی ہیں جیسے "مہمان ہنستے بولتے، زنجیر پاؤں میں، اور چھوٹی بیگم وغیرہ یا پھر داخلیت اور خارجیت کا فرق لکھنو کو شعبی حکومت سے وابستہ کر کے جو بہت سی باتیں وہاں کی شاعری کے متعلق کہی گئی ہیں یا تصوف اور غیر تصوّف کی بحثیں چھیڑ کر جو لکھنو اور دہلی کے طرز فکر کو علاحدہ کر کے دیکھا جاتا ہے اس میں کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے جس کی بناء پر ہم اردو شاعری کو دو اسکولوں میں تقسیم کر دیں۔

یہ تمام باتیں ایسے پڑھے لکھے افراد کے منہ سے بعض اوقات سننے میں آتی ہیں جن کی نظر وسیع ہے اور انھوں نے بلا سوچے سمجھے یہ رائے قائم نہ کی ہوگی مگر اردو کا ایک طالب علم عجیب کشمکش میں پڑ جاتا ہے۔ جب وہ اردو شاعری کی ارتقائی تاریخ پر اس نظر سے غور کرنے لگتا ہے۔

اردو کہیں سے شروع ہوتی ہو مگر یہ بات متفقہ طور پر طے ہے کہ اردو شاعری کو اپنے ابتدائی دور میں جو عروج حاصل ہوا ہے مجموعی طور پر وہ دکن ہی میں حاصل ہوا ہے۔ دکن کا پہلا شاعر کوئی رہا ہو مگر ابھی تک جس کا دیوان مکمل ملتا ہے وہ محمد قلی قطب شاہ ہے اور اس کے ساتھ اس کے درباری اور غیر درباری شعراء کی ایک بڑی تعداد ہے اس وقت یہاں اردو شاعری کی کوئی کسوٹی نہیں تھی۔ شعراء کے سامنے فارسی نمونے تھے یا پھر مقامی زبانوں کے اثرات کام کرتے رہے ہوں گے اور ان مقامی زبانوں کے ساتھ ساتھ وہ تمام خیالات ہوں گے جو ان شاعروں کے ذہن میں ہندوستانی سرزمین، ہندوستانی

ذہنیت، ہندوستان کی زبانوں کے باکمال شعرا کے نمونے جن سے کہ یہ لوگ واقف رہے ہوں گے، اسلام، فارسی اور عربی خیالات اور ان لوگوں کی زبان جن کے سنانے کے لیے اس وقت کے شعرا شعر و سخن سے دلچسپی لے رہے ہوں گے۔ یہ دور ۱۸۵۷ء کا دور ہے جب اردو زبان، لسانیات، اس وقت کے سماج کے محدود شعور، الفاظ اور خیالات کے حسب استعداد ذخیرے، اس دور کے لوگوں کے احساس جمال اور زندگی کے حقائق کی غیر پختہ واقفیت کے ساتھ دھیرے دھیرے قدم اٹھا رہی تھی ہر چیز میں تجربے ہو رہے تھے۔ ہیئت میں بھی اور مواد میں بھی۔ قلی قطب شاہ کی غزلوں پر نظر ڈالی جاتی ہے تو اس میں ایک طرف شبستاں، بلبل ہزار داستاں، ریحاں، خمستاں، نرگس اور صبا کی روایت ہے تو دوسری طرف میگھ، گگن، پیا، جامن کے پھل، برس گانٹھ، پون، اور نین کی کہانیاں ہیں۔ وجہی کے یہاں ایک طرف، کہ کھلیا کمل پھول پانی منے، برہا لوستنا نیچے بیچ باج تل تل رہے پیا، وغیرہ ہیں تو دوسری طرف، لالے، سنبلستاں، مطربہ رستم، وغیرہ کے بیانات ہیں۔ پھر یہی نہیں جیسے جیسے خود دکن ہی میں حیات انسانی آگے بڑھتی جاتی ہے نئے نئے تجربات کرتی جاتی ہے۔ سوچنے کا انداز، تشبیہات، طرز بیان، الفاظ کا انتخاب سب کچھ بدلتا جاتا ہے۔ قطب شاہی اردو کا کردار پن، عادل شاہی اردو میں نہیں رہ جاتا، عادل شاہی طرز فکر، بریدشاہی اور آصف جاہی دور میں دلچسپ نہیں معلوم ہوتا اور وجہی، کاظم، سیوا، شاہی، مرزا، اور ہاشمی کے مرثیے سودا، میر اور ضمیر کے مرثیوں کے آگے بے کیف معلوم ہوتے ہیں۔ ولی اور رنگ آبادی کے تغزل میں دکنی الفاظ کا وہ زور باقی نہیں رہ جاتا جو اس سے پہلے ملتا ہے ایک طرف، سوں، توں نمن، اپس کوں، دستے، ہیں تو دوسری طرف ؎

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسن بے حجاب اس کا ___ بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اس کا
بسے فرہاد کے مانند کوہ بے ستوں میں جا ___ اگر قصہ سنے خسرو تیری شیریں کلامی کا
اس کی تعظیم ہوئی اہل چمن پر لازم ___ بلبل باغ نے جب مصحف گل یاد کیا

جیسے سینکڑوں اشعار ملتے ہیں جنھیں شمالی ہندوستان کے کسی اسکول میں شامل کر دیا جائے تو پتہ چلانا مشکل ہو جائے کہ یہ کسی دکنی شاعر کا کلام ہے۔ غرضکہ دکنی شاعری میں ایرانی اور ہندوستانی طرز فکر کا ایک حسین امتزاج ہے۔ تصوف کی بھی چاشنی ہے اور غزل کی رنگینی مجازی کیفیات کے ساتھ پورے شباب پر جھلکتی نظر آتی ہے۔ بندہ نواز گیسو دراز کی تلقینوں کا اثر نمایاں ہے تو راسخ اور چنتہ کے اپدیش اور سندیسوں کا بھی پتہ چلتا ہے جو ؎

پھرے ہے پارۂ دل دیدۂ پر آب میں یوں ___ جلا کے چھوڑ دے جیسے کوئی بھنور میں چراغ (ظفر)

اور ؎

بوسہ نہ کیونکہ شیر لے میرے مزار کا ___ میں ہوں شہید آہوئے چشم نگار کا (ناسخ)
نوک مژہ پہ اشک صباحت نظام ہے ___ سونٹے پہ آبنوس کے چاندی کی شام ہے (بحر)

سوتے ہیں پھیل پھیل وہ سائے پلنگ پر ہم چپ الگ پڑے ہیں کنارے پلنگ پر (قلق)

سے بالکل الگ ہیں اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دکن کے شعرا ایسے خیالات سے واقف نہیں تھے۔ اگر ہندوستان کی مروجہ زبانوں میں سنسکرت اور دوسری زبانوں سے بوجہ عدم واقفیت یہ خیالات ان تک نہیں پہنچ سکے ہوں گے تو فارسی شعرا کے یہاں یہ رنگ انھیں ضرور ملا ہوگا۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ دکن میں سکون بھی تھا، شخصی حکومت تھی۔ بادشاہ صاحبانِ علم و فن کا قدرداں تھا۔ ایسے موقع پر ان تمام باتوں کا شعر و ادب میں آجانا لازمی تھا جو لکھنو اور دہلی اسکولوں میں وقت کے تغیر کے ساتھ آتی رہیں مگر اردو زبان کی کم مائیگی سماج اور ماحول کا مذاق بادشاہوں کی طبیعتوں کا انداز آڑے آیا اور اس طرح کی باتیں اس وقت رجحان کے طور پر نظم نہیں ہو سکیں، انفرادی طور پر چاہے امرت لال، زرگر پسر ابراہیم کی چھاتیوں کی کہانیاں سنائی جاتی رہی ہوں۔ ان تمام باتوں کے باوجود دکن کا اسکول شمال سے اس طرح الگ ہے کہ دکنی فکر و نظر کو شمال کے اسکولوں کے مقابلے میں لاکر بڑی آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ طرزِ فکر شمال سے بالکل الگ ہے۔

دہلی میں اردو شعر و ادب کا چرچا ولی کی دہلی میں آمد کے بعد مجموعی طور پر شروع ہوا۔ ان سے پہلے ریختہ گویوں کا جو دور تھا جس میں آبرو، یک رنگ، ناجی، بہار، مرزا مظہر وغیرہ خاص تھے وہ فارسی اور ریختہ دونوں میں شاعری کرتے تھے لہٰذا ان کے یہاں فارسی خیالات اور سجاوٹ کی آمیزش ہے۔ چونکہ شاعری کا یہ دور تفنن طبع کے لیے زیادہ ہے اس لیے اس میں ایہام اور دوسری صفات کا استعمال بہت ہے اور یہی نہیں کہ استعمال بہت ہے بلکہ اس وقت فن شاعری کا معیار بھی ایہام گوئی سمجھی جاتی تھی۔ مصطفےٰ خاں یک رنگ، دلاور خاں بیرنگ و ہم رنگ، شرف الدین مضمون، آبرو اور ان کے ساتھ شعرا کا ایک جمگھٹ تھا جو ایہام گوئی کو طرۂ امتیاز سمجھتا تھا اور اسی رو میں بہہ رہا تھا۔ مضمون نے بھی اسے اپنی شہرت کا باعث سمجھا ؎

ہوا ہے جگ میں مضموں نیرا شہرہ طرح ایہام کی جب سیں بحالی

شاہ حاتم نے گو آخر وقت میں ایہام گوئی ترک کر دی تھی مگر اس کا مزہ نہیں بھولے تھے۔ توبہ میں بھی ایک طرح کا تاسف نظر آتا ہے ؎

ان دنوں سب کو ہوئی ہے صاف گوئی کی تلاش نام کو حاتم کہیں چرچا نہیں ایہام کا

اسی کے فوراً بعد صاف گویوں کا دور آتا ہے اور ایہام کی مذمت شروع ہو جاتی ہے۔ میر، مرزا، میر حسن، سب ایہام گوئی کو مذموم قرار دیتے ہیں۔ اور تو اور خود حاتم جو ایہام کے رسیا تھے وہ بھی ایہام کی مذمت پر اتر آتے ہیں ؎

کہتا ہے صاف و شستہ سخن بس کہ بے تلاش حاتم کو اس سبب نہیں ایہام پر نگاہ

یہی ایہام جو کسی وقت فن شاعری سمجھی جاتی تھی لوگ اسے شاعری کا سقم سمجھنے لگے ہیں اور صاف گوئی کی تلقین کرتے ہیں[1]

---

[1] میر حسن اپنے تذکرہ میں میر احسن اللہ بیان کے لیے لکھتے ہیں "مرد ہے بود معاصر آبرو۔ طبعش بسیار مائل بہ ایہام بود از ایں جہت شعرائے بے رتبہ ماند"

سوداؔ، میرؔ اور میر حسنؔ کا کلام اس صفت سے پاک ہو جاتا ہے مگر دوسری صنعتوں سے انھیں بھی چٹکارا نہیں ملتا۔ چنانچہ اے دردؔ اپنے وقت میں ایہام رہ گیا، کہنے والے درد سے

ساقی کیدھر ہے کشتی مئے ابکی کھیو سے میں پار ہیں ہم

جیسے اشعار نظم کرتے ہیں۔ مگر دھیرے دھیرے تنوع اور ایک نیا لہجہ شاعری کو ملتا جاتا ہے اس دور میں وہ کیفیت باقی نہیں رہ جاتی جو فارسی آمیز ریختہ یا اس کے بعد کے دور میں ملتی ہے۔ لہجہ کے ساتھ ساتھ الفاظ کا انتخاب اور خیال کی پیش کش سب کچھ پہلے دور سے بدلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میرؔ کی کربناک آواز۔ دردؔ کا فلسفیانہ انداز اور سوداؔ کے قہقہوں سے اردو شاعری کے قصر و ایوان گونجتے نظر آتے ہیں جن کی بنیادی خصوصیات لکھنؤ پہنچنے کے بعد بھی نہیں بدلتیں، وقتی اور مقامی اثرات چاہے کبھی کچھ بھی اثر ڈال دیتے ہوں۔

صاف گوپوں کے یہاں عشق کے تصور میں گہرائی ہے۔ محبت میں حیات کی تابناکی کا شدید احساس ہے جو صرف تفنن طبع کے لیے نہیں پیش کیا گیا اور نہ اس میں سطحیت اور رذالت ہے۔ جہاں تصوف کا رنگ گہرا نظر آتا ہے وہاں مظہر کی تلاش ہے اور یہ تلاش عاشق کو چہرہ، دستار، پگڑی اور سبزہ، خط وغیرہ میں الجھا کر بہت واضح طور پر اردو شاعری کو امرد پرستی کا مرادف بنا دیتی ہے۔ جہاں عشق افلاطونیت سے متاثر ہے وہاں عشق کے پاک جذبے کی مرقع کشی کے ساتھ ساتھ احساس کی وہ جلن بھی نمایاں ہے جس کا واقعی اظہار اگر روایات سے ہٹ کر ہو جاتا تو عشق میں یہ ادب نہیں آتا، میرؔ کو نہ کہنا پڑتا۔ اس عشق میں سطحیت اور لذت کوشی کو چھوڑ کر تقریباً تمام رخ موجود ہیں۔ اگر زمانے کا انتشار ساتھ نہ ہوتا تو سطحیت اور لذت کوشی کا آجانا ممکن نہ تھا۔[1]

جرأت، مصحفی، اور انشا کے ہاتھوں دہلی کی شاعری اپنا درد و اثر بہت کچھ کھونے لگی۔ ان کے انفرادی سماجی حالات کی مساعدت اور لکھنؤ کی نقل سکونت نے ان پر سے غم کوشی اور پسائیت کی تہیں اتار لیں۔ ان کے حقیقی جذبات جن پر لکھنؤ کی چہل پہل حاوی ہو رہی تھی مشتعل ہونے لگے۔ سماج کے مذاق کی ترجمانی کی کوشش، دربار سے علاقہ، افکار سے نجات کا حاصل ہونا خوشگوار و رواروی سرپرستی ایک طرف اور دہلی میں ابتدائی پرورش کا پانا، زبان رسم و رواج، فکر و فن کا نظریہ، روایات کا اثر، انفرادیت قائم رکھنے اور نئی سرزمین کے شعرا سے مقابلہ کا جذبہ دوسری طرف۔ ان تمام چیزوں نے نو واردوں پر جن کا شعور ابھی تک میرؔ، سوداؔ، اور میر حسنؔ کی طرح پختہ نہیں ہوا تھا، عجیب اثر ڈالا۔ اغلاط سے معمور کہی اور سمجھی جانے والی آب حیات

---

[1] لکھنؤ پہنچ کر، عشق میں یہ ادب نہیں آتا، کہنے والے میرؔ بھی

طوان دنوں ہم سے اک رات جانی کہاں ہم کہاں تم کہاں پھر جوانی

بستی تبا پر تری مر گیا ہے کفن میرؔ کو دیجیو زعفرانی

(دیوان پنجم جو لکھنؤ میں تصنیف ہوا)

جیسے شعر کہنے لگے۔

ان کے مذاق کا نقشہ چند سطروں میں اس طرح پیش کرتی ہے۔

"قہقہوں کی آوازیں آتی ہیں۔ دیکھنا اہل مشاعرہ آن پہنچے۔ یہ کچھ اور لوگ ہیں جن کا آنا غضب کا آنا ہے ایسے زندہ دل اور شوخ طبع ہوں گے جن کی شوخی اور طراری طبع بارمتانت سے ذرا نہ دبے گی۔ اتنا ہنسیں گے اور ہنسائیں گے کہ منھ تھک جائیں گے مگر نہ ترقی کے قدم آگے بڑھائیں گے، نہ اگلی عمارتوں کو بلند اٹھائیں گے انھیں کو ٹھوں پر کودتے پھاندتے پھریں گے۔ ایک مکان کو دوسرے مکان سے سجائیں گے اور ہر شے کو رنگ بدل بدل کر دکھائیں گے۔ وہی پھول عطر میں بسائیں گے۔ کبھی ہار بنائیں گے۔ کبھی طرّے سجائیں گے کبھی انھیں کو پھولوں کی گیندیں بنا لائیں گے اور وہ گلبازی کریں گے کہ ہولی کھیلے گرد ہو جائیں گے۔ ان خوش نصیبوں کو زمانہ بھی اچھا ملے گا۔ ایسے قدرداں ہاتھ آئیں گے کہ ایک ایک پھول ان کا چمن زعفران کے مول بکے گا۔"

یہ ذہنی تبدیلی سماج کے مذاق کی تبدیلی تھی جس نے صرف زبان و بیان تک دہلی کی پابندی روا رکھی عشق کے نظریات اور معاملات میں واضح تبدیلی آنے لگی۔ ڈوبٹہ، انگیا، موباف اور مستی کے مضامین نظر آنے لگے اور یہی نہیں ریختہ نے ریختی بھی ایجاد کرلی۔ ہجو و مزاح، مسخریت اور بیباک قسم کی عریانی میں تبدیل ہونے لگے۔ انشاء نے بحروں، قافیوں اور زحافات کے میدان میں بھی وسعت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ بی جان پری خانم، اور، پری چہرہ پری چہم، جیسے ارکان و اوزان پیدا کیے مگر اس کے باوجود انشاء، مصحفی اور جرأت اپنے کو دہلوی ہی کہتے رہے۔ شاید اس لیے کہ دہلی میں پیدا ہوئے تھے اور زبان و بیان کے معاملے میں چند روایات اپنے ساتھ لائے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ لکھنؤ اور دہلی کے امتزاج سے تیار ہوئے تھے اور یہیں سے دہلوی طرز فکر کا انحطاط کئی معنوں میں شروع ہو جاتا ہے۔

دہلی میں دو ہی طرح کے نظریات عشق نظر آتے ہیں۔ ایک کے علم بردار صوفی شعراء ہیں جن کے یہاں عشق شریعت، طریقت اور حقیقت کی منزلوں میں سرگرداں نظر آتا ہے۔ دوسرا گروہ مجازی عشق میں سرشار ہے اس صنف میں میر، سودا، میر حسن اور ان کے بعد غالب، مومن، جرأت، مصحفی اور داغ وغیرہ ہیں جن کے یہاں درد ہے، تڑپ ہے، حرماں نصیبی ہے مگر وصل کی شادکامی، سوداؔ و آغؔ کے اور کسی کے یہاں مجموعی طور پر کم نظر آتی ہے۔ ان کا عشق، داستانِ غم و الم ہے جس میں سیاسی بحران، تباہ حالی اور پراگندگی پیدا کر دیتے ہیں۔ پہلے نظریہ کی وضاحت ؎

قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے — اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے (دردؔ)

ظفرؔ اس سے چھٹ کے جو بست کی تو یہ جانا ہم نے کہ واقعی
فقط ایک قید خودی کی تھی، نہ قفس تھا کوئی نہ جال تھا (ظفرؔ)

پردہ کب آسمان روئے دلربا سے اٹھ گیا — تب اٹھا وہ پردہ جب میں درمیاں سے اٹھ گیا (راسخؔ)

جیسے اشعار سے ہو سکتی ہے اور دوسرے کی سے

میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی ___ ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا (میر)

بہار بے سپر جام و یار گذرے ہے ___ نسیم تیر سی چھاتی کے پار گذرے ہے (سودا)

بولا پکارے ہیں تجھے کوچۂ جاناں والے ___ ادھر آ ابے او چاک گریباں والے (میر)

ٹکڑے کب غم نے یہ جگر نہ کیا ___ نہ کیا ہم نے نالہ پر نہ کیا (قایم)

جیسے اشعار سے۔ مگر ان دو رویوں کی واضح لکیر کے ساتھ ساتھ دونوں کیمپوں کے شعراء کے یہاں مجاز اور حقیقت دونوں کی ملی جلی کیفیات مل جاتی ہیں۔ یہاں جو کچھ کہا گیا ہے وہ بہ حیثیت مجموعی کہا گیا ہے۔

غرض کہ دہلی کی شاعری میں زبان و بیان، تذکیر و تانیث کے تھوڑے سے بہت فرق کے بعد بھی نظریات طرز فکر، نظریات شعری و عشقی اور ذہنی کیفیات میں ایک ایسا واضح فرق ملتا ہے جسے بنیادی فرق کہہ سکتے ہیں جو دکن میں نہیں ملتا اور جو آگے چل کر لکھنو میں بھی نظر نہیں آتا۔ مگر ان باتوں کے ساتھ ساتھ کسی قدم پر نہیں بھولنا چاہیئے کہ یہ تمام باتیں مجموعی طور پر دیکھنی چاہئیں نیز اسے بھی نظر میں رکھنا چاہیئے کہ کوئی بات یک بارگی وجود میں نہیں آتی۔ ہر مذاق اور ہر طرز فکر کی کچھ روایتیں اور ردیں دوسرے دور کے طرز فکر اور مذاق میں شامل رہا کرتی ہیں۔ میں نہیں مانتا کہ ہڑپا اور موہنجدڑو کی تہذیب صرف دراوڑی دور ہی کی تہذیب تھی اور اس میں اس سے قبل کی کسی تہذیب کا عکس نہیں تھا۔ تاج کو متعدد فنون کے امتزاج نے ایک نایاب صفت بخشی اور کون کہہ سکتا ہے کہ تصور بغیر کسی مادی بنیاد کے پیدا ہو سکتا ہے۔ اور اسی طرح اکثر بلند نما محاکاتی رشک یا اس خیال کا اظہار کہ ہم بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں لوگوں کو تقابلی تقلید پر آمادہ کرتا ہے۔ اگر میر، مومن، شاہ نصیر اور ظفر کی غزلوں میں لکھنو کے فن کو اپنی غزلوں میں سمونے کی کوشش ملے تو اسکول اور طرز فکر کی سرحدیں شکست نہیں ہو سکتیں۔ بلکہ اسے اپنی قدرت کا اظہار سمجھنا چاہیئے۔ شاہ نصیر کے سے

ہے یہ تمنا میرے جی میں یوں تجھے دیکھوں بادہ کشی میں
ہاتھ میں ساغر بر میں مینا، سر پر طرّہ ہار گلے میں
برقعہ کو الٹ منھ سے جو کرتا ہے تو باتیں اب میں ہمہ تن گوش بنوں یا ہمہ تن چشم
نہا کے افشاں چنو جبیں پر بکھیر زلفوں کو بعد اس کے
دکھاؤ عاشق کو اس ہنر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

جیسے اشعار کو صرف نظر میں رکھ کر کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے ساتھ دہلی کی زبان، دہلی کے محاورے اور لکھنو کی زبان، خیالات طرز فکر، بیباکانہ پن کو بھی نظر میں رکھنا پڑے گا۔ پھر شاہ نصیر اور ظفر کی ایسی مثقیں اپنی برتری اور تعلّی کے لیے کیوں نہ سمجھی جائیں؟ کیونکہ ان لوگوں نے اکثر اپنی برتری کا دعویٰ کیا ہے۔ ایک مقام پر ظفر کہتے ہیں سے

اے ظفر ایک ہے تو فن سخن میں استاد کیوں نہ قائل ہوں تیرے آتش و ناسخ دونوں

دلّی کی زبان، لکھنو میں ادبی محفلوں کے قیام سے پہلے، مرکزی اور مستند زبان سمجھی جاتی تھی۔ اس کا سبب خواہ یہ ہو کہ اہل علم کا قیام بادشاہت کے مرکز کے باعث دلی میں تھا یا یہ کہ اس کی ابتداء دہلی اور نواح دہلی میں ہوئی یا یہ کہ دلّی کے تغزل کی گونج سب سے پہلے یہیں سنائی دی۔ کوئی بھی سبب ہو سکتا ہے اور لکھنو کے دور شاعری میں بھی یہ اہمیت باقی رہی۔ میر تقی میرؔ اور انیسؔ اپنی زبان کی سند کے لیے دلّی ہی کی زبان کا حوالہ دیتے رہے گو لکھنو میں اس معاملہ میں بہت واضح تبدیلی شروع ہو گئی تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اسکول کا خیال دراصل زبان ہی کی وجہ سے پیدا ہوا مگر ہم دیکھ آئے ہیں کہ نہ صرف زبان بلکہ طرز فکر اور نظریات زندگی و عشق میں بھی دلّی کو انفرادیت حاصل ہے ـــــ ایسی انفرادیت جسے لکھنو میں ضم نہیں کیا جا سکتا۔ جن لوگوں کی نظر میں صفیر بلگرامی کی کتاب تذکرۂ ہمیلوۂ خضر کے ۹۰۰ صفحات فسانۂ عجائب کا مقدمۂ سخن دہلوی کا جواب، اور جعفر علی شیون لکھنوی کی طلسم حیرت وغیرہ ہیں وہ دہلی اور لکھنو کے صرف لسانیاتی ہی نہیں بلکہ بہت سارے فرقوں سے بخوبی واقف ہوں گے۔ اختلاف اللسان اور تذکیر و تانیث دہلی و لکھنو سے متعلق رسالے لکھے گئے۔ ان کے جوابات مشلّع کیے گئے اور یہ بحث دوسری جنگ عظیم سے پہلے تک بڑی دلچسپی سے برابر جاری رہی۔ ان بحثوں کو پڑھ کر اس خیال کی وضاحت اچھی طرح ہو سکتی ہے کہ دہلی کے بیان اور وہاں کی زبان میں اور لکھنو کی زبان و بیان میں ایک واضح فرق ملتا ہے جس کا ہونا سماجی نقطہ نظر سے ضروری بھی تھا۔

لکھنو اسکول کی ابتدا کا سوال، اگر نواب سعادت خاں برہان الملک اودھ کے صوبہ دار نہ ہوئے ہوتے اس وقت بھی پیدا ہوتا یا نہیں، فیض آباد اور لکھنو کی محفلیں نہ سجی ہوتیں اور وہ تمام فارغ البالی اور دولت کی فراوانی نہ ہوتی جس کا چرچا لکھنو اور فیض آباد میں ہوا تب بھی ادب میں یہ تبدیلی ہوئی ہوتی، اس کا جواب ذرا مشکل سے ملے گا۔ تبدیلی بہر حال ہوتی اس لیے کہ مذاق سخن اور معیار شاعری ہر دور میں بدلتا رہا ہے مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تبدیلی کس قسم کی ہوتی۔ دلّی میں اردو شاعری کو سکون اور خوش حالی کا زمانہ نہیں ملا۔ سیاسی زبوں حالی نے اسے وہ موقع ہی نہیں دیا کہ اطمینان کی شاعری کو فروغ ہوتا اس اطمینان کی شاعری میں کیسی کیسی باتیں نظم ہوتیں، کہا نہیں جا سکتا۔ اس لیے کہ جرأت، انشاؔ اور رنگین دہلوی ہی تھے اور ان کو جب اطمینان ملا تو انھوں نے کیا رنگ اختیار کیا، اردو زبان کی تاریخ کے طالب علم اس سے باخبر ہیں مگر چونکہ دلّی میں ایسا نہیں ہوا اس لیے وہاں کی تخیل میں درد ہے، ایک طرح کا فرار ہے جو اس زندگی کو کوئی اچھی چیز نہیں سمجھتا جسے تصوف کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جو ہر اس جگہ رونما ہوتا ہے، جہاں سیاسی زندگی میں بے چینی ہوتی ہے اور اس بے چینی کا اظہار کسی دوسری طرح پر شخصی حکومت میں نہیں ہو سکتا۔ شخصی حکومت اور شہنشاہیت کے اصول بغاوت کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ عوامی بغاوت ایسے ماحول میں مشکل ہے پنپ سکتی ہے۔ لکھنو میں سیاسی بے چینی کچھ عرصہ کے لیے ظاہری طور پر ختم ہو گئی تھی۔ کم از کم بلاد اودھ میں سکون تھا۔ دولت کی فراوانی تھی۔ شعرا کی قدر ہوتی تھی۔ پری پیکروں کی محفلوں نے

حکومت اور حکومت کے ساتھ سماج کا مذاق بدل دیا تھا۔ ہر بات میں تکلف، نفاست اور رنگینی عود کر آئی تھی۔ عشق نے مجاز کو مکمل جگہ دی اور اس مجاز میں صرف جنس مخالف سے محبت کرنے کو مناسب سمجھا گیا۔ بادشاہ اور امرا کے حلقوں میں شاہان عباسیہ اور سلاطین روم کی طرح عورتوں کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ رنگ رلیوں کا بازار گرم ہوا۔ بٹیر بازی، مرغ بازی، کبوتر بازی اور تمام بازیوں کا مشغلہ عام ہوگیا۔ واسوخت اور ریختی کا رنگ مجموعی طور سے شعر و ادب پر چھاتے لگا جس کے باعث کچھ اچھی باتیں بھی ظہور میں آئیں مگر تخریبی کام زیادہ ہوئے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ جو کچھ ہو رہا تھا وہ غلط نہیں تھا مگر دبی زبان سے یہ کہہ دینے کو ضرور جی چاہتا ہے کہ اگر شاہان اودھ کا تختہ نہ الٹ گیا ہوتا تو ان کی یہ تمام حرکات فن لطیف میں شمار ہو جاتیں اور ممکن تھا کہ کلچر اور ثقافت کے اعتبار سے یہ دور مسلمانوں کے آخری عروج کا عہد زرّین ہوگیا ہوتا۔ کبوتر بازی، بٹیر بازی، عورتوں کی محفلیں اودھ شاہی کی ایجاد نہیں تھیں۔ تاریخ سے باخبر لوگ جانتے ہیں کہ اکبر، جہانگیر اور مینا بازار کے فسانے آئین اکبری اور تزک جہانگیری میں اب تک موجود ہیں۔ درحقیقت شاہان اودھ کے دور میں ہندوستان جس سیاسی کشمکش سے گذر رہا تھا اس میں کسی بھی ہندوستانی حکومت کے لیے بقا کے آثار نہیں رہ گئے تھے۔

اودھ کے بظاہر اور وقتی سکون اور وہاں کی رنگ رلیوں نے شعر و ادب پر گہرا اثر ڈالا شاعر و ادیب اپنی اپنی انفرادیت اور صلاحیتوں کے باوجود سماج کے مذاق سے ہم آہنگ تھے۔ کچھ لوگوں نے تو اپنے کو سنبھال لیا باقی ماندہ اس رو میں بہہ گئے کہ پھر ابھر نہ سکے۔ بادشاہ اگر کسی خاص ذوق کی طرف ذرا سی توجہ دیتے تو ان کے مصاحبین اور حواریین اسے انتہا تک پہنچا دیتے اور جو لوگ اسے شاہانہ مذاق سمجھ کر اس کی تقلید یا نقالی کرتے وہ اور کھل کھیلتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنوی تہذیب اور ذوق شعر و ادب کا مقصد مجموعی طور پر معاملہ بندی، نسائیت، صنعت گری، معاملات کا استعارات اور تشبیہات میں بیان کرنا، خارجی بیانات پر زیادہ زور دینا، زبان کو مجلّا اور مطلّا کرنا ہوگیا۔ شاہان اودھ میں بہت سارے ادیب اور شاعر بھی تھے اور انھوں نے جب لکھنؤ میں دہلی سے یہ تبدیلی دیکھی تو اسے اپنے دور کی ایجاد سمجھ کر اس پر کوئی قدغن بھی عائد نہیں کی بلکہ اکثر نے تو اسے رواج بھی دینا چاہا کیونکہ سماجی نقطۂ نظر سے ان کی بقا کے لیے یہ ضروری بھی تھا کہ ان کا لایا ہوا یہ رجحان رواج پائے۔ مارکس اور اینگلز نے ایک مقام پر لکھا ہے۔

"وہ طبقہ جو سوسائٹی میں حکومت کی مادّی طاقت ہوتا ہے وہی ذہنوں پر بھی حکومت کرتا ہے۔ وہ طبقہ جس کے ہاتھ میں مادّی پیداواری ذرائع ہوتے ہیں انھیں (اپنے دور کی) ذہنی پیداوار پر بھی قبضہ حاصل ہوتا ہے۔"[1]

اور ہر دور کی حکومتوں کے تاریخی آئینہ میں یہ بات دیکھی بھی جا سکتی ہے۔ شخصی حکومت میں یہ کوئی مشکل کام ہے بھی نہیں خاص طور پر ہندوستان میں جہاں کی تاریخ بادشاہ اور دربار کی تاریخ کے سوا کچھ اور مشکل ہی سے ملے گی اودھ کی ہمدردی میں یہ سب کچھ نہیں کہا جا رہا ہے بلکہ ایسا کیوں ہوا اس کا سبب بتانا مقصود ہے۔

---

[1] GERMAN IDEALOGY BY MARK AND ENGELS

دہلی کے دورِ شاعری کی اگر تاریخ الٹی جائے تو معاملہ بندی، لسانیت، صنعت گری کی ایسی فراوانی جو لکھنؤ میں ہے معاملات کا استعارات اور تشبیہات میں بیان کرنا، خارجی بیانات پر زور دینا اور اسی طرح کی دوسری باتیں مجموعی طور پر کہیں نظر نہیں آتی ہیں۔ مرزا شوق کے لباس میں مومن اور ناسخ کے چولے میں شاہ نصیر جیسے ہی مل جائیں مگر ان باتوں کو عمومیت حاصل نہیں ہوئی، اور رجحان یا اسکول عمومیت ہی کا نام ہے جس میں یقیناً بہت سی بنیادی تبدیلیاں ہو گئی ہیں اس دور میں نوح ناروی یا ان سے پہلے لکھنؤ میں رہنے والے دہلوی طرز میں شاعری کر کے دہلویت کو قائم نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ مسائلِ حیات بدل چکے ہیں، فلسفۂ زندگی بدل چکا ہے، تاریخ کا نیا تصور پیدا ہو گیا ہے۔ شاعری اور ادب کے نظریات بدل چکے ہیں۔ ترقی پسندی ان تمام باتوں میں اپنے قبل کے ادب سے مختلف ہے اور یہ اختلاف کون کہہ سکتا ہے کہ اوپر ذکر کی ہوئی باتوں کا نہیں ہے۔ دکن کے مسائلِ حیات اور فلسفۂ زندگی نہ دہلی میں تھے اور نہ دہلی کی زندگی تمام تر لکھنؤ کی زندگی تھی۔ ناسخ کا لہو ہو کو، لہو، میاں کو صاحب، نت کو ہمیشہ، مط کو طرح، تیرے تئیں کو تجھ کو، پنٹ کو بہت، سمیت کو ساتھ، وداکو وداع کھو کو کبھی، اس ڈھب کا کو اس طرح، پرواہ کو پروا، دہا کو عشرہ میں بدلنا، بحر، رند، خلیل اور آتش کا معاملہ بندی کو بڑے اہتمام سے نظم کرنا، دیا شنکر نسیم، غیر و محسن کا صنعات کا ایک گورکھ دھندہ تیار کرنا اور مرثیے کو ایک نیا انداز اور میدان ملنا، ان تمام باتوں کا خمیر لکھنؤ کے اسی خاص ماحول سے اٹھایا گیا تھا جس میں امانت کی واسوخت، انشا و رنگین کی ریختی اور جرأت کی مسدس و مخمس جو اغنوں نے کربلا بھانڈ کی بچو میں لکھی ہیں، بھی شامل ہو گئے۔ یہ تمام باتیں دہلی سے الگ ہیں اور دہلی کی تمام باتیں دکن سے۔ اور ادبی تاریخ کے تناقض اس سے بھی بے خبر نہیں ہیں کہ ہر آنے والے دور میں دور ماقبل کی بہت سی باتیں اور مذاق اور روایتیں بھی کسی طرح شامل رہتی ہیں جنھیں گذشتہ دور سے کسی طرح مماثل نہیں کیا جا سکتا۔ بنیاد ہوا پر قائم نہیں ہو سکتی مگر تبدیلی بنیادی ہوتی رہتی ہے جس کے باعث اسکول کا قیام ہوتا ہے۔ ہم نہیں مانتے کہ یہ فرق زماں و مکاں کے معمولی تغیر کا نتیجہ تھا۔ زماں و مکاں کا تغیر کبھی معمولی ہوتا ہے اور کبھی بنیادی۔ عشق کا مادی تصور مرد کے بجائے عورت سے عشق کا خیال اور بہت سارے مسائلِ حیات لکھنؤ کے ساتھ وابستہ تھے جو معمولی زماں و مکاں کے تغیر کے ساتھ ظہور میں نہیں آ سکتے۔ فلسفۂ زندگی مسائلِ حیات اور خارجی اثرات کا اس میں بڑا ہاتھ ہے۔ اس کا انکار سماج اور زندگی کے حرکی ہونے کا انکار ہے۔

ضیاالحسن فاروقی

انیسویں صدی کے نصفِ اوّل کی

دہلی کی ایک جھلک

(جامعہ ملیہ دہلی میں "یوم مومن" کے موقع پر پڑھا گیا)

جناب صدر، محترم خواتین و معزز حضرات!

میرے مضمون کا عنوان ہے "انیسویں صدی کے نصف اول کی دہلی" یوم مومن کے موقع پر اس خاندانی سے مقصود یہ ہے کہ مومن کی شخصیت اور فن کے حقیقی خدوخال کو اُس عہد کی دہلی کے مذہبی، علمی اور تہذیبی ماحول کے آئینے میں دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی جائے۔ میں تو محض آپ کے ہاتھ میں آئینہ دے کر بیٹھ جاؤں گا، اس کے بعد مومن کی شخصیت، زندگی اور شاعری کے مختلف پہلو آپ کو اس میں نظر آئیں گے۔ اب آپ کا یہ کام ہے کہ آپ ژرف بینی اور تیز نظری سے کام لیں اور اس بڑے شاعر کی رنگا رنگ شخصیت کا مشاہدہ کریں۔

۱۸۰۳ء میں مومن کی عمر تقریباً تین سال تھی، یہ سال ہندوستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، اسی سال سندھیا مرہٹہ جن گاؤں کی صلح کی رو سے دوآبے کے سارے علاقے اور آگرہ اور دہلی پر اپنی بالادستی سے دستبردار ہو گیا اور یہ علاقے براہ راست ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری میں آ گئے، اور جب کمپنی کے نمائندے نے بادشاہ دہلی سے ملکی انتظام کا پروانہ جاری طریقہ پر لکھوا کر اعلان کر دیا کہ:

"خلق خدا کی، ملک بادشاہ سلامت کا، حکم کمپنی بہادر کا"

تو یہی وہ سال ہے جب شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے ہندوستان کے دارالحرب ہو جانے کا فتویٰ دیا۔ یہ گویا اعلان تھا اس بات کا کہ انگریزوں کے مقابلے میں ہندوستان کے مختلف سیاسی حلقوں کی یہ مہم ناکامیوں کے بعد آزادی کا جھنڈا علمی طبقہ کے ہاتھ میں بلند ہونا چاہیئے۔ اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی اور اس کا نتیجہ کیا نکلا اس سے یہاں بحث نہیں۔ بتانا صرف یہ ہے کہ مومن کی دلی اس عہد میں تحریک استخلاصِ وطن کا مرکز تھی اور ولی اسی سرچشمۂ رشد و ہدایت سے سیراب ہونے والے اس تحریک کے روح رواں مومن کے والد بزرگوار شاہ عبدالعزیزؒ کے عقیدت مندوں میں سے تھے۔ مومن جب بڑے ہوئے تو شاہ صاحب موصوف کے

بھائی شاہ عبدالقادر صاحب کی خدمت میں تحصیل علم کے لیے بھیجے گئے۔ شاہ صاحب اس مدرسہ میں درس دیتے تھے جو اکبرآبادی مسجد کے حجروں میں تھا۔ صاحبو! آج اس مسجد کا نام ونشان بھی نہیں ہے۔ سرسید نے جب آثار الصنادید لکھی تو یہ مسجد موجود تھی البتہ اس کے ایک مینار کی برجی ٹوٹ گئی تھی۔ اب کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ غلام رسول مہر کی تحقیق کے مطابق جہاں اب ایڈورڈ پارک بنا ہوا ہے وہی اس مسجد کی اصل جگہ تھی۔ یہ مسجد شاہجہاں کی بیگم اعزاز النساء نے ۱۶۵۰ء میں بنوائی تھی، چونکہ بیگم کا خطاب اکبرآبادی محل تھا اس لیے مسجد کا نام اکبرآبادی مشہور ہوا۔ یہی وہ مسجد ہے جہاں مومن کے پیر ومرشد سید احمد شہیدؒ نے تعلیم پائی۔ اسی کے ایک حجرے میں ابتدائی قیام دہلی کی پوری مدت بسر کی (یہ مومن کی طفولیت کا زمانہ تھا) اسی کے ایک حجرے میں وہ اس وقت ٹھہرے جب رائے بریلی سے نواب امیر خاں صاحب کے پاس راجپوتانہ جاتے ہوئے دہلی سے گذر رہے تھے۔ امیر خاں سے الگ ہونے کے بعد بھی اسی مسجد کے ایک حجرے میں مقیم ہوئے تھے اور جہاد کی مستقل اسکیم مرتب کی تھی۔ (سید صاحب کے جہاد کے متعلق مومن نے ایک مثنوی لکھی تھی) اسی مسجد میں شاہ عبدالقادر نے برسوں درس دیا اور ان کی وفات کے بعد یہ خدمت شاہ رفیع الدین سے متعلق ہوگئی۔ اس مسجد کے اردگرد کا علاقہ بڑا پررونق تھا۔ فیض بازار قلعہ کے نیچے سے لے کر دہلی دروازہ تک پھیلا ہوا تھا۔ جامع مسجد اور قلعہ کے درمیان اب جو وسیع میدان نظر آتا ہے یہاں ۱۸۵۷ء سے پہلے گنجان آبادی تھی اور قلعہ کے لاہوری دروازہ سے کر مسجد تک ایک پررونق بازار تھا جسے اردو بازار کہتے تھے اسی حصہ میں خانم کا بازار تھا، امرا اور ان کے متوسلین کی حویلیاں تھیں۔ مومن اس علاقے کی گلیوں میں چلتے پھرتے ہوں گے، کیا عجب کہ اس پردہ نشین کا کوچہ ملاقات بھی یہیں کہیں رہا ہو جس کے عشق میں وہ مرمر کے جیتے تھے۔

دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

بہرحال مومن کی دہلی میں ایک طرف یہ اکبرآبادی مسجد تھی جہاں تجدید واحیاء دین کی اسکیمیں مرتب ہوتی تھیں، وہ مراکز تھے جہاں سے مجاہدوں کے لیے سرحدی علاقہ میں ہنڈیاں جاتی تھیں، شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ تھی جہاں شام، مصر، چین اور حبش کے لوگوں کے جمگھٹے رہتے تھے۔ شاہ فخرالدین کی بارگاہ ولایت تھی جہاں میاں نظام الدین کا چشمۂ فیض جاری تھا، جامع مسجد کے محراب ومنبر تھے جہاں شاہ عبدالعزیز، جہاں شاہ اسمٰعیل اور دوسرے مذہبی اکابر کے وعظ ہوتے تھے۔ تو دوسری طرف چوک سعداللہ خاں کی رنگینیاں تھیں جن کے بارے میں ایک سیاح نے لکھا ہے:۔

"نظر از ملاحظہ محسوسات رنگا رنگ دست وپا گم می کند"۔

قلعہ معلیٰ تھا جہاں رقص پری پیکراں اور غوغائے رامشگراں میں ساری دنیا سمٹ کر آگئی تھی اور سپاہیوں کے میدان جنگ کے بجائے ٹیروں کی رزمگاہوں کے نقشے مرتب ہوتے تھے، چاندنی چوک تھا جہاں رئیس زادوں کے جمگھٹے لگے رہتے تھے اور جواہرات، عطریات اور پارچہ جات تک دنیا محدود تھی، میلے تھے جہاں عشرت ونشاط کے ہنگامے برپا ہوتے تھے اور شوقین مزاج عورتیں اور تماشہ بیں مرد خوب خوب داد عیش دیتے تھے۔ عین جامع مسجد کی سیڑھیوں کے نیچے جہاں واعظ

صراط مستقیم کی طرف دعوت دیتا تھا وہیں یہ آواز بھی آتی تھی "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" ذرا سرسید کی آنکھوں سے یہ منظر دیکھئے۔

"جنوبی دروازہ اس مسجد کا چتلی قبر کے بازار کی طرف بہت خوشنما بنا ہوا ہے ..... اس دروازے کی ۳۳ سیڑھیاں ہیں۔ ان سیڑھیوں پر تیسرے پہر کو مجمع عام ہوتا ہے اور بساطی اپنی اپنی دکانیں لگاتے ہیں ..... اور فالودے والا اپنی دکان لگاتا ہے اور شربت قند اور فالودہ رنگیں بیچتا ہے۔ کبابی ہر ہر طرح کے کباب بناتے ہیں اور اس کی بو پر عاشق برشتہ جاں حسرت لے جاتے ہیں۔ عجب عجب طرح کے جانور اور اصیل اصیل مرغ بکتے ہیں اور جوانانِ فرشتہ صورت ایام نوروز میں انڈے لڑاتے ہیں کہ آسمان بھی ان کی جفاکاری اور نیرنگی پر رشک کھاتا ہے۔ یارانِ ہم عمر اور جوانانِ ہم سیرت ہاتھ میں ہاتھ دیئے ہوئے سیر و تماشہ کرتے پھرتے ہیں ..... دروازہ شمالی کی طرف ۳۹ سیڑھیاں ہیں اگرچہ اس طرف بھی کبابی بیٹھے ہیں اور سودے والے اپنی دکانیں لگائے ہیں لیکن بڑا تماشہ اس طرف مداریوں اور قصہ خوانوں کا ہوتا ہے۔ تیسرے پہر ایک قصہ خواں مونڈھا بچھائے ہوئے بیٹھتا ہے اور داستانِ امیر حمزہ کہتا ہے، کسی طرف قصۂ حاتم طائی اور کہیں بوستانِ خیال ہوتی ہے اور صدہا آدمی اس کے سننے کو جمع ہوتے ہیں، ایک طرف مداری تماشہ کرتا ہے اور بھانتی کا کھیل ہوتا ہے اور بوڑھے کو جوان اور جوان کو بوڑھا بناتا ہے۔

..... شرقی دروازہ اس مسجد عالی کا خاص بازار کی طرف ہے ..... اس کے آگے ۳۵ سیڑھیاں ہیں۔ ان سیڑھیوں پر ہر روز گذری ہوتی ہے۔ یہ گذری بھی شاہجہاں آباد میں گویا ہر روز کا میلہ ہے۔ ہزار طرح طرح کے کپڑے الگنیوں پر ڈالتے ہیں اور عجب عجب خوشنمائی سے در و دیوار پر باغ سا کھلا معلوم ہوتا ہے۔ جوانانِ عشق پیشہ طرح طرح کے جانور پنجروں میں لیے ہوئے سیر کرتے پھرتے ہیں اور ان کی اچھی اچھی آوازیں سناتے ہیں، ایک طرف کبوتر والے کبوتر بیچتے ہیں اور ایک طرف گھوڑے والے گھوڑے لیے کھڑے ہیں۔ خریدار جوق جوق گرے پڑتے ہیں اور ایک ایک چیز نقد دل کے بدلے مول لیتے ہیں۔

غرض دلی کیا تھی ایک دھوپ چھاؤں کا شہر تھی، شراب خانے بھی تھے اور خانقاہیں بھی، مدرسے بھی تھے اور قمار بازی کے اڈے بھی۔ لوگ بڑی عقیدت کے ساتھ خانقاہوں اور مزارات پر حاضر ہوتے تھے پھر اسی جوش و ولولہ کے ساتھ طوائفوں کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ ان کی "رندی اور مذہبیت" ساتھ ساتھ چلتی تھی کوشش کرتے تھے کہ نہ رندی ہاتھ سے جائے اور نہ مذہبیت کا دامن چھوٹے، لیکن یہ آسان کام نہیں، دلی کے رندانِ پارسا کے بس کی یہ بات نہ تھی۔

برکفے جام شریعت، برکفے سندانِ عشق
ہر چہ ہوسنکے نہ داند جام و سنداں باختن

درحقیقت یہ ضمیر کی موت تھی، عام لوگوں کی یہ مذہبیت خود فریبی تھی، سلطنت دم توڑ رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ پورا معاشرہ عالمِ نزع میں تھا۔

مشاعرے دلی کی تہذیبی زندگی کی جان تھے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے "دلی کی آخری شمع" میں ایسے ایک مشاعرے کا

نقشہ پیش کیا ہے اور کریم الدین کی کتاب طبقات الشعراء ہند سے استفادہ کر کے اس زمانہ کی سماجی اور تہذیبی زندگی کی سچی عکاسی کی ہے۔ یہ عجب اتفاق ہے کہ مومن دہلوی ہی مرزا صاحب کی اس تصنیف کے محرک بنے تھے۔ چنانچہ وہ تمہید میں لکھتے ہیں۔

"جب کوئی بات ہونے والی ہوتی ہے تو اسباب خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ اتفاق دیکھئے کہ پرانے قدیم کاغذات میں مجھ کو حکیم مومن خاں مومن دہلوی کی ایک قلمی تصویر ملی۔ تصویر کا ملنا تھا کہ یہ خیال پیدا ہوا کہ تم بھی محمد حسین آزاد مرحوم کے "رنگ خیال" کی محفل شعراء کی طرح ایک مشاعرہ قائم کرو..... اور دل میں یہ بات جم گئی کہ بجائے تمام شعراء اردو کے دہلی کے آخری دور کا نقشہ کھینچ دیا جائے..... زمانہ ایک رنگ پر نہیں رہتا..... بہت سے اٹھ گئے اور بہت سے اٹھتے جاتے ہیں اور ایک زمانہ وہ آنے والا ہے کہ کوئی یہ بتانے والا بھی نہ رہے گا کہ مومن مرحوم کا مکان کہاں تھا جس طرح سوائے میرے اب شاید کسی کو یہ بھی معلوم نہ ہو کہ ان کی قبر کہاں ہے۔"

اس میں شبہ نہیں کہ اس گئی گذری دہلی میں بھی شعرا ہی نہیں ہر فن کے کاملوں کا ایک مجمع ہو گیا تھا یہ ایسے نقوش تھے جن سے "کاروانِ رفتہ" کی عظمت و شوکت کا اندازہ ہوتا ہے۔ حالی نے بڑے پر درد الفاظ میں اس عظمت رفتہ کا ماتم کیا ہے۔

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
کبھی اے علم و ہنر! گھر تھا تمہارا دلی
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز
چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز
غالب و شیفتہ و نیّر و آزردہ و ذوق
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز
مومن و علوی و صہبائی و ممنوں کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز
بزم ماتم تو نہیں بزم سخن ہے حالی
یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

صہبائی اور آزردہ کا ذکر آتا ہے تو مرحوم دہلی کالج کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ کیسے کیسے فضلاء روزگار یہاں جمع ہو گئے تھے اور کیسی کیسی دور آفرین ہستیاں اس کے دامن تربیت میں پروان چڑھیں۔ مولانا مملوک علی جنہیں مولوی کریم الدین نے

کانِ علم اور مخزنِ اسرار کہا ہے، کالج میں عربی کے صدر تھے، یہ بھی ولی اللہی خانوادے کے تربیت یافتہ تھے، ان کے شاگردوں میں سرسید احمد خاں، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا احمد علی محدث سہارن پوری اور ان کے اپنے صاحبزادے مولانا محمد یعقوب نانوتوی جیسے بالغ نظر بزرگ شامل ہیں۔ یہ وہ ہستیاں ہیں جن پر ہندوستان اور ہندوستان کے مسلمان ہمیشہ ناز کرتے رہیں گے۔ سرسید احمد ان کی نسبت آثار الصنادید میں لکھتے ہیں۔

"جناب مولوی مملوک علی شاگرد مولوی رشید الدین خاں علم معقول و منقول میں استعداد کامل رکھتے ہیں اور کتب درسیہ کا ایسا استحضار ہے کہ اگر فرض کرو کہ ان کتابوں سے گنجینۂ عالم خالی ہو جائے تو ان کی نقل ممکن ہے۔"

مولوی امام بخش صہبائی صدر مدرس فارسی اپنے وقت کے بہت بڑے ادیب تھے۔ مصنف اور شاعر بھی تھے۔ دہلی کالج میں ان کے تقرر کا عجیب واقعہ ہے۔ سنہ ۱۸۴۲ء میں جب مسٹر ٹامسن لفٹنٹ گورنر مدرسے کے معائنے کے لیے آئے اور یہ تجویز کی کہ ایک مستند فارسی مدرس کا تقرر ہونا چاہیے تو مفتی صدر الدین خاں صدر والصدور نے کہا کہ ہمارے شہر میں فارسی کے استاد صرف تین شخص ہیں۔ ایک مرزا نوشہ، دوسرے حکیم مومن خاں، تیسرے امام بخش صہبائی۔ مرزا نوشہ بھلا یہ روگ کیوں پالتے۔ انھوں نے انکار کر دیا، مومن خاں نے یہ شرط رکھی کہ سو روپے ماہانہ سے کم کی خدمت قبول نہ کروں گا۔ مولوی امام بخش صہبائی کا کوئی ذریعہ معاش نہ تھا انھوں نے یہ خدمت چالیس روپے ماہانہ پر قبول کر لی۔

مولانا صہبائی ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی چیرہ دستی کا شکار ہوئے اور شہید کر دیے گئے۔ آزردہ نے جب ان کی شہادت کی خبر سنی تو بے اختیار چیخ اٹھے۔

کیوں نہ آزردہ کہے جائے، نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

صہبائی کا ایک شعر ہے۔

مردم دور چشم کردم عالے تاریک گشت
من مگر شمع چو رفتم بزم برہم ساختم

صہبائی نے اپنے آپ کو شمع سے تعبیر کیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء میں دہلی کی آخری شمع بجھ گئی اور بساط الٹ گئی۔

اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

دیکھیے بات میں بات نکلتی ہے، میں نے دہلی کے شاعروں کا ذکر کیا تھا اور لے بیٹھا دہلی کالج مرحوم کا رونا، لیکن دہلی کالج میں جہاں مشرقی تہذیب کے سورج کی ڈوبتی کرنوں کے ساتھ انگریزی تعلیم کی شمع جلائی گئی تھی، بڑے معرکے کے شاعر ہوئے ہیں۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ دہلی کے ادیبوں اور شاعروں کا آخری مرکز مدرسہ غازی الدین خاں یعنی یہی دہلی کالج تھا یہاں اگر ایک طرف تصنیف و ترجمے کا کام ہوتا تھا اور درس و تدریس کی مسندیں آراستہ تھیں تو دوسری طرف ادبی مجلسیں بھی جمتی تھیں

جنھیں اس زمانے کے قادر الکلام استادانِ شعروادب رونق بخشتے تھے۔

ان مشاعروں کی روحِ رواں منشی فیض پارسا تھے۔ پارسا شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کی اولاد میں سے تھے۔ اچھے شاعر تھے۔ اُن کا ایک شعر ہے۔

کوئے الفت کے خاکسار اے دل
مثلِ آئینہ صاف طینت ہیں

اُن دنوں شہر کے دروازے ۹ بجے بند ہوجاتے تھے۔ مدرسہ شہر کے باہر تھا لیکن مشاعرہ کے دن ۲ بجے تک اجمیری دروازہ کھلا رہتا تھا۔ ان مشاعروں میں شاہ نصیر، استاد ذوق، مومن، غالب، آزردہ، شیفتہ، صہبائی اور ان کے شاگرد دادِ سخنوری دیتے تھے۔ وہ مشاعرہ جو تیلیوں کی طرح بکھرا ہوا تھا، اسی دلی کالج کا مشاعرہ تھا جس کی بابت مہاراجہ شاہ ظفر نے کریم الدین سے کہا تھا کہ وہ تو کہو غینمت ہوا کہ ردیف میں تیلیاں ہی تھیں کہیں خدانخواستہ اگر ردیف "لکڑیاں" ہوتی تو نہ جانے کتنوں کے سر پھٹ جاتے۔

حضرات! سچ تو یہ ہے کہ دلی مرحوم کا ماتم لوگوں نے برسوں کیا ہے اور کرتے رہیں گے۔ اتنی تھوڑی مدت میں اس کا حق ادا نہیں ہوسکتا، اس لیے آخر میں، میں مدرسہ غازی الدین خاں کے آخری مشاعرہ کا ماجرا سُنا کر اپنی درازنفسی کا سلسلہ ختم کرتا ہوں۔

شاہ نصیر جب لکھنو سے دلی آئے اور اس مشاعرہ میں شریک ہوئے تو وہ غزل پڑھی جس کا مطلع تھا

ہم بھڑک کر توڑتے تارِ نفس کی تیلیاں
پر نہ تھیں اے ہم صفیر اپنے بس کی تیلیاں

اس غزل پر شاہ نصیر کو بہت داد ملی۔ شعرا نے اپنے شاگردوں کو اس زمین میں غزلیں لکھ کر دیں۔ شاہ نصیر کو یہ بات ناگوار گذری، انھوں نے تقریباً پچاس غزلیں کہہ کر اپنے شاگردوں کو دیں۔ انھوں نے وہ غزلیں مشاعرے میں پڑھیں چنانچہ طے پایا کہ ہر مشاعرہ میں طرحی غزل کے ساتھ تیلیوں والی طرح جاری رہے۔ پھر کیا تھا یہ سلسلہ دھوم سے چلا۔ دوسرے شاعر آٹھ آٹھ، نو نو شعر کی غزلیں اس طرح میں پڑھتے تھے لیکن شاہ نصیر ہر مرتبہ دو غزلہ ساٹھ ستر بیت کا پڑھتے تھے اور ان کا ہر شاگرد انیس بیس شعر سے کم کی کوئی غزل نہیں پڑھتا تھا۔ ان مشاعروں میں پبلک بھی کافی شریک ہوتی تھی اور جب تیلیوں کی معرکہ آرائی کا سلسلہ شروع ہوا تو لوگ جوق در جوق مشاعرے میں پہنچے تھے سب کی نگاہیں شاہ نصیر اور شیخ ذوق کی طرف لگی رہتی تھیں۔ آخری مشاعرہ میں استاد ذوق کا وہ قصیدہ جو انھوں نے بہادر شاہ کی ولیعہدی کے زمانے میں لکھا تھا پڑھا گیا۔ اس قصیدہ کا ایک شعر تھا۔

چتی ترے دالان کی نازک بہت ہے نازنیں
کیا لگائی اس میں ہیں پائے مگس کی تیلیاں

شاہ نصیر کے شاگردوں میں ایک کھلبلی مچ گئی انھوں نے سمجھا ہمارے استاد پر پھبتی کسی گئی ہے۔ چنانچہ منشی گھنشام رائے عاصی نے فی البدیہہ یہ قطعہ کہہ کر سنایا۔

ذوق اتنا شعر گوئی کا عبث کس واسطے
قافیہ میں گر نہ تھیں حضرت کے بس کی تیلیاں
آپ ہی منصف ہوں اے صاحب ذرا بہر خدا
یار کی چلمن ہوا اور پائے مگس کی تیلیاں
شیخ صاحب یہ وہ چلمن ہے کہ جس میں بے دریغ
باندھیے گر ہو سکے تار نفس کی تیلیاں

عاصی کے بعد شاہ نصیر کے صاحبزادے شاہ وجیہ الدین نے یہ شعر پڑھا۔

گرچہ قندیل سخن کو مندھ لیا تو کیا ہوا
ڈھانچے میں تو ہیں وہی اگلے برس کی تیلیاں

ان معرکہ آرائیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بزم مشاعرہ درہم برہم ہو گئی۔ [1]

---

[1] اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں اور رسالوں سے مدد لی گئی۔

۱۔ "آب حیات"۔ محمد حسین آزاد (۲) "گل رعنا"۔ عبدالحی (۳) "نگار"۔ "مومن نمبر (۴) "نقش حیات" جلد دوم) مولانا حسین احمد مدنی (۵) "سید احمد شہید اور جماعت مجاہدین"۔ غلام رسول مہر (۶) "آثار الصنادید"۔ سرسید احمد خاں (۷) "دہلی کی آخری شمع" (۸) "تاریخ مشائخ چشت" خلیق احمد نظامی (۹) "مرحوم دہلی کالج"۔ مولوی عبدالحق (۱۰) "دلی کالج اردو میگزین" "قدیم دہلی کالج نمبر۔ (۱۱) "نوح کوثر"۔ شیخ محمد اکرام

(12) ROBERT'S HISTRY OF BRITISH INDIA

●

پامسٹری سائنس ہے اور سائنس ایک حقیقت اور آپ حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے

اگر آپ پامسٹری کو غلط ثابت کر سکتے ہیں تو

ایم۔ ایم ہاشم پامسٹ

۸۸۶۔ اسپیشل بی کلاس ٹے پلی، حیدرآباد سے رجوع کیجئے۔ فون نمبر ۲۲۲۸

شمیم کرہانی

سفینۂ غزل اور فیض

حافظ شیرازی کا شعر ہے ۔ ؎

در ایں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است
صراحیٔ مے ناب و سفینۂ غزل است

خالی از خلل ۔ تباہی و انتشار اور رنج و ملال سے خالی یعنی پُرامن ۔

سفینۂ غزل ۔ غزل کی بیاض ۔ فارسی میں "سفینہ" کشتی ہی کو نہیں بیاض اشعار کو بھی کہتے ہیں ۔ اب اس شعر کا مطلب کچھ یوں ہوتا ہے ۔

اس زمانے میں رفیق جو انتشار و پریشانی اور رنج و ملال سے خالی اور پرامن ہے وہ انگوری شراب کی صراحی اور غزل کی بیاض ہے ۔ لوگوں نے انگوری شراب کی صراحیاں بھر لی ہیں اور غزل کی بیاضیں کھول لی ہیں ۔ شراب پیتے جاتے ہیں دیوانوں (اشعار کی بیاضوں) سے غزلیں پڑھتے جاتے ہیں ۔

اب اس شعر کی تشریح فیض احمد فیض صاحب کی زبان سے سنیئے ۔

سفینۂ غزل

" غزل کی بات چلے تو حافظ کا شعر فوراً ذہن میں آتا ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ غزل کے لیے "سفینہ" سے بہتر استعارہ ممکن نہیں ۔ سفینہ سے حرکت اور رفتار کا تصور بھی وابستہ ہے ، امن و سکون کا بھی کسی ایک مقام پر ملاح ناؤ کو دریا میں ڈالتا ہے ۔ راستے میں دھارے کا بہاؤ ، ہواؤں کا رُخ ، پانیوں کی گہرائی ، ساحل کی نوعیت بدلتی رہتی ہے ، ناؤ کبھی ساحل کی عافیت میں دھیرے دھیرے چلتی ہے ، کبھی وسط دریا میں تیزی سے اڑی جاتی ہے ، راستے میں شاداب وادیوں سے بھی گذرنا ہوتا ہے ، سنسان ویرانوں سے بھی ، آباد شہر بھی راستے میں پڑتے ہیں ، برباد بستیاں بھی ۔ کبھی سحر کی کرن روشنی ناؤ کے جلو میں چلتی ہے ، کبھی رات کا مہیب اندھیرا اسے گھیر لیتا ہے ۔ کشتی اور کشتی بانوں پر ان سب مظاہر کا عکس پڑتا ہے ، صبح و شام کی دھوپ چھاؤں کی طرح کشتی اور اہل کشتی پر سے بھی کبھی امید و بیم ، خوف و رجا ، امن و خطر ، شادی و غم ، اداسی اور شگفتگی کی ظلمت و نور کی لہریں گذرتی رہتی ہیں لیکن ناؤ کی اپنی صورت نہیں بدلتی ، وہ کہیں رکتی بھی نہیں ، کبھی بدلتی بھی نہیں ۔ اگر وہ وسط دریا میں ساکن ہو جائے تو لہریں

اُسے پاش پاش کردیں اگر ناؤ والے وسط دریا میں اس کے تختے الگ الگ کر کے کسی اور ترکیب سے جوڑنا چاہیں جب بھی اس کا کچھ باقی نہ رہے۔

حافظ نے غزل کی دوسری صفت "خالی از خلل" بیان کی ہے۔ "خالی از خلل" اس شئے کو سمجھنا چاہیے جو "نہ خلل پذیر ہو نہ خلل انداز" یعنی اس کی تعمیر میں خرابی مضمر ہو نہ اس کے عمل میں شر و فساد۔"

اب دیکھیے کہ حافظ کے اس شعر سے غزل کے مزاج اور ارتقا کی وضاحت ہوتی یا نہیں؟ اس صنف سخن نے ہر عہد اور ہر دور کے عمومی اور انفرادی احساسات کی ترجمانی کی۔ ہر زمانے کے عوام و خواص کے دل و دماغ کی کیفیتیں اس کے آئینے میں منعکس ہوتی رہی۔ لیکن بااین ہمہ اس کی ظاہری صورت آج بھی وہی ہے جو ابتدا میں تھی۔ اگر غزل روح عصر کی ترجمان نہ رہے تو اس کی صورت قعر دریا میں ساکن سفینے کی سی ہو جائے گی اور اگر اس کی ہیئت کے نقوش اور ٹھہراؤ میں خلل آیا تو اس کے چوب و طناب دریا بُرد ہو جانے کا اندیشہ ہے۔"

اس خوبصورت اور عظیم الشان تشریح و تاویل کو پڑھ کر میرا دماغ پراگندہ ہو گیا۔ "سفینہ" یہاں کشتی کے معنی میں کسی طرح ٹھیک نہیں۔ زمانہ خلل صراحی مے ناب غرض کوئی لفظ کشتی یا دریا کے لیے مساعد نہیں ہے۔

فیض صاحب نے جو "خالی از خلل" کی تشریح کی ہے۔ اس تشریح نے بھی مجھے حیران کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ خالی از خلل صرف غزل ہی کی صفت نہیں ہے بلکہ صراحی مے ناب کی بھی صفت ہے کیونکہ شاعر دونوں کا ذکر ایک ساتھ کر رہا ہے۔ لہٰذا فیض صاحب نے سفینۂ غزل کی جیسی شاندار تشریح کی ہے ویسی ہی شاندار تشریح کی صراحی مے ناب بھی پیاسی نظر آتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ اس شعر میں حافظ نے صرف اتنی سی بات کہی ہے کہ اس کے عہد میں شراب و نغمہ پر کوئی احتساب نہیں ہے۔ لوگ عیش کی شراب پی رہے ہیں اور نشاط کے نغمے گا رہے ہیں۔

سطور بالا کا مقصد، شعر کے مفہوم کی تلاش ہے۔ ان سطور کے ذریعہ فیض صاحب ایسے ذی علم اور ممتاز شاعر کی طرف سے سوءظن پیدا کرانا ہرگز ہرگز مقصود نہیں ہے۔ وہ میرے ہم عصر ہیں ——— میرے ہم سفر ——— میں ان سے غائبانہ خلوص رکھتا ہوں۔

شکیل الرحمٰن

غالب ــــ نئی کتاب

"INTERPRETATION OF GHALIB" ۳۲۶ میں پنڈت جے۔ ایل۔ کول نے مرزا غالب کے تین سو چھبیس اشعار کے ترجمے کیے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے یہ کہہ کر حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ ایک نہایت ہی مشکل کام تھا، ہر زبان کی شاعری اپنے شاعرانہ تخیل کی ایک مخصوص دنیا رکھتی ہے لفظوں کا ترجمہ کر دیا جا سکتا ہے مگر وہ دنیا ترجمہ کی پکڑ میں نہیں آسکتی دیباچہ میں مولف نے اس کا اقرار کیا ہے کہ یہ تعبیر اور مفہوم ہیں انھیں ترجمہ سمجھنا چاہیئے۔ جے ال کول نے اس کی کوشش کی ہے کہ غالب کے اشعار کی تشریح کے ساتھ شاعرانہ تخیل اور مزاج کو سمجھنے کے لیے ایک چھوٹا سا پس منظر بھی تیار ہو جائے اس کوشش میں انھیں کامیابی کم ہوئی ہے۔ پس منظر تیار کر لینا آسان ضرور ہے لیکن یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ پس منظر پیش منظر کے رنگ و روپ کی مناسبت سے تیار ہوا ہے یا نہیں۔ جے ایل کول نے غالب کی شاعری کو صرف تخیلی شاعری کہہ کر بہت سی ذمہ داریوں سے دامن بچانے کی کوشش کی ہے۔ اشعار کے انتخاب میں انھوں نے ایک بات کو خاص طور پر پیش نظر رکھا ہے اور وہ یہ کہ غزل میں چونکہ کوئی ایک مزاج اور کوئی ایک لہجہ نہیں ہوتا اس لیے انتخاب جہاں سے بھی چاہے کیا جا سکتا ہے یہ بات کچھ عجیب ہے۔ تفہیم کا جہاں تک تعلق ہے اسے ایک معنی میں اس طور پر قبول کیا جا سکتا ہے لیکن مزاج اور لہجہ کا جہاں تک تعلق ہے غزل پر یہ الزام نہیں دیا جا سکتا۔ ایک غزل میں اگر مزاج اور لہجہ میں خواہ مخواہ تبدیلی آجائے تو اس سے ظاہر ہے کہ غزل کی روح کو تکلیف پہنچائی گئی ہے۔ غالب کی غزلوں کے مزاج اور لہجہ سے ہم اچھی طرح واقف ہیں۔ اس خیال کے پیش نظر جے ال کول نے غالب کی غزلوں سے جہاں سے چاہا ہے شعر چن لیا ہے۔ اس طرح بعض اچھے اشعار شامل نہ ہو سکے ہیں اور کچھ ایسے اشعار شامل ہو گئے ہیں جن کی ضرورت نہ تھی۔ جے ال کول نے چونکہ ترجمہ اور تشریح سے زیادہ پس منظر اور انفرادی کنٹری بیوشن پر زور دیا ہے اس لیے غالب کے اسٹائل کی خوبیوں اور خیالات کی بلندی کو پالینا مشکل ہو گیا ہے۔ کول صاحب نے جن اشعار کو منتخب کیا ہے وہ غالب کے مزاج اور ان کی شاعری کے خاص پہلوؤں کی نمائندگی ضرور کرتے ہیں لیکن بعض ایسی اہم غزلوں کی یاد آتی ہے جن کے اشعار پر زور دینا اور جن کی تشریح بہت سی باتوں کے لیے ضروری تھی۔ ایسے اشعار جن میں نفسیاتی حقائق ہیں ان کے لیے ایک دل فریب پس منظر تیار کر کے اپنی انفرادی رائے دی جا سکتی ہے اس سلسلے کے کچھ اشعار شامل ہیں لیکن ان کی تشریح کے لیے مناسب پس منظر نہیں، انفرادی خیال کے اظہار کی بات تو الگ رہی۔ کول صاحب

نے یہ درست کہا ہے کہ غالب نے جن حالات میں شاعری کی تھی ان حالات کی مکمل تصویر ہمارے سامنے نہیں ہے، جن حالات اور جن جذباتی حادثوں نے ان کی زندگی کو متاثر کیا تھا ان کا ذکر اس طور پر سامنے نہیں آتا کہ ہم غالب کے ذہنی ارتقا کو سمجھ سکیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اس سے ہم غالب کی عظمت کو اور زیادہ سمجھ سکتے۔ کول صاحب غالب کی صرف ایک غزل اس طور پر سامنے لاتے ہیں کہ اس میں آخری مغل شہنشاہ کی عظمت گرتی ہوئی نظر آرہی ہے۔ ماحول کی تصویر کشی اور تنقید کو دیکھنے کے لیے تمام شاعری کو ایک ساتھ نظر میں رکھا جائے تو اس سے اور بھی دلچسپ باتیں سامنے آجائیں گی۔

مرزا غالب نے جس طرح اردو غزل کو تصنع سے پاک کیا اور سچے جذبات کے آہنگ کو شامل کر کے انوکھے سمبولزم کے قریب کیا اس پر کول صاحب نے کم لیکن اچھی روشنی ڈالی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ غالب کی غزلیں قاری کے ذہن کو جھنجھوڑتی ہیں اور ان کے ذہن سے کچھ مطالبے کرتی ہیں۔ ان کی شاعری کی نزاکتوں کو محسوس کرنے کے لیے اور ان کی شاعری پر سوچنے کے لیے ہمارے پاس کافی مواد ہے۔

بعض اچھے اشعار کو انگریزی زبان کا جامہ پہناتے ہوئے یہ ہوا ہے کہ اس میں صرف ترجمہ کی کیفیت رہ گئی ہے، مثلاً۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

ART THOU NOT HE, O GOD, WHO IN THE PAST
EXALTED MAN, AND FROM THY HEAVEN DROVE OUT
THE ANGELS RECALCITRANT WHO WOULD NOTBEND
THEIR KNEE TO HIM? AND WHY SHOULD HE ——
THE ONE EXALTED MAN, THE CROWN OF THY CREATION
NOW FALL SO LOW THAT NONE WILL DO HIM REVERENCE
AND NONE WILL HEED HIS WRETCHEDNESS?

اور۔

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

I WILL TO MYSELF BE A GUIDE,
AND WILL NOT FOLLOW KHIZAR'S LEAD
NOR THAT OF OTHER MEN,

THY ARE BUT FELLOW-TRAVELLERS

WHO HAVE PRECEDED ME —

MY ELDERS, AND NO MORE

اس قسم کے اشعار کی تشریح کے کچھ مطالبے بھی ہیں۔ اردو غزل میں خصوصاً غالب کی شاعری میں دوست ناصح، واعظ، کوہکن، قیس کی جو اہمیت ہے اور ان میں جو چھن اور سرمستی ہے انگریزی زبان میں پیدا نہیں ہو سکتی ان کی حقیقت کو زیادہ صاف کرنے کی ضرورت تھی۔ اس سلسلہ میں جے ایل کول نے کوئی دھیان نہیں دیا اور اس طرح غالب کے اچھے اور بلند خیالات کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکا۔

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح ___ کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا
واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو ___ کیا بات ہے تمھاری شراب طہور کی
شوق ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

ایسے اور بہت سے اشعار کی تشریح صرف معنی بیان کرنے کی حد تک ہے۔ مشرقی شاعری کی روح ایک مغربی شاعری میں نہیں آ سکی ہے۔ انھیں لفظی ترجمہ کہنا چاہیئے۔ کول صاحب نے ایسے اشعار کے لیے نہ کوئی پس منظر تیار کیا ہے اور نہ کوئی انفرادی کنٹری دی ہے۔

کول صاحب کی اس کوشش میں بڑی جرأت ہے۔ انھوں نے اس کتاب پر جتنی محنت کی ہے اور جس ادبی ایمانداری اور خلوص کو شامل رکھا ہے اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اس کتاب کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ تشریح کے ساتھ کول صاحب نے انگریزی میں شاعری بھی کی ہے۔ ان کی زبان کی لطافت اور ان کے لہجہ کی پاکیزگی کو غالب کے خیالات نے نہ جانے کتنی بلندیوں پر پہنچا دیا ہے۔ مثال کے لیے ایک شعر دیکھیئے:۔

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

WHEN I SAID AT LOVE'S REVELS

THERE SHOULD NO STRANGERS BE,

SHE, WHO, LOVES TO POKE FUN AT

OTHER'S DISCOMFITURE

SHOWED ME THE DOOR AND SAID

(A TWINKLE OF MISCHIEF IN HER EYES)

"YOU MEAN YOURSELF NO DOUBT"

اس طرح کی اور بھی بہت اچھی کوششیں موجود ہیں۔ جہاں انگریزی میں غالب کی شاعری کو سمجھنے میں اس کتاب سے بہت مدد مل سکتی ہے وہاں اردو حلقہ میں بھی اسے کافی مقبولیت حاصل ہوگی۔ اردو کے ادیبوں اور شاعروں پر اس طرح کام ہوتا رہے تو دوسرے حلقوں میں اردو زبان و ادب کی عظمت کا احساس زیادہ سے زیادہ بڑھتا جائے گا۔ (ریڈیو کشمیر سرینگر سے براڈ کاسٹ)

افکارِ سہیل

مولانا اقبال احمد خاں سہیل کے علمی اور ادبی مقالات، مکتوبات اور خطبات کا مجموعہ

مرتبہ: شوکت سلطان، علی حماد عباسی، قیمت: چار روپے

ملنے کا پتہ

نگران شبلی نیشنل کالج میگزین۔ اعظم گڑھ (یوپی)

"گذشتہ چند برس سے بعض پڑھے لکھے حلقوں میں یہ غلط فہمی عام ہو رہی ہے کہ منشی پریم چند کے بعد اردو افسانے نے جو ارتقائی سفر شروع کیا تھا اس کا تسلسل اعلان آزادی کے بعد ٹوٹ گیا ہے۔ یہ حلقے بانو قدسیہ کا شکار ہیں، یا ان کا مطالعہ محدود ہے۔ ورنہ آخر کیسے ممکن ہے کہ جیلانی بانو کے افسانوں کی موجودگی میں اس قسم کی غلط بیانی کا ارتکاب کیا جائے۔" !! (احمد ندیم قاسمی)

اردو افسانوں کے راستے میں جیلانی بانو نے نئے چراغ جلائے ہیں ــــ اور اب

روشنی کے مینار

جیلانی بانو کی کہانیوں کا پہلا سنگ میل ہے

جسے نیا ادارہ لاہور اپنی روایتی خوبصورتی سے پیش کرتا ہے

اگست ۱۹۵۷ء میں شائع ہو رہی ہے

نشور واحدی

فکرِ نو ذوقِ تپاں سے آئی ہے
گرد تھوڑی کارواں سے آئی ہے

زندگی پرچھائیاں اپنی لیے
آئینوں کے درمیاں سے آئی ہے

سیکھ کر جادو وہ چشمِ مے فروش
محفلِ جادوگراں سے آئی ہے

رات کے افسوں جگاتے ہی رہے
نیند اپنی داستاں سے آئی ہے

ہو لئے ہم زندگی کے ساتھ ساتھ
یہ نہیں پوچھا کہاں سے آئی ہے

یا جوانی چھو رہی ہے چاند کو
یا محبّت کہکشاں سے آئی ہے

داغہائے سینہ میں یہ تازگی
التفاتِ ناگہاں سے آئی ہے

تھا ابھی جاری بیانِ زندگی
موت اٹھ کر درمیاں سے آئی ہے

کیا خبر تجھکو اسیرِ نو بہار
کتنی رعنائی خزاں سے آئی ہے

انقلابِ نو میں یہ قوّتِ نشور
میرے دستِ ناتواں سے آئی ہے

محمود ایاز

گذرتے لمحوں کی باتیں گذرتی رات کا ذکر
مری حیات کا حاصل یہی غمِ مبہم

کچھ اس طرح سے کٹی جا رہی ہے عمر دراز
نہ قربتوں کی خوشی ہے نہ دوریوں کا الم

وہ دن بھی تھے کہ ترے قرب کی تمنّا تھی
اب اپنی سادگیٔ شوق پر خجل ہیں ہم

●

وہ دور ہوں تو جدائی سہی نہیں جاتی
جو پاس ہوں تو نظر اُن پہ کی نہیں جاتی

بقیدِ ہوش تقاضائے دید ہے ان سے
نگاہ و دل کی ابھی گمرہی نہیں جاتی

نظر ملا، مرا احوال پوچھنے والے
حدیثِ شوق و تمنّا کہی نہیں جاتی

مظہرِ امام

مجھے اسی نے تری انجمن میں پہنچایا
ہجومِ یاس میں تیرا خیال کام آیا

غمِ جہاں کو ترا غم بنا لیا اس نے
تری نگاہ میں دل نے نہ جانے کیا پایا

بہ وقتِ وعدہ، وہ اندازِ جنبشِ مژگاں
مجھے تو جھوٹ کی معصومیت پہ پیار آیا

مری حیاتِ پریشاں کو کیا ملا آخر
ہزار زلف کو اپنی کسی نے سلجھایا

ملی نہ تھاہ ابھی تک زمیں کے ذرّوں کی
فرازِ چرخ سے تاروں کی تھاہ پا آیا

نئی نگاہ ملی شاہدانِ گیتی کو
رخِ حیات سے کس نے یہ پردہ سرکایا

فروغِ حسن سے صیقل ہوئی دماغوں کو
کمالِ عشق سے عالم میں انقلاب آیا

اظہر سعید

کیا کہیں کس طرح اس کوچہ میں اٹھتے ہیں قدم
نیند میں جیسے کوئی چلتا ہے یوں چلتے ہیں ہم

یہ پریشاں بال یہ آنسو یہ آہِ دم بہ دم
کھل گیا ظالم تری غفلت شعاری کا بھرم

میکدہ کی آبرو کا آگیا ہے جب سوال
گردنِ کراڑ گئے ہیں راہ سے دیر و حرم

آخر آخر اپنی حالت پر ہنسی آنے لگی
پہلے پہلے تو غمِ دل پر بہت روئے تھے ہم

منزلِ دشوار آساں ہوگئی جب مل گئے
راستے کے پیچ و خم سے گیسوؤں کے پیچ و خم

جیت تیری ہی سہی لیکن نگاہِ فتحمند
مجھکو احساسِ شکستِ دل تو رہنا کم سے کم

یہ بھی مشکل تو نہیں پر کون لے گا دوستو
گر مئی رفتار دے کر سایۂ ابرِ کرم

قمر ساحری

ہے تیرے دم سے سلسلۂ در دِ روز و شب — تیرا ہی غم نہیں تو زمانے کا غم نہیں
ذکرِ جفا کے ساتھ ہی آنسو نکل پڑے — دل ہی تو ہے حضور کوئی جامِ جم نہیں
یہ زندگی ہزار سہی زندگی مگر — تیرے بغیر موت کے عالم سے کم نہیں
تیرے کرم سے ایک زمانے کا تھا ستم — تیرا کرم نہیں تو کسی کا ستم نہیں
اس رہ گذر پہ خضر بھی مایوس و نامراد — وہ رہ گذر کہ جس پہ ہمارے قدم نہیں
جو بے نیازِ غم ہو اُسے دل کہے گا کون — وہ کعبہ ناتمام ہے جس میں صنم نہیں
یہ فکرِ صبح و شام یہ آزارِ کشمکش — دنیا بہشت ہو کے بھی دوزخ سے کم نہیں

شاید یہ انکسار کی معراج ہے قمرؔ
اپنا سرِ نیاز کسی در پہ خم نہیں

غفور انیس

صحرا میں کیوں خموش ہے اتنا فدائے گل
شاید کہ آ رہی ہے کہیں سے صدائے گل

کتنا ہے دردناک مآلِ غرورِ حسن
کچھ خشک پتیاں ہیں چمن میں برائے گل

میں اپنی کہہ چکا مگر اے عندلیبِ زار
تو بھی سنا سکے تو سنا ماجرائے گل

اک شوخ نے جو ہنس کے لبوں سے لگا لیا
کچھ اور سرخ کر گئی گل کو حیائے گل

شاید چمن میں جرم ہے احساسِ حسن بھی
صحرا میں پھر رہے ہیں نثارِ ادائے گل

چھیڑی ہے میں نے آج نرالی غزل انیس
ویرانۂ سخن میں ہوں نغمہ سرائے گل

زبیر رضوی

سرمستی و سرشاری بدنام ہوئی اپنی　　ساقی پہ مگر کوئی الزام نہیں آیا

میں جام لیے جھوموں وہ سامنے لے گائیں　　چاہت میں کوئی ایسا ہنگام نہیں آیا

وہ آئے مگر ان سے کچھ بات نہ ہو پائی　　جا اے دلِ دیوانہ تو کام نہیں آیا

دل ہے کہ مچلتا ہے غم ہے کہ سلگتا ہے　　مدت سے کوئی ان کا پیغام نہیں آیا

دل میں ہیں تری یادیں لب پر ترے افسانے
خوش ہوں تری محفل سے ناکام نہیں آیا

بشیر بدر

سبزہ کہسار پر سر اٹھاتا رہا، ریگ زاروں میں گل مسکراتے رہے
موت کے تیرہ و تار شمشان میں، زندگی کے دیئے جگمگاتے رہے
غزلیں کھلا گئیں نظمیں مرجھا گئیں، گیت سنولا گئے ساز چپ ہو گئے
پھر بھی خوش ذوق تھے کتنے اہل چمن نغمۂ فصل گل گنگناتے رہے
تیز سانسوں کی خوشبو لبوں کی مہک جانے کیسے ہوائیں اڑا لائی تھیں
رات کا ہر قدم کچھ بہکتا رہا عشق کے پاؤں بھی ڈگمگاتے رہے
شاید زندگی تو نے بھولے سے بھی ہم غریبوں کی جانب نہ دیکھا کبھی
اور ہم کو تری عظمتوں کے لیے سر کٹاتے رہے، جاں لٹاتے رہے
جیسے کشمیر کی جھیلوں کی آغوش میں ننھے ننھے ستارے اتر آئے ہوں
رات ان نیلی آنکھوں میں کچھ ایسے ہی آنسوؤں کے دیئے جھلملاتے رہے
تیرے لب کی مہک میرے بازو کا بل تیری آنکھوں کا رس میرے ہاتھوں کا جس
سالہا سال سے جنس بازار ہے، صاحب نقد بولی لگاتے رہے
اپنی پرخواب آنکھوں کی آغوش میں کتنی البیلی صبحوں کے سپنے لیے
نغمۂ زندگی گنگناتے ہوئے، ہر قدم سوئے منزل بڑھاتے رہے
کون شیریں سخن، مسکراتا بدن، نکہتوں کا چمن یاں نہا کے گیا
آج سنگم کی ہر موج ہے موج گل پربتوں گنگ و جمن گنگناتے رہے
رات موسم بہت کیف انگیز تھا، اس پہ یادوں کی زلفیں بھی لہرا گئیں
دیر تک دل سے تیری ہی باتیں رہیں بھولی بسری کہانی سناتے رہے
نامکمل ہے تصویر حسن جواں، اس کی رنگینیٔ تن کو پائیں کہاں
کتنے بہزاد و مانی بناتے رہے، کتنے خیام و غالب سجاتے رہے

علی حماد عباسی

جو مے تھی بہادی مٹی میں

اس چھوٹے سے نیم اندھیرے کمرے کی بند بند سی فضا کسی رسوا سر بازار قسم کی عورت کی نوجوانی کی طرح کثیف اور کسی ناکام محبت کے ذہن کی طرح پراگندہ تھی۔ وہاں ہر چیز کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا۔ وہاں جو چیز تھی وہ ہر طور کے نظم و ترتیب سے روٹھی روٹھی سی تھی۔ اس کمرے کے اندر چاروں طرف نظر دوڑا کر ہر نئے آنے والے کو ایسا محسوس ہوتا کہ کسی معمار نے کسی ابہام پسند شاعر کے بے ربط اور الجھے ہوئے افکار کو اس کے حلقۂ دام خیال سے نکال کر ایک کمرے کا روپ دے دیا ہو۔

جوں ہی میں اس کمرے میں داخل ہوا میری قدم بوسی کو کچے فرش کی سیلن سے پھولی ہوئی مٹی بے اختیار آگے بڑھی جس پر جا بجا بہت سے قدموں کے نقوش شاید اس کمرے میں مقیم کسی مدہوش جوانی کی عنایت و کرم طلب کرنے والوں کی مسلسل آمد و رفت کی گواہی دے رہے تھے۔ بکھرے ہوئے سگرٹوں اور بیڑیوں کے بے شمار روندے کچلے ٹکڑے، دیا سلائیوں کی ان گنت تیلیاں، کچھ خالی ڈبے اور کچھ خالی بوتلیں، جو سارے کمرے میں بکھرے ہوئے دنیا کی مطلب پرستی کا رونا رو رہے تھے بڑے اشتیاق کے ساتھ میرے خیر مقدم کو لپکے۔ اس کے بعد پان کی پیکوں کے بدنما دھبے جن کی گل کاریوں کا تقریباً تمام کمرہ رہین منت تھا، در و دیوار پر مدت سے بیٹھے ہوئے گرد و غبار، میلے کچیلے کپڑوں کی مہک، سگریٹ اور بیڑیوں کے دھوئیں کے سرغولوں نے مجھ اجنبی جان کر بڑے تپاک سے خوش آمدید کہا۔

ابھی میں اپنے ان خاموش استقبال کرنے والوں کی طرف دست نظر بڑھا ہی رہا تھا کہ میری نگاہ اس گندے کمرے کے کھلینوں کی طرف گئی۔ ان میں سے دو تو میرے محلے ہی کے نوعمر لڑکے تھے جن کی مسیں ابھی مشکل ہی سے بھیگی ہوں گی۔ وہ دونوں میری غیر متوقع آمد پر اس طرح حیران و سراسیمہ تھے کہ جیسے وہ بس ابھی ابھی ہڑبڑا کر اٹھیں گے اور کمرے سے بھاگ جائیں گے۔ مجھے دیکھ کر ان میں سے ایک نے تو سلگتے سگریٹ کو فوراً زمین پر پھینک کر پیروں سے مسل دیا اور دوسرے نے میری نظر بچا کر سگریٹ کو اپنی ہتھیلی کے آغوش میں چھپا لیا۔ ایک ادھیڑ عمر کا دبلا پتلا آدمی بھی تھا جو دیوار کی طرف منھ کیے شاید کسی جاسوسی ناول کے مطالعہ میں محو تھا۔ میرا دھیان تھوڑی دیر کے لیے اس منحوس صورت آدمی پر رکا جو ایک کونے میں کھڑا دیوار سے ٹیک لگائے بیڑی پی رہا تھا۔ وہ ایک میلا چوڑی دار پاجامہ، بنیر کالر کی نیلی قمیص اور اس کے اوپر خاکی رنگ کا میلا جیکٹ کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کی ڈراؤنی آنکھوں اور تلوار نما مونچھوں والے چہرے پر سوائے ناک کے کوئی اور ابھری ہوئی چیز

تھی۔ مجھے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اس نے منہ میں لگی ہوئی بیڑی کے ذرا سے ٹکڑے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور دلالوں کے سے خوشامدانہ انداز میں مسکراتے ہوئے اس نے اپنے غلیظ دانتوں کا اس طرح مظاہرہ کیا گویا کہ اس قابل اجتناب حد تک مکروہ ہیئت کے علاوہ مجھے پیش کرنے کو اس کے پاس کچھ اور رہا ہی نہیں۔ میں اس غلاظت کی تاب نہ لا سکا۔ میری نفاست پسند طبیعت کو گندگی اور کراہت کے احساس سے گھن سی آگئی۔ پھر میری نگاہ ذرا دوسری طرف بڑھی تو مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ جیسے یکایک میرے لاشعور کی جھاڑیوں میں اردو کا یہ مصرع :

آج اس طرح کا دیکھا ہے پری زاد کہ بس!!

بے تحاشہ پھڑپھڑا اٹھا ہو۔ اصل میں میری نگاہ ایک لمحے کے لیے اس عورت پر جا کر تھم گئی جو کمرے کے وسط میں ڈھیلی ڈھالی بانس کی چارپائی پر بڑے مزے اور اطمینان سے نیم دراز لیٹی ہوئی سگریٹ پی رہی تھی۔ وہ ہلکے زرد رنگ کی ساڑی اور ہرے رنگ کی پھولدار شنٹون کے بلاؤز میں ملبوس تھی۔ اس کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے مجھے ایسا جان پڑا کہ جیسے وہ عورت نہ ہو بلکہ جیسے تازہ مکھن ٹھنڈک کی وجہ سے جم گیا ہو یا جیسے کسی خوش مذاق ساقی نے اپنی سیمیں ہتھیلیوں پر رکھ کر مے نشاط سے لبریز کوئی رنگین جام پیش کر دیا ہو۔ واقعی وہ اس قدر حسین تھی کہ اس کے جسم کے ایک عضو کو لیسندیدگی سے دیکھتے ہی جسم کا دوسرا عضو دامن دل اپنی طرف کھینچ لیتا اور بیچارا ٹھٹکا کہ یہی وہ جگہ ہے جس کی تمھیں تلاش تھی، یہی وہ جگہ ہے جہاں سے حسن و دلکشی کے سوتے ابلتے ہیں اور اہل دل کی تشنہ کامیوں کو سیراب کرتے ہیں۔ غالباً اس فراسیسی شاعر نے اسی کے متعلق کہا تھا کہ خدا نے جب اس عورت کو تخلیق کی ہوگی تو نہ معلوم اس کا اپنا ایمان متزلزل ہونے سے کیسے بچا ہوگا؟ میں نے ایک بار ذرا غور سے اس کی خوبصورت مدھماتی آنکھوں کی طرف دیکھا تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے اس کی آنکھیں مجھ سے کہہ رہی ہوں کہ آج سے تم بھی جان لو کہ آنکھوں کی مستی اور ہوتی ہے اور شراب کی مستی کچھ اور، اور اگر تم آنکھوں کے اس میخانے سے پی کر زندگی کی پُرخار وادیوں میں سرمست و بے خبر ہو کر جھومتے ہوئے چلنا چاہتے ہو تو آؤ اور مجھ میں کھو جاؤ۔ جھجھک کر اور کوتاہ دستی سے کام مت لو۔ ان آنکھوں میں جاتی ہوئی دنیا کی ساری رعنائی تھی، سارا کیف تھا، اس کے ہونٹ تازہ زخم کی طرح شاداب تھے۔

اس کے بے پناہ حسن کو دیکھ کر چند لمحات کے لیے میں سرخوشی کے احساس میں ڈوب کر بے خود سا ہو گیا اور یہ بھول گیا کہ میں کہاں ہوں۔ گندگی جو میرے اردگرد پھیلی ہوئی تھی اس کا خیال تو ایک طرف رہا، تھوڑی دیر کے لیے تو مجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ میں وہاں کس لیے گیا تھا اور ان لوگوں سے جو وہاں موجود تھے مجھے کیا کام تھا۔ میں خاموش تھا اور شناسا مجھے اپنے ساتھ وہاں لے گیا تھا وہ بھی خاموش تھا۔ اور وہ بھی دشمن ایمان و آگہی بنی ہوئی چپ چاپ سگریٹ پیے جا رہی تھی۔ کچھ وقفے کے بعد خود اس نے مہر سکوت توڑی اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے شناسا سے بڑے تیکھے انداز میں مسکرا کر پوچھا۔

"یہ کون سوّر ہے؟" میں یکایک چونک پڑا۔ اصل میں لفظ "سور" تو میں نے اپنی جھینپ مٹانے کے لیے لکھ دیا ہے ورنہ

اس نے کہا کچھ اور تھا اور جس سے مجھ جیسے شریف آدمی کی پیدائش پر صاف حرف آتا تھا اس ایک ہی لفظ نے مجھے اس قدر زور سے جھنجھوڑ دیا کہ وہ ساری خیال انگیز کیفیت جو مجھ پر کچھ دیر پہلے طاری تھی آن کی آن میں فضا میں تحلیل ہوگئی وہ سارا مکمن وہ ساری شراب جو اس کے حسین جسم میں مجھے نظر آتی تھی میرے حلق میں دیکھتے ہی دیکھتے مچھلی کے کانٹے کی طرح پھنس گئی۔ میں کھسیا گیا اور مجھے اس حالت میں دیکھ کر شمشاد بھی شرمندہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے کہا۔

"یہ ایک لیکھک ہیں میرے دوست!"

اس نے شمشاد سے پھر سوال کیا:

"کیوں بے! یہ لیکھک کیا بلا ہوتی ہے؟"

"ارے چندا! یہ کہانیاں لکھتے ہیں۔"

"کیسی کہانیاں؟" اس نے پوچھا اور ساتھ ہی ایک موٹی سی گالی بھی دی۔

اب مجھے بولنا چاہیے تھا چنانچہ میں نے کہا۔

"وہی کہانیاں جن میں کوئی خوبصورت لڑکی ہوتی ہے جس کو کوئی لڑکا چاہتا ہے اور پھر.....!"

"یہ سب جھوٹ ہے" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور سگریٹ کا ایک لمبا کش لگا کر دھوئیں کو فضا میں چھوڑتی ہوئی پھر بولی "یہ سب جھوٹ ہے۔ کوئی کسی کو نہیں چاہتا۔ دیکھو یہ سالا ہمارا شوہر ہے (اس نے غلیظ دانتوں والے بدصورت آدمی کی طرف اشارہ کیا جس نے گالی سن کر شکریے کے خیال سے دوبارہ اپنے دانتوں کا مظاہرہ کر دیا) لیکن یہ بھی ہم کو نہیں چاہتا۔ ہم سے بس روزینہ تاڑی پینے کو پیسہ مانگتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے روپیہ دو میں بیڑی کی دکان کروں گا۔ اب تم ہی بتاؤ لیکھک صاحب! میں سالا روپیہ کہاں سے لاؤں؟" وہ بے تکان بولی جا رہی تھی اور بے دھڑک کالیاں بک رہی تھی اس کو اس بات کا ذرا بھی احساس نہیں تھا کہ اس کے سامنے ایک شریف اجنبی انسان بیٹھا ہوا ہے۔ غالباً وہ پیے ہوئی تھی۔

باہر نکلتے جاڑوں کی شام کا چراغ آہستہ آہستہ گل ہو رہا تھا اور اس کے کمرے میں لمحہ بہ لمحہ تیرگی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں جلدی ہی باہر نکل آیا اور گلی کو گھڑی بھر کے لیے سنسان پا کر میں نے ذرا اطمینان کا سانس لیا ورنہ اگر اس وقت کوئی مجھے وہاں سے نکلتے دیکھ لیتا تو میرے بارے میں نہ جانے کیا سوچتا اور خدا جانے کیا غلط سلط رائے قائم کرتا مجھے اس وقت شمشاد پر بڑا غصہ آ رہا تھا جو مجھے اپنے ساتھ وہاں یہ کہہ کر لے گیا تھا کہ اس کمرے میں اس کی محبوبہ رہتی ہے۔

کم از کم شمشاد سے تو مجھے اس بات کی قطعی امید نہ تھی کہ وہ کبھی چند ایسی کسی عورت کی محبت میں گرفتار ہو سکے گا جب کہ اس کی اپنی گھر والی بھی ناک نقشے رنگ ڈھنگ میں کسی سے بھی کم نہ تھی۔ میں اس کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ گونڈے کا رہنے والا تھا اچھی خاصی شکل و صورت کا پڑھا لکھا ایک متین اور معقول انسان تھا۔ شہر کے کیا بڑے اور کیا چھوٹے تمام لوگ اس کی شرافت خوش خلقی اور ملنساری سے بخوبی واقف تھے کیونکہ قومی بچت کے تمسکات کے ایجنٹ ہونے کے ناتے اس کو سب ہی کے

پاس آنا جانا اور ان سے تعلق رکھنا پڑتا تھا۔ میرے پاس سے تو وہ ہر چوتھے پانچویں آیا کرتا تھا۔ کبھی کوئی کتاب مانگنے اور ریڈیو پر کبھی کوئی خاص پروگرام سننے کے سلسلے میں۔

اور چندا ــــ!! ــــ کسی حسین دھوکے کا بھرم کھل جانے کے بعد اس سے جھٹکارا پائے ہوئے آدمی کی طرح "نادم نادم، نازاں نازاں" میں یہ سوچتا ہوا گلی میں سے گذر رہا تھا کہ اگر اس کے خوبصورت جسم کو الف لیلیٰ کی طلسمی دنیا کے اس زنگا محل سے تشبیہ دی جائے جس میں ایک خبیث روح نظر بند تھی تو یہ حقیقت سے بہت دور کی بات نہ ہوگی!"

گلی کے نکڑ پر پہنچ کر میں اپنے گھر کی طرف جانے والی سڑک کے ساتھ داہنے جانب مڑنے ہی والا تھا کہ پیچھے سے جلدی جلدی لمبے لمبے قدم رکھتا شمشاد مجھے آتا ہوا دکھائی دیا۔ میں رک گیا کچھ ہی پل میں اس نے مجھے آلیا۔ وہ کچھ جھینپا جھینپا سا ضرور تھا لیکن میرے قریب آتے ہی کہنے لگا دیکھا آپ نے! ــــ یہی وہ چندا ہے، یہ رنگ، یہ روپ، یہ بانکپن اور جوانی آپ نے اس سے پہلے بھی کبھی دیکھی تھی۔ خیر آپ نے تو شاید اس سے زیادہ خوبصورت عورت کہیں دیکھی بھی ہوگی لیکن میں تو قسم کھا کے کہتا ہوں اس بلا کا قیامت خیز حسن اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"کچھ بھی ہو شمشاد! مجھے تو وہ ایک بدچلن عورت معلوم پڑتی ہے۔" میں نے کچھ روکھے پن سے کہا۔

"وہ تو ہوئی ــــ میں کب کہتا ہوں کہ وہ بڑی پارسا اور پاک صاف عورت ہے۔ وہ بدچلن ہے اور بدزبان بھی۔ اصل میں آپ جانتے نہیں، وہ ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ جنھوں نے اس کو سماج کی گندی موری میں گرا دیا ہے اب میں اس کو برائیوں کے گندے کیچڑ سے اٹھانا چاہتا ہوں، اس کو ان برے لوگوں کے چنگل سے نکالنا چاہتا ہوں جن کے ہاتھوں اس کی یہ درگت بن چکی ہے۔ وہ خود بری نہیں ہے بلکہ وہ بنا دی گئی ہے۔" شمشاد جذبات سے مغلوب ہو کر بول رہا تھا۔ اس کی آواز سے صاف معلوم پڑتا تھا کہ وہ کچھ کر گذرنے پر آمادہ ہے۔ اس کو اس وقت یہ سمجھانا بجھانا کوئلے کی دلالی میں ہاتھ ہمیشہ کالا ہوتا ہے بالکل بے سود تھا۔ میں نے سلسلۂ گفتگو بدلنے کے خیال سے اس سے یہ پوچھ لیا کہ آخر چندا یہاں آئی کیسے؟

"یہاں تو وہ بالادین کے ذریعہ آئی ہے۔" شمشاد نے مجھے بتایا۔

"یہ بالادین کون ہے؟"

شمشاد کی اطلاع کے مطابق بالادین نیپال سے گانجا اور بھنگ اسمگل کر کے گورکھپور کے آس پاس کے ضلعوں میں خفیہ فروشی کا کاروبار کرتا تھا اور انٹی کرپشن اور پولیس والوں کو دے دلا کر اس کے پاس جو کچھ بچ رہتا وہ سب پینے پلانے اور عیاشی کی نذر کر دیتا۔ چندا ان دنوں بالادین ہی کے کمرے میں مقیم تھی اور شمشاد وہاں اپنے نوکر شیدو کے توسط سے پہنچا تھا۔ شیدو بالادین کا پڑوسی تھا۔

"اور بالادین کو چندا کہاں سے ملی؟" میں نے سوال کیا۔

اس کا جواب دینے میں شمشاد نے ذرا توقف سے کام لیا کیونکہ قریب ہی تنبولی کی دکان پر میری اور اس کی جان پہچان کا ایک آدمی کھڑا تھا۔ اس دکان سے ذرا آگے بڑھ کر شمشاد نے مجھے بتایا کہ چند اکو بالادین گرمائیں گنج کے ایک ریلوے کنٹریکٹر کے پاس سے لایا تھا اور اس کنٹریکٹر کو وہ ایک تھانیدار کے ہاں ملی تھی جس کو ایک سابق زمیندار نے اسے ازراہ دوستی یا کسی قتل کے مقدمے کے سلسلے میں بطور نذرانہ پیش کیا تھا اور اس زمیندار سے پہلے چندا ایک ریلوے گارڈ کی داشتہ تھی اور اس سے قبل ایک اور آدمی۔ . . . . . .

وہ اتنے پہلو گرما کر اور اتنی ساری ہانڈیاں چاٹ کر سامنے آئی تھی کہ مجھے تو یہ بھی یاد رکھنا مشکل ہو گیا کہ شمشاد نے کس ترتیب سے اس کے چاہنے والوں یا خریداروں کے نام گنائے تھے۔ میں نے شمشاد سے بھی پوچھا۔

"آخر اس کا وہ منحوس صورت شوہر بھی تو ہے، وہ کیا کرتا ہے؟"

"وہ جو پہلے کرتا تھا اب بھی وہی کرتا ہے۔"

"یعنی ——— ؟" میں نے اچنبھے کے ساتھ سوال کیا۔ شمشاد نے میرے کان کے بالکل نزدیک آکر سرگوشی کے انداز میں کچھ کہا اور میں بے اختیار بول پڑا۔

"نہیں۔ نہیں!! ——— میں ہرگز نہیں مانوں گا۔"

"میں بالکل سچ کہتا ہوں صاحب! منیر احمد چندا کا شوہر بھی ہے اور دلال ہے۔"

یہ سن کر میں بھونچکا سا ہو گیا۔ مجھ سے کوئی اور بات نہ بن پڑی اور اضطراری حالت میں میں نے اس سے پھر سوال کر دیا:

"یہ کیسے ——— یہ سب کیسے ممکن ہے؟"

"یقین مانیے صاحب!" شمشاد نے مجھے سنو بٹا سنو یقین دلانے کے انداز میں کہا۔

"یہ منیر احمد ہی اس کو سب سے پہلے اپنے قصبے کے ایک مہاجن کے پاس لے گیا تھا جس کا وہ کارندہ اور دلال تھا۔ اس مہاجن کے پاس چندا کے باپ کے کھیت گروی تھے اور اس کو امید تھی کہ منیر احمد کی مدد سے اس کو اس کے کھیت واپس مل جائیں گے۔"

"لیکن چندا نے یہ سب کیسے گوارا کیا؟"

اس پر شمشاد نے مجھے مختصراً بتایا کہ آج سے کچھ سال پہلے منیر احمد نے چندا کو اپنی بیوی بنانے کے بعد اس کو گھر سے نکال کر بازار میں لانا چاہا تو وہ بہت جھلائی، جھنجھلائی، روئی دھوئی، منیر احمد کے پیروں پر گری اور اس کے ہاتھوں پٹی تک بھی کیونکہ کسی حالت میں بھی وہ گھر چھوڑنے کو تیار نہیں تھی۔ اس کو اپنا گھر بہت عزیز تھا۔ وہ گھر میں زندگی کی چھوٹی موٹی خوشیوں اور چھوٹے موٹے بے نام دکھوں کے ساتھ سکون و اطمینان سے رہنا چاہتی تھی۔ وہ بچوں کا پیار چاہتی تھی۔ وہ شوہر کی خوشنودی

چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ میر احمد اس کا "آدمی" جس کو بدصورتی کے باوجود وہ اپنا سب کچھ سمجھتی تھی، بہت سا نہیں صرف اتنا ہی کما کر لائے جس سے گھر کا دھندا آسانی سے چل سکے۔ لیکن میر احمد نے اس کی ایک نہ مانی اور اس کو اپنے مہاجن کے پاس پہنچا کر ہی دم لیا۔ چند دنوں تک چندا نے اس مہاجن کی بغل گرمائی۔ پھر بے جائی کی اس زندگی کی اندھیری رات کو طول کھینچتے دیکھ کر چندا کو بہت غصہ آیا اور اس نے یہ سوچ کر کہ جب بیچ مجھ میں ناچنا ہے تو پھر گھونگھٹ کاہے کا، اپنے آپ سے انتقام لینا شروع کیا، اس بات کا انتقام کہ گناہ کے منحوس اندھیروں میں گم ہونے سے پہلے وہ مر تو سکتی تھی۔ وہ مری تو نہیں لیکن اس کا ضمیر ضرور مر گیا۔ وہ بازار کا سستو ہو گئی۔ وہ اپنے بے پناہ حسن کے لیے مشہور تھی ہی — پھر کیا تھا؟ — شکاری گھات میں تھے ہی، صرف مچھی کے گھونسلے سے اڑنے کی دیر تھی!!

اب چلتے چلتے میرا گھر آ گیا تھا۔ شمشاد واپس چلا گیا۔

دو تین ہفتے کے بعد مجھے پنھیرلی کی شمشاد نے اپنی بیوی کو گھر پہنچا دیا ہے اور چندا اپنے شوہر سے قطع تعلق کر کے اس کے پاس رہنے لگی ہے۔ دیکھتے دیکھتے شمشاد ستارے شہر کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ ہر طرف اس کے متعلق چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ وہ جب گھر سے باہر نکلتا تو اس کو دیکھ کر شہر کے من چلوں کے ہونٹوں پر ایک پراسرار مسکراہٹ سی بکھر جاتی اس پر ہر طرف انگلیاں اٹھنے لگیں۔ اس کا باہر نکلنا دوبھر ہو گیا اور اس نے اپنے کارخانے سے لمبی رخصت لے لی اور باہر آنا جانا اور لوگوں سے ملنا جلنا بالکل بند کر دیا اس پر لوگوں نے یہ قیاس آرائی شروع کی کہ شمشاد ان دنوں یار کو اپنے گھر مہمان کیے ہوئے ہے اس کو بھلا کہاں فرصت ملتی ہے کہ وہ اپنے دوست احباب کے پاس آ جا سکے۔ کچھ لوگ یہ کہتے کہ چندا کی وجہ سے وہ بہت مقروض ہو گیا ہے۔ وہ کم بخت تو دس روپے روز کی شراب پی جاتی ہے۔ اب معلوم ہو گا شمشاد میاں کو جوانیں عیاشی کا شوق چرایا تھا۔ ارے اس نے تو بڑے بڑوں کو ڈبو دیا شمشاد میاں کا تو کہیں ٹھکانا بھی نہیں لگے گا۔ گھر اور نہیں میاں کی طبیعت دو چار دن میں ہری ہو جائیگی یہ سب کچھ سن کر میرے دل میں بھی رہ رہ کر یہ خواہش اٹھتی کہ چل کر شمشاد سے ملاقات کر ہی لوں لیکن اپنی رسوائی کے اندیشہ ہائے دور دراز ہمیشہ میری راہ کے پتھر بن جاتے اور میں اپنے ارادے سے باز رہ جاتا۔

کچھ دن اور بیتے

پھر ایک دن بہت سویرے ہی وہ مجھ سے ملنے آیا۔ بہت ہی پریشان حال اور تھکا تھکا سا نظر آ رہا تھا جیسے کسی بہت دور دراز سفر سے ابھی ابھی لوٹا ہو۔ اس کو دیکھتے ہی میں نے یہ شعر:

اب اے دلِ تباہ، ترا کیا خیال ہے
ہم تو چلے تھے کاکلِ گیتی سنوارنے

پڑھا۔ وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح شرمسار اور چپ چاپ بیٹھا رہا۔ مجھے خبر مل چکی تھی کہ چندا اس کو چھوڑ کر پھر اپنے شوہر سے جا ملی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اس کے گھر سے گراموفون، سونے کی گھڑی، کچھ نقدی اور دوسرے قیمتی سامان بھی اڑا کر لے

گئی تھی۔ میں نے شمشاد کو مشورہ دیا کہ اگر وہ پولیس میں اس بات کی رپورٹ کر دے تو عین ممکن ہے کہ اس کا سارا سامان برآمد ہو جائے۔ نہیں صاحب رہنے دیجئے۔ اس نے پسپائی کے لہجے میں کہا، میں۔ نے چندا سے چالاکی دغا باندھ کر اس کو غلاظت سے نکال کر ایک بہتر زندگی دینی چاہی، اس کی خاطر میں کس قدر بدنام ہوا اس کی وجہ سے میرے بہت سے قریبی دوست مجھ سے بچھڑ گئے لیکن اس نے مجھ سے دغا کی۔ جو کچھ وہ گھر سے لے گئی ہے لے جانے دیجئے، شاید اس کی مدد سے وہ کچھ دن آرام سے زندگی بسر کر سکے۔

اس کے بعد جب بھی شمشاد سے میری ملاقات ہوتی تو چندا کے بارے میں وہ مجھے کچھ نہ کچھ ضرور بتاتا کبھی وہ بتاتا کہ چندا ان دنوں کلکتے کے ایک سیٹھ کے پاس ہے، کبھی جونپور میں کسی کے پاس ہے تو کبھی بنارس میں پولیس کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہے۔ ایک دن اس نے مجھے بتایا کہ کچھ روز ہوئے چندا نے کسی بات پر منیر احمد سے خفا ہو کر افیون کھالی تھی لیکن مرنے سے بچ گئی۔ پھر کچھ عرصے کے بعد شمشاد ہی یہ خبر لایا کہ چندا کو بڑی گھناؤنی بیماریاں ہو گئی تھیں اور وہ پیسے پیسے کی محتاج ہو کر مر گئی۔ وہ اپنے گھر آ کر مری تھی، اسی گھر میں جس میں اس نے جوانی کے سہانے خواب دیکھے تھے، جس میں آ کر اس نے اپنی کنواری تمناؤں کو سینے سے لگا کر یہ چاہا تھا کہ اس کا بھی ایک چھوٹا سا اچھا سا گھر ہو، بچے ہوں، شوہر کی محبت ہو، تھوڑی سی زمین ہو، گائے بھینس، ہل بیل ہوں۔ لیکن یہ سب اس کو نہ مل سکا۔ یہ سب کچھ اس کو نہ مل سکا تو کیا ہوا۔ اس کو گندگی تو ملی اس کو سماج کی ملامت تو ملی۔ اس کو رسوائی نہ ملی تو کیا غم ہے گناہ کے اندھیرے نے تو ملے۔ شمشاد اس کو یاد کر کے رو دیا۔ خدا جانے چندا کے دوسرے چاہنے والوں نے کس طرح اس کی موت کی خبر سنی ہوگی۔ ان کو اس کے مرنے کا تو کوئی خاص افسوس نہ ہوا ہوگا لیکن میرے خیال میں ان ہوس کاروں کو اس بات کا دکھ ضرور ہوگا کہ چندا کے ساتھ ساتھ اس کے ہونٹوں کے ساغر، بدن کی مینا اور آنکھوں کی مدھ بھری رسیلی پیالی بھی مفقود ہو گئی جن کی ان کو ضرورت تھی۔ چندا کے خواب بھی حسین تھے، انھیں اس سے کیا غرض تھی۔ اس کا حسین جسم ہی ان کے لیے ساری کائنات تھی ۔

بقیہ بازگشت

کاٹی

تازہ شمارے میں آپ کی غزل بے حد پسند آئی۔ شاہد کی غزل اور سلام کی "ندر عقیدت" بھی خوب ہیں اور اس پر قارئین کے خطوط تو غضب ڈھا گئے۔ ایسی ہی جرارت کی ضرورت ہے، صاف گوئی سے صاف اور ستھرا ادب تخلیق پاتا ہے۔

واجدہ تبسم کا اشارہ افسانہ نویسوں کے لیے ایک اچھی ضرب ہے مگر ان سب کے باوجود یہ دیکھ کر بے حد قلق اور دکھ ہوتا ہے کہ اردو رسائل موت اور زندگی کی کشاکش سے نکل نہیں پاتے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اردو والوں پر جمود اور بے حسی کا خطرناک جذبہ غالب ہے جو اردو زبان و ادب کے حق میں کسی طرح مفید نہیں۔

فیض انصاری

ہربنس سنگھ دوست

کانٹوں میں پھول

ایک ریڈیائی ڈرامہ

کردار

گوپال داس : ایک ضعیف فلسفی مصنف
جمنا : اس کی بیوی
راج کمار : ایک فلم ڈائرکٹر
ریتا : ایک پیلے بیگ گانے والی
طوطارام : ایک امیر ناشر (سیٹھ)
اگروال : خواہ مخواہ کا ایک فلسفی
ڈالیہ :

(کھانسی..... آہستہ آہستہ الفاظ کی ادائیگی جیسے کچھ لکھا جا رہا ہے)

روشنی کے ساتھ اندھیرا ہے..... جیت کے ساتھ..... ہار..... اور خوشی کے ساتھ غم..... اندھیرے اور روشنی کا میل سہانی صبح..... جیت اور ہار کا میل..... صلح..... خوشی اور غم کا میل..... ایک نئے دور کا آغاز۔

(جمنا کا داخلہ)

جمنا:۔ اب کب تک یوں ہی بیٹھے لکھتے رہو گے۔ بچی بیمار پڑی اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئی۔ لیکن تم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ نہ جانے تمہارے سینے میں باپ کا کیسا دل ہے۔ اپنی بچی کی موت آنکھوں کے سامنے دیکھتے رہے لیکن تمہاری آنکھوں سے آنسو تک نہ نکلا۔

گوپال:۔ تم یہ کیوں سوچتی ہو کر رونے سے مصیبت ٹل جاتی رونے سے تو اس میں اور اضافہ ہو جاتا۔ آنکھ روتی ہے تو اس میں سے پانی کی بوندیں ٹپکتی ہیں جو خاک میں جذب ہو جاتی ہیں لیکن جب دل روتا

ہے تو پانی کی نہیں خون کی بوندیں ٹپکتی ہیں اور سینے کو بری طرح چھلنی کر دیتی ہیں۔

جمنا:۔ یہ باتیں ہی تو تمھیں کہیں کا نہ رہنے دیں گی۔ ہر بات کو تم الٹی ہی نظر سے دیکھتے ہو۔ بچی کے گذر جانے کا تم کو کتنا غم ہے اس کا ثبوت تو یہ ہے کہ تمھاری آواز میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔

گوپال:۔ ہماری زندگی اتنی مختصر ہے جمنا۔ جیسے ایک جگنو چمکتے ہوئے اپنے پنکھ سمیٹ لیتا ہے اور روشنی بجھ جاتی ہے۔ بچھ جانے والے کے لیے دکھ میں کمی نہیں بلکہ اضافہ ہوگا۔

جمنا:۔ تو آپ کو بچی کی موت پر کوئی دکھ نہیں ہے۔؟

گوپال:۔ اگر حوادث کی آنچ کسی کی شمع دل کو نہیں پگھلاتی تو سمجھو اس کے پاس دل نہیں پتھر ہے لیکن مجھے ایک موت سے زیادہ دکھ اس بات کا ہے کہ خدا نے ایک ایسی کلی کو توڑ لیا جس نے نہ بہار کی فضا دیکھی نہ خزاں کی گھٹا گھٹی۔

جمنا:۔ اُفوہ ۔ کیسے باپ ہو تم ..... دکھ سے میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے، اور تم ہو کہ دنیا جہاں کی باتیں کر رہے ہو۔

گوپال:۔ یوں تو دل کی بھٹی آگ سلگنے کے لیے ہی ہے لیکن کوشش یہی کرنی چاہیئے کہ خونِ جگر سے سینچے ہوئے چمن کو اپنی آنکھوں سے اجڑتا ہوا دیکھ کر بھی ہماری آنکھ سے آنسو اور دل سے آہ نہ نکلے۔ دکھ ہونے پر روتے تو سب ہی لوگ ہیں جمنا، لیکن تم کیوں نہیں مصیبت میں ایک گھڑی مسکرا کر ایک نئی مثال پیدا کرتیں

جمنا:۔ مجھ سے نہیں پیدا ہوتی نئی مثال۔ آپ کی باتوں کو مانتے مانتے تو یہ حالت ہوگئی گھر میں فریج تانڈو ناچ رہا ہے چھوٹا بچہ بلک بلک کر سو گیا، لیکن تم ایسے شرم بیچ کر بیٹھے ہو کہ تمھارے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔

گوپال:۔ زبان کی کمان سے جو بات تیر بن کر نکلتی ہے وہ سینے کو سر باتی ہوئی دل میں چھید کر رہ جاتی ہے جمنا، جس سے تمھیں کوئی فائدہ نہ ہوگا، لیکن ممکن ہے دوسری کی ثابت قدمی میں کچھ کمزوری آجائے

جمنا:۔ کچھ بھی ہو میری تو ساری عمر بیت گئی سر کھپاتے کھپاتے لیکن تم میں ذرا بھر بھی فرق نہیں آیا۔ تمھارے بھائی نے جو تھوڑی بہت جائداد تھی ہتیالی لیکن تم نے ایک بار بھی اس سے گہری آنکھ سے دیکھا؟.....

ایک بار بھی اس کی طرف سے منہ موڑا ۔؟

گوپال:۔ جمنا، اگر آنکھیں آجائیں تو انھیں پھوڑ نہیں دیتے اگر جسم کا کوئی حصہ تکلیف دینے لگے تو اسے کاٹ نہیں دیتے۔

جمنا:۔ کاٹ نہیں دیتے ۔ جائداد کو بچانے کے لیے لوگ کیا نہیں کرتے۔ خون خرابہ تک ہو جاتا ہے۔

گوپال:۔ تم پاگل ہو ..... آدمی جب کسی مردے کو زندہ نہیں کر سکتا تو اسے مارنے کا بھی کوئی حق نہیں۔

جمنا:۔ پاگل تو میں ہوں ہی جو تم جیسے آدمی کے ساتھ نباہ کر رہی ہوں۔

راج کمار:۔ (باہر سے) کیا میں اندر آسکتا ہوں ۔ ؟
گوپال:۔ (ذرا کھانس کر) تم ہو راج۔ آؤ۔ اندر آنے کی اجازت صرف وہاں لی جاتی ہے جہاں تمھیں یہ خطرہ ہو کہ ممکن ہے نہ آنے دیا جائے۔
راج:۔ (ہنس کر خفت مٹاتے ہوئے) میں تو مذاق کر رہا تھا گوپال داس جی۔ ورنہ آپ کے یہاں آنے کے لیے اس کی کیا ضرورت تھی۔
گوپال:۔ خیر بیٹھو تو سہی۔
راج:۔ شکریہ، آیئے مس ریتا اندر آجایئے۔
ریتا:۔ تھینکس۔
راج:۔ یہی ہیں گوپال داس جی۔ جو اپنی نئی فلم کے ڈیلاگ لکھ رہے ہیں۔ ان کے قلم میں وہ جادو ہے مس ریتا کہ یہ چاہیں تو مارکٹ میں آگ لگا سکتے ہیں۔
گوپال:۔ نمستے..... بیٹھیے۔
ریتا:۔ جی شکریہ۔ راج صاحب سے آپ کی بہت تعریف سنی تھی۔ آج ملنے کا سوا بھاگیہ بھی پراپت ہوگیا۔ ☆
راج:۔ گوپال داس جی! میں دراصل اپنی نئی فلم کے سلسلے میں آیا ہوں۔ ادھر سالی مارکٹ تو بالکل ڈل ہو رہی ہے..... اس بار جو کہانی میں نے آپ کو دی ہے اس کے چٹ پٹے سے ڈیلاگ لکھ دیجئے پھر دیکھئے میں کیا کرتا ہوں۔ مارکٹ میں آگ لگا دوں گا گوپال داس جی۔ فلم باکس آفس ہٹ نہ ہوئی تو میرا نام راج کمار نہیں۔ آپ نے کام تو شروع کر دیا ہوگا گوپال داس جی۔
گوپال:۔ تم جانتے ہو راج یہ کام میں صرف پیسے کے لیے کرتا ہوں ورنہ مجھے اس سے کوئی خوشی نہیں ملتی۔
..... یہ تمھاری مہربانی ہے کہ تم اپنے نام کے ساتھ چیزیں استعمال کر کے مجھے کچھ پیسے دلوا دیتے ہو۔
راج:۔ یہ آپ خواہ مخواہ کہہ رہے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں آپ یہ موٹی موٹی فلسفے کی فائلیں بنانے کے بجائے فلموں کے لیے کام کریں۔ پھر دیکھئے دولت اور شہرت کتنی جلدی آپ کے قدم چومتی ہے۔ ہے نا مس ریتا۔
ریتا:۔ ہاں راج۔ اس میں کیا شک ہے۔ جب تک پبلک جان نہ لے۔ ہیرا بھی ان کے سامنے پتھر ہی ہوتا ہے..... اب میری ہی بات لیجئے۔ جب تک میں نے فلموں میں گانا نہ شروع کیا تھا، کون جانتا تھا مجھے..... کیا تھا میرے پاس ..... گھر میں فاقے تک رہتے تھے کئی بار تو ..... اور اب دیکھئے، چاروں طرف ریتا ہی ریتا ہو رہی ہے۔
گوپال:۔ میں وہ نہیں چاہتا جو آپ لوگ چاہتے ہیں۔ ..... میری منزل اور ہے..... خیر راج جس کام سے تم آئے تھے اس کے بارے میں کہو۔
راج:۔ ہاں، وہ تو میں بھول ہی گیا۔
(فائل کے کاغذ الٹنے پلٹنے کی آواز)
..... یہ وہ گیت ہیں جو آپ کو کہانی میں سٹ کرنے ہیں۔ شروع میں یہ گیت مس ہیلن

کے ڈانس کے ساتھ ہوگا۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے۔
(ایک لائن بھدّے سے انداز میں سناتا ہے پھر.....)
اگر برا نہ مانیے مس ریتا تو آپ ہی ذرا سنائیے نا اس کی دھُن۔

ریتا:۔ بنا میوزک کے کیا سناؤں۔ اچھا نہیں لگے گا۔

راج:۔ یہ کونسا ریکارڈنگ روم ہے کہ خراب ہو جائے گا ..... صرف دھُن ہی تو سنانا ہے۔

ریتا:۔ (ریتا دھُن سناتی ہے)

راج:۔ اس طرح نہیں۔ (WORDING) کے ساتھ سنائیے نا۔

ریتا:۔ اوہ، معاف کیجئے گا۔ لیجئے
(سناتی ہے)
اوئی سانورے، اوئی بانورے، اوئی شیام رے اوئی
بالم میرے اتنے تیلے جتنی پتلی سوئی

راج:۔ اس گیت کی سٹنگ (SETTING) پر ہی سب کچھ ڈپنڈ (DEPEND) کرتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے اس گیت کے بارے میں۔ آگ لگ جائیگی نا مارکیٹ میں؟

گوپال:۔ میری رائے سے یہاں کیا ہوگا۔

راج:۔ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔ یہاں تو پبلک اوپینین (PUBLIC OPINION) دیکھنا ہوگا۔ پبلک کیا چاہتی ہے۔ مارکٹ میں ڈیمانڈ (DEMAND) کس چیز کی ہے۔ اگر ڈیمانڈ مس ہیلن کے ڈانس کی ہوگی تو ہم اُسی کو دیں گے اگر مس بلبل کو پبلک چاہے گی تو ہم اسے ہی پیش کریں گے کیونکہ ہم کو تو مارکٹ میں آگ لگانی ہے۔ اپنی فلم ہِٹ کرنی ہے۔
(فائل کے کاغذ الٹنے پلٹنے کی آواز)
ہاں یہ ایک گیت نیا ہے۔ آج ہی بے دم صاحب سے لکھوایا ہے۔ ہاں تو مس ریتا، ہو جائے وہ دھُن بھی۔

ریتا:۔ کون سی ــ؟

راج:۔ وہی جس کی آپ کل پریکٹس کر رہی تھیں۔

ریتا:۔ اس میں بہت ٹمپو (TEMPO) ہے وہ یہاں نہ ہو سکے گی۔

راج:۔ آپ کہہ رہی ہیں مس ریتا۔ اگر ہم لوگ اس طرح جھجکنے لگے تو پھر مارکٹ میں آگ لگا چکے ..... چھوڑیئے چھوڑیئے، سنکوچ چھوڑیئے اور دھُن سنائیے۔

ریتا:۔ (ریتا پہلے دھُن سناتی ہے پھر، اوہ معاف کیجئے گا، کہہ کے (WORDING) کے ساتھ سناتی ہے)
میں تو گری رے گری رے گری گری رام
مجھے تھام ــــــــ ہو مرے رام
تو ہے تھام تھام تھام تھام تھام
میں تو .....

راج:۔ ذرا سوچئے اس سین میں جب مس ہیلن یا مس بلبل کا ڈانس ہوگا اور سوریہ کماری کی دھُن اس پر پلے بیک میں مس ریتا کی آواز ..... لوگ پاگل ہو جائیں گے گوپال داس جی ..... اس گانے کو سننے کے لیے پچاس پچاس مرتبہ فلم

دیکھیں گے..... آگ لگ جائے گی صاحب آگ
..... کیا خیال ہے آپ کا ــــ ؟

گوپال :۔ تم کہتے جاؤ۔

راج :۔ آپ بھی تو کچھ کہیئے۔ لکھنا تو سب کچھ آپ ہی کو ہے۔ میرا تو صرف نام رہے گا۔ اس فلم کے بارے میں مجھے یقین ہے گوپال داس جی کہ فینانسر ہنس ہنس کر روپیہ خرچ کرے گا۔ بس ڈیلاگ مزیدار لکھ ڈالیے کہ لوگ آغا حشر کاشمیری اور پنڈت رام دین کو بھول جائیں..... میں آگ لگا دینا چاہتا ہوں گوپال داس جی، آگ۔

(گوپال داس کچھ کہنے کی کوشش کرتا ہے کہ کھانسی قابض ہو جاتی ہے۔ راج کمار پھر آگے بڑھتا ہے)

دلیپ کمار، کشور کمار، شوک کمار، انوپ کمار، روپ کمار، وجے کمار، غرض کہ جس کمار کو بھی آپ چاہیں راج کمار لا سکتے ہیں۔ ایکٹریسوں میں وجنتی مالا، روپ مالا، دیپ مالا، سنہا مالا، روپ بالا۔

گوپال :۔ مجھ سے یہ کام نہ ہوگا راج۔

راج :۔ (حیرت سے) آپ سے یہ کام نہ ہوگا!..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ فلم ریلیز ہونے کی دیر ہے مارکٹ میں آگ لگ جائے گی آپ مالا مال ہو جائینگے

گوپال :۔ یہ درست ہے راج کہ چاندی کی جھنکار اور سونے کی چمک انسان کو بہرا اور اندھا بنا دیتی ہے۔ لیکن کئی جگہوں پر اسے بھی شکست کھانی پڑتی ہے۔

راج :۔ ڈائیلاگ، اُف، واٹ اے مارولس ڈائیلاگ (WHAT A MARVELLOUS DILOGUE) آپ تو واقعی مارکٹ میں آگ لگا سکتے ہیں۔ میں کہتا ہوں آپ کیا نہیں کر سکتے..... آخر آپ کو انکار کی کیا سوجھی؟

گوپال :۔ (کچھ دیر کھانس کر) مجھ سے یہ کام نہ ہوگا راج۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں تمہارے کسی کام نہیں آسکتا۔

راج :۔ آپ اتنا اچھا اور گولڈن چانس چھوڑ رہے ہیں بعد میں پچھتائیے گا اور بے طرح پچھتائیے گا۔ لیکن جب چڑیاں کھیت چگ جائیں گی تب پچھتانے سے کیا ہوگا.....

(گوپال داس کے کھانسنے کی آواز)

..... شاید آپ کو اپنے آپ پر گھمنڈ ہو گیا ہے۔ اُف اوہ، کیا زمانہ آگیا ہے (طنزاً) جس کے پاس کھانے کے لیے دو دانے نہیں وہ بھی اپنے آپ کو لاٹ صاحب سے کم نہیں سمجھتا۔

(کاغذات اکٹھا کرنے کی آواز)

مجھے سچا ہنسوں آدمی مل جائیں گے جو میرا کام کر دینگے

گوپال :۔ جوانی کے گرم خون کو اور بھی گرم ہو کر دوڑنے کی اجازت مت دو راج۔ مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔

راج :۔ میں بالکل سمجھ رہا ہوں۔ شکریہ۔ میں دیکھوں گا کہ کون آپ کو مجھ سے زیادہ عزت دیتا ہے ہونہہ۔ چلو ریتا۔

(راج کی آواز فیڈ آوٹ ہو جاتی ہے اور جمنا کی آواز اس طرح فیڈ ان ہوتی ہے۔ جیسے دوسرے

کمرے میں سے آرہی ہے)

جمنا۔ بھگوان جانے تم کیا کر کے مٹھو گے۔ جہاں روپیہ ملنے کی بات ہو وہاں تو تم پیسہ نہیں لگاؤ گے اور یہ جو فضول کتابیں دن بھر بیٹھے بیٹھے لکھتے ہو جنھیں نہ کوئی پڑھتا ہے، نہ چھاپتا ہے۔ یہ تمھیں کیا دیتی ہیں۔ لوگ ٹھیک کہتے ہیں کہ کتابی کیڑا بننے سے آدمی کا دماغ چل جاتا ہے

گوپال۔ (کھانس کھانس کر) مجھے ایک گلاس پانی لا دو۔ میں دوا کھالوں۔

جمنا۔ دوا کھانے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ تم کو تو یہ کتابیں ہی اچھا کر دیں گی۔ کئی سال گذر گئے تمھیں بیمار رہتے رہتے۔ کبھی تم نے کسی ڈاکٹر کو بلوایا۔ کبھی کسی سے ڈھنگ سے علاج کروایا ــــ؟؟

(گوپال داس کے کھانسنے کی آواز ابھرتی ہے پھر آہستہ آہستہ ہلکی ہو جاتی ہے)

..... لیکن علاج تم کیوں کراؤ گے۔ علاج کے لیے تو پیسہ چاہیئے اور پیسے کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔

گوپال۔ مجھے دکھ ہے جمنا کہ تمھیں جو کچھ زندگی میں ملنا چاہیئے تھا وہ تمھیں نہیں ملا، اور اس کا قصوروار کوئی دوسرا نہیں میں خود ہوں کیونکہ میں نے اپنے لیے ایک ایسے کام کو چنا جو پیسہ نہیں دیتا، دولت نہیں دیتا سکھ نہیں دیتا۔

جمنا۔ ذرا میں بھی جانوں کہ دیتا کیا ہے۔

گوپال۔ ٹھیک اس طرح جس طرح آگ کی طاقت بجلی کی چمک اور محبت کی ٹیسیں الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اس سے کیا ملتا ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ جو کچھ مجھے اس سے ملتا ہے وہ مجھے اور کہیں نہیں مل سکتا۔

جمنا۔ اور جو کچھ تمھیں اس سے مل رہا ہے اس سے صرف تم کو نہیں پورے گھر کو بھگتنا پڑتا ہے.... جاؤ اٹھو اور کہیں سے کچھ روپے پیسے لے کر دو اور گھر کی دوسری ضروری چیزیں لاؤ، ورنہ آج گھر میں کچھ نہیں بننے کا۔

گوپال۔ قرض لے کر اٹھنے سے بہتر ہے کہ اسی چارپائی پر پڑے پڑے اپنی جان دے دی جائے۔ تم جانتی ہو میں نے زندگی میں کبھی کسی سے قرض نہیں لیا اور شاید میری زندگی میں وہ دن آئے گا بھی نہیں۔

جمنا۔ جانتی ہوں یا اچھی طرح جانتی ہوں کہ تمھاری ہر بات دنیا سے نرالی ہے، اسی لیے تو قرض کے لیے نہیں بلکہ ان پیسوں کے لیے کہہ رہی ہوں جو تمھاری کتاب کے تمھیں ملنے ہیں اور تم اب تک نہیں لائے۔

گوپال۔ مجھ میں یہ بہت بڑی کمزوری ہے جمنا کہ میں اپنے پیسے بھی کسی سے نہیں مانگ سکتا..... بھجوا ہی دیں گے وہ..... اگر دو ایک دن اور انھوں نے نہ بھجوائے تو میں ضرور مانگ لوں گا۔

جمنا۔ اُفوہ، محنت کا معاوضہ بھی نہیں مانگ سکتے تم۔ کسی سے بھیک تھوڑے ہی مانگنی ہے کئی سالوں کی محنت تم کیا بیس روپوں میں دے دو گے جب

وہ لوگ چھاپنے پر تیار ہوئے ہیں تو صاف مطلب ہے کہ ان کو فائدے کی امید ہوگی اور جب فائدہ ہوگا تو اس کے حقدار تم بھی اتنے ہی ہو جتنے وہ۔

گوپال۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو جمنا۔ لیکن یہ زندگی میں پہلا آدمی ہمیں ملا ہے جو نہ صرف کتاب چھاپنے پر تیار ہو گیا بلکہ اس نے مجھے بیس روپے بھی پیشگی دے دیئے۔

(دستک ..... اور پھر سیٹھ طوطارام کی آواز)

طوطارام[1]۔ (باہر سے) گوپال داس جی ..... گوپال داس جی اندر ہیں۔

گوپال۔ آواز تو اسی پبلشر کی ہے۔ دیکھا میں نہیں کہتا تھا کہ وہ خود پیسے دے جائیں گے۔ جاؤ انھیں اندر لے آؤ۔

جمنا۔ (باہر کے دروازے کے پاس جاکر) جی ہاں آجایئے اندر رہی ہیں۔

(قدموں کی چاپ)

گوپال۔ آیئے طوطارام جی۔ آیئے (آہستہ سے) جاؤ دو کپ چائے بنالاؤ۔ اس بہانے میں بھی پی لوں گا ..... ہاں تو طوطارام جی آپ ہی کے بارے میں باتیں ہو رہی تھیں۔ اگر مجھے علم الخرافات پر یقین ہوتا تو میں یہی کہتا کہ آپ کی عمر بڑی لمبی ہے۔

طوطارام۔ دھنیہ واد، ایک گھنٹہ سے آپ کا گھر ڈھونڈ رہا تھا۔ (طنزاً) میں سمجھا آپ بھی بھگوان کرشن کی طرح آلوپ ہو گئے۔ یہ لیجئے اپنا درشن شاستر اور مجھے میرے پیسے واپس کیجئے۔

گوپال۔ لیکن آپ تو اسے چھاپ رہے تھے نا۔

طوطارام۔ اب مجھ سے اوٹھک مت کھلوایئے۔ بس یہی بہت ہے کہ میں آپ سے کبول اپنے ہی روپے مانگ رہا ہوں۔ اور کوئی ہوتا تو آپ کو جیل کی ہوا کھلوا دیتا۔ یہ سب چار سو بیس بھول جاتے آپ۔

گوپال۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

طوطارام۔ جی ہاں، مطلب آپ کیوں سمجھ سکتے ہیں۔ آپ کو تو کچھ گیان ہی نہیں اس سنسار کا۔ آپ تو ابھی روٹی کو لوتی کہتے ہیں۔ میرے مینجر کا تو شاید مستک خراب ہو گیا تھا جو اس نے آپ کی پُستک کی پرشنسا کر دی اور میں جھانسے میں آگیا۔ بڑے آئے ہیں چار واک

(ورق الٹنے پلٹنے کی آواز)

لکھتے ہیں ..... اگر کسی قوم کی تہذیب کا اندازہ لگانا ہو تو اس کے ادب، فلسفہ، اور سیاست میں دیکھو کہ عورت کی کیا حیثیت ہے، ..... واہ واہ رے ناری کے پجاری۔ اگر آپ یہی اپدیش سارے سنسار کو دینا چاہتے ہیں تو مگرمچھ کی مونچھ میں مت لکھئے اپنی پتنی کے چرنوں میں بیٹھے رہا کیجئے۔

گوپال۔ آپ عورت کا یہ درجہ سمجھتے ہیں۔ عورت وہ مقدس پھول ہے جو .....

طوطارام۔ (بات کاٹ کر) رہنے دیجئے اپنا یہ درشن شاستر میرے

---

[1] طوطارام کے بولنے کے ڈھنگ میں سیٹھوں کا رنگ ہے۔ اس کے علاوہ وہ ہرش، کرشن، کہتا ہے۔

پاس اتنا سمے نہیں کہ میں آپ کی بے کار باتیں سُن سکوں۔ لائیے میرے بیس روپے۔

گوپال:۔ وہ تو خرچ ہو گئے سیٹھ جی اور اِدھر آنے کی امید بھی نہیں۔ آپ اس کتاب کو لے جائیے میں بیس روپے دے کر لے آؤں گا ورنہ آپ بیس روپے میں ہی چھاپ لیجئے گا۔

طوطارام:۔ آپ مجھے بیس روپے ساتھ دیں تب بھی میں اسے پرکاشت کرنے کو تیار نہیں۔ آپ بیس روپے لینے کی سوچ رہے ہیں

گوپال:۔ تو پھر میں کیا کر سکتا ہوں طوطارام جی۔ آپ سے کیا چھپانا۔ گھر میں اس وقت قسم کھانے کو بھی پیسہ نہیں۔

طوطارام:۔ ہونہہ..... تو کہیں اور چار سو بیس کیجئے کسی اور کو الّو بنائیے۔ آپ لوگوں کا پیشہ ہی کیا ہے.... لیکن یاد رہے میرا نام بھی سیٹھ طوطارام ہے اور میں اپنی ایک ایک پائی لے کر رہوں گا۔ اگر میرے پیسے ایک دو دن میں نہ پہنچے تو پھر آپ کو جیل پہنچنا ہوگا۔ دو ہی دن میں سب کٹھن دٹھن نہ بھول گئے تو کسی پرکاشت کو یاد کیسے رکھئے گا۔

گوپال:۔ آپ خفا کیوں ہوتے ہیں طوطارام جی..... ذرا ٹھنڈے دل سے سوچئے کہ اس وقت.....

طوطارام: دل ٹھنڈا تو میرا اس سمے ہوگا جب آپ کو آپ کی چار سو بیسی کا سود امل جائے گا اور یہ میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

(موٹر کا ہارن باہر زور زور سے بجتا ہے طوطارام گھبراہٹ میں جلدی جلدی الفاظ ادا کرتا ہے) اب تو میں جاتا ہوں لیکن یاد رہے دوسری بار میں نہیں پولیس آئے گی۔

(زور سے دروازہ بند کرنے کی آواز.... پھر ہارن کی آواز..... اس کے بعد نئے جوتوں کی چرچراہٹ سنائی دیتی ہے)

اگروال:۔ سنتے گوپال داس جی۔ کہئے اچھے تو ہیں نا۔ ارے! یہ آپ نے کیا حالت بنا رکھی ہے جیسے.... جیسے (کچھ دیر سوچنے کے بعد گویا اچھل کر) ہاں جیسے کسی کا باپ مر گیا ہو۔

گوپال:۔ نہیں میں اچھا ہوں (ذرا کھانس کر) لیکن تم اتنے دن کہاں تھے ــ؟

اگروال[1]:۔ میں؟..... آپ تو جانتے ہیں مجھے انڈین فلاسفی (INDIAN PHILOSPHY) سے کتنی دلچسپی ہے۔ میرے پتا جی کی اچھا تھی کہ میں ڈاکٹر رادھا کرشنن کا اُتّرادھیکاری بنوں۔ ادھر میں اجنتا ایلورہ، سانچی، نالندہ، ویشالی، لاڑ دیا، راج گڑھ بدھ گیا، چندن پیڑ، کشی نگر، سارناتھ، راج گیر وغیرہ ان تمام جگہوں سے ہو کر آ رہا ہوں جنھیں

---

[1] اگروال دولت کے سہارے خواہ مخواہ اپنے آپ کو فلسفی ثابت کرنے کے لیے بڑے بھونڈے انداز سے موقع بے موقع شائبیں دیتا ہے اس لیے انداز گفتگو سے بالکل بیوقوف معلوم پڑتا ہے۔ لفظوں کو کھینچ کھینچ کر ادا کرتا ہے اور ہر محض، ظ اور ذ، کو ج، کہتا ہے۔

بھارتیہ درشن شاستر سے تھوڑا بہت بھی سمبندھ ہے
..... اور میں نے وہ کچھ سیکھا ہے گوپال
داس جی جو آج تک کسی نے نہ سیکھا ہوگا۔ دکھ یہی
ہے کہ کاش! آپ ساتھ ہوتے۔

گوپال: سیکھنے والے تنہا بھی بہت کچھ سیکھ لیتے ہیں۔ انھیں
سہارے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

اگروال: میں نے وہاں دیکھا گوپال داس جی کہ سرکار نے
لوگوں کے لیے ٹھہرنے اور دیکھنے کا کتنا اچھا پربندھ
کیا ہے۔ لیکن ایک بات ہے..... یدی پیسے
پاس نہ ہوں تو آدمی وہاں کا ادھین بھلی پرکار
نہیں کر سکتا۔ میرا تو اس ٹور (TOUR) میں لگ بھگ
دس ہزار روپیہ خرچ ہو گیا:

گوپال: لیکن جب ادھین یا مطالعے کے لیے گئے تھے
تو اتنا روپیہ خرچ کرنے کی کیا ضرورت تھی، دولت
کے سہارے کیا ہوا مطالعہ دولت ہی کی طرح چند
دنوں کا مہمان ہوتا ہے۔

اگروال: یہ بھی خوب کہتے ہیں گوپال داس جی، آپ گھومنے
جائیں اور پیسے خرچ نہ ہوں۔ یہ تو وہی بات ہوئی
جیسے..... جیسے (کچھ دیر سوچنے کے بعد گویا آنکھ کھل
ہاں جیسے کار چلائیں اور پٹرول خرچ نہ ہو۔

گوپال: (ہنس) خیر تمھیں کن کن چیزوں نے متاثر کیا ہے؟

اگروال: یہ تو بہت لمبی کہانی ہے..... ارے ہاں
میں تو ایک ضروری کام سے آیا تھا اور بھول ہی گیا
..... آپ کے چھوٹے بھائی نے کیا کبھی آپ
سے کچھ کاغذات پر دستخط کروائے تھے۔

گوپال: (کھانس کر) ہاں کیوں کیا بات ہے۔ کیا وہ باغ
میرے نام ہو گیا ــــ؟

اگروال: باغ! تو کیا وہ باغ کے لیے آپ سے دستخط کروا کے
لے گیا تھا۔

گوپال: ہاں، لیکن بات کیا ہے ــــ؟

اگروال: اُف، میں کیسے کہوں۔ میرا دل تو اس پرکار بیٹھا
جا رہا ہے جیسے..... جیسے.... (کچھ دیر سوچنے
کے بعد اُچھل کر)..... جیسے سردیوں کے دنوں
ناریل کا تیل۔ وہ تو آپ پر مالش کر رہا ہے: پانچ
ہزار روپے کی اور اس کے لیے آپ کی ہر چیز قرقی
ہوگی..... اس نے ہر چیز کا پربندھ کر رکھا ہے۔

گوپال: کیا وہ اتنا گر گیا ہے۔ مانا کہ وہ دولت مند ہے اور
دولت آدمی کو اندھا بنا دیتی ہے..... لیکن کیا بھائی
پر ظلم کرتے وقت بھی اسے کچھ دکھائی نہ دے گا۔

اگروال: میں آپ کے کبھی کسی کام نہ آسکا۔ مجھے آگیا دیجیے۔
کہ میں قانون کی سہائتا لے سکوں۔

گوپال: قانون!... قانون صرف جھونپڑوں میں ہی سب
کچھ دیکھ سکتا ہے اگروال..... محلوں میں جا کر
اس کی آنکھیں وہاں کی چکا چوند روشنی سے اندھی
ہو جاتی ہیں۔

اگروال: اس بات کی سمت یتا ( ) میں تو کوئی
سندیہ ہی نہیں نا..... آپ وشواس کیجیے
ارے گیارہ بج گئے۔ اچھا آپ بیٹھیے میں کیوں نہ
ذرا اپنے وکیل سے کنسلٹ (CONSULT) کر آؤں
کہ کم از کم آپ اپنا گھر بچا سکیں۔

گوپال:۔ یہ سب میرے لیے بڑا عجیب ہے اگروال ..... مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ تم جو مناسب سمجھو کر سکتے ہو۔

اگروال:۔ بہت اچھا۔ آپ سا ہس (حوصلہ) رکھئے ہیں کوئی کسر اپنی اور سے نہ اٹھا رکھوں گا۔

(اگروال کے نئے جوتوں کی چرچراہٹ آہستہ آہستہ فیڈ آوٹ ہوجاتی ہے ..... دور سے گاڑی اسٹارٹ کرنے کی آواز ..... جمنا کی آواز کا فیڈ ان

جمنا:۔ اب بھی کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے، چلو بوریا بستر اٹھاؤ اور فٹ پاتھ پر ڈیرہ جما لیتے ہیں۔ تم ہی تو کہا کرتے ہو نا کہ وہ لوگ ہم سے کہیں زیادہ خوش رہتے ہیں۔

گوپال:۔ مجھے طعنوں سے زخمی نہ کرو (ہلکی سی کھانسی) زبان میں ہڈی نہیں ہوتی لیکن وہ دل جیسی مضبوط چیز کو توڑ ڈالتی ہے، کاش تم کچھ سمجھ سکتیں۔

جمنا:۔ تم سمجھو یہ سب ... میں تو چلی بھاگ کر رونے شام کو بچوں کو کچھ کھلانا بھی ہے کہ نہیں۔

(دروازہ بند کرنے کی آواز ..... المیہ ساز بجتا ہے اور بجتا رہتا ہے)

گوپال:۔ اُف، آج میں قرض دار ہوں، آج میں دھوکے باز ہوں، فریبی ہوں، چار سو بیس ہوں، غرض کہ آج وہ سب کچھ ہوں جس سے زندگی بھر دور بھاگتا رہا اور سوچتا رہا کہ کم از کم میری زندگی میں کوئی مجھے ایسا نہ کہے گا، اور جس روز کسی نے کہا تو اس کا مطلب ہوگا کہ میری زندگی ختم ہوگئی ..... میری زندگی ختم ہوگئی۔ ؟ ..... نہیں نہیں، انسان کو مصیبت کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔

(موسیقی ابھر کر پھر مدھم ہو جاتی ہے)

..... اور کچھ ہو نہ ہو۔ اس بات میں رتی بھر بھی شک نہیں کہ میں اپنی زندگی میں ناکامیاب ثابت ہوا ہوں۔ جب میں نے اپنی یہ زندگی شروع کی تھی تو میرے سامنے اس کی کتنی خوبصورت تصویر تھی، کتنی امیدیں تھیں۔ مجھے اپنے آپ سے ..... اپنی زندگی سے اپنے آنے والے دنوں سے۔ لیکن آج ایسا معلوم پڑتا ہے جیسے اتنی مصیبتوں، اتنی مشکلوں سے گذرتا ہوا میں چلتا رہا، چلتا رہا ..... اور جب تھک ہار کر منزل پر پہنچا تو پتہ چلا کہ میں نے راستہ ہی غلط چنا تھا۔

(وقفہ ..... موسیقی)

کل لوگ مجھے دھوکے باز کہیں گے، فریبی کہیں گے .... جو ان کا دل چاہے گا کہیں گے۔ جتنے منہ ہوں گے اتنی باتیں ہوں گی .... تب ... تب ... تب میں کیا کروں گا۔ کیا مجھ میں ہمت ہوگی کہ میں یہ سب باتیں سن سکوں ..... نہیں نہیں میں زندہ رہ کر یہ سب نہیں سن سکتا .... یہ سب سن کر زندہ نہیں رہ سکتا .... تب میں کیا کروں .... کہاں جاؤں .... کچھ سجھائی نہیں دیتا .... اُف کچھ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ (کھانسی) .... کچھ سمجھ نہیں آتا۔

(کچھ دیر لگاتار کھانسی کی آواز ..... پھر آہستہ

آہستہ FADE ہوتی ہے جیسے کچھ دور چلی گئی ہے
..... شیشیوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دیتی ہے)

گوپال۔ یہ کیا ہے!..... بچی کی مالش کی دوا.....
(آہستہ آہستہ پڑھتا ہے) احتیاط سے مالش کیجئے
کیونکہ یہ زہر ہے..... زہر! یعنی خودکشی! میری
تمام مصیبتوں کا بہترین علاج..... لیکن خودکشی
فراریت ہے..... ESCAPISM ہے اور
میں ESCAPIST نہیں بن سکتا۔
(کھانسی اور اکھڑی اکھڑی سانسیں)
لیکن..... میں دھوکے باز ہوں، میں چار سو بیس
ہوں، میں قرض دار ہوں..... اُف! یہ دنیا جہاں
کی باتیں..... اور ان سب کا علاج..... یہ
زہر..... یہ زہر۔
(غٹاغٹ پینے کی آواز..... ٹھنڈی سانسیں.....
قدموں کے لڑکھڑانے کی آواز..... اور ایک
جھٹکے سے کرسی پر بیٹھنے کی آواز..... پھر کاغذ کی
کھڑکھڑاہٹ..... اور ہلکی سی کھانسی اور آہستہ
آہستہ بولنے کی آواز جیسے کچھ لکھا جا رہا ہے)
جمنا!
یہ میری زندگی کا آخری خط ہے میری زندگی
کا آخری خط ہے۔ میں زندگی سے ہار گیا
اور وہ زہر جو میرے انگ انگ میں سرایت
کر رہا ہے تھوڑی دیر میں مجھے ختم کر دیگا۔
تمہارے لیے اس خط کے علاوہ میں ان
کتابوں کے مسودے چھوڑ رہا ہوں جن کیلئے
میں نے اپنی ساری زندگی بیکار گنوا دی.....
کاش! دو چار لوگوں تک پہنچ سکتی۔
تمہارا ہی۔ گوپال داس
(کھانسی بے طرح شروع ہو جاتی ہے۔ کچھ کچھ کراہنے
کی آواز بھی آتی ہے..... دروازہ کھلنے کی آواز
کے بعد جمنا کی آواز آہستہ آہستہ FADE IN ہوتی ہے)
جمنا۔ تم اپنی لاج سنبھال کر رکھو کیوں کہ تم لالہ صاحب
ہو۔ ہم بھوکے نہیں رہ سکتے کیونکہ ہم باتوں کے
بھروسے جینا نہیں جانتے۔ ہمارے شریر میں پیٹ
بھی شامل ہے اور اسے بھرنے کیلئے میں تو پڑوس سے
چاول ادھار لے کر آ رہی ہوں۔
(گوپال داس کے کھانسنے کی آواز)
تم بیٹھے کھانستے رہو..... ایڑیاں رگڑتے رہو
..... لیکن کسی سے پیسے ادھار مت لانا کیوں کہ تم
ساری دنیا سے نرالے ہو نا!
گوپال۔ (نڈھال ہو کر اکھڑی اکھڑی سانسوں میں) میرے
ہاتھ میں ہاتھ دے دو جمنا، میرے ہاتھ میں ہاتھ.....
جمنا۔ (جیسے اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا ہو) ہائے رام
میں مر جاؤں..... یہ کیا ہو گیا تمہیں۔
گوپال۔ اب میں تھوڑی دیر کا مہمان ہوں جمنا۔
جمنا۔ (جذباتی ہو کر) ایسی بات نہ نکالو منہ سے۔ کچھ نہیں
ہو گا تمہیں، ہوا کیا ہے۔ ابھی تو تم اچھے بھلے تھے۔
گوپال۔ (نڈھال آواز میں) میں نے زہر پی لیا۔
جمنا۔ زہر۔!
گوپال۔ ہاں، زہر کی پوری شیشی پی گیا ہوں۔ اُف، میرا

دل مل رہا ہے۔ کلیجہ پھٹک رہا ہے.....
میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا جا رہا ہے
جمنا۔

جمنا۔ ہائے میرے بھگوان۔ یہ کیا سُن رہی ہوں میں۔ یہ سوچھی کیا تم کو۔

گوپال۔ میں زندگی سے تنگ آگیا ہوں۔ مجھ میں اب زندہ رہنے اور دنیا کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں رہی۔
(زور زور سے کھانستا ہے..... اور کراہتا ہے)

جمنا۔ لیکن تم نے یہ تو سوچا ہوتا کہ ہم لوگ تمھارا منہ دیکھ کر ہی زندہ رہتے ہیں۔

گوپال۔ مجھے معاف کر دو جمنا۔ میں تمھیں کبھی کوئی سکھ نہیں دے سکا۔

(کھانستا ہے)

میرے جسم میں آگ سی لگی جا رہی ہے جمنا (کراہ کر) جمنا.....

جمنا۔ (سسک کر) میں کیا کروں میرے بھگوان..... ہیں کہاں جاؤں..... میں ڈاکٹر کو بلا کر لاتی ہوں (سسکیاں)

گوپال۔ اب ڈاکٹر کو بلانے کا وقت نہیں رہا۔ (کھانسی) تم آخری وقت میں میرا ساتھ نہ چھوڑ دو جمنا۔

(دروازے پر دستک)

آواز (باہر سے) چھٹی صاحب چھٹی۔

(گوپال داس کے کھانسنے اور کراہنے کی آواز)

گوپال۔ کس کا خط ہے — ؟

جمنا۔ سوسائٹی کا ہے..... دلّی سے آیا ہے۔

گوپال۔ (کراہ کر آہستہ آہستہ) کیا آخری وقت میں بھی ضرورت تھی ایک اور ایسے خط کی۔ پچاسوں بار مایوس ہوا ہوں لیکن اب میرا دل ہر مایوسی کے لیے تیار ہو چکا ہے مصیبتیں انسان کو کٹھور بنا دیتی ہیں جمنا.....

..... (کھانسی)

جمنا۔ (کاغذ کی کھڑکھڑاہٹ کے بعد) لکھا ہے۔

"آپ کی نئی کتاب کو ہماری سوسائٹی کے سب ممبروں نے پسند کیا ہے اور فیصلہ کیا ہے کہ اسے سرکار کی طرف سے بھارت کی کئی بھاشاؤں میں پرکاشت کیا جائے۔ آپ سے انور ودھ ( ) ہے کہ آپ کر پیا یہاں آکر اپنا ادھین اور رچنا تمک ( ) کاریہ ارنبھ کیجئے۔ سرکار آپ کی ہر ممکن سہائتا کرے گی۔"

..... اُف، تم نے یہ کیا کر دیا۔ ہمیشہ کی طرح تم نے اس بار بھی موقعے کو چھوڑ دیا..... زندگی بھر تم جس چیز کے لیے ترستے رہے، وہ جب تمھاری طرف آئی تو تم منھ پھیرے کھڑے ہو۔

(سسکیاں)

گوپال۔ (کراہتے ہوئے) جمنا میں نے زندگی میں کبھی ہمت نہیں چھوڑی تھی۔ صرف چند منٹوں کے لیے میں نے ہمت کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوڑا اور اس وقت میں مجھ سے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہو گئی..... خیر، مجھے اب اتنا افسوس نہیں..... کم از کم تمھاری زندگی تو اب آرام سے گذرے گی۔ سرکار تمھاری ضرور مدد کرے گی۔ میری باقی کتابیں بھی

انھیں سمجھا دینا۔

(گوپال داس باتیں کھانس کھانس کر اور کراہ کراہ کر کہہ رہا ہے..... جمنا کی آواز بھرائی ہوئی ہے)

جمنا۔ (سسکیاں لے لے کر) میرے بھگوان میں ادھار چاول لینے کیوں گئی تھی۔ شاید مجھے اس کی سزا ملی ہے۔ کاش! میں یہیں بیٹھی ہوتی تاکہ ایسا نہ ہوپاتا..... اُف.....

(کراہ کر سسکتی ہے)

تم نے ایسا کیوں کیا..... میری طرف دیکھو..... تمھیں میرا خیال بھی نہ آیا۔؟

(گوپال داس کی طویل کھانسی..... سانس کا اکھڑنا..... کراہنا)

گوپال۔ آدمی جب بھی ہمت ہارتا ہے جمنا۔ اُس سے کوئی بہت بڑی غلطی ہوتی ہے..... چاہے وہ ایک لمحہ کے لیے ہی ہمت کیوں نہ ہارے.....

..... جمنا!..... جو صلہ رکھو..... میرے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نہ نکالو..... مجھ سے دور مت ہٹو جمنا..... مجھ سے دور مت ہٹو۔

(کھانسی اور کراہنے کی موہوم آواز..... پس منظر میں المیہ ساز)

جمنا..... جمنا..... جمنا.....

(ہچکی کے ساتھ دم توڑتا ہے..... جمنا کی چیخ ابھرتی ہے..... اور سسکیوں میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ ورُد بھرا ساز بجتا ہے۔

(فیڈ آوٹ)

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو۔ پٹنہ)

حیدرآباد میں شہر کا قدیم ترین ہوٹل

عزیزیہ ہوٹل

جہاں صبح و شام ہندوستانی طریقہ سے ماہر فن باورچیوں کے ہاتھوں تیار کیے ہوئے کھانے مل سکتے ہیں۔ صفائی اور پاکیزگی اس ہوٹل کا امتیازی نشان ہے۔ کم کرایہ پر صاف ستھرے اور ہوادار کمرے مل سکتے ہیں۔ پتہ یاد رکھیے

عزیزیہ ہوٹل

ناملی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن فون (۴۳۱۶)

احمد جمال پاشا

طنزیہ

مقدمے

گھبرائیے مت! میں آپ پر مقدمہ چلانے نہیں جا رہا ہوں بلکہ مقدمے کے بارے میں کچھ تبلانے پر ہی اکتفا کروں گا۔

مقدمہ پہلے ایجاد ہوا یا لڑائی، مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ لڑائی بلا مقدمے کے ادھوری رہ جاتی ہے اور مقدمہ بغیر لڑائی کے بے کیف، غرض کہ مقدمہ ہو یا لڑائی جب تک فریقین کو ایسے حضرات نہ مل جائیں جو ہنگامہ میں دلچسپی کا اظہار کر سکیں اور خدائی فوجدار کی خدمات بھی انجام دے سکیں اور لڑنے والوں کی حماقت کو حق بجانب بھی تسلیم کر سکیں تب تک اس مقدمہ بازی میں رنگ پیدا نہیں ہو پاتا اور وہ رنگ کیا جس میں بھنگ نہ ہو القصہ مختصر جب تک اس رنگا رنگ کے پروگرام میں کچھ دل بڑھانے والے اور کچھ تماشائی نہ ہوں بات ادھوری رہ جاتی ہے غالباً اس وجہ سے یہ خیال بے جا نہ ہوگا کہ دنیا کا سب سے پہلا مقدمہ جس نے لڑا ہوگا یقیناً وہ کوئی بہت بڑا جانور رہا ہوگا اور اسی جانور کی روح آج بھی ہر مقدمہ باز کے قالب میں حلول کیے ہوئے نظر آتی ہے اور اس میں جب بھی کوئی کمی واقع ہو جاتی ہے تو دائر کیا ہوا مقدمہ آپ کے دائرے سے خارج ہونے لگتا ہے

اس مقدمہ بازی کو اگر صرف کچہری عدالت تک محدود کر دیا جائے تو یقیناً خود مقدمہ پر بڑا ظلم ہوگا۔ خود آپ کا ہر قسم کے مقدموں اور مقدمہ بازوں سے سابقہ پڑتا ہوگا۔ جیسے وہ مقدمات جو گھر میں خود آپ کو آئے دن فیصل کرنا پڑتے ہوں گے اور اس وقت بھی آپ میں سے بہت سے حضرات ان سے ذاتی طور پر دوچار ہو رہے ہوں گے جس کے لیے یہ خاکسار ہمدردی کا اظہار کرتا ہے ہاں تو میں یہ کہنے والا تھا کہ اس قسم کے مقدمے جو خفیفہ کی گھریلو عدالت میں سنے اور لڑے جاتے ہیں عموماً بچوں سے متعلق ہوتے ہیں اور کھیل ہی کھیل میں نپٹا دیے جاتے ہیں مگر خصوصاً بڑوں ہی سے متعلق ہوا کرتے ہیں جن کو مونٹی سوری سسٹم سے تو نہیں نپٹایا جا سکتا مگر تعلیم بالغان سے ضرور فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

پھر بھی اچھی خاصی تعداد ایسے مقدمات کی رہ جاتی ہے جن میں "من و تو" کو دست گریباں ہونے کا موقع نہیں مل پاتا کیونکہ ان کی ساری کارروائیاں کاغذی ہوتی ہیں اور وہ بھی یک طرفہ چنانچہ اس کاغذی پیرہن کے اوڑھنے کی نوبت آتی ہے نہ بچھانے کی۔ نہ اس میں مقدمہ دائر کرنے، موکل بننے، وکیل بنانے اور پیروی کرنے کے لیے پاپڑ بیلنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اور نہ اپیل کی گنجائش ہوتی ہے۔

یہ مقدمہ کی سب سے انوکھی قسم تو آپ کو ضرور معلوم ہو گی مگر ساتھ ہی بے حد عام بھی۔ اس عام اور گھاس کا جلوہ آپ کو صرف کتابوں ہی میں ملے گا۔ میرا مطلب قانون کی کتابوں سے نہیں ہے مگر میں ان کو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں چھوڑ سکتا۔ اس راز سے شاید آپ بھی واقف ہوں کہ دنیا کے اہم اور عجوبہ راز کاغذ کے سینے پر نقش کر کے قید کر دیئے گئے ہیں۔ یہ بالکل الگ بات ہے کہ کسی مسخرے نے اس راز کو موم جامہ پہنا کر اپنے مرید کے بازو پر باندھ دیا اور کسی نے مثل سقراط اور بقراط بنی نوع انسان پر عالم آشکارا کر دیا۔ مگر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنے افکار و خیالات کو نہ قید کیا نہ آزاد بلکہ ایک معمّہ یا چیستان بنا کر اس کو ہلکے کے حال پر چھوڑ دیا۔ ہمارے شعر و ادب کا خاصہ نامعقول حصہ بھی آپ کو اسی "چیستانیت" یا "چیستان ازم" کا شکار ملے گا۔ مگر چیستان زنی کی واردات اور مقدمات کی بھرمار کی پرچھائیاں ہمارے شعر و ادب پر آپ کو اول تا آخر نظر آئیں گی۔ اور عجب رنگ روپ میں ملیں گی۔ کہیں جناب کتاب تو مشکل سے چٹاک بھر کی ہے اور مقدمہ اس پر لکھا گیا پنسیری بھر کا۔ کہیں صرف مقدمہ ہی ملا اور کتاب کے سلسلے میں مخصوص اشاروں سے کام لیا گیا۔ یا مقدمہ حاضر ہے اور کتاب کا دور دور تک پتہ نہیں چنانچہ لوگ مقدمے سے ہی کام چلا لیتے ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ ایک ہی کتاب پر مقدمہ بازوں کے ایک پورے گروہ نے حملہ کر دیا اور ان مقدمات کے بیچ میں کتاب ایسی دبی کہ پھر کبھی نہ ابھر سکی اور یوں بھی گذری کہ کتاب نے اتنی جگہ گھیر لی کہ مقدمہ باز بے چارہ قلم ہی تولتا رہ گیا اور کتاب اپنے کو صفا بچا لے گئی چنانچہ اس کا تو ثریہ دریافت کیا گیا کہ اگر کتاب نے پوری جگہ گھیر لی تو کوئی غم نہیں ہم بھی ایک کونے میں پڑے رہیں گے اور اسی بہانے سرورق سے چمٹے رہے اور چھٹائے نہ چھوٹے۔ گو کہ اس میں بھی سختیاں ہوئیں اور مصنف نے سرورق کی کچھ جگہ تصویر کے بہانے گھیرنا شروع کر دی۔ غرض مقدمہ بازوں نے طویل مقدمے لکھ کر۔ قصیدے لکھے۔ مبارک سلامت کا شور مچایا۔ اگر کچھ بس نہیں چل سکا تو کہہ سن کر مصنف کی تاریخ وفات ہی کا اس میں اپنی طرف سے اضافہ کروا دیا کسی نے اس بہانے کہ مقدمہ کتاب کا دیباچہ ہے کچھ نہ کچھ لکھ مارا کسی نے مقدمے کو کتاب کا عنوان قرار دیا۔ مقدمہ بازوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے مصنفوں نے خود ہی اپنی کتابوں پر مقدمے چلانے شروع کر دیئے۔ کڑی شرط بھی لگاتے چلے گئے، اگر صرف تعریف لکھنا ہو تو لکھو ورنہ ہم خود لکھیں گے۔ جب مقدمہ بازوں نے کوئی راہ مقدمہ نہ پائی اور راہ فرار اختیار کرنے پر راضی نہ ہوئے تو اکثر تو اس قدر خفا ہوئے کہ انھوں نے بجائے اصل کے صرف نقل پر اکتفا کی اور فلسفہ قناعت کا سہارا لے کر بلا سی مسودے کا سہارا لیے صرف مقدمے لکھنا شروع کیے اور علم بغاوت بلند کیا اور کچھ انڈر گراؤنڈ ہو گئے اور چھپی ہوئی کتابوں پر چھاپے مارنے لگے اور تبصرے کے بہانے ان پر اخبارات اور رسائل کا سہارا لے کر مقدمے چلانا شروع کیے۔

یوں تو بہت سے مقدمے چلائے گئے مگر سب سے مشہور مقدمہ مولانا حالی نے اردو شاعری پر چلایا تھا جس نے بڑی شہرت حاصل کی بہت سے لوگوں نے اس ادا کو پسند کیا اور ادب کی مختلف روایتوں کی آؤ لیکر ان پر مقدمے چلانا شروع کیے۔

مگر مقدمہ بازوں کا ایک گروہ ایسا بھی رہ گیا جس کی یا تو اتنی پوچھ گچھ نہ تھی کہ ان سے کوئی مقدمہ لکھوا تا یا ان کی مقدمہ بازی کو خاطر میں لاتا۔ یا پھر وہ لوگ تھے جو باقاعدہ مقدمہ بازی بھی کرتے اور شب خون مارنے والے ان چھاپہ ماروں کے گروہ میں شامل

ہو گئے اور لکھی لکھائی اور چھپی چھپائی کتابوں اور مقدموں کی اپیل کرتے۔ یہ گروہ مشنری اور ساخت کے اعتبار سے کچہری کے منشیوں سے ملتے جلتے تھے اور انھوں نے کتابوں پر واشی لکھنے میں اپنا نام پیدا کیا۔ ان لوگوں نے لکھی ہوئی کتابوں پر نئے مقدمے کیوں لکھے اس کی تاویل وہ بطور عذر جو پیش کرتے ہیں وہ بھی نہایت دلچسپ اور قابل سماعت ہے کچھ کا کہنا ہے کہ اگر یہ کتاب یوں ہی چھوڑ دی جاتی تو اس کے ارتقار کی کڑی ٹوٹ جاتی اس لیے ہم اس میں وقتاً فوقتاً مزید اضافے کرتے رہے۔ کسی نے اس وجہ سے مزید مقدمہ لکھا کہ اس سے قبل جو مقدمہ لکھا گیا تھا وہ قطعی ناکافی تھا اور برخلاف اس کے کسی نے احتجاجاً مقدمہ لکھا کہ پہلے جو کچھ لکھا گیا تھا وہ بہت زیادہ تھا اور اس طرح سے انھوں نے طویل مقدمہ کو اپنے قلم کی جنبش سے طویل ترین بنا دیا۔ کسی کو مقدمہ کا اصل مقدمہ پسند نہ آیا تو یا تو اس نے اس پر اصلاح اور نظر ثانی پر اکتفا کیا اور کچھ نے سرے سے مقدمہ چلا کر میدان جنگ کا نقشہ ہی پلٹ دیا اور بعض مقدمے تو پوری کتاب پر امر بیل کی طرح چھا گئے۔ اکثر یہ غدر بھی پیش کیا گیا کہ لائبریریوں میں بجائے کتابوں کے چمڑا سی مل جاتا ہے جو دروازے ہی پر سے جھنڈی دکھلا دیتا ہے۔ لیکن اگر کبھی کبھار کوئی مفید کتاب اس کے توسط سے مل جاتی ہے تو یہ ہمارا فرض ہوتا ہے کہ ہم اس کو مفید ترین کتاب میں تبدیل کر دیں اور جو اس پر مزید مقدمہ چلائے بغیر ممکن نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے بعد یہ کتاب عام آدمی کے لیے جو علم غیب وغیرہ سے ناواقف رکھا گیا ہو قطعی بیکار ہو جاتی ہے مگر عام آدمی یوں بھی کب مفید کتابوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اگر کتاب کسی کی ذاتی ہو تو اول تو وہ خود کیوں نہ مقدمہ چلائے دوسرے اگر آپ پرائی کتاب پر مقدمہ چلانے کی جرأت بھی کریں خواہ اس وقت آپ کی نیت محض کتاب کا پوسٹ مارٹم کرنا ہو تب بھی وہ آپ کو کیوں بخشنے لگا اول تو اس میں ایسی بھی صورت پیدا ہو جانے کا احتمال رہتا ہے جس کے آخر میں لوگوں کو اس کی عیادت کرنے ہسپتال جانا پڑتا ہے اور اگر صورت حال زیادہ خراب ہو جائے تو وہ آپ کے مقدمہ کی اپیل عدالت میں بھی کر سکتا ہے اور اس نکتہ سے تو مقدمہ باز حضرات بھی بخوبی واقف ہوتے ہیں کہ سر سے موج خوں گذر جاتی ہے قطرہ کے گہر ہونے تک" اس لیے ہمیشہ ان مقدمہ باز حضرات کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت رہتی ہے جو مشترکہ ملکیت ہوں جس کے لیے لائبریریوں ہی کا سہارا لینا پڑتا ہے اور وہیں ہم کو اس قسم کے نکتے بھی ملتے ہیں۔ یہ مقدمہ باز اکثر بطور تاوان کتاب میں سے پہلے تصویریں اور نقشے پار کر دیتے ہیں ـــــ کیونکہ یہ مقدمہ باز ہوتے ہیں مگر آرٹسٹ ہونے سے پرہیز کرتے ہیں اور بعض اس خیال کے تحت بھی غائب کرتے ہیں کہ پڑھنے والوں کو اس کا احساس رہے کہ یہ کتاب بیکار نہیں ہے اس کو پڑھنے والے معمولی لوگ نہیں بلکہ اہل ذوق تھے جو بطور ثبوت کتاب کے صفحات اس طرح لے گئے گویا "ہم نے کتاب پڑھی ـــ ہم نے اس پر مقدمے چلائے اور اب ہم اس کے ورق لیے جا رہے ہیں مثل رسید تاکہ سند رہے اور" وقت ضرورت کام آئے" پھر کسی کے ہی کام نہ آئے۔

فاضل مقدمہ نگاران کتابوں کو لے جا کر ان کی کتابت کرتے ہیں اور ادارت کے فرائض انجام دیتے ہیں اصلاح کے استادانہ ہاتھ دکھلاتے ہیں غرض جو کچھ بھی ہوتا ـــ ہوتا دلچسپ ہے۔ ادبی اور تنقیدی کتب کے مقدمات میں میر و سودا سے لے کر میاں بی بی کے جھگڑے غم جاناں، غم دوراں، غم یاراں، تھیٹر اور بائیسکوپ کی باتیں وغیرہ تو جو کچھ ہوتا ہے خوب ہوتا ہے اور اپنے اندر

اپیل کرنے کی پوری گنجائش رکھتا ہے مگر اس سے بھی دلچسپ یہ ہوتا ہے کہ ان مقدموں پر مقدمہ چلانے کے بہانے ان سے نہایت ہی کلاسیکل قسم کے گھریلو عشق لڑائے جاتے ہیں جن کے لیے شعرا رحضرات کے دیوانوں کا سہارا لے کر کبھی دیوانگی کا اظہار کیا جاتا ہے اور کبھی بیگانگی غرض یہ مقدمے اس وقت تک چلتے رہتے ہیں جب تک کہ کتاب عوام میں مقبول ہونے کے لیے بنیئے کی دکان پر نہ پہنچ جائے جہاں پھر اس کی سفت پڑیاں ہاتھوں ہاتھ تقسیم کی جاتی ہیں۔ یا حلوائی ان کے ذریعہ شیرینی تقسیم کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہے، یا پھر دیمک ان کا صفایا نہ کر دے۔

ان کتابوں میں جو مقدمات پیہم کی بھرمار ہوتی ہے اور پنچایتی خفیفہ کی عدالتوں سے لے کر عالیہ تک کے شغرفجی مہروں کی بساطیں بچھائی اور الٹی جاتی ہیں۔ ان کی ایک آدھ جھلک کیوں نہ آپ بھی دیکھیں گو کہ میرے پاس وقت محدود ہے جو ان کی دستو کو اپنے دامن میں سمیٹنے سے فی الحال قطعی معذور رہے مگر پھر بھی حاضر ہیں حجت کیسے کر سکتا ہوں۔

بطور تبرک ارشاد ہے کہ ایک صاحب نے لکھا کہ "آپ لوگ کتاب پر اپنا نام لکھ کر کتاب کا ستیاناس اردیتے ہیں" اسی کے نیچے کسی صاحب نے جن سے نہ رہا گیا لکھتے ہیں "آپ بھی بالکل وہ ہیں آپ کتاب پر لکھنے کو منع کر سکتے تھے مگر آپ نے اپنا نام کیوں لکھ دیا؟" اور اس کے نیچے انھوں نے نہ صرف اپنا نام لکھا بلکہ اس کے نیچے تاریخ و سنہ لکھا، اپنا پورا پتہ لکھا غرض کہ لطف یہ کتاب پر نہ لکھنا چاہیئے کی ساری بحث کتاب پر لکھ کر کی گئی۔ کسی کتاب میں مصنف نے کافی مفید اور کام کی باتیں جہاں بتلائی تھیں اور اہم انکشافات کیے تھے اس کو انڈر لائن کر کے کسی صاحب نے لکھا "سوسائٹی آپ کی اس مفید ریسرچ کا شکریہ ادا کرتی ہے" اس کے نیچے جو کچھ درج تھا اس میں ان حضرات سے یہ پوچھا گیا تھا، کیا آپ سوسائٹی ہیں۔؟ کسی صاحب نے لکھا "ہر گھاگھو عاشق کا امتیاز خصوصی یہ ہے کہ وہ بدصورت ہو" فوراً اس کے آگے بریکٹ قائم کر کے کسی مسخرے نے لکھ دیا "جیسے کہ آپ"۔ کسی مصنف کو لکھنے کے لیے کسی شعر کا سہارا لینے کی ضرورت پڑی چنانچہ اس بے چارے نے یہ مصرع جب حال پاکر لکھ دیا۔ "وہ گلیاں یاد آتی ہیں جوانی جن میں کھوئی ہے" اس کے نیچے فوراً لکھ دیا گیا "ہمیں آپ سے ہمدردی ہے" ایک کتاب پر مصنف کا فوٹو جہاں چھاپا گیا تھا اس کے نیچے پبلشر کی طرف سے اس قسم کی کتابوں کے شائع کرنے کا ایک پروگرام بھی درج تھا۔ اس کے نیچے کسی نے لکھ کر دریافت کیا تھا، کیا کارٹونوں کے شائع کرنے کا یہ سلسلہ اب مستقل چلے گا۔؟ ایک شاعر کے دیوان کے صفحہ اول پر لکھا ہوا تھا "یہ پہلے اس کو پڑھیئے ورنہ پچھتائیے گا۔ پھر مطلع کچھ یوں تھا۔ اگر آپ کے پاس فالتو وقت ہے تب بھی خدا کی قسم اس کو نہ پڑھیے ورنہ میرے عزیز آپ کا وقت برباد ہوگا اور روح ناشاد ہوگی" اس کے نیچے کسی نے مقطع عرض کیا تھا "بھیا کیوں شاعری کے پیچھے پڑے ہو۔ اس میں کیا رکھا ہے۔ کوئی کام کی بات کرو"

مگر اس کام کی بات پر مجھے یاد آگیا کہ نہ کام کی بات کتاب کے اندر ملتی ہے نہ باہر شکل ہی سے کتاب سازی اور مقدمہ بازی کے سوا کچھ ہاتھ آتا ہے۔ مگر جو کچھ میرے ہاتھ آچکا ہے وہ میں نے محفوظ کر لیا ہے اور اس پر عنقریب میرا ارادہ خود ایک مقدمہ لکھنے کا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ وہ مقدمہ انھیں مقدمات پر ہو۔

مغنی تبسم

تلاشِ سایۂ گل میں

یہ متوالی گھٹا ساون کی بکھری زلف شانوں پر
یہ ٹھنڈی جھیل سی آنکھیں، یہ آئینہ سی پیشانی
یہ عارض آگ کے ہالے، ہر اک خطِ بدن بجلی
یہ قامت ایک بگڈنڈی کسی شاداب وادی میں
گلِ نوخاستہ کی آبرو موتی سے بھی اُجلی
یہی دریوزۂ دیدار ہے رختِ سفر میرا

یہ غارِ سنگ بستہ جس کی دیواروں کی تنہائی
دکھا کر آئینہ مجکو ہنسی میری اڑاتی ہے
یہ پھیلا آسماں، نیلاہٹیں ہیں جس کی زہر آگیں
یہ چٹیل صاف میداں غنچۂ خودرو سے بھی عاری
شفق ہے دور تک پھیلی ہوئی اک جوئے خوں جیسے
نہیں جگنو کوئی کہ راستہ گلشن کا دکھلاتا
کوئی برگد نہیں کہ داستاں سنتا جدائی کی
تری برسات لے کر دیدۂ پُرنم کہاں جاؤں

میں اک بھٹکا ہوا راہی تلاشِ سایۂ گل میں
ہر اک خارِ مغیلاں سے الجھتا بادِ گرداں کو
بنا کر رازداں اپنا نکل آیا ہوں صحرا سے

چمن ہے یہ کہ ویرانہ؟ یہ گل ہیں یا کہ اخگی ہیں؟
یہ کیسی خاک اڑتی ہے؟ صبا ہے یا کہ صرصر ہے؟
مری خاکسترِ دل سے بھڑک اٹھتے ہیں پھر شعلے

تجھے اے دل مبارک ہو کہ اس کی یاد کے گلشن
میں اب بھی رات کی رانی کی کلیاں مسکراتی ہیں
مجھے پہروں رلاتی ہیں

بشیر نواز

حالِ دل لکھوں کیونکر

آج ارمانوں کے سب شیش محل ٹوٹ گئے
دستِ امید سے خوابوں کے کنول چھوٹ گئے
بے نیازی سے تری پہلے بھی دل تھا واقف
نازِ محبوبی تو پہلے بھی سہا تھا میں نے
آج سے پہلے کوئی ناوک بے مہر مگر
میرے سینے میں ترازو نہ ہوا تھا ایسے
چشمِ نظارہ تو یوں آب نہ کھوتی تھی کبھی
شوقِ بے تاب کی رسوائی نہ ہوتی تھی کبھی
میں کہ پڑھتا تھا تری چینِ جبیں کی تحریر
ڈھونڈ لیتا تھا ہر اک خوابِ وفا کی تعبیر
بے رخی کو تری اندازِ حیا جانا تھا
غنچۂ دل نے تجھے موجِ صبا جانا تھا
جانے کیوں ایک نگاہِ غلط انداز تری
آج جذبات محبت کا فسوں توڑ گئی
مجھ کو تنہا سرِ صحرائے جنوں چھوڑ گئی

جانے کیا بات ہوئی آج کہ تیرے انداز
بن گئے جذبۂ توہینِ وفا کے غمّاز
بے رخی سے جو تری شیشۂ دل ٹکرایا
قصرِ امید میں جھنکار سی اک گونج اٹھی
ریزہ ریزہ ہوئے تخئیل کے بلّور حسیں
شورِ ماتم میں امنگوں کی صدا ڈوب گئی
تھے درِ دل پہ جو خوابوں کے حریری پردے
جنبشِ صرصرِ بے باک سے صد چاک ہوئے
دل سے اٹھتے ہوئے اشکوں میں لہو گھلنے لگا
رازِ دل آ کے سرِ نوکِ مژہ کھلنے لگا
قربِ والطاف و کرم ہو گئے افسانے سے
ہم نظر آنے لگے خود کو بھی بیگانے سے
اک نگاہِ کرمِ آگاہ پھری کیا ہم سے
حوصلے شوق کے ناکام نظر آنے لگے
میکدے جیسے ہتی جام نظر آنے لگے

اٹھ گیا آج زمانے سے محبت کا چلن
یادگار عہدِ گذشتہ کی ہے یادوں کی چلن
دل کے محراب میں جلتی ہوئی شمع ارماں
جیسے کھو بیٹھی ہے آج اپنا وہ تاج زریں
نقدِ دل دے کے جنھیں مول لیا تھا میں نے
کھو گئے اب ترے وعدوں کے وہ شبتاب نگیں
مدتوں بعد مجھے آج یہ معلوم ہوا
صرف ترسا کے بھی جا سکتی ہے گلشن سے گھٹا
دل نے دو پیار کے الفاظ نہ سیکھے تھے ابھی
چاہنے کے بھی تو انداز نہ سیکھے تھے ابھی
زندگی کھو گئی آلام کے ویرانوں میں
خوں اتر آیا تمناؤں کا پیمانوں میں
حسرتیں آرزوئیں پوچھ رہی ہیں مجھ سے
کیوں ملیں نالہ و ماتم کی سزائیں ہم کو
کچھ تو معلوم ہوں اپنی بھی خطائیں ہم کو

جب نظر رات کی تاریکی میں گھر جاتی ہے
جگمگاتے ہوئے مہتاب کی یاد آتی ہے
دل کی گہرائی میں اترا ہوا دلکش نغمہ
جس طرح مدتوں تخئیل میں لہراتا ہے
وادیٔ غم میں بھٹکتے ہوا کثر یوں ہی
عشرتِ عہدِ گذشتہ کا خیال آتا ہے
آج سے پہلے جب اٹھا تھا ترے در سے کبھی
روک لیتی تھی تیرے پلکوں کی موہوم نمی
کتنے افسانے لبِ ناز پہ تھرّاتے تھے
کتنے شکوے تری آنکھوں میں امڈ آتے تھے
روک لیتے تھے مری راہ کبھی ناز ترے
بڑھ کے دامن سے لپٹ جاتے تھے انداز ترے
آج لیکن مری ویرانیٔ قسمت کے طفیل
کسی جانب سے بھی کچھ دل کو اشارا نہ ملا
ایک دزدیدہ نظر کا بھی سہارا نہ ملا

آج ارمانوں کے سب شیش محل ٹوٹ گئے
دستِ امید سے خوابوں کے کنول چھوٹ گئے

راشد آذر

موڑ

(والد[1] مرحوم سے خطاب)

وقت کے شانے پہ بکھری ہوئی شب کی لٹیں
میرے سینے میں دبی آگ کو بھڑکاتی ہیں
جب ذرا دیر کو رک جاتی ہے نبضِ ہستی
بیتی یادیں مری رگ رگ میں سما جاتی ہیں

حشر تک آپ کی یادوں کے جلیں گے دیپک
عمر بھر آپ کی باتیں مجھے یاد آئیں گی ــــ
آپ کے پیار کے جگنو گے ستارے جس دم
نفرتیں وقت کے دریاؤں میں کھو جائیں گی

آپ نے جتنی کتابوں پہ جمائیں نظریں
ان سے اب آپ کی آنکھوں کی کرن پھوٹتی ہے
جلد پر آپ کی صورت نظر آتی ہے مجھے
آپ کی دید کا، آنکھ اب بھی مزہ لوٹتی ہے

شب مہتاب میں جب جام اٹھاتا ہوں کبھی!
کوئی چٹکی سی مرے دل کے قریں لیتا ہے
موجِ مے آپ کا چہرہ مجھے دکھلاتی ہے
دل کے کونے میں دیا یاد کا لو دیتا ہے

شب کی آنکھوں میں سلگتے ہوئے سیمیں آنسو
دل کے پھیلے ہوئے دامن میں سما جاتے ہیں
میرے احساس میں بیتی ہوئی خوشیوں کے شرر
غم کے دو چار دیے اور جلا جاتے ہیں

آج کی رات پہ اُس رات کا پرتو سا ہے
گھر میں جس وقت کہ ہنگامۂ محشر تھا بپا
در و دیوار پہ تھے موت کے سائے لرزاں
زندگی پھرتی تھی جب چاک کیے اپنی قبا

---

[1] پروفیسر حسین علی خاں (ایڈیٹر)

مقبرہ سوتا ہے اوڑھے ہوئے شب کی چادر
سوکھے پتوں کے تڑپنے کی صدا آتی ہے
ان کراہوں سے خموشی کا جگر چھلنی ہے
تیرگی ہے کہ مری سانس گھٹی جاتی ہے

روح کی آگ بجھانے کو دبے پاؤں یہاں
غم دنیا سے میں گھبرا کے چلا آیا ہوں
آپ کی قبر پہ تھوڑے سے اجالے کے لیے
اپنی پلکوں پہ میں شبنم کے دیئے لایا ہوں

سوچتا ہوں کہ ابھی آنکھ لگی ہے شاید
آپ کو نیند سے بیدار کروں یا نہ کروں
دل کا ہر زخم دکھانے کے لیے آیا ہوں
چشم خوں بستہ کو خوں بار کروں یا نہ کروں

موت بادیدۂ تر آپ کو لائی تھی جہاں
زندگی مجھ کو وہاں کھینچ کے لے آئی ہے
جب تلک آپ نہ جاگیں گے یہیں بیٹھوں گا
آج تو میں نے جگانے کی قسم کھائی ہے

جاگ اٹھیں تو ذرا آپ سے پوچھوں اک بات
کیا کبھی آپ بھی تنہائی سے گھبراتے ہیں
زندگانی سے کبھی پیار کیا کرتے تھے
آج کیوں زیست سے بیزار نظر آتے ہیں

آج کی رات جو آپ اتنے خفا ہیں مجھ سے
کتنی بار آپ کا دل میں نے دکھایا ہوگا
اپنی آوارہ مزاجی کی قسم کھاتا ہوں
جان کر تو نہ کبھی میں نے ستایا ہوگا

آپ کی موت تو اک دور کا مٹ جانا ہے
ایک تہذیب کا معیار گیا آپ کے ساتھ
وہ شرافت، وہ صداقت، وہ محبت، وہ خلوص
آپ کے دور کا کردار گیا آپ کے ساتھ

میں کہ شاعر بھی ہوں آوارہ طبیعت بھی ہوں
حسن تہذیب کے معیار پہ اتروں کیسے
بزم دنیا کا تصنع مجھے یوں لگتا ہے
دامن دل پہ لپکتے ہوئے شعلے جیسے

زندگانی کے ہر اک موڑ سے گذرا، لیکن
آگے تاریک ہیں راہیں مجھے معلوم نہ تھا
ایک ایسا بھی مقام آئے گا رستے میں جہاں
دل سے نکلیں گی کراہیں مجھے معلوم نہ تھا

دل کی تسکیں کے لیے یاد ہی کافی ہے مجھے
آپ کے لوٹ کے آنے کا گماں بھی نہ سہی
شور ماتم ہی نہیں سوزش فرقت کی دلیل
دل تو صد چاک ہے مصروف فغاں بھی نہ سہی

گوپی چند نارنگ

۱۸۵۷ء

پس منظر

لارڈ کلائیو سے ڈلہوزی تک، انگریزوں کے جوڑ توڑ سے ثابت ہوتا ہے کہ انگریز کسی نہ کسی بہانے ہندوستان پر قابض ہونا چاہتے تھے۔ جنگ پلاسی کے بعد واقعات کی رفتار صاف نظر آنے لگی تھی۔ انگریزوں کے ہاتھوں میر قاسم کا بھی وہی حشر ہوا جو میر جعفر کا ہوا تھا۔ اس پر میر قاسم نے نواب وزیر سے مدد مانگی چنانچہ شجاع الدولہ شاہ عالم ثانی، ۱۷۶۴ء میں بکسر کے میدان میں میر قاسم کی حمایت میں انگریزوں سے نبرد آزما ہوئے لیکن شکست کھائی۔ غرض پلاسی سے جس کام کی ابتداء ہوئی تھی بکسر پر اس کی انتہا ہوئی۔ اس کے بعد نواب وزیر انگریزوں کے ہاتھ میں کھلونا بن گیا۔ شجاع الدولہ کو نہ صرف الہ آباد اور کڑا کے علاقوں سے ہاتھ دھونا اور ۵۰ لاکھ روپے جنگ کا تاوان دینا پڑا بلکہ انگریزی فوجوں کو بھی اپنے خرچ پر اودھ میں رکھنا پڑا۔ بکسر کی لڑائی کے بعد شاہ عالم بھی انگریزوں کے چنگل میں پھنس گیا۔ بنگال، بہار، اور اڑیسہ کی دیوانی انگریزوں کو عطا ہوئی اور اس کے بدلے میں انگریزوں نے شاہ عالم کو ۲۶ لاکھ روپے سالانہ خراج دینا منظور کیا۔ ابھی اس عہد نامے پر سات سال بھی نہ گذرے تھے کہ وارن ہیسٹنگز نے یہ رقم اس بہانے بند کردی کہ شاہ عالم مرہٹوں کے اثر میں ہے۔ الہ آباد اور کڑا کے علاقے بھی چھن گئے۔ شاہ عالم نے وارن ہیسٹنگز کو خوش کرنے کے لیے اسے خطاب دینا چاہا لیکن اس نے انکار کردیا۔ کارنوالس نے ایک قدم اور بڑھایا اور مراسلات میں بادشاہ کو ہر قسم کے پیشکوہ رسمی القاب لکھنا بند کردیئے۔ ولزلی تو کسی نہ کسی طرح دہلی پر قابض ہونا چاہتا تھا۔ چنانچہ مرہٹوں سے جنگ کے بہانے ۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے دہلی فتح کرلی۔ اور شاہ عالم کو بھی اپنی حفاظت میں لے لیا۔ سوا لاکھ روپے ماہوار بادشاہ کا وظیفہ مقرر ہوا۔ آداب میں تو زیادہ فرق نہیں آیا لیکن بادشاہ کے اختیارات قلعے تک محدود ہوگئے۔

اکبر شاہ ثانی (۱۸۰۸ — ۱۸۳۷ء) کے زمانے میں انگریزوں کا رسوخ روز افزوں تھا۔ لارڈ ہیسٹنگز دہلی کی برائے نام بادشاہت کا بھی خاتمہ کردینا چاہتا تھا۔ اس نے بادشاہ کے نام مراسلت میں اپنے نام کے ساتھ خادم شاہ لکھنا بند کردیا۔ نذر دینے کی رسم اڑادی۔ نواب وزیر کو الگ شہ دی کہ وہ بادشاہ کا لقب اختیار کرے۔ سر چارلس مٹکاف دہلی کے رینڈیڈنٹ نے بادشاہ کی توہین اور شہزادوں کی تذلیل تک سے گریز نہ کیا اور شاہی جاگیر کی آمدنی بادشاہ سے چھپائی جانے لگی۔ قید طویل یا قصاص

کے احکام پر بادشاہ سے منظوری لینے کی جو رسم تھی وہ بھی موقوف کردی گئی۔ ۱۸۲۳ء میں جب لارڈ ہیسٹنگز گورنر جنرل ہوئے تو انھوں نے اکبر شاہ سے مساویانہ ملاقات کی اور کوئی نذر نہیں دی۔ خطوں میں اطاعت کا ذکر تو درکنار صاف لفظوں میں لکھا جانے لگا "آپ کی بادشاہی صرف نام کی ہے اور محض اخلاقاً بادشاہ کے خطاب سے یاد کیے جاتے ہیں"۔ ریذیڈنسی کے انگریز ملازموں کو کھلی چھٹی مل گئی کہ ان کے لیے بادشاہ کی تعظیم و تکریم لازمی نہیں۔ اکبر شاہ ثانی نے اس تمام ظلم و تعدی کے خلاف نواب وزیر سے سفارش کروانا چاہی، گورنر جنرل کے پاس وکیل بھی بھیجے، لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ مجبور ہوکر راجہ رام موہن رائے کو سفیر بنا کر لندن بھی روانہ کیا۔ اس موقع پر اکبر شاہ ثانی نے جارج چہارم کے نام جو پرزور عرضداشت بھیجی تھی اس میں ان شرائط کا حوالہ دیا جو شاہ عالم ثانی کے وقت میں کمپنی سے طے ہوئی تھیں اور مطالبہ کیا کہ محلات جاگیر کی آمدنی جو اس وقت تقریباً ۳۰ لاکھ تھی بادشاہ کو ملنا چاہیے۔ اس عرضداشت کے آخر میں نہایت عاجزی سے شاہ انگلستان کی توجہ اولاد تیموریہ کی خستہ حالی کی طرف منعطف کرائی لیکن یہ کوشش بھی بے کار گئی۔ ۱۸۳۲ء میں دہلی صوبہ مغربی و شمالی میں شامل کردی گئی اور ۱۸۳۳ء میں جو سکے جاری ہوئے ان پر بجائے شاہ دہلی کے شاہ انگلستان کی صورت مسکوک تھی۔ گورنر جنرل کی مہر سے "فدوی خاص بادشاہ" کے لفظ خارج کردیئے گئے۔ ۱۸۳۷ء میں بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوئے۔ گورنر جنرل لارڈ الن برا نے انھیں علانیہ قلعہ کی سکونت ترک کردینے اور شاہی خطابات سے دستبردار ہوجانے کو کہا۔ نیز تجویز پیش کی کہ وہ قطب صاحب میں عمارت بنوا کر وہاں آرام و آسائش سے بسر کریں۔ بہرحال یہ طے پایا گیا کہ بہادر شاہ کے بعد ان کے جانشین سے قلعہ خالی کرالیا جائے۔ بادشاہ ریذیڈنٹ کو اپنے خطوں میں فرزندارجمند لکھا کرتے تھے۔ جب ہارڈے صاحب ایجنٹ ہوکر آئے تو انھوں نے بادشاہ کو لکھ دیا کہ مجھے تمھارا فرزند بننا منظور نہیں، مجھے فرزند ارجمند نہ لکھنا۔ نذر وظیفہ میں ۲۵ ہزار کا اضافہ ضرور ہوا لیکن ساتھ ہی دارالسلطنت کی ایک چپہ بھر زمین بھی بادشاہ کی ملکیت میں نہ رہی اور ان کے تمام اختیارات سلب کرلیے گئے۔

رہی سہی کمی ڈلہوزی نے پوری کردی۔ بہادر شاہ کی چہیتی بیگم زینت محل اپنے بیٹے جوان بخت کی ولی عہدی منظور کروانا چاہتی تھی۔ ڈلہوزی نے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مرزا فخرو کو ولی عہد نامزد کردیا اور ان سے طے کرلیا کہ وارث تخت ہونے پر وہ قلعہ خالی کردیں گے اور قطب میں رہیں گے لیکن ۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو کا انتقال ہوگیا۔ زینت محل نے اس پر پھر جوان بخت کے لیے کوشش کی لیکن انگریزوں نے بہادر شاہ کے دوسرے بیٹے مرزا قویش کو اس شرط پر ولی عہد مان لیا کہ بہادر شاہ کی وفات کے بعد ان کے لیے صرف خطاب شہزادہ باقی رہے گا۔ پنشن سوا لاکھ کے بجائے ۱۵ ہزار ہوگی۔ اور قلعہ خالی کردیا جائیگا۔

انگریزوں کے ان جوڑ توڑ سے ثابت ہوتا ہے کہ سلطنت مغلیہ کو ختم کرنے کا پورا منصوبہ ان کے پیش نظر تھا۔ گویا آل تیمور کا خاتمہ ہر لحاظ سے ایک فیصلہ شدہ بات تھی۔ ادھر کمپنی کے بعد دیگرے دیسی ریاستوں پر بھی ہاتھ صاف کررہی تھی۔ وارن ہیسٹنگز بنارس، روہیلکھنڈ اور بنگال کو خاک میں ملا چکا تھا۔ ولزلی نے میسور، پونا، ستارا اور کئی دوسری ریاستوں کو تختۂ مشق بنایا۔ نانا فرنویس، حیدر علی اور ٹیپو سلطان زندگی بھر انگریزوں کی دست درازیوں کے خلاف ان سے لڑتے رہے۔ ہندوستانی

فوجوں میں انگریزوں کی کارروائیوں سے جو نفرت پھیل رہی تھی اس کا پہلا اظہار ۱۸۲۶ء میں ویلور بغاوت کے موقع پر ہوا۔ اس نفرت کو ڈلہوزی کی بدعنوانیوں نے اور بھی شدید کر دیا۔ انگریزی سلطنت کی حدود بڑھانے کے لیے کمپنی دیسی حکمرانوں کو معمولی معمولی بہانوں پر برطرف کرنے لگی، اور ان کی پنشنیں بھی ضبط کر لی گئیں۔ ۱۸۴۹ء میں انگریز پنجاب پر بھی قابض ہو گئے۔

معاشی استحصال کی حالت یہ تھی کہ کمپنی نے دیسی صنعت و حرفت کو بالکل تباہ کر دیا۔ کاریگر اور صناع بے کار ہو رہے تھے کسانوں کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ اور تجارت کساد بازاری کا شکار تھی۔

سماجی سطح پر بھی ہندوستانیوں کا خطرہ کچھ ایسا بے جا نہ تھا۔ انگریز سارے ہندوستان کو عیسائی بنانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ انگلستان کے دارالعوام میں علی الاعلان کہا جانے لگا کہ ہندوستان کو مشرق میں عیسائیت کا گڑھ بنانا چاہیئے۔ مندروں اور مسجدوں کے وظائف اور جاگیریں تو بند ہو گئیں اور اس کے برعکس عیسائی مشنریوں کو حکومت کی طرف سے لاکھوں روپے کی امداد ملنے لگی۔ پادری، ہندو مسلمان دونوں کو تبدیلی مذہب کے لیے طرح طرح کے لالچ دینے اور خطوں کے ذریعہ دھمکیاں دینے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ ان حالات میں مسلمانوں کے علما اور مصلحین کے دلوں میں انگریزوں سے شدید نفرت کا پیدا ہو جانا ضروری تھا۔ اس کی ابتدا انیسویں صدی کے شروع میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تحریک سے ہو چکی تھی۔ شاہ صاحب نہ صرف ہندو مسلمانوں میں سچا مذہبی جذبہ پیدا کرنا چاہتے تھے بلکہ ملک کو انگریزوں کے وجود سے بھی پاک کر کے ہندوستان میں ایک جمہوری حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ ان کے بعد ان کی ہمہ گیر اصلاحی تحریک کو ان کے عزیزوں اور رفیقوں نے جاری رکھا جن میں شاہ عبدالقادر، سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ الہ آباد میں یہ خدمت مولانا لیاقت علی انجام دے رہے تھے۔ اپنے وعظ اور ذکر میں اقتدار مضاری پر تلمیحاً اشارہ کر جاتے اور مریدوں کو جہاد کی ترغیب و تلقین کرتے تھے۔ مولوی احمد شاہ مدراسی نے شمالی ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف آگ سی لگا دی تھی۔ آگرہ میں ڈاکٹر وزیر خاں اور ان کے ساتھی انگریزوں کے خلاف فضا تیار کر رہے تھے۔ ادھر نانا راؤ پیشوا اٹھور سے دیسی ریاستوں کو انگریزوں کے خلاف بھڑکا رہا تھا۔ اس سلسلے میں نانا راؤ نے عظیم اللہ کی مدد سے جس خفیہ سازش کا جال بچھایا، انگریز مورخوں نے بھی اس کی تعریف کی ہے۔ بہادر شاہ ظفر اپنی عمر اور مزاج کے تقاضے سے انگریزوں کے خلاف علم جنگ بلند کرنے کے حق میں نہ تھا لیکن زینت محل انگریزوں کی زخم خوردہ تھی اور ان کا اقتدار ختم کرنے کے کسی موقعے کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔ بعض شہزادے بھی اس کے ہم نوا تھے۔ بنگال میں علی نقی خاں، فقیروں اور سنیاسیوں کے ذریعہ فوجیوں کو بھڑکانے میں اہم حصہ لے رہا تھا۔ سینکڑوں فقیر، سنیاسی، پنڈت اور مولوی انگریزوں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکانے کے لیے مختلف شہروں اور چھاؤنیوں میں بھیجے گئے۔ ان کے بڑے بڑے مرکز لکھنو، پٹنہ، الہ آباد، آگرہ، میرٹھ، دہلی اور بملکۃ تھے، جہاں چھاؤنیوں میں رات کو خفیہ جلسے ہوتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے آغاز ہی میں آتش زدگی کی اکا دکا وارداتیں شروع ہو گئی تھیں، اور آئے دن نئی نئی پیشن گوئیاں کی جاتیں، کبھی خبر اڑتی کہ ایران کا کجلاہ ہندوستان پر حملہ آور ہوگا۔ کوئی کہتا کہ زار روس ہند کی طرف پیش قدمی کریگا۔ جامع مسجد

اور دوسری جگہوں پر اشتہار چسپاں کیے جاتے، جن میں آنے والے انقلاب کی جھلک ہوتی۔ خاص و عام میں مشہور تھا کہ ہندوستان میں ہر سو سال کے بعد راج بدلتا ہے۔ ان حالات میں کارتوسوں والے معاملے نے بارود پر آگ کا کام کیا۔ یہ صحیح ہے کہ کارتوسوں کے بنانے میں ناجائز قسم کی چربی استعمال کی جاتی تھی۔ لیکن آٹے اور شکر میں ہڈیاں پسوانے اور گائے سور کی چربی ملانے والے معاملے کسی پیش بندی کے بغیر اچانک پیش آ گئے۔ یہ نہ ہوتے، جب بھی انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کی نفرت کا لاوا پھٹ پڑنے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ ضرور ڈھونڈ لیتا۔

مارچ ۱۹۵۷ء میں ناتا راؤ نے انبالہ، لکھنؤ اور کالپی کا دورہ کیا اور بقول ساورکر ۳۱ مئی اتوار کا دن انگریزوں کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرنے کے لیے مقرر ہوا۔ عوام تک اس کی اطلاع چپاتیوں[1]، بکری کے گوشت کی بوٹیوں اور کنول کے پھولوں کی تقسیم کے ذریعے پہنچائی گئی۔ اس دوران میں انگریزوں نے انیسویں رجمنٹ کو جو بارک پور میں مقیم تھی بغاوت کے شبہ پر برطرف کر دیا۔ کچھ مدت بعد مارچ میں منگل پانڈے کے حادثے کی بنا پر ۳۴ رجمنٹ بھی برطرف کر دی گئی۔

نئے کارتوسوں کے خلاف دیسی سپاہیوں کا احتجاج جب شدت اختیار کر گیا تو حکم ہوا کہ آئندہ کارتوس منہ کی جگہ ہاتھ سے کاٹے جائیں گے۔ فیصلہ ہوا کہ اس نئی ترکیب پر سب سے پہلے میرٹھ چھاؤنی میں عمل ہو۔ یہاں کے سپاہیوں نے کارتوسوں کو چھونے تک سے انکار کر دیا۔ اس پر ۸۵ سپاہیوں کا کورٹ مارشل ہوا اور انھیں دس دس برس قید کی سزا دی گئی۔ قدرتی طور پر ان کے ساتھی غصہ سے آگ بگولا ہو گئے۔ اگلے دن اتوار تھا، شام ہوتے ہی سپاہیوں نے جیل پر دھاوا بول دیا اور اپنے ساتھیوں کو قید و بند سے آزاد کرا لیا۔ چند ہی گھنٹوں میں بغاوت کی آگ سارے میرٹھ میں پھیل گئی۔ میرٹھ میں قتل و غارتگری کرنے بعد یہ سپاہی اسی رات دہلی کی طرف چل دیئے۔ یوں میرٹھ جیسی غیر متوقع جگہ سے انقلاب کی ابتدا ہوئی

واقعات

اگلے دن صبح کے وقت میرٹھ کے سپاہیوں نے دہلی پہنچ کر بادشاہ کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ بادشاہ نے ان کی انگریزوں سے صلح صفائی کرانا چاہی لیکن سپاہی نہ مانے اور چند ہی گھنٹوں میں لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا۔ سب سے پہلے ریذیڈنٹ فریزر اور قلعہ دار ڈگلس قتل کیے گئے۔ بازار بند ہو گئے، شہر پناہ کی دیواروں پر توپیں چڑھا دی گئیں۔ بادشاہ جنگ کے حق میں نہ تھے۔ لیکن زینت محل نے باغیوں کا ساتھ دیا۔ مرزا مغل اور مرزا خضر سلطان اور دوسرے شہزادے فوج کے افسر بنائے گئے

---

[1] چپاتیوں کی تقسیم کا واقعہ بعینہٖ اس واقعہ کا عکس تھا جو مرہٹوں کے شمالی ہند پر حملہ کرنے سے پیشتر وقوع میں آیا تھا۔ صرف فرق اتنا تھا کہ بکری کے گوشت کے بجائے روٹی کے ساتھ چواری کی ٹہنی بھی منتھالو کی بغاوت سے قبل سال کے درخت کی ٹہنی گاؤں گاؤں بھیجی گئی تھی۔ ہندو چونکہ سبزی خور ہوتے ہیں یہ اغلب معلوم ہوتا ہے کہ بکرے گوشت کا خیال اسلامی معنایا جیسا کہ ظاہر کیا گیا ہے ممکن ہے اس کا مقصد کلی استیصال ہو۔ میری تو یہی رائے ہے کہ اس کا اصلی مفہوم یہی تھا۔" (غدر کی صبح شام، حسن نظامی ص ۱۸)

اور بادشاہ کے نام سے احکام جاری ہونے لگے۔ بنک گھرانہ لٹ گیا۔ انگریز چن چن کر قتل ہوئے اور میگزین کے اڑ جانے کے بعد تو شہر میں انگریزوں کی ایک بھی پناہ گاہ باقی نہ رہی۔

اگر سادر کر کا یہ بیان صحیح ہے کہ ۱۴ مئی کا دن انقلاب کے لیے مقرر ہو چکا تھا تو میرٹھ کے سپاہیوں کی جلد بازی نے اس کی رفتار پر برا اثر ڈالا۔ انقلاب کی یوں قبل از وقت ابتداء سے انگریزوں کو تیاری کا موقع مل گیا۔ انھوں نے ایران سے صلح کر لی اور انگریزی فوجیں ہرات سے واپس آ گئیں اس زمانے میں برطانیہ چین پر حملہ کی تیاری کر رہا تھا اور گورا فوجوں کی ایک بڑی تعداد کلکتے سے گذر رہی تھی۔ یہ سب کی سب فوج بغاوت کو فرو کرنے کے لیے طلب کر لی گئی۔

ساتھ ہی پنجاب کے سکھوں نے انگریزوں کو جو کمک پہنچائی اس نے تو باغیوں کی کمر ہی توڑ کر رکھ دی۔ انگریزوں نے سکھوں اور مغلوں کی دیرینہ عداوت کا پورا پورا فائدہ اٹھایا اور حکمت عملی سے کام لے کر سکھوں کو باغیوں سے الگ رکھنے میں کامیاب ہو گئے۔

پٹیالہ، نابھہ اور جیند کی فوجوں کی مدد سے انگریزوں نے دہلی کے سپاہیوں سے پہلا مقابلہ ہنڈی ندی کے قریب کیا۔ رجون کو نیپال سے بھی کمک آ پہنچی اور "بندل سرائے" کے معرکہ میں انگریزوں کی جیت رہی۔ اس واقعے کے بعد انگریزوں نے کشمیری دروازے سے باہر پہاڑی پر توپیں چڑھا دیں اور شہر کو محاصرے میں لے لیا۔ لگ بھگ اس زمانے میں بغاوت کی آگ شمالی ہندوستان کے ایک بڑے حصے میں پھیل چکی تھی اور ہر طرف سے باغی فوجیں دہلی میں جمع ہو رہی تھیں، انھیں میں بریلی کا جنرل بخت خاں بھی اپنی فوج کے ساتھ دہلی پہنچا۔ اس کی فوجی قابلیت اور فراست نے دہلی کی جنگ کا نقشہ بدل دیا مجاہدوں نے جہاد کا فتویٰ لکھا۔ نمک اور شکر پر محصول معاف کر دیا۔ شہر میں امن و امان قائم ہوا۔ ہندو مسلمان اتحاد کی انتہا یہ تھی کہ ۲۰ جولائی کے شاہی فرمان کی رو سے گاؤکشی کی ممانعت کر دی گئی۔ جنرل بخت خاں کو کمانڈر انچیف بنایا گیا۔ ایک مرتبہ عید قرباں کے موقع پر بادشاہ نے حسب ذیل شعر لکھ کر بخت خاں کو بھیجا۔

لشکر اعدا الٰہی آج سارا قتل ہو
گور کھا گوجر سے لے کرتا نصاریٰ قتل ہو

دہلی کی فوجوں میں ایک حلف نامہ تقسیم ہوا جس پر سب نے اقرار کیا کہ وہ انگریزوں کے خلاف آخر دم تک لڑیں گے۔ یہ سپاہی واقعی اس بہادری سے لڑے کہ محاصرہ چار ماہ جاری رہا۔ اس دوران میں انگریزی فوجوں کے دو کمانڈر انچیف ہیضے کا شکار ہو گئے۔ تیسرا استعفےٰ دے گیا اور نوبت کئی بار محاصرہ اٹھانے تک پہنچی۔ چوتھا کمانڈر ولسن بڑے حوصلے کا آدمی تھا لیکن جوں جوں محاصرے میں دن گذرتے جاتے تھے اس سے انگریزوں کی طاقت بڑھ رہی تھی اور دیسی سپاہی جو شہر کے اندر تھے وہ کمزور ہو رہے تھے۔ مثلاً شہر میں باغیوں کے بارود کا کارخانہ اڑ گیا جس سے اسلحہ کی کمی بہت سخت محسوس ہونے لگی۔ بخت گڑھ کی لڑائی کے موقع پر بخت خاں، سدھاری سنگھ اور غوث محمد خاں کے درمیان اختلاف ہو گیا۔ پھر برسات کے موسم میں پانی اس زور سے برسا کہ ہزاروں سپاہی پانی میں گھر کر انگریزوں کی توپوں کا نشانہ بن گئے۔ پھر مستزاد یہ کہ خود بادشاہ سلامت کا

سمدھی مرزا الٰہی بخش انگریزوں کو دم دم کی خبر پہنچا رہا تھا۔ مرزا الٰہی بخش نے بڑا ستم یہ کیا کہ فنونِ حرب سے ناواقف شہزادے مرزا مغل کو بھڑکایا تو وہ جنرل بخت کے فوجی کام میں دخل در معقولات کرنے لگا۔ اس باہمی کش مکش نے انتظام کو بد سے بدتر کر دیا۔ جو کرتا تو الگ رہا، مدافعت کی بھی طاقت نہ رہی۔ بدقسمتی سے عین وقت پر مرزا مغل نے ہمت ہار دی اور جیتی ہوئی بازی ہاتھ سے جاتی رہی۔ ۲۴ ستمبر کو دہلی پر دوبارہ انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ بخت خاں نے بادشاہ سے بہت کہا کہ حضور فوجوں کے ساتھ دہلی سے نکل چلیں لیکن مرزا الٰہی بخش نے کچھ ایسا افسوں کیا کہ بادشاہ نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ دوسرے روز میجر ہڈسن نے تھوڑی سی فوج ساتھ لی اور بادشاہ کو ہمایوں کے مقبرے میں گرفتار کر لیا۔ ادھر مرزا مغل وغیرہ دوسرے شہزادوں نے بھی مرزا الٰہی بخش کے کہنے پر اپنے آپ کو بلا کسی شرط کے انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ انجام یہ ہوا کہ میجر ہڈسن نے انھیں راستے ہی میں گولی مار دی اور ان کے سر خونی دروازے پر آویزاں کرا دیئے۔ اس کے بعد انتظام کی غرض سے دہلی میں انگریزوں نے کشت وخون کا وہ بازار گرم کیا کہ باید و شاید۔

الہ آباد میں جانبازی اور سرفروشی کا مظاہرہ کرنے والوں میں لیاقت علی سب سے پیش پیش تھے، انگریزوں کے اقتدار کا خاتمہ کرنے کے بعد انھوں نے خسرو باغ پر پھر ہرا نشان کا جھنڈا لہرایا جس کے نیچے ہزاروں ہندو مسلمان وطن کی خاطر لڑنے مرنے کے لیے جمع ہو گئے اور انگریزوں کے قلعے کا محاصرہ کیا گیا۔ ابھی انقلابیوں کی سرگرمیاں جاری تھیں کہ جنرل نیل بنارس سے ایک بھاری جمعیت لیے الہ آباد پہنچ گیا۔ انگریزوں نے لیاقت علی کے ساتھیوں کو انعام واکرام کے لالچ دلا کر توڑ لیا۔ مولانا نے باغ کی دیواروں سے قلعہ کا کام لینا چاہا تھا لیکن کامیابی نہ ہوئی چنانچہ وہ دشمنوں کے نرغے سے بچ کر لکھنو کی طرف نکل گئے۔ اس کے بعد جنرل نیل نے امن قائم کرنے کے لیے شہری اور دیہاتی آبادی پر ایسے ایسے ظلم توڑے کہ لوگ نادر شاہ کی سفاکی بھول گئے۔

لکھنو میں انقلاب کے بانی مبانی مولوی احمد شاہ، کانپور میں نانا صاحب اور جھانسی میں رانی لکشمی بائی تھیں۔ ان تینوں مقاموں پر شورش کا آغاز لگ بھگ جون جولائی میں ہوا۔ لکھنو میں نابالغ شہزادے برجیس قدر کو مسند نشین کیا گیا اور ملکہ اودھ حضرت محل نگران مقرر ہوئیں۔ کانپور میں انگریزوں کا خاتمہ کرنے میں دیسی سپاہ نے بڑی بے دردی سے کام لیا لیکن ۲۶ جولائی، ۱۸۵۷ء کو کانپور پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہو گیا۔ ستمبر ۱۸۵۷ء میں ہیولاک بھاری جمعیت لیے لکھنو آیا لیکن خود محصور ہو کے رہ گیا۔ آخر کار کمانڈر انچیف کولن نے لکھنو کا رخ کیا لیکن بے سود۔ دسمبر ۱۸۵۷ء سے فروری ۱۸۵۸ء تک انگریزی فوجیں تانتیا توپی بھیل اور رانی لکشمی بائی کے ساتھ معرکوں میں مصروف رہیں، مارچ میں لکھنو پر بھرپور حملہ ہوا۔ مہوخاں، مشیر حضرت محل کی سفلہ پروری اور سُنّی شیعہ کی پھوٹ نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔ ۱۵ مارچ ۱۸۵۸ء کو انگریز لکھنو پر دوبارہ قابض ہو گئے۔

دہلی اور کانپور کی شکست کے بعد نانا صاحب اور شہزادہ فیروز شاہ بریلی میں نواب خاں بہادر خاں کے پاس جمع ہوئے انقلابی ۳۰ مئی، ۱۸۵۷ء سے بریلی پر قابض تھے۔ لکھنو میں ناکامی کے بعد مولوی احمد شاہ، حضرت محل اور شہزادہ برجیس قدر بھی بریلی پہنچے۔ کولن کیمل نے یہاں مئی ۱۸۵۸ء کو حملہ کیا، مئی تک شدید جنگ رہی۔ آخر غداروں کی افواہوں سے انقلابیوں کے پاؤں

انگریز گئے، جس کے بعد وہ محمدی میں جمع ہوئے۔ یہاں جون ۱۸۵۸ء میں مولوی احمد شاہ نے اپنی حکومت کا اعلان کیا، ادھر لگ بھگ اسی زمانے میں رانی لکشمی بائی نے گوالیار فتح کیا لیکن انقلاب کے یہ دونوں سرگروہ اسی مہینے میں مارے گئے۔ رانی لکشمی بائی انگریزوں کے ہاتھوں اور مولوی احمد شاہ ایک انگریز نواز ہندو راجہ کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ گو نانا صاحب اور ان کے ساتھی اس کے بعد بھی انگریزی فوجوں پر چھاپے مارتے رہے لیکن دراصل بریلی کی شکست کے بعد انقلابیوں کا زور ٹوٹ گیا۔

تانتیا توپی اپنے ساتھی راجہ مان سنگھ کی غداری سے گرفتار ہوا اور ۱۸۵۹ء میں پھانسی کے تختے پر لٹکا یا گیا۔ نواب بہادر خاں کو بھی پھانسی ہوئی۔ شہزادہ فیروز شاہ ہندوستان سے ہجرت کر گیا۔ اور اس نے باقی عمر حجاز میں بسر کی۔ نانا صاحب، عظیم اللہ، بخت خاں، حضرت محل، اور برجیس قدر نیپال کے جنگلوں میں روپوش ہو گئے۔ یہیں ۱۸۵۹ء میں عظیم اللہ اور ۱۸۷۹ء میں حضرت محل کا انتقال ہوا۔ بعد میں انگریزوں نے برجیس قدر کو معافی دے دی۔ وہاں سے وہ مکہ گئے آئے لیکن یہاں ان کے ایک بدخواہ نے انھیں زہر دے کر ہلاک کر دیا۔ بہادر شاہ ظفر پر دہلی میں مقدمہ چلا اور وہ اکتوبر ۱۸۵۸ء میں رنگون بھیج دیئے گئے جہاں، نومبر ۱۸۶۲ء کو وفات ہوئی۔

۱۸۵۷ء کے ان واقعات کو پہلی جنگ آزادی کے تمام پیچیدگیوں تمام مورخوں کو اتفاق نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سن ستاون کے واقعات کے پیچھے کوئی منظم یا باقاعدہ تحریک نہ تھی۔ اس کا آغاز سپاہیوں کی شورش سے ہوا جس کی پشت پناہی زیادہ تر ان راجاؤں اور نوابوں نے کی جن کی ریاستیں انگریزوں نے چھین لی تھیں اور جو حالات کے ہاتھوں مجبور تھے۔ اس لڑائی کے پیچھے چونکہ کوئی قومی تحریک نہ تھی اس لیے یہ ملک گیر نہ ہو سکی۔ چند دیسی فوجی افسر بد دل راجے اور نواب اس میں ضرور شریک ہوئے لیکن عوام نے اس کا پورا پورا ساتھ نہیں دیا۔ پنجاب کی سکھ ریاستوں اور نیپال نے انگریزوں کی مدد کی۔ یہ شورش زیادہ تر دہلی اور اتر پردیش تک محدود رہی۔ راجپوتانہ، حیدرآباد، بمبئی اور مدراس اس سے زیادہ متاثر نہیں ہوئے۔ اس کے علاوہ گوالیار، اندور، بھرت پور وغیرہ ریاستیں بھی شروع سے آخر تک انگریزوں کے ساتھ رہیں۔ اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہوئی کہ جلد ہی خود دیسی سپاہ کے مختلف گروہوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ کوئی مثبت قومی تصور یا آدرش ان لوگوں کے پیش نظر نہیں تھا۔ ان سب کے سینوں میں صرف ایک ہی جذبہ تھا "انگریز کی مخالفت" جو سراسر ایک منفی تخیل ہے اس طرح گویا خود ان کی تخریب میں خرابی کی ایک صورت مضمر تھی۔

بے شک یہ شورش ناکام رہی لیکن اس کے باوجود ۱۸۵۷ء کے واقعات بہت اہم تاریخی واقعہ ہیں۔ انھیں آج کے معیاروں سے نہیں دیکھنا چاہیئے۔ اتنا ثابت ہے کہ اس وقت انگریزوں کے خلاف نفرت بہت سمایاں تھی اور اس کا اظہار نہایت شدت سے ہوا۔ . . . . . اس میں ہندو مسلمان دونوں برابر کے شریک تھے اور انگریزوں کے خلاف یہ ان کا پہلا متحدہ محاذ تھا۔ یہ شورش کامیاب نہ ہوئی لیکن اس سے انگریزوں

کی برتری کا طلسم ٹوٹ گیا اور ہندوستانی قومیت کا شعور ابھرنے میں مدد ملی۔

●

ماخذ:- (۱) "تمار یہ عظیم"، پنڈت کنہیالال، مطبع نول کشور لکھنو۔ (۲) "داستان غدر"، ظہیر دہلوی، مطبع کریمی لاہور۔ (۳) "تاریخ بغاوت ہند"، سکندر لال، مطبع مفید اخلاق آگرہ، ج ۷، حصہ ۳، ۱۸۶۰ء۔ (۴) "غدر کا نتیجہ" (نصرت نامہ گورنمنٹ از غلام حسین خاں، اردو ترجمہ) مرتبہ خواجہ حسن نظامی دہلی، ۱۹۳۰ء۔ (۵) "غدر کی صبح شام" (روزنامچہ معین الدین حسن خاں وجیون لال مرتبہ سر چارلس مٹکاف مترجمہ مولوی ضیاالدین احمد برنی، شائع کردہ خواجہ حسن نظامی دہلی، ۱۹۲۶ء۔ (۶) "غدر دہلی کے اخبار"، مرتبہ خواجہ حسن نظامی دہلی۔ (۷) "محاصرہ دہلی کے خطوط"، مرتبہ خواجہ حسن نظامی، دہلی۔ (۸) "اسباب بغاوت"، سرسید احمد خاں۔ (۹) "تاریخ عروج عبدالفگشیہ"، مولوی ذکاءاللہ، دہلی، ۱۹۰۴ء۔ (۱۰) "قیصر التواریخ" (تاریخ اودھ) ج ۲، سید کمال الدین حیدر، لکھنو، ۱۸۸۶ء (۱۱) "تاریخ اودھ"، محمد نجم الغنی، مطبع نول کشور، ۱۹۱۹ء۔ (۱۲) THE WAR OF INDIN INDEPENDENCE، ساورکر، بمبئی، ۱۹۴۷ء۔ (۱۳) "دہلی کی جان کنی"، خواجہ حسن نظامی، دہلی، ۱۹۲۷ء بار پنجم۔ (۱۴) "انگریزوں کی بپتا" خواجہ حسن نظامی، دہلی ۱۹۲۷ء بار پنجم۔ (۱۵) "بہادر شاہ ظفر"، امیر احمد علوی، ادارہ فروغ اردو، لکھنو، ۱۹۵۵ء۔ (۱۶) "بہادر شاہ ظفر اور اس کا عہد" رئیس احمد جعفری، لاہور، ۱۹۵۶ء۔

●

ادب اور آرٹ کا ——— حسین ترین امتزاج

شعور

تیسرا سلسلہ شائع ہوگیا ہے

اس شمارے میں حصہ لینے والے: کرشن چندر، اثر لکھنوی، بلونت سنگھ، احمد ندیم قاسمی، حفیظ ہوشیارپوری، شوکت تھانوی، ممتاز مفتی، ظہور نظر، آغا بابر، قتیل شفائی، شاد عارفی، مصطفےٰ زیدی، محمد خالد اختر، سلیمان اریب، ابوسعید قریشی، خلیل الرحمٰن اعظمی شاذ تمکنت، ضمیر الدین احمد، شان الحق حقی، شاعر لکھنوی، حنیف فوق، عبدالرؤف عروج، اختر ہوشیارپوری اور دوسرے

۳۲ صفحات پر مشتمل کلیات میر کی دوسری قسط بھی اس شمارے میں بطور تحفہ پیش کی جارہی ہے

تزئین ● صفدر ربانی، آذر زوبی ——— ترتیب ● آذر زوبی

ڈھائی سو صفحات کے اس بے مثال رسالہ کی قیمت ——— صرف تین روپے

پتہ:- مکتبہ شعور ● ماٹھوی والا لین ● پریڈی اسٹریٹ ● صدر ● کراچی

نصیر الدین ہاشمی

۱۸۵۷ء اور حیدرآباد

تین سو سال پہلے انگریز تجارت کرنے کی غرض سے ہندوستان آئے جب مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اور آپس کی خانہ جنگیوں اور تدبر کے فقدان کے باعث ملک میں انتشار پھیل گیا تو انگریزوں کو ملک گیری کی ہوس پیدا ہوگئی اہل ہند کی نااتفاقی، مخالفت اور خود غرضی کے باعث انگریزوں کے حوصلے بلند ہوگئے اور روز بروز ان کی سلطنت مضبوط ہوتی گئی اور ہوتے ہوتے یہ تاجری ۱۸۵۷ء میں تقریباً پورے ہندوستان کے مالک بن بیٹھے۔ دیس ہی کے باشندوں کی فوج بنائی انگریز افسر مقرر کرکے ان کو جنگی تعلیم دے کر باقاعدہ بنایا اور دیسی ریاستوں کی فوج سے مقابلہ میں بازی لے جانے لگے اس طرح ان کی حکومت کا دائرہ وسیع ہوتا ہوگیا۔

ایسے زمانے میں جب کہ انگریز پورے ہندوستان پر قابض ہو رہے تھے صرف ایک بہادر اور جانباز سپاہی ٹیپو سلطان کے نام سے آج تک مشہور ہے اس نے انگریزوں کی بڑھتی ہوئی قوت کا اندازہ کرلیا اور ان کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے کی تدبیر کی مگر انگریزوں نے اپنی ڈپلومیسی اور چالبازیوں کی بدولت مرہٹوں اور نظام کو..... ہموار کرلیا اور پھر ٹیپو سلطان کے بعض امیروں کو رشوت ... دے کر اپنے موافق بنالیا جس کی وجہ سے ہندوستان کا یہ بہادر سپاہی ٹیپو سلطان جنگ کرتے ہوئے شہید ہوگیا۔

انگریزوں نے ملک گیری کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب کی تبلیغ بھی شروع کردی تھی ان کے پادری برسر عام مذہبی لکچر دینے اور ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے لگے۔ دوسری طرف ہندوستان کی صنعت و حرفت کو تباہ کرنے کا تہیہ کرلیا۔ یہاں کے صناعوں کو نقصان پہنچا کر تباہ کرنے لگے، تاکہ انگلستان کے مشین سے بنائے ہوئے سامان کی کھپت ہوسکے۔ ہندوستان کی دولت انگلستان جاتی رہی اور ہندوستان مفلس بن گیا یہاں کے باشندے بھوکوں مرنے لگے قحط اور افلاس بڑھنے لگا یہ تمام اسباب تھے جس کے باعث کئی محبان وطن اس پر کمربستہ ہوگئے کہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کیا جائے چنانچہ ۱۸۳۹ء میں مولانا سید احمد شہید نے ایک مذہبی تحریک کی صورت میں (جس کو وہابی تحریک کہا جاتا ہے) جدوجہد شروع کی تھی ان کا مقصد یہ تھا کہ انگریزوں کی حکومت کو ختم کیا جائے۔ کئی سال تک یہ تحریک کامیابی سے چلتی رہی مگر اس کے بانیوں کے شہید ہوجانے اور کافی اسلحہ اور ساز و سامان نہ ہونے کے باعث کامیابی نہ ہوسکی۔

اس کے بعد ۱۸۵۷ء کے واقعات ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ سے جنگ کا آغاز ہوا۔ انگریزوں کی دیسی فوج باغی ہوگئی اور دہلی آکر اس کو انگریزوں سے فتح کرلیا۔ مغلیہ بادشاہ جو وظیفہ یاب اور بے دست و پا تھے پھر سے دہلی کے تخت پر بٹھائے گئے۔ جنرل بخت خاں فوج کا کمانڈر انچیف مقرر ہوا۔ بہادر شاہ کے خطوط سے پوری طرح واضح ہوتا ہے کہ ان کا مقصد انگریزوں کو ملک سے باہر کرکے مشورہ کے بعد کسی کو ہندوستان کا بادشاہ بنانا تھا۔

ہندوستان کے مختلف حصّوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت کا جذبہ پھیل گیا اور کئی نامور ہستیاں مثلاً نانا صاحب تانیتا ٹوپی، شہزادہ فیروز شاہ، رانی جھانسی، بیگم اودھ، جنرل عظیم اللہ خاں وغیرہ انگریزوں سے جنگ کرتے رہے۔ ان سب کے حالات یہاں لکھنے کی گنجائش نہیں ہے اس لیے یہاں صرف حیدرآباد کی جدوجہد کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو جنگ آزادی کی تاریخ میں جلی حروف سے لکھا جاسکتا ہے۔

حیدرآباد کی حکومت کی جانب سے جنگ آزادی حیدرآباد کی جدوجہد کے متعلق دو کتابیں شائع ہوگئی ہیں ان میں تفصیل سے واضح کیا گیا ہے کہ حیدرآباد کی جدوجہد کا آغاز ۱۸۵۶ء سے ہوا۔ جو مشہور واقعات اس خصوص میں لکھے جاسکے ہیں ان کو سلسلے کے لحاظ سے یہاں درج کیا جاتا ہے

۱۔ سب سے پہلے نورالامرا اور راؤ رنجھلے کے واقعات سامنے آتے ہیں ۱۸۵۶ء میں جنوبی ہند کی چھاؤنیوں کی دیسی فوج لباس کی تبدیلی کے باعث باغی ہوگئی ان کو خیال ہوا کہ لباس کے ساتھ رفتہ رفتہ مذہب بھی تبدیل کردیا جائے گا کیوں کہ اس زمانہ میں عیسائی پادری بازاروں میں عیسائیت کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔

جنوبی ہند کے کئی مقامات مثلاً سندی درگ، شنکر راک، بلاری، بنگلور، والاجاہ پیٹھ وغیرہ میں فوج باغی ہوگئی اور سوار جو فوج سے سخت مقابلہ کیا۔ یہ واقعات حیدرآباد کی کنٹینجنٹ کو معلوم ہوئی۔ کنٹینجنٹ کی فوج تنخواہ تو نظام سے پاتی تھی مگر انگریزوں کے زیر اقتدار تھی اسی زمانہ میں بالاپور سے ایک فوج بلا اجازت حیدرآباد آئی اس طرح یہاں سراسیمگی پیدا ہوگئی۔ حیدرآباد میں یہ افواہ پھیل گئی کہ انگریز حضور نظام سے لڑنے کے لیے تیار ہورہے ہیں اس خبر کو سن کر آصف جاہ ثالث نے اپنی خاص فوج کو بھی تیاری کا حکم دیدیا تھا۔ مگر اس کے بعد انگریزوں نے دیوان کے ذریعہ کہلا بھیجا کہ انگریزی فوج حضور سے جنگ کرنا نہیں چاہتی۔ بلکہ وہ حضور کی محافظت کرنے کے لیے ہے۔

حیدرآباد میں جو دیسی فوج باغی ہوگئی تھی اس کو ہتیار لے کر برطرف کردیا گیا تھا۔ برطرف کیے ہوئے افسر اور سپاہیوں کو نورالامراء اور راجہ راؤ رنجھلے نے اپنی فوج میں ملازم کرلیا۔ اس الزام میں ان دونوں امیروں پر رزیڈنٹ کا عتاب ہوا اور اور گورنر جنرل کی جانب سے حضور کو لکھا گیا تھا کہ ان کو حیدرآباد سے شہر بدر کردیا جائے چنانچہ دونوں امیر کچھ عرصہ کے لیے اپنی جاگیرات میں چلے گئے۔

۲۔ اس کے بعد راجہ مہیت رام کا واقعہ ہے مہیت رام ایک گجراتی کھتری تھے اور حکومت آصفیہ میں بڑے اعزاز

کے مالک تھے لاکھوں کی جاگیرات تھیں کئی صوبوں کے صوبہ دار اور ایک بڑی فوج کے کمانڈر تھے اولاً حضور کی فرانسیسی فوج کا تعلق ان کے سررشتہ سے تھا۔ وہ اس کی وجہ سے انگریزوں سے اچھی طرح واقف تھے اور ہندوستان اور دکن سے ان کی حکومت کو نکال باہر کرنے کا خیال رکھتے تھے۔ جب انگریزوں کو راجہ مہیت رام کے خیالات کا علم ہوگیا تو وہ ان کے درپے آزار ہوگئے میر عالم (جو اس زمانہ میں دیوان تھے) کے ذریعہ ان کی بیخ کنی کرنی چاہی اور ان کی جاگیرات وغیرہ ضبط کرکے ان کو حیدرآباد سے چلے جانے کا حکم دیا۔ آصف جاہ ثالث سکندر جاہ راجہ مہیت رام سے خوش تھے، اور ان کو حکومت آصفیہ کا خیرخواہ تسلیم کرتے تھے۔ مگر انگریزوں کے باعث مجبور ہوگئے اور ان کو حیدرآباد سے چلے جانے کی "اجازت" دیدی۔

راجہ مہیت رام سکریشاپور گئے اور وہاں ایک فوج جمع کرلی جس میں عرب اور روہیلے زیادہ تھے اب انگریزی فوج..... مہیت رام سے لڑنے کے لیے گئی اس فوج میں ایک کمانڈر گارڈن تھا اور دوسرا ولیم پالمر اس فوج کا مقابلہ راجہ مہیت رام نے بڑی بہادری سے کیا راجہ مہیت رام نے اپنی فوج کو اس طرح مرتب کیا تھا کہ ایک طرف عرب اور روہیلے تھے اور دوسری طرف توپ خانہ تھا۔ میجر گارڈن توپ خانہ کی طرف بڑھا مگر مارا گیا اور اس کی فوج پسپا ہوگئی پالمر نے عربوں اور روہیلوں کے طرف پیش قدمی کی مگر گرفتار ہوگیا۔ اس طرح پوری فوج پسپا ہوکر واپس آگئی پالمر کو راجہ مہیت رام نے داغ دے کر رہا کردیا۔ یہ حیدرآباد آکر ایسا شرمندہ ہوا کہ فوجی ملازمت سے استعفا دے کر بنک قائم کرلیا۔ اور بڑی بڑی شرح سود پر حکومت کو اور امیروں کو قرضہ دینے لگا۔ اس پالمر کی بھی بڑی لمبی کہانی ہے۔ راجہ چندولال کی داد و دہش سے سرکاری خزانہ خالی ہوگیا تو پالمر سے سودی قرضہ لیا جاتا رہا۔ اس کی وجہ سے رزیڈنٹ اور گورنر جنرل میں اختلافات ہوگئے، کیوں کہ پالمر کو گورنر جنرل کی پشت پناہی حاصل تھی اس لیے رزیڈنٹ کی مخالفت اثر نہیں کرتی تھی چونکہ یہ واقعات ایک طویل سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے یہاں نظرانداز کیے جاتے ہیں۔ راجہ مہیت رام سے مقابلہ کرنے کے لیے دوسری مرتبہ زیادہ فوج کو روانہ کیا گیا۔ چونکہ مہیت رام کے پاس اس بڑی فوج سے مقابلہ کے لیے قوت نہیں تھی اس لیے وہ ہولکر کے پاس چلے گئے اور پھر انگریزوں سے جنگ کرتے ہوئے زخمی ہوگئے اور ناگپور کے دواخانہ میں لائے گئے اور یہاں ان کا انتقال ہوگیا۔ راجہ مہیت رام کو حیدرآباد کی جنگ آزادی کا پہلا سپاہی قرار دینا صحیح ہوگا۔

۳۔ راجہ مہیت رام کے بعد نواب مبارزالدولہ کے کارنامے آتے ہیں جن کو یکے بعد دیگرے تین مرتبہ انگریزوں کی وجہ سے قلعہ گولکنڈہ میں قید کردیا گیا اور آخری مرتبہ جو نظربندی ہوئی تو مرکر ہی رہائی پائی۔

نواب مبارزالدولہ آصف جاہ ثالث یعنی سکندر جاہ کے فرزند اور آصف جاہ رابع یعنی ناصرالدولہ کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے۔ مبارزالدولہ کو مذہب سے دلچسپی تھی اور دینی امور کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ فنون سپہ گری کی اچھی مہارت رکھتے تھے شمشیربازی اور تیراندازی کا خاص ملکہ تھا۔ ان کو شروع سے انگریزی تعلیم اور انگریزی معاشرت سے نفرت تھی۔ بالفاظ دیگر وہ انگریزوں کے مخالف تھے۔

۱۸۱۵ء میں مبارز الدولہ کے علاقہ کا ایک مرثیہ خواں شیریں نام کا رزیڈنسی کے ایک درزی سے جھگڑا ہو گیا۔ مبارز الدولہ کے ملازمین اس درزی کو پکڑ لائے۔ چونکہ اس زمانہ میں سرکاری پولیس پوری طرح منظم نہیں تھی اس لیے حکومت کے امراء اور شاہی خاندان والے کوتوالی . . . . . کی پروا نہیں کرتے تھے۔ رزیڈنٹ نے حضور سے چارہ جوئی چاہی۔ حضور یعنی خود سکندر جاہ نے انتظام کرنے کا وعدہ کیا مگر رزیڈنٹ نے بہ اختیار خود اپنی فوج بھیج کر مبارز الدولہ کی ڈیوڑھی کا محاصرہ کر لیا اور محل پر گولہ باری ہونے لگی۔ مبارز الدولہ کو بھی غصہ آ گیا اور انھوں نے اپنے تیر سے انگریز افسر کو ہلاک کر دیا۔ انگریزی فوج اپنے افسر کے مارے جانے پر غضبناک ہو کر آگے بڑھی۔ مبارز الدولہ کے ایک حبشی سپاہی نے انگریزی توپ پر قبضہ کر کے اس کا منہ پلٹ دیا۔ اب انگریزی فوج پسپا ہو گئی۔ اس واقعہ کو سن کر رزیڈنٹ نے اور زیادہ فوج نہ بھیجنی چاہی مگر مہاراجہ چندو لال کی مدت علی کے بعد انگریزی فوج رک گئی اور مبارز الدولہ کو قلعہ گولکنڈہ میں نظر بند کر دیا گیا۔ پانچ سال کے بعد رہائی ملی۔

مبارز الدولہ کی دوسری نظر بندی ۱۸۲۰ء میں ہوئی واقعات یہ ہیں کہ خود ان کے علاقہ کے ملازموں اور رہیلوں میں کچھ تکرار ہو گئی اور مار پیٹ سے کچھ سپاہی زخمی ہو گئے۔ رزیڈنٹ تو مبارز الدولہ کی ناک میں تھا فوراً سکندر آباد کی چھاؤنی سے فوج آ گئی اور مبارز الدولہ کی ڈیوڑھی کا محاصرہ کر لیا گیا۔

اس زمانہ میں ناصر الدولہ یعنی مبارز الدولہ کے بڑے بھائی کی حکمرانی تھی۔ انگریزوں نے ان کو مجبور کر کے مبارز الدولہ کو قلعہ گولکنڈہ میں نظر بند کر دیا۔

حیدرآباد کے عوام مبارز الدولہ کو بہت عزیز رکھتے تھے انھوں نے مبارز الدولہ کی نظر بندی کے واقعہ کو افسوس سے سنا تھا اور ان کی سواری دیکھنے کے لیے ان کی ڈیوڑھی کو ٹلہ عالیجاہ سے قلعہ گولکنڈہ تک راستوں پر دو طرفہ اور گھروں کی چھتوں پر حتیٰ کہ درختوں پر چڑھ گئے تھے اور بچے، جوان، بوڑھے، عورت مرد سب ہی باجشم گریاں ان کی سواری کو دیکھتے رہے چند سال کے بعد جب مبارز الدولہ کو رہائی ملی تو اس وقت پہلے سے زیادہ خوشی اور مسرت کا اظہار کیا گیا۔

مبارز الدولہ کی تیسری نظر بندی ۱۸۳۹ء میں وہابی تحریک کے سلسلے میں ہوئی۔ مولوی ولایت علی اور مولوی سلیم نے جو سید احمد شہید کے مرید تھے حیدرآباد آ کر مبارز الدولہ پر . . . . اثر قائم کر لیا اور مبارز الدولہ اس تحریک میں شریک ہو گئے۔ اس تحریک نے دور دور تک بڑی وسعت حاصل کر لی تھی۔ سندھ، بنگال، حتیٰ کہ کابل سے خط و کتابت ہوتی تھی۔ مبارز الدولہ کو سارے ہندوستان کا بادشاہ بنانے کی تجویز تھی کرنول کے نواب غلام رسول خاں نے توپ سازی کا ایک کارخانہ قائم کیا تھا۔ سینکڑوں توپیں تیار ہو چکی تھیں۔ اودگیر علاقہ مدراس سے ایک لاکھ کی بارود خریدی گئی تھی۔ انگریزی دیسی فوج کی کمپنیاں اس تحریک میں شریک تھیں بہرحال بڑی تیاری ہو چکی تھی ایک خاص تاریخ کو ہنگامہ ہونے والا تھا مگر قبل از وقت چند خطوط انگریزوں کو مل گئے جس کے باعث اصل ہنگامہ نہ ... ہو سکا رزیڈنٹ نے ناصر الدولہ کے

پاس آکر واقعات بیان کیے اور مبارز الدولہ کو نظر بند کر دینے کی خواہش کی۔ چنانچہ سرکاری فوج مدیر جنگ عبداللہ بن علی اور دلاور جنگ محمد خاں قائم خانی کے تحت بھیجی گئی اور مبارز الدولہ کی ڈیوڑھی کا محاصرہ کر لیا گیا چار روز کے محاصرہ کے بعد سرکاری فوج ڈیوڑھی کے اندر داخل ہو سکی۔ نواب مبارز الدولہ بنفس نفیس لڑنے کے لیے آ گئے۔ مگر عبداللہ بن علی نے اپنی فوج کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ خود مبارز الدولہ سے گفتگو کر کے ان کو حضور کے حکم کے مطابق قلعہ کو چلنے کے لیے راضی کر لیا اور مبارز الدولہ کو گولکنڈہ موتی محل میں نظر بند کر دیا گیا۔ اس طرح مبارز الدولہ تیسری مرتبہ نظر بند کر دیے گئے اور انھوں نے اپنی عمر کے باقی پندرہ سال نظر بندی کی حالت میں گذار دیے اور اس بار مرکر ہی ان کو رہائی ملی۔ لاش قلعہ کے موتی محل سے لا کر دکھا برہنہ شاہ میں دفن کی گئی۔ ان کے ہمراہیوں کو اٹھارہ اٹھارہ سال تک قید میں رکھنے کے بعد شہر بدر کر دیا گیا۔

۴۔ اب ۱۸۵۷ء سے ۱۸۵۸ء کے سلسلۂ واقعات کا آغاز ہوتا ہے اس سلسلہ میں ۱۸۵۷ء سے ۱۸۵۸ء تک کے واقعات رونما ہوئے یکے بعد دیگرے ان کی مختصر صراحت کی جاتی ہے۔ جب ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء میں میرٹھ میں فوج باغی ہو گئی اور اس نے دہلی کی جانب پیش قدمی کی تو اس کی اطلاع کئی ہفتے کے بعد دکن میں پہنچی کیونکہ آج کل کی طرح اس زمانہ میں اخبارات عام نہیں تھے اور نہ دوسرے ذرائع پبلک کی اطلاع کے موجود تھے۔

میرٹھ کے حالات کی اطلاع ۱۰ جون ۱۸۵۷ء کو اورنگ آباد کی دیسی فوج کی چھاؤنی کو ملی اس زمانہ میں مومن آباد سے گھوڑا سوار پلٹن اور رنگ آباد میں آئی ہوئی تھی اور کالے چبوترے کے پاس اس کا قیام تھا۔ سپاہیوں نے آپس میں قسمیں کھائیں کہ ہم دہلی جا کر بادشاہ سے مقابلہ نہیں کریں گے۔ جب یہ حالات انگریز افسروں کو معلوم ہوئے تو احمد نگر اور پونہ سے سولجروں کی فوج طلب کی گئی اور دیسی فوج کو گھیر کر چھ منٹ کی مہلت دی گئی کہ ہتیار اتار دیں۔ جب سواروں نے آگے قدم بڑھایا تو سولجروں نے گولیوں کی بارش شروع کر دی۔ بیسیوں سوار مارے گئے صدہا کو گرفتار کر لیا گیا سینکڑوں فرار ہو گئے دیسی فوج کا سرکردہ امیر خاں تھا وہ بھی فرار ہو گیا تھا اس کی گرفتاری کے لیے دو ہزار روپے انعام کا اشتہار دیا گیا۔

مفرور فوج کی گرفتاری کا سلسلہ شروع کیا گیا کئی سوار جامع مسجد سے گرفتار کر کے لائے گئے۔ دیہات کے باشندوں کو بھی گرفتار کیا جاتا رہا بعضوں کو گولی کا نشانہ بنایا گیا، بعض کو سولی دی گئی بعض توپ کے منہ کو باندھ کر اڑا دیے گئے۔ ان کے ہاتھ اور پیر بیس سے اسی گز تک دور جا گرے ایک مرنے والے نے کہا "میں گناہوں سے پاک ہو رہا ہوں اور وطن کی آزادی کے لیے جان دے رہا ہوں"۔ کچھ سوار اورنگ آباد سے حیدرآباد بھی آ گئے تھے یہاں ان کو گرفتار کر کے جب رزیڈنٹ کے حوالے کیا گیا تو عام طور سے بے چینی میں اضافہ ہو گیا۔ امیر خاں زمانہ مابعد میں گرفتار ہوا اور تمام عمر کے لیے جزیرہ انڈمان روانہ کر دیا گیا اس کے علاوہ کئی سوار تمام عمر کے لیے وہاں جلاوطن کر دیے گئے۔

۵۔ ۱۸۵۷ء کا دوسرا اہم واقعہ حیدرآباد کی رزیڈنسی پر حملہ ہے۔ حیدرآباد میں میرٹھ کے ہنگامے اور دہلی پر حملہ اور اس کو فتح کرنے، بہادر شاہ کے تخت نشین ہونے کا علم ہو چکا تھا اور نہ صرف تعلیم یافتہ اور ذی مرتبہ اصحاب بلکہ عوام میں بھی ہل چل

مچی ہوئی تھی۔ جب اورنگ آباد کے سوار یہاں آئے اور ان کو گرفتار کر کے رزیڈنٹ کے حوالے کیا گیا تو یہاں کی ہل چل اور سراسیمگی میں اور اضافہ ہو گیا۔

مکہ مسجد میں ایک جلسہ میں جس میں کئی سربرآوردہ اصحاب جیسے شمس الامرا فخر الدین خاں کے فرزند رشید الدین خاں اعتدار الملک اور ان کے علاوہ عظمت جنگ لشکر جنگ، مرزہ محمد چاند، محمد باز خاں، حکیم ابراہیم وغیرہ شامل تھے جہاد کی ترغیب دی گئی چار مینار اور مکہ مسجد پر "جہاد" کے اشتہار چسپاں کر دیئے گئے (یہ اشتہار بھی اب دستیاب ہو چکے ہیں)

۲۴ ذی قعدہ ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۲ جولائی ۱۸۵۷ء جمعہ کے دن مغل پورہ کی مسجد میں مولوی علاء الدین اور لشکر جنگ نے نماز ادا کی۔ مولوی علاء الدین ایک عالم اور فاضل شخص تھے حیدر آباد کے مشہور عالم اور صوفی مولانا شجاع الدین کے خاندان سے ان کا تعلق تھا، ۳۵ سال کی عمر تھی۔ وہ اقتدار الملک کے مصاحب تھے۔ یعنی شمس الامرا کے متوسل تھے تنخواہ ملتی تھی اور ان کی قابلیت کا اعتراف خاص و عام میں تھا وہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے ان کے شاگردوں کی تعداد بھی تھی۔

مولوی علاء الدین نماز جمعہ کے بعد رزیڈنسی پر حملہ کے لیے روانہ ہوئے ان کے ساتھ ان کے کئی شاگرد بھی تھے جو مغل پورہ سے چار مینار پہنچے تو جہانگیر خاں اپنے ساتھیوں کے ساتھ شامل ہو گیا۔ جیسے جیسے یہ لوگ آگے بڑھتے گئے ان میں اور لوگ بھی شامل ہوتے گئے ان کے پاس صرف تلوار، بھرمار بندوق اور لاٹھیاں تھیں جب مجمع شہر کے دروازہ سے باہر نکلا تو (یہ دروازہ مسلم جنگ کے پل کے پاس تھا) اس کی تعداد کئی ہزار ہو گئی تھی یہ مجمع ندی کے اندر سے ہو کر بیگم بازار پہنچا یہاں سے طرہ باز خاں اور اس کے ساتھی مجمع میں شامل ہو گئے۔

طرہ باز خاں ایک بہادر روہیلہ سپاہی سرکاری ملازم نہیں تھا مگر فوجی عزت اور صاحب قدرت تھا۔ بڈھن خاں سے (جو کمال خاں مرحوم کے اجداد میں شامل ہیں) رشتہ داری تھی۔ طرہ باز خاں کے زیر اثر بہت سے روہیلے تھے۔

اب یہ مجمع بیگم بازار سے رزیڈنسی کو روانہ ہوا۔ حکومت آصفیہ نے مجمع کو روکنے یا منتشر کرنے کی کوئی کارروائی نہیں کی، بلکہ خاموشی اختیار کر لی۔ جب یہ مجمع جو کئی ہزار آدمیوں پر مشتمل تھا گولی گوڑہ کے مقام پر پہنچا تو رزیڈنسی سے توپ کے گولے سر ہونے لگے۔ اس کے باوجود مجمع نے آگے بڑھ کر رزیڈنسی کے دروازے کو توڑ دیا مگر توپ کی گولہ باری اور بندوق کی گولیوں سے مجبور ہو کر بالآخر پسپا ہو گیا تاہم بہت سے لوگ ابن صاحب اور جے گوپال داس اور اعظم خاں کے مکانوں میں پناہ لے کر رات بھر رزیڈنسی پر گولیاں چلاتے رہے۔

صبح ہونے کے بعد مولوی علاء الدین اور طرہ باز خاں پناہ گاہ سے چلے گئے اور . . . . دونوں بیگم بازار میں طرہ باز خاں کے مکان پہنچے۔ طرہ باز خاں گھوڑے پر سوار ہو کر ایک طرف فرار ہو گیا اور مولوی علاء الدین سیتا رام پیٹھ کے پہاڑ چلے گئے۔ رزیڈنٹ نے ان واقعات کی اطلاع حضور نظام کو دے دی۔

رزیڈنٹ کے دباؤ پر حکومت آصفیہ کی جانب سے تمام باغیوں کی گرفتاری کی کوشش شروع ہوئی۔ ان گرفتاریوں

چار ہزار کا انعام مقرر ہوا۔ طرہ باز خاں کو مغل گدہ میں زخمی کر کے گرفتار کر لیا گیا اور اسے جزیرۂ انڈمان روانہ کرنے کا.... فیصلہ صادر ہوا مگر چونکہ وہ زخمی تھا اس لیے رزیڈنسی کے سرجن کے زیر علاج رہا کئی ماہ کے بعد جب تندرست ہو گیا تو پہرہ کے جوانوں کو ساتھ لے کر فرار ہو گیا۔ اب دوبارہ پانچ ہزار کا انعام مشتہر ہوا۔ اس مرتبہ طرہ باز خاں نے تویران کے جنگل میں پناہ لی۔ تویران کے تعلقدار کو اس کی اطلاع مل گئی اور اس کی گرفتاری کے لیے روانہ ہو گئے۔ طرہ باز خاں اور تعلقدار کے آدمیوں میں مقابلہ ہوا۔ اس مقابلہ میں طرہ باز خاں شہید ہو گیا۔ لاش حیدرآباد لائی گئی شناخت ہوئی کئی دن تک سر بازار لٹکائی گئی اس کے بعد دفن کر دی گئی۔ اس طرح طرہ باز خاں نے وطن کی آزادی کی خاطر اپنی بہادری اور دلیری کا ثبوت دے کر جان دیدی۔

مولوی علاء الدین ۱۸ جولائی کا تمام دن ستبارام پیٹھ کی پہاڑی پر مقیم رہے سر کے بال اور ڈاڑھی کو جمیعہ سے کاٹ کر چھوٹی کر دی رات کے وقت پہاڑی سے نکل کر فتح دروازہ کے راستہ اپنے مکان مغل پورہ گئے اور وہاں سے جنگل کی راہ لی موضع منگلور پہنچے اس کے بعد موضع منگل پلی ضلع محبوب نگر میں جو مہاراجہ منرندر پرشاد (مہاراجہ کشن پرشاد کے نانا) کا جاگیری موضع تھا۔ پیر محمد کے مکان میں قیام کیا۔ مولوی علاء الدین جیسا کہ لکھا گیا ہے ایک مذہبی شخص تھے نہ صرف عالم تھے بلکہ عامل بھی تھے ۱۲۷۵ھ (۱۸۵۹ء) میں موضع منگل پلی اور اس کے آس پاس کے مواضعات میں وہابیت پھیل گئی اس کے دفعیہ کے لیے مولوی علاء الدین نے لوگوں کو تعویذیں دیں۔ کھوج کرنے والوں کو اس سے پتہ چل گیا اور مولوی صاحب گرفتار کر لیے گئے مقدمہ چلایا گیا انھوں نے اقبال جرم کیا اور انھیں تمام عمر کے لیے جزیرہ انڈمان کو جلاوطن کر دیا گیا۔ وہ (۶۷) سال کی عمر تک وہاں زندہ رہے۔ کئی مرتبہ وہاں سے رہائی کی استدعا کی مگر منظور نہیں ہوئی۔

۶۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی یہ ہے کہ ۱۸۵۵ء میں جب افضل الدولہ آصف جاہ خامس سے ملنے کے لیے رزیڈنٹ چوک محلہ (سوتی گلی) آیا تو ایک روہیلہ جمعدار جہانگیر خاں نے (جو ۱۸۵۷ء کے حملے میں شریک تھا) رزیڈنٹ کو گولی کا نشانہ بنانا چاہا مگر گولی خطا کر گئی۔ اس نے تلوار کھینچ لی لیکن اس عرصہ میں اس کو گرفتار کر لیا گیا بعد میں اس پر مقدمہ چلایا گیا اور اسے پھانسی دیدی گئی۔

۷۔ ۱۸۵۷ء میں شورا پور کے راجہ وینکٹا نے عربوں اور روہیلوں کی ایک اچھی خاصی جمعیت فراہم کر لی تھی اور انگریزوں سے جنگ کرنے کی پوری تیاری کر لی تھی۔ مقابلہ ہوا مگر کامیابی نہیں ہوئی راجہ صاحب حیدرآباد آ گئے اور یہاں ان کو گرفتار کر کے رزیڈنٹ کے حوالے کر دیا گیا ان کو بھی جزیرہ انڈمان روانہ کرنے کا فیصلہ ہوا مگر انھوں نے عنبر پیٹھ کے مقام پر فوج کی نگرانی میں خودکشی کر لی۔

ان کے شریک کار عزت خاں، سدی نصیب وغیرہ کو پھانسی کی سزا دی گئی یا جزیرہ انڈمان کو جلاوطن کر دیا گیا۔

۸۔ نانا صاحب پیشوا اور تانیتا ٹوپی نے دکن کے طرف بھی خطوط روانہ کیے تھے اور اپنے وکلا کو بھیجا.... چنانچہ رنگ راؤ نامی ایک شخص کو لاس آیا اور راجہ دیپ سنگھ والی سمستان کو فوج فراہم کرنے کے لیے راضی کر لیا۔ اس سلسلہ میں

صفدرالدولہ کو بھی ہموار کرلیا گیا تھا مگر رنگ راؤ گرفتار کرلیا گیا۔ خطوط پکڑے گئے۔ راجہ صاحب کو گدی سے اتار دیا گیا صفدرالدولہ کی تمام جائیداد منقولہ وغیر منقولہ ضبط کرلی گئی اور ان کو تمام عمر کے لیے نظر بند کر دیا گیا۔

۹۔ ۱۸۵۸ء میں موضع جولہ تعلقہ لسبت کے پیرزادگان غلام حسین اور غلام محسن نے ہنگامہ کیا ان کے پاس دہلی کے آئے ہوئے روہیلے جمع ہوئے انگریزی فوج پر حملہ کرنے کے منصوبے ہوئے انگریزی فوج سے مقابلہ ہوا لیکن سرگروہ گرفتار کرلیا گیا مقدمہ چلایا گیا اور اسے قید کی سزا دی گئی۔ جاگیر ضبط ہوئی جولہ کی گڑھی مسمار کردی گئی۔

۱۰۔ اس کے بعد ۱۸۶۲ء میں بیگم بازار کا واقعہ ہوا۔ پیشوا کے خاندان کے دو اشخاص راؤ صاحب اور بابا صاحب قلم و آصفیہ میں آئے اور حیدرآباد کو بھی اپنا مرکز بنایا۔ فوج جمع کرنے کی کوشش شروع کی گئی، لوگوں کو دوشالے اور پگڑیاں تقسیم کی گئیں صدہا اشخاص ان کے ساتھ مل گئے مگر راز کھل گیا۔ لوگوں کی گرفتاریاں ہوئیں گھروں کی تلاشیاں لی گئیں اس کے بعد پینتالیس آدمیوں پر مقدمہ چلایا گیا اور مختلف سزائیں دی گئیں۔ چنانچہ آٹھ اشخاص کو دوامی قید کی سزا دی گئی پانچ اشخاص کو دس دس سال تک اور سات کو سات سات سال تک نو کو تین سال اور باقی کو ایک سال کی قید کی سزا دی گئی موہن لال کو جو سرموتی لال کے اجداد میں شامل تھے پچہتر ہزار کا جرمانہ اور پوری مل ساہو کو دس ہزار کا جرمانہ کیا گیا۔

اس ہنگامہ میں بڑا حصہ رام رتن گیر چیلہ نربدا گیر کا تھا اس نے نہ صرف بابا صاحب کو حیدرآباد میں رکھا تھا بلکہ ان کے مقصد کی تکمیل میں بڑی جدوجہد کی تھی اور پھر ان کے فرار کرانے میں بھی حصہ لیا تھا۔ اس کو گرفتار کیا گیا اور اس پر سختیاں کی گئیں۔ ایک مرتبہ وہ قید سے فرار بھی ہوا مگر پھر گرفتار کرلیا گیا۔ بابا صاحب کا پتہ نہ بتلانے کی پاداش میں اس پر ظلم و ستم کیا جاتا رہا اس سے تنگ آکر اس نے خودکشی کرلی۔

۱۱۔ ہنگاموں کا جو سلسلہ ۱۸۵۷ء میں شروع ہوا تھا اس کا تسلسل کئی سال تک جاری رہا یعنی ۱۲۸۶ھ (۱۸۷۰ء) تک اس کا سراغ ملتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ سے واضح ہوتا ہے کہ بھالکی میں ایک شخص رام راؤ عرف جنگ بہادر رام نے فوج جمع کرنی شروع کی تھی مگر یہ سازش بھی تکمیل کو نہیں پہنچی اور جلد پتہ چل گیا۔ اس کے تین سرگروہ رام راؤ عرف جنگ بہادر بھیم راؤ اور بالکشن کو عمر قید کی سزا دے کر جزیرۂ انڈمان روانہ کردیا گیا۔

یہ ہیں وہ مختصر واقعات جو جدوجہد آزادی کے سلسلے میں حیدرآباد کے تعلق سے قابل ذکر ہیں۔

عزیز قیسی

اندولن

ایسا ایتا چار کہ جس کا ذکر کلیجہ تھرّا دے
ایسا بھیانک ظلم کہ جس کی یاد لہو کو کھولا دے
ایسے دیر کہ جن کی زد میں لوہے کی دیواریں تھیں
ایسے متوالے تھے جن کی نظریں خود تلواریں تھیں
ایسے شیشے چوٹ سے جن کی پتھر بھی نا چور ہوئے
ایسے سخی تھے جن کے لہو سے ساگر سب بھرپور ہوئے
ایتا چاری قاتل ڈاکو ہتھیارے
سیتاؤں کی لاج ہزاروں میں لوٹیں
ماؤں کی تقدیس ہزاروں میں لوٹیں
بچوں کے تتلاتے لب جو سی ڈالیں
پانی کے بدلے میں لہو جو پی ڈالیں
جلادوں کا غول درندوں کی ٹولی
معصوموں کے خون سے جو کھیلیں ہولی
نینوں کے تاروں کو ہرنے والے تھے
سینوں میں انگارے بھرنے والے تھے
ایسے روز و شب گذرے ہیں بستی ہر گاؤں میں
جیون جیسے بیت گیا ہو تلواروں کی چھاؤں میں
دیس کے بیٹے اس دھرتی کی سانسوں سے محروم رہے
دل کے ٹکڑے ماؤں نے خود کالے کوسوں بھیج دیئے

گولی کھانا پھانسی پانا خون لٹانا کھیل ہوا
ویروں کی نگری میں مرنا جان گنوانا کھیل ہوا

کب تک دھرتی سہہ سکتی ان قاتل ایتاچاروں کو
ویروں نے پرنام کیا پھر زنگ لگی تلواروں کو
ساونتوں کے جیکاروں سے نیل گگن بھی کانپ گیا
بٹ ماروں کا جلّادوں کا پاپی من بھی کانپ گیا
بے گنتی ہاتھوں کے بھالے لہرائے
بے گنتی نینوں کے اجالے مسکائے
بے گنتی سینوں کی جوالا پھوٹ پڑی
موت کے دل پر ویر جوانی ٹوٹ پڑی
شعروں نغموں تصویروں کی شکتی کا خوں گرمایا
فن کے ساتوں رنگوں میں بس ایک لہو کا رنگ آیا

رام کی دھرتی کشن کنہیا کا مدھ بن
اکبر کا گہوارہ بابر کا گلشن
غالب کا میخانہ میرا کا آنگن
تلسی داس کی چوکھٹ نانک کا مسکن
بھگت کبیر کی کٹیا کے بھگتی دوارے
ویروں کی قبروں میں سوئے انگارے

اس پاکیزہ دیس کا ہر ذرہ جاگا
جاگ اٹھا زخمی ہونٹوں پر جیکارا
جئے ہو اس دھرتی کی، اس دھرتی کے چاہنے والوں کی
جئے ہو اس کے فرزندوں کی جئے ہو اس کے لالوں کی

(طویل نظم "ایک صدی سے")

حسن نعیم

تنویرِ آزادی

(۱۵ اگست کے موقع پر)

ہند کا آزاد ہونا وقت کا اعجاز تھا
بیڑیوں کے ٹوٹنے کا اک نیا انداز تھا
ایشیا میں اک نئی تاریخ کا آغاز تھا
جس قدر ہم جشنِ آزادی منائیں کم ہے آج
جس قدر اہلِ طرب جھومیں مچائیں کم ہے آج

آج وہ دن ہے کہ جس دن کے لیے اہلِ وطن
بارہا نکلے تھے سر سے باندھ کر اپنے کفن
مدتوں روئے تھے جس کے ہجر میں گنگ و جمن
تذکرہ کرتے تھے جس کا محبسِ زنداں میں ہم
مدح خواں جس کا رہا ہے ہر مفکر کا قلم

وہ ہمیں تھے حریت کی ناؤ جو کھیتے رہے
سرگھڑی رخ کا ہوا کے جائزہ لیتے رہے
ٹوٹے پتواروں کو پیغامِ وفا دیتے رہے
آس ہر ساعت رہی اک موجِ بسمل سے لگی
کتنے طوفاں سر سے گذرے تب یہ ساحل لگی

کیا ستم تھا کہ تمدن کی حفاظت کے لیے
نورِ عرفاں ارتقائے آدمیت کے لیے
حق آزادی جتانے کی جسارت کے لیے
اہلِ دانش کو فرنگی جیل میں سڑنا پڑا
اہلِ دل کو کوچہ و بازار میں لڑنا پڑا

آئی آزادی تو غم میں کچھ کمی آنے لگی
ظلمتوں سے چھن کے جیسے روشنی آنے لگی
نیم جاں شہروں میں پھر سے زندگی آنے لگی
مطمئن کھیاں ہوئیں کہ عہدِ گل چینی گیا
خوش ہوئے اہلِ نظر کہ دورِ کم بینی گیا

تبصرے

زنداں نامہ

فیض احمد فیض کا نیا مجموعہ کلام ہے جسے انجمن ترقی اردو نے حسین ٹائپ میں شائع کی ہے۔ صفحات صرف ۹۶ ہیں اور قیمت دو روپے چار آنے ہیں۔ فیض کی مقبولیت کاغذ اور ٹائپ کی طباعت کے لحاظ سے زیادہ نہیں ہے۔ سرورق ستیش گجرال کا بنایا ہوا ہے جن کا شمار اس وقت ہندوستان کے اچھے مصوروں میں ہوتا ہے۔

"زنداں نامہ" فیض کی ان نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے جیل میں لکھی ہیں اس طرح سے یہ دست صبا کا تتمہ ہے۔ "زنداں نامہ" کا جو ایڈیشن پاکستان سے شائع ہوا ہے اس میں فیض کے رفیق زنداں مجرا اسحاق کا لکھا ہوا بڑا ہی دلچسپ اور معلومات آفرین دیباچہ بھی شامل ہے جس سے فیض کی شاعری اور نظموں کی شانِ نزول سمجھنے میں مدد ملتی ہے، ہندوستانی ایڈیشن میں یہ دیباچہ شریک نہیں ہے جس کی وجہ سے ایک بڑی کمی محسوس ہوتی ہے، پروفیسر آل احمد سرور نے اپنے دیباچے میں بڑے شاعرانہ انداز بیان سے فیض کی شاعری کے مزاج، لب و لہجے اور موضوعات کا جائزہ لیا ہے جو بڑی حد تک صحیح اور کامیاب ہے، یہ دیباچہ مکمل ہوتا اگر اس میں فیض کی شاعری کا دوسرا پہلو بھی زیر بحث آتا، جہاں تک فیض کی شاعری کے محاسن کا تعلق ہے یہ دیباچہ جامع ہے لیکن جہاں تک فنی اور زبان کی حد تک فیض کی بعض... لاپرواہیوں کا تعلق ہے ان کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا، ہو سکتا ہے کہ یہ کمی اس وجہ سے ہو کہ عام طور سے دیباچے میں شاعر کے کمزور پہلو کی طرف اشارہ کرنا مناسب نہیں سمجھا جاتا۔

رابرٹ فراسٹ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ کسی نظم پر یہ فیصلہ دینے کے لیے کہ یہ باقی رہنے والی ہے یا نہیں یہ کہنا کہ ہم وقت کا انتظار کریں اور دیکھیں کہ یہ باقی رہتی ہے یا نہیں ایک مہمل سی بات ہے ایک اچھا قاری پڑھتے ہی کہہ سکتا ہے کہ نظم پڑھ کر اس کے دل پر جو چوٹ لگی ہے وہ ہمیشہ باقی رہنے والی ہے یا نہیں اور اگر یہ زخم لافانی ہے تو نظم بھی لافانی ہے، جہاں تک اس نقطۂ نظر کا تعلق ہے بات ایک حد تک صحیح ہے اور ہمارے پاس بھی یہی اصول ہے کہ جو شعر یا نظم دل کو لگے وہی لافانی ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی شاعر کے متعلق اسی کے زمانے میں فیصلہ کر دینا پہلے بھی مشکل رہا ہے اور اب کچھ زیادہ ہی مشکل ہو گیا ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے زخم کھانے والے قاری اور نقاد بھی

اب مصلحتوں کے تحت زخم کھانے لگے ہیں اور پہلے سے ذہن میں ایک بندھی ٹکی رائے رکھ کر کسی شعر پارے کا اثر قبول کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ بلاپس وپیش یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اکثر بڑے بڑے نقاد بھی شخصیتوں کو سامنے رکھ کر تنقید کرتے ہیں۔ کسی ادبی تخلیق کا جائزہ لیتے وقت ناقدین کے اپنے ذہن تحفظات بھی کام کرتے ہیں اور خارجی عوامل بھی ان حالات میں کسی ہم عصر شاعر کے متعلق کوئی فیصلہ کرنا مشکل نظر آتا ہے، خود فیض کی شاعری کے بارے میں کچھ کہنا اتنا ہی متنازع فیہ ہے جتنا غیر متنازع فیہ ہے، بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوگی لیکن اپنے پچھلے تنقیدی سرمایہ کا جائزہ لیتے ہوئے اس بات کو بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک زمانہ میں جو لوگ فیض کو ابہام، داخلیت اور یاسیت کا شکار کہتے تھے آج وہی فیض کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ رائے کی تبدیلی کا ایک سبب تو بعض غیر شاعرانہ باتیں ہیں لیکن دوسرا اہم سبب یہ ہے کہ فیض نے اپنی شاعری کا لہجہ بھی منوا لیا ہے۔ اور آج کسی بھی مکتب خیال سے تعلق رکھنے والا نقاد اور کسی بھی معیار کا قاری فیض کو آج کا بہت ہی اچھا شاعر ماننے میں کوئی پس وپیش نہیں کر سکتا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ اب یہ فیصلہ کرنا ہمارا کام نہیں ہے کہ اس شاعری میں عظمت کے کتنے عناصر ہیں اور باقی رہنے کی کتنی قوت۔ اس حد تک ہمیں رابرٹ فراسٹ سے اختلاف کرتے ہوئے زمانے کے فیصلے کا ہی انتظار کرنا پڑے گا۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ فیض نے زنداں کی دیواروں میں بند رہ کر اردو شاعری کو جو نئی آواز اور لہجہ دیا ہے وہی آج سب سے زیادہ مقبول اور دل کو لگنے والا انداز بیاں معلوم ہوتا ہے۔

اس مختصر سے مجموعے میں چند نظمیں اور غزلیں ہیں لیکن ان میں سے اکثر آج کے دور کی بہترین ترجمان ہیں۔ مجموعے کی ابتدا جس نظم سے ہوتی ہے وہ خود بہت ہی خوبصورت اور بھرپور نظم ہے "حبیب عنبر دست" شاعر کی اپنی جدوجہد، اپنے روشن مستقبل اور انسانیت پر اٹل ایقان کی آئینہ دار ہے۔ یہی رجحان ہم کو اکثر نظموں اور غزلوں میں ملتا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر قید وبند کی آزمائشوں میں گھر کر بھی جھنجھلاتا نہیں، اس کے لہجے میں درشتی پیدا نہیں ہوتی بلکہ وہ بہت ہی لطیف انداز، دھیمے لہجے اور متین انداز میں مستقبل پر اپنے ایمان کا ذکر کر کے پڑھنے والوں میں بھی بالواسطہ طریقے سے یہ ایمان تازہ کرتا ہے، وہ غم والام کو ستاتا نہیں بلکہ ان کے ساتھ موانست اور یگانگت کا اظہار کرتا ہے، وہ ہجر کی تاریک راتوں کو بھی کسی کی یاد سے روشن کر لیتا ہے اور اسے بھی "تعلق محبوب" کی استواری کا وسیلہ سمجھتا ہے ؎

بزم خیال میں ترے حسن کی شمع جل گئی ۔۔۔ درد کا چاند بجھ گیا، ہجر کی رات ڈھل گئی

نہیں شکایت ہجراں کہ اس وسیلے سے ۔۔۔ ہم اُن سے رشتۂ دل استوار کرتے رہے

ہم اہل قفس تنہا بھی نہیں ہر روز نسیم صبح وطن ۔۔۔ یادوں سے معطر آتی ہے اشکوں سے منور جاتی ہے

شوق والوں کی حسیں محفل شب میں اب بھی ۔۔۔ آمد صبح کی صورت میں ترا نام آتا ہے

یہ تمام اشعار غزلوں کے ہیں، غزل کا یہی نیا مزاج دست صبا کی غزلوں میں بھی ملتا ہے لیکن زنداں نامے میں زیادہ

پختہ ہوگیا ہے اس لیے آلِ احمد سرور کی یہ بات ٹھیک نہیں معلوم ہوتی کہ اس مجموعے کی غزلیں دستِ صبا کی طرح بھرپور وار نہیں، اس میں شک نہیں کہ اس مجموعے کی بعض غزلیں بہت کمزور ہیں مثلاً وہ غزل جس کا مطلع ہے ؎

ہم پر تمھاری چاہ کا الزام ہی تو ہے　　لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

جس پر ابوالانشاء کے فرضی نام سے کسی صاحب نے ہنگامہ بھی کھڑا کردیا تھا اور غلط انداز میں بہت سے صحیح اعتراضات بھی کیے تھے لیکن مجموعی حیثیت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فیض نے غزل کا جو نیا انداز اختیار کیا تھا وہ اب ڈھل مجھ کر زیادہ صاف زیادہ روشن اور زیادہ لطیف ہوگیا ہے، اس بات کے ثبوت کے لیے بعض غزلوں کے چند اور اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

وہ دن کہ کوئی بھی جب وجہِ انتظار نہ تھی ـــــ ہم ان میں تیرا سوا انتظار کرتے رہے
یاں جاں کے زیاں کی ہم کو بھی تشویش لیکن کیا کیجئے ـــــ ہر رہ جو ادھر کو جاتی ہے مقتل سے گذر کر جاتی ہے
ایسے ناداں بھی نہ تھے جاں سے گذرنے والے　　ناصحو پند گرد راہ گذر تو دیکھو
وہ جو اب چاک گریباں بھی نہیں کرتے ہیں　　دیکھنے والو کبھی ان کا جگر تو دیکھو

یا پھر وہ پوری غزل جس پر اگست ۵۰ء کا عنوان دیا گیا ہے اور جس کا آخری شعر ہے ؎

پھر سے بجھ جائیں گی شمعیں جو ہوا تیز چلی　　لا کے رکھو دو سرِ محفل کوئی خورشید اب کے

اسی طرح ایسی ہی ایک اور غزل ہے جس کی فضا اور موڈ بھی بالکل اسی غزل کی طرح ہے اور جو اس شعر سے شروع ہوتی ہے ؎

یوں بہار آئی ہے اس بار کہ جیسے قاصد　　کوچۂ یار سے بے نیل و مرام آتا ہے

یا پھر وہ غزل جس میں یہ اشعار ہیں ؎

شامِ گلزار ہوئی جاتی ہے دیکھو تو سہی　　یہ جو نکلا ہے لیے مشعلِ رخسار، ہے کون
پھر دلِ زار پہ کوئی دینے لگا ہے دستک　　جانیے پھر دلِ وحشی کا طلب گار ہے کون

زنداں نامے کی نظموں میں "دریچہ" "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" "روشنیوں کے شہر" "درد آئے گا دبے پاؤں" اور "سنکیانگ" جیسی خوبصورت اور فن و خیال دونوں پہلوؤں سے بھرپور نظمیں بھی شامل ہیں "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" اور "سنکیانگ" ایسی نظمیں ہیں جو ہنگامی موضوع سے تعلق رکھتے ہوئے بھی اپنے تاثر، انداز بیان کی شعریت و معنویت کے لحاظ سے بہت ہی مکمل، جاندار اور عرصے تک باقی رہنے والی معلوم ہوتی ہیں۔ آلِ احمد سرور کی یہ رائے بالکل صحیح ہے کہ اس طرح فیض نے اس بات کا جواب بھی دے دیا ہے کہ وقتی موضوعات پر جاندار اور دیرپا شعری تخلیقات پیش نہیں کی جاسکتیں۔

مجموعی حیثیت سے "ملاقات" اور "آجاؤ اے فرقا" اس مجموعے کی کمزور نظمیں ہیں، ملاقات کے متعلق یہ رائے پڑھ کر

شاید اکثر ناقدین کو تعجب ہو کیونکہ تقریباً سبھی نے اس نظم کی تعریف کی ہے لیکن میری رائے میں اس نظم میں فیض نے جو نیا تجربہ کیا ہے وہ ناکام رہا ہے یہ ایک اہم سوال ہے کہ اردو شاعری کے لیے انگریزی نظموں کا وہ انداز جس میں مصرعہ بیچ سے اس طرح ٹوٹتا ہے کہ اگر الگ پڑھا جائے تو اس کا کوئی مطلب ہی نہ رہے کامیاب بھی ہو سکتا ہے یا نہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اردو شاعری کو آزاد اور معرّیٰ نظموں کے ذریعہ وسعت دینا ہے تو یہ طریقہ ناگزیر ہے مگر اس تجربے کو کامیاب ثابت کرنے کے لیے زبان اور بیان پر بڑی استادانہ دسترس کی ضرورت ہے، اگر اس نظم کو فیض بجائے مساوی مصرعوں والی نظم کی صورت میں لکھنے کے آزاد نظم کی شکل دیتے تو شاید اتنی اجنبیت محسوس نہ ہوتی لیکن اس نظم کی ایجری اور انداز بیان میں بھی اس قسم کے جھول ہیں جن کی کم سے کم فیض سے توقع نہیں کی جا سکتی ؎

اس کی شبنم سے خامشی کے
یہ چند قطرے تری جبیں پر
برس کے ہیرے پرو گئے ہیں

ان تین مصرعوں میں شاعر نے جو IMAGE دینے کی کوشش کی ہے وہ تشبیہات کے دور از کار اور بے ربط ہونے کی وجہ سے کامیاب اثر نہیں چھوڑتا، اسی طرح "آجاؤ ایفرقا" میں زبان اور بیان کے ساتھ جو نیا تجربہ کیا گیا ہے وہ بھی ناکام ہے، چند مصرعے ملاحظہ فرمائیے ؎

آجاؤ میں نے سن لی ترے ڈھول کی ترنگ
آجاؤ مست ہو گئی میرے لہو کی تال
آجاؤ میں نے چھیل دی آنکھوں سے غم کی چھال
میں ایفرقا ہوں دھار لیا میں نے تیرا روپ
میں تو ہوں، میری چال ہے تیری، ببر کی چال
آجاؤ ایفرقا
آؤ ببر کی چال
آجاؤ ایفرقا

پہلے مصرعے میں ستر گر ہے (آجاؤ کے بعد تیرے لکھا گیا ہے) باقی مصرعوں کا انداز بیان نہ صرف اجنبی اور غیر مانوس ہے بلکہ اچھا بھی نہیں ہے۔

ایک اور نظم ہے "یہ فصل امیدوں کی ہمدم" یہ اچھی نظم ہو سکتی تھی لیکن اس کے آخری شعر نے پورا مطلب ہی بدل دیا ہے ؎

اک فصل پکی تو بھر پایا جب تک تو یہی کچھ کرنا ہے

شاعر کا مطلب شاید یہ ہے کہ اگر کئی فصلوں اور بہاروں کے اکارت جانے کے بعد ایک فصل بھی پک جائے تو ہمارا مقصد حاصل ہو جائے گا اور یہ مقصد پورا ہونے تک ہمیں اپنی جدوجہد جاری رکھنی ہے لیکن اس مصرعے کی وجہ سے "اک فصل پکی تو جیا پایا" مفہوم ہی بدل ہو گیا ہے کیونکہ "جی پانا" مقصد حاصل ہونے کے معنوں میں استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ تنگ آ کر کسی کام سے بیزاری کا اظہار کرنے کے معنوں میں آتا ہے؛

"روشنیوں کے شہر" بڑی خوبصورت اور توانا نظم ہے۔ نظم کی خوبصورتی کی وجہ سے آخری بند میں یہ سقم اور بھی بری طرح کھٹکتا ہے کہ فیض نے "کہہ دو" کو رو اور لو کا ہم قافیہ بنا کر استعمال کیا ہے۔

"کوئی عاشق کسی محبوب سے خوبصورت نظم ہے لیکن ایک مصرع میں زبان کی غلطی ہے جو آسانی سے دور ہو سکتی تھی۔

مصرعہ ہے ع سانس تھامے ہیں نگاہیں کہ نہ جانے کس دم

"سانس روکنا" محاورہ ہے "سانس تھامنا" غلط ہے۔

ان نظموں میں فیض کی جن زبان کی غلطیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ایسی ہی بعض غلطیاں غزل کے اشعار میں بھی ملتی ہیں ع ہر ایک سے سخن راز دار کرتے رہے

حدیثِ شعلہ رخاں بار بار کرتے رہے

بھیگی ہے رات فیض غزل ابتدا کرو

"سخن کرنا" "حدیث کرنا" "ابتدا کرنا" خلاف محاورہ ہیں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اجتہادی غلطیاں ہیں جو آگے چل کر مروج بھی ہو سکتی ہیں لیکن بعض ایسی غلطیاں بھی ہیں جن کے لیے کوئی عذر پیش نہیں کیا جا سکتا مثلاً ع

ورنہ ہمیں جو دکھ تھے بہت لادوا نہ تھے یا

سچ ہے ہمیں کو آپ کے شکوے بجا نہ تھے

"لادوا ہونا" ایک قطعی بات ہے اس کے ساتھ بہت یا کم کی تخصیص قطعاً غیر ضروری ہے۔ اسی طرح دوسرے مصرعے کا مفہوم غلط زبان کی وجہ سے واضح نہیں ہو پاتا۔

نظموں اور غزلوں میں زبان کی ان غلطیوں کو گنانے کا قطعاً یہ مطلب نہیں ہے کہ مجموعی حیثیت سے فیض کے شاعرانہ مقام پر کوئی حرف رکھا جائے اس وقت یہ بات بلا جھجک کہی جا سکتی ہے کہ نئی اور پرانی نسل کے تمام... شاعروں کے مقابلے میں کیفیت کے لحاظ سے فیض نے اردو شاعری میں پچھلے چند برسوں میں جو اضافہ کیا ہے اتنا اضافہ اس مدت میں کسی اور نے نہیں کیا، اگر اتنا حسین شاعر جس کی "قفس میں ایجاد کی ہوئی طرزِ فغاں" آج سب کا انداز بیاں بنی ہوئی ہے ایسی معمولی غلطیاں کرے تو حیرت ہی نہیں دکھ بھی ہوتا ہے، یہ خامیاں ممکن ہے دوسرے شاعروں کی حد تک معاف کر دی جائیں لیکن ہم فیض سے ایسی توقع نہیں کر سکتے کیونکہ آج جس انداز میں ان کی شاعری کو

قبول عام کی سند ملی ہے جس طرح سے نقادوں نے ان کی تعریفیں کی ہیں اس کی وجہ سے ان کا شاعرانہ منصب اور زیادہ دشوار اور ان کی ذمہ داریاں اور زیادہ سخت ہوگئی ہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ کوئی ایسی بات کہنا جو بالکل نئی ہو اور جسے بیان کرنے کا انداز اچھوتا ہو ہماری زبان میں پہلے سے اپنے لیے مناسب الفاظ اور انداز نہ رکھنے کی وجہ سے مشکل ہو جاتا ہے اس لیے ان باتوں سے بچنا ناممکن ہے۔ لیکن یہ عذر معمولی درجے کے شاعروں کو زیب دے سکتا ہے فیض کو نہیں۔ دنیا جو اردو کے ساتھ فارسی اور عربی سے بھی کماحقہ واقف ہیں اگر وہ زبان کی ایسی غلطیاں کریں تو نئے شاعروں کے لیے غلطی کا جواز پیدا ہوتا ہے جو اردو شاعری کے لیے نیک شگون نہیں ہو سکتا۔

"زنداں نامہ" بحیثیت مجموعی صرف "دست صبا" کا تتمہ ہی نہیں بلکہ فیض کی شاعری کا اگلا قدم بھی ہے اپنے معنوی حسن اور خوبیٔ بیان کی وجہ سے باذوق حضرات کے لیے یہ ایک قابل قدر تحفہ کی حیثیت رکھتا ہے، اگر فیض اپنی شاعری کی اس آگ کو جو قید و بند کی تنہائیوں میں روشن ہوئی تھی جلائے رکھیں تو اس مقدس آگ میں ڈھل کر ایسے بہت سے ادب پارے تخلیق ہو سکتے ہیں جو اردو شاعری میں نئی روایات کی داغ بیل ڈالیں اور قابل قدر اضافہ کریں ـــــ دیکھنا یہ ہے کہ فیض اس آگ کو جلائے رکھنے میں کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں ـــ اور اسی پر فیض کی شاعری کے مستقبل کا انحصار ہے۔ (وحید اختر)

ذکرِ حافظ

ذکرِ حافظ اردو ادب میں اس لحاظ سے یقیناً ایک اضافہ ہے کہ تنقید اور ادب فہمی کے جدید نقطۂ نظر سے اس عظیم عالمی شاعر پر یہ پہلی کتاب ہے۔ سائنسی نقطۂ نظر سے ادب ادبی قدروں کا حامل ہو یا نہ ہو، حافظ کی شاعری مجموعی طور سے ادبیات عالم کا ایک ایسا جزو ہے جس میں تبدیلی اور تغیر کے "تاریخی حادثات" سے محفوظ رہنے کی ایک بڑی صلاحیت نظر آتی ہے۔ سجاد ظہیر نے کتاب کے ابتدائی حصہ میں ظ۔ انصاری کے اس نقطۂ نظر کے خلاف تنقید کی ہے کہ "حافظ نے فرار میں نجات چاہی اور اپنے گرد انھوں نے عیش کوشی اور سکون پسندی کا حصار کھینچ لیا۔" سجاد ظہیر نے انتہائی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ ظ۔ انصاری کے نتائج کا جائزہ لیا ہے لیکن اس پوری بحث کے مطالعہ سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ سجاد ظہیر، ظ۔ انصاری کے تنقیدی مفروضات سے بہرحال متفق ہیں صرف حافظ کے بارے میں اُن کے نتائج سے انھیں اتفاق نہیں۔ اب اس بات کی ضرورت ہے کہ جدید تنقید کی اکثر مروجہ اصطلاحوں کا نئے سرے سے امتحان لیا جائے۔ ظ۔ انصاری نے فرار، عیش کوشی، سکون پسندی اور اسی قسم کے کئی الفاظ اس فیاضی کے ساتھ استعمال کیے ہیں کہ جیسے یہ ایک متعین مفہوم کے حامل ہیں اور بہرحال ایک اچھے ادب کا ان صفات سے مبرا ہونا ضروری ہے۔ سجاد ظہیر نے انتہائی کامیابی کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ حافظ کی شاعری ان ناپسندیدہ صفات سے پاک ہے۔ لیکن اگر ایک بنیادی سوال یہ پیش کیا جائے کہ کہیں ایسی اصطلاحیں اور یہ الفاظ ادبی بحث سے غیر متعلق تو نہیں،

تو کیا یہ سوال بے محل ہوگا۔

ذکر حافظ میں اس قسم کی بحث غیر متعلق ہو جاتی ہے ورنہ ہمیں یقین ہے کہ سجاد ظہیر نئی تنقید کو اس اذعانی نقطۂ نظر سے آزاد کرانے کی کوشش کرتے جس نے نئی تنقید کی ترقی کو بڑی حد تک روک دیا ہے۔ یوں بھی ایک عام پڑھنے والے کو یہ بات کھٹکتی ہے کہ سجاد ظہیر نے اپنی کتاب کا ایک بڑا حصہ ظ۔ انصاری کے "الزامات" کے تنقیدی امتحان کے لیے وقف کر دیا بہتر ہوتا کہ ذکر حافظ کو صرف حافظ کی شاعری کے رہنما تصورات کے مطالعہ کے لیے محدود کر دیا جاتا۔ ظ۔ انصاری نے شاید ضمنی طور پر حافظ اور سعدی کی غزل کا جائزہ لیا تھا۔ جہاں تک غزل گوئی کے موجودہ رجحانات کا تعلق ہے مشکل ہی سے ظ۔ انصاری کے نتائج سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور خود سجاد ظہیر نے ان سے اتفاق کیا ہے۔ ظ۔ انصاری بھی اگر اتنا مجاہدانہ جوش سے ہٹ کر۔۔۔ جو یقیناً غزل گوئی کے جدید میدان کے لیے ٹھیک اور برمحل ہے ــــ جس کا انھوں نے غزل پر اپنی تنقید میں اظہار کیا ہے، حافظ کی شاعری کا محض شاعری کی حیثیت سے کسی خاص صنف سخن کے محدود نقطۂ نظر سے، مطالعہ کریں تو وہ یقیناً سجاد ظہیر کے اس نتیجہ سے اتفاق کریں گے کہ۔۔۔۔ "۔۔۔ اس کے متعلق بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ عشق و محبت کے جذبے اور اس کی واردات کو فارسی اور اردو تو خیر، شاید دنیا کی بہت سی زبانوں میں ایسی والہانہ سرخوشی، ایسی لطافت و شیرینی اتنے خلوص اور خوبصورتی کے ساتھ کسی بھی شاعر نے اتنے اچھے اور پُراثر طریقے سے بیان نہیں کیا ہے" اور یہ کہ "۔۔۔۔۔۔۔ فارسی اردو کے اساتذہ میں غالباً کوئی ایسا نہیں جس کے یہاں خوبیوں کی اتنی افراط ہے کہ اس کے دیوان اور غزلوں سے انتخاب کرنا اتنا مشکل ہو جتنا کہ حافظ کے دیوان غزل سے انتخاب۔۔۔۔۔"

ظ۔ انصاری سے پہلے علامہ اقبال نے بھی خودی کے فلسفہ کے زاویے سے حافظ کے کلام کو بحیثیت مجموعی مردود ٹھہرایا تھا، اقبال نے بھی ہمارے بعض نئے نقادوں کی طرح ایک معیار کو اتنی زیادہ اہمیت دیدی تھی کہ ماضی کا سارا علم و فلسفہ، سارا ادب اور شعر کا سرمایہ یا تو مقبول ٹھہرا یا مردود، بات یہ نہیں کہ شعر پر حکیمانہ تنقید جائز نہیں بلکہ بات یہ ہے کہ صرف حکیمانہ نقطۂ نظر شعر اور ادب کے جائزہ کے لیے کافی نہیں ہے۔ ذکر حافظ اس لحاظ سے بھی اردو ادب میں اضافہ ہے کہ سجاد ظہیر نے جمالیاتی نقطۂ نظر کو پوری طرح برقرار رکھا ہے ــــ علم و حکمت کے مختلف شعبے ایک ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہوئے بھی ایک حد تک خود مختار رہتے ہیں۔ یہ بات اتنی بدیہی ہے اور پھر بھی ہمارے اکثر نقاد اس کو بھول جاتے ہیں۔ سجاد ظہیر نے جدید ادبی تنقید کو اکثر بے راہ رو ہونے سے ٹوکا ہے اور ذکر حافظ میں بھی انھوں نے اپنی بالغ نظری کا پورا پورا ثبوت فراہم کیا ہے۔

حافظ کے کلام کا انتخاب جتنا مشکل کام ہے اس کا سجاد ظہیر کو اندازہ ہے جس کلام میں بار بار ایسے مقام آئیں جہاں یہ کہنا پڑے کہ "کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا ست" انتخاب آسان نہیں رہتا۔ انتخاب حافظ، دیوان حافظ کا بدل نہیں

ہوسکتا لیکن حافظ سے دلچسپی پیدا کرنے کے سامان فراہم کر دیتا ہے۔ ذکر حافظ کی روشنی میں پہلی بار انتخاب حافظ پڑھنے والا حافظ کا دیوان پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ذکر حافظ کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ یہ کتاب حافظ کے تفصیلی مطالعہ کے لیے اکساتی ہے۔

انجمن ترقی اردو نے اس کتاب کی اشاعت سے یقیناً اردو کی ترقی کے سامان بہم پہنچائے ہیں۔ (عالم خوندمیری)

سقراط

ناشر : انجمن ترقی اردو، حیدرآباد دکن
تعداد صفحات : ۱۰۸ ، قیمت : ایک روپیہ چار آنے

تین ایکٹ کا یہ تاریخی ڈراما مولوی فضل الرحمٰن صاحب نے بڑی کاوش سے لکھا ہے۔ ڈرامے سے آپ کو شروع سے شغف رہا ہے اور فن کی باریکیوں سے واقف ہیں۔ ڈرامے کے مختلف سین ہیں جس میں قدیم یونان کی معاشرت رسم و رواج لوگوں کے اخلاق، حکومت کے قوانین اور سقراط کے اصول اور خیالات کو سلیقہ سے پیش کیا گیا ہے۔

سقراط حضرت عیسیٰ سے ۴۰۰ برس پہلے ایتھنز میں پیدا ہوا۔ حکیم یونانی فلسفہ اخلاق کا بانی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ نیکی علم ہے اور بدی جہل، وہ کہتا تھا کہ حقیقت میں کوئی آدمی برا نہیں ہوتا اور کسی نے جان بوجھ کر بدی نہیں کی۔ اس کا طریقہ تعلیم خاص تھا جو اس کے نام سے مشہور ہے۔ یہ فلسفی شہر کے گلی کوچوں اور بازاروں میں پھر کر لوگوں کو انسانیت کی تعلیم دیتا رہا۔ اردو ادب میں افلاطون اور ارسطو کے مقابلہ میں سقراط کا ذکر بہت کم ہے۔ اس ڈرامے سے سقراط کے پیام کو اردو داں طبقہ تک پہنچانے میں کامیابی ہوئی ہے۔

مکالمے دلچسپ ہیں لیکن زبان کے لحاظ سے بعض الفاظ کا استعمال اور جملوں کی ترکیب صحیح نہیں ہے۔ مثلاً بھائیوں کے بازو پکڑ کر سورہ "تمھارے بازو پیچ پر ٹکتا ہوں"، بازو کے کمرہ میں، بازو بیٹھ جاتا ہے، ان جملوں میں "بازو" کی جگہ "برابر" ہونا چاہیئے۔ (۲) تلوار کے زخم مرہم سے چنگے ہو جاتے ہیں، یہاں چنگے کی جگہ اچھے موزوں ہوگا۔ چنگا اردو میں علیحدہ نہیں بولا جاتا، یہ لفظ "مانس" کی طرح سہلایا جلے کے ساتھ بولا جاتا ہے (۳) بے جا لاڑ نے بگاڑا ہے۔ "لاڈ" فصیح ہے (۴) مجھ پر بھی کافی کیچڑ اچھالا ہے، کیچڑ مونث ہے (۵) قلم میں بچھو کی ڈنک ہے۔ ڈنک مذکر ہے۔ (۶) شہر کے چکر کاٹا ہوں، میں نے شہر کے چکر کاٹے ہیں (۷) وہ جسطی دیوتاؤں کو تک نہیں چھوڑتا، کھانے پینے کی تک سدھ بدھ نہیں رہتی، ان جملوں میں حرف ربط کو تک کی کا استعمال صحیح نہیں ہے، دیوتاؤں تک کو، کھانے پینے تک کی، ہونا چاہیئے۔

اسی قسم کی فروگزاشتوں سے کتاب کی افادیت میں فرق نہیں آتا۔ یہ ڈراما ہر صاحب ذوق کے پڑھنے کے قابل ہے۔

(غلام ربانی)

بازگشت

حیدرآباد دکن

ڈیر ادیب! مئی کے شمارے میں کالی گھٹا کے عنوان سے مولوی ابوظفر عبدالواحد صاحب کی ایک "قصیدہ نما" نظم شائع ہوئی ہے، موصوف کا علم وفضل مسلم ہے اس لیے حیرت ہوئی کہ انھوں نے اپنے نام سے اس قسم کی طفلانہ نظم کی اشاعت کیوں ضروری سمجھی اور تم نے بھی اس کا شائع کرنا کس مصلحت کے تحت گوارا کرلیا۔

اس نظم پر ایک مختصر سا نوٹ بھی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں "جمہوریت کے بعض نازک اور پیچیدہ مسائل پر" اور جہاں تک اس نظم کی معنویت کا تعلق ہے ان ہی الفاظ سے بحث کا دروازہ کھلتا ہے، اور اگر ایک غیر جانبدار شخص غائر نگاہ سے اس نظم کا مطالعہ کرے تو لازماً اس نتیجہ تک پہنچے گا کہ ان (۴۵) اشعار میں ایک شعر بھی ایسا نہیں ہے جس کا موضوع جمہوریت کا نازک یا پیچیدہ مسئلہ ہو، اس قسم کے مصرعے ؎ ہے بھارت بھاڑ اقلیت چنا ہے

غرور اکثریت بے بنا ہے

ترا اپنا تبرا ئی نیا ہے

جمہوریت کے نازک اور پیچیدہ مسائل سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ اور مجھے تعجب ہے کہ اس نظم پر مذکورہ نوٹ کو تم نے کس نقطۂ نظر سے موزوں سمجھا!!

نظم کے بعض مقامات زبان وبیان کے اعتبار سے بھی محل نظر ہیں مثلاً پہلے ہی مصرعہ میں "نام خدا" کا استعمال غلط کیا گیا ہے

خدا سے بیر جب نام خدا ہے ہر اک نا اہل اپنا ناخدا ہے

صحیح محل استعمال کی مثال شوق کی مثنوی زہر عشق کا یہ شعر ہے۔ ؎

جب کہ نام خدا جوان ہوئے ایسے مختار میری جان ہوئے

تمہیدی کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو ؎

سیاست کی ہر اک رسم دلاویز زبان دل کا بھونڈا ترجمہ ہے

رسم کو زبان کا ترجمہ کہنا بجائے خود بھونڈی ترجمانی سے کم نہیں۔

تقفید کی ایک مکروہ مثال حسب ذیل شعر کے دوسرے مصرعہ میں ملے گی ؎

نہیں جب پاس تیرے تیرے ڈھب کی تو کیوں مجھ کو بلاتا ساقیا ہے

اس موقعہ پر صفی اورنگ آبادی مرحوم کا سنایا ہوا ایک شعر یاد آیا ۔۔

وہ لیڈر ہیں کیا کرتے ہیں جو جلسوں میں تقریریں مگر لیڈر ہیں وہ بھی مٹھو کر گردن ہلاتے ہیں جو

نظم کا ایک مصرعہ یہ بھی ہے ؎ غریبوں کا گھروندا بے دیا ہے

"بے دیا" اگر بے چراغ کے معنی میں جائز تصور کر لیا جائے تو "بے رحم" کے بجائے "بے دیا" کو بھی صحیح سمجھنا پڑیگا!

چوتھے بند کا ایک شعر ہے ؎

نشیمن چاک دامن چاک دل چاک جنوں پرور ہماری ایکتا ہے

گذارش ہے کہ دامن چاک اور دل چاک تو خیر درست ہیں لیکن یہ نشیمن چاک کیا بات ہوئی؟ اگر اشارہ تقسیم ہند کی طرف ہے تو ظاہر ہے کہ لاجواب اشارہ ہے!

نہ لے جمہوریت کا نام آمر تری جمہوریت اک مضحکہ ہے

کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہاں شاعر کس سے مخاطب ہے ؟

بہر حال "صبا" کے حصہ نظم کا معیار امکانی حد تک بلند ہونا چاہیئے اس لیے کہ اس کا ایڈیٹر ایک شاعر ہے ..... بڑے ناموں سے مرعوب ہو کر کوئی چیز چھاپ دینا آئین جوانمردی کے خلاف ہے، یہ ہمیشہ یاد رکھو کہ ادارت کا تعلق "شیوۂ منعوت" سے ہے، اس میدان میں حق بات کہنا ضروری ہے خواہ وہ انا الحق کے انداز ہی میں کیوں نہ ہو۔

یہاں تک لکھنے پایا تھا کہ "صبا" کا تازہ شمارہ ملا، اب جو غور کرتا ہوں تو تیری غزل کے آخری شعر میں کھلی ہوئی ہٹ دھرمی پائی جاتی ہے ؎

کوئی افسانہ ہو یا مثنوی و نظم و غزل
حدیث عظمت انساں نہیں تو کچھ بھی نہیں

یعنی اگر کسی افسانے، کسی مثنوی، کسی نظم، یا کسی غزل میں حدیث عظمت انساں کے بجائے داستان پستیٔ انسان فنکارانہ خصوصیات کے ساتھ بیان کی جائے تو میں اسے "کچھ بھی نہیں" سمجھوں گا۔ حیرت ہے مجھ پر!

تمھیں یاد ہوگا کہ ایک صحبت میں مخدوم نے اور میں نے کہا تھا کہ تمھاری نئی غزل کا یہ شعر ؎

ایک بار کی شہرت، ساری عمر چلتی ہے
میں پیوں جو پانی بھی لوگ رم سمجھتے ہیں

ایک قسم کے بیان صفائی کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے فرض ضروری ہے لیکن تم نہیں مانے اور اس شعر کو اتنا ضروری سمجھا کہ شاعر میں سنانے کے بعد "صبا" میں بھی چھاپ دیا، ایک اچھی خاصی سنجیدہ غزل کے ماحول میں "رم" کا انگریزی قافیہ ملق سے نیچے نہیں اترتا۔

سلام کی نظم اچھی ہے، مگر چھٹے شعر کے پہلے مصرعہ میں لفظ اجنتا کی جگہ صرف جنتا کی گنجائش ہے۔ خورشید احمد جامی کی نظم کے چوتھے بند کا یہ شعر ؎

میری ہر ایک تمنا مری ہر اک خواہش
پاس آ کر میرے چپکے سے کوئی لوٹ گیا

فوراً طلب ہے اس لیے کہ یہاں "لوٹ لے گیا" کا محل ہے!

حضرات فراق و اثر کا جھگڑا سنجیدگی کی حدوں سے بڑھتا جا رہا ہے، اب ان سخن گسترانہ باتوں میں مقطع "آ پڑے" تو مناسب ہے! شاہد رامپوری

ناگپور

فراق صاحب اور اثر صاحب کی قلمی جنگ ہمیں چند اہم مسائل پر سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔

تنقید جو براہ راست کسی ہم عصر اور تقریباً ہم رتبہ ادیب کی تخلیق پر کی جائے اس کا لب و لہجہ کیا ہونا چاہیئے اور یہ کہ اس سلسلے میں کون کون سے عناصر پر بحث کی جائے اور کون سی باتیں اس دائرے سے خارج کر دی جائیں چونکہ میں نے مئی کا "صبا" نہیں دیکھا اس لیے مجھے نہیں معلوم کہ اثر صاحب کا انداز تقریر کیا تھا۔ مگر اپنے خط میں فراق صاحب نے جو انداز اختیار کیا ہے وہ ایک ممتاز شاعر نقاد اور ان سب سے بڑھ کر ایک بلند انسان کے شایان شان نہیں۔ اس سے پہلے بھی فراق صاحب اور اثر صاحب کی نوک جھونک منظر عام پر آ چکی ہے اور اس میں اثر صاحب کا انداز بھی قابل اعتراض تھا سردار جعفری اور فراق میں دو تین سال پہلے جو جنگ چھڑی تھی اس کا بھی یہی حال تھا۔ تنقید کرتے وقت غیر جانب دار نقاد کا لب و لہجہ اختیار کیا جائے۔ تو تو میں میں کا گالی گلوچ نہ کی جائے۔ جلے دل کے پھپھولے نہ پھوڑے جائیں۔

ادبی تنقید تخلیق پر کی جانی چاہیئے خالق پر نہیں۔ ذاتیات کا تعلق اخلاقیات سے ہو سکتا ہے تنقید سے نہیں۔ اگر مصنف کی سوانح لکھی جا رہی ہے تو بلاشبہ ذاتیات پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے لیکن اعتراض یہاں بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کسی ادبی تخلیق پر تنقید کرتے وقت ادیب کے عادات و اطوار پر بحث کرنا اس وقت تک قطعی غیر مناسب ہے جب تک کہ عادات و اطوار کا اثر براہ راست تخلیق پر نہ پڑتا ہو یا تخلیق کو سمجھنے کے لیے اس کے پس منظر کو اجاگر کرنے کی ضرورت نہ ہو ــــ یہ بات مجھے سردار جعفری کے اس اعتراض کے سلسلے میں یاد آئی ہے جو انھوں نے فراق صاحب پر امرد پرستی کے متعلق کیا تھا۔

یہ درست ہے کہ اردو زبان کی تاریخ میں ادبی نوک جھونک کے ساتھ ساتھ ذاتی حملوں کی بھی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ مگر تاریخ کا دہرایا جانا ضروری تو نہیں ــــ ؟ سودا اور ضاحک انشا اور مصحفی کی ہجویں باعث فخر نہیں بلکہ باعث ندامت ہیں ــــ ادیب اور شاعر اگر لڑتے ہیں تو ان سے کہیئے کہ آپ آپس میں بلا تکلف جنگ فرما سکتے ہیں۔ زیادہ شوق ہو تو آپ کے لئے ٹکٹ بھی لگوایا جا سکتا ہے (ویسے لوگ بلا ٹکٹ بھی تماشہ دیکھ ہی لیتے ہیں ــــ!) مگر ادبی پرچوں کو براہ کرم اکھاڑہ نہ بنایئے ــــ اور تاریخ کو اپنی کوئی ایسی یادگار نہ دیجئے جس سے آپ کے نام مستقبل میں عزت کے ساتھ نہ لیے جا سکیں ان جنگوں کو روکنے کی ذمہ داری اداروں پر عائد ہوتی ہے۔ اس لیے اس قسم کی کوئی چیز شائع نہ کی جانی چاہیئے۔

دوسری بات یہ کہ کسی کی تخلیق پر اگر کوئی غیر جانبدار تنقید کرتا ہے تو ادیب کو چاہئے کہ ٹھنڈے دل سے اس پر غور کرے اسے پرکھے اور سمجھے ۔ اور اگر اس میں صداقت ہے تو اپنی غلطیوں کا بلا تامل اعتراف کرلے۔ اس جذبے کا اردو ادب میں فقدان ہے۔ نومشق بھی اپنے آپ کو کسی سے کم نہیں سمجھتے ۔ اپنی کسی چیز پر تنقید گوارا نہیں کرسکتے۔ غلطیوں کے بڑے عجیب عجیب اور ترقی پسندانہ قسم کے جواز پیش کرتے ہیں۔ اور کہنہ مشق اصحاب تو خیر استادی کے زعم میں کسی کی بات خواہ وہ کتنی ہی معقول کیوں نہ ہو ماننے کے لیے قطعی تیار نہیں۔ غلط سلط اوٹ پٹانگ جو کچھ ان کے قلم سے نکل گیا وہ سب الہام ۔ اردو ادب میں انحطاط کی بڑی وجہ یہی ہے۔

اسی سلسلے میں ادیبوں کی خودستائی کا ذکر بھی غیر مناسب نہیں۔ ہمارے یہاں خودستائی کی وبا اگر مقطوں تک ہی محدود رہتی تو پھر بھی کوئی ایسی بات نہ تھی۔ مگر وہ تو مقطعے سے نکل کر زندگی میں داخل ہو چلی بلکہ خود زندگی بن چکی ہے میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ ہر شاعر اپنے آپ کو اپنے تمام ہم عصروں سے بہتر سمجھتا ہے ۔ اور اپنی اس خیالی دنیا میں مگن وہ اپنے فن کو معراج تک پہنچانے کی ضرورت سمجھتا ہے اور نہ اس کی کوشش کرتا ہے ۔ آج جو پھس پھسی چیزیں ہمیں نظر آتی ہیں اس کا ایک سبب یہ بھی ہے۔ ادیبوں پر بڑی کڑی تنقید کی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنی خوش فہمیوں کو بھول کر خود کو پہچاننے لگیں۔

اثر صاحب نے فراق صاحب کی زبان کی چند غلطیوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔ زبان کی غلطیاں فیشن میں داخل ہوگئی ہیں۔ یہ بات آپ کو اکثر ادیبوں اور شاعروں کے ہاں نظر آئے گی۔ یہ ٹھیک ہے کہ زبان ہی سب کچھ نہیں مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ زبان میں غلطیاں کی جائیں یا ان کی طرف سے چشم پوشی کی جائے ۔ ؟ زبان ہر حالت میں صحیح استعمال کی جانی چاہیے۔ اس کے لیے کوئی بہانہ نہیں ہوسکتا۔ خیال کے ساتھ زبان کی بھی بہت اہمیت ہے۔ خدارا اس فیشن کو ختم کیجئے اور اگر اثر صاحب یا کوئی اور زبان کی غلطیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو اعتراض نکتہ نہ بنائیے۔

شفیقہ فرحت

سری نگر کشمیر

فراق اور اثر کا یہ ہنگامہ "صبا" سے ختم کردو تو اچھا ہے، اور کیا کہوں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ "صبا" کے معیار کو اور اونچا ہونا ہے ان بزرگوں کو کون بتائے کہ ان کے پاس ہمیں دینے کے لیے اب کچھ نہیں رہا، یہ تماشے، یہ ہنگامے، یہ گالیاں ۔ یہی وہ دولت ہے جسے ہمارے بزرگ اپنی نئی نسل میں لٹا رہے ہیں۔ اگر ادب سے کچھ کہدو تو آفت آجائے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کو جو کچھ سنایا گیا ہے وہ ہم سبھوں کو سنایا گیا ہے، ہم سب خاموش ہوجائیں اور لنگڑی شاعری کرتب دکھاتی رہے۔

شکیل الرحمٰن

کلکتہ

"صبا" کا ہر شمارہ ترقی کی سمت ایک قدم ہوتا ہے۔ آپ کی کاوشوں کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی۔ تازہ شمارے میں

بھی کئی کام کی چیزیں ہیں۔ اثر صاحب اور فراق صاحب کی چشمکوں کا اختتام تو ہونے والا نہیں ہے۔ اثر صاحب کی بعض تنقیدیں مفید ہیں۔ "نقوش" نے ان دونوں صاحبان کی نوک جھونک کی اشاعت کے سلسلے کو ختم کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے آپ کو بھی ایسا کرنا ہی پڑے گا۔

مخدوم صاحب نے اپنے سفرنامے کے بعض خوب صورت اوراق پیش کیے ہیں۔ مظہر امام

جمشید پور

"صبا" کا تازہ شمارہ مجھے مل گیا۔ ممنون ہوں۔ ابھی تک پورا نہیں پڑھ سکا پھر بھی اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ "صبا" ایک تابناک مستقبل کی طرف گامزن ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ ہندوستان کا واحد جریدہ ہے جس کی ترتیب میں صرف ادبی اور فنی مقصد ہی پیش نظر رکھا جاتا ہے تو کئی لوگوں کو برا لگے گا لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ "صبا" اس وقت اپنے تمام ہم عصروں سے الگ مقام کا مستحق ہے۔ سب سے زیادہ مسرت مجھے یہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ یہ بیک وقت عوام و خواص دونوں میں مقبول ہو رہا ہے۔ میں تعریفی خطوط لکھنے کا قائل نہیں لیکن یہ شمارہ دیکھ کر بس یوں سمجھیے کہ یہ سطور بے اختیار قلم سے نکل گئیں۔

میں پرچے کے بارے میں تفصیل سے لکھنا چاہتا تھا لیکن اس وقت میں جس طرح خط لکھ رہا ہوں یہ ممکن نہیں ہے لیکن اس پر بھی آپ کی غزل کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بڑے دنوں کے بعد آپ کی ایک پیاری غزل پڑھنے کا موقع ملا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ شاعر ہوتے ہوئے بھی آپ نے اس میں شاعری کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ایسی ہی ایک آدھ غزل ہر شمارے میں شائع کیجئے تو پھر کیا کہنے۔ ہربنس سنگھ دوست

نئی دھلی

بھی گذشتہ دو تین شمارے "صبا" کے بڑے وزنی اور جاندار تھے۔ عالم اور شاہد صاحبان نے "سخن گسترانہ باتیں" بڑے خلوص سے اور سوچ سمجھ کر لکھی ہیں۔ عالم صاحب کی پہلی سخن گسترانہ بات پر تنقیدیں عموماً معتقدین کے جھنجھلائے ہوئے دلچسپ ردعمل ہیں اگر اس کا کوئی ردعمل نہ ہوتا یا اگر انھیں غلط سمجھنے کی کوشش نہ کی جاتی تو میں اس مضمون کو دو کوڑی کا سمجھتا۔ کلیم اللہ صاحب تو اسکول ماسٹر کی طرح عالم کو سمجھانا شروع کر دیا ہے ان سے دہلی میں ملوں گا تو بہت بحثیں کروں گا۔

گذشتہ شمارے میں برق موسوی صاحب کا مضمون بھی بہت "آنکھ کھول" یعنی EYE OPENER قسم کا ہے۔ استادوں کو اب چوکنا ہو جانا چاہیئے کہ یہ جوانان ادب بھی بڑی گہری نظر رکھنے لگے ہیں۔

مخدوم صاحب کا سفرنامہ بھی بڑا ہی دلچسپ ہوتا ہے۔ ان کا اسٹائل انتہائی دلنشین اور اچھوتا ہے کہ شروع کرنے کے بعد اسے پورا پڑھنا ہی پڑتا ہے، اس مجبوری کا اظہار ان سے بھی کر چکا ہوں۔ حصہ نظم میں بہتری کی گنجائش ہے۔ ویسے اس بار تقریباً سب ہی چیزیں اچھی ہیں۔ گذشتہ شمارے میں ابوظفر صاحب کی نظم "کالی گھٹا" اور سطر شہاب کی غزل بہت پسند آئی تھی۔

(حسن نعیم)

علی گڈھ

جیلانی بانو کا افسانہ مجھے بہت پسند آیا۔ ہو سکے تو ان کو میری طرف سے مبارکباد پیش کر دیجئے گا۔

احمد جمال پاشا

مدراس

"شاہراہ" دہلی کے بعد صرف ایک "صبا" ہی تو ہے جس میں "نجات دیدہ دل" کا صحت مند ادب دیکھنے میں آتا ہے۔ بلکہ "شاہراہ" سے ایک قدم اور بھی آگے ہے۔ اس لیے کہ اس میں ترقی پسند ادب کے متعلق ڈھنڈورا کم اور افادی عناصر زیادہ نظر آتے ہیں۔ جہاں مخدوم ہیں۔ اثر لکھنوی بھی تو "عشق نہ رہے پیشہ" کے بل پر طلب گار مرد کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ اثر صاحب نے فراق کو جو کشتی کے لیے للکارا ہے۔ اس سے ارباب ذوق میں بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ سلسلہ مفید ہو سکتا ہے بشرطیکہ فریقین شائستگی اور اخلاق کا دامن نہ چھوڑیں۔ برق موسوی نے حضرت اثر کی غزل کا خوب جائزہ لیا ہے۔ دانش فراہی

جمشید پور

تازہ "صبا" میں آپ کی غزل پڑھی آپ کی غزل کے آخری تین شعر اس قدر مرصع ہیں کہ ہم تمام دوست ان پر گھنٹوں بحث کرتے رہے لہٰذا اس کامیاب تخلیق پر میں آپ کو مبارکباد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ عبدالستار فاروقی

حیدرآباد

جون اور جولائی کا مشترکہ "صبا" واقعی ہر لحاظ سے شاندار ہے۔ اب کی مرتبہ افسانوی حصہ بھی خوب ہے۔ آپ کی اور شاہد صدیقی صاحب کی غزلیں نفیس ہیں۔ خورشید احمد جامی کی نظم بہت پسند آئی۔ مخدوم کے تحفے دلچسپ اور پُراز معلومات ہیں۔ مقتدیٰ علی

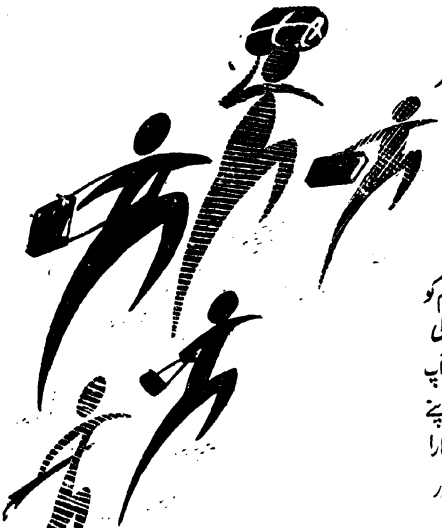
بھوپال

اس مرتبہ افسانے غنیمت ہیں لیکن سب سے بہتر کہانی آمنہ ابوالحسن کی ہے جس کا عنوان ہے "عیدی"۔ یہ پڑھنے والے کے دل پر گہرا نقش اور اثر چھوڑتی ہے اور بات اچھے ماحول میں لکھی گئی ہے۔ حقیقت نگاری نے اس میں مزید حسن پیدا کر دیا ہے۔ کوثر چاندپوری

لکھنؤ

"صبا" کا تازہ شمارہ ملا۔ شکریہ۔ اب کی آپ نے کہانیوں کا حصہ صنف نازک کی تخلیقات کے لیے مختص کر دیا ہے۔ انتظام عیدی، جی کا جنجال تینوں کہانیاں بے حد موثر ہیں۔ مجھے بے حد پسند آئیں، اس بات کے باوجود واحدہ تبسم کی کہانی کے بارے میں یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ انھوں نے آخر میں بڑے میاں سے جو کنیادان کرا لیا وہ کسی طرح برحق نہیں تھا۔ بڑے میاں کا کردار آخر میں خود افسانہ نگار کی جذباتیت کا شکار ہو گیا ہے۔ راہی لعل

(باقی صفحہ ۴۸ پر دیکھئے)



اِنفلوائنزا کی دُوسری لہر کے خوف سے مت بھاگیئے

اپنے جسم میں قوّتِ مدافعت پیدا کیجئے!

● یہ صحیح ہے کہ انفلوائنزا کا معمولی سا حملہ بھی جسم کو نڈھال کر دیتا ہے اور یہ بھی صحیح ہے۔ کہ انفلوائنزا کی دوسری لہر پہلی لہر سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ لیکن آپ دوسری لہر کے خوف سے مت گھبرایئے۔ سِنکارا سے اپنے جسم میں زبردست قوّتِ مدافعت پیدا کیجئے۔ سِنکارا آپ کو آنے والے موسم میں نزلہ زکام۔ ملیریا۔ ہیضہ اور خود انفلوائنزا کی دوسری لہر سے محفوظ رکھے گا۔

سِنکارا

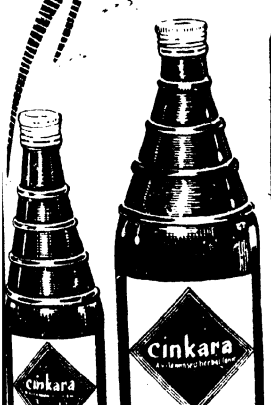
ہر موسم کے لیے اور خاندان بھر کے لیے ایک ٹانک

سِنکارا کے اجزاءِ ترکیبی۔

عام کمزوری:۔ حیاتین الف، د، ب، پ، نیاسناماڈ، ج
بال چھڑ، صندل سفید۔
مقویات نظامِ تنفس:۔ تلسی، واسپنی۔
مقویات نظامِ عصبی: اگر کیلیم، کلیسر فاسفیٹ، سوڈیم گلیسر وفاسفیٹ
مقویات نظامِ ہضم:۔ تیزپات، پھٹکڑی، واسپنی، دھنیا، پودینہ، کچری، گلاب، ناگرموتھ۔
مقویاتِ خون:۔ فولک ایسڈ۔
جراثیم کش:۔ تلسی، لونگ۔

اِنفلوائنزا کے بعد کے اثرات

نظامِ تنفس پر:۔
معمولی نزلہ زکام، کھانسی، گلے کے امراض
نظامِ عصبی پر:۔
ضعفِ دماغ، کام میں دل نہ لگنا، دردِ سر
نیند کی کمی، دردِ سر، چکر، چڑچڑا پن،
نظامِ ہضم پر:۔
بھوک بند ہو جانا، قبض، اپھارا،
خون:۔
خون میں سرخ دانوں کی کمی اور سفید دانوں کی زیادتی۔



اپنے قریبی اسٹاکسٹ سے سِنکارا اور اس کا لٹریچر طلب فرمایئے

Hamdard DAWAKHANA (TRUST) DELHI

صبا

دی نظام شوگر فیکٹری لمیٹڈ

مشرق کا سب سے بڑا شکر سازی کا کارخانہ

شکر اور الکحل

منظور شدہ سرمایہ ——— ۲,۰۰,۰۰,۰۰۰ روپے

سرمایۂ جاریہ ۱,۴۶,۴۰,۰۰۰ روپے

ہیڈ آفس :- عابد روڈ، پوسٹ باکس ۱۰۹ - حیدرآباد دکن - کیبل اور ٹیلیگرام "SUGAR"

فیکٹری :- شکر نگر - سنٹرل ریلوے - فون ۴۷۰۴، ۴۹۳۷، ۴۸۷۶، ۴۹۹۶

مینجنگ ایجنٹس کے نمائندے

دی حیدرآباد کنسٹرکشن کمپنی لمیٹڈ

ہر قسم کی انجینیرنگ کنسٹرکشن کے ماہران خصوصی

عابد روڈ - حیدرآباد - دکن

انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ

کے

ادبی حلقہ

کی

رکنیت قبول فرمائیے

سہ ماہی

اردو ادب

اور ہفت روزہ

ہماری زبان

حاصل کیجئے

انجمن کی چند نئی مطبوعات

۱	زندان نامہ	فیض احمد فیض	۲؍۲۵
۲	ذکر حافظ مع انتخاب	سجاد ظہیر	۲؍۲۵
۳	تنقیدیں (مضامین)	ڈاکٹر خورشید الاسلام	۴؍۵۰
۴	یادگار حالی (نیا اڈیشن)	صالحہ عابد حسین	۴؍۲۵
۵	ترقی پسند ادب (نیا اڈیشن)	علی سردار جعفری	۳؍۷۵
۶	انتخاب جدید (نیا اڈیشن)	مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور	۳؍۰۰
۷	انتخاب کلام میر (نیا اڈیشن)	ڈاکٹر عبدالحق	۳؍۵۰
۸	اردو صرف و نحو	〃 〃	۱؍۰۰
۹	چند ہم عصر	〃 〃	۱؍۲۵
۱۰	اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیاء کرام کا کام		۱؍۰۰
۱۱	نقد غالب (مضامین)	مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد	۱؍۰۰
۱۲	مقالات حالی (مضامین)		۲؍۲۵
۱۳	اردو ہندی لغت	مرتبہ انجمن	۲۰؍۰۰

شعرا کے انتخابی سلسلے کی مندرجہ ذیل کتابیں چھپ چکی ہیں

فیض • مجاز • مخدوم • اختر شیرانی • اختر انصاری • مجروح
عرش • وجدہ • شاد عارفی • جاں نثار اختر • احمد ندیم قاسمی

شرائط رکنیت ادبی حلقہ

• حلقے کی رکنیت کی فیس سالانہ ۳۰؍۰۰ روپے ہے۔ یکمشت یا دس دس کی چار ماہی قسطوں میں۔

• حلقہ ممبروں کو ہر سال ۲۵؍۰۰ روپے کی کتابیں اور انجمن کا ششماہی رسالہ اردو ادب قیمتی ۱۰؍۰۰ روپے اور انجمن کا ہفتہ وار اخبار قیمتی ۵؍۰۰ روپے کل ۳۰؍۰۰ کی مطبوعات پیش کرے گا۔

ارکان کو بقدر ۲۵؍۰۰ روپے انجمن کی مطبوعات میں سے اپنی پسند کی کتابیں منتخب کرنے کا حق ہوگا۔ محصول ڈاک رکن کے ذمہ ہوگا۔

• ۳۰؍۰۰ روپے کے عوض ۳۰؍۰۰ روپے کی مطبوعات مندرجہ بالا صورت میں دی جائیں گی۔ اس کے علاوہ اگر کوئی رکن انجمن کی دوسری کتابیں خریدے گا تو ۲۵ فیصد کمیشن دیا جائے گا۔

مزید تفصیلات کیلئے

جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے خط و کتابت کیجئے

فون نمبر ۵۴۵ تار "ہندی"

ہندی کے معیاری ادب اور نصابی کتب

کی اشاعت

ایک

قومی فریضہ کو پورا کرنا ہے

ہندی پرچار سبھا حیدرآباد

اس فرض کو پورا کر رہا ہے

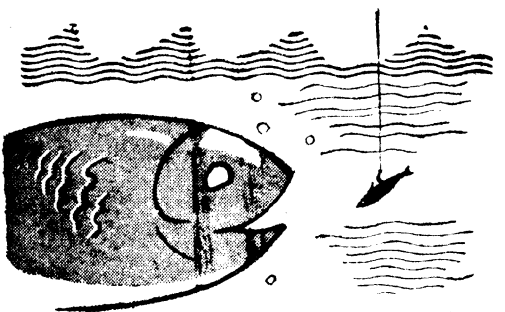
ہندی طباعت اور اشاعت کے معیاری کام کیلئے ہندی پرچار سبھا کی خدمات حاصل فرمائیے

سبھا کی مطبوعات کی فہرست طلب کیجئے

مینیجر

ہندی پرچار سبھا

اسٹیشن روڈ ناپلی ——— حیدرآباد دکن



نزلے

کا شکار ہوتے دیر نہیں لگتی!

آپ نزلہ، زکام اور کھانسی سے کتنا ہی بچیں
یہ شکایتیں اکثر پیچھے پڑھائے ہو جاتی ہیں۔ خصوصاً
موسم کی تبدیلی کے وقت تو گویا ان پر سے ہر
روک ٹوک اُٹھ جاتی ہے۔
ہر وقت چوکنے رہیے اور ان کی روک تھام
سُعالین سے کیجیے۔



سُعالین

کھانسی، نزلہ اور زکام کی دوا

Hamdard

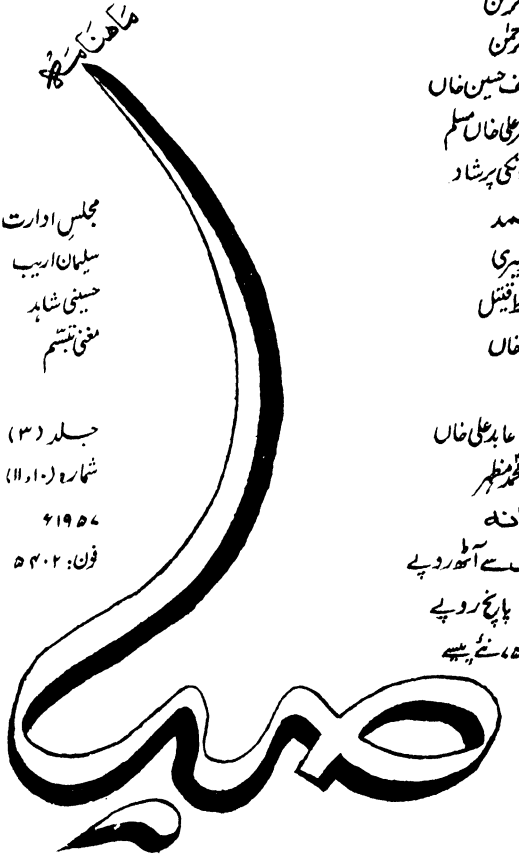
منظور شدہ محکمۂ تعلیمات حکومت آندھرا پردیش

مجلسِ مشاورت
حبیب الرحمٰن
فضل الرحمٰن
ڈاکٹر یوسف حسین خاں
ڈاکٹر طاہر علی خاں مسلم
رائے جانکی پرشاد
سیّد محمد
عالم خوندمیری
ڈاکٹر حفیظ قتیل
دلاور علی خاں
رضیہ بیگم
خازن: عابد علی خاں
کاتب: محمد مظہر

زرِ سالانہ
ہندوپاک سے آٹھ روپے
ششماہی: پانچ روپے
قیمت: ۵۰ نئے پیسے

مجلسِ ادارت
سلیمان اریب
حسینی شاہد
مغنی تبسم

جلد (۳)
شمارہ (۱۰، ۱۱)
۱۹۵۷ء
فون: ۵۴۰۲



پرنٹر پبلشر سلیمان اریب۔ ۱۷ مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ۔ مطبوعہ نیشنل فائن ..... پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد دکن

اس شمارے میں

پہلی بات ۷

● تحفے

ہجرت — جوش ملیح آبادی ۱۲
مجھی کے پیچھے چھوکرا — مخدوم محی الدین ۱۸

● مضامین

ایجاز کا رسے — ابوظفر عبدالواحد ۲۲
غزل کے عشقیہ موضوعات — ڈاکٹر حفیظ قتیل ۳۰
منٹو، موپاساں اور بالزاک — رضیہ بیگم

● غزلیں

شاد عارفی — علی جواد زیدی ۴۰
غلام ربانی تاباں — وحید اختر
اختر سعید — محمود ایاز
سعید شہیدی — ابن احمتاب
منوہر لال شارب — مظہر حسین قیصر
بشیر بدر ۵۰

● افسانے

روشنی اور سائے — رام لعل ۵۱
دل خانہ خراب — عوض سعید ۶۰
دغل باز دنیا — صفی الدین صدیقی ۶۸
مٹی — موپاساں ۷۲

● نظمیں

زمین کا چاند — اختر حسن ۷۸
نوید — باقر مہدی ۷۹
پرتو — حمایت علی شاعر ۸۰
تنہائیاں — عبدالرؤف عروج ۸۱
دیار غیر میں — حمید الماس ۸۲
عشق بھٹکتا ہے بیابانوں میں — غفور انیس ۸۳
مغنی — نہیر رضوی ۸۴
مطلع حیات — شفیق فاطمہ شعریٰ ۸۵
حیات امروز — جاوید وششٹ ۸۶
پہرا — کنول پرشاد کنول ۸۷

● طنزیہ

عکس تعمیرات اور ویرانۂ دل — آوارہ گرد ۸۸

● دوسری زبانوں سے

بنگلہ شاعری کی رفتار — شانتی رنجن بھٹاچاریہ ۹۰
ایک کشمیری غزل — غلام نبی خیال ۹۵
مخطوطات کتب خانۂ سالار جنگ ۹۲

● تبصرے

اسلام کے علاوہ اور مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ — پروفیسر عبدالقادر سروری ۱۰۰
بنیادور — جیلانی بانو ۱۰۳
شعور — وحید اختر ۱۰۴
صحیفہ — وحید اختر ۱۰۶

● بازگشت

عبدالرحمٰن چغتائی — جیلانی بانو ۱۰۷
واجدہ تبسم — حمایت علی شاعر
اسداللہ — صفی الدین صدیقی
شاہدہ نعیم — متین سروش
علی جواد زیدی — شانتی رنجن بھٹاچاریہ ۱۱۲

پہلی باتیں

حیدرآباد کے تہذیبی ادارے اور حکومت

پچھلے سال یکم نومبر کو تلگو بولنے والے عوام کا ایک خواب شرمندۂ تعبیر ہوا تھا اور آندھرا و تلنگانہ کے انضمام سے آندھرا پردیش کی ریاست معرض وجود میں آئی تھی، اس لحاظ سے یہ ایک اہم اور خوشگوار واقعہ تھا کہ تلگو بولنے والے کروڑوں عوام کو اپنی تہذیبی اور لسانی ترقی کے لیے بڑا میدان مل گیا اور اتحاد و یک جہتی سے ترقی کرنے کے مواقع پیدا ہو گئے، لیکن آج ہم یہ لکھتے ہوئے افسوس محسوس کرتے ہیں کہ آندھرا پردیش کے ان تہذیبی اور ادبی اداروں کو جو برسوں سے حیدرآباد کی سابق ریاست میں امداد پا رہے تھے اب تک امداد نہیں دی گئی ہے اور ان کی مقررہ سالانہ رقم کی ادائی کا مسئلہ اب تک زیر تصفیہ ہے۔ یہ سلوک کسی ایک زبان یا ادارے کے ساتھ نہیں ہوا ہے بلکہ تلگو، اردو، ہندی، مرہٹی اور کنڑی سب ہی زبانوں کے ادارے اس کا شکار ہوئے ہیں، نئے ہندوستان کی تعمیر و ترقی کے لیے جہاں معاشی منصوبوں کی تکمیل پر کروڑوں اور اربوں روپے صرف کیے جا رہے ہیں وہیں کلچرل اداروں کے ساتھ حکومت کی یہ بے توجہی قابل غور ہے۔ کسی ملک کی ترقی کا راز صرف معاشی منصوبوں ہی کی تکمیل میں نہیں بلکہ اس کے کلچر اور زبان کا تحفظ بھی لازمی ہے، ہم یہ نہیں کہتے کہ معاشی منصوبوں پر اتنی کثیر رقم صرف نہ کی جائے معاشیات تو ترقی و تعمیر کی بنیاد ہے، اس پر جتنا کچھ بھی صرف کیا جائے مناسب ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اگر تھوڑا سا حصہ تہذیبی اداروں کے لیے بھی مختص کر دیا جائے تو ہم اپنے قومی کلچر کے فروغ میں حصہ لینے کے قابل ہو سکیں گے، ایک طرف تو ہمارے نیتا قومی تہذیب کے احیا اور ترقی کے بلند بانگ دعوے کرتے ہیں اور دوسری طرف عملی طور پر اس قدر بے اعتنائی برتی جاتی ہے، قول و عمل کا یہ تضاد اسی صورت میں دور ہو سکتا ہے کہ اگر حکومت پہلے سے زیادہ امداد تہذیبی اداروں کو نہیں دے سکتی تو کم سے کم اتنی امداد تو جاری رکھے جو پہلے ملتی تھی۔

آل انڈیا ریڈیو اور اردو پروگرام

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ آل انڈیا ریڈیو کے بعض اسٹیشنوں میں جن میں حیدرآباد بھی شامل ہے چند مہینے پہلے تک اردو کے پروگرام کا تناسب اس قدر کم تھا جو نہ ہونے کے مترادف تھا لیکن بعض حلقوں سے اس کے خلاف موثر احتجاج کی وجہ سے اب

اردو کے پروگرام میں اضافہ کردیا گیا ہے اور یہ خوشگوار تبدیلی بھی آئی ہے کہ حیدرآباد کے ان لکھنے والوں کو بھی دعوت آرہی ہے جن کو پہلے نہ جانے کن مصلحتوں کی بناء پر ریڈیو والے نظرانداز کرتے تھے، پھر بھی یہ شکایت ایک حد تک باقی ہی ہے کہ حیدرآباد کے اردو پروگرام خاص طور پر فیچر اور ڈرامے کے حصے میں حیدرآبادی مصنفین سے زیادہ باہر کے لکھنے والوں کی نمائندگی ہوتی ہے جو کوئی مناسب بات نہیں ہے جب کہ حیدرآباد میں اچھے اور تجربہ کار ریڈیو کے لکھنے والوں کی کمی نہیں ہے، اسی کے ساتھ ایک بات اور قابل توجہ ہے کہ اب بھی بعض اہم شخصیتوں کو اردو کے پروگرام میں ان کے سیاسی نظریات کی بناء پر مدعو نہیں کیا جاتا ہے حالانکہ اب سارے ہندوستان میں کہیں بھی کسی سیاسی پارٹی پر کوئی پابندی نہیں ہے، چنانچہ خود آل انڈیا ریڈیو کے دوسرے اسٹیشنوں سے ایسے لوگوں کے پروگرام نشر ہوتے ہیں، خبر نہیں کہ حیدرآباد ہی کے اسٹیشن نے یہ احتیاطی اور جانبدارانہ پالیسی کیوں برقرار رکھی ہے، ریڈیو بھی ایک تہذیبی واسطہ ہے اور تہذیب و ادب کے معاملے میں سیاسی نظریات کی اتنی اہمیت نہیں ہے جتنی خود تہذیبی و ادبی مسائل کی، اس لیے آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کو اس نقطہ نظر سے اپنی پالیسی میں صحت مندانہ تبدیلی کرنی چاہیئے۔

انجمن ترقی اردو (حیدرآباد)

حیدرآباد کی شاخ انجمن ترقی اردو ہندوستان کی اہم ترین ریاستی شاخوں میں سے ایک ہے اور پچھلے چند برسوں میں اس نے بعض بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں مثلاً اردو ہال کی تعمیر اور اردو کالج کا قیام۔ اردو ہال کی تعمیر اس لحاظ سے اہم ہے کہ حیدرآباد ایسے بڑے شہر میں جہاں روزبہی اردو کا کوئی نہ کوئی جلسہ یا تقریب ہوتی رہتی ہے، اردو والوں کی اپنی کوئی ایسی جگہ نہ تھی جسے وہ ان مقاصد کے لیے استعمال کرسکتے۔ اردو ہال کی تعمیر نے اس ایک اہم ضرورت کو پورا کردیا ہے لیکن اردو ہال اور اردو کالج کی اہمیت کو مانتے ہوئے بھی ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ انجمن کا اصل کام زبان و ادب کی بقا اور ترقی و ترویج کے لیے کوشش کرنا ہے۔

انجمن کا فرض ہے کہ وہ اردو کی ادبی کتابوں اور خاص طور سے حیدرآباد کے قدیم و جدید ادبی سرمائے کے تحفظ و اشاعت کی طرف توجہ دے، اگر اپنی زبان اور ادب ہی کو محفوظ نہ کیا گیا تو اردو ہال کی تعمیر اور اردو کالج کا قیام کچھ زیادہ سودمند ثابت نہ ہوگا۔ انجمن کو اشاعتی پروگرام کے ساتھ ایک بات کی طرف اور توجہ کرنی چاہیئے وہ یہ ہے کہ اس وقت حیدرآباد سے صرف ایک ایسا ادبی جریدہ نکل رہا ہے جو ہندوستان و پاکستان کے اعلیٰ ترین ادبی معیار کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے، حیدرآباد مدتوں سے اردو کی ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے اور یہاں اب بھی بڑی تعداد میں ایسے ادیب اور شاعر موجود ہیں جو پورے ہندوستان و پاکستان میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ایسے مقام سے ایک پرچہ بھی پابندی سے نہ نکل سکے تو اس کی ذمہ داری بھی انجمن پر عائد ہوگی۔ انجمن جہاں بہت کچھ

ٹھوس کام کر رہی ہے وہیں اس کو "صبا" کی اشاعت اور امداد کی طرف بھی اب سے زیادہ توجہ کرنی چاہیئے کیونکہ یہ ادبی رسالہ بھی حیدرآباد اور ہندوستان میں اسی مقصد کو پورا کر رہا ہے جس مقصد کے لیے انجمن کی جدوجہد جاری ہے۔

محترم رشید احمد صدیقی اور "صبا"

چند مہینے پہلے "صبا" میں حضرت اثر لکھنوی اور حضرت فراق گورکھپوری کی بحث کا آغاز ہوا تھا جسے دو ہی شماروں کے بعد اس لیے بند کرونا پڑا کہ اس بحث سے ادب اور تنقید کو کسی قسم کا فائدہ پہنچنے کے بجائے ادبی فضا کے مکدر ہونے کا زیادہ احتمال تھا، اس بات کو خود اداره "صبا" نے محسوس کیا، ساتھ ہی پڑھنے والوں کے خطوط سے بھی اسی رائے کا اظہار ہوا کہ یہ بحث خود اثر و فراق کے شایانِ شان ہے اور نہ "صبا" کے۔

۱۵ دسمبر ۱۹۵۰ء کے "ہماری زبان" کے اداریہ میں اس قضیے پر اظہار خیال کرتے ہوئے "صبا" اور "ساقی" کراچی کا ذکر کیا گیا ہے۔ ادارتی نوٹ کے بعد ہی رشید احمد صدیقی صاحب کا ایک مکتوب سرور صاحب کے نام شائع کیا گیا ہے جو اسی جھگڑے سے متعلق ہے، رشید صاحب نے فراق و اثر کو تو موردِ الزام گردانا ہی ہے مگر زیادہ غصہ "صبا" اور "ساقی" پر اتارا گیا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔ "ایک بات جو میں نے بڑے غم سے محسوس کی اور جس میں کوشش کے باوجود غصہ کا بھی شائبہ آگیا ہے وہ یہ ہے کہ بعض رسائل کے ایڈیٹر صاحبان نے اس جھگڑے کو اپنے رسالے میں اس طور پر شائع کیا ہے جیسے ایڈیٹر صاحبان موصوف کا یہ کوئی بڑا کارنامہ ہے۔ کیا افسوس اور غیرت کی بات نہیں کہ رسالے کی اشاعت کو چمکانے کے لیے دو شریفوں کے ناگوار تعلقات کو اچھالا جائے۔ . . . . . " اس قسم کی ذہنیت کو رشید صاحب نے "گھٹیا" اور "شریفوں میں بار پانے کے ناقابل" بتایا ہے۔

اصولی طور سے اس رائے سے ہمیں بھی اتفاق ہے لیکن "صبا" کے تعلق سے رشید صاحب کا یہ انداز بیان نامناسب ہی نہیں بلکہ غلط ذہنی تحفظات پر مبنی ہے۔ رشید صاحب کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ "صبا" ہی وہ پہلا مجرم نہیں جس نے اس قضیے کی اشاعت کی بلکہ اب سے کئی برس پہلے اس کا آغاز "تہذیب" (پٹنہ) میں ہوا تھا اور وقتاً فوقتاً مختلف رسالوں میں یہ ناپسندیدہ بحث شروع بھی ہوئی اور بند بھی۔ جب ادارۂ "صبا" نے بھی دیکھا کہ اس ادبی بحث کا انداز بالکل غیر ادبی ہے تو اسے دو ہی شماروں کے بعد بند کر دیا گیا۔ رشید صاحب کا اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ یہ سب کچھ رسالے کی اشاعت کو چمکانے کے لیے کیا گیا تھا ہمارے اوپر ایک ایسا الزام ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں۔ رشید صاحب ہمارے بزرگ ہیں ہم ان کا بہت احترام کرتے ہیں اور اسی احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم موصوف سے ادباً اتنا پوچھا چاہتے ہیں کہ کیا ان کے اپنے دلائل اور ان سے اخذ کیے ہوئے نتائج کی بنا پر "ہماری زبان" کے کالم "رفتار" کو "گرم بازاری" کا ایک ذریعہ نہیں سمجھا جا سکتا؟ حالانکہ اس کے متعلق رشید صاحب کا جواب نفی میں ہوگا کیونکہ انھوں نے سرور صاحب کو "رفتار" کی

اس بحث کو بند کرنے کا مشورہ بڑے دکھ سے دیا تھا اور انھیں افسوس تھا کہ لوگ کالم نگار کی صحیح باتوں کو صحیح روشنی میں نہیں دیکھ رہے ہیں۔ اگر رشید صاحب اُس کالم کے تعلق سے ایک رویّہ اور اِس بحث کے تعلق سے ایڈیٹروں کو معطون کرتے ہوئے دوسرا رویہ اختیار کریں تو پھر ہمیں سوچنا پڑتا ہے کہ یہ "دوعملی" اور "جانبداری" نہیں تو اور کیا ہے؟

"صبا" جب سے جاری ہوا ہے اس نے اعلیٰ معیار کو برقرار رکھا ہے، اگر رسالے کی اشاعت کو چمکانا ہی مقصود ہوتا تو ہم اور بھی بہت سے سستے طریقے استعمال کر سکتے تھے مگر ہم نے صحت مند ادب کی روایت کی خاطر کبھی غلط طریقوں سے توسیع اشاعت کی کوشش نہیں کی اسی وجہ سے آج ہم نے رشید صاحب کا یہ خط پڑھ کر ان ہی کے الفاظ میں "بڑا غم محسوس کیا جس میں کوشش کے باوجود غصے کا بھی شائبہ آگیا ہے" ساتھ ہی ہمیں "ہماری زبان" کے ادارے سے بھی شکایت ہے کہ ایک اتنے ذمہ دار جریدے نے ہمارے ساتھ کوئی انصاف نہیں کیا۔

جیلانی بانو اور "ہندوستانی ادب"

حیدرآباد کے ایک اردو ماہنامے "ہندوستانی ادب" نے اپنے اکتوبر کے شمارے میں جیلانی بانو کے تعلق سے چند ایسی باتیں لکھی ہیں جو کسی ادبی پرچے کو زیب نہیں دیتیں، واقعہ یہ ہے کہ جیلانی بانو نے اپنا ایک ڈرامہ کراچی کے کسی ماہنامے "شہناز" کو معاوضہ لے کر دیا تھا۔ بعد میں انھوں نے یہی ڈرامہ "تشور" کراچی میں بھی شائع کروادیا جس پر "شہناز" نے اعتراض کیا، اسی بات کو "ہندوستانی ادب" کے مدیر نے خبر نہیں کن اسباب کی بنا پر خوب خوب اچھالا اور ایک خاتون افسانہ نگار کے لیے "دغاباز، دھوکے باز، فریبی، چغلی، شیطان صفات" کے الفاظ ہی استعمال نہیں کیے بلکہ انھیں بداخلاقی و بدکرداری کا بھی مرتکب قرار دیا اور یہاں تک لکھ مارا کہ دھوکے بازی کی کمائی "حرام کی کمائی" کے برابر ہے۔ ہمارے ادبی اور صحافتی آداب سے قطع نظر بھی تہذیب و شائستگی کا تقاضہ یہ ہے کہ کسی کے انتہائی خلاف لکھتے ہوئے بھی آداب و اخلاق کو ملحوظ رکھا جائے، چہ جائیکہ ایک خاتون کے لیے ایسے نازیبا الفاظ استعمال ہوں۔ ہم کو اپنے اس معاصر ماہنامے کی اس تحریر سے سخت اذیت پہنچی کیونکہ یہ ادبی جریدوں اور صحافت کے دامن پر بھی ایک بدنما داغ ہے ـــــ ہندوستان و پاکستان کے تمام ادبی جریدوں اور لکھنے والوں کو اس رویّے کے خلاف احتجاج کرنا چاہیئے کیونکہ کسی ادیب کی ذات پر حملہ تمام ادیبوں کی توہین کے مترادف ہے۔

ہمارا مشورہ ہے کہ "ہندوستانی ادب" کے ایڈیٹر صاحب اپنی اس غلطی کو تسلیم کر کے معافی مانگ لیں۔

"صبا" کا سالنامہ

صبا تقریباً تین سال سے پابندی کے ساتھ ادب اور زبان کی خدمت کر رہا ہے اور آج ہم یہ کہتے ہوئے فخر

محسوس کرتے ہیں کہ اس مدت میں صبا نے اپنے معیار کے لحاظ سے پورے برصغیر ہند و پاک میں اہم مقام حاصل کرلیا ہے۔ بظاہر تو تین سال کی مدت بڑی قلیل معلوم ہوتی ہے لیکن اگر یوں دیکھا جائے کہ آج ادب کی کساد بازاری کے زمانے میں کسی اچھے اور ستھرے مذاق کے ادبی جریدے کا اجرا کتنا مشکل کام ہے تو معلوم ہوگا کہ کسی ایسے رسالے کو تین سال تک باقی رکھنا کتنا بڑا کام ہے۔ اب تک جس طرح صبا نے اپنی زندگی کی جدوجہد جاری رکھی ہے آئندہ بھی یہ جدوجہد رہے گی، اس موقع پر ہم ایک بار پھر اپنے لکھنے والوں اور پڑھنے والوں سے توجہ اور تعاون کی درخواست کرتے ہیں۔ نئے سال کے آغاز میں صبا اپنا خاص نمبر نکالنے کا اعلان کرتا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اردو کے تمام اہم اور قابل ذکر لکھنے والوں کی تخلیقات کے ساتھ یہ ایک اہم اور قابل قدر نمبر ہوگا۔

اسی نگاہ میں ہے قاہری و جباری
اسی نگاہ میں ہے دلبری و رعنائی

اقبال

نگاہ

علمی و ادبی جریدہ

زیر ادارت ——— سردار جعفری

خوبصورت ٹائپ میں نفیس کاغذ پر چھپی ہوئی سال میں چار ضخیم جلدیں پیش کی جائیں گی

فی جلد پانچ روپیہ

سالانہ ——— سولہ روپے
ششماہی ——— نو "

اردو پبلشرز

۶۳۔ مورلینڈ روڈ۔ بمبئی (۸)

ہند و پاک کے موقر جریدوں کے منتخب شاہکار پیش کرنیوالا

اردو ماہنامہ

شاہکار

نومبر کی ابتدائی تاریخوں میں شائع ہوچکا ہے

(پہلے نمبر کے فن کار)

افسانے:۔ احمد ندیم قاسمی • شفیق الرحمن • ممتاز شیریں • شوکت تھانوی • خدیجہ مستور • کشمیر کا لال ذاکر • مہدی عباس قیصر

غزلیں • جگر مرادآبادی • فراق گورکھپوری • فیض احمد فیض • سلیمان اریب • نشور واحدی • مسعود اختر جمال • بشیر بدر

نظمیں • جوش ملیح آبادی • سردار جعفری • شاد عارفی • اختر انصاری • سلام مچھلی شہری • اور پرویز شاہدی وغیرہ

مرتب ——— محمود احمد حسن

ضخامت: ۵۰ صفحات۔ قیمت فی پرچہ: ایک روپیہ
سالانہ: دس روپے

مکتبہ شاہکار۔ کٹرہ۔ الہ آباد ۲

جوش ملیح آبادی

ہجرت

حضرت جوش کی یہ تحریر نئی قدریں" حیدرآباد (سندھ) میں شائع ہوئی تھی، اس آئینے میں جوش صاحب کی شخصیت اور انداز فکر کے نقوش نمایاں ہیں، اسی لیے ہم اسے قارئین "صبا" کے لیے نقل کر رہے ہیں تاکہ عبرت بھی ہو اور بہتوں کا بھلا بھی، اب یہ آپ کا کام ہے کہ اس عندلیب گناہ کو جو نام چاہیں دیں؛ (مدیر)

پیش اشارہ ہجرت ایک ایسا ناقابل شرح عظیم ترین حادثۂ روح فرسا ہے کہ اگر تمام عالم کی تمام ضخیم فرہنگوں اور تمام نمایاں افراد اقوام کی تمام قابل احاطہ ادبی تخلیقوں کو، بخوبی کھنگال کر ان سے تمام ہوت برد و شِ وحسرت فروش الفاظ کو ایک ایک کر کے چن لیا جائے اور ان سب کو ایک لشکر جرار کی شکل میں ڈھال کر، مسلح و کمر بستہ کر کے کسی موجد الفاظ، خلاق معانی اور دارائے ادبیات ولسانیات شاعر اعظم کی کمان میں، اس درخواست کے ساتھ دیدیا جائے کہ وہ اپنے لشکر الفاظ کی مجموعی طاقت سے ہجرت کر کے صرف کروڑ ویں جزو حقیر ہی کی شرح کر دے تو اس موقع پر اگر کوئی صحیح ترین پیش گوئی کی جاسکتی ہے تو وہ یہ ہوگی کہ فقدان قوت اظہار اور تموج بحر جذبات کے پیدا کردہ اضطراب نفس کے شکنجہ میں گرفتار ہو کر وہ شاعر اس حریص گفتار کے مانند جو یکایک گونگا ہو گیا ہو، تیورا کر زمین پر گر پڑے گا، اور خون کی قے کر کے ہمیشہ کے واسطے خاموش ہو کر رہ جائے گا۔

لیکن قدرت کی یہ بہت بڑی شقاوت خلاقی ہے کہ اس نے ہمارے اس کرہ کی تمام چہل پہل اور گھما گھمی کو اس نامراد ہجرت سے وابستہ کر رکھا ہے اور دلوں کے اس کانٹے سے زمین کے دامن کو بسا دیا ہے۔

اگر انسان ہجرت کی آبائی سنت جاریہ اور ترک وطن کے تاریخی تقاضائے مسلسل کا پابند نہ ہوتا تو یہ دنیا آج ایک کرۂ غیر آباد کے سوا اور کچھ نہ ہوتی۔ اور لوگ کب کے ایک دوسرے کی رگڑ سے جل اور ایک دوسرے کے وزن سے کچل کر موت کے گھاٹ اتر چکے ہوتے۔

اے متاع درد در بازار جاں انداختہ گوہر بے سود در جیب زیاں انداختہ

پس اشارہ (۱) اگر ہندوستان کے کسی، اپنی حد تک حال مدہوش و مستقبل فراموش، عمر رسیدہ و وطن گزیدہ شاعر مثلاً محمود کو اس کا ایک صاحب اقتدار و پیکر ایثار پاکستانی دوست، مثلاً حامد، اس امر

کے سمجھا دینے میں کامیاب ہو جائے کہ قدرت نے جس زبان کی خاطر اس کو خلق کیا ہے اس کی خدمت کا اگر کہیں امکان ہے، یا پیدا کیا جا سکتا ہے تو وہ پاکستان اور صرف پاکستان ہے۔

اور اگر محمود اپنی معاشی فراغت اور مجلسی وجاہت کے برقرار رکھنے کی ہوس میں ہندوستان ترک نہیں کرے گا، تو دراصل محمود کی اپنی زبان سے یہ ایک ایسی شرمناک سنگ حرامی ہوگی جسے آئندگان رفتنی میں سے کوئی ایک فرد بھی کبھی معاف نہیں کرے گا۔

(۲) اسی کے ساتھ ساتھ اگر محمود کو اس حقیقت سے بھی آگاہ کر دیا جائے کہ ہندوستان میں اس کی تمام چمک دمک کا مدار ہے وہاں کے وزیر اعظم کی شخصی دوستی پر۔

اگر خدانخواستہ، وہ نہیں رہے تو، دوسرے ہی دن "ملاپ و پرتاب" کی ذریت اُسے پامال کر کے رکھ دے گی۔

(۳) اس کے ساتھ ساتھ اگر محمود کے دل میں ظنیات و جذبات کی معرفت نہیں بلکہ منطقی دلائل کی وساطت سے اس امر کا پختہ یقین اور اس بات کا شدید خوف پیدا کر دیا جائے کہ اُس کے وطن عزیز کا سیاسی موسم، اس کے محبوب معاشرے کے مزاجی تیور اور اس کی دل نشین زمین کی جذباتی آب و ہوا اب اس حد تک بدل اور بگڑ چکی ہے کہ اس کے برادرانِ وطن اس کی نصف صدی کے تمام سیاسی، ادبی اور فکری خدمات کو تعصب و نفرت کی بھٹی میں جھونک چکے ہیں اور اُسے اس حملہ آمادہ بھیڑیئے کے مانند گھور رہے ہیں جو عنقریب جھپٹ پڑنے والا ہو۔

(۴) اور اسی کے دوش بدوش محمود کو اس یقین کا زہر بھی پلا دیا گیا ہو کہ اس کے "انتقال" فرماتے ہی اس کا وطن اس کی خود دار بیوہ، اس کے ناز و نعم میں پلے ہوئے یتیموں اور ان یتیموں کے بچوں کو:۔

(ا) ان کی ثقافت سے بیگانہ بنا دے گا۔

(ب) گدی سے ان کی زبان کھینچ لے گا۔

(ج) معاش کے ذریعے سے ان کو سر محروم کر دے گا۔

(د) انہیں عزت کی بلندیوں سے ڈھکیل دے گا۔

(س) اور، آخر کار ان کو تپتی اور ہونکتی سڑکوں کی طرف چابک مار کر ہانک دے گا۔ تو قدرتی طور سے محمود یہ سوچنے پر آمادہ ہو جائے گا کہ اب وہ کیا کرے؟

اور اگر اس "اب وہ کیا کرے؟" کا کوئی حل نکلتا ہوا نظر نہیں آئے گا، تو آخر کار وہ یہاں تک غور کرنے پر مجبور ہو جائے گا، کہ وہ چھاتی پر پتھر رکھ کر کس ملک کی طرف منہ کالا کر جائے؟"

اور شش و پنج کے اس چیست یارانِ طریقت کے دوراہے پر اگر حامد کی آواز گونج اٹھے گی، اور وہ محمود کو گرجتے ہوئے اصرار اور برستے ہوئے اخلاص سے پاکستان آ کر بس جانے کی دعوت، اس وعدۂ محکم کے ساتھ دے گا کہ

وہ اس کے اہل وعیال کی ذہنی معاشی فراغت کا ایسے ملوکے ساتھ بندوبست کردے گا کہ وہ ایک قابل رشک زندگی بسر کرنے لگیں گے۔

اوران سام اور پراور نیچے لکھے ہوئے امور پر ٹھنڈے دل سے، اور سال ڈیڑھ سال تک ٹھہر ٹھہر کر غور کر چکنے اور اپنے ہر مکتب خیال کے پختہ کار احباب کی سنجیدہ رائے بھی لے لینے کے بعد اگر محمود ایک حاصل شدہ ذاتی فراغت کو ایک موعودہ خاندانی فراغت پر قربان کر کے ہندوستان کو ترک اور پاکستان کو اختیار کر لے گا۔ تو یہ امر فطرتِ انسانی کا ایک ایسا قدرتی تقاضائے مبرم ہوگا جس سے سرتابی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

اور یہ سن کر اگر کوئی سقراط صاحب یہ بول اٹھیں کہ محمود کے یہ تمام دفدغے غلط تھے تو ان کی خدمت میں بعد ادب گذارش ہے کہ محمود نے ان تمام مسائل پر آپ کے کاسۂ سر کی معرفت غور نہیں کیا تھا۔ بلکہ اپنی اور اپنے دیدہ ور یاروں کی کھوپڑی سے سوچ کر وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا۔

اور یہ دراصل بڑی مجبوری ہے کہ کسی نتیجے تک رسائی حاصل کرنے کے واسطے ہر انسان اپنی عقل اور اپنے رفیقوں کے مشوروں تک محدود رہتا اور تمام دنیا کے عقلا سے مشورہ نہیں لے سکتا۔

بہرحال محمود اور اس کے احباب نے جو کچھ فیصلہ کیا اسی پر عمل کیا گیا۔ اور یہ وہ بات ہے جسے ایک دنیا آج بھی کر رہی ہے اور ہمیشہ سے کرتی چلی آرہی ہے جس سے بقراط صاحب بھی باہر نہیں ہیں۔

اور اس شافی ومسکت دلیل کے باوجود اگر کسی بقراط یا بہت سے بقراطوں کا دل محمود کو برا کہنے یا اس پر اعتراض کرنے کو تڑپ رہا ہو تو وہ محمود کی اس ہجرت کو "خطائے اجتہادی" کا نام دے کر وہ کر لیں جسے منہ سونپا کرنا کہا جاتا ہے۔ انھیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ:۔

"ایں خطا ئیست کہ در شہر شما نیز کنند"

اور اس کے بعد یا عین اسی موقع پر کوئی اشرف النفس اور انجب الذکاوت لال بجھکڑ قسم کے بزرگ یکایک یہ نعرہ لگا اٹھیں کہ جناب والا اہم سے پوچھئے تو ہم بتائیں کہ محمود کی یہ ہجرت صرف طمع زر تھی، خالص طمع زر اور اس سے سوا سب بکواس ہے۔

سو ان کی خدمت میں یہ مؤدبانہ درخواست ہے کہ وہ "طمع" زر کی اگر تحقیق فرما لیتے تو ایسی اوگھڑ بات منہ سے نہ نکالتے۔

طمع کے معنی سمجھنے کی خاطر پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ "مبادلۂ جنس بالجنس" کی رسم کو ترک کر کے سکوں کے رائج کر دینے والی اس دنیا میں اس شخص کی یہ مجال نہیں ہے کہ وہ طلب زر سے ہاتھ اٹھا لے جو دوسروں کی خوشامد کرنے، دوسروں کے در پر اپنی آبرو بیچنے اور سر بازار بھیک مانگنے پر آمادہ نہیں۔

اس دنیا میں جو شخص بھی جینا اور جلانا چاہتا ہے اس کے واسطے قدرت کا یہ اٹل فرمان ہے کہ وہ طلبِ زر سے ایک لمحے کی غفلت کا بھی ارتکاب نہ کرے۔

طلبِ زندگی کو سنوارنے، نکھارنے اور ابھارنے والا ایک فطری اور قابلِ تحسین عمل ہے جس سے لفظِ حیات میں مفہوم پیدا ہوتا ہے۔

اور ہوسِ زر زندگی کو اجاڑنے، پچھاڑنے اور بگاڑنے والا ایک نفسی مرض ہے جس میں زندگی کو دُبلا اور توڑے کو موٹا کیا جاتا ہے۔

اور جو شخص طلبِ زر اور ہوسِ زر دونوں کو ایک سمجھتا ہے اُسے اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ وہ امکانی عجلت سے کام لے کر کسی دماغی اسپتال میں داخل ہو جائے۔

واضح ہو کہ اگر کوئی بچہ حسبِ معمول و فطرت بھوک لگنے تو رونے لگے اور دودھ پی لے تو سو جائے تو اس صورتِ حال کو ایک فطری و مستحسن "طلبِ شیر" کہا جائے گا۔

اور اگر کوئی بچہ خلافِ معمول و فطرت بھوک نہ لگنے، پھر بھی روئے اور دودھ ملنے تو پئے بہت کم اور ٹھونسنے میں بھر کر رکھ لے بہت زیادہ تو اس صورتِ حال کو ایک غیر فطری و غیر مستحسن "ہوسِ زر" کا برا نام دیا جائے گا۔

اور اس روشنی میں محمود کے بارے میں یہ دیکھنا ہے کہ اس کے پاکستان جانے میں "طلبِ زر" کا ہاتھ تھا یا "ہوسِ زر" کا؟

جہاں تک طلبِ زر کا تعلق ہے محمود ایک نارمل آدمی کی طرح اس سے قطعی بے نیاز نہ تھا۔ اس لیے کہ ہندوستان میں اسے اس قدر معاشی فراغت حاصل تھی کہ لاکھوں اُس پر رشک کیا کرتے تھے۔

اور اس کے ساتھ ساتھ اسے ہندوستان میں وہ معاشری وجاہت بھی حاصل تھی کہ اس کی جانب بڑے بڑوں کی نگاہیں اٹھا کرتی تھیں۔ اس لیے جہاں تک کہ اُس کی ذات کا تعلق ہے ہجرت کی اسے ضرورت ہی نہیں تھی۔

اب رہا "ہوسِ زر" کا مسئلہ، اس موقع پر اگر کوئی صاحب ذاتی کدورت، سیاسی مصلحت، خود مشتہرانہ فطرت یا عقل کی خفت کی بناء پر دو قدم آگے بڑھ کر یوں گل افشانی فرمانے لگیں کہ یہ تو صحیح ہے کہ محمود ہندوستان میں ایک قابلِ رشک زندگی گذار رہا تھا لیکن اس کے باوجود وہ "..... ہے آرزو کہ خوب سے خوب تر کہاں؟" اور مزید دولت حاصل کرنے کی خاطر "دولت زیادہ دولت (WEALTH MORE WEALTH) کا نعرہ لگاتا ہوا پاکستان ... بھاگ کھڑا ہوا تھا۔

اگر اس طرح کہہ کر وہ صاحب اپنا جی ہی ٹھنڈا کرنا چاہتے ہیں تو شوق سے ٹھنڈا کر لیں۔ لیکن اگر وہ حقیقت میں تلاشِ حق چاہتے ہیں تو مندرجہ ذیل امور پر نگاہ ڈال کر خود ہی فیصلہ کر لیں کہ محمود فطرتاً ایک سیر چشم آدمی ہے کہ حریص و بخیل۔

(۱) محمود کسی ننگے بھوکے خاندان کا دولت ندیدہ و طرب ناچشیدہ انسان نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس وہ اودھ

کے ایک ایسے خسر و اقتدار و دارائے دَرہم و دینار خان واوہ بزرگ کا چشم و چراغ ہے جس نے چاندی سونے کے پہاڑ ملی کو ہمیشہ ایک تودۂ ذلیل کا خطاب دیا ہے (اس دعوے کی صداقت کے واسطے محمود کے کلام کی ورق گردانی اور محمود کی زندگی کا مطالعہ فرمایا جائے)

(۲) محمود کے بدترین دشمن تک بشرطیکہ وہ سچ بولنے کے موڈ (MOOD) میں ہوں، اس بات کی شہادت دے سکتے ہیں کہ محمود اپنی تمناؤں کی دلداری اور ارباب حاجت کی غم خواری میں اس وقت تک لاکھوں روپے پانی کی طرح بہا چکا ہے۔

(۳) محمود کو اس کے تمام اقربا و احباب ہمیشہ سے "فضول خرچ" "مُسرف" اور "لکھ لٹ" کا خطاب دیتے چلے آئے ہیں۔

(۴) اس کے سن رسیدہ ارباب وطن و اعزا آج بھی اس کی گواہی دے سکتے ہیں کہ اس کے جواں مرگ باپ کے عین انتقال کے بعد جس وقت کہ اس کے ایک بزرگ عزیز اقرب نے اپنے فائدے اور اس کے نقصان کی خاطر دو تین دستاویزیں تیار کر کے دستخط کے واسطے اس کے ہاتھ میں دیں تو ان پر اس نے بے پڑھے محض اس خیال سے دستخط کر کے اپنے کو شدید جائدادی و نقدی نقصان پہنچا لیا کہ اگر وہ پڑھ کر دستخط کرے گا تو اس کے عزیز اقرب کے دل کو اس خیال سے صدمہ پہنچے گا کہ اس نے ان پر اعتبار نہیں کیا۔

"شاعرانِ پاک دل اس طرح پڑھتے ہیں نماز"

(۵) اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی نہایت اہم ہے کہ محمود ان لوگوں میں سے نہیں جو "بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے" کا رونا روتے رہتے ہیں۔

بلکہ اس کے برعکس وہ ایسے دھوم دھڑکے سے ایک ایسی بھرپور زندگی گزار چکا ہے جس کے ایک پرتو کی تمنا میں کروڑوں آدمی تڑپتے رہتے اور تڑپ تڑپ کر مر جاتے ہیں۔

(۶) اور سب سے آخری اور سب سے وزنی بات یہ ہے کہ محمود کی زندگی کا طوفانی دور اب گذر چکا ہے۔ اس کی گھومتی گھرتی، گونجتی اور گھڑگھڑاتی جوانی کا ساون ماہ و سال کے ریگستانوں میں دفن و جذب ہو چکا ہے۔

شیب کا خشک ہاتھ اسے نچوڑ چکا ہے۔ ہیجان اس سے اپنا رشتہ توڑ چکا ہے۔ اور سال خوردہ زمانہ تفکر و تامل کی جانب اس کی باگ موڑ چکا ہے۔

اور ظاہر ہے کہ زندگی کی اس پختہ و برشتہ منزل میں باد و بحر شراب، آدھ پاؤ کباب اور مطالعہ کتاب کے علاوہ اسے اب ایسی کسی ناآزمودہ لذت کی طلب ہو سکتی ہے کہ وہ یکایک اس روپے کی ہوس میں گرفتار ہو جائے جسے تمام عمر ٹھکراتا اور چٹیا تا رہا ہے۔

محمود کی ذات میں یوں تو صدہا "وہ" پائے جاتے ہیں جنھیں عرف عام میں گناہ کہا جاتا ہے لیکن وہ زندگی بھر جن دو چیزوں سے نفرت کرتا رہا ان میں سے ایک تو ہے دروغ ہے دوسری ہے زر پرستی۔

دروغ گوئی کے معاملے میں وہ زیادہ ڈینگ نہیں مار سکتا اس لیے کہ "بجرم عشق مرا می کشندہ غوغائیست" کے جان لیوا مواقع پر ایک بار نہیں، وہ اپنی قابل پرستش بیگم سے متعدد بار جھوٹ بول چکا ہے۔

البتہ جہاں تک زر پرستی کا تعلق ہے وہ سینہ ٹھونک کر اس کا اعلان کر سکتا ہے کہ اس جذبہ رکیک کا اس پر زندگی میں ایک بار بھی پرتو نہیں پڑا ہے۔ اور پڑتا بھی کیونکر، اس لیے کہ ایک "بحال ہندوش بخشم سم قند و بخارا را" قسم رند خراباتی اور مرد آزادہ رو کے سامنے جب یہ "دائن پرستی" آتی ہے تو اس کی نبضیں ساقط ہو کر رہ جاتی ہیں۔

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں
کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم!

اور اس موقع پر اگر کوئی صاحب یہ سوال اٹھائیں کہ محمود نے ہجرت سے قبل اس بات پر کیوں غور نہیں کیا تھا کہ اگر اس کا سا نمود ار شخص ہندوستان سے چلا جائے گا تو اس کے "ارباب فرقہ" کی سیاسی حیثیت اور وطنی وفاداری پر کس قدر برا اثر پڑے گا۔؟

سو محمود کی جانب سے یہ عرض کیا جاتا ہے کہ اس بیچارے نے اس مسئلے پر نہایت ہی ہمدردانہ کرب کے ساتھ غور اور بار بار غور کیا تھا اور اگر اپنی زبان اور اپنے بچوں کی تباہی کا یقین اس کا گلا نہ دبا دیتا تو وہ ہجرت کا خواب تک نہ دیکھتا۔

یہ بات بھی ہمدردی کے ساتھ غور طلب ہے کہ جن لوگوں کے سیاسی بھرم کے قائم رکھنے کی خاطر محمود اپنی آل و اولاد کو قربان کر کے ہندوستان ہی میں رہتا۔ اس کے مر جانے کے بعد کیا وہ لوگ اس کے تبرکوں کو اپنی سرپرستی میں لے کر انھیں ٹھوکریں کھانے سے محفوظ کر دیتے؟

اور اس ناجواب طلب سوال کے سامنے بھلا نتیجہ اس میں ہے کہ محمود شرم سے خود اپنا ہی سر جھکا لے۔

محمود کو معلوم ہے کہ اس کے "ارباب فرقہ" حکومت ہند پر اپنی وفاداری کا سکہ بٹھانے اور بہا سبھائی سورماؤں سے ایک سرپرستانہ تبسم وصول کرنے کی خاطر اور "تم بھی حضرت اٹھو سلام کرو" کے تحت اس پر آواز بلند سب و شتم اور بہ اعلان تبرا کرتے رہتے ہیں۔ لیکن محمود ان لوگوں کی بے چارگیوں اور دردمندیوں پر نگاہ کر کے ان کو مورد الزام نہیں ٹھہراتا ہے۔ بلکہ اس خیال سے جی ہی جی میں "یقین مانیے" خوش بھی ہوتا ہے کہ لوگ اسے برا کہہ کر اپنی بھلائی کی مہم چلا رہے ہیں۔

کس قدر مبارک ہے وہ لاش جو گاڑی نہیں گئی بلکہ جنگل میں پھینک دی گئی، اور گدا سے نوچ نوچ کر اپنا پیٹ بھر رہے ہیں۔ ع

استخواں میرے ہما کس کس مزے سے کھائے ہے۔

مخدوم محی الدین

بگھی کے پیچھے چھوکرا

"میرے بچپن میں کوئی بچپن ہی نہ تھا" (چغتائی)

دھرم ونت ہائی اسکول میرے بچپن کی قدیم درسگاہ ہے۔ اس کے موجودہ ہیڈ ماسٹر مجتبیٰ دادے پرشاد صاحب نے بہت دن پہلے اپنے مدرسہ کے رسالے کے لیے پیام مانگا تھا۔ میں اس وقت ان کی فرمائش پوری نہ کرسکا ذیل کے مضمون کو اسی دیرینہ مطالبہ کی تکمیل سمجھتا ہوں۔ (مخدوم)

اب سے ۳۹ برس پہلے ۱۹۱۸ء میں پہلی جنگ عظیم کے بعد انگریزوں کی فتح کا جشن منایا جارہا ہے، ہجوم سے انگریز بادشاہ سلامت کی درازیٔ عمر و اقبال کی دعائیں منگوائی جارہی ہیں۔ دھرم ونت ہائی اسکول کے کشادہ دالان، پیش دالان کے سامنے صحن میں مدرسہ کے سب بچے قطاریں بنا کر کھڑے ہیں۔ بڑے بچے پیچھے ہیں، چھوٹے بچے آگے ہیں کشن اور گلاب اور میں اگلی صف میں ہیں، ان دنوں شاید ہم پہلے درجے میں پڑھتے ہوں گے۔ مٹھائی تقسیم ہورہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہر بچہ کو کاغذ کا بنا ہوا جامت کی بلیڈ کے سائز کا ایک ایک یونین جیک دیا جارہا ہے۔

ہمارے ہیڈ ماسٹر جوشی اور کلاس ٹیچر مولوی جعفر علی بہت مصروف ہیں۔ ان دونوں سے ہم سب بچوں کی روح کانپتی تھی۔ بے رحم بید کی "سزا" عام تھی۔

کشن لال کسی دولت مند سیٹھ کا لڑکا تھا، گورا چٹا، صحت مند گرضرورت سے زیادہ موٹا۔ دوپہر کی چھٹی میں وہ اپنے دوستوں کو چینا اور چورن کی نارنگیاں کھلایا کرتا تھا۔ دوسرا سیاہ فام بچہ گلاب تھا۔ گولیاں کھیلنے، چھڑے سے گنا کاٹنے کے مقابلوں میں اپنے محلے کے بچوں میں سب سے پار سفا اس لیے مجھے اس پر رشک بھی آتا تھا۔ گلاب کے تعلق سے میرے ذہن میں راز اور اسرار کی فضا چھائی رہتی تھی، اس کی ماں طوائف تھی جو گھاسی میاں کے بازار میں حضرت مسکین شاہ صاحب قبلہ کے مکان سے قریب رہتی تھی۔ ان دنوں میں چمپا دروازہ میں رہتا تھا جہاں اب ہائی کورٹ ہے۔ گلاب اور میں کبھی کبھی مل کر بھی کھیلتے تھے۔

اپنی قطار میں میں نے دیکھا کہ بچے مٹھائی کھا رہے ہیں اور ان کے سینے پر یونین جیک لگا ہوا۔ میں نے جھنڈا قولیا، گردن غ

میں اپنے چچا کا یہ قول چکر لگا رہا تھا کہ "انگریز ہمارا دشمن ہے"۔ میرے مشفق چچا والد کے انتقال کے بعد میرے سرپرست اور میرے معلم تھے، وہ نیک دل، کنبہ پرور، مذہبی آدمی تھے۔ مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزوں سے نفرت اور وطن سے محبت کا سبق انھوں نے ہی مجھے پڑھایا تھا میں نے سب سے پہلے انقلاب روس اور لینن کا نام اپنے چچا کی زبان ہی سے سنا تھا۔ مجھے اب تک اچھی طرح یاد ہے کہ چچا نے ایک رات دسترخوان پر سب عورتوں، بچوں کو بالشویک انقلاب کی خبر سنائی تھی وہ خوشی اور جوش کے ساتھ کہہ رہے تھے کہ روس میں بالشویکوں نے بادشاہ کا تختہ الٹ دیا ہے، مساوات آگئی ہے، اب کوئی امیر و غریب نہیں سب برابر ہوگئے ہیں۔ اور سب ایک دسترخوان پر مل کر کھاتے ہیں، اس وقت میرے ننھے دماغ میں، اس انقلاب کی ماہیت تو کچھ سمجھ میں نہیں آئی مگر ذہن میں اس خیال کی عجیب و غریب تصویر سی تھی کہ سب لوگ جب ایک دسترخوان پر کھانے ہوں گے تو وہ دسترخوان کتنا بڑا ہوتا ہوگا؟

ان سارے خیالات ہی کا اثر تھا کہ یوں محسوس ہوا گویا انگریز کا جھنڈا کرتے پر لگانا سخت ترین گناہ کرنا ہے۔ میں نے آنکھ بچا کر چپکے سے جھنڈا زمین پر گرا دیا اور اس پر پاؤں رکھ دیا، دل دھڑک رہا تھا کہ کہیں مولوی جعفر علی اور جوشی نہ دیکھ لیں۔ مگر دل میں ہمت بھی تھی کہ اچھا کام کیا ہے۔ کشن اور گلاب نے بھی ایسا ہی کیا اور تقویت ہوئی۔

ہم نے جھنڈے کے بارے میں ایک بات بھی نہ کی، ہم سب کے ساتھ مٹھائی کھاتے رہے، وہ کشن اور گلاب معلوم نہیں اب کہاں ہیں، مگر یہ ہماری سیاسی جہاد کی بسم اللہ تھی۔

چمپا دروازہ سے یاقوت پورہ کے دروازہ سے قریب دھرم ونت ہائی اسکول تک روزانہ پیدل جانا ہوتا، اس زمانہ میں بسیں تھیں نہ سیکلیں نہ رکشا، موٹریں بھی بہت کم دکھائی دیتی تھیں۔ سڑکوں پر ہاتھی، اونٹ، بیل کی رتھیں شکرم جھٹکے، ٹانگے اور بگھیاں دکھائی دیتی تھیں۔

امیروں کے بچے بگھیوں میں آتے، ایک گھوڑے کی بگھی، بعض زیادہ امیر ہوں تو دو گھوڑوں کی بگھی، کوچوان کے ساتھ ایک اور نوکر سامنے بیٹھا ہوا، اور پیچھے دو جوان باضابطہ وردی میں کھڑے ہوئے، مٹھو بچو کی آوازیں لگاتے تھے، امیر بچوں کی حفاظت کرتے تھے ان سے کم مقدرت بچے جھٹکوں میں آتے، کچھ بچے پیدل آتے جاتے تھے۔ پیدل بچے ایسی بگھیوں کی کھوج میں رہتے جس کے پیچھے جوان نہ کھڑے ہوں، لپک کر پیچھے کے تختہ پر سہنہ کے نیچے ہاتھ لے کر پاؤں اٹھا کر لٹک جاتے، راستے کے بچوں کا اس وقت فرض عین ہوتا کہ کوچوان کو پکار کر آگاہ کریں: "بگھی کے پیچھے چھوکرا" کوچوان سامنے سے اپنا لمبا چابک بیٹھے بیٹھے اس زور سے چلاتا کہ لٹکتے ہوئے بچے کبھی مار سے بچ جاتے کبھی مار میں آکر اتر کر بھاگ جاتے، میرے لیے بھی ایسی سواری عام تھی۔

مدرسہ پیدل جانا، حفظان صحت یا صحت کے اصول کے تحت نہیں تھا بلکہ فلاشی کا نتیجہ تھا، غریب بچے کو اس سے تھکن ضرور ہوتی مگر خود اعتمادی کے علاوہ ایک فائدہ ایسا بھی تھا جو بیچارے امیر بچوں کو نصیب نہ تھا اور وہ تھا زندگی کو نزدیک سے دیکھنے کا موقع۔

شیر دل کی کمان کی بغل میں حلوائی کی دکان پر کورے کٹورے میں گرم گرم میٹھا دودھ کھڑے کھڑے صرف پیدل بچے ہی پی سکتے تھے، بگھی والے بچے اس لطف سے محروم تھے، یا ہم سوکھے حوض پر کونے والی پتنگ کی دکان پر رنگ برنگی پتنگوں کو دیکھا کرتے، گھنٹوں دیکھتے مگر طبیعت سیر نہ ہوتی تھی، بگھی والے اسے صرف دیکھنے للچاتے گذر جاتے۔

اس زمانہ میں محلہ محلہ اکھاڑے، تعلیم اور پہلوان ہوتے تھے، محلہ پرستی کا جذبہ جارحانہ شکل میں شہر بھر میں پھیلا ہوا تھا، جب کوئی بچہ ہمارے محلہ میں آجاتا تو اس سے ہمارے محلے کی "چکنی مٹی" کا نعرہ لگوائے بغیر نہیں چھوڑتے اگر نہ لگواتا ہو تو ہمیں مار پیٹ کر بھاگ جاتا ورنہ ہار ماننی پڑتی۔ دوسرے محلے میں ہماری ایسی ہی گت بنتی۔ مدرسہ جاتے ہوئے اکثر ان محلوں سے گذرنا پڑتا تھا جو سواری والے بچوں کو نصیب نہ تھا۔

چوڑی مار لمبے لمبے بانسوں کی انی پر لیسا لگا کر چڑیاں پکڑتے تو دلچسپ معلوم ہوتا۔ رنگ رنگ کی بیناؤں، طوطے، شکرے باز، بہری، تیتر، بٹیر اور کبوتروں کا نظارہ پیدا آتے جاتے ہو جاتا، راستوں پر بندر ریچھ کا تماشہ، سانپ کا سپنا ایسی دلچسپیاں تھیں جس کی وجہ سے بعض اوقات ..... مدرسہ جانے میں دیر ہو جاتی اور سزا بھگتنی پڑتی۔

مچھلی کمان اور سوکھے حوض کے بیچ میں ایک جادوگر ڈبہ لے کر بیٹھتا تھا اور مردہ لوگوں کی روحوں کے درشن کراتا تھا، اس کا بڑا شہرہ تھا، بہت بھیڑ رہتی تھی، میرے بچپن کے دل میں ایک خواہش پیدا ہوئی کہ میں اپنے مرحوم والد کو دیکھوں جن کا کوئی نقشہ میرے ذہن میں نہ تھا، گھر والوں نے مجھے پیسے نہیں دیئے، ورنہ وہ تماشہ بھی دیکھ لیتا۔

۲۹ سال بعد جب میں دیکھتا ہوں تو چمپا دروازہ سے اسکول تک کا راستہ کچھ زیادہ نہیں بدلا، سوائے اس کے کہ وہ چمپا دروازہ نہیں رہا۔ ہائی کورٹ کے کمپونڈ میں ندی کے رخ پر قریب ہی میں ایک مندر ہے جس کے صبح و شام کے گھنٹوں کی آواز اب بھی کانوں میں گونجتی ہے۔ وہیں قریب کسی بزرگ کا مزار ہے جہاں عقیدت مند آتے جاتے پیسے سلام اور ڈنڈوت کرتے تھے، میں کبھی کبھی "مجاور" بن کر عود دان کی راکھ سے ان کے ماتھے پر تلک لگاتا اور زبان پر تبرک رکھتا تھا، یہیں سے کچھ قدم فاصلہ پر چمپا دروازہ تھا، پتھر کی مضبوط فصیل میں چھوٹا سا دروازہ جس کے باہر کلال خانہ (سینڈی خانہ) تھا جہاں کا چاکنہ اتنا مشہور رہا کہ اس کے شوق میں لوگ دور دور سے آتے تھے۔

ندی میں اتنا پانی ہوتا تھا کہ فیل خانے کے ہاتھی گھنٹوں کی گھن گھن آواز اور سرخ جھول کے ساتھ آتے، ندی میں نہلاتے اور سونڈ سے پانی پھینکتے تھے۔ منظر اکیلے بچے کے لیے بہت دلچسپ تھا۔ راتوں میں یکایک شور اٹھتا پولیس کی سیٹیوں کا، ان سیٹیوں سے دل میں بے سہارا پن کا احساس پیدا ہوتا تھا۔ مجھے نفرت تھی ان آوازوں سے، یہ سیٹیاں یا تو اس وقت بجتی تھیں جب "اعلیٰ حضرت" کی سواری نکلتی تھی یا پھر کوئی ہاتھی مست ہو کر لوگوں کو روندتا پھرتا تھا۔ عجب دہشت کا عالم ہوتا، پھر کوئی اونٹ لایا جاتا اور وہ اونٹ بدمست ہاتھی کا کان دانتوں میں پکڑ لیتا اور ہاتھی کی ساری مستی اتر جاتی بھگی بلی بن کر فیل خانہ میں لے جایا جاتا مگر شاہی سواری کا کوئی علاج نہ تھا۔

صبح شام ہائی کورٹ بنانے والے مزدوروں ہی میں رہنا ہوتا تھا، پتھر توڑتے ہوئے مزدوروں کا ڈیرا لگا کر بڑی بڑی بھاری بھرکم سلوں کو ڈھونے والے مزدور ہزاروں کی تعداد میں گرد کے اطراف رہتے تھے۔ سفید پتھر، لال پتھر گنبدوں کے پتھر، دیواروں اور جالیوں کے پتھر، کمانوں کے پتھر، چٹخ پٹخ، ٹخ ٹخ، ٹھن ٹھن کی ہزاروں آوازیں ایک ساتھ اٹھتیں، مزدوروں کے ہتوڑوں اور آریوں کے کراؤ کی آوازیں ایک عجیب آرکسٹرائی کیفیت پیدا کرتی تھیں، دھوپ، بارش سردی کوئی موسم ہو کام نہیں رکتا تھا۔ جب مزدور ہتوڑا اٹھا کر پتھر پر لگی ہوئی آری کو پوری طاقت سے مارتا تو اس کے کشتی رنگ کے بازوؤں کی بنی ہوئی مچھلیاں تھرک تھرک جاتی تھیں، میں گھنٹوں یہ منظر دیکھتا۔ . . . . . تا وقتیکہ میرے میزبان کی دوسری بیوی جن کے ہاں میں مقیم تھا چلا چلا کر نہ بلاتی "ارے بابا سودا لانا ہے، نل سے پانی بھرنا ہے"۔

وہ ایسا زمانہ تھا کہ ایک بڑے پیسے میں ناشتہ ہو جایا کرتا تھا۔ نئے پل کے پاس مغل کا ہوٹل تھا۔ مغل کا ہوٹل بجلی کی روشنی میں بھلا معلوم ہوتا تھا۔ بڑے بڑے قد آدم آئینے اور دیواروں پر جگہ جگہ گوری گوری خوبصورت ولایتی میموں کی رنگین تصویریں بڑی جاذب نظر ہوتیں، ایک پیسہ کی تنوری روٹی، دو پیسے کی نہاری ایک بچے کے لیے کافی ہو جاتی۔ دو وقت کے مدرسوں کے زمانے میں لنچ" کا مسئلہ کافی اہم بن جاتا تھا، دوپہر کا کھانا نہیں ملتا تھا، اکثر بچے مدرسے کے باغ میں نارنگی، موسمبی، سپاری اور کھجور کے درختوں کے سائے میں بیٹھ کر توشہ دان کھولے کھانا کھایا کرتے۔ ایک بچہ جس کا نام یاد نہیں بعض اوقات مجھے اپنے ساتھ کھلا لیتا مگر عموماً چھٹی ہی میں مدرسہ سے باہر سیر کرنے چلا جاتا۔

یاقوت پورہ کے دروازہ کے باہر ایک کلال خانہ تھا جو دن رات آباد رہتا تھا، گوشت، کباب اور کلیجی بھوننے کی مہک راستہ پر پھیل جاتی چھٹی میں میں اکثر اس راستہ پر پایا جاتا، کبھی کبھی کر مہک کا لطف اٹھاتا اور یہی تھا میرا "لنچ"۔

"نوائے آزادی" (تحریک آزادی میں اردو کا حصہ)

۱۸۵۷ء کی جدوجہد سے متعلق شاہی رقعات سے لے کر ۱۹۵۰ء تک کے مکمل حالات۔ ایک بے نظیر ادبی پیش کش اور مستند تاریخ۔ جدید ٹائپ کی مدد سے چھاپی گئی۔ (۴۵۰) صفحات پر مشتمل ایک بہترین کتاب۔

★ عمدہ کاغذ ★ عمدہ طباعت ★ اچھوتا گرد پوش

قیمت:- پانچ روپے عمدہ جلد۔ چار روپے معمولی جلد

مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار دہلی سے طلب فرمائیے

ابوظفر عبدالواحد

ایجاز کارے

اردو میں دریا کو کوزے میں بند کرنے کا محاورہ زبان زدِ خاص و عام ہے۔ لیکن دریا کو کوزے میں بند کرنا محض شاعرانہ ڈیمنگ ہے جس کا عقل و ادراک کی ترازو میں پورا اترنا ضروری نہیں۔ تاہم چست نگاری اور ایجاز بیانی کی ایک خاص صنف میں جسے "ایپی گرام" (ایجاز کارہ) کہتے ہیں، یہ اعجاز ناممکنات سے نہیں ہے۔ مزید توضیح کی ضرورت ہی کیا۔ جب کہ اس صنف کے بہترین فن کار کے ہاں سے کچھ نمونے آپ کی ضیافت کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔

آسکر وائیلڈ نے ایک جگہ دعویٰ کیا ہے کہ اس نے سارے نظامِ ہستی کو چند فقروں میں اور کل کائنات کو اپنے ایجاز کاروں میں نظر بند کر دیا ہے۔ حیات اور مسائلِ حیات کو اس اختصار اور چابک دستی کے ساتھ قلم بند کرنا واقعی کمال ہے۔ بے محل نہ ہوگا اگر اس کی تصانیف کے مختلف مقامات سے ان ایجاز کاروں کو چن کر الگ الگ ابواب یا عنوانوں کے تحت ایک نظر فریب مرقع پیش کیا جا سکے۔ اس سے وائیلڈ کے دعوے اور اس کی فن کارانہ بلندیوں کا ہمیں اندازہ ہو سکے گا۔

اسی خیال کے مدِ نظر میں آسکر وائیلڈ کے ایجاز کاروں کو مختلف مقامات سے چن کر بہ لحاظ موضوع الگ الگ شقوں میں پیش کر رہا ہوں۔ تاکہ زندگی، مسائلِ زندگی اور سماج کے متعلق وائیلڈ کی تنقیدی اور ان کے بارے میں اس کے فنکارانہ مسلک اور زاویۂ نگاہ کا صاف اور صریح اندازہ آپ کو ہو سکے۔

۱

اس شق میں عام اور روزمرہ حقائق کو انوکھے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایجاز کارے ایک طرح کے چٹکلے ہیں جن میں لطفِ زبان اور لطیف مزاح کے سوا کوئی خاص بات نہیں جو دعوتِ فکر کا سامان بن سکے۔ لیکن پھر بھی ہیں خاصے کی چیز۔

پہلا ایجاز کارہ ہی بڑے مزے کا ہے اور اپنے آنے والے ساتھیوں کی غمازی کرتا ہے۔ اس شق کے ایجاز کاروں کو میں نے "حقائق و افسوں" کا عنوان دیا ہے۔ اب کلیدی ایجاز کارے کے تیور دیکھئے۔ اس کے بعد اس پلٹن کے اور بھی ساتھی آئیں گے۔

ــ حقائق کی نٹ کھٹ بازی گروں کا کھیل ہے۔ ہستی کا جتنا وُسعت زیادہ ہوگا، یہ تماشہ اتنا ہی نظر فریب ہوگا۔

ــ زندگی کا پہلا فریضہ یہ ہے کہ انسان جہاں تک بن پڑے بناوٹی بنے۔ دوسرا فریضہ کیا ہے؟ یہ ابھی تک کسی نے معلوم نہیں کیا۔

ــ لوگ اُس چیز کے دینے میں بڑے فیاض نظر آتے ہیں جس کی خود انھیں ضرورت نہیں ہوتی۔

ــ آج کل لوگ ہر شے کی قیمت جانتے ہیں مگر قدر نہیں جانتے۔

ــ جذبات سے فائدہ یہ ہے کہ وہ ہمیں گمراہ کر دیتے ہیں۔ اور سائنس سے یہ فائدہ ہے کہ ہم جذبات سے عاری ہو جاتے ہیں۔

ــ صداقت، صداقت نہیں رہتی اگر ایک سے زیادہ کا اس پر ایقان ہو۔

ــ بوڑھے ہر ایک چیز مان لیتے ہیں۔ ادھیڑ ہر چیز پر شبہ کرتے ہیں۔ جوان ہی سب کچھ سمجھتے اور جانتے ہیں۔

ــ اوچھے خود کو پا لیتے ہیں۔ وہ انسان ہی کیا جو تھوڑا بہت ڈانواں ڈول نہ ہو۔

ــ زود رس کم رس، جوانی کا رس ہے۔ وہ جوان نہیں جس کی نگاہیں دور رس نہیں۔

ــ عشق کی ابتدا؟ خود فریبی۔ اس کی انتہا؟ آشنا فریبی۔ یہ ہے وہ عریاں حقیقت جس کو جدید لغت میں "رومان" کہتے ہیں۔

ــ بچے ماں باپ کو چاہنے سے ابتدا کرتے ہیں۔ بڑھ کر وہ ان کا محاسبہ کرنے لگتے ہیں۔ کبھی کبھار انھیں معاف بھی کر دیتے ہیں۔

ــ امتحانات ایک سرے سے دھوکے کی ٹٹی ہیں۔ وہ بھلا مانس ہے اسے آنکنے کی ضرورت نہیں، وہ سب کچھ جانتا ہے۔ اور جو بھلا مانس نہیں، اس کے لیے کچھ نہ جاننا ہی بھلا۔

ــ انسان جب کبھی احمقانہ حرکت کرتا ہے، اس کی نیت ہمیشہ نیک ہوتی ہے۔

ــ کبھی یہ نہ کہو کہ زندگی میں کچھ باقی نہیں رہا۔ اس سے سدا یہ گمان ہوتا ہے کہ تم میں کچھ باقی نہیں رہا۔

۲

اس شق کا عنوان میں نے "نرناری" رکھا ہے۔ اس لیے کہ اس عنوان کی ذیل میں آنے والے ایجاز کارے معرکۂ خیر و شر کے دو زبردست اداکاروں سے متعلق ہیں۔ قدرت کی یہ سب شعبدہ بازی پھیکی ہی رہتی اگر یہ مائل شر بندۂ آدم و حوّا کے یہ جائے، دنیا کے اسٹیج پر اپنا اپنا پارٹ ادا کرنے کے لیے بطور خاص بھیجے نہ جاتے۔ وائلڈ کی ایجاز کاری یہاں اپنے شباب پر نظر آتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:-

ــ عورتیں بس زینت کی جنس ہیں کہنے کے قابل کوئی بات ان کے پاس نہیں ہوتی۔ لیکن کہنے کا ڈھب

ضرور دلکش ہوتا ہے۔ عورتیں انسانی ذہن پر مادّے کی فتح کا نشان ہیں۔

ــــ عورتیں غضب کی عمل آشنا ہوتی ہیں۔ مرد اس معاملے میں پھسڈی ہوتا ہے۔ چاہت کے وقت ہمیں بیاہ برات کی سُدھ نہیں ہوتی۔ اس کی پہل سدا عورت کی جانب سے ہوتی ہے۔

ــــ عورتیں حملے سے خود کو بچاتی ہیں، جس طرح اچانک اور انوکھی رضاجوئی سے حملہ آور ہوتی ہیں۔

ــــ عورتیں ہم میں چاہت پیدا کرتی ہیں۔ اس امانت کے واپس لینے کا بھی انھیں حق حاصل ہے۔ تم کہو گے یہ بالکل سچ ہے لیکن یہ جانتے ہو کہ بالکل سچ کوئی چیز نہیں۔

ــــ یہ امریکی ناریاں پھر اپنے دیس ہی میں کیوں نہیں رہتیں؟ سدا یہی کہتی ہیں کہ اُن کی جنم بھومی عورتوں کے لیے بہشت ہے۔ وہ ٹھیک کہتی ہیں۔ جب ہی تو حوّا کی طرح بہشتی بننے کے لیے نت نئے بَن کیا کرتی ہیں۔

ــــ امریکی لڑکیاں اپنا حسب نسب چھپانے میں استاد ہیں لیکن انگلستان کی سندریاں کب ان سے ہٹتی ہیں۔ وہ بھی اپنا ماضی چھپانے میں لاجواب ہیں۔

ــــ عورتیں مردوں کی خامیوں سے عشق رکھتی ہیں۔ ہماری خامیاں سلامت ہیں تو وہ سب کچھ درگذر کردیں گی حتیٰ کہ ہماری خوبیاں بھی۔

ــــ بیاہی زندگی میں تین سے دلبستگی رہتی ہے۔ اور دو سے؟ صرف تشفی۔

ــــ شکر رنجی اور غلط فہمی بیاہی زندگی کے روزمرّہ وظائف ہیں۔

ــــ عورتیں تھک جاتی ہیں، سیر نہیں ہوتیں۔ مرد بوڑھے ہو جاتے ہیں، نیک نہیں ہوتے۔

(۳)

اس شق میں "مذہب و اخلاق" سے متعلق کچھ ایجاز کارے پیش کیے جائیں گے۔ آسکر وائیلڈ بظاہر منکرِ دین و اخلاق معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ اُس کی روش معاندانہ ہے میرے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے، وہ جہاں کہیں چوٹ کرتا ہے اس چوٹ کی تہ میں محض حسنِ بیان اور اپنی انوکھی روش کا لطیف سا مظاہرہ کرتا ہے۔ خود ہمارے شعرا جب دین و مذہب پر چوٹیں کرتے ہیں تو ان کا نشانہ اصل میں وہ بنے ہوئے دیندار ہوتے ہیں جو "چون بہ خلوت می روند، آں کارِ دیگر می کنند"

خیر، حقیقت کچھ ہی ہو۔ میں یہاں ایسے ایجاز کارے پیش کروں گا جو ہمیں مذہب و اخلاق کے بارے میں ظریفانہ مگر صحت و رانداز میں دعوتِ فکر و نظر دیتے ہیں۔ نزاعی اور معاندانہ مباحث سے ہمیں دور رہنا چاہیے۔ ملاحظہ کیجیے چند ایک ایجاز کارے:-

ــــ معصیت اور سیہ کاری ایک افسانہ ہے جو نیکوں نے ان لوگوں کی توجہ کے لیے گھڑ رکھا ہے جو اپنے اندر

ایک پُراسرار کشش رکھتے ہیں۔

—— کسی مذہب کو جھٹلانا اور ثابت کرنا ہی اس کی موت ہے۔

—— جن چیزوں کے بارے میں کچھ ایقان سا ہوتا ہے، سدا جھوٹی ہوتی ہیں۔ عقیدے اور رومان کی نمود ایک ہے۔

—— میں کسی چیز کو پسند یا ناپسند نہیں کرتا۔ زندگی کو پرکھنے کا یہ نہایت نازیبا طریقہ ہے۔ ہم دنیا میں اخلاق کی وبا پھیلانے کے لیے نہیں بھیجے گئے۔

—— انسان شاد ہوتا ہے تو سدا نیک رہتا ہے۔ لیکن نیک ہوتا ہے تو سدا شاد نہیں رہتا۔

—— روح اور جسم، جسم اور روح قدرت کی کیسی چستانیں ہیں۔ جو لوگ روح اور جسم میں فرق پاتے ہیں، وہی ہیں جو دونوں نہیں رکھتے۔

—— بعض عورتیں مذہبیت میں پناہ لیتی ہیں۔ مذہب کے غواص میں غمزے کی شان ہے۔

—— صرف روح کیا معنی؟ حواس ظاہری سے بھی روحانی اسرار منکشف ہو سکتے ہیں۔ ذہن کی کوئی ادا، کوئی کیفیت ایسی نہیں جس کو رنگ و بو کی بھینی ادا میں بیان نہ جا سکے۔ عنبر و عود کو سونگھ کر بھی انسان صوفی بن سکتا ہے۔

—— سچ بولنا تکلیف دہ چیز ہے، اور جھوٹ بولنے پر مجبور ہونا اور بھی تکلیف دہ۔

—— اعمال، زندگی کا پہلا جزو نہیں ہیں۔ الفاظ، دوسرا!

(۴)

"اشتراکیت اور آزادی" کے نعروں سے فضائے عالم آج کل گونج رہی ہے۔ نامناسب نہ ہوگا۔ اگر اس موضوع پر آسکر وائیلڈ کے کچھ ایجاز کارے اس کی مشہور کتاب "روح انسان" سے چن کر آپ کی ضیافت کے لیے پیش کیے جائیں۔

—— اشتراکیت سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ اس کی بدولت محض اوروں کی خاطر بدمزگی کے ساتھ زندگی بسر کرنے سے ہمیں نجات ملے گی۔

—— اکثر کہا جاتا ہے کہ غریب لوگ داد و دہش اور سخاوت کے احسان مند ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعضے ہوتے ہیں، لیکن بہتیرے نہیں ہوتے۔ وہ سدا ناشکرے، ناقابل، نافرمان، اور بغاوت شعار رہتے ہیں۔ آخر وہ شکر گزار کیوں ہوں، اگر کسی دھن وان کے دسترخوان سے کچھ بچا کھچا انھیں مل جاتا ہے۔

—— کسی شہری یا دیہاتی مزدور کو کفایت شعاری کا درس دینا بے حمیتی اور بے اخلاقی ہے۔ مزدوروں کو چاہیئے کہ وہ گھٹیا درجے کی زندگی بسر کرنے سے صاف انکار کر دیں، اور یا تو چوری کریں، یا پھر شرح مزدوری کو بڑھوانے پر اڑ جائیں۔ رہ گئی بھیک؟ سو بھیک میں وہ عافیت ہے جو چوری میں نہیں۔ لیکن چوری میں جو صفائی ہے وہ مزدوری میں نہیں۔

ـــ بعض اوقات غریبوں کے کفایت شعار ہونے کی بڑی تعریفیں ہوتی ہیں لیکن غریبوں کی کفایت شعاری کو سراہنا حد درجے مذموم اور برمحل توہین کے ہے۔ یہ حرکت ایسی ہی ہے جیسے کسی فاقہ کش کو کسی کا یہ مشورہ کہ وہ کم کھائے۔

ـــ بعض اشتراکی عقائد جن سے دوچار ہونے کا مجھے اتفاق ہوا ہے، آمرانہ تخیل سے داغ دار نظر آتے ہیں۔ حکومت اور دباؤ کی بے دخلی، اشتراکیت کی اولین شرط ہے۔

ـــ حکومت کے تمام سانچے نکمے بشمول حکومت ہر ایک کے حق میں، یہاں تک کہ خود فرماں روا کے لیے بھی ناروا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ جمہوری حکومت سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ لیکن جمہوریت بھی ایک طرح کا "لٹھ راج" ہے جس میں کندوں پر کندے سے کندوں کی حکومت ہوتی ہے۔

ـــ لوگ بعض اوقات سوال کرتے ہیں کہ فن کار کے لیے کونسی حکومت بھلی ہو سکتی ہے۔ اس کا ایک ہی جواب ہے۔ فن کار کے لیے وہی حکومت بھلی جہاں کوئی حکومت نہ ہو۔ فن کار پر حکمرانی مضحکہ خیز ہوتی ہے۔

۶

اس شق کی بہار بھی ملاحظہ ہو۔ یہ آسکر وائلڈ کا خاص میدان ہے جس میں اس نے ادب اور آرٹ کا اپنے خاص الخاص انداز میں محاسبہ کیا ہے۔ اسلوب میں جو شگفتگی، ندرت اور دل کشی ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے

ـــ آرٹسٹ کے پاس اظہار اور صرف اظہار ہی زندگی کی آن ہے۔

ـــ آرٹ مبالغے ہی کا ایک روپ ہے۔ اور انتخاب جو اصل میں آرٹ کی جان ہے، شدت تاکید کا ایک مبالغہ آمیز سانچہ ہے۔

ـــ آرٹ اس سے بھی زیادہ مجرّد ہے جتنا کہ ہم نے اسے سمجھ رکھا ہے۔ روپ اور رنگ محض رنگ روپ ہے۔ دیکھا یہی گیا ہے کہ فن اپنے فن کار کا پردہ دار ہوتا ہے۔ غماز نہیں ہوتا۔

ـــ آرٹ کا عمل پر اثر نہیں پڑتا۔ وہ خواہش عمل کو نیست و نابود کر دیتا ہے۔ فن کی بڑی خوبی ہے بے ثمری۔

ـــ تخلیق کی ساری لذت کسی فنکار کی محض ذات سے وابستہ ہوتی ہے، اور محض اس لذت کی خاطر کوئی چیز تخلیق کی جاتی ہے۔ میں اس لیے لکھتا ہوں کہ لکھنے میں مجھے انتہائی فنکارانہ لذت ملتی ہے۔

ـــ کوئی فنکار اشیا کو ٹھیک اسی طرح نہیں دیکھتا جس طرح کہ وہ ہوا کرتی ہیں۔ جہاں اس نے ایسا کیا، فنکار نہیں رہتا۔

ـــ لوگ کہتے ہیں کہ آرٹ ہمیں فطرت آشنا اور اس کے اسرار کو ہم پر آشکارا کرتا ہے۔ لیکن میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ آرٹ کا مطالعہ جتنا گہرا ہوگا فطرت اتنی ہی اوچھی اور کم مایہ نظر آئے گی۔

ـــ زندگی جب آرٹ پر چھا جاتی ہے تو آرٹ کو کسی خرابے میں منہ چھپانا پڑتا ہے۔ حقیقی تنزل یہ ہے

جس کے لوگ آج کل شکار ہیں۔

ـــ حقائق کی ہولناک پرستش کی مناسب روک تھام اگر نہ کی گئی تو آرٹ پھر کبھی بارآور نہ ہوگا اور سپنسار ہمیشہ کے لیے حسن سے محروم ہو جائے گا۔

ـــ موسیقی داں بڑے نادان ہوتے ہیں۔ سدا یہی چاہتے ہیں کہ کوئی گونگا بن کر انھیں سنا کرے، جبکہ سننے والے کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ وہ بہرا ہو جائے۔

ـــ موسیقی انسان کے سامنے ایسا ماضی لے آتی ہے جس سے وہ ناآشنا تھا۔ اور ایسے آلام سے بھی روشناس کرتی ہے جو آنسوؤں کی اوٹ میں چھپے تھے۔

ـــ لوگ بعض اوقات کہتے ہیں کہ حسن سطحی ہوتا ہے۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو، لیکن اتنا سطحی تو نہیں ہوتا جتنا کہ فکر و مراقبہ۔

ـــ چھاپے کی ایجاد کے بعد سے لوگوں میں چھپی ہوئی خبروں کو پڑھنے اور آنکھوں کی وساطت سے معنی اور مطالب کو گھورنے کا مرض آج کل عام ہو رہا ہے۔ یونانیوں کے ہاں ایسا نہ ہوتا تھا۔ وہ تحریر کو اپنی واردات قلبی کو قلم بند کرنے کا محض ایک وسیلہ سمجھتے تھے۔ ان کے ہاں مطالب کے جوہری کان ہوتے تھے نہ کہ آنکھیں۔ ہر لفظ کی معنویت، اس کا ترنم آواز کے کانٹوں پر تلتا تھا۔ آواز کسوٹی تھی اور کان جوہری۔

ـــ زندگی اور آرٹ کا مطالعہ جتنا گہرا ہوگا، اتنا ہی شدت کے ساتھ یہ محسوس ہوتا جائے گا کہ ہر انوکھی شے کے پیچھے کسی کی شخصیت چھپی ہوتی ہے۔ نیز یہ کہ انسان گھڑی اور آن کا آفریدہ نہیں ہوتا بلکہ زمانہ اس کی مٹھی میں ہوتا ہے۔

ـــ آج کل لوگوں کو رسائل اور اخباری خرافات پڑھنے کا مرض ہے۔ ارباب صحافت کی یہ پیداوار سرے سے بے مایہ اور مہمل ہے۔ یہی حال جدید ادب کا ہے۔ کٹ پوتلیے، ٹٹ پونجیے کو تنقید کی ترازو میں تول رہے ہیں اور نااہل نااہلوں کی قصیدہ خوانی میں مشغول ہیں۔ یہ ہے تماشہ جو انگلستان کی فنکارانہ سرگرمی گاہ و بے گاہ ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔

ـــ میرا کہنا یہ ہے کہ ادب کے فرائض میں یہ داخل ہے کہ روزمرّہ زندگی اور زندگی کے کچے مال مسالے سے ادیب ایسی دنیا پیدا کرے جو ہماری اس دنیا سے زیادہ انوکھی، بارونق، پائدار اور نیکی ہوتا کہ ایک عامی بھی اس سے اپنی سرشت کی تکمیل کر سکے۔

ـــ میرا یہ ایقان ہے کہ ایک فن کارانہ تخلیق سرانجام پانے کے بعد وہ اپنا ایک منفرد وجود اور مقام حاصل کر لیتی ہے۔ اور اس کا امکان بھی ہے کہ بنانے والے کی مرضی اور غایت کے برخلاف وہ کوئی نیا سندیس سنائے۔ انسان کی قلبی واردات کی طرح حسن کے معنی بھی انتہا ہوتے ہیں۔ حسن کے نکتے نقطوں سے باریک ہوتے ہیں۔ حسن سب کچھ ظاہر کرتا ہے اس لیے کچھ ظاہر نہیں ہوتا۔

ـــ نقاش کا میدان، ادیب اور شاعر کے میدان سے مختلف اور محدود ہوتا ہے۔ زندگی اپنی پوری معنویت کے ساتھ شاعر کے سامنے آتی ہے۔ نہ صرف اس حسن کے ساتھ جس پر لوگوں کی نگاہیں ہوا کرتی ہیں، بلکہ اس حسن کے ساتھ بھی جو کانوں میں امرت ٹپکاتا ہے۔ چہرے مہرے کے موقتی بناؤ سنگھار اور رنگوں کے عارضی بانکپن کے ساتھ ہی نہیں بلکہ احساس کی پوری شدت اور فکر کی پوری توانائی کے ساتھ۔

ـــ اکثر کہتے سنا ہے کہ ایک آرٹسٹ کی زندگی کا حزنیہ یہ ہے کہ وہ اپنا نصب العین نہیں پاتا۔ میری رائے میں کسی آرٹسٹ کا حزنیہ یہ ہے کہ وہ اپنا نصب العین قطعیت کے ساتھ پالے۔ نصب العین جہاں پالیا گیا، اس کی حیرت اور چونکنی ختم ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موسیقی آرٹ کا بھرپور نمونہ ہے۔ موسیقی اپنا آخری بھید کبھی نہیں بتاتی۔

ـــ آرٹ اپنے ادھورے پن ہی کی بدولت انسان کی جمالیاتی حس کو موہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جمالیاتی نقاد آرٹ کی ان اصناف کو جو محض سطحی اور غیر ایمائی ہوتی ہیں، سر و کار نہیں رکھتا۔ اسے ایسی چیز کی تلاش ہوتی ہے جو اپنی ابہائیت کی بدولت فکر و مراقبے کا سامان فراہم کرے، جس کے حسن کی بے شمار توجیہیں ہوں اور کوئی توجیہہ آخری اور قطعی نہ ہو۔

ـــ آرٹ حسن کا گیان ہے۔ ریاضی سچائی کا۔

(۶)

آخری شق کا ماجرا بہت ہی دردناک ہے اور سبق آموز بھی۔ سماج سے گاہ و بے گاہ کی چھیڑ چھاڑ رنگ لا کر رہی اور آسکر وائیلڈ نے وہ سب کچھ دیکھا جو دنیا کے ادب کا سانحۂ عظیم کہا جا سکتا ہے۔ خود وائیلڈ کو اپنے عبرتناک انجام کا دھندلا سا احساس تھا۔ چنانچہ اس کے یہ الفاظ بہت پہلے سے اس امر کی نشان دہی کرتے ہیں جب کہ شان گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ اس کی جراتِ گفتار و کردار کا اس بے دردی کے ساتھ محاسبہ کیا جائے گا۔ اس نے بہت پہلے کہا تھا کہ "اعمال، زندگی کا پہلو حزنیہ ہیں۔ الفاظ، دوسرا۔"

اس شق کے تمام ایجازکارے اس طویل خط سے لیے گئے ہیں جو "دردبھری روئداد" (DE PROFUNDIS) کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع کیے گئے تھے۔ پورا خط برطانوی عجائب گھر میں محفوظ ہے، اور غالباً ۱۹۶۰ء میں اس کی اشاعت عام کر دی جائے گی۔ یہ بڑی معلومات آفرین اشاعت ہوگی، اس لیے کہ "دردبھری روئداد" میں اس مہتمم بالشان خط کے بعض حصے مصلحتاً حذف کر دیے گئے تھے۔ بہرحال اس دردبھری داستان کا جستہ جستہ احوال ان ایجازکاروں سے سنیے:-

ـــ میری زندگی کے دو انقلابی موڑ ہیں۔ ایک وہ جب کہ میرے باپ نے مجھے آکسفورڈ بھیجا۔ دوسرا وہ جب کہ سماج نے مجھے جیل میں جھونکا۔

ـــ میری ٹریجڈی دیر تک چلتی رہی۔ اس کا نقطۂ کمال، ختم ہو چکا۔ اس کا خاتمہ، ہنوز ذلیل ہے۔ خوب جانتا

ہوں کہ جس وقت اس خاتمے کا سر انجام ہوگا، مجھے ایک ایسی دنیا کی طرف لوٹنا ہوگا جہاں کسی کو میری ضرورت نہ ہوگی طویل قید سے میرے چہرے پر ہوائیاں اڑتی ہوں گی اور غم و درد سے میرا حلیہ ہی کچھ اور ہوگا۔

—— جیل کی زندگی ہر شے کو اس کے اصلی روپ میں پیش کرتی ہے۔ جب ہی تو آدمی پتھر ہو جاتا ہے۔ جیل کے باہر رہنے والے، زندگی کی چہل پہل کے مغالطے میں آجاتے ہیں۔ وہ زندگی کے چکر کے ساتھ گھومتے اور اس کی غیر واقعی فضا میں گھل مل جاتے ہیں۔ ہماری طرح جمود کی زندگی بسر کرنے والے ہی سب کچھ دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔

—— وہ بیتا جو مدت ہوئی تم بھول بھال گئے ہوگے، یا بہ آسانی بھول سکتے ہو۔ مجھ پر آج بھی گذر رہی ہے اور کل بھی گذرے گی۔ یہ بھید اگر تم نے پالیا، تو پھر تمھارے لیے یہ سمجھنا دشوار نہیں کہ میں کیوں اور کس لیے اس انداز میں لکھ رہا ہوں۔

—— دردمندی ایک طویل آن ہے۔ ہم اسے رُتوں اور موسموں میں بانٹ نہیں سکتے۔ ہم صرف اس کی نیرنگیاں دیکھتے، یا زیادہ سے زیادہ ان نیرنگیوں کی آمد کا وجدان کر سکتے ہیں: وقت، جسے لوگ رواں اور گذراں کہتے ہیں، ہماری نگاہوں میں گذرتا ہوا نہیں بلکہ رینگتا بلکہ لفظ 'درد' کے گرد طواف کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

—— اور بھی بدنصیب لوگ ہیں جو جیل میں جھونکے جانے کے بعد دنیا کے مزوں اور دل کشیوں سے اگر محروم کر دیئے جاتے ہیں، تو کم سے کم دنیا والوں کی لعن طعن سے بچے تو رہتے ہیں۔ وہ، اطمینان کے ساتھ اپنی کال کوٹھری میں منہ تو چھپا سکتے ہیں اور ذلت و خواری ان کے حق میں حریم عافیت بن جاتی ہے۔ میرے نصیب میں یہ بھی نہیں۔

—— وقت نے ابھی ایک گھاؤ پر پھایا بھی نہ رکھا تھا کہ وکیلوں کے سخت سست خطوں کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔ اور بعضے بیدردی کے ساتھ افلاس اور خانہ خرابی کی بھی دھمکیاں دے رہے ہیں۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں۔ لیکن قانونی . . . چارہ کار کے ذریعے میرے بچے مجھ سے چھڑا دیئے جائیں، یہ ایک ایسا قلق ہے جو میرے دل سے کبھی دور نہ ہوگا۔ قید کی ذلت اس قلق اور کوفت کے آگے ہیچ ہے۔

—— اب میں محسوس کرتا ہوں کہ میری سرشت کی گہرائیوں میں ایک چیز پوشیدہ ہے جو بہ زبان حال مجھ سے کہہ رہی ہے کہ دُنیا کی کوئی شے، خصوصاً دردمندی بے معنی نہیں ہوتی۔ میری سرشت کی گہرائیوں میں بسنے والی یہ چیز، یہ بلند نشیں خزانہ کیا ہے؟ میری فروتنی۔ یہی وہ چیز ہے جو سب کچھ لٹ جانے کے بعد میرے پاس رہ گئی ہے۔ یہی حاصلِ حیات ہے۔

—— میں کبھی وہ تھا کہ میری ہستی اپنے عہد کے فن اور شائستگی کا نشان تھی۔ میں نے یہ بزرگی اپنی زندگی کے عنفوان میں حاصل کی تھی۔ کم لوگ ہیں جنھیں اپنے جیتے جی یہ رتبہ ملتا ہے اور اُن کی برتری کا اس طرح اعتراف ہوتا ہے۔

—— ایک گھاؤ نے جیل میں ادنیٰ قیدیوں کے ساتھ اسیر رہنے کا مجھے دکھ نہ ہونا چاہیئے۔ اور گو بظاہر یہ ایک عجیب سی بات لگتی تاہم مجھے اپنے نفس پر تربیت دینی ہے کہ مجھے اس سے شرمندہ نہ ہونا چاہیئے۔ جو کوئی اپنے ہمزاد سے پشیمان ہو اسکے لیے یہی بہتر ہوگا کہ وہ سزا نہ پاتا۔

—— میں اب محسوس کر رہا ہوں کہ الم، بہ حیثیت ایک ہمہ گیر جذبے کے جس پر انسان قابو پا سکتا ہے، ایک بڑھیا فن کا نشان ہے۔

—— دُکھ خوشی کی طرح ڈھونگی نہیں ہوتا۔ آرٹ میں سچی چیز وہی ہے جو اپنی ذات کے ساتھ مربوط اور ہم آہنگ ہو، اور جس کا بیرونی پہلو درونی کیفیت کا آئینہ دار ہو۔

ڈاکٹر حفیظ قتیل

غزل کے غیر عشقیہ موضوعات

"غزل اور مسائل" کے نام سے ڈاکٹر حفیظ قتیل کی کتاب بہت جلد شائع ہوگی۔ یہ کتاب تقریباً لکھی جا چکی ہے۔ ہماری استدعا پر قتیل صاحب نے وعدہ کر لیا ہے کہ وہ اپنی تصنیف کا ایک ایک باب (جو اپنی جگہ مضمون کی حیثیت رکھتا ہے) "صبا" کی ہر اشاعت میں دیں گے۔ اس کے لیے ہم ان کے ممنون ہیں (ایڈیٹر)

یوں تو غزل انسانی حسن و عشق کی کیفیات و واردات کو بیان کرنے کے لیے وضع ہوئی اور آج تک بھی اس صنف سخن کا دامن اس موضوع سے بندھا ہوا ہے لیکن ایران میں غزل کا آغاز ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ تصوف کی اشاعت شروع ہو گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابتدا ہی سے غزل میں مادی اور مجازی حسن و عشق کے ساتھ حقیقی اور ماورائی حسن و عشق کی باتیں بھی کی جانے لگیں۔ وہی زبان وہی زبان کے تیور وہی تشبیہات و استعارات وہی اشارات و علامات غرض فن اظہار کی وہ پوری روایت جو انسانی حسن کی عکاسی اور انسانی محبت کے اظہار کے لیے وجود میں آئی تھی شاہد حقیقی کی تجلیات اور عشق حقیقی کے احوال و مقامات کو بیان کرنے کے لیے کچھ اس طرح استعمال ہونے لگی کہ زبان و اسلوب کی یکسانیت اور کیفیات و واردات کی مشابہت کے باعث شاعر کے محبوب کو پہچاننا مشکل ہو گیا لیکن تصوف محض شاہد حقیقی کی پرستش نہیں تھا وہ تو مرتب نظام فکر تھا۔ ذات و صفات کی ماہیت کیا ہے۔ خالق و مخلوق میں کیا ربط ہے۔ کائنات کیسے وجود میں آئی۔ زندگی کیا ہے۔ ہم حادث ہیں یا قدیم۔ ہم مجبور ہیں یا مختار۔ انسان کی تخلیق کا مقصد کیا ہے۔ صعود و نزول کے مراتب کیا ہیں۔ فنا و بقا کیسے حاصل ہوتی ہے یہ اور ایسے بیسیوں مسائل سے تصوف بحث کرتا ہے اس لیے لازمی طور پر یہ مسائل سمٹ کر غزل میں آ گئے۔ اس طرح غزل تصوف کے توسط سے زندگی کے فلسفیانہ مسائل سے بھی دوچار ہوئی مگر چونکہ ایران اور ہندوستان دونوں ملکوں میں تصوف کو سیاسی ادبار و انتشار کے حالات میں فروغ ہوا اس لیے فارسی اور اردو غزل میں جو صوفیانہ تصورات آئے ان پر یہ ناسازگار حالات بھی اثر انداز ہوئے چنانچہ زندگی کے بارے میں صوفی شعرا کا تصور بہت منفعل اور فراری ہو گیا، جیسے زندگی بے ثبات ہے۔ حیات دنیوی ایک خواب ہے۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے مشیت الٰہی سے ہو رہا ہے اس لیے ناسازگار حالات کا مقابلہ کرنے کی بجائے

ناسازگار حالات سے سازگر کرلینا چاہیئے۔ زندگی کی نعمتوں کو حاصل کرنے کے لیے انسان تگ و دو نہ کرے اس لیے کہ یہ نعمتیں عاقبی ہیں اس کی بجائے انسان قوت لایموت پر اکتفا کرے اور نیک اعمال سے حیات بعد الموت کی راحتوں کا سامان کرے یہی کا تصور بھی صوفی شعرا کے یہاں کچھ زیادہ وسیع اور جاندار نہیں ہے۔ فقر و فاقہ، صبر و حلم، عفو و درگزر اور قناعت و توکل جیسی منفعل نیکیاں ہی صوفی شعراء کے نزدیک اعلیٰ اخلاقی قدریں ہیں۔ اس کی ساری توجہ اپنے تزکیۂ نفس اور اپنی نجات پر مرکوز رہتی ہے۔ اسلام نے دنیا کو جو انقلابی نظام فکر اور جماعتی زندگی کی جو اعلیٰ قدریں عطا کی ہیں ان کا کوئی پرتو صوفیانہ شاعری میں نظر نہیں آتا۔ سلطان ابوسعید ابوالخیر سے اصغر گونڈوی تک صوفیانہ شاعری کا یہی رنگ ہے۔ ان تصورات و تعلیمات کی نوعیت اور مزاج جو کچھ بھی ہو ان کی بدولت غزل داخلیت کے نہاں خانے سے نکل کر خارجی زندگی کی وسعتوں میں بھی سانس لیتی رہی ہے۔

تصوف مذہب کی ایک فلسفیانہ تعبیر ہے جو مذہب کی تعلیمات کی روح پر زیادہ توجہ دیتی ہے۔ صوفی کے نزدیک عمل سے زیادہ ایمان و اخلاص اہم ہوتا ہے جس کے بغیر اچھے سے اچھا عمل بھی بے سود ہوتا ہے۔ کچھ تو اس نقطۂ نظر کے باعث اور کچھ روحانی واردات و کیفیات سے مغلوبیت کے باعث بعض صوفیا دین کے ظاہری پہلو سے بے اعتنائی کرنے لگے۔ مذہب کی اس صوفیانہ تعبیر نے دو گروہ پیدا کر دیئے۔ ایک گروہ علمائے ظاہر کا تھا جو اوامر و نواہی کی پابندی میں سختی کرتا تھا۔ اس کے مقابلے میں دوسرا گروہ علمائے باطن کا تھا جو صوفیا کہلاتے تھے۔ تصوف کی اشاعت کے آغاز ہی سے یہ دو مکاتیب خیال ایک دوسرے کے حریف مقابل کی حیثیت سے معرض وجود میں آگئے اور ان میں کشمکش شروع ہوگئی علمائے ظاہر خصوصاً قاضی، شحنہ، محتسب اور مفتی کو حکومت کی تائید حاصل ہوتی تھی اس لیے وہ اپنے اقتدار و طاقت سے صوفیا کے غیر شرعی اعمال کا تدارک کرتے۔ ان کے مقابلہ میں صوفیا کے یہاں ایسی کوئی طاقت نہ تھی اس لیے انھوں نے غزل کی تشبیہیں اور ایمائی فن اظہار سے فائدہ اٹھایا اور غزلیہ شاعری میں علمائے ظاہر کے تیتر سے کھیلنے لگے۔ وہ صوفیا کی ظاہری بے راہ روی پر حملے کرتے یہ ان کے ضعف ایمان اور ظاہر و باطن کے تضاد پر اتر آتے اور ان کی خلوتوں کے پردے اٹھا اٹھا کر ان کی چھپی ہوئی بداعمالیوں کو منظر پر لاتے اس طرح اس کشمکش نے غزل میں ایک مستقل موضوع کی صورت اختیار کر لی، اور قاضی، شحنہ، محتسب، شیخ اور زاہد پر کچڑا اچھالنا، ان کے معائب گنانا اور ان کی تحقیر کرنا غزل کی روایت بن گیا۔

بات یہیں تک ختم نہیں ہوئی بلکہ اہل ظاہر کے کردار پر اپنے کردار کو ترجیح دینے کے لیے صوفی شعرا اپنی رندی و مے خواری کے محاسن بیان کرنے لگے کہ ہم شراب پیتے ہیں تو ڈنکے کی چوٹ شراب پیتے ہیں۔ ہمارا ظاہر و باطن ایک ہے اس کے برخلاف علمائے ظاہر ریاکار اور منافق ہیں انھوں نے اپنی سیاہ کاریوں پر عبا و ں کا پردہ ڈال رکھا ہے ہم تو صرف شراب پیتے ہیں صرف یہی ہمارا گناہ ہے لیکن ہم پر حد شرعی جاری کرنے والے مال حرام کھاتے ہیں، حقوق العباد تلف

کرتے ہیں، دل آزاری کرتے ہیں۔ ان کی معصیت معاشرہ کو نقصان پہنچاتی ہے اس لیے وہ خدا ہی کے گنہگار نہیں بندوں کے بھی گنہگار ہیں، اور ہماری میخواری کا نقصان ہماری ذات تک محدود ہے اس لیے ہم صرف خدا کے گنہگار ہیں۔ اس کے علاوہ شراب اپنے اندر کچھ محاسن بھی رکھتی ہے۔ شراب کی یہ کیا کم خوبی ہے کہ ..... یہ انسان میں جرات و بے باکی جیسی گوئی و صاف معاملگی، کشادہ دلی و عالی ظرفی، انسان دوستی و وسیع المشربی پیدا کر دیتی ہے۔ عقل کی فتنہ کاریوں کا قلع قمع کرتی ہے اور بے خودی و خود فراموشی کی وہ کیفیات پیدا کر دیتی ہے جو معرفت کے لیے ضروری ہے غرض کہ اس انداز میں شعرائے مے و میخواری کی اتنی تعریف و توصیف کرنے لگے کہ یہ بھی خمریات کے عنوان سے غزل کا ایک مستقل موضوع بن بن گیا۔ لیکن خمریاتی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ غزل کی شراب محض افسردۂ انگوری نہیں ہے کچھ اور بھی ہے بلکہ بعض نقادوں کی رائے میں کچھ اور زیادہ ہے افسردۂ انگور کم ہے غالباً غزل میں اسلوب بیان کی یہ روایت بھی صوفی شعراء ہی نے قائم کی۔ جب انھوں نے اپنی روحانی اور وجدانی کیفیات اور مابعد الطبیعی واردات کو بیان کرنا چاہا تو انھیں مجبوراً اسی دنیا کی زبان استعمال کرنی پڑی۔ چنانچہ انھوں نے مشاہدۂ حق کی گفتگو کے لیے رندوں ہی کے بادہ و ساغر کو استعارہ بنا لیا۔ مے و میخانہ کے یہ استعارے اس قدر عام ہوئے کہ شاعری میں حقیقی شراب اور استعاری شراب میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ یہ اسلوب بیان ایسا چل نکلا کہ ہر کیف آگیں کیفیت کی ترجمانی کے لیے یہی استعارہ استعمال ہونے لگا۔ جیسے مسرت کی شراب، علم کی شراب اور حب وطن کی شراب وغیرہ۔ کبھی کبھی مے و میخانہ کے الفاظ استعارے سے گذر کر ایک وسیع مفہوم کا اشارہ بھی بن گئے ہیں۔ ریاض خیرآبادی کے اس شعر میں لفظوں سے گذر کر شاعر کے مافی الضمیر تک پہنچنے کی کوشش کیجیے۔

جام مئے توبہ شکن توبہ مری جام شکن　　سامنے ڈھیر ہے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کا

کیا لفظوں کے پیچھے شاعر کی وہ ذہنی کشمکش نہیں جھلک رہی ہے جو خیر و شر کے تصادم سے پیدا ہوتی ہے۔

ان صوفیانہ، حکیمانہ اور خمریاتی موضوعات کے علاوہ شعرا کچھ اور بھی ایسی باتیں کہتے رہے ہیں جو ماسوائے عشق ہیں۔ جیسے اکثر شعرا نے اپنے کمال کی ناقدری کا شکوہ بھی کیا ہے۔ اپنی شاعرانہ عظمت کو جتایا ہے شاعری اور فن شاعری کے بارے میں اپنے سے اشارے بھی کیے ہیں۔ یہ اشارے بڑے کام کے ہوتے ہیں۔ ان سے نہ صرف شاعر کو بلکہ اس اسکول کی شعری روایات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے جس سے شاعر وابستہ ہوتا ہے۔ شاعری کے بارے میں حاتم کا خیال ہے کہ جو کچھ کہا جائے بے محابہ کہا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں بے حد روانی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔

ہے عبث حاتم یہ مضموں اور معانی کا خیال　　منھ سے نکلا جو سخن گو کے وہ موزوں ہو گیا

ہمیں مضمون و معنیٰ سے نہیں کچھ ربط اے حاتم　　نشہ کی لہر میں جو دل میں آیا ہم بھی بک اٹھے

دبستان دہلی کے جس کسی شاعر نے بھی فکر و بیان کے چوں و چگوں پر روشنی ڈالی ہے اس نے کم و بیش ان ہی خصوصیات پر

زور دیا ہے۔ میر کہتے ہیں :۔

دیکھو تو کس روانی سے کہتے ہیں شعر میر — در سے ہزار چند ہے ان کے سخن میں آب
کیا جانے دل کو کھینچے ہے کیوں شعر میر کے — کچھ طرز ایسی بھی نہیں ابہام بھی نہیں

میر نے سادگی صفائی اور روانی کے ساتھ ساتھ لفظوں کے خوش آہنگ دروبست اور طرزبیاں کے معنی خیز تیور کی اہمیت بھی جتائی ہے۔

میر شاعر بھی اور تھا کوئی — دیکھتے ہو نہ بات کا اسلوب

میر کی غزل میں بات کا یہی اسلوب ہے جس کے آگے بڑے بڑے اساتذہ نے سر تسلیم خم کیا ہے۔ وہ جس حسن بیان کو بات کا اسلوب کہہ رہے ہیں وہ لفظ و بیان کا ایسا جادو ہے جو فن کے تجزیہ و تشریح کی دسترس سے باہر ہے۔ میر نے صنف غزل کی استعاری اور ایمائی خصوصیات کے بارے میں بھی جو کچھ کہا ہے وہ اس صنف کے مزاج اور فن اظہار کے بارے میں آج بھی حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ غزل کو در پردہ اظہار کا ذریعہ بتاتے ہیں۔

کیا تھا ریختہ پردہ سخن کا — سو ٹھہرا ہے وہی اب فن ہمارا

اس پردے میں غم دل کہتا ہے میرا اپنا — کیا شعر و شاعری ہے یار و شعار عاشق

جب غزل شرفائے لکھنو کے ہاتھوں میں پہنچی ہے تو فکر و فن کے تمام خطوط بدل جاتے ہیں۔ حاتم یا میر کے مقابلہ میں جرأت کے یہاں فن کا تصور دیکھئے کہ شاعری لکھنؤ میں کس طرح صنعت گری بن کر رہ گئی۔

جرأت اب کیجئے بنا اک محل ریختہ اور — تا یہ سب جانیں کہ خوب اس نے یہ جوڑے تھے پتھر
غزل گریہ و فغاں کہ اک اور پر چاہیئے کہ جرأت — ردیف اس کی بھی ہو مشکل گھبرا نہ گئے باآتش

زندگی کے داخلی اور خارجی پہلو ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے اس قدر اثر پذیر ہوتے ہیں کہ ایک کو دوسرے کے بغیر سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ اگر شاعر کی زندگی پے در پے انقلابات کا شکار ہو رہی ہو تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کے افکار و احساسات، اس کا مزاج، اس کا زاویۂ نظر ان انقلابات سے بالکل بے اثر رہے ہر وہ معمولی سے معمولی واقعہ جو شاعر کی خارجی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے اس کے طرز فکر و احساس اس کے مذاق حسن اس کے معیار خیر و شر مختصر یہ کہ اس کی پوری شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے اور یہی شخصیت اس کی غزل میں سمٹ کر آتی ہے وہ عشق و عاشقی کی باتیں بھی کرتا ہے تو اسی شخصیت کی زبان سے کرتا ہے۔ دلی کے شاعر کو دیکھئے اس کی شخصیت میں کتنی فتادگی، شکستگی اور سپردگی ہوتی ہے۔ یہ دردمندی یوں نہیں آئی۔ دلی سو بار اجڑی اور بسی ہے تو اتنا درد پیدا ہوا ہے۔ میر کہتے ہیں :۔

دیدۂ گریاں ہمارا نہر ہے — دل خرابہ جیسے دلی شہر ہے

دل کا خرابہ اور دلی کا خرابہ دو علیحدہ حقائق نہیں بلکہ ایک دوسرے کا نتیجہ ہیں۔ ان دونوں میں وہی ربط ہے جو فرد

اور معاشرہ میں ہوتا ہے۔ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ دلی کی تباہیوں کی بالواسطہ ترجمانی دلی کے ہر شاعر کا مزاج شعری کرتا ہے۔ مگر شاعر صرف اسی حد تک متاثر نہیں ہوا ہے وہ چوٹ پر چوٹ کھا کر چپ نہیں سادھ سکتا وہ گل و بلبل، قفس و آشیاں، بہار و خزاں اور ساحل و طوفان کی زبان ہی میں دل کا مرثیہ کہتے کہتے دلی کا مرثیہ کہنے لگتا ہے:۔

میر — بیگانہ سا لگے ہے چمن اب خزاں میں ہائے — ایسی گئی بہار مگر آشیا نہ تھی
" — قید قفس میں ہیں تو ضرورت ہے نالگی کی — گلشن میں تھے تو ہم کو منصب شعار و مہ خوانکی
سودا — بلبل چمن میں تیغ نگہ کس کی چل گئی — جس گل کو دیکھتا ہوں سو زخموں سے چور ہے
درد — کچھ گل ہی باغ میں نہیں تنہا شکستہ دل — ہر غنچہ دیکھتا ہوں تو ہے گا شکستہ دل
مصحفی — اپنی تو اس چمن میں نت عمر یونہی گذری — یاں آشیاں بنایا واں آشیاں بنایا
مومن — کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی — آشیاں اپنا ہوا برباد کیا
" — ڈرتا ہوں آسماں سے بجلی نہ گر پڑے — صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

نادر شاہ کے حملہ سے جنگ آزادی ۱۸۵۷ تک دلی اور اہل دلی پر جو کچھ بیتی اس کی تفصیل سے تاریخ کے صفحات سیاہ ہیں لیکن داغ نے ایک پوری صدی کی تاریخ کو ایک شعر میں سمیٹ لیا ہے۔

میرے آشیاں کے تو تھے چار تنکے — چمن اڑ گیا آندھیاں آتے آتے

اس دور کے کم و بیش ہر شاعر نے غزل کی ایمائی اور استعاری زبان میں اجتماعی زندگی کی بربادیوں پر نوحہ خوانی کی ہے۔ مگر یہ گھاؤ اتنے گہرے تھے کہ فقط آہ زیر لبی سے بھڑ اس نہیں نکل سکتی تھی۔ غزل کی روایت اظہار کا رکھ رکھاؤ شدت احساس کو روک نہ سکا تو شاعر نے اشاروں ایما اور تشبیہ و استعارہ کے پردے چاک کر کے حقائق کو واشگاف بھی پیش کیا ہے۔ میر کے یہاں ایسے متعدد شعر ملتے ہیں۔ میر بھی کچھ عجیب شاعر تھا۔ جذبات و کیفیات کی مصوری میں جس قدر دستگاہ اس کو تھی کسی اور کو نہ تھی۔ اپنے داخلی عالم میں اس قدر کھوئے ہوئے رہنے کے باوجود خارجی زندگی میں جس قدر پختہ شعور اس کو تھا اور کسی کو نہ تھا۔

یا قافلہ در قافلہ ان رستوں میں تھے لوگ — یا ایسے گئے یاں سے کہ کچھ کھوج نہ پایا
میر جنگل بڑے ہیں آج یہاں — لوگ کیا کیا یہیں تھے کل بستے
اجڑے نگر کو جس دم دیکھوں ہوں تو کہوں ہوں — اب پھر بسے گی بستی ایسی خراب کیونکر
جن بلاؤں کو میر سنتے تھے — ان کو اس روزگار میں دیکھا
دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں — تھا کل تلک دماغ جنھیں تخت و تاج کا
شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی — انھیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

(باقی صفحہ ۳۹ پر دیکھئے)

رضیہ بیگم

منٹو، موپاساں اور بالزاک

منٹو، موپاساں اور بالزاک۔ نہیں معلوم کیوں یہ تینوں نام میرے ذہن میں ہمیشہ ایک ساتھ ابھرتے ہیں اور ایسا لگتا ہے جیسے کہانی لکھنے والوں کا یہ مثلث باوجود زبان و ادب اور کے بُعد اور فرق کے اپنے اندر کچھ ایسے مشترک زاویے رکھتا ہے جو ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتے اور ان کی تکمیل کرتے ہیں۔ یہ ادبی اشتراک یا فکر و نظر کے زاویے کیا ہیں؟ اور کیوں ہیں؟ انھیں جانچنے پہچاننے کے لیے ظاہر ہے ضرورت ہے بہت زیادہ دقت نظر اور الگ الگ ہر ایک کے پھر مطالعہ کی۔ اور میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتی — میں نے منٹو، موپاساں اور بالزاک تینوں کی کہانیاں پڑھی ضرور ہیں۔ لیکن اتنی گہرائی میں اتر کر اور اس تنقیدی نظر سے نہیں کہ خود اپنے اس احساس کا تجزیہ کر سکوں، اور ان کی مشترک قدروں کو واضح طور پر بیان کر سکوں — ہاں سرسری طور پر اس مثلث کے زاویوں میں مجھے جو ایک نمایاں وجہ مماثلت دکھائی دیتی ہے اسے مختصراً یوں کہہ سکتی ہوں کہ موپاساں اور منٹو کی ادبی شخصیتوں میں نہ سہی مگر ان کی کہانیوں میں جو ایک طرح کی ہم مشربی سی ہے وہ ان دونوں کا بظاہر کچھ نہیں" کو ایک خوبصورت کہانی بنا دینے کا تیکھا انداز ہے۔ میرا مطلب ہے جس طرح موپاساں کسی ایک احساس، ایک تاثر، ایک بہت ہی معمولی چھوٹی سی بات کو، ایک وقتی تجربہ، ایک لمحہ اور اس کے ردعمل کو یوں ایک حسین کہانی کا روپ دے دیتا ہے کہ ایسا لگتا ہے جیسے کہانی خود بول رہی ہے۔ کہنے اور سننے یا پڑھنے والے میں کوئی دوری نہیں رہی، اسی طرح آپ دیکھیں گے کہ منٹو کی کہانیاں بھی انسانی زندگی کے کچھ چھوٹے چھوٹے واقعات، سانحات، احساسات، تاثرات اور تجربوں کے گرد گھومتی ہیں۔ جو شاید یوں کسی کے لیے بھی جاذب توجہ نہ ہوں لیکن جب فنکار ان کو کہانی کا روپ دے کر ہمارے سامنے رکھتا ہے تو جیسے ہم چونک پڑتے ہیں اور بالکل وہی احساس ہوتا ہے کہ کہانی خود بول رہی ہے، اور ہماری نگاہیں جیسے داستان گو کے ساتھ ساتھ حرکت کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں، اور فوراً نہ سہی کچھ بعد میں ہم ضرور یہ سوچتے ہیں کہ یہ سب کیا ہے؟ اور کیوں؟

اسی طرح منٹو اور بالزاک کی کہانیوں میں جو ایک نمایاں مشترک زاویہ دکھائی دیتا ہے وہ ان کی

بے باکی اور غیر معمولی جراءت اظہار و خیال ہے۔ بالزاک نے اپنے زمانہ میں جس باغیانہ جراءت کے ساتھ نہ جانے کتنی صدیوں کے ڈھلے ہوئے فکر و نظر کے ایک مخصوص سانچے کو توڑا اور ہزاروں پردوں میں چھپے ہوئے کچھ "مقدس بتوں" کو برہنہ کر کے سب کی نظروں کے سامنے رکھا کہ دیکھو میں اور تم ہی یہ بھی تو ہیں ــــ اور کسی موڑ پر بھی اس کے قلم نے کسی قسم کی جھجھک یا خوف کا اظہار نہیں کیا اسی طرح منٹو کی تحریروں میں بھی ہم کو ایسی باغیانہ جراءت و بے باکی نظر آتی ہے۔ منٹو نے انسانی زندگی کے جس ایک پہلو کو خاص طور پر اپنے فن کا موضوع بنایا وہ بہت ہی مکروہ سہی اور منٹو خود اس سے کراہیت محسوس کرتا ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس انتخاب میں وقت کی ایک بہت بڑی ضرورت شامل تھی۔ اور منٹو ہی اردو کا پہلا افسانہ نگار ہے جس نے اپنے زمانے کے ادب کی اس کوتاہی کو محسوس کیا کہ وہ اپنے سماج کے ایک انتہائی گندہ پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے اور اس سے دامن بچا کر اور اسے موٹے پردوں میں چھپائے رکھ کر نہ صرف یہ کہ ایک سماجی جرم کا مرتکب ہو رہا ہے بلکہ اپنے کو بھی دھوکہ دے رہا ہے چنانچہ اسی احساس کی شدت نے بالزاک کی طرح منٹو کو بھی کہنا چاہیئے اس باغیانہ شرارت پر آمادہ کیا کہ اس نے سوچا کیوں نہ سماج کی اس ڈھکی چھپی گندگیوں کو اس طرح سر بازار بکھیر دیا جائے کہ راستہ چلنے والے خود چونکیں اور واقعی کچھ سوچنے اور کرنے پر مجبور ہوں۔۔۔۔۔ اسی لیے وہ کسی انسانی جذبے سے بلاوجہ خوف نہیں کھاتا اور نہ اس کے ردعمل کو بیان کرتے ہوئے غیر ضروری شرم و ندامت محسوس کرتا ہے۔ اس کا فن کار ذہن انسانی زندگی اور فطرت کے تمام تقاضوں کو احاطہ کرتا ہے خود ان کی گہرائیوں تک پہنچتا ہے اور ان کی ہر تہہ کو اپنے ہاتھ سے کھول کر دیکھتا ہے اور ہر اس تاثر تجربہ اور احساس کو جو وہ اس طرح حاصل کرتا ہے خواہ وہ دنیا اور سماج کی مخصوص نظر میں ذلیل و ناگفتہ بہ ہی کیوں نہ ہو، کہہ ڈالنے میں کوئی جھجھک محسوس نہیں کرتا۔ اس طرح اس نے اپنے گرد و پیش، اپنے وقت اور زندگی کے جتنے چور دروازوں کو کھول کر جس انداز سے "اندرون خانہ" کے منظر دکھائے ہیں شاید ہی اردو کے کسی دوسرے افسانہ نگار کے پاس یہ چیز یہ جراءت اور بے باکی ہو ــــ تو شاید یہی بات ہے کہ جب بھی میں منٹو کو پڑھتی ہوں تو اس کے ساتھ موپاساں اور بالزاک کا تصور بھی ضرور شامل ہو جاتا ہے اور بڑے افسانہ نگاروں کا یہ ایک متنوع سا مثلث بن جاتا ہے جس کے زاویے بہت کچھ مشابہ ہوتے ہوئے بھی مختلف ہیں اور ان کا خطار تفاع بھی ایک نہیں۔

موپاساں اور بالزاک نے ادبی دنیا میں جو شہرت و مقبولیت پائی نہ صرف فرانس میں بلکہ مختلف ملکوں اور زمانوں میں جس طرح نقادوں اور ادب دوستوں نے انھیں پڑھا اور سمجھا اور ان کے ادبی اجتہاد کی قدر کی منٹو غریب "ہندوستان نشان" کو اس کا عشر عشیر بھی نصیب نہ ہوا۔ دوسرے ملکوں کی بات تو دور رہی خود اپنے ملک میں اسے صحیح طور پر جانا پہچانا نہیں گیا اور وہ شاید زندگی بھر "ذوق نظر" کی تمنا میں تشنگی کو روتا ہی رہ گیا۔

میں اسے منٹو کی کم نصیبی سے زیادہ پڑھنے والوں اور ادب دوستی کا دم بھرنے والوں کی بدقسمتی سمجھتی ہوں کہ ہم اپنے فن کاروں اور ادیبوں کو عام طور پر کچھ ایسے مخصوص زاویوں سے دیکھنے کے عادی بن گئے ہیں کہ ہماری نظریں اکثر و بیشتر سطح سے ٹکرا کر ہی لوٹ آتی ہیں۔ اس سطح کے نیچے کیا ہے اسے دیکھنے اور جاننے کی ہماری اکثر نقاد بھی وسیع نظری کے ساتھ کوشش نہیں کرتے، ابتدائی منزل پر کچھ اس طرح ذاتیات و شخصیات کی الجھنوں میں جا پڑتے ہیں کہ اصلی مقصود پیچھے رہ جاتا ہے اور فن کار بہ لحاظ فن نہیں بلکہ بہ لحاظ ذاتیات صرف ایک "خاصہ کی چیز" بن کر رہ جاتا ہے چنانچہ منٹو کے ساتھ بھی یہی تو ہوا۔ اکثروں نے محض اس کی کچھ اوپری گندگی اور میل کو دیکھ کر ــــ وہ بھی پہلے سے بنے بنائے ایک تصور کے ساتھ ــــ ناک بھوؤں چڑھا کر اُدھر سے منہ پھیر لیا اور اتنی بھی زحمت گوارا نہ کی کہ کچھ دور ہی تک سہی منٹو کے ساتھ ان خلوت خانوں میں جا کر دیکھیں کہ ان ہی کی اپنی غلاظتوں اور گندگیوں کے بیچ کتنے چھپے ہوئے گوشے ہیں جہاں فن کار کی نظر انسانی ذہن و نفس کی اس ستھرائی کو بھی دیکھتی ہے جسے ابھار کر سامنے لانے اور اسے آلائشوں سے پاک کرنے کی شدید تمنا میں ہی وہ وہاں تک پہنچا ہے ــــ نہ کہ صرف لذت کوشی کے لیے اور نہ اپنی خارجی شخصیت کا خون کر کے ہمارے آپ کے لیے نئی حقیقتوں کے پیکر بناتا ہے۔

ان سے ہٹ کر جو کچھ نے زیادہ حوصلہ دکھایا تو حاتم زمانہ بن کر بڑی دھوم دھام سے صرف یہ کہہ کر چلتے بنے کہ منٹو بہت بڑا فن کار ہے وہ مر گیا لیکن اس کا فن مر نہیں سکتا، مگر اتنی ہمت وہ بھی نہ کر سکے کہ کچھ دیر رک کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے کہ وہاں کتنے خاموش سلگتے ہوئے زخم ہیں اور اس کے رسوائے عام گلی کوچوں کی گندگی میں اٹے ہوئے چہرے بھی اپنے اندر ایک کیسی بے چین روح رکھتے ہیں جو روشنی کی متمنی ہے۔

ہماری اس گریز پائی میں ہو سکتا ہے کہ ہمارا یہ اندیشہ اور خوف بھی شامل ہو کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ گرد و غبار سے اٹی ہوئی سطح کے پیچھے جو آئینہ ہے اس میں جھانک کر دیکھیں تو اپنا ہی رخ نہ دکھائی دے جائے اور تقدس و پاکیزگی کا جو بھرم ہم نے بنا رکھا ہے وہ نہ ٹوٹ جائے۔

اور کچھ ناصح قسم کے محتاط ناقدوں نے بڑی متانت سے یہ حکم لگا دیا کہ اگر منٹو یہ کرتا، یوں نہ کرتا، ایسے رہتا یوں نہ لکھتا کچھ نازک حدود نہ توڑتا تو اس سے بھی بڑا فنکار ہوتا ــــ لیکن منٹو جو کچھ ہے، جیسا ہے، اس کی زندگی میں اس کے فن میں جو طوفان ہے، جو اتار چڑھاؤ ہے، اس میں جو متضاد کیفیتیں ہیں اور اس کے سارے تضاد میں جو مشترک درد ہے اور اس کے غیر معمولی حساس ذہن اور مزاج کا جو تقاضائے محویت ہے کہ وہ جو کچھ لکھتا ہے خواہ وہ "بو" ہو یا "قانون" "ہتک" ہو یا "گوپی ناتھ" اس میں ڈوب کر لکھتا ہے۔ اس سب کو اسی وسعت اور جامعیت کے ساتھ احاطہ کرنے اور منٹو جیسے بلا کے ذہین فنکار سے نظریں ملا کر اسے پوری طرح سمجھنے کی میں نہیں سمجھتی اب تک کسی نے بھی واقعی کامیاب کوشش کی ہے اور دراصل یہ کام اتنا آسان ہے بھی نہیں کیونکہ منٹو کے فن میں مجھے ایسا لگتا ہے، اس کی

اپنی شخصیت، اپنی زندگی، اس کی کوتاہیاں، نارسائیاں اور کامرانیاں یعنی اس کی تلخی اور ہنسی دونوں کچھ اس طرح آمیز ہیں اور اس کی کہانیاں اپنے اندر انسانی زندگی کی کچھ فطری کچھ شعوری اور کچھ حالات کی پیدا کردہ کوتاہیوں خامیوں، خوبیوں اور تضادوں کو کچھ ایسے ملے جلے انداز میں سمیٹے ہوئے ہیں کہ ان کے درمیان کوئی ایک روشن راستہ بنانا دشوار ہے۔ منٹو کے بارے میں نہ تو ہم دوٹوک انداز میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے جو کچھ لکھا ہے سب بہت خوب ہے، اس کی ہر کہانی لاجواب ہے نہ یہ کہ اس کے پاس صرف "بو" یا "ٹھنڈا گوشت" ہے اور اس کی "فونٹ اور سٹرانڈ" اور میں سمجھتی ہو کہ حقیقت شعار پڑھنے والوں کی حیثیت سے۔ خواہ شاعر ہو یا افسانہ نگار ہمیں اس سے یہ توقع بھی نہ رکھنی چاہیے کہ اس کی ہر کہانی، اس کا ہر شعر ایک ہی درجہ، ایک ہی معیار کا ہو۔ وہ بھی بہرحال انسان ہوتا ہے اور جو بقول غالب، بجائے خود ایک "محشر خیال" ہے ۔ وہ بھی ہماری آپ کی طرح اپنے ماحول اور گردوپیش میں ہی پلتا بڑھتا ہے۔ ہماری آپ کی طرح بہت سے متضاد احساسات و جذبات سے گذرتا ہے اور ان کے عمل اور ردعمل سے تاثرات قبول کرتا ہے، مختلف اور متضاد تجربوں سے دوچار ہوتا ہے۔ تو کیسے ممکن ہے کہ ہر وہ احساس اور تاثر یا تجربہ جسے وہ کہانی یا شعر کا روپ دے ایک ہی سطح اور ایک ہی معیار کا ہو۔ ممکن ہے جو ادیب صفحۂ خارجی حقیقت کا چربہ یا عکس اتارنے کو فن کا واحد مقصد سمجھتے ہیں۔ ان کے پاس یہ ایک سپاٹ سطح اور سیدھی لکیر مل جائے لیکن ایک واقعی ادیب اور خاص طور سے غیر معمولی حساس اور ذہین ادیب صرف حقیقتوں کا عکس نہیں اتارتا اور نہ یہ اس کا کام ہے بلکہ وہ اپنے تمام گوناگوں تجربات اور تاثرات کو "ایک رنگ" بنا کر پیش کرتا ہے، اس میں ہو سکتا ہے کبھی اس کا رنگ کچھ پھیکا بھی پڑ جائے اور میں تو سمجھتی ہوں جو ادیب اپنے احساس و قلم میں اتنی طاقت رکھتا ہے کہ ایک چھوٹے سے چھوٹے واقعہ، ایک تاثر، ایک احساس، ایک لمحہ ایک ثانیہ کو مستقل کردار اور ایک حسین روپ دے سکے وہی بہت بڑا فنکار ہے اور منٹو کے قلم میں یقیناً یہ طاقت تھی احساس و تاثر کا یہ کرب تھا اور ایک سچے فنکار کی وہ محویت اور شدید تمنا تھی جو ایک کہانی کہنے والے سے ایسی تخلیقات کرواتی ہے جو پڑھنے والے کے احساس و تصور کو صرف چونکاتی نہیں بلکہ اسے جھنجھوڑتی بھی ہے اور اسے دیکھنے اور کچھ سوچنے پر بھی مجبور کرتی ہے، اور میں اعتماد کے ساتھ اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ منٹو کی ہر کہانی میں (خواہ وہ خراب ہی کیوں نہ سمجھی جائے) آپ کو یہ "کرب" ضرور ملے گا اور یہی وہ مشترک درد ہے جو اس کے فن کی ایک کسوٹی بن سکتا ہے اور اس کی کچھ کوتاہیوں اور خوبیوں کو ہم آہنگ کرتا ہے۔ شاید ہی اس نے کوئی کہانی اس گہرے تاثر اور شدید تمنا کے بغیر لکھی ہو جو خود اپنی طاقت سے اظہار کے سانچے میں ڈھلتی ہے اور جتنا ہم منٹو کو پڑھیں اور سمجھیں گے یہ حقیقت واضح ہوتی جائے گی کہ منٹو ایک مداری نہیں تھا جس نے ڈگڈگی بجا بجا کر کچھ تماشائیوں کو تھوڑی دیر کے لیے اپنے گرد جمع کر لیا ہو پھر کچھ نہیں۔

منٹو نے جیسی زندگی گذاری، جن حالات میں رہا جس طرح فریب دہی اور فریب خوردگی دونوں کی منزلیں طے کیں

زندگی کے تقریباً ہر گلی کوچے سے گذرا، نیکی بھی کمائی اور رسوائیاں بھی اکٹھا کیں۔ اپنے چاروں طرف کی اچھی بری چیز کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھا اور ان عام گوناگوں تاثرات اور تجربات کو جس طرح کہانی کے سانچوں میں ڈھالا ہے اور ایک فنکارانہ روپ دیا ہے وہ اپنے اندر بہت دیرپا قدریں رکھتا ہے اور آج نہیں تو کل ادبی دنیا میں اسے زیادہ بلند اور صحیح مقام ملے گا اور منٹو موپاساں اور بالزاک کی کہانیوں کے مشابہ سمجھے جائیں گے۔

◄

بقیہ غزل کے غیر عشقیہ موضوعات

حالی نے چونکہ غزل کو نظم کے مقصد کے لیے برتنے کا نہ صرف مشورہ دیا بلکہ خود بھی اس انداز کی غزلیں کہیں۔ اس لیے حالی سے اردو غزل میں ایک نئے رجحان کا آغاز ہوتا ہے۔ ورنہ ویسے ابتداء ہی سے غزل خارجی زندگی سے بے تعلق نہیں رہی اور نہ ہی رہ سکتی تھی۔ غزل گو شاعر بھی معاشرہ ہی کا ایک فرد ہوتا ہے۔ اجتماعی سود و زیاں میں اس کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ صرف ان تاثرات کے اظہار کے لیے بھی ہے جو خارجی زندگی کے حادثات اور تجربات سے اس پر مرتب ہوتے ہیں اور ان تاثرات کے اظہار کے لیے بھی وہ غزل کی روایتی زبان سے کام لیتا ہے اس لیے کہ غزل کی غائیت صرف تاثر کی زبان ہوتی ہے واقعات و تفصیلات کی زبان نہیں ہوتی۔

روشنی کے مینار

جیلانی بانو

کے روشن افسانوں کا مجموعہ

نیا ادارہ ○ لاہور، پیش کر رہا ہے

جیلانی بانو نے زندگی سے نزدیک رہ کر اس کی تصویر بنانے کی کوشش کی ہے..... مخدوم محی الدین

جیلانی بانو کے افسانے معنوی اور ہیتی، دونوں لحاظ سے حسن و تناسب کے نہایت دلآویز نمونے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی

اس بار عاتق شاہ

"عابد روڈ سے کمرشیل اسٹریٹ"

کے نام سے پونے دو سو صفحات پر پھیلا ہوا ایک طویل رپورتاژ پیش کر رہا ہے جس میں آپ نئے ہندستان کو دیکھیں گے اور بیسیوں جیتے جاگتے کرداروں سے ملیں گے جن کو حالات نے ایک کہانی بنا دیا

خوبصورت گیٹ اپ کے ساتھ چھپ رہا ہے

اپنی کاپی کے لیے لکھیے

اقبال منزل

۳ - اے مین کراس روڈ۔ بنگلور ۱

شادؔ عارفی

رات ہوتے ہی یہ سامانِ سفر میرے لیے
"چودھویں کا چاند" ہے دیوار پر میرے لیے

جا رہی ہے دور تک اس کی نظر میرے لیے
اور کیا ہوتا محبت میں اثر میرے لیے

"رازِ سربستہ" رہا دن کی ملاقاتوں کا حال
بار ہا بیٹھے ہیں پہرے، رات بھر میرے لیے

روتے روتے جان کھو دیتا جنونِ شوق میں
اس کی سی پابندیاں ہوتیں اگر میرے لیے

جیتے کوئی کام یاد آجائے" اس انداز سے
وہ ٹھہر جاتا ہے ہر ہر گام پر میرے لیے

گھپ اندھیرے جا پہنچنا منہ اندھیرے واپسی
مستقل ہے اس کی خلوت میں گذر میرے لیے

اک نہ اک دن کھل بھی سکتا ہے فریبِ دردِ سر
ترک کر دیجئے فریبِ دردِ سر میرے لیے

چاہیئے تحریر غم آمیز کی تائید بھی
اپنی جانب سے بھی کچھ اے نامہ بر میرے لیے

جس کی رحمت پر بھروسہ ہے تمھیں اے میکشو
چھوڑ دو تھوڑی سی اس کے نام پر میرے لیے

گدگدے اعضا پہ کیفِ خواب آنکھیں مدھ بھری
تم ہو۔ یا جادو جگا لائی سحر میرے لیے

آنکھ ملتی ہے سرِ محفل نہ ملنے کی طرح
پے بہ پے گویا پیامِ مختصر میرے لیے

شادؔ اک تجھ کو میں نے موم پایا عشق میں
معتبر ہے اک بتِ نامعتبر میرے لیے

علی جوّاد زیدی

ہم سفر گم، راستے ناپید، گھبراتا ہوں میں
اک بیاباں در بیاباں ہے جدھر جاتا ہوں میں

بزمِ فکر و ہوش ہو یا محفلِ عیش و نشاط
ہر جگہ سے چند نشتر، چند غم لاتا ہوں میں

آ گئی اے نامرادی، وہ بھی منزل آ گئی!
مجھ کو کیا سمجھائیں گے وہ ان کو سمجھاتا ہوں میں

ان کے لب پر ہے جو ہلکے سے تبسم کی جھلک
اس میں اپنے آنسوؤں کا سوز بھی پاتا ہوں میں

شامِ تنہائی! بجھا دے جھلملاتی شمع بھی
ان اندھیروں میں ہی اکثر روشنی پاتا ہوں میں

ہمت افزا ہے ہر اک افتادِ راہِ شوق کی
ٹھوکریں کھاتا ہوں، گرتا ہوں، سنبھل جاتا ہوں میں

ان کے دامن تک خود اپنا ہاتھ بھی بڑھتا نہیں
اپنا دامن ہو تو ہر کانٹے سے الجھاتا ہوں میں

شوقِ منزل ہم سفر ہے، جذبۂ دل راہبر
مجھ پہ خود بھی کھل نہیں پاتا کدھر جاتا ہوں میں

غلام ربّانی تاباںؔ

جو اپنی تنگیٔ داماں پہ مسکرا نہ سکا
سنا ہے انجمنِ گل میں بار پا نہ سکا
وہ بدنصیب جو رازِ بہار پا نہ سکا
چمن میں شعلۂ عریاں کی تاب لا نہ سکا
تجھے یہ فکر نمودِ سحر قریب آئی
مجھے یہ غم کہ چراغِ سحر جلا نہ سکا
بڑے عذاب میں ہے جانِ بادہ خواروں کی
کہ ذکرِ جام ہوا دورِ جام آ نہ سکا
وہی جبیں پہ غرورِ شکست آج بھی ہے
یہ نقش وہ ہے زمانہ جسے مٹا نہ سکا
خرابِ جلوۂ ساقی خرابِ جلوۂ مئے
بقیدِ ہوش کوئی میکدے سے جا نہ سکا
مزاجِ حسن میں اتنا تو دخل تھا تاباںؔ
ہمیں مٹا تو سکا وہ مگر بھلا نہ سکا

وحید اختر

اپنی تباہیوں کی نہیں ہے خبر مجھے
بس یاد رہ گئی ہے تری چشمِ تر مجھے

اے دوست کیفِ زیست کا عنوان ہی سہی
آئی نہ راس تیری تمنا اگر مجھے

آ آ کے رک گئے ہیں جہاں کاروانِ شوق
کرنا ہے اس مقام سے عزمِ سفر مجھے

•

کس بلندی کے تصور کو ہم انساں سمجھیں
کوئی منزل نہیں جس کو حدِ امکاں سمجھیں

اُن سے ملتے ہوئے دل میں کوئی ارمان تو تھا
اتنی مہلت نہ ملی معنیٔ ارماں سمجھیں

نشترِ غم کی خلش زیست کا دیتی ہے پتہ
کوئی تبلائے پھر اب کس کو رگِ جاں سمجھیں

•

رنج اُن کی جدائی کا اب سے بھی سوا ہوتا
اقرارِ محبت وہ کرتے بھی تو کیا ہوتا

دونوں طرف آنکھوں نے کڈالا دمِ رخصت
وہ حرفِ محبت جو مشکل سے ادا ہوتا

اختر سعید

کسی صورت بھی ممکن ہو بدلنا ہے زمانے کو
کہاں تک زندگی رویا کرے گی مسکرانے کو

جو سننا ہے تو سن میری زباں سے داستاں میری
نہ جانے کہنے والے رنگ کیا دے دیں فسانے کو

پڑا رہتا کہاں تک سایۂ دیوارِ گلشن میں
ہوائے دامنِ صحرا اڑا لائی دوانے کو

کہیں ایسا نہ ہو تم نے مجھے دل سے بھلایا ہو
بہت جی چاہتا ہے ان دنوں آنسو بہانے کو

ہوا تجھ کو بھی منظور امتحانِ ضبطِ غم میرا
زمانہ کم نہ تھا اے دوست میرے آزمانے کو

یہ کس امید پہ اٹھ آئے تھے ہم اُن کی محفل سے
ابھی تک تو اجل آئی نہ وہ آئے منانے کو

ہمیں یکساں ہے اے ساقی یہ عالم ہو کہ وہ عالم
نہ دنیا سانس لینے کو نہ عقبیٰ سر چھپانے کو

محمود ایاز

اس دل سادہ کی تسلی کو
اک فریبِ وفا نما ہے بہت

یاد رکھو تو دل کے پاس ہیں ہم
بھول جاؤ تو فاصلہ ہے بہت

کوئی وعدہ کوئی امید نہیں
اب سکوں دل کو آچلا ہے بہت

ہم بچھڑ کر بھی تجھ سے جی لیں گے
تیری یادوں کا آسرا ہے بہت

عیشِ دنیا بھی کم نہیں لیکن
دل ترے غم سے آشنا ہے بہت

کوئی آوازِ بازگشت سہی!
غم کا سناٹا بڑھ چلا ہے بہت

سعید شہیدی

خزاں سے مجھ کو محبت ہے گلستاں کی قسم
میں بجلیوں کا فدائی ہوں آشیاں کی قسم

رہا نہ چین سے دم بھر میں تیری دنیا میں
تری زمیں کی قسم تیرے آسماں کی قسم

جگر کا خون پلا کر بہار لاؤں گا
چمن میں اب جو خزاں ہے اُسی خزاں کی قسم

دلِ شکستہ کے ٹکڑے نہ جڑ سکیں گے کبھی
حضور آپ کی اس سعیٔ رائگاں کی قسم

بدل کے رکھ دیئے آداب زندگی میں نے
مری جبیں کی قسم تیرے آستاں کی قسم

ملی نہ منزلِ مقصود ایک کو بھی سعیدؔ
بھٹک رہے ہیں سبھی میرِ کارواں کی قسم

ابنِ احمد تاب

تم وجہِ بنائے درد ہوئے اور درد کا حاصل ہو نہ سکے
مدّت سے مرے دل میں رہ کر تسکینِ غمِ دل ہو نہ سکے

مانا کہ کئی افسانوں کو ہم دے بھی چکے اشکوں کی زباں
افسانے تھے آخر افسانے تفسیرِ غمِ دل ہو نہ سکے

تم قبلہ نما تم شیخِ حرم تم صاحبِ ایماں اہلِ کرم
حیرت ہے کہ سب کچھ ہو کر بھی اک دردِ بھرا دل ہو نہ سکے

معلوم نہیں لے آیا ہے ادراک الم کس منزل میں
یہ حال ہے اب آنسو بھی مرے جذبات کا حاصل ہو نہ سکے

راہوں کی دل آویزی اکثر مجبورِ سفر کر دیتی ہے
منزل پہ پہنچ کر بھی کتنے آسودۂ منزل ہو نہ سکے

منوہر لال شارب

اک نیا سلسلۂ فکر و نظر پاتا ہوں
اب تو ہر غم میں ترے غم کی خبر پاتا ہوں

اپنی ہر آہ کو شایانِ اثر پاتا ہوں
اس گھنی رات میں بھی رنگِ سحر پاتا ہوں

مرحلے عشق کے خود سہل ہوئے جاتے ہیں
دل پہ کچھ تیری توجہ کی نظر پاتا ہوں

زندگی تیرے لیے جذبۂ پیکار سہی
میں محبت ہی میں معراجِ بشر پاتا ہوں

آج اشکوں میں جو امید کی چھوٹی ہے کرن
اس میں کچھ تیرے تبسّم کا اثر پاتا ہوں

اور کچھ ہو کہ نہ ہو تیرے تصوّر کے نثار
دل میں پر کیف سی ہل چل تو مگر پاتا ہوں

بے سبب تو نہیں موجوں کا یہ گمبھیر سکوت
اک نئی شورشِ طوفاں کی خبر پاتا ہوں

یہ تری مے کشی یہ زور بیاں اے شارب
عیب بھی تیرا بانداز ہنر پاتا ہوں

مظہر حسین قیصری

(نذرِ شاہی)

کیا کیا کروں سجنا جتن کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے
بیری بنا اپنا ہی من کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

وعدہ تو تجھ سے کر گئی میں لاج سے مر مر گئی
پائل پکارے چھن چھنن کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

پانی گھٹا جب چھائے ہے کیا کیا من للچائے ہے
کس سے کہوں دل کی لگن کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

پریتم سے جب پیتم ملے اندر ہی اندر من جلے
جھر جھر بہے نیناں سجن کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

تجھ نردئی کی چال پر مجھ باوری کے حال پر
رو رو کہے نیلا گگن کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

برہا کی کالی رات میں اڈی ہوئی برسات میں
کروٹ جولوں چھکے چھن کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

نندیا جو اُچٹے بھور کو کاٹے ہے دل کی کور کو
باہوں میں چھپ روئے پون کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

ساون کی یوں بوندیں پڑیں پلکوں سے جوں موتی جھڑیں
جل جل بجھے دل کی اگن کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

سکھیوں کی مٹھی مار کیا تجھ بن مورا سنگھار کیا
کورے ہیں کاجل سے نین کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

بشیر بدر

تم نے دیکھا کدھر گئے تارے — کس کی آواز پر گئے تارے

یہ کہیں شہرِ آرزو تو نہیں — چلتے چلتے ٹھہر گئے تارے

کب سے ہے آنکھ گود پھیلائے — جھیل میں کیوں اتر گئے تارے

دور تک نقشِ پائے نور نہیں — جانے کس رہ گذر گئے تارے

اُف یہ سائے یہ اندھیرے سناٹے — جانے کس کے نگر گئے تارے

آج آثارِ صبح سے پہلے — وادیوں میں اُتر گئے تارے

سہمے سہمے، بجھے بجھے مغموم — سر جھکائے گذر گئے تارے

بدرؔ کچھ واں کی بھی خبر ہے تمھیں
آنچلوں پر بکھر گئے تارے

رام لعل

روشنی اور سائے

دینا ناتھ دفتر سے تین دن سے غیر حاضر تھا۔ اس نے چھٹی کے لیے کوئی درخواست بھی نہیں بھیجی تھی۔ قیاس یہ تھا کہ وہ بیمار ہوگا۔ اس کی غیر حاضری میں ٹائپ کرنے کا کچھ کام گپتا صاحب نے کپل دیو کو سونپ دیا تھا۔ لیکن ابھی تک اسے بہت ضروری اور راز میں رکھی جانے والی خاص فائلیں دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ ان فائلوں کو دیکھنے کے لیے بیسار یادہ خواہش مند بھی نہیں تھا۔ پھر بھی وہ سوچتا تھا کہ گپتا صاحب دینا ناتھ کی غیر حاضری میں سارا کام خود کب تک دیکھیں گے۔

چار پانچ روز کے بعد صاحب کو دورے پر جانا پڑ گیا۔ اُن کے ساتھ ایک اسٹینوگرافر کا جانا بہت ضروری تھا۔ آج تک تو ان کے ساتھ ان کا پرانا اسٹینوگرافر دینا ناتھ ہی گیا تھا۔ جب صاحب نے کپل دیو کو ہیڈ کلرک کے ذریعہ بلا بھیجا تو ہیڈ کلرک نے کپل دیو کو اپنے پاس بٹھا کر بہت ہی رازدارانہ لہجے میں کہا ــــ "دیکھو بیٹا! آج تمھیں ایک بہت ہی سنہری موقع ملا ہے۔ اب صاحب کی ایسی خدمت کرو کہ ان کی نظروں میں آجاؤ۔ مجھے یقین ہے تم ایک دن ضرور ترقی کروگے۔ رہا میں سب کام خدمت اور خوشامد سے ہوتے ہیں۔"

یہ سن کر کپل دیو مسکرا دیا۔ جواب دیا "بڑے بابو آپ بھی عجیب باتیں کرتے ہیں! میں کسی کی خوشامد نہیں کروں گا۔ ایسی ترقی چاہے مجھے کبھی نہ ملے جو مجھ سے میری غیرت اور خودداری چھین لے۔"

یہ تمھارا پاگل پن ہے۔ بیٹا! ابھی تمھیں زمانے کی بے رحمی کا پورا احساس نہیں ہوا ہے۔ تم میرے تجربات سے فائدہ اٹھاؤ۔ میں نے سب نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ جب میں اس دفتر میں ملازم ہوا تھا تب مجھے صرف سترہ روپے تنخواہ ملا کرتی تھی۔ آج میں دفتر کا سب سے پرانا ملازم ہوں۔ میرے دیکھتے دیکھتے کتنے معمولی آدمی آگے بڑھ گئے۔ تم میرے مرحوم دوست کے بیٹے بھی ہو، اس لیے تمھیں ہدایت دینے اور سمجھانے کا مجھے حق حاصل ہے۔"

"جی میں آپ کی شفقتوں کو کبھی بھلا نہیں سکتا۔ میری یہ ملازمت بھی آپ ہی کی وجہ سے ہے۔ لیکن میں یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ افسروں کی خوشامد کرتے پھرنا میرے مزاج میں داخل ہی نہیں ہے۔ میں اپنے آپ کو ان لوگوں سے بالکل مختلف پاتا ہوں جو دن رات افسروں کے آگے پیچھے منڈلاتے رہتے ہیں۔ بلکہ مجھے تو ان کے بال بچوں پر بڑا ترس آتا

ہے جو افسروں کی خدمت کے جذبے میں انھیں بھی بھولے رہتے ہیں۔"

ہیڈ کلرک نے کپل دیو کی یہ بات پسند نہ کی۔ قدرے غصے سے بولے ۔" اچھا اچھا جاؤ۔ صاحب تمھارے انتظار میں ہیں۔ تمھیں اپنے ساتھ دورے پر لے جائیں گے۔"

کپل دیو نے منہ بنا کر کہا۔" بڑے بابو، آپ مجھ پر یہ ایک اور احسان فرمائیں گے اگر میری بجائے صاحب کے ساتھ دورے پر کسی دوسرے کو بھیج دیا تو۔"

" اب جاؤ بھی۔ کونسی بڑی آفت آجائے گی دو ہفتوں کے دورے میں۔!" بڑے بابو کی گھنی مونچھوں کے جھکے ہوئے بل کانپ کانپ گئے۔ وہ کچھ مسکرائے بھی، اور عینک کے اوپر سے اُسے گھور کر دیکھا۔ کپل دیو وہاں سے ہٹا نہیں۔ میز پر جھک کر پھر بولا۔" آپ جانتے ہیں مجھے دوستوں کے ساتھ روزانہ رمی کھیلنا کتنا اچھا لگتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں میرا یہ شغل نہ رہا تو میں بیمار پڑ جاؤں گا۔"

یہ سن کر ہیڈ کلرک کے اردگرد اپنی اپنی میزوں پر بیٹھے ہوئے کلرک ہنس پڑے۔ ایک کلرک نے کہا۔" ٹھیک تو ہے بڑے بابو۔ کپل دیو کے بغیر تو ہمارا دل بھی نہیں لگے گا۔"

ہیڈ کلرک نے مصنوعی غصّے کا اظہار کرتے ہوئے کپل دیو کو صاحب کے پاس جانے کا اشارہ کیا۔ وہ دل نخواستہ صاحب کے کمرے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ صاحب نے بلایا تو اندر چلا گیا۔ ایک بہت بڑی چڑی اور نفاست سے سجی ہوئی میز کے سامنے گنجی کھوپڑی والے صاحب اسے دیکھتے ہی کہہ اٹھے۔" تم نے کپل دیو، وہ سلیکشن کی فائل ابھی تک نہیں لوٹائی!"

" جی ہاں وہ ۔۔۔ اُس کی ایک لسٹ ابھی ٹائپ کرنا باقی ہے۔ کل شام کو ایک ضروری کام کی وجہ سے جلدی چلا گیا تھا۔"

" اور آج اس وقت تک؟" صاحب نے گھڑی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔" گیا رہ! ابھی تک تم نے کام شروع نہیں کیا؟"

" شروع کرنے ہی والا تھا کہ ہیڈ کلرک صاحب نے بلا لیا۔ میں ابھی جا کر ختم کر لوں گا۔"

صاحب نے میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجائی۔ چپراسی اندر آیا تو اس سے کہا۔" شاہ صاحب کو بلاؤ۔"

دوسرے ہی لمحے ہیڈ کلرک کوٹ کے بٹن بند کرتا ہوا اندر آگیا۔ اور آتے ہی پوچھا۔" جی فرمائیے۔"

" میں آج دورے پر جا رہا ہوں۔ لکھیم پور، گونڈہ، گورکھپور، سیتا پور اور گولا گوکرن ناتھ جانا ہوگا۔ غالباً دو ہفتے لگیں گے دینا ناتھ کا کچھ پتہ نہیں۔ وہ میرے دورے کا سب انتظام خود دیکھتا تھا۔ میں اس پر بھروسہ کر سکتا تھا۔ خیر۔ اب مجھے کوئی ٹائپسٹ دو جو میرے کام کو بخوبی انجام دے سکے۔"

یہ سن کر ہیڈ کلرک نے کپل دیو کی طرف دیکھا۔ پھر ذرا اور مدھم آواز میں کہنے لگا۔" جناب اسے ساتھ لے جائیے نا۔ میں اسے جانتا ہوں۔ یہ بہت محنتی اور ہشیار ہے۔ اسے موقعہ دیجئے خدمت کرنے کا۔"

صاحب نے سر اٹھا کر شاہ صاحب کو گھورا اور کہا۔" اس کی سفارش مت کرو۔ اسے میں نے دیکھ لیا ہے۔ اس

سے ابھی تک سلیکشن کی فائل بھی تیار نہیں ہو پائی ہے۔ مجھے دینا ناتھ کی کمی بری طرح محسوس ہو رہی ہے۔ وہ میرے مزاج اور کام دونوں سے واقف تھا۔"

"بہت اچھا جناب۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ کے ساتھ جانے کے لیے اور کونسا ٹائپسٹ موزوں ہو سکتا ہے۔"

"ہاں اور دیکھو اسے میرے پاس جلدی بھیج دو۔"

صاحب پھر کاغذات پر جھک گئے۔ کپل دیو اور شاہ صاحب باہر چلے آئے۔ ہیڈ کلرک اب سچ مچ غصّے میں تھا۔ اس نے کپل دیو کے ساتھ کوئی بات نہیں کی۔ سیدھا ٹائپ سکشن میں چلا گیا۔

کپل دیو کی بجائے رام ناتھ کو بھیج دیا گیا۔ وہ دو ہفتوں کے بعد لوٹا تو دینا ناتھ واپس آچکا تھا۔ لیکن اس کے باوجود رام ناتھ صاحب کا منظورِ نظر بنا رہا۔ صاحب اس کے کام سے بہت خوش ہوئے تھے۔ رام ناتھ کے اندر خدمت اور خوشامد کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس نے صاحب سے ایک بار متعارف ہو جانے کا فائدہ خوب اٹھایا۔ صاحب کے بنگلے پر راشن کوئلہ لکڑی تک پہنچانے کا جیسے اس نے ٹھیکہ لے لیا ہو۔ دفتر پہنچنے سے پہلے صاحب کے بنگلے پر صبح سویرے حاضری دیتا۔ کوئی خاص کام نہ ہوتا پھر بھی مقررہ وقت سے کچھ دیر پہلے دفتر جا پہنچتا۔ شام کو صاحب کے دفتر سے نکلنے کے بعد اپنی میز چھوڑتا بلکہ اکثر صاحب کے ساتھ ان کے بنگلے تک جاتا تھا۔ کبھی کبھی دفتر کے کچھ اور لوگ بھی ساتھ رہتے تھے۔ صاحب نے رام ناتھ پر پورا بھروسہ کر لیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے معاملات کی جانچ پڑتال کے لیے کبھی کبھی اسے تنہا بھیج دیتے تھے۔

کپل دیو رام ناتھ کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ اس کا مذاق کسی حد تک حسد پر مبنی تھا۔

اسی سال دفتر میں ایک سلیکشن ہوئی۔ صاحب کو اپنے لیے ایک پی اے کی ضرورت تھی۔ اور دو نئے سرکل انسپکٹر بھی مقرر کرنے تھے۔ کافی چھان بین کے بعد تین آدمی لیے گئے۔ رام ناتھ انسپکٹر ہو گیا۔ کپل دیو کو کسی نے نہ پوچھا۔ اس کی درخواست پر غور تک نہ کیا گیا۔ ساٹھ روپے تنخواہ پانے والا اب ایک سو پچاس پانے لگا۔ دفتر میں ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک رشک اور حسد کی لہر دوڑ گئی۔ کپل دیو دل ہی دل میں جل کر رہ گیا۔ اسے رام ناتھ کے ساتھ کسی طرح کا بیر نہیں تھا۔ اس کی حسد کی بنیاد صرف یہ تھی کہ اس نے ایک بار موقع ملنے پر صاحب کو خوش کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ رام ناتھ اسی دن سے اس کے طنز اور مذاق کا نشانہ بن رہا تھا۔ طنز اور مذاق نے اب باقاعدہ حسد کی جگہ لے لی تھی۔ ہیڈ کلرک نے اسے کئی بار رام ناتھ کی مثال دے کر صاحب کی خدمت کرنے کے لیے کہا۔ کپل دیو یہ سب سن کر چپ ہو رہا۔ اس کی نظریں ہمیشہ رام ناتھ کے تعاقب میں رہتیں۔ رام ناتھ اب صاحب کے کمرے کے سامنے ایک چوڑی میز کے آگے بیٹھتا تھا۔ اس کے لباس اور بات چیت کے لب و لہجے میں ایک انقلاب آچکا تھا۔ پہلے وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھ کر خوب قہقہے لگایا کرتا تھا۔ اب ان کی باتیں سن کر صرف مسکرا دیتا تھا۔ اب وہ ان سب سے اسے سلام کرنے کی توقع رکھتا تھا، اور واقعی یہی ہوتا تھا۔ سبھی اسے دیکھ کر سلام کرنے لگے تھے۔ جو نہیں کرتے تھے اس کے حاسد تھے۔ اسے دورے کا جو الونس ملتا تھا

اسے جمع کر کے وہ ایک موٹر سائیکل خریدنے کا پلان بنا رہا تھا۔ کپل دیو نے بڑے بابو کی نصیحتوں پر کبھی دھیان نہ دیا۔ حسب معمول افسروں اور انسپکٹروں کی برائیاں بیان کرنے میں لگا رہتا۔ دفتر کے مقررہ اوقات کے بعد ایک منٹ کے لیے بھی وہاں نہیں رکتا تھا۔ کبھی زیادہ کام کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ اکثر کچھ کام دوسرے دن پر ہی اٹھا رکھا۔ اور فالتو وقت دوستوں کے ساتھ تاش کھیلنے میں گذارتا رہا۔

دوسرے سال گپتا صاحب کا تبادلہ ہوگیا۔ نئے افسر کی آمد تک ہیڈ کلرک نے ان کی جگہ پر کام کیا۔ یہ عرصہ صرف دو مہینے کا تھا۔ اس دوران میں ہیڈ کلرک نے بہت سے اہم کام کپل دیو کے سپرد کر دیئے۔ اسے راز میں رکھی جانے والی فائلیں بھی پڑھنے کے لیے دے دیں۔ محکمے کی پالیسی کے تمام کاغذات اس کے ہاتھوں سے گزرنے لگے۔ وہ چاہتا تھا کہ کپل دیو دفتر کا ایک اہم کلرک بن جائے۔ اس کا کپل دیو پر ایک اخلاقی اثر بھی تھا۔ کپل دیو نے اسے ناراض نہ کرنے کے لیے تمام بوجھ بخوشی سنبھال لیا۔ ابھی تک کام میں اضافے کے بدلے میں اس کی تنخواہ میں ایک پیسے کا بھی اضافہ نہیں ہوا تھا۔ محنت اور مصروفیت حد درجہ بڑھ گئی تھی۔ اب اسے گھر پہنچ کر تاش کھیلنے کے لیے وقت نہیں ملتا تھا۔ پہلے وہ دن بھر میں بمشکل پندرہ بیس کیس ٹائپ کیا کرتا تھا۔ اب اسے پچاس ساٹھ کرنے پڑ جاتے تھے۔ کسی کسی فائل میں تو ایک ایک کیس چار چار اور چھ چھ صفحات کا ہوتا تھا۔

ایک دن اس کی نظر ایک نئی سلیکشن فائل پر پڑی۔ ادنیٰ گریڈ اسٹاف کی بھرتی کے لیے دو سو آدمیوں کی ضرورت تھی۔ اسے یاد تھا کہ اس قسم کی سلیکشن کئی بار پہلے ہو چکی تھی۔ جن دنوں دینا ناتھ یا رام ناتھ اس جگہ پر کام کر رہے تھے۔ ان کے پاس دور دور سے لوگ سفارشیں لے کر پہنچتے تھے۔ اس لیے ان کا مزاج بہت اونچا رہتا تھا۔ جن لوگوں کو وہ فائدہ پہنچاتے تھے ان سے کتنے فائدے خود بھی اٹھاتے۔ اسے معلوم تھا کہ رام ناتھ اپنی بیوی کا علاج میڈیکل کالج سے بغیر کسی سفارش یا بغیر کسی انتظار کے کرایا تھا۔ حکمہ تعلیم سے اس نے اپنے عزیزوں کے لیے کتنی مراعات حاصل کی تھیں۔ پولیس میں بھی اس کا اثر و رسوخ اسی وجہ سے بنا ہوا تھا۔ اس فائل کو دیکھ کر کپل دیو گہری سوچ میں پڑ گیا۔ ان دو سو آدمیوں کو رکھنے کے لیے تقریباً چار ہزار درخواستوں کو پڑھنا ہوگا۔ اگر وہ اس جگہ کام کرتا رہے تو اس کی اہمیت بھی بڑھ سکتی ہے۔ وہ بھی سر اونچا کر کے اور سینہ پھلا کر چل سکتا ہے۔ شام کو گھر جانے سے پہلے اس نے ہیڈ کلرک سے اس فائل کا ذکر کیا۔ شاہ صاحب اس کا مدعا سمجھ کر مسکرا دیئے اور کہا ــــ "لیکن یہ سلیکشن میں نہیں کر سکتا۔ ہمارا اپنا افسر ہی آ کر کرے گا۔"

کپل دیو خاموش ہوگیا۔ نئے افسر کی آمد تک وہ اسی جگہ کام کرتا رہے۔ تب وہ کسی ذمہ داری کو اٹھانے کے قابل بن سکتا تھا۔

جس دن نئے افسر کی آمد تھی وہ ان کا استقبال کرنے کے لیے صبح صبح اسٹیشن پر جا پہنچا۔ وہاں دفتر کے بہت سے

لوگ جمع تھے۔ ہیڈ کلرک، سرکل انسپکٹر، ٹھیکیدار اور کئی دوسرے۔ ان میں دو چار ایسے کلرک بھی تھے جو اس کے ساتھ کام کرتے تھے۔ اور ہمیشہ ہر افسر کا کام کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ بہت سے لوگ پھولوں کے ہار اور گلدستے اٹھائے ہوئے تھے۔ اس بھیڑ میں اس نے اپنے آپ کو حد درجہ تنہا محسوس کیا۔ آج تک وہ کسی افسر کو الوداع کہنے یا ان کا سواگت کرنے کے لیے اسٹیشن پر نہیں آیا تھا۔ اس نے کسی افسر کی اس حد تک خوشامد نہیں کی تھی۔ آج اس کے لیے یہ پہلا موقع تھا۔ وہ ایک طرف کھڑا ہو کر باقی لوگوں کی حرکات و سکنات کا گہری نظر سے مطالعہ کر رہا تھا۔ وہ لوگ کس قدر خوش تھے۔ کتنے اچھے اچھے اور صاف ستھرے کپڑے پہن کر آئے تھے بار بار اپنی پتلونوں کی کریز دیکھتے۔ نکٹائی کی گانٹھ چھوتے۔ سر کے بالوں کو سہلاتے۔ چشمہ صاف کرتے۔ کبھی ہیٹ کے کو سر سے اتارتے کبھی جماتے تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر زور کا قہقہہ لگا کر ہنس پڑتے تھے۔ اس کا جی بھی چاہتا تھا کہ ان کے ساتھ کھڑے ہو کر باتیں کرے۔ اور اسی طرح قہقہے لگائے لیکن اس کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔ دو ایک آدمیوں نے اس کی طرف دیکھ کر منہ پھیر لیا تھا۔ ہیڈ کلرک نے اسے دیکھ کر محض مسکرا دینے پر ہی اکتفا کی تھی۔ اس لیے وہ ان لوگوں کی حرکتوں میں کوئی کشش نہیں پا رہا تھا۔ اسے وہ سب کے سب بے وقوف اور غیر مہذب معلوم ہو رہے تھے۔ جب تک گاڑی نہیں آئی وہ پلیٹ فارم پر تنہا ٹہلتا رہا۔

گاڑی کے آجانے پر سب لوگ اس ڈبے کے سامنے جمع ہو گئے جس میں نئے صاحب بھی تھے۔ نئے صاحب ادھیڑ عمر کے اونچے اور موٹے جسم کے مالک تھے۔ منہ میں سگار پھنسائے ہاتھ اٹھا اٹھا کر سب کو سلام کا جواب دے رہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی بیوی، دو لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ لڑکیاں بڑی تھیں جو اپنے ترشے ہوئے بالوں کو بار بار شانوں کے آگے گراتی اور اپنے باپ کے ہاتھوں پر چھلتی ہوئی نگاہ ڈال کر جانے ادھر ادھر کس کو ڈھونڈھنے لگتی تھیں۔ ایک خونخوار ایلسیشن کتا ان کے آگے پیچھے بہت بے چینی سے پھرتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

ہار پہنانے والوں نے آگے بڑھ بڑھ کر صاحب کے گلے میں ہار ڈالے۔ صاحب کے ساتھ متعارف ہونے اور ان کے ساتھ ہاتھ ملانے کے لیے سبھی لوگ بے قرار نظر آتے تھے۔

"مجھے بھگوان سنگھ کہتے ہیں میں ڈیولپمنٹ سکشن کا انچارج ہوں۔"

"خادم کو عذر حسین کہتے ہیں۔ سرکار کا بہت پرانا ٹھیکیدار۔"

"مجھے رام ساگر پانڈے ہے۔"

"صاحب کا اقبال بلند رہے میں سرکل انسپکٹر۔"

کپل دیو سب کے پیچھے تھا۔ ایک کونے میں چپ چاپ کھڑا تھا۔ بھیڑ کی وجہ سے اسے نئے افسر کا چہرہ تک دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس نے ایک بار آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن پھر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے ساتھی کلرک اور دفتر کے کئی چپراسی صاحب کا سامان اٹھوانے میں مصروف تھے۔ کپل دیو کو یوں محسوس ہوا جیسے وہاں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ ہر شخص اپنی جگہ پر قبضہ

کر چکا تھا جب نئے صاحب اپنی بیوی بچوں اور دفتر کے قافلے کو ساتھ لے کر آگے بڑھے تو کپل دیو ایک دوسرے راستے سے ہو کر اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکل گیا۔

اسے دفتر میں اسی جگہ پر مستقل طور پر کام نہ کرنے دیا گیا۔ وہاں وہی پہلا ٹائپسٹ لگا دیا گیا جسے شاہ صاحب نے ہٹا دیا تھا۔ کپل دیو نے سمجھ لیا اب اس کے لیے آگے بڑھنے کا موقع مشکل سے آئے گا۔ اب وہ سچ مچ آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ اس نے تاش کھیلنا چھوڑ دیا تھا۔ اس نے جان لیا تھا کہ اگر اسے منصب ترقی نہ ملی تو اس کی مالی حالت بہت گر جائے گی۔ جب تک اس کی اولاد نہیں ہوئی تھی تب تک تو میاں بیوی کی گذر بخوبی ہوتی رہی تھی۔ اب بچے ہو جانے کے بعد اخراجات بڑھ گئے تھے اس نے ہیڈ کلرک سے کئی مرتبہ کہا تھا کہ وہ صاحب کے سامنے اس کی سفارش کریں۔ شاہ صاحب نے اسے بتایا تھا کہ ابھی اسے انتظار کرنا ہوگا۔ ابھی تو صاحب نئے نئے آئے تھے۔ ابھی تو انھیں خود صاحب تک رسائی حاصل کرنے کی ضرورت تھی۔

ایک سال گذر گیا۔ کپل دیو صاحب کے نزدیک نہ پہنچ سکا۔ کبھی کبھار سامنے ہو جانے پر سلام کر دینے سے وہ بات نہیں بنتی تھی جس کا وہ متمنی تھا۔ صاحب کے بنگلے پر بغیر کسی کام کے جا کر ملنے کی اس کے اندر جرات نہیں تھی۔ دو ایک کلرک جو صاحب کے آتے ہی ان کی نظر میں چڑھ گئے تھے وہی ان کے ہاں بڑی آزادی سے آتے اور جاتے تھے۔

ان ہی دنوں صاحب کی ایک لڑکی کی شادی قرار پائی۔ ایک افسر گر اپنی ملازمت کے دوران میں اپنی لڑکی کی شادی کرتا ہے تو اس کے ہاں تحائف کے انبار لگ جاتے ہیں۔ وہی ہوا۔ محکمے کا کوئی انچارج، انسپکٹر یا ہیڈ کلرک ایسا نہیں تھا جس نے تحفہ نہ پہنچایا ہو۔ کئی کلرکوں نے بھی نذریں پیش کیں۔ ٹھیکیدار تو جیسے اسی موقع کے انتظار میں تھے۔ کسی نے فرنیچر، یا کسی نے مہمانوں کی دعوت کا پورا خرچہ اپنے ذمہ لے لیا۔ سائیکل، گھڑی، ریڈیو، برتن، سیونگ مشین، کپڑے زیور، بجلی کا جملہ سامان جتنی کہ وہاں ہر ہر چیز جمع ہو گئی۔

ایک دن شاہ صاحب نے کپل دیو کو بلا کر کہا "تم ابھی سائیکل پر بانس منڈی چلے جاؤ۔ وہاں ولایت حسین کی دکان پر صاحب کے ہاں جانے والا جس قدر سامان بک کرایا گیا ہے اسے ٹھیلوں پر لدوا کر صاحب کے بنگلے پر پہنچا آؤ۔ یہ لو سامان کی فہرست سارا سامان خوب دیکھ بھال کر کے اپنے سامنے وہاں رکھوانا سمجھے! میں نے صاحب سے تمھاری تعریف کر دی ہے اور انھیں کہہ دیا ہے کہ کپل دیو اس ذمہ داری کو پوری طرح نبھائے گا۔"

کپل دیو فوراً بانس منڈی پہنچا۔ تین سو کرسیاں اور میزیں تھیں۔ دو بڑے عالیشان شامیانے تھے۔ پانی کے بڑے بڑے ٹب اور دیگر برتن تھے۔ دس ٹھیلوں پر سامان لدا گیا۔ بانس منڈی سے صاحب کا بنگلہ چھ میل دور تھا۔ وہاں تک پہنچنے میں تین گھنٹے لگ گئے۔ ٹھیلے اسی رفتار سے چل سکتے تھے۔ کپل دیو نے دوپہر کا کھانا تین بجے ایک ہوٹل میں کھایا۔ دھوپ اور پسینے سے اس کا جسم تمتما رہا تھا۔ پھر بھی وہ بنگلے پر شام کے چھ بجے تک سارا سامان ترتیب سے لگواتا رہا۔ وہاں اور بھی بہت سے آدمی کام کاج میں مصروف تھے۔ کبھی کبھی برآمدے میں صاحب کی جھلک دکھائی دے جاتی تھی۔ انھیں یہ تو

جاننے کی فرصت ہی نہیں تھی کہ ان کے ہاں کون کون کام کر رہا ہے۔

ایٹ ہوم کی شام کپل دیو کے لیے بہت ہی اداس شام ثابت ہوئی۔ وہاں شہر کے بہت سے بڑے افسر مدعو تھے۔ دفتر کے انچارج اور انسپکٹر لوگ بھی تھے۔ لیکن اس نے وہاں اپنے آپ کو حد درجہ تنہا اور اداس محسوس کیا۔ اس وقت اس کے لیے وہاں کوئی کام باقی نہیں رہ گیا تھا۔ شہر کے ایک بڑے ہوٹل کی طرف سے مہمانوں کو کھلانے پلانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ ہوٹل کے باوردی بیرے مہمانوں کی خدمت کرنے میں مصروف تھے۔ گیٹ پر پولیس کا ہیڈ ایک ڈیوٹیشن مگر بہت ہی اداس دھن بجا رہا تھا۔ جن دو تین کلرکوں کے ساتھ بات چیت کر سکتا تھا وہ اس سے کام کرنے میں سبقت لے گئے تھے وہ ابھی تک بنگلے کے اندر اور باہر بڑی تیزی سے آ اور جا رہے تھے انھیں کپل دیو کی طرف دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ کپل دیو وہاں سے چلا آیا۔

"دوسرے دن بانس منڈی میں ہر ایک چیز گن کر اور دیکھ بھال کر کے واپس کرنی تھی۔ اس کام کے لیے کپل دیو ہی کو بھیجا گیا۔ وہ کام سے نہیں گھبراتا تھا۔ وہاں اس کی خدمات کو سراہنے والا کوئی نہیں تھا۔ صاحب نے ابھی تک اسے دیکھا بھی نہیں تھا۔

کئی دنوں کے بعد اس کے بدن سے پوری طرح تکان دور ہو سکی۔

ایک دن رام ناتھ نے دورے پر ساتھ لے جانے کے لیے اس کا نام لیا جسے ہیڈ کلرک نے منظور کر لیا۔ رام ناتھ کبھی اس کی مانند محض ایک ٹائپسٹ کلرک تھا۔ اب اسے رام ناتھ کے ساتھ ایک ماتحت بن کر جانا ہوگا۔ رام ناتھ پہلے درجے میں سفر کریگا اور وہ تیسرے درجے میں۔ اسے ایک شدید صدمے کا احساس ہوا۔ حسد کی آگ تو پہلے سے جل ہی رہی تھی لیکن ساتھ جانے سے وہ انکار نہیں کر سکتا تھا۔

دفتر چھوڑتے وقت رام ناتھ نے اس کا اپنا سامان اسٹیشن لے جانے کی ذمہ داری بھی اس پر ڈال دی۔ کیونکہ اسے صاحب کے ساتھ بنگلے پر بہت ضروری کام تھا۔ کپل دیو ایک کڑوا گھونٹ پی کر رہ گیا۔

رات کو وہ پلیٹ فارم پر اپنے اور رام ناتھ کے پاس بیٹھا رام ناتھ کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا سامان ایک پرانے سوٹ کیس اور دری میں لپٹے ہوئے بستر پر مشتمل تھا۔ لیکن رام ناتھ کے سامان میں ایک اچھا سا چمڑے کا سوٹ کیس، ایک ہولڈال، ایک ٹفن باکس اور لکڑی کے فریم میں رکھی ہوئی ایک صراحی شامل تھی۔ ایک ٹائپ رائٹر بھی تھا۔

گاڑی کے آنے میں دس منٹ رہ گئے تھے۔ رام ناتھ کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ اسے رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ وہ ناحق اس کا سامان اٹھوا کر لے آیا تھا۔ جانے وہ کہاں بیٹھا گپیں ہانک رہا ہوگا۔ اس نے بوٹ کی نوک سے اس کے چمڑے کے سوٹ کیس کو دبایا جیسے اس کا پیٹ پھاڑ دینا چاہتا ہو۔

گاڑی آ گئی۔ رام ناتھ ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ سامان اٹھانے والے قلی نے کہا ——— "چلیے صاحب، سامان

گاڑی میں رکھ دوں؟"

اس نے رام ناتھ کے کچھ سامان کو پلیٹ فارم پر ہی چھوڑ دینے کا ارادہ کرلیا۔ اپنا سامان قلی کے سر پر رکھ دیا۔ چمڑے کا سوٹ کیس اور صراحی وہیں پڑے رہنے دی ۔۔۔ قلی نے کہا ۔۔۔ "آپ اس سامان کو دیکھیے گا میں یہ سامان گاڑی میں دھر آؤں۔

کپل دیو قلی کے پیچھے پیچھے چلدیا۔ پلیٹ فارم پر چمڑے کا سوٹ کیس اور صراحی پڑی رہی ۔۔۔ قلی نے پوچھا ۔۔۔ "آپ وہاں رکے نہیں؟"

"اماں تم چلو کون اٹھالے گا!"

"یہ سامان کس درجے میں رکھا جائے۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کہاں رکھا جائے؟ رام ناتھ پہلے درجے میں سوار ہوگا۔ اور وہ تیسرے درجے میں۔ یہاں سے لے کر بنارس تک۔ بنارس پہنچ کر رام ناتھ انسپکٹروں کے ریسٹ ہاؤس میں قیام کرے گا اور وہ ماتحت کلرکوں کے لیے ایک چھوٹی سی کوٹھری بھی نہیں ہوگی۔ ریسٹ ہاؤس کے برآمدے میں پڑے رہنا ہوگا۔

اس نے سر گھما کر پلیٹ فارم پر اس جگہ کی طرف دیکھا جہاں وہ رام ناتھ کا کچھ سامان چھوڑ کر چلا آیا تھا۔ سامان ابھی تک رکھا تھا۔ دور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جیسے وہ کپل دیو کی نیت سمجھ گیا ہو۔ کپل دیو سوچ رہا تھا سامان کو ابھی تک کسی نے اٹھایا نہیں تھا۔ اٹھانے والے تو پلک جھپکنے کی دیر میں اٹھا لے جاتے ہیں۔ اس وقت کوئی اس کی طرف دیکھتا بھی نہیں تھا۔ اس نے قلی سے کہا ۔۔۔ "صاحب کا سامان پہلے درجے میں لگا دو۔"

"اور آپ کا؟"

"ابھی یہاں باہر رکھو۔"

قلی نے ویسا ہی کیا۔ وہ بھاگ کر سوٹ کیس اور صراحی بھی اٹھا لایا۔ بستر بھی کھول دیا۔ اور پھر نیچے اتر کر کپل دیو کے سامنے آ کھڑا ہوا ۔۔۔ بولا۔

"مجھے مزدوری دے دیجیے؟"

قلی کو وہ رام ناتھ کے سامان کی مزدوری دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے قلی کو انتظار کرنے کے لیے کہا۔ لیکن جب وہ گڑگڑایا تو اس نے اسے چار آنے دے دیئے۔ وہ چار آنے پا کر خوش نہ ہوا۔ کہہ سن کر دو آنے اور بھی لے گیا۔

گاڑی کھلنے سے دو منٹ پہلے رام ناتھ پہنچا۔ بغل میں فائل دبائے اور بڑے اطمینان سے سگریٹ پیتا ہوا پوچھا۔ "سامان رکھ دیا گڈا! اچھا تم اب جا کر اپنے ڈبے میں بیٹھو ورنہ جگہ نہیں ملے گی۔"

کپل دیو نے کوئی جواب نہ دیا۔ رام ناتھ گاڑی کے ڈبے میں گھس کر اپنے سامان کا جائزہ لینے لگا۔ کوٹ اتار کر اٹھاتے ہوئے بولا۔

"تم اب جاکر بیٹھو نا بھئی! گاڑی تو کھلنے والی ہے۔"

کپل دیو کہیں جاکر بیٹھنے کی بجائے وہیں کھڑا رہا۔ اسے گھورتا رہا۔ رام ناتھ بہت حیران ہوا۔ کھڑکی میں سے سر نکال کر پوچھا۔ "کیا ہوا بھئی؟ تم جاکر بیٹھتے کیوں نہیں؟"

کپل دیو نے تھرتھراتی ہوئی آواز میں جواب دیا "میں آپ کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔"

رام ناتھ کو تعجب ہوا۔ "طبیعت خراب ہو رہی ہے؟ کیوں؟ پہلے پتہ نہیں تھا؟ خیر تم گاڑی میں بیٹھو کل بنارس پہنچ کر کوئی دوا لے لینا۔"

"جی نہیں۔ میں ساتھ چلنے سے بالکل مجبور ہوں۔"

گاڑی نے سیٹی بجا دی۔

ارے بھئی میں وہاں جاکر کس سے ٹائپ کا کام کراؤں گا۔ بیٹھو بیٹھو۔ بنارس پہنچ کر کسی ڈاکٹر سے دوا لے لینا گھبراؤ مت۔"

"جی نہیں۔"

"تم بہت عجیب ہو!"

گاڑی چل دی۔ رام ناتھ سخت تذبذب میں تھا۔ جلدی سے اونچی آواز میں بولا۔ "کل میرے دفتر جاکر کوئی دوسرا ٹائپسٹ بھجوا دینا۔ میں وہاں انتظار کروں گا۔ سمجھے بھولنا نہیں۔"

گاڑی دھڑ دھڑاتی ہوئی پلیٹ فارم سے نکل گئی۔ کپل دیو نے ایک ہاتھ میں اپنا پرانا زنگ آلود لوہے کا سوٹ کیس اور دوسرے میں دری میں لپٹا ہوا بستر اٹھا کر باہر کا رخ کیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔

خواجہ وزیر نمبر اور مجاز نمبر کے بعد ماہنامہ شبستان لکھنؤ کی ایک اور شاندار خالص ادبی پیشکش

غزل نمبر

● تقریباً ڈھائی سو صفحات پر مشتمل یہ نمبر آج تک شائع ہونے والے تمام نمبروں میں امتیازی اور انفرادی حیثیت کا حامل ہوگا۔

● اس نمبر میں پہلی مرتبہ اردو غزل کے عنوان پر ہندو پاک کے نامور ادیبوں کے مطبوعہ غیر مطبوعہ مضامین یکجا کیے جائیں گے ● موجودہ دور کے مشہور خوش فکر شعراء و ادباء کے افکار جمیل اور بہترین آرٹ پیپر پر طبع شدہ تصاویر سے مزین یہ نمبر آپ اپنی مثال ہوگا

● یہ نمبر فروری ۱۹۵۰ میں شائع ہوگا۔ ● اس نمبر کی قیمت ڈھائی روپے ہوگی

ایجنٹ و مشتہرین حضرات مینجر کے نام اپنے آرڈر جلد روانہ فرمائیں

ساحر لکھنوی ایڈیٹر شبستان، دین دیال روڈ، اشرف آباد، لکھنؤ

عوض سعید

دلِ خانہ خراب

رسمی تعارف کے بعد حکیم عبدالمتین نے پہلا سوال جو مجھ سے کیا وہ یہ تھا "صاحبزادے تمہاری کیا عمر ہوگی؟"

"یہی کوئی تیئس چوبیس برس۔"

"جھوٹ بکتے ہو۔"

"تو پھر آپ ہی بتائیے شاید میری پیدائش کا دن آپ کی ڈائری میں نوٹ ہو۔ بیس سال کی عمر تو میرے چھوٹے بھائی ممتاز کی ہوگی متین صاحب!"

ارے ممتاز بیس برس کا ہوگیا۔ برسوں ہی کی تو بات ہے وہ ننگ دھڑنگ گلیوں میں کھیلا کودا کرتا تھا۔ انھوں نے کچھ حیرت اور مسرت کے ملے جلے جذبات میں ڈوب کر کہا۔

ابھی ابھی انھوں نے جو میری عمر کے تعلق سے فتویٰ دیا تھا اسے بالکل ہی بھول سنبھال کے وہ ممتاز کی عمر کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ دلی آنے کے بعد جب حکیم صاحب کا آنا جانا مکان میں زیادہ ہونے لگا تو وہ میرے بالکل ہی قریب آگئے۔ متین صاحب کی عمر ساٹھ برس کی تو یقینی ہوگی لیکن وہ اپنی عمر سے کوئی پندرہ برس کم دکھائی دیتے تھے۔ صورت شکل بھی بڑی اچھی پائی تھی جس سے بڑھاپے کا عیب بڑی حد تک ان کے چہرے کے دلآویز خطوط کی تہوں میں جا چھپا تھا۔ پتلی اونچی ناک فراخ ماتھا، چھوٹی چھوٹی کرنجی آنکھیں جن میں ذہانت کی چمک تھی اور جب وہ کوئی دلچسپ بات سنانے بیٹھتے تو ان کی چھوٹی چھوٹی تیز آنکھوں میں ہنسی کی جوت جل اٹھتی۔ ہنسی ان کے لبوں کے کنارے سے ہوتی ہوئی ہولے ہولے آنکھوں میں سمٹ آتی، ان کا نچلا ہونٹ قدرے موٹا تھا اور اوپر کا ہونٹ گلاب کی پنکھڑی کی طرح پتلا اور نازک تھا جس سے خواہ مخواہ انھیں یہ احساس ہوگیا تھا کہ ان کا نچلا ہونٹ بڑا بھدا ہے۔

ایک دن میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا تنہائی کے مزے لوٹ رہا تھا۔ باہر تڑاخے کی بارش ہو رہی تھی، وہ پانی میں شرابور ہانپتے کانپتے میری برابر والی کرسی پر آکر لڑھک گئے۔ ان کا سلیم شاہی جوتا پانی میں سبھیگ کر بالکل ہی اتھل پتھل لجلجا سا ہو کر رہ گیا تھا، اور سفید سلک کی شیروانی ان کے دبلے پتلے سینے سے یوں چمٹ گئی تھی جیسے کوئی ضدی بچہ فریاد کرتا ہوا اپنے باپ سے لپٹ جائے۔ میں نے کہا "متین صاحب۔ اس موسلا دھار بارش میں آپ نے گھر آنے کی زحمت

کیوں کی۔ کسی سے اپنا پیام ہی کہلوا دیا ہوتا۔ دیکھئے آپ کا بدن کانپ رہا ہے میرے کپڑے دھرے ہیں انھیں پہن لیجئے۔ یہ رہا تولیہ۔" میں نے تولیہ ان کے ہاتھ تھماتے ہوئے کہا۔

انھوں نے عجیب بے نیازی سے میرے ہاتھ سے تولیہ لیا۔ شیروانی اتار کر کھونٹی پر لٹکا دی اور جیب سے رومال کی ڈبیہ نکال کر دو چکی ناک میں ڈالی اور لگے چھینکنے۔ جب چھینکوں کا دورہ ختم ہوا تو قدرے میری جانب کرسی کھسکاتے ہوئے انھوں نے کہا۔

"صاحبزادے آج بارش میں طبیعت سمجھنا چاہتی تھی سوچا کیوں نا اسی رحمت باراں سے لطف اٹھایا جائے۔ اور میں تمھارے یہاں چلا آیا۔ وہ تمھاری نکوڑی ماما رحمت بی تو ہوگی ہی اس مردار سے کہنا کہ حکیم عبدالمتین کے لیے فوری ایک پیالہ چائے بنا کر لائے، پھینی بھی زیادہ ہو۔"

میں کرسی سے فوری اٹھا اور تھوڑی ہی دیر میں چائے بنا لایا۔ اس وقت ماما گھر پر موجود نہ تھی۔ میں نے ان سے یہ بات کہنا مناسب نہ سمجھا۔ جب میں نے چائے کا پیالہ ان کے قریب بڑھایا تو وہ ایک گھونٹ پی کر جھلا اٹھے۔

"دیکھا ظالم نے کوئی پاؤ بھر پھینی پیالے میں ڈال دی ہے۔ میں ذیابیطس کا مریض بھلا اتنی پھینی کیسے استعمال کر سکتا ہوں۔ حکیم ہونا بھی ایک عذاب ہے۔ وہ نکوڑی سمجھتی ہوگی حکیم جی کو ذیابیطس ہے بھی تو کیا گھر میں جو دو اخانہ موجود ہے۔ اب بھلا اسے یہ بات کون سمجھائے کہ حکیم اپنا آپ علاج نہیں کر سکتے۔ اور حکیم عبدالمتین کا علاج کرنے والا۔۔۔ یہاں کوئی ولد الحیض زندہ بھی ہے؟"

"متین صاحب! بارش کا موسم ہے کم از کم چھاتہ تو خرید لیا ہوتا۔"

"صاحبزادے کیا یہ ہودہ سی بات کرتے ہو کیا میرے ہاں برساتی نہیں جو میں چھاتہ خرید کر بے وقوفوں کی فہرست میں اپنے نام کا اضافہ کروں۔"

"کیا چھاتہ استعمال کرنا بیوقوفی ہے؟"

"سراسر بیوقوفی ہے۔" کہنے لگے۔ "میرے لڑکپن کا زمانہ تھا۔ گھر میں چچا مرحوم نے دم رخصت جائیداد میں جو چیزیں چھوڑی تھیں ان میں ان کا ایک چھاتہ بھی تھا۔ عجیب و غریب چھاتہ، جسے دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا تھا کہ چھاتے کے موجد نے سب سے پہلے اسے ہی تختۂ مشق بنایا ہوگا۔ یہی بارش کا زمانہ تھا جب ہوا تیز چلتی تو چھاتہ ہوا کے زور سے الٹ جاتا مجھے بڑی خفت ہوتی۔ ایک دن میں نے یہ چھاتہ چپکے سے چچا مرحوم کے مزار پر رکھ دیا۔ دوسرے دن اخباروں میں یہ دلچسپ خبر آئی کہ حکیم ابوالفتح کے مزار سے چھاتہ نکل آیا۔ میں اس دن خوب ہنسا۔ چچا مرحوم اگر زندہ ہوتے تو اخبار میں اپنا نام دیکھ کر کس قدر مسرور ہوتے۔ صاحبزادے! سن لی نا چھاتہ نہ خریدنے کی وجہ۔ آئندہ سے چھاتے کا ذکر نہ کرنا۔"

حکیم صاحب بڑے باغ و بہار قسم کے آدمی تھے۔ زندہ دلی ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ میں نے انھیں

اداس کبھی نہیں دیکھا۔ روتے بسورتے چہروں سے انھیں بڑی نفرت تھی۔ کہتے تھے جس دن میں کسی اداس چہرے کو دیکھتا ہوں تو میرا سارا کاروبار چوپٹ ہو جاتا ہے۔ ان کی رنگین مزاجی اور زندہ دلی کی دلّی میں بڑی دھوم تھی۔ حکیم صاحب کے کوئی اولاد نہ تھی۔ پھر دلی میں کالرا نے زور پکڑا تو آناً فاناً ان گنت آدمیوں نے اپنا بستر گول کر لیا اور ان کی بیوی نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ اس وقت بھی ان کے چہرے پر اداسی کی بدلیاں نہیں چھائیں۔

روایت تو یہ ہے کہ جب وہ قبرستان سے اپنی بیوی کو دفنا کر باہر آئے تو اپنے ایک جگری دوست کو اداس چہرہ بنائے کھڑا دیکھ کر کہا تھا "ابے مردود جو رو میری مری ہے اور اداس تو ہے۔ کہیں دال میں کچھ کالا تو نہ تھا۔"

یہ روایت صحیح ہو یا نہ ہو حکیم جی کی شخصیت بڑی پہلو دار تھی۔ میں نے کسی انسان کے مزاج میں اتنی بوقلمونی اور پیچیدگی نہیں دیکھی۔ خود میری مامی جان نے جب انتقال کیا تو انھوں نے مجھے روتا ہوا دیکھ کر سمجھانے کے انداز میں کہا "مرحومہ کی اجل آئی اور وہ چلی گئیں۔ زمین پر وہ ایک بوجھ ہی تو تھیں۔ اتنا رونا دھونا بھی کیا۔"

حکیم جی کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ انھوں نے اپنی بیوی کو اپنی زندگی میں ایک لمحہ بھی سکھ نہیں پہنچایا۔ ہر وقت اسے جلی کٹی سناتے۔ وہ چھوٹ چھوٹ کر روتی تو اس کے چہرے کی نقلیں اتارتے۔

گلی قاسم جان میں انھوں نے اپنا ایک مطب کھول رکھا تھا ایک چھوٹی سی تنگ ملگی تھی جس میں مشکل سے ایک چھوٹی سی الماری کہیں سے انھوں نے لا رکھی تھی جس پر چھوٹی چھوٹی دواؤں کی شیشیاں تھیں۔ اس سے ذرا پرے طاق میں دو تین بڑے شیشے رکھے ہوئے تھے جس میں غالباً عرقِ گاؤزبان تھا۔ انھوں نے اس چھوٹی سی قبر نما ملگی کے اوپری حصہ پر ایک بہت بڑا سائین بورڈ لگا رکھا تھا جس پر جلی حروف میں لکھا تھا "دلی کا نامور دواخانہ"

مجھے کبھی بلیماراں جانا ہوتا تو قاسم جان کی گلی بھی جاتا جہاں حکیم جی کا مطب تھا۔ وہ اکثر تنہا بیٹھے دکھائی دیتے اور کبھی کبھار بھولے بھٹکے کوئی آدمی اس طرف آ بھی جاتا تو اتفاق سے وہ ان کا دوست ہی نکلتا۔ ایک دن صبح دس بجے میں ان کے مطب گیا۔ مجھے دیکھتے ہی ان کی باچھیں کھل گئیں۔

"آؤ صاحبزادے" پھر جب انھوں نے اپنی مخصوص باتیں جو ایک طرح سے خوبصورت گالیاں ہوتی تھیں سنائیں تو دو بج گئے مجھے خبر تک نہ ہوئی۔ میں نے اجازت چاہی لیکن وہ مصر رہے کہ دواخانہ بند ہونے تک میں ان کا ساتھ دوں۔

"دواخانہ تو اب بھی بند ہی ہے حکیم جی ــــ"

وہ میرے اس سوال پر سٹپٹائے اور ان کے میلے چہرے پر خفگی کی ہلکی لہر نمودار ہو گئی۔

"کیا مطلب"

"مطلب صاف ہے" ــــ میں زیرِ لب مسکرایا۔

تم نے کیا مجھے کوئی گھٹیا حکیم سمجھ رکھا ہے۔ میں ٹٹ پونجیوں کا علاج نہیں کرتا۔ میری دوائیں نوابوں منسٹروں

کے ہاں جاتی ہیں۔ کل شفقت نواب نے گھر پر بلوایا تھا۔ میں نے صرف نبض دیکھنے ہی کے دو سو روپے لیے۔

جب شام ہوئی تو انھوں نے مطب کو تالا لگایا میں ان کے ساتھ ہی تھا۔ گلی قاسم جان پار کر کے وہ مجھے حافظ جی کی ہوٹل میں کھینچ لائے خود سیر ہو کر کھانا کھایا اور مجھے چائے پلائی۔ اس اثنا میں ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اندر داخل ہوا جس کے سامنے کے دو دانت غائب تھے۔ یہ مجھے اس وقت معلوم ہوا جب اس نے بے ڈھنگے انداز میں حکیم جی سے بات شروع کی۔

"حکیم جی آپ نے دوسری شادی نہیں کی؟"

میں نے دیکھا حکیم جی کے چہرے پر شادی کے ذکر کے ساتھ ہی ایک سرخ لہر سی دوڑ گئی۔

وہ معصومانہ انداز میں مسکرائے۔

"تو ہی دیکھ نا کھی مارا!"

تم اسے جانتے ہو سعید میاں۔ یہ میرا پرانا ملازم ہے۔ یہ میرے گھر میں کام کرنے کی بجائے کھیاں مارا کرتا تھا، اور اب مکھیاں مارنے کے فن میں کچھ اتنا ماہر ہو گیا ہے کہ ایک پریس میں سو روپے کی ملازمت ڈھونڈ لی ہے۔

حکیم جی کے مزاج میں جو پھکڑ پن تھا اس کا احساس شاید انھیں نہ ہو لیکن ذاتی طور پر میں ان کے پھکڑ پن سے کچھ ڈرا ہوا ہی رہتا تھا۔ انھیں نام بگاڑ کر کہنے کی بری عادت تھی یہ عادت آگے چل کر کچھ اتنی شدت اختیار کر گئی کہ انھوں نے اچھے بھلے ناموں کی سر بازار پگڑی اچھالنی شروع کر دی۔ کسی زمانے میں ان کے برابر والے مکان میں ایک دار و غہ جی رہا کرتے تھے جن کا نام فیاض علی تھا۔ انھوں نے فیاض علی کے نام کے آگے رتالو کا دم چھلا لگا دیا۔ اتفاق سے جب کوئی شخص فیاض علی کا پتہ ان سے دریافت کرتا تو وہ اطمینان سے کہتے۔ اس فیاض علی رتالو سے ملنا ہے آپ کو، یہ رہا مکان ــــ غرض وہ جو نام رکھتے چل نکلتا۔ مکھی مار کی مثال خود میرے سامنے تھی۔

میں بی اے کا امتحان دے رہا تھا۔ بدقسمتی سے میرا انگریزی کا پرچہ کچھ خراب ہو گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں میں فیل نہ ہو جاؤں میں نے حکیم جی سے یہ بات کہی تو انھوں نے تیقن آمیز انداز میں کہا۔ تمھارا کام ہو جائے گا برخوردار تم بے فکر رہو۔

میرا پرچہ پروفیسر کپور کے ہاں تھا جن کی کوٹھی سیگور روڈ پر واقع تھی۔ "حکیم جی پروفیسر کپور پتہ نہیں آپ کو جانتے بھی ہیں یا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ انکار کر دیں۔"

"کیا بات کرتے ہو بچہ۔ حکیم عبدالمتین کو کون نہیں جانتا۔ سنیچر کی شام اس پروفیسر کے بچے کے ہاں چلیں گے۔"

میں سنیچر کی شام جب ان کے گھر پہنچا تو وہ چائے پی کر میرا انتظار کر رہے تھے پہلے انھوں نے کچھ سوچا پھر کیا بات ذہن میں آئی کہ سلک کی سفید شیروانی اتار دی اور اولن کی کالی شیروانی پہن لی، اور چل کھڑے ہوئے۔ وہ راستہ بھر اپنی بڑائی کرتے رہے۔ دیکھو پروفیسر مجھ سے مل کر کس قدر مرعوب ہوتا ہے۔

جب ہم پروفیسر کپور کے گھر تیگور روڈ پہنچے تو انھوں نے حکیم جی کو دیکھ کر سیدھے منھ بات بھی نہیں کی۔ انھیں اس ناکامی سے بڑی خفت اٹھانی پڑی۔ اپنی اس خفت کو مٹانے کے لیے انھوں نے راستہ بھر بچوں کی سی حرکتیں کیں میں اسے کبھی نہیں بھلا سکتا۔ پھر کئی دنوں تک حکیم جی سے ملاقات نہیں ہوئی۔

ادھر دلی میں چوریاں بہت ہونے لگیں۔ خاص طور پر لاجپت نگر میں دن دھاڑے چور قفل شکنی سے باز نہیں آرہے تھے۔ ایک دن میں نے حکیم جی سے کہا: "قبلہ آپ لاجپت نگر چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ وہاں ان دنوں چوریاں بہت ہو رہی ہیں۔"

"حکیم عبدالمتین کے گھر بھلا چور قدم رکھنے کی جرات بھی کر سکتا ہے۔"

ٹھیک ہے، چور آپ کے گھر آکر کرے گا بھی کیا۔" میں نے طنزاً کہا۔ میرا تیر ٹھیک نشانے پر جا لگا تھا۔ وہ بلبلا کر رہ گئے۔

برخوردار پیٹ میں سے پاؤں نکالنا ٹھیک نہیں ہے۔ کوئی ایک ایسا نام رکھ دوں گا کہ زندگی بھر یاد رکھو گے۔

میں نے گھبرا کر دوسرا موضوع چھیڑ دیا۔

پھر ایک رات میں گہری نیند کے ہلکورے لے رہا تھا کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کھٹ کھٹ، کھٹ کھٹ کی بیہودہ سی آواز نے میری نیند اچاٹ کر دی۔ بس غصہ سے تلملاتا ہوا بستر سے اٹھا اور "کون ہے" کہتا ہوا مندی مندی آنکھوں سے باہر نکل آیا۔ یہ حکیم جی تھے۔ اتنی رات گئے حکیم جی کو دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی: "کیا ماجرا ہو گیا" میں نے ایک فراخ انگڑائی لیتے ہوئے بیزار لہجے میں کہا۔

یہاں وقت کی کسے پروا ہے صاحبزادے پہلے اپنی دراز زبان تو دکھانا۔ آخر تمھاری کالی زبان کا کہا پورا ہی ہوا۔ آج رات چور نے میرے گھر کا بالکل صفایا کر دیا۔"

"سچ" — میں نے حیرت سے کہا۔

"تو کیا جھوٹ" وہ بڑبڑائے۔

میرے مزید سوال سے پہلے انھوں نے چوری شدہ سامان کی ایک طویل فہرست میرے سامنے رکھ دی: "میرا فلپس ریڈیو، برتن، زیورات، کرسیاں، قالین سب ہی کچھ کمبخت گھسیٹ لے گیا۔"

"کیا آپ نے پولیس میں رپورٹ نہیں لکھوائی؟"

"لکھوا کر تو آرہا ہوں، لیکن چوری کا مال کبھی کسی کو ملا بھی ہے۔" انھوں نے یہ جملہ بڑے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

اور تھوڑی دیر بعد وہ مایوس اپنے گھر لوٹ گئے۔

دوسرے دن وہ ہر شخص سے کہتے پھر رہے تھے۔ میں لٹ گیا میرا سارا اثاثہ چوری ہوگیا۔ اب مجھے ایک نئی زندگی شروع کرنی ہوگی۔ جہاں تک مجھے علم ہے چور نے ان کے گھر سے صرف ریڈیو ہی چرایا تھا۔ باقی سب باتیں غلط تھیں۔ اسے اتفاق کہئے کہ چند مہینے بعد وہ ریڈیو بھی پولیس نے چور کو گرفتار کرنے کے بعد حکیم جی کو دلوا دیا۔

ایک دن حکیم جی خوش خوش میرے گھر آئے اور فاتحانہ انداز میں کہا: "وہ میرا ریڈیو مل چکا ہے۔ سنا تم نے جب بورڈ کو یہ معلوم ہوا کہ یہ ریڈیو عبدالمتین کا ہے تو اس نے گھبرا کر۔۔۔ اسے پولیس کے حوالے کر دیا تاکہ یہ مجھ تک پہنچ جائے۔ حکیم جی ریننگ ڈینگیں مارتے رہے اور میں چپ چاپ ان کی باتیں سنتا رہا۔

پھر ایک دن جب میں شام کو گھر لوٹا تو حکیم جی کی شادی کا رقعہ میز پر دھرا تھا۔ یہ ان کی تیسری شادی تھی۔

شادی کرتے ہی انھوں نے اپنے مطب کو تالا لگا دیا۔ یہ بات مجھے اس وقت معلوم ہوئی جب میری اچانک ملاقات لھی مارے ہوئی۔ وہ پریس سے واپس لوٹ رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ حکیم جی نے مطب کو تالا لگا لیا ہے۔ مجھے یقین نہ آیا میں سے رخصت کرتا ہوا اگلی قاسم جان گیا۔ واقعی ملگی کے دونوں پٹ بند تھے اور بدصورت سا زنگ آلود تالا لٹک رہا تھا۔ لگی کی دیوار پر کسی زندہ دل آدمی نے لکھ دیا تھا۔ ع

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل دکان اپنی بڑھا گئے

حکیم جی نے دوسری شادی کیا کی کہ ان سے ملنا دوبھر ہوگیا۔ ہر وقت بیوی کی آغوش میں گھسے رہتے۔

ایک دن شام میں نے ان کے گھر جا کر دستک دی۔ ایک خوبصورت نسوانی ہنسی کی آواز کے ساتھ مجھے حکیم جی کے بے ربط خوشگوار قہقہے سنائی دیئے۔ میں تھوڑی دیر باہر کھڑا اس بوڑھی محبت پر غور کرتا رہا جسے خضاب کی ضرورت تھی میں نے ب اور آواز دی اور اس کے ساتھ ہی حکیم جی مسکراتے ہوئے باہر نکل آئے۔

"صاحبزادے تم نے بہت برا کیا مشکل سے بات بنی تھی کہ تم وارد ہو گئے اب میری بجائے تم ہی اندر چلے جاؤ۔ وہ کچھ خوش ہوگی بے چاری۔"

حکیم جی بڑے منہ پھٹ واقع ہوئے تھے۔ بعض وقت ان کے اس بے تکے مذاق سے مجھے بجائے ہنسی کے کوفت سی ہوتی تھی۔ اکثر اوقات تو میں شرم سے پانی پانی ہو کر رہ جاتا تھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ حکیم جی کی جوانی بڑی رنگینیوں میں گذری تھی۔ ان کی اکثر راتیں جی بی روڈ پر گذری تھیں جہاں رنڈیاں رہتی ہیں۔ کہتے ہیں انھیں ایک رنڈی ریشماں سے بڑا عشق ہوگیا تھا، جو پنجاب کی رہنے والی تھی۔ ریشماں نے بھی سنا ہے حکیم جی کو چاہا تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے، ریشماں نے ایک خوبصورت سا بلوز پہن رکھا تھا۔ جب حکیم جی کوٹھے پر داخل ہوئے تو ریشماں نے انھیں پیار سے تھپتھپایا اور کہا۔ ذرا دیکھنا میرے بلوز کو۔ کتنا خوبصورت ہے یہ کپڑا۔ ساری دلی چھان ماری تب بھی نہ ملے۔

ریشماں نے حکیم جی کی انا کو چھیڑا تھا۔ وہ چپ چاپ اس کے پاس سے اٹھ آئے۔ چاندنی چوک، کناٹ پلیس کی ساری کپڑوں کی دکانیں چھان ماریں لیکن وہ کپڑا انھیں نہ مل سکا۔ پھر اچانک ہی انھیں ایک پرانی دکان کا خیال آیا جہاں جانا وہ بھول گئے تھے۔ اتفاق سے انھیں وہاں وہ کپڑا مل گیا۔ لیکن صرف چھ گرہ ــــ !!

حکیم جی پہلے تو پٹپٹائے پھر کچھ سوچ کر ایک فیصلہ لگایا۔ جیسے اپنے آپ وہ کسی نتیجے پر پہنچ گئے ہوں۔ انھوں نے خوشی خوشی دکاندار سے چھ گرہ کپڑا خریدا اور سیدھے ایک درزی کی دکان پر گئے اور کہا۔ میرے ہاں یہ چھ گرہ کپڑا ہے اس کا تم کچھ بھی سی دو۔ درزی ہنس پڑا۔

"حکیم جی مرنے کو آ گئے لیکن زندہ دلی نہیں چھوڑی"۔ پھر وہ مابوس ہو کے ایک موچی کے ہاں گئے اور موچی سے بڑی لجاجت سے کہا: "اس سلیم شاہی جوتی پر یہ کپڑا بڑی خوبصورتی سے چڑھا دینا"۔

پہلے موچی نے حیرت بھری نگاہوں سے حکیم جی کو دیکھا پھر سلیم شاہی جوتے کو دیکھ کر وہ آپ ہی آپ مسکرایا اور تیزی سے اس کا کھردرا ہاتھ مشین کی طرح جوتے پر چلنے لگا۔

رات جب ریشماں نے کپڑے کی بات چھیڑی اور طعنہ دیا تو حکیم جی نے اپنا پاؤں ریشماں کے منہ کے قریب لے جا کر غصہ سے کہا: "تم جو کپڑا پہنتی ہو اسے میرا جوتا پہنتا ہے"۔ اور کوٹھے سے اتر آئے۔

لوگوں کا کہنا ہے حکیم جی نے پھر کبھی کوٹھے کی صورت نہیں دیکھی۔ اس کے بعد ریشماں نے بھی کوٹھے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا۔ دریا گنج والے پنواڑی رکھال کا بیان ہے کہ یہ ریشماں حکیم جی کی پہلی بیوی تھی۔

اس طرف کئی مہینوں سے حکیم جی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ایک دن اوکھلا موڑ پر ان سے ملاقات ہو گئی۔ انھوں نے آج کمخواب کی خوبصورت شیروانی پہن رکھی تھی اور ہاتھ میں ریشمی رومال تھا وہ اس لباس میں بالکل دولہے معلوم ہو رہے تھے میں نے ان سے کم ملنے کا شکوہ کیا تو انھوں نے اس کا جواب اپنی مخصوص مسکراہٹ سے دیا۔

"اس وقت میں بہت مصروف ہوں۔ تم گھر جاؤ وہاں تمہارا کوئی انتظار کر رہا ہے"۔ یہ کہہ کر انھوں نے ایک ٹیکسی والے کو آواز دی اور موٹر میں بیٹھ کر چلے گئے۔

جب وہ چلے گئے تو میں حکیم جی کے بارے میں سوچنے لگا۔ "عجیب آدمی ہے۔ دو چار سنٹ بات بھی نہیں کی۔ بھلا گھر میں کون انتظار کر رہا ہوگا۔ شاید بوڑھے کا سر۔۔۔۔۔"

میں گھر پہنچا تو مجھے حکیم جی کا ایک رقعہ ملا جس میں ان کی شادی کی تاریخ درج تھی۔ میں سوچتا رہ گیا۔ کیا حکیم جی نے اپنی دوسری بیوی کو بھی طلاق دے دی۔ مجھے حکیم جی کی بڑھاپے میں یہ حرکت پسند نہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں شادی میں شرکت نہ کر سکا۔

ایک دن ملاقات ہوئی تو میں ڈر رہا تھا کہ کہیں حکیم جی شادی میں نہ آنے کے سلسلے میں مجھے گالیاں نہ دینے لگیں۔ لیکن انھوں نے مجھ سے ہمیشہ کی طرح ہنسی ٹھٹھول کی باتیں کیں۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو لیکن مکھی مار کا بیان تھا کہ انھوں نے شادی کے دن مجھے نہ دیکھ کر میری شان میں کچھ کہنے کے بجائے اپنی مرحوم ماں کو جی بھر کر گالیاں دیں۔

ایک دن حکیم جی سے ملنے میں ان کے گھر گیا۔ باہر کا دروازہ کھلا پڑا تھا۔ شیشے کی کھڑکیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ کانچ کے باریک باریک ریزوں کو دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا تھا جیسے ابھی ابھی کسی نے توڑ پھوڑ کی ہے۔ مکان میں سناٹا سا طاری تھا۔ جیسے ایک بہت بڑا طوفان حکیم جی کی گھر کی دیواروں کو منہدم کرتا ہوا چپ چاپ چلا گیا ہو۔

میں نے ڈر کر آہستہ سے آواز دی۔ "حکیم جی ــــ"

اور اندر سے کسی نے غصیلی گرجدار آواز میں جواب دیا۔ "حکیم جی کے بچے ذرا ٹھیر تو سہی"

یہ مکھی مار تھا۔ اس نے خفت اور شرمندگی کے مارے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے کہا۔

سعید میاں۔ دیکھو میری لڑکی کی کیا حالت بنی ہے۔ میں نے حکیم جی سے اس کی شادی اس لیے تو نہیں کی تھی۔

میں نے دیکھا۔ ایک سانولی سلونی دوشیزہ نیم بیہوشی کے عالم میں زمین پر پڑی تھی۔ اس کے چہرے پر جا بجا خراشیں تھیں جیسے کسی نے کانچ کے ٹکڑے اس کے چہرے پر پھینک مارے ہوں۔ پیشانی اور ناک پر بھی زخم کے گہرے نشان تھے۔ میں جب حکیم جی کے گھر سے باہر نکلا تو پڑوس کے ایک لڑکے نے مجھے دیکھ کر کہا۔

"بابو جی ــ بابو جی ــ ابھی ابھی حکیم جی تیز تیز اس قبرستان کی طرف گئے ہیں۔

میں بجلی کی سی رفتار کے ساتھ جب قبرستان کے پھاٹک کے قریب پہنچا تو دیکھا حکیم جی ایک مٹیالی رنگ کی قبر سے لپٹے پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ اور ان کے پاؤں میں وہی سلیم شاہی جوتا تھا جس پر انھوں نے موچی کے ذریعہ چھ گرہ کپڑا لگا لیا تھا ــــ!!

پامسٹری سائنس ہے اور سائنس ایک حقیقت اور آپ حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے

اگر آپ پامسٹری کو غلط ثابت کر سکتے ہیں تو

ایم۔ ایم۔ ہاشم پامسٹ

۸۸۶۔ اسپیشل بی کلاس ملے لی حیدرآباد سے رجوع کیجئے فون (۲۲۲۴)

صفی الدین صدیقی

دغل بازدنیا

میرے مکان کے عین مقابل سڑک کے اس پار میدان میں چند جھونپڑیاں ہیں۔ ان میں رہنے والے زیادہ تر فقیر اور بھک منگے ہیں۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ یہ میدان کسی درگاہ کی ملکیت ہے اور فقیروں کی یہ چھوٹی سی آبادی بہت پرانی ہے۔ قریب قریب ڈیڑھ سو سال پرانی۔ ان فقیروں کو حضرت کالے شاہ سے بہت عقیدت ہے کیونکہ ڈیڑھ سو برس پیشتر وہ خود اک بہت بڑے فقیر مانے جاتے تھے۔ اس بستی کے بیچوں بیچ حضرت کالے شاہ کا مزار ہے جس پر ہمیشہ گیروے رنگ کی چادر چڑھی رہتی ہے۔ سہ شام چراغ جلتا ہے جو رات بھر ٹمٹماتا رہتا ہے۔ اس مزار کا متولی بھکو شاہ ہے جس کا فقیروں پر غیر معمولی رعب داب ہے۔ بھکو شاہ کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے اور کئی مرتبہ اس کی گفتگو بھی سن چکا ہوں۔ وہ گٹھیلے جسم کا آدمی ہے۔ لمبی لمبی زلفیں، چھدری داڑھی، گلے میں موٹا سا تعویذ۔ وہ بھیک مانگنے یا پھیری کے لیے کبھی نہیں جاتا۔ اس کا گذارہ فقط دوسرے فقیروں کی محنت پر ہے۔ جب کوئی فقیر دن بھر کی تگ و دو کے بعد کچھ کما کر لاتا ہے خوشی سے اپنی بھیک کا ایک تہائی حصہ بھکو شاہ کے نذر کر دیتا ہے۔ تمام فقیر اس کو اپنا روحانی پیشوا مانتے ہیں کیونکہ وہ ان سب کو ہمیشہ دوزخ کے عذاب سے ڈراتا رہتا ہے۔

فقیروں کا پیشوا بھکو شاہ گانجے اور چرس کا بھی رسیا ہے۔ وہ مزار سے ملحق نیم کے ایک گھنے درخت تلے مست نیند سوتا ہے۔ بھکو شاہ کا اپنا ایک گھر بھی موجود ہے۔ مگر وہ شام کو محض روٹی کھانے وہاں جاتا ہے اور اپنی بیوی خیراتن کو بات بات پر بے تحاشہ پیٹتا بھی ہے۔

بھکو شاہ بڑا باتونی آدمی ہے۔ گویا وہ اپنی بستی کا اخبار ہے۔ دنیا کے ہر مسئلہ پر وہ اپنے انداز میں سوچ کر دوسروں کے سامنے اپنی رائے کا اظہار کر جاتا ہے۔ یہ خبریں بھکو شاہ عام طور پر ٹین شیڈ کے اس معمولی ہوٹل سے فراہم کرتا ہے جو بستی سے کچھ فاصلے پر واقع ہے، اور جہاں مزدور لوگ اور بھکاری چائے پینے کے لیے آجاتے ہیں۔ اسے چائے کی لت بری طرح پڑی ہوئی ہے۔ بھکو شاہ کا روز کا معمول تو دو پیالیوں سے کم نہیں البتہ مفت کی چائے وہ کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔

بھکو شاہ کے بھیک مانگنے کا طریقہ بھی عجیب و غریب ہے۔ آدھا آنہ اور پاؤ آنہ کی بھیک وہ کبھی قبول نہیں کرتا

ایک آنہ مل جائے تو ٹھیک، کم دینے والے کو اپنی بددعاؤں سے ڈراتا ہے۔ بھکو شاہ کی بددعاؤں میں بڑا اثر ہے کیونکہ مارواڑی اور بیوپاری قسم کے لوگ اس سے بہت گھبراتے ہیں۔ اگر وہ ناراض ہو کر چلا گیا تو ضرور بیوپاریں گھاٹا آتا ہے اور مارواڑیوں کا دیوالہ نکل جاتا ہے۔ اس کی دعاؤں میں بھی بلا کا اثر ہے۔ کسی سیٹھ سے خوش ہو کر اس نے دعا دی تھی کہ روئی کے سٹے میں اس کو لاکھوں کا فائدہ ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ تب سے مارواڑی بھکو شاہ کے معتقد ہیں۔ وہ ان پر اپنا اثر قائم رکھنے کے لیے زیادہ خیرات قبول نہیں کرتا۔ غلہ میں سے محض ایک آنہ نکال کر چلا جاتا ہے۔

میں نے بھکو شاہ کی بیوی خیراتن کو بھی دیکھا ہے۔ ناک نقشہ درست ہے مگر عام آدمیوں کا خیال ہے کہ وہ چال چلن کی درست عورت نہیں ہے۔ کئی بار وہ اپنے گھر سے بھاگ چکی ہے مگر کچھ عرصہ غائب رہنے کے بعد وہ لوٹ کر بھکو شاہ کے پاس آجاتی ہے۔ ان ہی موقعوں پر بھکو شاہ خیراتن کی خوب مرمت کرتا ہے لیکن جب خیراتن اپنی گمانٹھ سے اس کے ہاتھ میں ایک چمکدار سکہ تھما دیتی ہے تو وہ اس کے منہ پر تھوک اڑا کر چلا جاتا ہے۔ چرس کا دم لگا کر مست پڑا رہتا ہے۔

اک روز اتوار کی صبح کو وہ مجھ سے ملنے آیا۔ میں نے اس کو اندر آنے کے لیے کہا۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں کہنے لگا۔

"صبح سے چائے نہیں پی ہے۔ صرف ایک آنہ چاہیئے۔ آج کم بکھت اتوار ہے اور انج کا بازار بند۔"

میں نے کہا "بھکو شاہ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ تمھاری چائے ابھی بن کر آجائے گی۔"

وہ کہنے لگا "میرے لیے اچھی پتی ضائع نہ کیجئے ماسٹر صاحب۔ اپنا کام تو ہوٹل کی چائے سے بھی نکل جائے گا۔"

"بھکو شاہ اک روز اچھی پتی کی چائے بھی پی لو تو کیا ہرج ہے۔"

وہ "ھُوحق" کا نعرہ لگاتا ہوا قالین پر بیٹھ گیا۔ اس کے آنے سے کمرے میں ایک عجیب بو پھیل گئی تھی۔ اس کے پسینے کی بو جو میرے لیے بڑی ناگوار تھی۔ لیکن مجھے کچھ دیر کے لیے سب کچھ برداشت کرنا تھا۔ اپنی کہانی کے ایک کردار کی خاطر۔

میں نے اس کو برابری کے انسان کا درجہ دیتے ہوئے کہا۔

"بھکو شاہ نیچے کیوں بیٹھے ہو؟ آرام سے کرسی پر بیٹھو۔"

"نہیں ماسٹر صاحب۔ ہم فقیروں کو زمین پر زیادہ آرام ملتا ہے۔ یہ دنیا فانی ہے۔ محلوں کا عیش و آرام فقط دو دن کا ہے۔ اس کے بعد کی منزل وہی دو گز والی کوٹھری۔"

بھکو شاہ تصوف پر اتر آیا تھا اور مجھے دنیا کی بے ثباتی کا فلسفہ سمجھانے پر تل گیا تھا۔ مجھے اس کا ایک عجیب و غریب شعر یاد آگیا جسے وہ رمضان کے مہینے میں سحری کے وقت بڑی میٹھی دھن میں گایا کرتا ہے۔ اس کے اس شعر میں وہی بے ثباتی کا پیغام ہے۔

دغل باز دنیا ہے اور مطلب کے سارے
چلا جا مسافر کنارے کنارے

مجھے بھکو شاہ کے ان دو مصرعوں کے وزن یا فارم سے دلچسپی نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ علم عروض اور ردیف و قافیے کے اصولوں سے ناواقف ہوتے ہوئے بھی اس نے ان دو مصرعوں میں وہ سب کچھ ادا کر دیا ہے جو کہ وہ کہنا چاہتا ہے۔ (دغل باز دنیا کی ترکیب اردو زبان کو بھکو شاہ کی ایک دین ہے خواہ اسے ادیب اور زبان کے ماہر غیر مستند سمجھ کر کیوں نہ ٹھکرا دیں؟ بھکو شاہ فقیروں کا شاعر ہے۔ اس کے گیت فقیر اکثر گایا کرتے ہیں۔ اس کے ہر گیت میں دغل باز دنیا کی ترکیب ہمیشہ ایک سمبل (SYMBOL) کے طور پر موجود ہوتی ہے۔ گویا اس کے اپنے قلعہ کا یہی ایک مرکزی نکتہ ہے)

بھکو شاہ آرینج پیکو کی تازہ چائے بڑے مزے لے لے کر پی رہا تھا۔ وہ موڈ میں آگیا تھا۔ اس نے کپ کے بعد دیگرے دو بڑی بڑی پالیاں ختم کر ڈالیں، اور پھر اپنے گندے رومال سے ناک صاف کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"اب کہئے ماسٹر صاحب آپ کو کیا پوچھنا ہے؟"

میرا پہلا سوال تھا ــــ "بھکو شاہ تم کانی تو انا انسان ہو۔ اپنے بازوؤں سے روٹی کیوں نہیں کماتے؟ بھیک مانگنا بڑی بات ہے۔"

اس پر اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا، اور پھر سنجیدہ ہو کر جواب دینے لگا۔

"بھیک مانگنے کو آپ جیسے پڑھے لکھے لوگ بری بات سمجھتے ہیں۔ ہم نہیں! ہر کسی کو اپنے باپ داداؤں کے پیشے کی لاج رکھنی پڑتی ہے۔ ہمارے نرر گوں کے مرشد بھی ایک بہت بڑے فقیر تھے جنکی درگاہ کا میں خادم ہوں۔ ماسٹر صاحب۔ جن لوگوں کو اس دغل باز دنیا سے کوئی مطلب نہیں ہوتا وہ اس میں کودتے نہیں بلکہ کنارے کنارے چلے جاتے ہیں۔ جو ملتا ہے اس پر قناعت کرتے ہیں۔ فقیری ایک بہت بڑی دولت ہے۔ آپ پڑھے لکھے ہیں۔ آپ نے ہندوؤں کے ایک بہت بڑے فقیر کا نام سنا ہوگا۔ گوتم بدھ۔ وہ بھی بھیک مانگ کر گذارہ کرتے تھے۔ انھوں نے ایک نہیں دو نہیں بلکہ ہزاروں لاکھوں فقیروں اور فقیرنیوں کی ٹولیاں بنائی تھیں جو نگر نگر گھوم کر بھیک اکٹھی کرتے تھے۔ اب دیکھئے کہ اسی فقیر کا نام تمام دنیا میں روشن ہے۔ اس کے مندر جگہ جگہ ملتے ہیں۔ گوتم بدھ نے بھی اس دغل باز دنیا کو تیاگ دیا تھا۔ وہ خاندان کا شہزادہ تھا۔ اس کی ایک خوبصورت بی بی بھی تھی لیکن اس نے سب کو ٹھکرا دیا۔"

مجھے بھکو شاہ کی اس تقریر نے مبہوت کر دیا۔ وہ ایک جاہل مطلق ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ جانتا تھا۔ میں نے بات کا رخ بدل دیا۔

"گوتم بدھ کی بی بی کے بارے میں تو تم نے بتا دیا۔ وہ اپنی بیوی کو کبھی مارتے نہیں تھے اور تم اپنی بیوی کو بری طرح پیٹتے ہو ــــ یہ کیوں؟"

بھکو شاہ مسکرانے لگا ــــ

آپ خیراتن کی بابت پوچھنا چاہتے ہیں۔ اپنے پیرومرشد کی قسم ماسٹر صاحب کہ میں خیراتن کو بالکل نہیں پیٹنا چاہتا مگر کیا کروں وہ مجھے مجبور کر دیتی ہے۔ اسے مار کھانے کی عادت ہے۔ جب تک مرمت نہ ہو اس کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ اک مرتبہ غصہ میں میں نے خیراتن کو اس قدر پیٹا کہ اس کی ناک اور منہ سے خون بہنے لگا۔ وہ بہت دنوں تک بیمار رہی۔ میں نے رات دن اس کی خدمت کی اور دل ہی دل میں اپنے پیرومرشد سے وعدہ کیا کہ آئندہ عورت ذات پر کبھی ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ وہ بھلی چنگی ہو گئی۔ میں اس سے محبت کا برتاؤ کرتا رہا۔ اک روز وہ مجھے چھیڑ کر کہنے لگی۔"

"اے جی معلوم ہوتا ہے تم کو مجھ سے الفت نہیں رہی۔"

میں حیرت سے پوچھنے لگا۔

"یہ تو نے کیسے جان لیا؟"

تو وہ آنکھیں مٹکا کے کہنے لگی "محبت ہوتی تو کیا تم مجھے پیٹتے نہیں۔ معلوم ہوتا ہے دگڑو فقیر کی لونڈیا کے جال میں پھنس گئے ہو۔"

ماسٹر صاحب اس کی اس بات پر میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ دگڑو فقیر کی وہ تیرہ سالہ لونڈیا جس کو میں نے اپنی گود میں کھلایا ہے جو میری بیٹی برابر ہے اس کے ساتھ میرا ناتہ جوڑتی ہے۔ آپ ہی بتائیے میں اس کی کندی نہ کروں تو کیا کروں۔"

تمام معاملہ میری سمجھ میں آگیا۔ خیراتن کو دراصل مار کھانے کی عادت ہے۔ وہ جب تک بھکو شاہ سے مار نہیں کھا لیتی اس کو مزہ نہیں ملتا یہی وجہ ہے کہ وہ بھکو کو نہیں چھوڑتی۔ گھوم پھر کر اس کے پاس لوٹ آتی ہے۔

بھکو شاہ سے میں نے دریافت کیا۔ "تمھیں خیراتن پسند ہے؟"

وہ جھینپ کر کہنے لگا۔

"ماسٹر صاحب اس حرامزادی کے بغیر میرا جی نہیں لگتا۔ سچ پوچھیے تو مجھے اس کو مارنے میں بڑا مزہ آتا ہے اس کے علاوہ وہ مجھے بڑے پیار سے روٹی بھی کھلاتی ہے، اور مجھے گھر کی کچھ بھی فکر نہیں کرنی پڑتی۔"

"جانتے ہو روٹی کا بندوبست وہ کہاں سے کرتی ہے؟" نہ جانے میں نے اس سے یہ سوال کیوں کر دیا؟

"خوب جانتا ہوں ماسٹر صاحب ــــ خیراتن اول درجے کی بدکارہ ہے۔ مجھ سے کچھ زیادہ ہی کما لیتی ہے۔" بھکو فوراً بول اٹھا۔

"اور ایسی کمائی کھانا تمھیں پسند ہے؟"

بھکو شاہ اپنے مخصوص انداز میں کہنے لگا ــــ "ماسٹر صاحب آپ بہت زیادہ پڑھے لکھے ہیں نا اس لیے

(باقی صفحہ ۷۲ پر)

موپاساں

(ترجمہ)
سیّد شبّیر حسین

مسٹی[1]

یہ ایک بہت ہی پرانی بات ہے۔ اُن دنوں میرے تعلقات ایک نہایت ہی عجیب و غریب عورت سے تھے۔ یہ عورت شادی شدہ بھی یقیناً تھی۔ غیر شادی شدہ عورت سے تعلق کے خیال ہی سے میرے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں۔ یہ بات میری سمجھ میں کبھی بھی نہ آسکی کہ آخر کسی ایسی عورت سے تعلق رکھنے میں لطف ہی کیا ہو سکتا ہے جو کسی کی نہیں اور پھر ہر ایک کی بھی ہے۔ ایسی عورت تو اپنے ہی دو ہرے نقصان کا ہدف بنی رہتی ہے۔ مسئلے کے اخلاقی پہلوؤں کو نظر انداز کر کے بھی اگر پورے خلوص کے ساتھ غور کیا جائے تو بات بالکل صاف ہے کہ جنس کو پیشہ تو ہرگز بننا نہیں چاہیئے۔ مجھے اس سے کچھ گھن سی آجاتی ہے۔ یہ میری ایک کمزوری ہے، اور مجھے اپنی اس کمزوری کا اعتراف بھی ہے۔

شادی شدہ عورت بہر حال ایک رحمت ہوا کرتی ہے۔ اس میں سب سے بڑی چیز جو مجھ جیسے کنوارے کو مل سکتی ہے وہ ہے ٹھکانے کی سہولت۔ ایک اچھا خاصا سجا سجایا اور آراستہ گھر اس کو مل جاتا ہے۔ جس میں آسائش کی ہر چیز موجود ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اہل خانہ سے ہر فرد کی ہمدردیاں بھی مفت میں اس کے شریک حال ہو جاتی ہیں۔ ان افراد میں نوکر چاکر، عزیز، شوہر سب ہی برابر کے حصہ دار ہوتے ہیں۔ آنے والا گویا ان کا مہمان عزیز ہے۔ جو غیب کی ان گنت نعمتیں لے کر ان کے گھر نازل ہوا ہے اور اس کی خاطر تواضع اور خدمت گذاری ان کا پہلا فریضہ ہے، اور پھر یہاں کی ساری مسرتیں بھی مشترک ہوتی ہیں ــ دوستی، محبت، دسترخوان، بستر اور پدریت سب ہی ــ گھریلو زندگی کا یہ چین اور آسائش گھروں کے ہمیشہ بدلتے رہنے کے غیر محدود موقعوں کے علاوہ ہے۔ آپ حسب ضرورت اور حسب ذوق جس معیار کا ماحول چاہیں اپنے لیے چن سکتے ہیں۔ گرمیوں میں مضافات چلے جایئے کوئی غریب دہقان بخوشی اپنے ایک آدھ کمرے کا آپ کو حصہ دار بنا لے گا۔ سرما میں شہر چلے آیئے متوسط گھرانوں کے دروازے تو ہمیشہ کھلے ملیں گے ہی لیکن اگر آپ تھوڑی سی ہمت سے کام لیں تو اعلیٰ گھرانے بھی باہیں پھیلا کر آپ کا استقبال کر سکتے ہیں۔

مجھ میں ایک اور بھی کمزوری ہے۔ میں اپنی ان داشتاؤں کے شوہروں کا بھی دلدادہ ہوں۔ شک نہیں کہ

---

[1] MISTY

بعض شوہر نہایت ہی بدقماش اور مکروہ ہوتے ہیں۔ اپنی بیویوں کے خلاف میری نفرت کو ابھار کر مجھے بہکانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ سب کچھ دیکھ بھال کر ہی میں معاملے کرتا ہوں۔ کہیں کسی شوہر میں اگر ذرا سی بھی زندگی اور زندہ دلی ہوتی ہے تو میں اس کا دیوانہ ہو جاتا ہوں۔ ساتھ ہی اس بات کی بھی پوری پوری احتیاط برتتا ہوں کہ بیوی سے خواہ تعلقات ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ ہی کیوں نہ جائیں لیکن شوہر سے کبھی شکر رنجی پیدا نہ ہونے پائے۔ اس طرح ان ہی شوہروں میں سے میں نے بعض نہایت اچھے دوست بھی پیدا کر لیے ہیں۔ اور بارہا ایسی دوستی کی وساطت سے مرد کے تفوق و برتری کی میں نے تصدیق بھی کی ہے۔ عورت ایک جھمیلہ ہے خطرناک حد تک آپ کو مصائب میں مبتلا کر دینے کی کوشش کرے گی۔ کچھ نہیں تو کوسنے ہی سنا دے گی، گالیاں تک دے گی۔ بہرحال آپ کو تماشہ بنا دے گی۔ لیکن مرد کا رویہ، جس کو بھی احتجاج و شکایت کے مساوی بلکہ زیادہ حقوق حاصل ہیں ہمیشہ عورت کے برخلاف ہوگا۔ آپ گویا ایک فرشتۂ رحمت تھے جس کا نزول اس کے گھر ہوا تھا۔

ہاں تو وہ جس کا میں تذکرہ کر رہا تھا بڑی ہی عجیب تھی۔ رنگ سانولا نکلین، مزاج الھڑ اور متلون، سخت مذہبی ہونے کے ساتھ ساتھ سخت وہمی بھی تھی۔ سادہ لوح بھولی بھالی۔ سب سے بڑھ کر بوسہ دینے میں تو اس کو کمال حاصل تھا۔ یہ چیز مجھے اور کہیں اور کبھی نہ مل سکی..... مگر یہ بات یہاں کچھ بے محل سی ہو جاتی ہے..... جلد نہایت ہی نرم و مصفا، ایک قسم کا ابدی سرور مجھے اس کا ہاتھ تھام لینے سے ہوتا۔ اور پھر وہ اس کی آنکھیں..... اپنی گھنیری اور وزنی پلکوں کو اٹھا کر جب وہ مجھے دیکھتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ محبت و سرور کا ایک بے انتہا ساگر ہے جو مجھے اپنی آغوش میں سمیٹ رہا ہے۔ اس کے زانوؤں پر سر رکھ کر کبھی کبھی میں گھنٹوں گم ہو جاتا، اور وہ اپنی لطیف و سبک مسکراہٹ کے ساتھ جو عورتوں کا ایک وصف ہے مجھ پر جھکی ہوتی۔ میری نظریں، انگلیں اور شباب و حسن کی ایک لطیف شراب بوند بوند کر کے میرے قلب میں ٹپکنے لگتی۔ اس کی ریشمی آنکھوں سے پھوٹنے والی وہ تاباں شعاعیں جن میں پیار کا ایک سنسار بسا ہوتا اور وہ اس کی پتلیوں کی نیلاہٹ جو سکون و سرور کا آکاش بن کر مجھ پر چھا جاتا۔

اس کا شوہر کہیں خانگی ملازم تھا۔ خانگی نوکر گھر یا گھاٹ کا نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہ بھی گھر سے دنوں غائب رہتا ہماری شامیں بالکل آزاد تھیں اور یہ وقت عموماً میں اسی کے گھر گذارتا وہ صوفہ پر بیٹھی ہوتی اور زانو پر میرا سر۔ اس کی گود میں ایک موٹا تازہ کالا بلا بھی ہوتا۔ یہ بلا اس نے بڑی چاہت سے پال رکھا تھا۔ ہم دونوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں مل کر اس بلے کی ریشمی پشت میں پیوست ہو جاتیں۔ اس بلے کے نچلے جسم کی حرارت مجھے اپنے گال پر محسوس ہوتی اور اس کی خرخراہٹ کو میں صاف صاف سن سکتا۔ کبھی کبھی اپنے جسم کو اکڑا کر ایک آدھ پنجہ وہ میری آنکھ پر رکھ دیتا اور اس کے پانچ تیز ناخن پپوٹے میں دھنس کر آنکھ کے ڈھیلے میں چبھنے لگتے، اور ایسا محسوس ہوتا کہ کسی لمحہ بھی وہ میری آنکھ کے ڈھیلے کو نکال کر باہر پھینک دے گا۔

ہم دنوں کبھی کبھی باہر نکل جاتے۔ اس عمل کو وہ فرار سے تعبیر کرتی۔ ہمارا یہ فرار واقعتاً نہایت ہی معصوم ہوتا کبھی کسی غیر معروف ہوٹل میں ہم رات کا کھانا کھا لیتے یا اگر کھانا کھا کر باہر نکلتے تو جماعت سے بھاگے ہوئے طالب علموں کی طرح کسی دور دراز کے شراب خانے میں ڈرتے ڈرتے داخل ہوتے اور کسی ہلکی پھلکی شراب کی چسکیاں اڑا لیتے۔

ہماری یہ پناہ گاہیں عموماً دور دراز کے گمنام اور بڑے ہی گھٹیا درجے کے شراب خانے ہوتے جن کی مدھم روشنی میں دھوئیں کے غلیظ بادلوں کو چیرتے ہوئے کسی کونے کی چرچراتی اور جھولتی ہوئی کرسیوں پر ہم بیٹھ جاتے۔ فضا میں ایک تیز سی چبھتی ہوئی بو ہوتی جو رات کے کھانے پر دی ہوئی مچھلی کی یاد کو تازہ کر دیتی۔ ہمارے اطراف میں بے فکرے برانڈی کے پیگ پر پیگ چڑھا کر گو بجلی آواز میں گپ لڑا رہے ہوتے۔ اور سہما ہوا ویٹر شیری کی ایک بوتل اور دو خالی گلاس ہماری میز پر چپکے سے رکھ کر کھسک جاتا۔

ایک لذت آگیں خوف سے تھرتھراتی ہوئی اپنی سیاہ نقاب کو الٹ کر وہ ناک کی پھننگ پر اٹکا دیتی اور کسی سین گناہ کے احساس کو بیدار کر کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ پینے لگتی۔ ہر گلاس پر اس کا یہ احساس اور بھی بھڑک اٹھتا اور ہر گھونٹ ایک ممنوعہ مسرت بن کر اس کے حلق سے نیچے اتر جاتا۔

پھر نہایت ہی مہین آواز میں کہتی "اب چلیں"۔ ہم اٹھ کھڑے ہوتے وہ ہلکے ہلکے اور تیز تیز قدم ڈالتے ہوئے سر جھکائے باہر نکل جاتی۔ بے فکرے متوالوں کی شوق اور غضب سے ملی ہوئی نگاہیں دور تک اس کا پیچھا کرتیں۔ باہر نکل جانے پر وہ ایک لمبا اور گہرا سانس لیتی جیسے کسی بڑی مہیب مصیبت سے نجات مل گئی ہو۔

ایسی حالت میں کبھی لرزکر وہ مجھ سے پوچھ بیٹھتی "اگر کوئی مجھے چھیڑ دے یا بدتمیزی پر اتر آئے تو آپ کیا کریں گے؟" یہ سوال میرے لیے بالکل ہی غیر متوقع ہوتا۔ میں کچھ سنبھل کر جواب دیتا "ہڈیاں نہیں توڑ ڈالوں گا اس بدمعاش کی"۔ اس جواب سے اسے بڑا اطمینان ہوتا اور خوشی سے جھوم کر وہ بازو دبا دیتی۔ اس حرکت میں ایک دبی ہوئی خواہش جھانکتی ہوئی مجھے دکھائی دیتی کہ کوئی اسے چھیڑے اور اس کی ہڈیاں توڑنے کے لیے میں مجبوراً جھپٹ پڑوں۔

ایک شام کسی ایسے ہی اندھے شراب خانے کے ایک گوشے میں ہم بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک بڑھیا داخل ہوئی یہ نہایت پھٹے حالوں میں تھی اور تاش کی ایک میلی کثیف سی گڈی اس کے ایک ہاتھ میں تھی۔ جب اس بڑھیا نے ایک خاتون کو یہاں بیٹھا پایا تو سیدھے ہماری میز کا رخ کیا اور میری ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے نہایت گہرے لہجے میں کہا "اپنی تقدیر معلوم کرو"۔ یہ غریب جوہر بات پر نہایت ہی آسانی سے عقیدہ لا لیتی تھی اشتیاق کا شکار ہو گئی اور بڑھیا کو اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔

معلوم نہیں تاریخ کے کس دور سے اس چڑیل کا تعلق تھا۔ ہاتھوں اور پاؤں پر جگہ جگہ سے جلد لٹک آئی تھی۔ چہرے پر تہہ بہ تہہ جھریاں اور آنکھوں کے اطراف بڑے بڑے اور گہرے حلقے۔ اس نے تاش کے پتے بچھانے

شروع کیے۔ پہلے تو یہ ایک ایک پتا بچھاتی گئی اس کے بعد ان کی جوڑیاں بنائیں، پھر تین تین اور اس کے بعد چار چار۔ درمیان میں کچھ پتے اٹھاتی بھی گئی۔ اس نے کچھ بڑبڑانا شروع کیا۔ ایما مبہوت بنی اس کے انہماک کو دیکھتی اور اس کی بڑبڑاہٹ کو سنتی رہی۔ کبھی اس کا رنگ بالکل پھیکا پڑ جاتا، کبھی سانس تیز تیز چلنے لگتا اور دوسرے ہی لمحہ حیرت و مایوسی کے آثار اس کے چہرے پر ابھر آتے۔

اب بڑھیا نے کہنا شروع کیا۔ اس کی ساری پیشین گوئیاں اوٹ پٹانگ مبہم اور گنجلک سی تھیں۔ "مسرف ..... اولاد ..... ایک خوب رو نوجوان ..... سفر ..... بڑی دور کا، دولت ..... مقدمہ بازی ..... ایک سیاہ فام مرد ..... واپسی ..... کامیابی ..... اور ..... موت ..... ؟" موت پر ایما چونک پڑی اور اس نے بڑھیا پر سوالات کی بوچھار کر دی۔ کس کی موت؟ کیسی موت؟ کس طرح؟ کیسے؟ کیوں ..... ؟

بڑھیا نے جواب دیا۔ "یہ پتے اتنے جاندار نہیں کہ میں پورا پورا صحیح حال بتلا سکوں۔ ہو سکے تو کل میرے گھر آجاؤ کسی اور طریقے سے سولہ آنے سچ سچ بتلا دوں گی۔"

ایما نے اسی عالم میں میری طرف دیکھا اور التجائیں کرنے لگی۔ "کل چلو نا ڈارلنگ۔ نہیں نہ کہو۔ مجھے بڑی کوفت ہوگی۔ وعدہ کرلو۔"

مجھے ہنسی آگئی۔ "برابر چلیں گے ڈارلنگ نہیں۔ بھلا کیوں؟" بڑھیا نے اپنا پتہ ہمیں دے دیا۔

کسی گمنام محلے میں ایک عمارت کی چھٹی منزل پر وہ رہتی تھی۔ دوسرے دن ہم اس کے گھر پہنچ گئے۔

یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جو شاید اس پوری عمارت کے ٹوٹے پھوٹے اور فالتو سامان کے لیے بنوایا گیا تھا۔ بہت عجیب و غریب اور نادر چیزیں ہم نے یہاں دیکھیں۔ جو معمولاً کہیں اور دیکھنے کو میسر نہیں آسکتیں۔ یہ گویا چھوٹا موٹا عجائب گھر تھا۔ دیواروں پر بھانت بھانت کے خشک کیے ہوئے چھوٹے بڑے پودے، پتے اور جڑیں آویزاں تھیں۔ ان کے ساتھ ہی مختلف قسم کے رینگنے والے حشرات اور دوسرے چھوٹے جانوروں کو سکھا کر لٹکا دیا گیا تھا۔ ایک کونے میں دیوار سے لگے ایک لمبے تختے پر مختلف وضع اور ناپ کی شیشیاں جن میں رنگ برنگی مایع بھرا ہوا تھا۔ دوسرے کونے میں ایک قدیم پلنگ۔ کمرے کے عین بیچ میں ایک میز اور دو کرسیاں۔ میز کے بیچوں بیچ ایک سیاہ و فربہ بلے کی کھال میں بھس بھر کے لوہے کے تاروں کے سہارے کھڑا کر دیا گیا تھا۔ کمرے کی پوری ہیبت ناک فضا پر اس بلے ہی کا تسلط معلوم ہوتا تھا۔

ایما نے۔ جو خوف سے بے حال ہو رہی تھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے مجھ کو مخاطب کر لیا۔

ارے اسکو تو دیکھو ڈارلنگ بالکل اپنے مسٹی جیسا ہے۔" ساتھ ہی اس نے بڑھیا کو بھی بتلایا کہ ایک ایسے ہی بلے کو خود اس نے بھی پال رکھا ہے۔ "اوہ بالکل یہی۔"

خطرناک ہے۔" محبت کے لیے سخت خطرہ ہے" پیار کرنے والوں کے گھروں میں ایسے بلّے کا وجود سخت خطرناک ہوا کرتا ہے" بڑھیا نے کہا۔

"کیوں خطرناک ہوا کرتا ہے" خوف میں ایما کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

بڑھیا نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور کہا "میری زندگی کے سارے آلام کا سبب یہی کالا بلّا ہے"

اب ایما بے چین ہوگئی۔ اور اس کو مجبور کرنے لگی کہ پورا واقعہ سنائے۔ تجسس زرد یقینی اور توہم میں سب ہی عورتیں یکساں ہوتی ہیں۔ بڑھیا بھی ایما کی بے چینی سے متاثر ہوگئی اور اپنا قصّہ سنانا شروع کیا۔

"مجھے اس بلّے سے بڑا پیار تھا" بڑھیا نے بھس بھری کھال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "جیسے کسی کو اپنے قریبی رشتہ دار سے ہوا کرتا ہے" ان دنوں میں جوان تھی۔ تنہا رہا کرتی تھی اور رسی پر کے اپنا پیٹ پالتی تھی اس بڑی دنیا میں مانٹین یہی بلّا میرا ایک رفیق تھا۔ ایک پڑوس نے تحفتاً مجھے دیا تھا۔ جب یہ بہت چھوٹا تھا۔ یہ بڑا چالاک تھا اور بڑا مسکین۔ مجھے چھوڑ کر کہیں آتا جاتا نہ تھا۔ ہر وقت میرے اطراف گھومتا رہتا۔ دن بھر میری گود میں پڑا رہتا اور رات میں میرے ہی تکیے پر اتنا قریب مجھ سے سوتا کہ اس کے دل کی دھڑکنیں میں صاف سن سکتی تھی۔

"اسی اثنا میں ایک شخص سے میرا تعارف ہوگیا۔ یہ ایک شریف الطبع نوجوان تھا جو کسی پارچہ فروش کی دکان میں ملازم تھا۔ دن گذرتے رہے اس کی تجویز تھی کہ ہم دونوں ایک ہی ساتھ رہنے لگیں۔ کفایت کی خاطر میں نے عرصہ تک اس کو کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن تم تو جانتی ہو کہ عورت کو اپنی بعض کمزوریوں کے آگے جھکنا ہی پڑتا ہے۔ کوئی عورت اس سے مستثنیٰ نہیں۔ قطع نظر اس کے سچ تو یہ ہے مجھے اب اس سے کچھ لگاؤ سا ہوگیا تھا۔ یہ آدمی تھا بہت نیک اور ہمدرد۔ ایک شام میں اس کو اپنے یہاں دعوت دی۔ اس کے بلانے میں میرے کوئی خاص ارادے نہیں تھے۔ خدا گواہ ہے کوئی ارادہ نہیں۔ شام کا ایک گھنٹہ صرف میں اس کے ساتھ گذارنا چاہتی تھی۔

وہ بڑے تپاک سے ملا۔ بڑی خوش اخلاقی سے پیش آیا۔ سارا وقت بڑی اچھی اچھی باتیں کرتا رہا۔ یقین مانو میرے دل کی کلی جو مدت سے کملائی مرجھائی پڑی تھی کھل.... اٹھی۔ رخصت کا وقت آگیا۔ اس نے میرا ایک بوسہ لیا۔ ایک سچّا اور محبت سے لبریز بوسہ۔ میری آنکھیں خود بخود بند ہوگئیں، جیسے ایک غنودگی سی مجھ پر طاری تھی۔ میری نسوں ایک مٹھاس سی دوڑنے لگی۔ لیکن یکایک ایک بجلی کے سے جھٹکے کے ساتھ وہ مجھ سے پرے ہٹ گیا اور ایک دلدوز چیخ کی آواز کمرے کی فضا میں دوڑ گئی۔ وہ چیخ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے اور کبھی میں اس چیخ کو بھول نہیں سکتی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا۔ مانٹین اس کے چہرے سے چمٹا ہوا ہے اور چاروں طرف سے خون کی دھاریاں رواں۔ مانٹین کس بے دردی سے اپنے تیز تیز ناخنوں اور دانتوں سے اس کے چہرے کو پھاڑ رہا تھا جیسے کسی چیتھڑے کی دھجیاں بنا رہا ہو۔

میں نے جھٹ اس کو علیحدہ کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے ناکامی ہوئی۔ یہ اپنے تیز ناخن اس کے چہرے کی جلد میں گاڑھ کر مسلسل جھٹکے مار رہا تھا۔ میں نے دوبارہ کوشش کی لیکن اس نے کاٹ کھایا۔ آخر بڑی مشکل سے میں اس پر قابو پا سکی۔ اور جیسے ہی یہ گرفت میں آیا میں نے اس کو دریچہ سے باہر پھینک دیا۔

"اس غریب کا فوراً منہ دھلایا۔ چہرے کی جلد کہیں سے ثابت نہیں بچی تھی اور دونوں آنکھیں بھی جا چکی تھیں۔ اس کو ہسپتال میں شریک کروا دیا۔ ایک سال کی سخت اذیت سہنے کے بعد وہ مر گیا۔ کئی بار میں نے کوشش کی کہ اس کو اپنے پاس لے آؤں اس کی تیمارداری کروں پر وہ کسی طرح راضی نہ ہوا۔ مجھ سے شاید اسے نفرت ہو گئی تھی۔"

"مانگین چھ منزلوں کی بلندی سے گرا تھا، زندہ تو کیا بچتا دوسرے دن کسی پورٹر نے گھسیٹے ہوئے لاکر میرے کمرے کے سامنے اسے پھینک دیا۔ یہ شکل وصورت جو تم اس وقت دیکھ رہی ہو میں نے ہی دی ہے ـــ اور اس کی وہ خونخوار حرکت اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ وہ رقابت کو برداشت نہ کر سکا۔ اس کے سوا کوئی اور سبب تم بھی نہیں بتلا سکو گی۔"

بڑھیا خاموش ہو گئی اور ہولے ہولے مانٹین کا سر سہلانے لگی۔ تاروں کے سہارے کھڑے مردہ بتے میں حرکت پیدا ہو گئی۔

.....اور ایسا..... بچ سی گئی۔ اس موت کا خیال اس کے ذہن میں کہیں گم ہو گیا۔ جس کے بارے میں وہ دریافت کرنے کے لیے آئی تھی۔ ایک لفظ بھی اس کی زبان سے نکل نہ سکا۔ چپکے سے پانچ فرانک کا ایک نوٹ بڑھیا کے ہاتھ پر رکھ دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

دوسرے دن ایسا کا شوہر آ چکا تھا۔ اور اس کے بعد جب میں ملاہوں تو بیچ میں کئی دن گذر چکے تھے۔

مسٹی گھر میں کہیں نظر نہ آیا۔ مجھ کچھ حیرت سی ہوئی۔ میں نے ایسا سے پوچھا "مسٹی کہاں ہے؟"

اس نے کچھ جھینپ کر جواب دیا "میں نے اسے چھڑوا دیا ـــ کہیں دور۔ ڈر لگنے لگا تھا۔"

"ڈر ـــ کاہے کا ـــ" حیرت ہے۔"

وہ مجھ سے لپٹ گئی اور ایک لمبے بوسے کے درمیان مہین آواز میں بولی "تمھاری آنکھیں ڈارلنگ ـــ!"

بقیہ دغل باز دنیا

یہ بھید نہیں جانتے۔ ہم فقیر لوگ گھر گھر سے بھیک مانگ کر لاتے ہیں کیا آپ کے خیال میں وہ سب حلال کی کمائی ہوتی ہے اب منہ مت کھلوائیے۔ یہ دغل باز دنیا کا دستور ہی نرالا ہے۔ یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ کونسی کمائی حلال کی ہے اور کونسی کمائی حرام کی۔ میں مانتا ہوں کہ خیرات اول درجے کی بدکارہ ہے مگر آپ صاحب اس میں ایک بہت بڑی اچھائی ہے۔"

میں حیرت سے پوچھنے لگا "وہ کیا؟"

وہ سھاری بھرکم آواز میں کہنے لگا "پیا داری، حضرت پیر و مرشد کالے شاہ کی درگاہ پر اک قوالی ہوتی تھی وہیں سے آپ کے لیے ایک شعر نکال کر لایا ہوں۔ جانے کس بھلے مانس کا ہے۔"

بھکو شاہ بالکل قوالی کی دھن میں وہ شعر سنانے لگا۔

و پیا داری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

میں مبہوت رہ گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری کہانی کا ہیرو بھکو شاہ واقعی ایک اچھوتا کردار ہے۔

اختر حسن

زمین کا چاند

دوستو! بزم سجاؤ کہ شبِ جشن ہے آج حسن والوں کو بلاؤ کہ شبِ جشن ہے آج
ہمدمو! ساز اٹھاؤ کہ شبِ جشن ہے آج پیار کے گیت سناؤ کہ شبِ جشن ہے آج
آج ارمانوں کے گلشن میں بہار آئی ہے
قلبِ بے تاب میں بھی آج شکیبائی ہے

آؤ پھر تذکرۂ چشمِ فسوں بار کریں آؤ پھر تازہ حدیثِ لب و رخسار کریں
حسنِ خود بیں کو جہاں بینِ وجہاں دار کریں عشق کو جرأتِ بے باک سے سرشار کریں
بربطِ نغمۂ محبت کے ترانے گائیں
آؤ انسان کی عظمت کے ترانے گائیں

آج قدرت ہے نگوں سار حضورِ آدم آج انسان کی مٹھی میں ہے اسمِ اعظم
آسمانوں سے یہ آتی ہے ندائے پیہم مرحبا، صلِّ علیٰ چشم و چراغِ عالم
عشق کی جست کے آگے یہ جہاں کچھ بھی نہیں
بندشِ قید زماں جبرِ مکاں کچھ بھی نہیں

تابعِ ذوقِ نظر شام و سحر کا جلوہ عشرتِ موسمِ گل خونِ جگر کا جلوہ
دیدنی ہے پرِ پروازِ ہنر کا جلوہ آج انوکھا ہے بہت فکرِ بشر کا جلوہ
آسمانوں پہ زمینوں کا مکیں جا پہنچا
قاصدِ فرش سرِ عرش بریں جا پہنچا

تذکرہ فرش سے تا عرش ہے ہر سو اپنا سیر کو آج چلا اک مہ خوش رو اپنا
آج ہے وسعتِ افلاک پہ قابو اپنا آج چلتا ہے ستاروں پہ بھی جادو اپنا
عشق کا شعلۂ پُر نور محل اٹھتا ہے
دیکھنا پردۂ ناموسِ ازل اٹھتا ہے

(ناتمام)

عبدالرؤف عروج

تنہائیاں

پھر افق پر چاند چمکا شیشموں کی آڑ سے
پھر فضائیں جگمگائیں، جگمگائے کوہسار
پھر دمیدہ رنگ کلیوں نے اڑایا ہے گلال
پھر مہکتے شاخچوں کے پیرہن ہیں زرنگار
دل ہی جب سینے میں ارمانوں کی لَو دیتا نہ ہو
کون جانے مجھ سے کیا کہنے کو آئی ہے بہار

کہکشاں پیمانہ خیالوں کی اڑانیں تھک گئیں
نیم جاں، بے خواب یادوں کے جزیرے سو گئے
آس کا مدھم دیا بھی جھلملا کر رہ گیا
کارواں نادیدہ سپنوں کے بھی دھندلے ہو گئے
کن دیاروں میں مہکتی ہے محبت کی سگندھ
کون پی کے دیس میں چاہت کے موسم کھو گئے

سینۂ احساس میں ہیں دفن صدہا ماہتاب
اور کب تک چاندنی راتوں میں یوں رسوا رہو
کیسی تقریب ملاقات اور کیسی بازدید
کس لیے اُن قریۂ آہو وشاں میں جا رہو
گو بخیتی ہے ایک شہنائی سی پورب کے قریب
چیخ پڑتا ہے سکوتِ پیش و پس، تنہا رہو

کل بھی تھا افسانۂ دل نامراد و ناتمام
کل بھی زنجیرِ فغاں تھی قہقہوں کے پاؤں میں
کل بھی تھے رخسارِ گل پر دشتِ نو کے نشاں
کل بھی ٹوٹی تھی بطِ مے بادلوں کی چھاؤں میں
کل بھی ہنگامِ خزاں تھا ساونوں کے شہر پر
آج بھی رقصِ بلا ہے سرخوشی کے گاؤں میں

پھر افق پر چاند چمکا شیشموں کی آڑ میں
پھر فضا میں مسکراتی ہیں جواں رعنائیاں
پھر کسی نازک سی آہٹ پر دھڑک جاتا ہے دل
پھر ہوا میں گنگناتی ہیں سرور آرائیاں
اور بڑھ جاتی ہے بے تابی سوا ہوتا ہے غم
انجمن سے تو غنیمت ہیں یہی تنہائیاں

حمید الماس

دیارِ غیر میں

اجنبی شہر کی پُر پیچ گذرگاہوں پر
یوں سرِ شام کبھی دل نہ دُکھا تھا پہلے
جھلملاتی ہوئی اس جوئے شفق پر مجھ کو
یوں کبھی آگ کا دھوکہ نہ ہوا تھا پہلے
یوں کبھی درد کا طوفاں نہ اٹھا تھا پہلے

آج اک دوست نے لکھا ہے وطن سے مجھکو
ثبت ہیں راہ پر اب بھی ترے قدموں کے نشاں
پوچھتے ہیں تجھے ہر موڑ پہ گلیوں کے چراغ
اب کہاں ہے وہ طرحدار و خوش پوش جواں
وہی الماس وہی رونقِ بزمِ یاراں

دریوزہ گری

نیلگوں چرخ کو گھیرے ہوئے بھورے بادل
اس طرح گھومتے پھرتے ہیں ہوا کے رتھ پر
جیسے یہ سلطنتِ آب کے شہزادے ہوں
جن کے اک حکم سے ہو جائے زمیں لالہ فروش

دیکھنا یہ ہے کہ کب آس کی کونپل پھوٹے
سو کبھی جاتی ہے تمناؤں کی کھیتی اپنی

غفور انیس

عشق بھٹکتا ہے بیابانوں میں

قصۂ درد ہو کس طرح رہینِ اظہار
کانپ جاتی ہے مری روح لرزتی ہے زباں
شدتِ غم سے جو مائل بہ گلہ ہوتا ہوں
گونج اٹھتا ہے خیالوں میں کسی کا پیماں
چشمِ نمناک میں سہمے ہوئے جلتے ہوئے اشک
اپنے ہمراہ لیے خونِ جگر آتے ہیں
ظلمتِ غم میں سسکتے ہوئے لاکھوں ارماں
میری یادوں کے اجالوں میں ابھر آتے ہیں
وادیٔ شوق کی رنگین مہکتی راہیں
میرے بیتے ہوئے لمحوں کو صدا دیتی ہیں
اپنے خاموش اشاروں سے بلاتی ہیں مجھے
دل کے بھڑکے ہوئے شعلوں کو ہوا دیتی ہیں
کبھی تنہائی میں خوابوں کا مسیحا میرا
دل کے رستے ہوئے ناسور کو دھو جاتا ہے
دورِ سنسان خلاؤں میں یکایک جیسے
ٹوٹ کر کوئی ستارا کہیں کھو جاتا ہے

اُف یہ بے رنگ سے دن اُف یہ بھیانک راتیں
آہ میری محبت کا جگر سوز مآل
اب کسے ہوش کہ رفتارِ زمانہ کیا ہے
اب کہاں سلسلۂ ماضی و مستقبل و حال
ایک میں ہی نہیں ناکام محبت کہ یہاں
آرزوؤں کو سزا عشق کو تعزیریں ہیں
فطرتِ دل میں ہے آوارگیٔ دشتِ جنوں
چار سو پھیلی ہوئی آہنی زنجیریں ہیں
لٹتے آئے ہیں دربارِ گہِ الفت پر
روزِ آغاز سے تا حال دوانے کتنے
دشت و صحرا رسن و دار کے زندانوں کے
بزمِ عالم میں ہیں مشہور فسانے کتنے
اور بہتا ہی رہا خونِ شہیدانِ وفا
پیار روتا رہا دھرتی کے ستم خانوں میں
آج بھی حسن ہے مجبورِ روایات و رسوم
آج بھی عشق بھٹکتا ہے بیابانوں میں

زبیر رضوی

مُغنّی

میں اک مغنّی میں ایک مطرب
لطیف شاموں کی گنگناتی
حسیں فضاؤں میں میں اکثر
سجا کے نغموں کی اپسرائیں
ہزار جادو جگا دیئے ہیں
لٹا کے آواز کے خزانے
دلوں کے غنچے کھلا دیئے ہیں
حیات کی تیرہ وادیوں میں
طویل، بے نور راستوں پر
چراغ منزل جلا دیئے ہیں
گگن پہ تارے کھلا دیئے ہیں
کبھی جو آئے امنڈ کے بادل
تو میکدے نے مجھے پکارا
میں بادہ خواروں کے جھرمٹوں میں
شراب کا جام بن گیا ہوں
خوشی کا پیغام بن گیا ہوں

کبھی جو برہا کی تیز اگنی
شبوں کی تنہائیوں میں بھڑکی
میں نامرادوں کی انجمن میں
رفیق و دلدار بن گیا ہوں
صدائے غمخوار بن گیا ہوں
کبھی جو محلوں کے رہنے والے
سجے سجائے حسین کمروں میں
کوئی تقریبِ نو مناتے
تو لطفِ کام و دہن کی خاطر
مجھے بلاتے، ہوا ہے اکثر
کہ ان کی رنگینیوں میں کھو کر
میں جنسِ بازار بن گیا ہوں
متاعِ زردار بن گیا ہوں
میں جب بھی گذرا چمن سے میں نے
ببول کی خشک ٹہنیوں کو
خزاں کی پروردہ ڈالیوں کو
بہار کا پیرہن دیا ہے
نکھار، رس، بانکپن دیا ہے

میں خلوتوں میں ہیں جلوتوں میں
نشاطِ قلب و نظر کی خاطر
کھنکتے لہجے کا لوچ اپنے
یوں ہی لٹاتا رہا ہوں اکثر
کھلونا بنتا رہا ہوں اکثر
لہو بھی ٹپکا ہے انگلیوں سے
لہو بھی اگلا ہے میں نے منہ سے
میں گیت گاتا رہا ہوں پھر بھی
دیئے جلاتا رہا ہوں پھر بھی

میں اک مغنّی، میں ایک مطرب
کہ میرے دل میں بھی اک جہانِ
امیدوار ماں بسا ہوا ہے
ادھر بھی اے کاش کوئی دیکھے
ادھر بھی اے کاش کوئی آئے
کہ آج تک اس جہاں کو دیکھا نہیں کسی نے

شفیق فاطمہ شعریٰ

مطلعِ حیات

مثلِ شمعِ راہ جل رہا ہے چاند
ڈھل رہی ہے رات ڈھل رہا ہے چاند
جیسے خواب میں چل رہا ہے چاند

ہے ہواؤں میں نیند کا خمار
موڑ سو گئے چپ ہے رہ گذار
کارواں تھے دب گیا غبار

گا رہا ہے کیا طائرِ حزیں !
اف یہ راگ ہے کیسا آتشیں
کتنا دل خراش کس قدر غمیں

تیری تان اٹھی اور کھو گئی
آستینِ شب کو بھگو گئی
تیرگی کچھ اور تیرہ ہو گئی

ٹمٹما اٹھے دیپ تاروں کے
ڈوبنے لگے دل نظاروں کے
ذرّے کانپ اٹھے رہگذاروں کے

آنسوؤں کی سلک جگمگا اٹھی
دل پہ برق درد ٹوٹ گری
ہائے زندگی ہائے زندگی

ہم پہ جو پڑی ہم وہ سہہ گئے
پھوٹے آبلے اور بہہ گئے
ہلکے ہلکے داغ دل میں رہ گئے

پیار کا شرارِ ماہ نو کا نور
چشمِ انتظار تشنۂ سرور
سخت ناشکیب سخت ناصبور

ماہ نو کا نور اک جہانِ راز
چودھویں کا طور آسماں گداز
شمعِ آرزو محوِ سوز و ساز

چار دن کی جوت پھر اندھیری رات
تیرہ و سیاہ مطلعِ حیات
آ رہی ہے یاد ایک ایک بات

دل کی آگ ہی اب تپاں رہے
اپنی تاب و تب جاوداں رہے
مطلعِ حیات ضو فشاں رہے

جاوید وششٹ

حیاتِ امروز

قدم قدم پہ نشیب و فراز ملتے ہیں
سفر دراز ہے دشوار رہ گذارِ حیات
پیام آبلہ پائی ہر ایک گام سہی
ہمیں عزیز ہے پھر بھی یہ خارزارِ حیات

چمن چمن پہ نشیمن نواز آتشِ برق
روش روش پہ مچلتے ہوئے شرارِ حیات
ستم ظریفیٔ رنگِ بہار کیا کہیے
یہ شوخ دل کا شگوفہ وہ شعلہ زارِ حیات

دھڑک رہا ہے دلِ کائنات رہ رہ کر
پھڑک رہی ہے رگِ ابر دے نگارِ حیات
مچل رہے ہیں فضاؤں میں آتشیں فتنے
سسک رہا ہے دلِ زیست میں قرارِ حیات

فضا میں ایٹمی ہلچل، ہوا میں شور و نشور
پھر آج حشر بداماں ہے روزگارِ حیات
وہ گھڑ گھڑاتے سیہ فام ٹینک، طیارے
یہ تھرتھراتے ہوئے قصرِ رنگِ حیات

پیامِ فخر ہے ذرّات کی توانائی
مگر یہ فخر ہے بنیادِ انتشارِ حیات
ہوائے تند کا جھونکا ہے وقت کا رجحان
اور اس کی زد پہ ہے گیسوئے تابدارِ حیات

اسی پہ ناز ہے ایجادِ نو کی فطرت کو
کہ صبح و شام بڑھے اور انتشارِ حیات
یہ نور و نار کی آویزشیں مٹیں گی ضرور
تمام ہو کے رہے گا یہ خلفشارِ حیات

کرن امید کی پھوٹے گی ظلمتِ شب سے
گہن سے چاند اُگے گا بصد بہارِ حیات
چمک اٹھے گی فضا امن کے تبسم سے
دمک اٹھے گا افق سے رخِ نگارِ حیات

کنول پرشاد کنول

پہرا

(گیت)

آج سکھی سور[1] پر پہرا ہے
پوچھ گُھٹے گیتوں سے میرے، کتنا تیرا دکھ گہرا ہے

میرا درد نہیں انسون میں، جو جگ کے آگے چھلکا دوں
جن میں تیرا پیار — انھیں میں کیسے پلکوں سے ڈھلکا دوں
اسی لیے تو نین دوار پر، پیڑ[2] اکا ساگر ٹھہرا ہے
آج سکھی سور پر پہرا ہے

نظروں کے پگ میں زنجیریں بیڑی آہوں کے پاؤں میں
دفن پڑی ہیں من کی ٹیسیں، کب سے اِن رِستے گھاؤں میں
اب تک میرے موک رُدن[3] کو سُن نہ سکا یہ جگ بہرا ہے
آج سکھی سور پر پہرا ہے

---

[1] آواز [2] درد [3] خاموش نالے

آوارہ گرد

(طنزیہ)

محکمۂ تعمیرات اور ویرانۂ دل

ویرانۂ دل کی حالیہ کھدائیوں سے جو انکشافات ہوئے ہیں محکمہ تعمیرات کے لیے باعث عبرت اور قارئین کے لیے باعث حیرت ہوں گے۔ چونکہ ہندوستان کے پنج سالہ منصوبے کا ایک حصہ اسی محکمہ کی مشق سیاست اور رضیافت طبع کے لیے مختص ہے اس لیے نامناسب نہ ہوگا کہ ان قیمتی معلومات کو پیش کر دیا جائے تاکہ وقت ضرورت کام آئیں۔

اہم ترین دریافت یہ ہے کہ محکمۂ تعمیرات ابتداء میں محکمۂ آب رسانی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اور اس کی داغ بیل حضرت فرہاد آنجہانی نے ڈالی گو سہرا ان کے سر نہ باندھا جاسکا۔ یہ بھی ظاہر ہوا ہے کہ اس اسکیم میں شیریں کی فہم و فراست کو بھی کافی دخل تھا اور اس کے فینانشیر حضرت خسرو پرویز تھے۔

"نالابوں کی تعمیر کی ابتداء" نرگس" نامی ماہر فن کی طرح منسوب ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ آئینہ ایجاد نہیں ہوا تھا اس لیے اس نے اپنا عکس پانی میں دیکھنے کے لیے سب سے پہلا تالاب تعمیر کیا۔

محکمۂ تعمیرات کے دوسرے شعبہ کی ابتداء کوچۂ جاناں سے ہوئی جہاں بہت زیادہ بھیڑ بھاڑ اور چیر پھاڑ رہا کرتی تھی۔ ٹریفک کی زیادتی کے مدنظر کوچہ جاناں کے نشیب و فراز کو دور کرنے کے لیے ترکیبیں سوچی جانے لگیں۔ اس سلسلے میں "حضرت بسمل" کا نام تاقیام عالم یاد رہے رکھا جائے گا جنھوں نے سب سے پہلے روڈ رولر کی افادیت کو علاً ظاہر کیا اور کوچۂ جاناں کو ہموار کر کے اپنی عالی دماغی کا ثبوت دیا۔ چنانچہ اسی سلسلے میں کوچہ جاناں کے ایک مشہور رہرو نے کہا ہے ؎

پست و بلند کوچۂ جاناں کی سرزمیں بسمل نے لوٹ لوٹ کے ہموار کر دیا

اس شعر کی خوبی یہ بھی ہے کہ "حضرت بسمل" کے طریقہ کار کو بھی ظاہر کر دیا گیا ہے۔

محکمۂ تعمیرات کی ترقی کا سب سے بڑا سبب کوچۂ جاناں اور اس کے رہرو ہیں زمانۂ قدیم سے کوچۂ جاناں کو نیشنل ہائی وے یعنی قومی شاہراہ کی حیثیت حاصل رہی ہے چونکہ عہد قدیم کے لوگ نہایت درجہ اپج رکھتے تھے اس لیے دیکھا گیا کہ کوچۂ جاناں کا کوئی رہرو اگر پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے تو کوئی دم دبا کر بھاگ رہا ہے کوئی سر کے بل چل رہا ہے تو کوئی گھٹنوں؛ اسی لیے ہمواری راہ کے بعد حضرت بسمل کے جانشین نے کوچۂ جاناں میں "آنکھیں" بچھانی شروع کر دیں۔ تاکہ بار بار راستہ خراب نہ ہو۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ زمانۂ حال کی سڑکوں پر جس طرح

تھپ کے روڑے یعنی ٹیبل بچھائے جاتے ہیں اسی طرح اس زمانے میں خاص طرح کے روڑے (ٹیبل) استعمال کیے جاتے تھے جس کو "آنکھ" کہا جاتا تھا۔ مزید امور پردۂ خفا میں ہیں۔

کوچۂ جاناں کے رہرو فرداً فرداً بھی گام زنی کرتے تھے اور قافلوں کی صورت میں بھی جس کی وجہ سے گرد و غبار بہت رہا کرتا تھا۔ اس سلسلے میں محکمۂ آب پاشی کا قیام عمل میں آیا اور اشک باری کا طریقہ اختیار کیا گیا چنانچہ دیدۂ دل سے حاصل شدہ دستاویزات میں درج ہے کہ:۔ "اشک باری کا حکم جاری ہے"۔

معلوم ہوتا ہے کہ حکومت نے اشک باری سے متعلق قانون ہی بنا دیا تھا اور "قانون اشک باری" (نشان و سنہ ندارد) کے تحت کم از کم دستاویز مذکور کی تحریک تک طریقۂ اشک باری جاری تھا اس سلسلے میں یہ امر بھی دلچسپی کا باعث ہوگا کہ ٹریفک پر قابو پانے کے لیے کوچہ جاناں میں کانٹے بچھائے جاتے تھے۔ نیز "قانون راہ راست" بھی نافذ العمل تھا اس قانون کی اہم ترین دفعہ درج ذیل کی جاتی ہے۔

"راہ راست برو اگرچہ دور است"

مغرب کے ایک مقنن نے اسی قانون کا ترجمہ کیا ہے جو آج بھی "KEEP LEFT" کے عنوان سے موسوم ہے بعض محققین کا خیال ہے کہ مقنن مذکور نے ترجمہ میں غلطی کی ہے لیکن چونکہ مقنن مذکور کا تعلق ایسے ملک سے ہے جس کے متعلق جلیل القدر محقق کنہیا لال کپور کا خیال ہے کہ وہاں کی ہر چیز الٹی ہوتی ہے چنانچہ انھوں نے ایک مصرعہ بھی اس سلسلے میں درج کیا ہے کہ:۔

"ہم اُلٹے یار الٹی بات الٹی"

اس لیے میرے خیال میں ترجمہ مناسبت ملکی و قومی رکھتا ہے۔

"جاناں" سے متعلق صرف اسی قدر تحقیق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان کو قومی ملک سمجھا جاتا تھا اور ہر شخص ان سے ملاقات کا آرزومند اور کوشاں رہتا تھا اور جو شرف باریابی پا جاتا تھا اس کو "رقیب" کا خطاب عطا کیا جاتا تھا۔ ایک مشہور رہرو (انشاء اللہ خاں ولد رعالباً) ماشاء اللہ خاں نے کوچۂ جاناں کی تصویر کشی کرتے ہوئے جاناں سے ملاقات کے طریقہ کو خوب ظاہر کیا ہے:

"یار ہے کوئے یار میں کیا بھیڑ بھاڑ ہے
تو بھی گھسیڑ بسیڑ جو گھسیڑم گھساڑ ہے"

مخفی مباد کہ کوچۂ جاناں کو کوئے یار بھی کہا جاتا تھا۔

خاتمۂ کلام پر چند زرّیں اصول جوان کیدانیوں میں ظاہر ہوئے ہیں اور جن کی پابندی اس دور میں بھی محکمۂ تعمیرات کے لیے مفید ثابت ہوگی درج کیے جاتے ہیں۔ (۱) شاہراہ یا معمولی راستوں کی تعمیر پر عہدیداروں کا تقرر ان کے وزن اور گولائی کی مناسبت سے کیا جائے تاکہ حضرت بسمل کے تجربات سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ (۲) نالیوں کی تعمیر پر صرف ایسے اصحاب کا تقرر کیا جائے جن کے لیے چلو بھر پانی کافی نہیں (۳) تعمیر ممکنہ پر ایسے اشخاص کا تقرر کیا جائے جن کو اولوں سے بچنے کی فکر لگی رہتی ہو۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

بنگلہ شاعری کی رفتار

اردو میں دوسری علاقائی زبانوں کے ادب اور ترقی کی رفتار کو روشناس کرانے کی ضرورت ہے تاکہ اردو کے ادیب اور پڑھنے والے دوسری زبانوں کے رجحانات سے بھی واقف رہیں۔ اس دفعہ ہم بنگالی کی دو نظموں کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔ ان دو نظموں سے جدید بنگلہ شاعری کی رفتار کا کچھ تو اندازہ ہو ہی سکتا ہے۔ ترجمہ شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے پیش کیا ہے۔ (ادارہ)

شوکانت بھٹاچاریہ

ٹیگور اور نذرالاسلام کے بعد بنگال جس نام کو دنیائے ادب کے سامنے پیش کرتا ہے وہ ہے مرحوم شوکانت بھٹاچاریہ کا نام۔ وہ جدید بنگلہ ادب کے تیسرے ستون مانے جاتے ہیں۔ شوکانت کی شاعری میں بھرپور سماجی شعور اور انقلابی جذبہ ہی نہیں بلکہ ہزاروں لاکھوں قوموں کے ایک راستے پر ایک ساتھ آگے بڑھنے کا ترانہ اور اس ترانے کی مٹھاس، شعریت، اثر، لچک اور گرمی اور سب کو مست کر دینے والی لے موجود ہے۔ شوکانت نے عوام اور ان کے جذبات کو اپنایا اور عوامی شاعروں کے لیے راستہ ہموار کیا ہے۔ آج بنگالی کے جدید ادیب ان کو اپنا رہنما مانتے ہیں اور ان کے راستے پر آگے بڑھ رہے ہیں۔ ہر سال بنگال کے کونے کونے میں بڑے دھوم دھام سے ٹیگور اور نذرالاسلام کی طرح یوم شوکانت بھی منایا جاتا ہے۔ ان کے کلام کے مجموعے حسب ذیل ہیں۔ (۱) چھاڑ پتر (۲) گھوم نای (۳) پورب بھانتی (۴) آبھی جان (۵) میٹھے کڑا۔ یہ عظیم شاعر عین عالم شباب میں دق کا شکار ہو کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس وقت ان کی عمر بیس یا اکیس سال تھی۔ ان کی بے وقت موت نے نہ صرف ایک عظیم شاعر بلکہ ایک سرگرم عوامی کارکن، جنگ آزادی اور عوامی جدوجہد کے ایک جانباز سپاہی اور رہنما کو بنگال کے عوام سے چھین لیا۔ ان کی ایک مشہور نظم "چھاڑ پتر" (پاسپورٹ) کا ترجمہ پیش کرتا ہوں۔

پاسپورٹ

آج جس ننھے نے جنم لیا ہے

اس کی زبانی مجھے یہ معلوم ہوا ـــــ کہ
اسے ایک پاسپورٹ ملا ہے
تب ہی ـــــ جنم لیتے ہی
نئے جہاں کے دروازے پر
اپنے حق کے لیے آواز بلند کر رہا ہے ـــــ چلّا رہا ہے ـــ!
کمزور اور ناتوان ہونے کے باوجود ـــــ اس کے ہاتھوں کی مٹھیاں بند ہیں
اور اپنے مطالبے کے لیے ـــــ اس نے ہاتھ بلند کیا ہے
اس کی باتیں کوئی نہیں سمجھتا
کوئی ہنستا ہے اور کوئی اس کا مذاق اڑاتا ہے
لیکن ـــــ میں اپنے دل میں
اس کے مطالبے کو سمجھ چکا ہوں
اُسے پیغام مل چکا ہے ـــــ ایک نئے جہاں کا
میں اپنی کمزور اور بوڑھی آنکھوں سے
اس کے پیغام کو پڑھ چکا ہوں
ننھا آیا ہے ـــــ اس کے لیے جگہ خالی کر دینی ہوگی
اس گلتی سڑتی مرتی ہوئی بوڑھی دنیا سے
ہم کو اب چلے جانا ہوگا
ہاں ـــــ میں چلا جاؤں گا
لیکن آج جب تک جسم میں جان ہے
اس نئے آدم کے سامنے
میں قسم کھاتا ہوں۔
کہ ـــــ میں دل و جان سے جد و جہد کر کے
اس جہاں کو اس ننھے کے ہنستے رہنے کے قابل بنا جاؤں گا ـــ!
اور پھر سب کام ختم کر کے
اپنے دل کے خون سے اس نئے ننھے کو

آشیرواد دے جاؤں گا
اور اس کے بعد
تاریخ عالم میں چند صفحات کا اضافہ ہوگا ـــــ !!

سولیل چودھری

بنگلہ کے جدید ادب میں سولیل چودھری بھی اپنا ایک مقام بنا چکے ہیں ـــ سولیل شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی لیکن وہ شاعر ہی کی حیثیت سے زیادہ مقبول ہوئے۔ ان کا مجموعہ کلام "گھوم بھالنگا تیرگان" یعنی بیداری کے گیت پچھلے عرصہ میں اتنا مقبول ہوا کہ اب تک دو ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ ان کا یہ گیت پورے ہندوستان میں مشہور ہے اور ان کے گیتوں میں سب سے زیادہ مقبول گیت ہے۔ یہ گیت پہلی بار رسالہ "پری چے" جو کہ بنگلہ زبان کے ترقی پسند ادب کا ترجمان ہے کے جنوری فروری ۱۹۵۱ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ یہ ایک کورس گیت ہے، اور ظاہر ہے کہ گیت کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا، صرف یہ سمجھا یا جا سکتا ہے کہ شاعر نے کیا گایا ـــ اور اگر آپ میرے اس ترجمہ کو پڑھ کر صرف اتنا سمجھ سکیں کہ شاعر نے اپنے گیت میں کیا کیا ہے تو میں سمجھوں گا کہ میں بہت زیادہ کامیاب ہوا ہوں۔

امن کا گیت

مختلف خیالات اور طبقات کے ملاپ میں "ہم"
"ہم" میں کوئی دائیں تو کوئی بائیں طرف چلتے ہیں
"ہم" میں کوئی آشنک ہے اور کوئی ناستک
کوئی دھارمک ہے تو کوئی ادھرمی
لیکن ـــــ !
ہم سب ایک ہی سمندر میں ہاتھ پیر مار رہے ہیں
ہماری آنکھوں کا نور ہے
امن کے دامن میں بسے ہوئے مکانات
زندگی کی ہل چل ـــــ "آزاد خوش حال وطن"

تب ہم سب ایک ہو کر گیت گاتے ہیں
لیکن جب سوال اٹھتا ہے ــــ "بربادی یا آبادی ــ؟"
ہماری آنکھوں میں شعلے بھڑک اٹھتے ہیں
اور ہم جواب دیتے ہیں
"آبادی ــــ آبادی ــــ آبادی ــ!"
جب سوال اٹھتا ہے "جنگ یا امن؟"
ہمیں انتخاب کرنے میں دیر نہیں لگتی
اور ہم جواب دیتے ہیں
"امن ــــ امن ــــ امن ــ!"
خون کے دریا اب نہ بہیں گے
اور بربادی نہیں چلے گی
مائیں اب آنسو نہ بہائیں
اب بچے رویا نہ کریں گے
خون بربادی اور جنگ
نہیں رہے گی ــــ نہیں رہے گی ــ!
ہمارے وطن کے
کروڑوں ہاتھوں میں کام کرنے کی بھوک ہے
اور ہمارے کانوں، پہاڑوں اور مٹی کے دامن میں
سونا ہے ــــ امرت ہے۔
پھر بھی ــــ!
آہ و فریاد ہے ــــ مہاکال ہے۔
گھر گھر میں بھوک پلتی ہے۔
بے گھر بے روزگار لوگ اس سنہرے وطن میں بھوکے مرتے ہیں
اور اس اُجڑے وطن میں
زندگی کو پروان چڑھانے کے لیے
ہم سب ایک ہو جاتے ہیں

ہم آج پھر سُن رہے ہیں کہ
مٹھی بھر شیطان نشے میں جنگی تیاریاں کر رہے ہیں
دنیا کو تباہ و برباد کرنے، لوٹنے کے لیے
تب ہم اس جہاں کے
تمام امن کے متوالوں کے ساتھ
ایک ہو کر نعرہ بلند کرتے ہیں ــــــ "جنگ مردہ باد"
تب ہم ایک ہو جاتے ہیں
اور کروڑوں مضبوط ہاتھ
جنگ بازوں کے خلاف
ایک ساتھ فضا میں اونچے اٹھاتے ہیں

حیدرآباد میں شہر کا قدیم ترین ہوٹل

عزیزیہ ہوٹل

جہاں صبح و شام ہندوستانی طریقے سے ماہر نان بائی چیوں کے ہاتھوں تیار کیے ہوئے کھانے مل سکتے ہیں ●
● صفائی اور پاکیزگی اس ہوٹل کا امتیازی نشان ہے۔ کم کرایہ پر صاف ستھرے اور ہوادار کمرے مل سکتے ہیں

پتہ یاد رکھیئے

عزیزیہ ہوٹل

ناپلی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن فون نمبر ۴۳۱۶

غلام نبی خیال

غزل

(کشمیری)

اصل:-

گاہے تھوک تیونگلن اندر گاہے پشہ مس کرُیوٹھ غم
متہ ونتہ کیہہ میانس دلس اُم چھی پترمت بدرستم
میانیُ کتھن زن کترُین بانن چھُ اندہ وَدرُم گمژ
چوں اکھ سخن ماشاءاللہ زن گاہ چھو ترادان جام جم
رَتھ چیون رَواتھو وخونرَ وظلمات گووزیٹھاں مگر
دیوانگے دارن کھسان دیوانگی سپز کہہ نہ کم
ژہ تہ زاگہ چھی نشتر دلو امہ تہ چھُم اُزیوک تلخا بہ چیون
دونہ چھو جان لی ژہ تہ روز دردرمہ تہ گژھ نہ بگیچ آش کم
لولاہ سرُن ژاپُن زہر پہ چھہ لولہ والیُن زندگی
یُدو نے حسن کرہ اکھ ستم عشقس چھ باساں کچھ کرم
ہیوت زاہدو غم آخرت ارمان دلک اُڈہ ژٹ کرکہہ
واللہ خیالس شاد مٹھ یم نارمتہ رد ٹ چیون غم

ترجمہ:-

کبھی اسے انگاروں پر رکھا گیا اور کبھی اسے شدید غم سونپا گیا
مرے اس دل کو کچھ مت کہو اس نے بے پایاں ستم جھیلے ہیں
میری باتیں۔ گویا مٹی کے برتنوں میں اوپر سے نیچے تک بال آیا ہے
اور تمھارا اک سخن۔ ماشاءاللہ جیسے جام جم نور برسا رہا ہو
خونخواروں نے خون پینا روا رکھا اور ظلمات کی حدیں پھیلتی ہی گئیں
پھر بھی دیوانے دار پر چڑھ گئے اور اُن کی دیوانگی کم نہ ہوئی
اے دل نشتہ تجھے بھی ڈھونڈھتے ہیں اور مجھے بھی آج کا تلخاب پینا ہی ہے
اب بہتر یہی ہے کہ تو بھی ہمت نہ ہار میں بھی کل سے پُرامید ہوں
عشق کرنا اور زہر کے گھونٹ پینا یہی عاشقوں کی زندگی ہے
اگر حسن ایک ستم کرے تو وہ عشق کے لیے لاکھ عنایتوں کے برابر ہے
زاہدوں نے غم آخرت اپنایا تو دل کے ارمانوں کا خون کر دیا
واللہ خیال تو مسرت کو بھول گیا جس نے تیرا غم سینے سے لگایا

مخطوطات کتب خانۂ سالار جنگ

ہندوستان کے تہذیب و تمدن کی طویل اور مسلسل تاریخ میں کئی نقوش ابھرے اور ایک دوسرے میں گھل مل گئے یہ نقوش اپنی الگ انفرادیت اور جدت بھی رکھتے تھے جس کی وجہ سے ہماری ثقافتی تاریخ ہمیشہ نئے رجحانات و خیالات سے مالا مال رہی۔ ان ہی کے ابھرنے، ایک دوسرے میں ضم ہونے اور پرانے نقوش پر نئے نقوش کے ثبت ہوتے رہنے سے موجودہ ہندوستانی کلچر اپنی تمام رنگا رنگیوں اور رعنائیوں کے ساتھ وجود میں آیا اور اب بھی ارتقا کی راہوں سے گذر رہا ہے، آزادی کے بعد نہ صرف ہم نے کھلی فضا میں سانس لی اور غلامی کے حبس سے نجات پائی بلکہ ہمارے علم و ادب کلچر اور آرٹ کو بھی نئی زندگی ملی۔ آج ہم پر یہ فرض اسی رشتے سے زیادہ شدت سے عائد ہوتا ہے کہ اپنے ملک کے پرانے تہذیبی سلسلوں کو ڈھونڈیں، کھوج لگائیں، گرہوں کو کھولیں اور جہاں ضرورت ہو ان کو ایک دوسرے سے تاریخی ربط بھی دیں، اسی طرح سے ہمارا ثقافتی ورثہ تاریخی لحاظ سے اہمیت اختیار کر سکتا ہے اور انہی خطوط پر ہم اپنے مستقبل کی تہذیب کو تعمیر کر سکتے ہیں۔

ثقافتی ورثہ کی کھوج عام آدمی کا کام ہے نہ ہر ایک کے بس کی بات۔ یہ علما اور محققین کا کام ہے جس پر انھیں توجہ کرنی چاہیئے اور حکومت کو ان سے یہ کام خاطر خواہ طریقے پر لینے کے لیے امداد بھی دینی چاہیئے۔ جہاں آج ہمارے ملک میں تعمیر و ترقی کے دوسرے کام ہو رہے ہیں وہیں صاحبان علم اپنے فرض سے بھی غافل نہیں اور وہ برابر اپنی کھوج میں مصروف ہیں، چنانچہ حال ہی میں سالار جنگ مرحوم کے کتب خانۂ مشرقیہ کے عربی مخطوطات کی فہرست کی پہلی جلد شائع ہوئی ہے، اس فہرست کی تدوین و ترتیب خود ایک محنت طلب کام تھا مخطوطات کو پڑھ کر ان کی پوری پوری تحقیق کرنا بڑی جاں فشانی اور عرق ریزی چاہتا ہے، خوشی کی بات ہے کہ اس کار فرہاد کو تیشہ و ران علم و تحقیق نے بڑی کامیابی سے سرانجام دیا ہے۔

حیدرآباد جہاں اور دوسری خصوصیات و نوادر تاریخی کے لیے مشہور رہا ہے وہیں اب ایک اور کا بھی اضافہ ہو گیا ہے، ہر سیاح پرانے کھنڈروں، قدیم عالیشان عمارتوں اور تاریخی آثار سے گذرتے ہوئے ضروری سمجھتا ہے کہ وہ ان نوادر پر بھی ایک نظر ڈال لے جو ایک فرد کی وارفتگیٔ شوق و ذوق نظر نے یکجا کر دیئے ہیں، سالار جنگ ثالث نواب میر یوسف علی خاں کے انتقال کے بعد ان کی جائداد پر حکومت کی نگرانی قائم ہوئی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ان کے جمع کیے ہوئے فنون لطیفہ کے شاہکار، قیمتی جواہر، نادر سامان آرائش، تاریخی آثار اور بڑی شخصیتوں کی ملکیت میں رہی ہوئی بہت سی

اشیاء کو میوزیم کی صورت میں عوام کے لیے ترتیب دیا گیا ہے، میوزیم کو دیکھنے والا یہاں جمع کیے ہوئے نوادر کے ذخیرے سے تو واقف ہو جاتا ہے مگر ہر شخص یہ نہیں جانتا کہ اس کے پہلو میں علم و ادب کا وہ بیش بہا خزینہ بھی موجود ہے جسے صدیوں کی فنکارانہ و خلاقانہ محنت نے پیدا کیا، کتابیں وہ خزانے ہیں جہاں ہنرمند دماغوں کے افکار و تصورات کا نچوڑ جمع ہوتا ہے یہ وہ افکار ہیں جو جہانِ تازہ کی نمودیں حصہ لیتے ہیں جو تاریخ کو بناتے اور تہذیب کو آگے بڑھاتے ہیں اس لیے کتابوں سے زیادہ اہمیت رکھنے والی اور کوئی شئے ہو ہی نہیں سکتی۔ اس گراں بہا سرمایہ سے عوام کو روشناس کرانا اور اہل علم کے لیے کارآمد بنانا بڑی خدمت ہے، وہ لوگ جنھیں سالار جنگ ثالث مرحوم کا ورثہ بطور امانت سونپا گیا ہے اپنے فرض سے غافل نہیں ہیں۔ نواب مہدی نواز جنگ صدر نشین کمیٹی کے ایما پر کتب خانے کی تدوین و ترتیب کا کام انجام پا چکا ہے۔ اور اب مخطوطات پر تحقیقی کام ہو رہا ہے، مخطوطات کے شعبے میں ۷۶۵۰ نسخے ہیں جن میں عربی کے ۲۴۵۹ فارسی کے ۴۱۴۶، اردو اور ہندی کے ۱۰۴۵ اور متفرقات تقریباً ۲۰۰ ہیں۔ علوم مشرقی سے مالا مال اس حصے کو دیکھتے ہوئے کتب خانہ سالار جنگ کو خدا بخش لیبریری بانکی پور (پٹنہ)، نیشنل لیبریری کلکتہ، ایشیاٹک سوسائٹی لیبریری کلکتہ اور آصفیہ سنٹرل اسٹیٹ لیبریری حیدرآباد کے ساتھ شمار کیا جاتا ہے۔ جہاں تک مخطوطات کی اہمیت کا تعلق ہے خدا بخش لیبریری بانکی پور کو سب سے زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے مگر سالار جنگ کتب خانہ میں مخطوطات کی تعداد تقریباً دگنی ہے۔ اس ذخیرے میں کتنی ہی ایسی کتابیں ہیں جو اپنے موضوع پر اہم ترین سمجھی جاتی ہیں اور بہت کم یاب ہیں بعض نسخے تو اس قدر نایاب ہیں جن کی نظیر کسی اور کتب خانے میں نہیں ہے۔ کچھ نسخے خود مصنفین کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں، کچھ مصنف کے زمانے ہی میں یا تھوڑی مدت بعد لکھے گئے ہیں۔ کئی ایسے نسخے ہیں جن کی تاریخی اہمیت ان مہروں اور دستخطوں کی وجہ سے بڑھ جاتی ہے جو ان لوگوں کے ثبت کیے ہوئے ہیں جن کی ملکیت میں کتاب رہ چکی ہے یہ دستخط اور مہریں بادشاہوں، بڑے بڑے امرا اور علما کی ہیں، عربی مخطوطات کا حصہ بطور خاص زیادہ اہم نسخوں سے بھرپور ہے جن میں فلسفہ، منطق اور دینیات پر بڑی اہم کتابیں ملتی ہیں، جن مصنفین کی اصل کتابیں موجود ہیں ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ علامہ حلّی، مُلّا صدرہ، مُلّا باقر، آقا حسین خوانساری، مرزا جان حبیب اللہ شیرازی، میر سید شریف جُرجانی، بحر العلوم، فخر السمک رئیس الشافعانی، نصیر الدین طوسی، یہ نسخے قدیم ترین ہیں اور بعض مصنف کے دستخط شدہ۔

عربی مخطوطات کے اس حصے کو نواب مہدی نواز جنگ اور مرحوم پروفیسر حسین علی خاں کے ایما پر السنۂ مشرقیہ کے مشہور عالم اور ماہر کتابیات ڈاکٹر نظام الدین ڈائرکٹر دائرۃ المعارف (حیدرآباد) نے بڑی کاوش سے ترتیب دیا ہے، ترتیب میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ فہرست جدید خطوط پر سائنٹفک اصولوں کی بنیاد پر بنائی جائے اور زیادہ سے زیادہ فائدہ بخش ثابت ہو سکے چنانچہ موصوف نے فہرست کو ڈیوی کے مرمم طریقے کی بنیاد پر تقسیم کیا ہے، علوم کے لحاظ سے ترتیب دی ہوئی اس فہرست سے سرسری اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کتب خانے میں کن علوم میں کتنے مخطوطات مل سکتے ہیں۔

۱۔ فلسفہ، منطق، دینیات ۳۵۱ نسخے۔ (۲) قرآن اور تفسیریں ۴۹۱ نسخے۔ (۳) اصول سنت، قانون، فقہ، فتاویٰ (اہل سنت) ۲۹۸ نسخے۔ (۴) فقہ امامیہ ۲۷۴ نسخے۔ (۵) تصوف، موعظ و فیرہ، ۳۷۷ نسخے۔ (۶) لسانیات،

رب، نظم ونثر اور سوانحات شعرا، ۳۲۰ نسخے۔ (۷) ریاضیات، فلکیات، کیمیا، طب، فنون لطیفہ اور دوسرے فنون، ۱۰۰ نسخے۔ (۸) تاریخ، جغرافیہ، سوانح وغیرہ، ۱۶۸ نسخے۔

عربی مخطوطات کی فہرست کا کام ہو رہا ہے اور اب تک پہلی جلد شائع ہوئی ہے جس میں فلسفے منطق اور دینیات کے ۳۷ مخطوطات کی تفصیل اس طرح دی گئی ہے کہ ہر کتاب کی اہم خصوصیات، مصنف کا نام، کاتب کا نام، تاریخ تصنیف وکتابت رکتابیات کے حوالے سب آگئے ہیں۔

اس فہرست کی مدد سے دنیا کے ہر گوشے کا طالب علم اور محقق یہ جان سکتا ہے کہ اس کے کام کی کونسی کتاب اس کتب خانے میں موجود ہے اور اس کی کیا تاریخی اہمیت ہے، اس طرح سے اس خزانے کو جو الماریوں میں منتشر اور بے ترتیب پڑا تھا ترتیب دے کر اور اس کی فہرست شائع کر کے یارانِ نکتہ داں کو دعوت عام دے دی گئی ہے۔ اس فہرست کی اشاعت سے علوم مشرقی پر تحقیق کرنے والوں کو بڑا فائدہ ہوگا، اس کی افادیت کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اس راہ کی دشواریوں سے واقف ہیں اور جنھیں قدیم مشرق کے آثار علمیہ کی اس لیے کھوج ہے کہ وہ اپنے ثقافتی سلسلوں کو ملا کر نئے مشرق کی تعمیر میں اپنا فرض ادا کریں۔

کتب خانۂ سالار جنگ کے عربی مخطوطات میں قرآنی نسخوں کا ذخیرہ سب سے زیادہ شاندار، قیمتی اور اہم ہے، یہاں نویں صدی عیسوی سے انیسویں صدی عیسوی تک لکھے ہوئے نسخے موجود ہیں جن کی کتابت مختلف ملکوں میں ماہر ترین خطاطوں کے قلم سے ہوئی ہے۔ ان کی جسامت ۲ مربع فٹ سے ایک مربع انچ تک ہے جو خط کوفی، نیم کوفی، نسخ، ثلث، نستعلیق، رقاع، محقق، ریحاں، غبار، تعلیق، شکستہ، شافعہ، خط بہار وغیرہ میں لکھے ہوئے ہیں، جن نسخوں میں ان نسخوں میں محفوظ ہے ان میں سے چند کے نام ہیں۔ یاقوت مستعصمی، مبارک شاہ، شاہ مسکین، حاجی نیاز علی طغرائی، عبداللہ مرواریدنباتی، عبدالحی مرغنانی، کیقباد بن علی بہار آبادی مذہب، ابراہیم عادل شاہ (بیجاپور)، قطب شاہ (گولکنڈہ) اور شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر۔

ان قرآنی نسخوں کی تعداد ۳۶۰ ہے جو یعقوب مستعصمی (۶۸۰ھ مطابق ۱۲۸۸ء) سے محمد عالم شیرازی (۱۲۳۴ھ مطابق ۱۸۱۸ء) تک پھیلے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر نظام الدین (مدیر فہرست) کی تحقیق ہے کہ یعقوب مستعصمی کے لکھے ہوئے قرآن شریف کے بارہ نسخے تمام دنیا کے کتب خانوں میں ان کے نام سے ملتے ہیں، ان میں سے دو نسخے حیدرآباد ہی میں ہیں، ایک کتب خانۂ آصفیہ میں اور دوسرا کتب خانۂ سالار جنگ میں۔۔۔ ان کتب خانے میں جو نسخہ ہے وہ ۶۸۰ھ ۱۲۸۸ء کا لکھا ہوا ہے اس نسخے پر تین مغل شہنشاہوں کے دستخط ہیں، جہانگیر، شاہجہاں، اورنگ زیب۔ یہ نسخہ جہانگیر کے دستخط سے ۲۷ جمادی الثانی ۱۰۲۲ھ ۱۶۱۳ء کو اس کے کتب خانے میں داخل ہوا تھا اور ۲ رمضان ۱۰۲۸ھ مطابق ۱۶۱۸ء کو جہانگیر ہی کی تحریر دستخط کے ساتھ حسن خواہ کو دیا گیا، تیسری تحریر شاہجہاں کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حادثات زمانہ کے ہاتھوں یہ نسخہ مختلف ہاتھوں سے ہوتا ہوا، ۱۰۵۶ھ ۱۶۴۶ء میں شاہجہاں کے دستخط سے اس کے کتب خانے میں شامل کر لیا گیا، جسے ہدایاں اورنگ زیب نے خواجہ حسن جو بیاری کے پوتے خواجہ محمد یعقوب کو اپنے دستخط کے ساتھ تحفتاً واپس کر دیا، اس نسخے پر خود یعقوب مستعصمی

کے قلم کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نسخہ اس نے وسط ربیع الاول ۶۸۰ھ میں تحریر کیا ہے اور یہ سنہ اس کی وفات سے گیارہ سال پیشتر کا ہے۔

اس ایک نسخے کی تفصیل سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس ذخیرے میں کیسے کیسے نادر مخطوطات جمع ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر نظام الدین نے خود لکھا ہے:۔

"میں ۱۹۲۶ء میں جوامع الحکایات (عوفی) کی تدوین کے بعد حیدرآباد واپس ہوا، اس وقت تک میں ساری دنیا کے کتب خانوں سے اس کتاب کے ۵ نسخوں کا مطالعہ کر چکا تھا لیکن مجھے علم نہ تھا کہ اس کے دو نسخے خود میرے شہر میں موجود ہیں۔ مجھے وہ دن یاد ہے جب مرحوم سالار جنگ نے مجھے ان مخطوطات کے مطالعے کا موقع عنایت فرمایا۔ میں نے گہرے دل سے نواب صاحب کا شکریہ ادا کیا اور ان کے فارسی و عربی مخطوطات کی فہرست ترتیب دینے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں، مگر یہ بات ٹال گئی اور اب ۲۸ سال کے بعد اس کا موقع آیا ہے۔"

ڈاکٹر نظام الدین کی نگرانی میں عربی مخطوطات کی فہرست ۸ جلدوں میں شائع کی جا رہی ہے جن کی تفصیل پہلے دی جا چکی ہے ان ہی خطوط پر فارسی مخطوطات کی فہرست بھی ترتیب پا رہی ہے یہ فہرست ۱۲ جلدوں میں تکمیل کو پہنچے گی۔ فارسی مخطوطات کو مندرجہ ذیل بارہ جلدوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) فلسفہ، منطق، دینیات وغیرہ، ۱۸۱ نسخے۔ (۲) قرآنی علوم اور تمام فرقوں کی فقہ ۳۵۰ نسخے۔ (۳) تصوف اخلاق، ادعیہ و موعظ و تذکرے ۶۳۱ نسخے۔ (۴) ریاضیات، ہیئت، کیمیا، فنون وغیرہ، ۲۳۴ نسخے۔ (۵) طب حیوانات وغیرہ، ۳۰۱ نسخے (۶) عروض و قواعد وغیرہ، ۱۹۱ نسخے۔ (۷، ۸) شاعری، کلیات، دواوین وغیرہ (۹) نثر و سوانح شعرا وغیرہ، ۱۱۴ نسخے۔ (۱۰، ۱۱، ۱۲) جغرافیہ، تاریخ، سوانح وغیرہ، ۵۰۰ نسخے۔

اگر یہ فہرست مکمل ہو جائے تو علوم کا وہ خزانہ جو مدتوں سے دبا پڑا استعاب کے سامنے آجائے گا اور دنیا کو معلوم ہو سکے گا کہ اس کتب خانہ میں کیسے کیسے علمی نوادر محفوظ ہیں جن سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، عربی مخطوطات کی فہرست کی پہلی جلد پر یونیسکو بلٹین فار لیبریریز نے بھی خراج تحسین ادا کیا ہے، اس تحقیقی کام کے لیے حکومت ہند سے بھی درخواست کی گئی ہے اور امداد کا وعدہ ہو چکا ہے، توقع ہے کہ بہت جلد جمہور اپنے عظیم تہذیبی ورثے کے ان نوادر سے مستفید ہونے کے قابل ہو جائیں گے

یہ فہرست اپنی نوعیت کی پہلی فہرست ہے جو مخطوطات کو جدید طرز پر ترتیب دے کر پیش کر رہی ہے اگرچہ لارڈ کرزن کے زمانے میں خدا بخش لیبریری بانکی پور کی فہرست بھی خان بہادر عبدالقدر اور ان کے ساتھیوں کی محنت سے ۳۱ جلدوں میں ترتیب پا چکی ہے مگر اس فہرست میں سائنٹفک اصولوں کے ساتھ ساتھ اختصار کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے جس کی وجہ سے خدا بخش لیبریری کے مخطوطات کی گنتی تعداد کو ۲۰ جلدوں میں سمیٹ دیا جائے گا۔

تبصرے

اسلام کے علاوہ اور مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ

تصنیف:۔ ڈاکٹر محمد عزیز ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی استاذ شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی۔ علیگڈھ

ناشر:۔ انجمن ترقی اردو۔ علیگڈھ

قیمت:۔ درج نہیں ہے

یہ کتاب بنیادی طور پر وہ مقالہ ہے، جو ڈاکٹر عزیز نے مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے پی ایچ ڈی کے تحقیقی کام کے طور پر یونیورسٹی میں پیش کیا تھا اور اسی مقالے پر انھیں ڈگری عطا ہوئی۔ اس اعتبار سے یہ مقالہ اپنے موضوع پر ایک مستند کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ حقیقت میں یہ اہم موضوع کسی محقق کی نظر نکتہ رس کا منتظر تھا، مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے ایک استاد نے اس اہم خدمت کے لیے کمر ہمت باندھ لی، اور اسے بخوبی تکمیل کو پہنچایا۔

مصنف نے اس مقالے میں ہندو، جین، سکھ، عیسائی اور بہائی مذہب سے متعلق اردو تصانیف کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ ان تصانیف میں ہندو مذہب اور اس کے مختلف پہلوؤں سے متعلق تصانیف کی تعداد کثیر ہے۔ اور یہ ایک فطری بات بھی ہے، کیونکہ ملک میں اس مذہب کے ماننے والوں کی تعداد بھی کثیر ہے۔ مقالے کو پڑھنے کے بعد اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اردو زبان میں ہندو مذہب سے متعلق کتنا کثیر اور متنوع ادب موجود ہے۔ حالانکہ اس کو باور کرنے کی کافی وجوہ ہیں کہ مصنف کی رسائی بعض ہندو امرا جیسے حیدرآباد کے مہاراجہ سرکشن پرشاد آنجہانی کے کتب خانوں تک نہ ہو سکی، جہاں ہندو مذہبی تصانیف کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔

کتاب کے اصل موضوع کو شروع کرنے سے پہلے "ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور اس کے اثرات" پر ایک بسیط مقدمہ ہے، جس میں مصنف نے ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے کی تفصیلات ان کی ابتدائی نوآبادیوں اور اس کے سماجی، تہذیبی اور لسانی اثرات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس حصے میں ڈاکٹر تارا چند، سلیمان ندوی اور بعض دوسرے علماء کے حوالے سے انھوں نے مسلمانوں کے ہندوستان آنے کے بعد ان کی زبانوں کے اثر کے ماتحت ایک مشترکہ زبان اور مشترکہ تہذیب کی نشو و نما پر بحث کی ہے۔ اس کے بعد ہندو مذہب کے بنیادی اصولوں اور ان کے مذہبی صحائف کا

مختصر سا تذکرہ کیا ہے۔ اردو میں ہندو مذہب کے متعلق تصانیف کا تذکرہ صفحہ ۴۴ سے شروع ہوتا ہے، اور یہ تذکرہ صحائف میں ویدوں کی بنیادی اہمیت اور قدامت کی مناسبت، ویدوں کے خلاصوں اور ترجموں سے شروع کیا گیا ہے اس سلسلے میں سب سے پہلی کتاب جو مصنف کو دستیاب ہو سکتی ہے وہ منشی کنھیا لال کی تصنیف "الکھ پرکاش" ہے جو ۱۸۶۱ء میں لکھی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بہت قدیم زمانے کی تصنیف نہیں ہے۔ اردو میں ہندو مذہب اور خاص طور پر اس کے اخلاقی اصولوں اور صوفیانہ تصورات کا عکس اس سے بہت پہلے بعض مسلمان صوفیوں کی تحریروں میں بھی نظر آتا ہے۔ اگر اس نقطۂ نظر سے بھی قدیم اردو تحریروں کا جائزہ لیا جا سکتا تو بہت ہی اچھا ہوتا۔ مصنف کے تفحص نے جو وسیع ادب ان صفحات میں اکٹھا کر دیا ہے وہ ہندو صحائف، عقائد، اساطیر، فلسفہ، اخلاق اور فکر کے دوسرے شعبوں پر مشتمل ہے۔ مذہبی تصانیف عموماً ادبی اہمیت کی کم حامل ہوتی ہیں۔ لیکن ڈاکٹر عزیز نے جو کارنامے کھوج کر نکالے ہیں ان میں سے بعض خاصی ادبی اہمیت کے بھی حامل ہیں۔ ایسے چند کارناموں کے مختصر اقتباسات نجم الغنی رامپوری کی "بحر الفصاحت" میں بھی ملتے ہیں، لیکن وہ صرف معانی اور بلاغت یا عروض کے مسئلے کو سلجھانے کے لیے مثالوں کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ان میں سے بعض تصانیف کا تذکرہ اردو مخطوطات کی وضاحتی فہرستوں میں بھی مل سکتا ہے، لیکن اردو ادب کے اس قیمتی سرمائے کا جائزہ جس تفصیل کے ساتھ اس مقالے میں لیا گیا ہے اس سے پہلے کبھی نہیں لیا جا سکا تھا۔ اس وسیع سرمایہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اہم کارناموں کی حد تک اردو میں ہندو مذہب سے متعلق تصانیف کا ذخیرہ زیادہ ہے یا اسلام سے متعلق ایسے وسیع ادب کی اردو میں موجودگی اس حقیقت کی دلیل ناطق ہے کہ ملک میں ایسے لوگوں کی بڑی بھاری تعداد موجود ہے جن کے لیے یہ ادب پیدا ہوا۔

ہندو مذہب سے متعلق تصانیف کے علاوہ، اس مقالے میں جین مت، سکھ، عیسائی، اور بہائی مذہب سے متعلق تصانیف کا تذکرہ بھی موجود ہے اور یہ اچھا مطالعہ ہے جو موضوع کی مناسبت سے ضروری تھا۔ ہندو مذہب کے ذیلی فرقوں جیسے کبیر پنتھ، برہمو سماج، آریہ سماج وغیرہ کے ادب کا بھی اس میں جائزہ لیا گیا ہے۔ جین مت اور سکھ مذہب کا ذکر مصنف نے علیحدہ علیحدہ ابواب میں کیا ہے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ بدھ مت سے متعلق ادب کا کوئی تذکرہ اس اہم جائزے میں شامل نہیں ہے۔ پتہ نہیں کہ مصنف نے بدھ مت کو قصداً چھوڑ دیا یا انھیں اس مذہب سے متعلق کوئی کارنامہ نہیں ملا۔ اگر پہلی بات تھی تو مصنف کے پاس اس کی کافی وجوہ ہونی چاہئیں اور ان کا اظہار ضروری تھا۔ دوسری بات صحیح نہیں ہو سکتی کیونکہ بدھ مت سے متعلق کچھ نہ کچھ تصانیف اردو میں مل جاتی ہیں۔ چنانچہ ایک اہم کتاب "بدھ اور اس کا مت" کے نام سے انجمن ترقی اردو نے ۱۹۴۲ء میں شائع کی تھی۔ اس جائزہ میں اسے مصنف کے پیش نظر یقیناً ہونا چاہیے تھا۔

ہندو مذہب کے علاوہ دوسرے مذہبوں سے متعلق تصانیف کا جائزہ ضمنی حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ جہاں ہندو

مذہب سے متعلق تصانیف کا تذکرہ دو سو صفحوں پر حاوی ہے، جین مذہب کی تصانیف کا تذکرہ صرف سولہ صفحوں پر ختم ہوتا ہے، سکھ مذہب کا تقریباً پچیس صفحوں پر عیسائی مذہب کا پچاس اور بہائی مذہب کا انیس صفحات پر۔

مستقل تصانیف کے علاوہ مذہبی رسائل اور اخبارات کے تذکرے کے لیے مقالہ نگار نے ایک علٰحدہ باب مختص کیا ہے لیکن یہ تذکرہ بہت مختصر ہے اور صرف آٹھ صفحات پر ختم ہوگیا ہے اس حصہ میں بھی ہندو مذہب اور دوسرے مذاہب سے متعلق رسالوں اور اخباروں کی تعداد کا تناسب وہی ہے جو تصانیف کا ہے۔

موضوع کے تعارف کے طور پر مصنف مقالہ نے مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی ان علمی اور ادبی صحبتوں کا تذکرہ کیا ہے، جہاں سے یہ موضوع انھیں سوجھا تھا۔ شانِ نزول بہرحال کچھ بھی ہو وہ ساعتیں یقیناً قابلِ قدر ہیں جن سے مرتب مقالہ کو یہ موضوع ہاتھ لگا۔ کیونکہ اس جائزہ کے سامنے آجانے کے بعد ایسے لوگوں کے لیے جو زبان کو مذہب کے ساتھ مخصوص کر دینا چاہتے ہیں، کچھ لمحاتِ فکر ضرور فراہم ہو جائیں گے۔ تاہم ایسے لوگوں کی خاطر جو غلط پروپگنڈے کے زیر اثر، اردو سے اپنا ناتہ توڑنے پر تلے ہوئے ہیں، مصنف کو ہم یہ مشورہ دیں گے کہ کچھ اور مواد اکٹھا کر کے وہ خود یا کسی ادارے کے تعاون سے اس کتاب کو ناگری رسم خط میں بھی شائع کر دیں۔ ناگری اڈیشن میں مصنف کو بعض حصّوں پر نظرِ ثانی کرنی پڑے گی۔ کیوں کہ مرتب مقالہ کو، اس وسیع مواد کے اکٹھا کر دینے کے بعد بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے جمع کیے ہوئے حقائق کافی اظہاری نہیں ہیں اس لیے انھوں نے جگہ جگہ اس بات کی طرف توجہ منعطف کرانے کی کوشش کی ہے کہ دیکھیے، اتنے وسیع غیر اسلامی سرمائے کے اردو میں موجود ہوتے ہوئے بھی اردو کو مسلمانوں کی زبان کہنا کہاں تک حق بجانب ہے؟ ہمارے خیال میں اس وقیع مقالے میں اس طرح کی اپیلوں کی گم گنجائش ہے۔ پھر جو لوگ ایسے اہم حقائق کو نظر انداز کرنے تیار ہوں ان پر ظاہر ہے کہ چند لفظی اپیل کا کیا اثر ہو سکتا ہے؟

اس کتاب میں بہ حیثیت مقالے کے جہاں اپیل کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی بعض کارناموں کے جائزے کا کاروباری انداز بھی مشتبہ اہمیت کے سائنٹیفک طریقے اور مخدوش قسم کی قطعیت کے تیور رکھتا ہے۔ مثلاً صفحہ ۱۲۴ پر پریم ساگر کا تذکرہ..... ملاحظہ ہو:-

(۱۵) پریم ساگر منظوم:- از شنکر دیال فرحت، مطبع ثمر ہند (مقام درج نہیں) ۱۲۸۰ھ ص ۵۹۔

کارناموں کے جائزے کا یہ انداز، کسی توضیحی فہرست کے لیے موزوں ہو تو ہو، لیکن جہاں تک ادبی مقالوں کا تعلق ہے ان کا بیان مستند اور واقعاتی ہوتے ہوئے بھی حتی الامکان ادبی ہونا ضروری ہے۔ ورنہ ایسے نوٹوں سے مقالے کی ادبی روح مضمحل ہو جاتی ہے۔

کتاب میں اشاریہ نہیں ہے اور مستند علمی اور ادبی کتابوں کی اہمیت اشاریہ سے بہت بڑھ جاتی ہے۔

عبدالقادر سروری

نیا دور (ناولٹ نمبر)

پبلشر:- پاکستان کلچرل سوسائٹی۔ کراچی ۱۔
ادارہ ۔ ثناءاللہ۔ قمر سلطانہ ۔ قیمت:- پانچ روپے

کراچی سے پابندی وقت کے ساتھ شائع ہونے والے اعلیٰ معیاری رسالوں میں "نیا دور" ایک امتیازی خصوصیت رکھتا ہے۔ دو تین برس کے اندر ہی نیا دور نے بڑی مقبولیت حاصل کرلی ہے۔ زیر نظر شمارہ ناولٹ نمبر ہے جو اس خوبصورت رسالے کی ترقی کا ایک سنگ میل کہا جاسکتا ہے۔ اس کے ۴۸۰ صفحات پر نو ناولٹس شائع کی گئی ہیں۔ اردو میں ناولٹ کی ٹکنک ابھی ابتدائی مرحلوں سے گذر رہی ہے۔

جس طرح ناول اور ناولٹ کی ٹکنک میں فرق ہے۔ اسی طرح ناولٹ اور مختصر کہانی کی ٹکنک بھی ایک ہی نہیں ہے۔ ناول (AUTO BIOGRAPHICAL) ہوسکتی ہے۔ لیکن ناولٹ میں قاری کو کسی شارٹ کٹ راستے سے منزل تک پہنچایا جاتا ہے۔ وحدت تاثر مختصر کہانی کی امتیازی خصوصیت ہے۔ اس کے برخلاف ناولٹ میں اس کی قید نہیں۔ بلکہ پلاٹ کا پھیلاؤ اور کردار نگاری ضروری ہے۔ یوں کہہ لیجئے کہ ناولٹ میں چاول کے دانے پر الحمدللہ کی خطاطی کی جاتی ہے لیکن اکثر افسانہ نگار اس فرق کو بھول جاتے ہیں اور کہانی کو کئی صفحوں پر پھیلا کے اسے ناولٹ کا نام دیدیتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اردو میں اچھی ناولٹس کی تعداد بہت کم ہے اور کسی رسالے کے لیے ناولٹ نمبر شائع کرنا اتنی آسان بات نہیں ہے۔

اس نمبر میں عزیز احمد، شوکت صدیقی، بلونت سنگھ، غلام عباس، ابوالفضل صدیقی جیسے مشہور لکھنے والوں کے علاوہ ناصر شمسی، صادق حسین، ضمیر الدین احمد اور واجدہ تبسم شامل ہیں۔ قرۃ العین حیدر کی طرح عزیز احمد بھی اچھی ناول کے بعد اچھی ناولٹ لکھ سکتے ہیں۔ مختصر کہانی ان کا فن نہیں ہے۔ اس شمارے میں عزیز احمد کی ناولٹ "جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں" نہ صرف عزیز احمد کی اچھی ناولٹ ہے بلکہ ناولٹ کی ٹکنک کی ساری خوبیاں سمیٹے ہوئے ہے۔ شوکت صدیقی کی ناولٹ "اندھی گلیاں" بہت کامیاب ہے۔ شوکت صدیقی نے ٹریجڈی پر آوارہ گردی کرنے والوں کے لیے اپنے قلم کو مخصوص کرلیا ہے اس موضوع پر انھوں نے کئی کہانیاں لکھی ہیں۔ لیکن "اندھی گلیاں" ان سب میں بلند ہے۔

ضمیر الدین احمد نے "صراط المستقیم" میں پہلی بار غیر ضروری جنس نگاری سے اپنی توجہ ہٹائی ہے۔ غالباً یہ ان کی سب سے اچھی کہانی ہے، جو چار دیواری کے اندر بسر ہونے والے ایک خاموش المیے کو اس کے سارے اسرار و رموز کے ساتھ دہراتی ہے۔

غلام عباس کہنہ مشق لکھنے والوں میں شامل ہوتے ہیں جو کسی (GAP) کے بغیر لکھے جا رہے ہیں۔ لیکن ان کی ناولٹ "کن رس" اچھی کہانی ہے۔ ناولٹ نہیں۔

بلونت سنگھ سے "حد فاصل" سے بھی اچھی ناولٹ کی توقع کی جاسکتی تھی۔ کیونکہ وہ اس سے پہلے "پہلا پتھر"

اور" جگا" وغیرہ لکھ چکے ہیں۔

ابوالفضل صدیقی کی کہانی، صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے اس کے باوجود اسے ناولٹ نہیں کہا جاسکتا، اصفحوں پر لکھی جانے والی کہانی پڑھنے کے لیے مصنف کو قاری سے ہمدردی رکھنا چاہیے۔ اگر وہ چاہتا ہے کہ اس کی پوری کہانی پڑھی جائے تو کہانی میں اس کشش کا ہونا ضروری ہے جس کے سہارے قاری خود بخود مصنف کے ساتھ ہولے۔

سے لکھنے والوں میں واجدہ تبسم تیزی سے بڑھ رہی ہیں۔ جنس واجدہ کا خاص موضوع ہے۔ اس پر انھوں نے کئی کامیاب کہانیاں لکھی ہیں۔ "شہر ممنوع" بھی ان کی اچھی کہانیوں میں شامل ہوگی۔

اس کے علاوہ مزید ناولٹس قابل ذکر نہیں ہیں۔

مجموعی طور سے اس نمبر کو بڑی خوبصورتی سے مرتب کیا گیا ہے۔ ہر لکھنے والے کا فوٹو بھی شامل اشاعت ہے۔

ترتیب اور تزئین کے لحاظ سے بنا دور کا اپنا ایک خاص معیار ہے۔ یہ معیار ناولٹ نمبر میں کچھ اور بلند ہوگیا ہے۔

جیلانی بانو

شعور (کراچی) ۳۷۲

تزئین و ترتیب: آذر زوبی، صفدر بابی
ناشر: مکتبۂ شعور ماڈسی والا لین، پرڈی اسٹریٹ، صدر کراچی

پچھلے چند برسوں میں پاکستان کے ادبی پرچوں میں ادب کے ساتھ مصوری کی نمائندگی کا رجحان بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ ادب اور مصوری کا یہ امتزاج نہ صرف رسالے کے صوری حسن میں اضافہ کرتا ہے بلکہ دو اہم فنون لطیفہ کو ایک دوسرے کے قریب بھی کرتا ہے۔ شعور ٹائپ میں شائع کیا جا رہا ہے۔ طباعت کے جدید اور سائنٹفک طریقے کو اپنانا ہر لحاظ سے ایک قابل تقلید اقدام ہے۔

اس وقت ہمارے پیش نظر شعور کا دوسرا اور تیسرا شمارہ ہے۔

دوسرے شمارے کے افسانوں میں سب سے اہم پورلے گر کولیست کے افسانے کا ترجمہ ہے جو ممتاز شیریں نے کیا ہے، منٹو کے افسانے میں کوئی نئی بات نہیں بلکہ خود ان کے بہت سے پرانے افسانوں کی سی بات دُھرائی گئی ہے حفیظ رومانی کا افسانہ "غنڈے" بڑی حد تک کامیاب ہے، قدرت اللہ شہاب کا طنزیہ خاکہ "کراچی ۱۹۳۹ء" خاصے کی چیز ہے لیکن اس کا اصل مقام افسانوی حصے کی بجائے طنزیہ خاکوں میں تھا، محمد خالد اختر نے طنز نگاروں میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں، ہمارے ادب میں یہ حسن اس قدر کم یاب ہے کہ اس صنف میں لکھنے والوں کے نام انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ ..... خالد اختر کا طنزیہ "ماڈرن ڈزائنرز" ان کے رنگ کی بہترین چیز ہے، اس طنز نگار سے مستقبل کی اچھی توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ ڈرامے دونوں اچھے ہیں مگر جیلانی بانو نے اتنے بھاری بھرکم اور گہرے موضوع کو چھوا ہے جس پر بغیر وسیع علمی اور فلسفیانہ پس منظر کے قلم نہیں اٹھانا چاہیے اسی لیے کہیں کہیں یہ احساس

ہوتا ہے کہ اتنے ہمہ گیر موضوع (آدم سے آدمیت تک) کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکا، رشید احمد صدیقی کے طویل مضمون نے حصۂ مضامین کی لاج رکھ لی ہے ورنہ یہ حصّہ بہت کمزور تھا۔

یوسف ظفر، حامد عزیز مدنی، خلیل الرحمٰن اعظمی اور سجاد شاہد کی نظمیں اچھی ہیں، فارغ بخاری کی نظم میں یہ مصرعہ بری طرح کھٹکتا ہے ع مرے ماحول کو یہ زہر پلائی کس نے ـــــ ضرورت قافیہ کے تحت بھی یہ غلطی گوارا نہیں کی جا سکتی ظہیر ہاشمی شان الحق حقی، شاعر لکھنوی کی غزلیں نئے انداز تغزل سے بھرپور ہیں، فراق کی غزل میں صرف ایک شعر ہے ع

ان سے مل کر فراق خوش ہوئیں ۔۔۔ زندگی بھر اداس رہتا ہے

شعور کے اس شمارے میں "ادیب اور شخصیت" کے عنوان سے ایک بحث کا آغاز ہوا ہے جس میں یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ ادیب کی شخصیت سے اس کی تخلیقات کا کوئی تعلق ہوتا ہے یا نہیں، بحث کے آغاز کے لیے "مقالے" کے نام پر الطاف گوہر کا دو صفحوں کا مختصر سا مضمون پیش کیا گیا ہے، بحث سے قطع نظر اس مضمون سے کوئی بات واضح نہیں ہوتی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مضمون نگار کے ذہن میں شخصیت کا کوئی واضح تصور نہیں ہے حالانکہ نفسیات کی کسی ابتدائی کتاب میں شخصیت کی واضح اور جامع تعریف مل سکتی ہے، یہ تعریف ہر جگہ اس قدر یکساں ہے کہ شخصیت میں تمام ذہنی تصورات، جذبات، احساسات، طرز عمل اور تخلیقات کو بھی شامل کیے بغیر چارہ ہی نہیں، اس لحاظ سے یہ بحث ہی غیر ضروری اور ایک مسلمہ حقیقت کو متنازع فیہ بنانے کی سعیٔ لاحاصل ہے۔ اگر بحث ہی مقصود ہے تو پہلے شخصیت کی تعریف اور حدود کا تعین ضروری تھا جو کوئی مشکل کام نہیں ـــــ

شعور کے تیسرے شمارے میں اس بحث کا سلسلہ نہیں ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاید اس طرف توجہ دینے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی گئی۔ تیسرا شمارہ مجموعی حیثیت سے زیادہ ٹھوس اور وقیع ہے، اس دفعہ بھی مضامین کے صفحات کی کمی کھٹکتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے مضمون نگاروں کے قلم تھک چکے ہیں۔ اس شمارے میں افسانے، نظمیں اور غزلیں سبھی اصناف کافی جاندار ہیں اور ہمارے آگے بڑھتے ہوئے ادب کی ترقی کے آئینہ دار ـــ بلونت سنگھ کا افسانہ اپنے اختصار کے باوجود مکمل ہے، ممتاز مفتی نے اپنے خاص جنسی نقطۂ نگاہ کو ہی حسب معمول افسانوی رنگ دیا ہے۔ عزیز ملک کے افسانے میں کہیں کہیں قدامت پرستی کی بو آتی ہے مگر اس افسانے سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ افسانہ نگار کا انداز بیان منفرد بھی ہے، شعری بھی اور حسین بھی، طویل نظموں کے حصے میں تبغ الہ آبادی کی نظمیں خاص طور پر توجہ چاہتی ہیں۔ تبغ نئی نسل کے شعراء میں منفرد بھی ہیں اور ممتاز بھی۔ درمیان میں ان کے پاس ٹھیراؤ اور بے رنگی کی کیفیت آ گئی تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کے سفر نے ان کے ذہن کی کھڑکیاں پھر تازہ ہوا کے لیے کھول دی ہیں اور شاعری میں نیا نکھار آ رہا ہے۔ تیسرے شمارے کو دیکھنے کے بعد اداریہ کا یہ جملہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ "کوشش ہے کہ ہر شمارہ پہلے سے بہتر ہو" چنانچہ اس شمارے کے سب ہی افسانے نظمیں اور غزلیں اچھے معیار پر پوری اترتی ہیں۔ "شعور" کتابی شکل کے ضخیم ادبی رسالوں میں ایک اہم اور خوبصورت اضافہ ہے۔

وحید اختر

صحیفہ (لاہور)

مدیر :- عابد علی عابد۔ معاون مدیر :- سید سجاد رضوی
مجلس ترقی ادب ۲، نرسنگ داس گارڈن، کلب روڈ۔ لاہور

آج کل کتابی شکل کے ضخیم پرچوں کا اجرا روز بروز بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اس انداز کے رسالوں کا ایک رخ تو یہ ہے کہ لکھنے والوں کی زیادہ تخلیقات کو جگہ ملتی ہے اور بیک نظر ہی ان کے خدوخال کا اندازہ قائم کیا جا سکتا ہے، دوسرا رخ یہ ہے کہ عام طور سے ادیب اور شاعر ایسے ہی پرچوں میں لکھنے کو ترجیح دیتے ہیں جس کی وجہ سے زیادہ معیاری چیزیں یکجا ہو جاتی ہیں۔ لیکن ایسے رسالوں کی کثرت ماہناموں کے مستقبل کے تعلق سے ایک سوالیہ علامت بھی بن سکتی ہے اور اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

صحیفہ مجلس ترقی ادب کا سہ ماہی مجلہ ہے جس کا پہلا ہی شمارہ بڑے دھڑلے سے نکلا ہے، عابد علی عابد ایسے کہنہ مشق صاحب قلم کا مدیر ہونا ہی اس کے معیار کی ضمانت سمجھا جا سکتا ہے۔ صحیفہ کے پہلے ہی شمارے میں احمد ندیم قاسمی کا ایک معرکتہ الآرا افسانہ "بیٹے بیٹیاں" موجود ہے جسے بلاپس وپیش اردو کے کامیاب ترین افسانوں میں شامل کیا جا سکتا ہے، غلام علی چودھری کا افسانہ "بھاپ اور لوہا" بھی اچھا اثر چھوڑتا ہے اور کامیاب کہا جا سکتا ہے نظموں اور غزلوں کے حصے میں ہر شاعر کی کئی کئی چیزیں ہیں اور پرانے لکھنے والوں کے ساتھ نوواردوں کے نام بھی نظر آتے ہیں، قدیم اور جدید کا امتزاج اس رسالے کا مقصد ہے اور یہی مقصد ترتیب سے نمایاں ہے، مقالوں کا حصہ بہت بھاری بھرکم اور وقیع ہے مضمون نگاروں نے کافی مطالعے، وقت نظر اور محنت کا ثبوت دیا ہے عام طور سے ادب میں مضامین کی اہمیت اور ضرورت کو نظر انداز کیا جاتا ہے چنانچہ نیا لکھنے والا ہی مطالعے کی عرق ریزی سے بچنے کے لیے شوق افسانے کو اپنا تختۂ مشق نہیں بناتا بلکہ اب تو بعض پرانے مضمون نگار بھی علمی ریاضت سے بچنے کے لیے دوسری اصناف کی طرف رجوع کر رہے ہیں حالانکہ ہم کو ایسے صاحبان علم اور وسیع مطالعہ رکھنے والوں کی ضرورت ہے جو مختلف موضوعات پر لکھ کر اردو کے دامن کو مالا مال کر سکیں۔ صحیفہ کے دونوں شماروں میں اس حصے کی طرف خاص توجہ دیکھ کر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ ادارہ اس رخ پر زیادہ زور دے تو ایک بڑی ضرورت پوری ہو سکتی ہے، ویسے بھی ہمارے پاس خالص علمی یا علمی ادبی پرچوں کی بڑی کمی ہے .... جو علمی پرچے ہیں بھی تو ان میں ادبی پہلو کمزور ہوتا ہے اور ادبی پرچے تو علمی مضامین کی طرف رخ ہی نہیں کرتے، مجلس ترقی ادب کے اغراض ومقاصد کا مطالعہ کرنے کے بعد بھی اس نتیجے پر پہنچنا پڑتا ہے کہ صحیفے کو اس طرف خاص توجہ کرنی چاہیئے اور ایسا کیا بھی گیا ہے چنانچہ دونوں شماروں میں مقالات کا حصہ جاندار ہے اور اس کے موضوعات بھی متنوع اور کہیں کہیں نئے ہیں۔ دونوں شماروں میں ترجمے بھی ہیں اور طنز ومزاح کا حصہ بھی بھرپور ہے البتہ دوسرے شمارے کا دامن طنز واضانوں سے خالی ہے لیکن ابوالفضل صدیقی اور قیوم نظر کے مضامین افسانوں سے کہ دلچسپی اور حقیقت افروز نہیں ہیں، یوں بھی ایک اچھے رسالے میں معمولی افسانوں کی اشاعت کے بجائے ترجمے اور تلخیص پر ہی اکتفا کرنا زیادہ مناسب ہے۔ صحیفہ میں اہل ذوق کی دلچسپی کا دوسرا سامان اتنا وافر ہے کہ افسانوں کی کمی کی بری بھی نہیں معلوم ہوتی۔

دونوں شماروں کی ضخامت ڈھائی سو صفحات سے زائد ہے، کتابت، طباعت، کاغذ اور معیار کو دیکھتے ہوئے ہر شمارے کی قیمت تین روپے زائد نہیں .... صحیفے کے مدیر سے ہم خوب سے خوب تر کی توقع اس لیے کر سکتے ہیں کہ وہ ان مدیران کرام میں سے نہیں ہیں جو بقول عشرت رحمانی ادارت کو "قوت ارادت" سے چلاتے ہیں۔

وحید اختر

بازگشت

لاہور

صبا کا ڈیزائن میں نے تیار کر رکھا ہے اگر اب بھی اس کی ضرورت ہو تو لکھ دیں بھیج دوں گا۔
حیدرآباد (دکن) کا پہلا رسالہ جو اپنی روایات سے ہٹ کر کسی نئی راہ پر بڑی خوش اسلوبی سے چلا جا رہا ہے۔

عبدالرحمٰن چغتائی

حیدرآباد دکن

"بازگشت" میں جو آوازیں گونجا کرتی ہیں محض اس سے بچنے کی خاطر "صبا" کے متعلق کچھ لکھنے سے گریز کرتی رہی۔ لیکن اس بار خطوں میں کچھ افادیت پیدا ہو چلی ہے۔

مثلاً اس بار شاہد صدیقی اور شفیقہ فرحت نے بڑے غور سے پورا "صبا" پڑھ ڈالا۔ (اردو رسالوں کے ساتھ یہ بھی ٹریجڈی ہے کہ ان کا صرف ایک دلچسپ حصہ پڑھا جاتا ہے)

ویسے شاہد صدیقی نے جس نظم کا ذکر کیا ہے وہ سچ مچ صبا کی سب سے دلچسپ نظم تھی۔ جسے پڑھ کر بڑی مسرت ہوئی تھی۔ آپ کے شعر پر شاہد صدیقی کا اعتراض کوئی اہم جواز نہیں رکھتا۔ رم ایک شراب کا نام ہے جو اردو میں اسی نام سے مستعمل ہے۔ اکبر اور حکیمت کے علاوہ بہت سے شاعروں نے انگریزی قافیے استعمال کیے ہیں۔ یوں بھی اگر اردو شاعری میں سے دوسری زبانوں کے الفاظ علیحدہ کرنے کی مہم شروع کر دی جائے تو غالباً کسی شاعر کا کوئی شعر سارا نہ بچے گا۔

فراق اور اثر کی "طفلانہ لڑائیوں" کو بند کر کے آپ نے صبا کے کئی صفحے بچا لیے ہیں۔

صبا میں ریویو کے حصے پر بھی اب خاص توجہ دی جانے لگی ہے۔ رسالے کے اوراق اجازت دیں تو تبصرہ ہمیشہ کھل کر ہونا چاہیے۔ تاکہ قاری کے ساتھ ساتھ مصنف کا بھی سہارا بن سکے۔

لیکن اس بار "زنداں نامے" کے تبصرے میں کئی اعتراض برائے اعتراض سے ہو گئے ہیں فیض پر چاہے کوئی الزام رکھیے لیکن داخلیت اور یاسیت کا الزام ان کی شاعری کے کسی دور پر کسی نے نہیں رکھا۔ تبصرہ نگار اس بات سے متفق ہے کہ کسی شاعر کی مقبولیت کا راز تنقید نگاروں کی رائے دیکھ کر نہیں بلکہ عوام میں اس کی مقبولیت دیکھ کر لگایا جاتا ہے

چنانچہ فیض کی نظم "ملاقات" کو بھی پسندیدگی کی سند سجاد ظہیر کی سفارش نے نہیں دلوائی۔ بلکہ ملاقات کا موضوع اظہار بیان اور اس کی تکنیک نئے تجربے کے طور پر مفید ہو گئی ہے لیکن اس کے باوجود اس نظم پر صرف "اجنبیت" کا الزام رکھ کر کنڈم (CONDEMN) کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس نظم کے بند کا مفہوم بھی تنقید نگار نے کچھ بدل دیا ہے۔

پھر اگلی رُت کی فکر کرو　　جب پھر اک بار اجڑنا ہے
اک فصل پکی تو بھر پایا　　جب تک تو یہی کچھ کرنا ہے

اس بند کا مفہوم تو بالکل سیدھے سادے انداز میں کہہ رہا ہے کہ ایک فصل پکی تو کچھ حاصل نہ ہوا۔ یعنی بھر پایا (اور نہ جانے اپنا مقصد پانے تک کتنی فصلیں رائیگاں جائیں گی) یہاں "بھر پایا" بیزاری کے معنوں میں ہی استعمال ہوا ہے تبصرہ نگار نے نہ جانے کیسے الٹ پھیر کے اسے دوسرے معنی پہنانے کی کوشش کی ہے۔

سانس تھامے ہیں نگاہیں کہ نہ جانے کس دم　　تم پلٹ آؤ، گذر جاؤ، یا مڑ کر دیکھو

سانس تھامنا بے شک محاورہ نہیں ہے۔ لیکن اس مصرع میں شاعر نے جو کیفیت بیان کی ہے اس کے لیے سانس تھامنے سے زیادہ موزوں الفاظ اور کیا ہوں گے، اکھڑی ہوئی سانسوں کو نگاہوں نے ایک انتظار موہوم میں تھام رکھا ہے۔ اگر روک رکھتیں تو اس سے شاعر کی لب دم کیفیت کا اظہار نہ ہوتا۔

صرف پرانے محاوروں کے پیچھے دوڑنا ہی شاعری نہیں۔ شاعر نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں اگر ان میں زبان کا کوئی سقم نہیں اور وہ اظہار کے لیے موزوں ہیں تو ان کا استقبال کرنا چاہیے۔

دراصل فیض اپنے ساتھ نئی تشبیہوں اور الفاظ کا ایک ذخیرہ لے کر آئے ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری میں بہت سے نامانوس الفاظ اور تشبیہیں ایسی بھی چلی آئی ہیں جنھیں سنبھل کر دیکھنا پڑتا ہے۔ اس تکرار سے کہیں آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ میں فیض کی شاعری میں زبان کی غلطیوں سے منکر ہوں۔ یا یہ چاہتی ہوں کہ وحید اختر صاحب ان غلطیوں کو اجاگر نہ کریں۔

مثلاً انھوں نے فیض کے اس شعر کو سراہا ہے۔

یوں بہار آئی ہے اس بار کہ جیسے قاصد　　کوچۂ یار سے بے نیل و مرام آتا ہے

اس میں بے نیل و مرام کی بجائے بے نیل مرام ہونا چاہیے۔

لیکن اس کو یوں کہیے گا کہ فیض کی شاعری کے اس رنگا رنگ سیال میں ہر شخص مبہوت ہو جاتا ہے۔ ان کی شاعری کی چکا چوند میں اگر کوئی فیض کے عیوب تلاش کرنے پر کمر ہمت کس بھی لے تو اس کے ہاتھ اکثر کنکروں کی تلاش میں بھی موتی ہی رولتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ "زنداں نامے" پر تنقید کرتے وقت وحید اختر نے کچھ جارحانہ سا انداز اختیار کر لیا تھا (یہاں میں فیض کی شاعری پر کسی بحث کا آغاز کرنا نہیں چاہتی اس لیے اب مزید کچھ نہیں کہوں گی)

مخدوم کا سفرنامہ بڑی دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ ان کا اسٹائل اتنی دل کشی لیے ہوئے ہے کہ افسانہ نگار بھی جھینپے جا رہے ہیں۔ اس بار "طنزیہ" کہانیوں سے زیادہ کامیاب ہے۔

نظم "موٹر" کے جس بند میں شاعر نے شب مہتاب میں جام اٹھاتے وقت اپنے والد کو یاد کیا ہے وہ قابل غور ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ شاعر اپنے والد کو ایک ہم پیالہ ساتھی کی طرح یاد کر رہا ہے یا ناصح مشفق کی طرح۔

حیدرآباد میں کئی اچھے تنقید نگار ہیں۔ مثلاً عالم خوندمیری، طاہر علی خاں مسلم وغیرہ۔ لیکن یہ لوگ صبا کے لیے کیوں نہیں لکھتے۔ کہانیوں کا معیار بھی ذرا اور بڑھایئے۔ میری کہانی تو ابھی پچھلے شمارے میں آچکی ہے۔ اب جلد ہی ایک اور کہانی بھیجوں گی۔ جیلانی بانو

حیدرآباد دکن

معاف کیجئے — (گو یہ احساس ضرور ہے کہ آپ کو برا ضرور لگے گا!) آپ کے پرچے میں FICTION بہت ہی کم ہوتا ہے اور جو ہوتا ہے تو بہت ہی عجیب ہوتا ہے — اور شاید آپ کو یہ علم نہیں کہ پرچہ عموماً افسانوں کے سہارے ہی چلا کرتا ہے — تنقید تو اکثر لوگ پڑھتے ہی نہیں — رہیں آپ کی نظمیں اور غزلیں — تو وہ صرف ذرا صاحب ذوق قسم کے لوگ ہی پڑھتے ہیں — پرسوں آفروز اس ماہ کا صبا پڑھتی بیٹھی تھی — اس نے دو چار صفحے الٹے اور بس پرچہ یہ کہہ کر پھینک دیا "توبہ ہے آپا تیرے اس پرچہ میں (صبا کو وہ میرا پرچہ سمجھتی ہے!) تو کچھ ملتا ہی نہیں پڑھنے کو" — آفروز کی یہ بات اس لیے قابل غور ہے کہ یہ ایک عام قاری کی رائے ہے — اور اس رائے کو ہمیشہ آپ کے سامنے رہنا چاہیئے —

جناب فراق اور اثر صاحب کا آپ نے خاتمہ کر دیا — اچھا کیا!! آپ نے شاید "ساقی" (پچھلے ماہ کا) دیکھا ہو — اس میں فراق صاحب نے بڑا "آہیلوان قسم" کا مضمون لکھا ہے — یوں لگتا ہے کہ اثر صاحب سامنے آگئے تو باقاعدہ کشتی لڑ پڑیں گے — پرانے اساتذہ سے شاید کسی نے کچھ حاصل کیا ہو — مگر مجھ سے "لکھا" (یعنی تحریر) لیجئے کہ فراق اور اثر سے ہم لوگ ضرور گالیاں اور بدتمیزی ہی سیکھیں گے — میں سچ کہتی ہوں کہ شاہد احمد دہلوی کی بجائے اگر میں "ساقی" کی مدیر ہوتی تو ایسے مضمون کو راستہ بتا دیتی — بہرحال — آپ کے پرچے میں تبصرے تعریف کے لائق ہوتے ہیں — بعض پرچوں میں میں دیکھتی ہوں تبصرے یوں کیے جاتے ہیں گویا بیگار سر اجارہا ہو — اب کی بار وحید اختر نے جو فیض کے "زنداں نامہ" پر تبصرہ کیا ہے — اسے پڑھ کر جی خوش ہو گیا — تبصرہ ہو تو ایسا ہو — باقاعدہ تنقیدی مضمون کا سا انداز ہے — مدیہ ہے کہ انھوں نے چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر بھی نظر رکھی ہے —

اور ایک بات سنیئے — اپنا نام چھپا دیکھنے کی اب مجھے ہوس نہیں رہی کیونکہ دو سال کے عرصے میں (جب سے کہ میں نے افسانہ نگاری شروع کی ہے) کئی بار میرا نام چھپ چکا ہے — ہاں اتنا ضرور چاہوں گی کہ میری یہ سطریں فراق صاحب

اور اثر صاحب کی نظروں سے ضرور گذر جائیں۔ واجدہ تبسم

حیدرآباد (سندھ)

وحید اختر کا تبصرہ تازہ شمارے میں پڑھا ــــ زنداں نامے پڑا اچھا لکھا ہے۔ لیکن فیض کی زبان کی غلطیاں گناتے ہوئے خود وہ زبان کی کئی غلطیوں کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اگر اس طرف تم انھیں متوجہ کر دیتے تو اچھا ہوتا۔ "بازگشت" میں شاہد صدیقی کا خط بہت سلجھا ہوا ہے اور بڑے خلوص سے لکھا گیا ہے۔ جن باتوں کی طرف انھوں نے اشارہ کیا ہے متعلقہ حضرات کو ان پر غور کرنا چاہیئے۔ خود تمھاری اپنی غزل کے بارے میں انھوں نے جس خیال کا اظہار کیا ہے میں اس سے متفق ہوں میں نے وہ غزل پڑھی تھی۔ لیکن سچ کہتا ہوں "رم" کے لفظ نے غزل کی سنجیدہ فضا کو ایک دم غیر سنجیدہ کر دیا تھا۔ بھئی تم تو غزل کے آداب سے واقف ہو، نظم میں تک اس کا التزام رکھنے کی کوشش کرتے ہو، یہ غزل کہتے ہوئے کس موڈ میں تھے۔ کہیں "رم آلود" تو نہیں تھے۔

تازہ شمارے میں غزلوں کا حصہ یوں ہی سا ہے۔ مجھے تو صرف دو تین شعر پسند آئے۔ اظہر سعید کا یہ شعر کہ۔

آخر آخر اپنی حالت پر ہنسی آنے لگی ــــ پہلے پہلے تو غمِ دل پر بہت روئے تھے ہم

اور زبیر رضوی کی غزل کا پہلا شعر:۔

سرمستی و سرشاری بدنام ہوئی اپنی ــــ ساقی پہ مگر کوئی الزام نہیں آیا

اور مظہر امام کا یہ شعر:۔

بہ وقتِ وعدہ وہ اندازِ جنبشِ مژگاں ــــ مجھے تو جھوٹ کی معصومیت پہ پیار آیا

ہاں بشیر بدر کی غزل میں بھی کچھ شعر اچھے ہیں۔ نظموں کے حصے میں مغنی تبسم کی نظم بہت ہی اچھی ہے، بار بار پڑھتا رہا۔ بشر نواز اور عزیز قیسی کی نظمیں بھی متاثر کرتی ہیں۔ کاش یہ کچھ مختصر ہوتیں۔ حمایت علی شاعر

لندن

"صبا" کے ایک پچھلے پرچہ میں مغنی تبسم صاحب کا حمایت علی شاعر کے مجموعے پر تبصرہ پڑھا۔ مجھے اگر آپ اجازت دیں تو میں عرض کروں کہ کیا ہم لکھنے والے ہمیشہ اتنے ہی غیر ذمہ دار رہیں گے جتنے کہ مغنی تبسم ہیں۔ شاعر نے تو مجموعہ کلام کے چھپوانے میں غلطی کی ہو نہ ہی جلدی کی۔ بہت کم شاعر ہم عصر شاعر ہوں گے جن کے ہاں شاعری کی شاعری کی طرح اپیل ہو۔ قبول عام کی سند تو مغنی صاحب کے ہاں لغوی چیز ہوگی۔ ویسے شاعر اگر ذاتی الجھنوں میں نہ الجھا تو میں آپ کو یقین دلاؤں کہ وہ کہیں سے کہیں جا پہنچے گا۔

فراق و اثر کا قصہ ختم کیجیے۔ دونوں طرف کے "حملے" پڑھنے کے بعد میری تائید فراق کے حق میں ہے۔ فراق بہت بڑے شاعر اور ذہین انسان ہیں۔ اثر صاحب کے ہزار حملوں کے باوجود فراق مرنے والا نہیں۔ عالم صاحب کی باتیں سمجھ میں نہیں آئیں۔ شاہد صدیقی سے نثر لکھوائیے۔ آمنہ ابوالحسن کے افسانے بالکل پسند نہ آئے۔ اسد اللہ